مجلۂ علمیہ

برہان

کی

۶۰ ویں جلد

مرتب

سعید احمد اکبر آبادی ایم اے

ناشر

ندوۃ المصنفین [illegible] جامع مسجد دہلی

دعوتِ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہندوستان سے اور اہل ہند کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت عہد رسالت میں عرب میں ہندوستانی اشیاء کے رواج اور اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا ذکر ہے، کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جس میں عرب میں آباد سات ہندوستانی قوموں کے ناموں کی تحقیق اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات لکھے گئے ہیں، ضمناً جاہلی عرب اور ہندوستانیوں کے بعض مذہبی عقائد مثلاً اصنام پرستی میں یکسانی، عرب کے ہندوؤں کے صابیہ و مجوس ہونے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہندوستانی راجاؤں کے وفود کی آمد اور ہدایا کی پیشکش، دونوں ملکوں کی زبانوں کے توارد کی بعض مثالیں بھی تحریر کی گئی ہیں، حضرت سید صاحبؒ کی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات اس موضوع پر اتنی جامع اور مبسوط ہے، اور اس میں عرب و ہند کے تعلقات کے ہر پہلو پر اتنے معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں، کہ اُن پر مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، اس کتاب میں بھی اس سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم مصنف نے بعض نئی باتیں بھی لکھی ہیں لیکن عہد رسالت کے واقعات اور عرب ہند کے تعلقات کے ذکر میں ماخذوں کی صحت و استناد کا جس قدر اہتمام و لحاظ ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہے، بعض مباحث میں غیر ضروری تکرار بھی ہو گئی ہے جو گراں گذرتی ہے، مجموعی حیثیت سے کتاب مفید اور مطالعہ کے لائق ہے،

عظیم بیداری اور جمہوریت کا چیلنج مترجمہ جناب جلیس عابدی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات، ۲۹۶، قیمت ۵ روپے

پتہ: نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی، نمبر ۶

مشہور برطانوی مفکر جان سٹریچی نے اپنی وفات سے کچھ پہلے ۱۹۶۳ء پورپ میں چند تقریریں کی تھیں، یہ کتاب اُن کا اردو ترجمہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں پانچ اور دوسرے میں دس تقریریں ہیں، اُن میں مصنف نے پرانی نوآبادیاتی حکومتوں کا اجمالی جائزہ لیا ہے، اور موجودہ دور

کے انقلاب اور اُس کی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، اور سامراج کی حقیقت بیان کی ہے، اور اُس کے متعلق لینن اور دوسرے کمیونسٹوں کے خیالات اور اُن کی سامراج دشمنی کے دعوی کی مفصل تردید کی ہے، نئے امریکی سماج یا اور کسی سامراجی طاقت کے موجودہ زمانہ میں اُبھرنے کے اندیشہ کو ناممکن بتایا ہے، ایک تقریر میں انھوں نے چین اور ہندوستان کی ترقیاتی اسکیموں کا موازنہ کرکے اوّل کو خرگوش اور دوسرے کو کچھوے سے تشبیہ دی ہے، کتاب کے آخری حصّوں میں جمہوریت کی تعریف، اس کا تجزیہ اور اس پر بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور ڈکٹیٹرشپ اور کمیونزم کے نقائص بیان کرکے جمہوری، کمیونسٹ اور سوشلسٹ نقطہائے نظر کا باہم موازنہ کیا گیا ہے، مصنّف خود جمہوری سوشلزم کے قائل ہیں، لیکن اُن کے تجزیے غیر جانبدارانہ اور بعض خیالات غور و فکر پر مبنی ہیں، مجموعی حیثیت سے موجودہ دنیا، اور اس عہد کے حالات و تبدیلیوں کے متعلق یہ بڑی معلوماتی کتاب ہے، اور ترجمہ بھی سلیس ہے،

حمید نظامی، مرتبہ جناب شورش کاشمیری صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ صفحات ۱۱۲ مجلد مع گردپوش، قیمت :- ۲۵ پیسے ۶ پتہ :- مطبوعات چٹان ۸۰ میکلوڈ روڈ لاہور،

آغا شورش کاشمیری مدیر چٹان نے اس کتاب میں مشہور پاکستانی صحافی اور روزنامہ نوائے وقت کے اڈیٹر حمید نظامی مرحوم کے متعلق اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات تحریر کئے ہیں، ان کی سیرت و کردار، اُن کی خصوصیات اور زندگی کے نمایاں پہلوؤں مثلاً صحافتی کمالات، تحریک پاکستان کی حمایت، جرأت و بیباکی، خودداری، مروّت و حسن و سلوک مظلوموں سے ہمدردی، حریفوں سے چشمک، ارباب اقتدار سے چپقلش، اُن کے شب و روز کے مشاغل کی تصویر کھینچ دی ہے، آغا صاحب کے مصور و مرقع نگار قلم نے ایک داستان میں کئی اور داستان بھی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ایک مکمل [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] اردو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ملاوی ہیں، انھوں نے حمید نظامی کی سرگذشت کا یہ خاکہ گذشتہ سال اپنی اسیری کے زمانہ میں ہفتہ عشرہ کے اندار تجالاً قلمبند کیا تھا، اس لئے اس میں بڑی بے ساختگی اور برجستگی، اور ان کی پرزور انشار کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں،

بارشِ رحمت و باران رحمت: ازجناب مولوی سلمان احمد صاحب ہلالی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت بالترتیب عہ، و ۵۰ پیسے،

پتہ: نظامی بک ایجنسی بدایوں - یو-پی،)

یہ دونوں مجموعے مولوی سلمان احمد صاحب ہلالی وکیل بدایوں کے فکرِ سخن کا نتیجہ، اور اور قصائد نعت ومنقبت پر مشتمل ہیں، اس میں مصنف نے اخلاص وعقیدت کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وکمالات کی مصوری بھی کی ہے،

،کلام کا معیار معمولی اور طرز بیان سادہ ہے،

اللہ میاں کا جادو مرتبہ مولانا ابراہیم عمادی صاحب متوسط تقطیع صفحات
اخلاقی کہانیاں بالترتیب ۶۸، ۱۱۴، ۱۰۴، کاغذ، کتابت وطباعت
بچّوں کی شہریت بہتر، قیمت: ۵۰ پیسہ و ۶۲ پیسہ و ۶۲

پتہ: صدیقیہ بک ڈپو بھنڈی بازار بمبئی ۳

لائق مصنف ایک تجربہ کار معلم ہیں، انھوں نے بچّوں کی اصلاح وتربیت اور بنیادی ضروری معلومات کے لئے اُن کے مذاق اور طبیعت کے موافق نہایت دلچسپ زبان اور آسان انداز میں کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، یہ تینوں کتابیں اسی سلسلہ کی ہیں، پہلی کتاب میں قدرت کے مختلف کرشموں، بادل، بارش، ہوا، سورج اور نباتات وغیرہ کے علاوہ گاؤں، عجائب خانے اور قومی ومذہبی تہواروں کے متعلق بچّوں کے لئے مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں، دوسری کتاب

[illegible]

[illegible] ہو سکتا ہے [illegible]

[illegible] ثقافتی تعلقات کی داستان [illegible]

نتیجے میں بدگمانی پیدا ہو جانے کا احتمال ہے [illegible] ہندوستان کے [illegible] کروڑ مسلمانوں کے [illegible]

[illegible] ہو جائیگا کہ یہ زبان اسلیے نظر انداز کر دی گئی ہو کہ یہ ان کی مذہبی زبان سمجھی جاتی ہے۔

اس کمیشن کو فارسی زبان بھی اپنی فہرست میں شامل کرنی چاہیے تھی۔ ہندوستان کا بہت بڑا دوست افغانستان ہے جس کی علمی، ثقافتی اور سیاسی زبان فارسی ہی ہے۔ اس سے دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں فارسی زبان کی تعلیم مفید اور مؤثر ہوگی۔ ہندوستان اور ایران کے تعلقات بھی قدیم زمانہ سے قائم ہیں۔ ایرانی تہذیب و تمدن کے آثار ہندوستانی زندگی کے مختلف شعبوں میں نظر آتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے لیے فارسی اجنبی ہو گئی تو اس کے [illegible] اور اس کا جو ادبی اور تہذیبی سرمایہ ہے وہ ہماری آئندہ نسلوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو جائے گا جو ہندوستان کے [illegible] کے لیے ایک دردناک حادثہ ہوگا۔

[illegible] ہندوستان کے [illegible] میں فارسی زبان و ادب پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اس [illegible] ہندوستان کے اندر جتنا [illegible] ادب پیدا ہوا اس پر زیادہ توجہ [illegible] ہندوستان کے [illegible] فارسی ادب [illegible]

میں چند بڑے پیغمبروں اور ہندوستان کے بعض سادھوسنتوں کے قصے، مہاراشٹر کے بعض نیول اور بمبئی کے مخیر لوگوں کا ذکر ہے، تیسری کتاب میں اسکول، پنچایت، گاؤں پنچایت، میونسپلٹی ناؤپو پنشن صوبائی اسمبلیوں، بمبئی کے نظم ونسق، اور تمدن وشہریت وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں، ہر کتاب میں ضروری، مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی آداب سے بچوں کی واقفیت کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اس حیثیت سے ان کتابوں میں مذہب، اخلاق، معاشرت، سائنس، جغرافیہ، شہریت اور تمدن وغیرہ کے متعلق گوناگوں قسم کے ضروری اور مفید معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں، اور بچوں کے ذہن کو بار سے بچانے کے لئے مکالمہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے، یہ تینوں کتابیں بچوں کے لئے نہایت مفید اور اُن کے کورس میں شامل کئے جانے کے لائق ہیں،

تفسیر المعوذتین: از حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مترجمہ مولانا حمید الزماں کیرانوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، وطباعت، عمدہ، صفحات ۵۲، قیمت: عمر، مجلس معارف القرآن دار العلوم دیوبند،

مجلس معارف القرآن دیوبند نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی تصنیفات کی اشاعت کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے، یہ رسالہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں حضرت نانوتوی کے فارسی رسالہ "اسرار قرآنی" کے ایک حصہ کا جو معوذتین کی تفسیر کے متعلق تھا، عربی میں ترجمہ کیا گیا، رسالہ استعاذہ کی حقیقت، مستعاذ بہ اور مستعاذ منہ کے متعلق لطیف اسرار و نکات پر مشتمل ہے، شروع میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مصنف کے حالات و کمالات تحریر فرمائے ہیں،

"ض"

مضامین

[illegible]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

ابھی کئی سال پہلے حکومت ہند کی طرف سے ایک تعلیمی کمیشن مقرر ہوا تھا، اس کی رپورٹ کو [illegible] کے نام سے شائع ہو گئی ہے، اس کی تعریف بھی ہو رہی ہے اور اس پر تنقیدیں بھی جاری ہیں، جناب آصف فیضی صاحب سابق سفیر متحدہ عرب جمہوریہ کا ایک مراسلہ اسٹیٹسمین کلکتہ میں شائع ہوا ہے جس میں [illegible] یہ توجہ دلائی ہے کہ اس رپورٹ میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، روسی، جاپانی، اسپینی اور چینی زبانوں کی تعلیم کے لیے تو سفارش کی گئی ہے لیکن ان زبانوں کے ساتھ جدید عربی کا نام نہیں ہے [illegible] ہے، جاپانی، اسپینی اور چینی زبانوں سے زیادہ حق جدید عربی کا ہے۔

جناب آصف فیضی نے جدید عربی کے حق میں بہت سے دلائل پیش کیے ہیں، یہ ریڈیو، پریس [illegible] پارلیمانی ایوانوں اور اہم تصانیف کی زبان ہے، یہ ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کی تہذیبی [illegible] ہے، یہ ادارۂ اقوام متحدہ کی پندرہ ریاستوں کی زبان ہے، یہ ادارہ بین الاقوامی مسائل کو [illegible] زبانوں میں ترجمے کراتا ہے، ان میں ایک زبان جدید عربی بھی ہے، اس زبان کے ذریعہ [illegible] فلسفہ، مذاہب عالم، معاشرتی سائنس، لغات، سائنس [illegible] ہیں جن سے جدید علم و ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، [illegible] عرب ممالک کی سیاسی، علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کی روز افزوں [illegible]

مقالہ

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے عنوان سے محترم [illegible] صاحب کا ایک [illegible] [illegible] میں شائع ہوا تھا۔ نظامی گنجوی کی مثنوی مخزن الاسرار [illegible] کے نام سے [illegible] صاحب نے اس مضمون میں ثابت کیا ہے [illegible] المعروف [illegible]

[illegible]

[illegible] صاحب فرہنگ نے مختلف لغات کے ذیل میں یہ اشعار بطور شواہد [illegible]
خود مؤلف نے آخری باب (چلیپیم) کا عنوان یہ قائم کیا ہے: "در الفاظ ہندوی کہ در نظم بکار [illegible]
کے ساتھ ساتھ اس مضمون میں مؤلف ہذا کی دوسری کتاب شرح مخزن الاسرار پر بھی گفتگو کی ہے۔
اور یہ بتایا ہے کہ شرح "مخزن الاسرار" کا مؤلف وہی ہے جس نے زبدۃ الفضائل لکھی ہے۔ اور شرح پر بحث
کرتے وقت یہ ثابت کیا ہے کہ نولکشور پریس میں یہ کتاب غلط نام سے شائع ہوئی۔ ظہیر الدین کسی ظہوری
اس کا مؤلف نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے یورپی مستشرقین اسپرنگر، ایتھے، ریو وغیرہ کا [illegible]
کی طرف اشارہ کیا ہے جنھوں نے اس فرہنگ کو گیارہویں صدی ہجری کا بتایا ہے، اور یہ ثابت
کرنے کی ناتمام کوشش کی ہے کہ محمد بن قوام یعنی شارح مخزن گیارہویں صدی کے اواخر کا مؤلف تھا۔
عرشی صاحب نے بھی اپنے مضمون میں ان ہی دونوں باتوں کی وضاحت کی ہے۔ گویا مضمون کا
زیادہ حصہ ان ہی مباحث سے متعلق ہے، جو شیرانی صاحب کا موضوع گفتگو تھا۔ اگر عرشی صاحب کے
پیش نظر شیرانی صاحب کا مضمون ہوتا تو شاید ان کی گفتگو کا انداز بدل جاتا۔ بہرحال عرشی صاحب کے نتائج بھی
وہی ہیں جو شیرانی صاحب کے ہیں لیکن مضمون کے دوسرے حصے میں عرشی صاحب نے دوسرے پہلوؤں پر بھی
گفتگو کی ہے۔ ان کے نزدیک شارح "مخزن الاسرار" محمد فیروز شاہی کا [illegible]
شیرانی صاحب نے اس کے بجائے شارح "مخزن" کی ایک کتاب فرہنگ [illegible]
اور مضمون میں پورا زور اسی فرہنگ کی تشریح [illegible]

---

١ اس غلطی کا احساس [illegible] والوں کو بھی تھا۔ اگر کوشش کے [illegible]
کیونکہ دوسرا نسخہ انھیں نہیں مل سکا۔ دیکھیے [illegible]
[illegible] ہے شرح مخزن [illegible] سے تاریخ تصنیف یعنی [illegible]
ذیل میں موجود ہے۔ فہرست مخطوطات فارسی [illegible]
انھیں کی ذیر [illegible] گیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شرح [illegible] مشکل [illegible]

[illegible] بیانات [illegible] سے [illegible] شرح [illegible]

[illegible] کے [illegible] امام [illegible] کے بیانات اخذ کئے ہیں [illegible] غلطی کی وجہ [illegible]

[illegible] اپنی غلطی [illegible] کے پیش نظر

شرح کا ایک نسخہ [illegible] کے [illegible] پورا کیا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شرح [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ریجہ، اطلاع بہم پہنچائی تھی، یہ ضرور ہے کہ ان کے پیش نظر نولکشور پریس کا مطبوعہ نسخہ [illegible] انتساب دوسرے مولف کی طرف کر دیا گیا ہے، اس بنا پر ان کو غلط فہمی میں پہلے کا ہو جانا [illegible] مستشرقین کے غلط بیانات یقیناً ان کے سامنے تھے، مگر انھوں نے ان سے مرعوب نہ ہو کر صحیح مولف کا نام محمد بن قوام بن رستم بن احمد بن محمود بدر خزانہ بلخی معروف بکرہی اور سالِ تالیف [illegible] کیا ہے، جو بالکل صحیح ہے،

ادھر حال ہی میں لاہور کی پبلک لائبریری میں جو فارسی مخطوطات ہیں، انکی ایک توضیحی فہرست شائع ہوئی ہے، اس میں "بحر الفضائل" کا ایک نسخہ ہے، مگر اس کی وضاحت کے سلسلے میں وہی سب غلطیاں دہرائی گئی ہیں، جو اسپرنگر، ایتھے وغیرہ کے یہاں پائی جاتی ہیں، اس کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ مولف گیارھویں صدی ہجری کے اواخر کا آدمی ہے،

ان ابتدائی امور کے ذکر کرنے کے بعد اب ہم جناب عرشی صاحب کے مضمون کے دوسرے حصے کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں انھوں نے شارح "مخزن الاسرار" اور مظہر کڑہ کو ایک شخص ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ان کے دلائل یہ ہیں:-

۱- دونوں کا زمانہ اور وطن ایک ہے،

۲- کم از کم شرح مخزن الاسرار کے ایک نسخے[2] میں شارح کا نام مظہر بن قوام ملتا ہے،

۳- دیوان مظہر میں جن شعراء کا ذکر ہے ان میں سے اکثر شرح مخزن الاسرار میں [illegible]

۴- شارح مخزن مذکور "نصاب الفضلاء" کا مولف ہے، یہی [illegible] ایک کتاب [illegible] ہے، جو مظہر کی بتائی گئی ہے، دونوں کے ایک ہونے کے [illegible]

۵- مظہر کڑہ نے حضرت نظام الدین اولیاء کے جو کسی بزرگ [illegible]

[1] ج ۳ ص ۵۰۹ - ۵۰۸ [2] مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے [illegible] دفتر اسلام پشاور کے کتب خانہ میں تھا، اس میں اس کا نام [illegible] بحار رستم الکرہی ہے،

[illegible] شخص معلوم نہیں۔

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] ہے۔

(۱) [illegible] ایک [illegible]

[illegible] کے حساب سے [illegible] معلوم ہو چکا ہے۔

۱۔ کتابخانۂ [illegible]، دو نسخے، ایک مختصر (نمبر [illegible]) دوسرا ناقص الاول (نمبر [illegible])

۲۔ [illegible] لائبریری، تین نسخے، ایک کامل، دو ناقص،

۳۔ [illegible] لائبریری، ایک نسخہ، ناقص،

۴۔ دانشگاہ تہران، ۳ نسخے، ایک کتابخانہ مرکزی (نمبر [illegible]) دوسرا [illegible]

کتابخانہ [illegible] اور تیسرا [illegible]

۵۔ [illegible] ایک نسخہ کامل [illegible]

ان [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سے اس بحر کی تصنیف کے سال سمبت کے بیان [illegible] ہے:

"و تاریخ ایشان از جلوس راجہ بکرماجیت است در این [illegible]

یکہزار و چہار صد و دو سال [illegible]"

ان دونوں بیانوں میں اس فرہنگ کی تاریخ ہجری کے اعتبار سے [illegible] اور سمبت کے [illegible]

[illegible] ہے، [illegible] ہجری [illegible] عیسوی کے مطابق ہے [illegible] سمبت کا [illegible]

سے تطبیق ہوتی ہے۔ آجکل [illegible] سمبت ہے [illegible] میں فرہنگ [illegible] گیا [illegible]

[illegible] سال قبل [illegible] میں [illegible] کی تفریق سے سال عیسوی [illegible] ہو جاتا ہے۔

اس سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ یہ کتاب [illegible] سال شمسی [illegible] سال قمری [illegible] تصنیف

اس کتاب کی تاریخ تالیف دو جگہ بیان ہوئی اور دونوں جگہ غلط ہے۔ ڈاکٹر شہریار

نقوی نے اپنی کتاب "فرہنگ نویسی" میں لکھا ہے: "ولی چنانکہ در شرح مخزن الاسرار [illegible]

قوام اشارہ شدہ و فرہنگ مزبور در سال [illegible] نوشتہ شدہ است [illegible] شرح [illegible]

کا ذکر مطلق نہیں، بلکہ خود اس شرح میں [illegible] شد [illegible] اس کی [illegible]

مشمول ہے۔ نشریہ دانشگاہ تہران میں [illegible] فرہنگ کی تاریخ [illegible] بتائی گئی ہے

اور فہرست کتابخانہ مرکزی دانشگاہ تہران کا حوالہ دیا گیا ہے، حالانکہ فہرست [illegible]

شرح مخزن [illegible] فہرست کی تاریخ قرار دی گئی [illegible] فرہنگ [illegible]

امور سے واضح ہے کہ فرہنگ [illegible]

تاریخ درج کرنے کے بعد [illegible] صاحب [illegible]

"[illegible] ان کتابوں و شروح و فرہنگ [illegible]"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نباتات [illegible] غلط ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

عمر ۱۲ سال کی ہوگی، بالفاظ دیگر ان دونوں شخصوں کے سنین [illegible]

ثابت ہونے میں مانع ہے۔ پروفیسر شیرانی شرح مخزن کو [illegible] کی تالیف [illegible]

تالیف قرار دیتے ہیں، دو مولف کی دونوں تالیفات کے درمیان [illegible] سال کا فاصلہ [illegible]

اوائل عمر اور دوسری کو اواخر عمر کی تالیف قرار دیتے ہیں جن [illegible] ظاہر ہے کہ مظہر [illegible]

کی پیدائش [illegible] کے قریب ہوئی اور جو [illegible] سے قبل شادی کی دنیا [illegible]

ہو چکا ہو، وہ [illegible] کی تالیف کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ کلام یہ کہ مظہر کڑہ اور شارح مخزن

ایک شخص نہیں ہیں۔

(۲) شارح مخزن اور مظہر کڑہ کے ناموں میں فرق ہے، اول الذکر کا پورا نام محمد بن [illegible]

رستم بن احمد بن محمود ہے، اور مظہر کے اصل نام کا پتہ ہی نہیں، شارح مخزن کے نام میں مظہر شامل

نہیں ہے۔ قریشی صاحب کے پیش نظر ایک نسخے میں اور [illegible] کے ایک اور نسخے میں [illegible]

مظہر ہے، اس کے علاوہ تمام نسخوں میں محمد ہی نام ملتا ہے۔ [illegible] معلوم ہوتا ہے، ایک [illegible]

(۱) شرح کے دو نسخوں کے علاوہ باقی تمام نسخوں میں یہی نام ہے۔

(۳) قاضی ابراہیم تتوی نے بلجکی کی شرح سے بہت استفادہ کیا ہے [illegible]

محمد بلجکی ہی لکھتے ہیں،

(۴) بحر الفضائل کے تمام نسخوں میں مولف کا نام محمد [illegible]

اس سے یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ شارح مخزن کا نام [illegible]

[illegible] جب دو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس عبارت کی [illegible] مختلف نسخوں میں مختلف ہے۔

پیش نظر نسخے میں یہی سہو ہے، مثلاً آصفیہ کتاب خانے کے دو نسخوں (الف) (ب) میں [illegible] دوسرے میں طلوع ہے جو [illegible] کے بیان سے ظاہر ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ شارح مخزن اسرار [illegible] ہم عصر نہیں ہیں، اس بنا پر مطبوعہ نسخے میں "ظہیر" کو چھاپے کی غلطی پر محمول کرنا چاہیے۔ وحشی صاحب نے [illegible] ظہیر نہ پایا گیا ہے وہ ان کی تحقیق کی جگہ ظہیر شارح سے دو صدی متقدم ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ شارح مطہر کو اپنے دور کے اہم فاضلوں میں شمار کرتا ہے۔ اسی بنا پر وہ شاعر سے الگ ہوتا ہے، شارح مخزن اسرار اپنے ایک دوسرے معاصر شیخ ہمدانی کو بھی افضل العصر قرار دیتا ہے۔ اس سے اس قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ "افضل العصر" کاتب کا اضافہ نہیں بلکہ خود شارح کا فقرہ ہے۔

وحشی صاحب نے اس سلسلے میں دوسرے طور پر استدلال کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

میری رائے میں اصل نسخے میں یہ عبارت ہوگی "چہرہ اختر مطہر گوید" کسی ناقل نسخہ نے افضل العصر تمہیداً مطہر گوید لکھا ہوگا، جو صاحب [illegible] سے واقف تھا۔ انھوں نے اس قسم کا تغیر [illegible] کر دیا ہوں [illegible] مصنف کے بیان [illegible] لکھا ہے [illegible] تعظیم [illegible] ہے۔"

[illegible] کے متعلق کچھ مزید [illegible] تمام نسخوں میں

[illegible]

[illegible]

عمر ۱۲۱ سال کی ہوگی، بالفاظ دیگر ان دونوں شخصوں کے درمیان عمروں کا تفاوت [illegible] ایک ثابت ہونے میں مانع ہے، پروفیسر شیرانی شرح مخزن کو ۱۰۸۸ھ میں تالیف [illegible] کی ابتدا تالیف قرار دیتے ہیں، دو مؤلف کی دونوں تالیفات کے درمیان ۲۲ سال کی مدت [illegible] ایک کو اوائل عمر اور دوسری کو اواخر عمر کی تالیف قرار دیتے ہیں حق بجانب تھا، اس شخص کا [illegible] جس کی پیدائش ۱۰۱۱ھ کے قریب ہوئی اور جو ۱۰۳۰ھ سے قبل شاعری کی دنیا میں [illegible] ہو چکا ہو، وہ ۱۰۸۸ھ کی تالیف کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ خلاصۂ کلام یہ کہ مطہر کڑہ اور شارح مخزن ایک شخص نہیں ہیں،

(۲) شارح مخزن اور مطہر کڑہ کے ناموں میں فرق ہے، اول الذکر کا پورا نام محمد بن قاسم بن رستم بن احمد بن محمود ہے، اور مطہر کے اصل نام کا پتہ ہی نہیں، شارح مخزن کے نام میں مطہر شامل نہیں ہے، عرشی صاحب کے پیش نظر ایک نسخے میں اور [illegible] کے ایک دوسرے نسخے میں محمد کے بجائے مطہر ہے، ان کے علاوہ تمام نسخوں میں محمد ہی نام ملتا ہے، جو صحیح معلوم ہوتا ہے، اس کی صحت کے قرائن یہ ہیں:

(۱) شرح کے دو نسخوں کے علاوہ باقی تمام نسخوں میں یہی نام ہے۔

(۲) قاضی ابراہیم تتوی نے مخزن کی شرح سے بہت استفادہ کیا ہے، وہ بھی شارح مخزن کا نام محمد ہی لکھتے ہیں،

(۳) بحر الفضائل کے تمام نسخوں میں مؤلف کا نام محمد بن قاسم بن [illegible]

اس سے یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ جاتی ہے کہ شارح مخزن کا نام محمد ہے مطہر [illegible] اس لیے جب دونوں نام الگ الگ ہیں تو دونوں کے ایک ہونے کا [illegible]

[illegible] ہیں [illegible]

[illegible] مخزن [illegible]

... اصلاً مظہر گردید ... ہے

افضل مصر بودہ مظہر گردید

اس عبارت کے تیسرے ٹکڑے میں مختلف نسخوں میں اختلاف ہے۔

جیسا کہ پیش نظر نسخے میں ہی ہے، مثلاً انگریزی میں دو نسخے ہیں، ایک میں گردید اور دوسرے میں ظاہر ہے۔ علیگڑھ والے نسخے میں مظہر گردید کے بجائے ظہیر ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ شارح مخزن اور ظہیر یا ہم عصر نہیں ہیں۔ اس بنا پر علیگڑھ والے نسخے میں "ظہیر" کو چھاپے کی غلطی پر محمول کرنا چاہیے۔ عرشی صاحب نے اس ظہیر فاریابی کے دیوان کی پہچان بتائی کی جبکہ ظہیر شارح سے دو صدی متقدم ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ شارح مظہر کو اپنے دور کے اہم ناموں میں شمار کرتا ہے، اسی بنا پر وہ شارح سے الگ ہو جاتا ہے۔ شارح مخزن اسرار اپنے ایک دوسرے معاصر غیاث ہانسوی کو بھی افضل العصر قرار دیتا ہے۔ اس سے اس قیاس کو مزید تقویت پہنچتی ہے کہ "افضل العصر" کاتب کا اضافہ نہیں بلکہ خود شارح کا فقرہ ہے۔

عرشی صاحب نے اس سلسلے میں دوسرے طور پر استدلال کیا ہے اور وہ لکھتے ہیں:

"میری رائے میں اصل نسخے میں یہ عبارت ہوگی "بندہ احقر مظہر گردید" کسی ناقل نے افضل العصر مولانا مظہر گردید لکھا ہوگا، جو اصحاب عربی زبان سے ناواقف ہیں انہوں نے اس قسم کا غیر عربی الفاظ کو دیباچوں میں بار بار دیکھا ہوگا کہ مصنف جہاں اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں شاگرد وہیں سے کتاب نقل کرتے وقت تعظیمی الفاظ بڑھا دیتے ہیں۔"

عرشی صاحب کے اس استدلال کے متعلق یہ کہنا ضروری ہے کہ صاحب شرح کے تمام نسخوں میں

[illegible] مخزن ... ۔ ... دیکھئے ... [illegible]

[illegible] ... [illegible]

[illegible] ہو اور یہ فقرہ شارح نے اپنے [illegible]

یہ فقرہ [illegible] سمجھنے پر اصرار، گو درا ستدلال ہے البتہ اس [illegible]

دوسری ہوتی، ورنہ تنہا یہ استدلال صرف [illegible] ہی نہیں بلکہ غلط [illegible]

تفصیلات بالا سے واضح ہے کہ مطہر کو اور محمد کو شارح عرزن [illegible] ایک ہونے کے

قرائن تقریباً بے بنیاد ہیں۔ ذیل میں محمد عرشی صاحب کے دلائل ان قرائن کے [illegible]

پیش کیجاتی ہیں،

میرے خیال میں ان کے دلائل میں کوئی دلیل ایسی نہیں جو خود کفیل ہو۔ اگر [illegible]

ہوتی تو پھر ان کے پیش کردہ قرائن مستحکم اور بڑی حد تک قابل قبول ہوتے لیکن واضح کی شہادت

نہ ہونے سے عرشی صاحب کے پیش کردہ دلائل بے معنی رہ جاتے ہیں، ہم وطن اور ہم عصر ہونا ایک ہونے

کی دلیل ہو سکتی ہے، بشرطیکہ نام بھی ایک ہو، باپ دادا اور خاندان کے دوسرے افراد بھی ایک ہوں

اگر یہ آخری چیز نہ ہو تو ہم وطن اور ہم عصر ہونا بے معنی ہے، ایک جگہ اور ایک [illegible]

آدمی رہتے ہیں، سب ایک نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان لاکھوں آدمیوں میں اگر کوئی دو ایسے ہوں

جن کا نام ایک ہی ہو[1]، ان کے باپ دادا کا بھی ایک ہی نام اور لقب ہو تو [illegible]

ایک ہونے کا قوی قرینہ ہوگا، محمد عرشی صاحب نے شارح [illegible]

ایک ہونے پر کوئی قابل ذکر بحث نہیں کی، انھوں نے محض ایک [illegible]

قرار دیا، اور اس ترجیح اور انتخاب کی تائید میں کوئی ایسی [illegible]

استدلال میں کوئی وزن باقی نہیں رہتا۔ جیسا کہ ہم [illegible]

کا نام مطہر نہیں محمد تھا، اس کا پورا ثبوت شرح کے مختلف [illegible]

---

[1] محض نام کا ایک ہونا کافی نہیں، اس لیے کہ ایک ہی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بعض شارحوں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
کتاب ہی دیکھ کر ذہن کر اس کے مندرجات ہی کا علم ہے، تو پھر اس کا کسی اور کتاب [illegible]
[illegible] ہے، اس لیے قابل ترک ہے۔

[illegible] رکن الدین ابوالفتح [illegible] شرح [illegible] اس طرح ذکر [illegible]:

"[illegible] رکن الحق والدین ابوالفتح قدس اللہ سرہ العزیز

[illegible]:"

[illegible] ان دونوں کے ایک [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

اسی طرح شارح اور شاعر دونوں کی شاعری و علمی فضیلت میں شرکت سے دونوں کا ایک ہونا کیونکر لازم ہوگا، یہ استدلال بھی بغیر کسی مستند دلیل کے بے بنیاد ہے،

خلاصہ یہ کہ عرشی صاحب کے یہاں کوئی مضبوط دلیل نہیں، انھوں نے سرے سے اہم بحث کو کہ شاعر اور شارح دونوں کا ایک ہی نام تھا تشنہ چھوڑ دیا ہے، اس کی بنا پر ان کے سارے قرائن ضعیف اور قابل ترک ہو جاتے ہیں، جب نام ہی الگ ہوں تو پھر ایک ہونے کا کیا ذکر، اس کے برخلاف راقم سطور کے نزدیک مظہر کڑہ اور شارح مخزن الاسرار کے دو الگ الگ شخص ہونے کے زبردست قرائن موجود ہیں، دونوں کے نام الگ ہیں، شارح اپنا نام مع آبا و اجداد کے نام کے ہر جگہ ذکر کرتا ہے، مظہر کے پورے دیوان میں اس تخلص کے سوا کچھ اور نہیں ملتا، پھر دونوں کی عمروں میں تفاوت ہے، اور آخری بات یہ کہ شارح مظہر کا ذکر اس طرح کرتا ہے کہ وہ الگ معلوم ہوتا ہے،

اب عرشی صاحب کے بعض ایسے امور کی طرف توجہ کی جاتی ہے جو موضوع سے براہ راست متعلق نہیں، مگر ضمنی طور پر ان پر گفتگو ہو چکی ہے،

۱- وہ بدر خزانۃ البلخی کو بدر الدین البلخی سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک بدر خزانہ کتابت کی غلطی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:[1]

"بدر الخزانۃ کے بارے میں میری رائے یہ ہے کہ یہ شارح کا لقب ہے جو اصل میں بدر الدین تھا، موجودہ نسخوں کے متعدد مقامات پر الدین کو خط کی شباہت کے باعث الخزانہ یا الخزانۃ پڑھا گیا ہوگا، اس کے بعد یہی لفظ مروج ہو گیا۔"

عرشی صاحب کا استدلال اس لیے کمزور ہے کہ قطع نظر اس امر کے کہ بدر خزانہ [illegible]

[1] معارف اگست ۱۹۷۱ء ص ۹۹

مخزون بدر المحرّمہ ... پر انتساب ... کے نسخوں میں ایک قرات ملتی ہے جو ... قرآن ...

کے ... تا ... تھا، اور ان کا خیال ہے کہ شیخ ... مصنف ... کے ...

... سے ... نسخہ ... معلوم ہوتا ہے ...

کا لقب نہیں مگر مصنف ... میں نقل ہے ... وہ تمام خصوصیات

جو ... کے نسخے ... میں ... موجود ہیں

ایسے قدیم نسخے ہیں بدر المحرّمۃ ہے، اس کے علاوہ مشارق مخزن الاسرار اور مولف بحر الفضائل

صاحب فضل الدین تھا نہ بدرالدین، یہ لقب ان دونوں کتابوں کے متعدد نسخوں میں موجود ہے، ان

دونوں کی بنا پر یہ صحیح ہے کہ بدر المحرّمہ بدرالدین کی غلط خوانی کا نتیجہ ہے نہ یہ کہ بدرالدین مولف

کا لقب تھا۔

(۲) مولانا جمال الدین ہتابی کے بجائے مولانا جمال الدین اسنابی ہونا چاہیے، یہ اپنے عہد

کے نامور عالم اور شاعر تھے، ان کی مدح میں مطہر کڑہ نے ایک قصیدہ لکھا ہے، جو قصیدے

راقم الحروف کو دستیاب ہو چکے ہیں، جو فکر و نظر اپریل ۱۹۶۵ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

(۳) محمد تغلق شاہ نے جو شہر کا نام خوشگاہ تجویز کیا تھا، حسنی صاحب کو اس وقت تاریخوں میں

وہ نہیں ملا تھا، مگر حافظ محمود شیرانی صاحب نے شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی (ص ۱۱۱)

سے یہ نقل کیا ہے۔

... ج ۲ ص ... جہان ... میں ... سواد ...

۱۔ دیکھیے رسالہ فکر و نظر بابت ۱۰ اپریل ۱۹۶۵ء ۲۔ دیکھیے فہرست کتاب خانہ ...

... شعرا ... ظاہر ہوتا ہے کہ ...

... جمال الدین ... است و ...

...

[illegible] موجود تھا [illegible] پہلے سے فارسی ادب میں خورنگاہ [illegible] تھا [illegible]

[illegible] خورنگاہ [illegible] معنی میں خورنگاہ [illegible]

[illegible] نے خورنگاہ [illegible] خورنگاہ [illegible]

[illegible] ابن تحتہ [illegible] شعر [illegible]

تابش رخسار تو داد بر شب چشم — کہ خورنگاہ دل [illegible]

[illegible] گوید : از طلعت فروش خورنگاہ [illegible] شعر [illegible]

گلی صحن چو خورنگہ اوست — کہ [illegible] اوست

واضح ہو کہ خاقانی اور عمید دونوں محمد شاہ تغلق سے پہلے کے ہیں۔ عمید [illegible]

مولف فرہنگ رشیدی نے خورنگاہ کو غلط بتایا ہے۔ وہ لکھتا ہے (جہانگیری) "خورنگاہ [illegible]

[illegible] خورنگاہ [illegible] خورد نگاہ چنانکہ بیاید" [illegible] لکھتا ہے : "خورنگہ [illegible]

خورد و خورنق معرب آن ، و بعضی گفتہ اند مخفف خوردنگاہ ، پہ [illegible] طعام [illegible]

جای طعام خوردن [illegible] بود بنا براں خورنگہ می گفتند کہ در آں طعام می خوردند ...... [illegible]

[illegible] کہ در خورنگہ دولت کنی طعام [illegible] — [illegible]

[illegible] گوید : [illegible] دیدہ [illegible] شعر [illegible]

رشیدی نے [illegible] تفصیل پیش کی ہے اس سے خورنگہ اور خورنگاہ [illegible]

اس دعوی کہ خورنگاہ غلط ہے کوئی ثبوت نہیں [illegible]

متقدمین نے یہ لفظ استعمال کیا ہے ۔ اس بنا پر صاحب رشیدی [illegible]

[illegible] ثابت کرنا [illegible] کے [illegible]

[illegible] کے متعلق [illegible] نہیں کیا جا سکتا [illegible]

[illegible] اور محمد بن قوام نے اس لفظ کے سلسلے [illegible]

[illegible]

[illegible] نہیں کہ [illegible] دہلی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

مگر [illegible] ایک قصبہ [illegible] بہت مشہور تھا

[illegible] فرشتہ [illegible] سلطنت اکبری [illegible]

[illegible]

[illegible] کے ساتھ [illegible] غالب [illegible]

کی قصبہ ہونے کے علاوہ [illegible] بھی تھا (دیکھئے مرات سکندری [illegible])

[illegible] بہت [illegible] گجرات [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] سلطنت دہلی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تہذیب کی تشکیل جدید

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

تشکیل جدید میں ایک ذی شعور طاقت ابتدا ہی سے موجود ہے

تشکیل جدید میں ایک ذی شعور طاقت ابتداء سے موجود ہے اور تحت الشعور کی ماہیت و نوعیت میں اسی کی عبادت و اطاعت کا جذبہ ہے، جیسا کہ اس آیت میں اشارہ ہے،

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا	میں نے جن اور انس کو اسی لیے پیدا کیا ہے
لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات - ۲)	کہ وہ میری عبادت کریں۔

اگر تحت الشعور میں جنسی خواہش یا غلبہ و اقتدار کا جذبہ ہوتا تو وہ دونوں کی آزادانہ تسکین سے سکون و اطمینان حاصل ہونا چاہیے تھا حالانکہ تجربہ و مشاہدہ سے ثابت ہے کہ یہ آزادانہ حرص وہوس کی آگ بھڑکا کر انسان کو زیادہ پریشان و غیر مطمئن بنا دیتی ہے، اس کے برخلاف عبادت و اطاعت سے جو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ اس قدر قطعی و یقینی ہے کہ خود فرائڈ نے بھی عابدوں اور زاہدوں کی عبادت و ریاضت سے نفس کے مختلف حصوں میں بعد پیدا ہونے [illegible] بعض طبقات کی تسکین اور جزوں سے بھی ہو سکتی ہے، قرآن حکیم میں ہے:

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ	خدا کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے
(رعد - ۴)	[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

(اعراف - ۲۳) | [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

افرایت من اتخذ الٰهه هواه | کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جس نے اپنا

(جاثیہ - ۲۳) | معبود اپنی خواہش کو بنا رکھا ہے

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible] | [illegible]

[illegible]

[illegible]

ختم اللہ علی قلوبھم [illegible]
وعلی ابصارھم غشاوۃ (البقرہ ۷) [illegible]

دوسری جگہ ہے [illegible]

بل طبع اللہ علیھا بکفرھم (نساء ۔ ۲۲) [illegible]

غالباً فرائڈ نے اسی مقام کی تحقیق کی ہے، جس میں ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ [illegible] جنسی خواہش کے بہلانے کا ذریعہ قرار پا سکتے ہیں

[illegible] کی سراغ رسانی کر کے نفسیاتی تکوین [illegible] | یہ ناکامی [illegible] [illegible] انسان کا مقام واضح ہو گا | بھی مغرب کی تحقیقات [illegible]

کے بغیر نہ تہذیب کی نفسیاتی تکوین ٹھیک ہو گی اور نہ کائنات میں انسان کا مقام واضح ہو گا۔

تحقیق کی ابتدا مادہ سے ہوئی اور تین چار سو سال کے بعد [illegible] دریافت ہو گئی ہے جس کی حقیقت ماوراے مادہ ہے

لیکن چونکہ ابھی ماوراے مادہ پرواز کی کوئی صورت [illegible] شاید موہوم اور دھندلی شکل میں ہے۔ اور اس کے بغیر نفس انسانی [illegible] ہیں۔

نفس انسانی کی مثال تاریک کوٹھری جیسی ہے [illegible] سے کام نہیں چل سکتا، اگر روشنی کے بغیر تحقیق و سیر [illegible] کی کوشش ہوئی تو بعض [illegible] مگر بعض جستجو کے باوجود نہ مل سکیں گی، پھر جو چیزیں گرفت [illegible] ہو جائے گی اور بعض خلاف حقیقت رہ جائیں گی۔ یا خلاف حقیقت [illegible]

تشکیل جدید میں اس دور کا [illegible] | تشکیل جدید میں یہ "قرآنی" [illegible]
سرچشمہ باران [illegible] ہے | ہر شئی کا [illegible]

یہ بات کہ انسانی تخلیق میں نقص نہیں [illegible] ایک [illegible] کے ساتھ منتظم کیا ہے
[illegible] ہے جس کا استدلال [illegible] ہے۔ قرآن حکیم میں ہے

الذی خلق الموت والحیٰوۃ	جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا

دوسری جگہ ہے

قل یحییہا الذی انشاہا اول	آپ کہہ دیجئے ان کو وہ زندہ کرے گا جس نے
مرۃ (یٰس)	پہلی بار ان کو پیدا کیا ہے

یہی ذات جو خالق ہے وہ مخلوق کی ہدایت کا فرض بھی انجام دیتا ہے۔ فرعون نے جب موسیٰ علیہ السلام

سے سوال کیا

فمن ربکما یموسیٰ (طٰہٰ۔ ۴۹)	اے موسیٰ تم دونوں کا رب کون ہے؟

موسیٰ نے جواب میں خصوصیت کے ساتھ ان دونوں صفتوں کا ذکر کیا

قال ربنا الذی اعطی کل شیء خلقہ	موسیٰ نے جواب دیا ہمارا رب وہ ہے جس نے
ثم ہدیٰ (طٰہٰ)	ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی اور راہ بتائی۔

اور ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا

الذی خلقنی فہو یہدین	رب وہ ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی
(الشعراء ۷۸)	میری ہدایت کرتا ہے۔

ایک جگہ ہے

الذی خلق فسوّیٰ والذی قدر	جس نے سب کو بنایا پھر ٹھیک کیا اور
فہدیٰ (الاعلیٰ)	جس نے ٹھیک اندازہ کیا اور راستہ بتایا۔

[illegible]

ثم سوّاه ونفخ فيه من روحه وجعل — پھر [illegible]
لكم السمع والابصار والافئدة — اپنی روح پھونکی [illegible]
(سجدہ-۱) — کان آنکھ اور دل بنائے

دوسری جگہ ہے

فاذا سويته ونفخت فيه من روحى — پھر جب میں انسان کو ٹھیک کر لوں اور
فقعوا له سجدين — اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم
(حجر-۱) — (فرشتے) سجدہ میں گر پڑو۔

فطرت ربانی توانائی کا مظہر ہے جس نے انسان کی اصل نورانی بنا دی

تحت الشعور، حیات اور روح حیات کی دریافت کے بعد نفسیاتی فکر میں ایک ربانی توانائی کی کارفرمائی مسلم ہو جاتی ہے اور انسان کے اصل شمائل کی تعیین میں زیادہ دشواری نہیں رہتی۔

مذکورہ فطرت اسی ربانی توانائی کا مظہر ہے جس نے انسان کو "نورانی" بنا دیا اور اس کی جہت میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی، اور انسان کے ذرائع علم، تجربات و مشاہدات میں محدود نہیں رہ گئے بلکہ مغیبات کے نام سے فیضان علم کا ایک مستقل سرچشمہ کھل گیا۔

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں:

طرق العلم ثلاثة الاخذ من — علم کے تین راستے ہیں محسوسات سے علم حاصل کرنا
المحسوسات والانتقال من المعلوم — اور معلوم سے [illegible]
الى المجهول والتلقى من الغيب ([illegible]) — غیب سے علم حاصل کرنا۔

انسان کی قیادت عظمیٰ

اس سرچشمہ نے کائنات میں انسان کو جس مقام کی نشاندہی کی ہے [illegible] اور مخلوق اس کی سہیم و شریک نہیں ہے [illegible]

جو زمین میں ... کسی ... یعنی ... اللہ تعالیٰ کی نیابت ... تھا

کہ وہ صفات کے ... ہو

انی جاعل فی الارض خلیفۃ — میں زمین میں نائب مقرر کرتا ہوں۔

اس منصب کے استحقاق کے لیے جن صفات کمال کی ضرورت درکار تھی وہ کسی اور مخلوق کو میسر نہ تھا،

اس لیے اس پیشکش کو قبول کرنے سے ساری کائنات نے انکار کر دیا

انا عرضنا الامانة على السمٰوٰت	ہم نے آسمانوں اور پہاڑوں
والارض والجبال فابين ان يحملنها	کے سامنے امانت پیش کی، ان سب نے
واشفقن منها وحملها الانسان	اٹھانے سے انکار کر دیا لیکن انسان نے
(احزاب - ۱۹)	اس کو اٹھا لیا،

عارفین نے کہا ہے:

"استحقاق انسان مرتبۂ خلافت را بنا بر کمال قابلیت او ست صفات متقابلہ ... کہ مظہر صفات متقابلۂ الٰہی تواند شد ... "

مظہر کے آئینہ میں انسان ہی کا ...	انسان کو اصلی مقام میں متمکن ہونے کے بعد ایک ایسے آئینہ کی ضرورت ہے جس میں اپنے ... عکس ... ہوتا ہو۔

... کے ... کہ ایک آئینہ تو موجود ہے مگر ... اس ... لیے ... کسی ... نہیں ... آئینہ ... انسان ... کے ... اس کے تمام ...

... کرنے میں ... کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

... کے ... کے مطابق انسان کی ساخت ... کے ... اور ...

بروایت کی ہوئی ہے، اور انسانی صلاحیت میں ذہنی طاقت کے علاوہ کسی کردار یا عمل ... کے لیے اخلاقی اقدار کی کوئی اہمیت ہے، بلکہ "صالح" وہ ہے جو فتحیاب ہو کر ... اخلاق و کردار درندے جیسے ہوں، اور غیر صالح وہ ہے جو شکست کھا کر ناکام ذلیل ہو، اگرچہ وہ فرشتہ جیسے صفات سے متصف ہو،[1]

اس اصول سے حیوان و انسان میں شعوری مماثلت ثابت کی گئی ہے، لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس مماثلت میں انسان حیوان کی سطح پر ہے یا حیوان انسان کی سطح پر یعنی اعلیٰ ادنیٰ کے اندر ہے یا ادنیٰ اعلیٰ کے اندر ہے،

جو لوگ انسان کو حیوان کے مماثل مانتے ہیں وہ اقدار و خصائص کو حیوان کے نفسیاتی احوال اور سابقہ عضوی کیفیات سے اخذ کرتے ہیں، یہاں تک کہ ذہنی و فکری قوتوں کو بھی اعضا جسمانی کی تدریجی ارتقا سے ظہور پذیر مانتے ہیں،

اور جو لوگ حیوان کو انسان کے مماثل مانتے ہیں وہ انسانی خصائص و اقدار کو حیوان میں ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، حتی کہ مذہبی جذبات جیسے پاکیزہ احساسات کو بھی کتوں اور بندروں وغیرہ میں تسلیم کرتے ہیں،

| تشکیل جدید میں ادراک مادہ پرواز کا انتظام ہے |

تشکیل جدید کے آئینہ میں ادراک مادہ کا عکس بھی منعکس ہوتا ہے جس بنا پر انسانی قیام و بقا کی صلاحیت کا سب سے ... کی مناسبت سے مادہ سے آگے پرواز کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور ابتدا ہی سے اس کا اہتمام کیا گیا ہے، چنانچہ

(۱) عالم ارواح میں سب سے اس کا عہد لیا گیا ہے

---

[1] حکایت فلسفہ ص ۵۰۷

[illegible]

[illegible]

(۲) ہر ایک کے نیچرل رجحان ... [illegible]

[illegible] ... جیسا کہ ... [illegible]

(۳) فطرت کے اثر سے جبلت میں بھی اس قرآن کی جھلک دکھائی گئی ہے

کل یعمل علی شاکلتہ (بنی اسرائیل) — ہر ایک اپنے شاکلہ پر عمل کرتا ہے۔

ای طریقتہ التی جبل علیہا — یعنی اس طریقہ پر عمل کرتا ہے جس پر اس کی جبلت کی گئی ہے۔

ابتدائی نسل و آبادی کے خطاب میں بھی [illegible]

(۴) انسان کی ابتدائی نسل و آبادی کے خطاب میں پروانہ پر خاص [illegible] کلام مجید کا ارشاد ہے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] انسان کی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

لیریهما سوآتهما انه یراکم	[illegible]
هو وقبیله من حیث لا ترونهم	اور وہ اور اس کا [illegible]
(اعراف - ۳)	[illegible]

جنت میں ٹریننگ کورس کی تکمیل کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب لباس اترنے کے بعد آدم و حوا کو اضطراب ہوا اور دونوں پتوں سے اپنی ستر چھپانے لگے۔

وطفقا یخصفان علیهما من ورق	اور دونوں جنت کے پتوں سے ستر
الجنة (اعراف - ۳)	ڈھانکنے لگے۔

اور اس جرم کے بعد بغاوت و سرکشی کے بجائے عجز و نیاز مندی کی گردن جھکا کر کہنے لگے

ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا	پروردگار ہم نے اپنے اوپر ظلم کیا اگر آپ
وترحمنا لنکونن من الخسرین	ہماری مغفرت نہ فرمائیں گے اور ہم پر رحم
(اعراف - ۳)	نہ کریں گے تو ہم [illegible] خسارے میں [illegible]

چونکہ ماورائے مادہ پرواز میں امن و سکون عنصر روحانی [illegible] کا [illegible] ہوتا تھا، اس لیے ابتدائی خطاب میں پرواز کی رکاوٹ دور کرنے اور حیوانی شعور [illegible] سے بچنے کی [illegible] کی گئی اور احول کو خاص سانچے میں ڈھالنے کیلئے خصوصی اہتمام کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ

یبنی آدم اما یاتینکم رسل منکم	اے اولاد آدم جب تمہارے پاس تم ہی میں سے پیغمبر
یقصون علیکم ایتی فمن اتقی	[illegible]
واصلح فلا خوف علیهم ولا هم	[illegible]
یحزنون	[illegible]
(اعراف - ۴)	[illegible]

مغربی تہذیب کا نقطۂ انتہا جسم انسانی پر ختم ہو گیا ہے

مغربی تہذیب کا انسان زندگی کی ادنیٰ شکل سے جدید آدمی بنا ہے، پہلے وہ بندر تھا، پھر لاکھوں سال کی مشق میں بتدریج ترقی کر کے انسان کی شکل اختیار کی ہے،

جسمانی ترقی کی طرح ذہنی ترقی بھی بتدریج ہوئی ہے، چنانچہ تین ہزار سال پہلے کے انسان کا دماغ بچوں جیسا تھا جس میں قوت تخیل مفقود تھی، پھر رفتہ رفتہ ترقی کر کے انسان عاقل و ناطق کہلانے کا مستحق قرار پایا ہے:[1]

اس توجیہ میں نہ روحانیت کا تصور ہے اور نہ بعد کے کسی ارتقا کا ذکر ہے، اس لیے یہ توجیہ و ارتقا محض جسم انسانی تک محدود ہے اور اسکے آگے ترقی کا کوئی زینہ باقی نہیں رہتا

تشکیل جدید کی ابتدا جسم انسانی سے ہوتی ہے

تشکیل جدید میں بھی ارتقا کی ابتدا جسم انسانی سے ہوتی ہے، لیکن اس کے بعد روحانی ارتقاء کا غیر محدود سلسلہ جاری رہتا ہے، یعنی مغرب کی یہ ماڈل جو انتہائی مقام ہے وہ تشکیل کا نقطۂ آغاز ہے اور جس جگہ مغرب کی سرحد ختم ہوتی ہے، اسی جگہ سے تشکیل کی ابتدا ہوتی ہے، اسکے لیے مختلف قسم کے استدلالات کا ثبوت ملتا ہے۔ مثلاً

(۱) انسان کو عقل و تجربہ کی رہنمائی عطا ہوئی ہے اور حقائق اشیاء کا علم دیا گیا ہے،

وعلّم آدم الاسماء کلھا (بقرہ ۳۱) اور آدم کو "الاسماء" کا علم سکھایا۔

مفسرین نے "الاسماء" کے مختلف معنی بیان کیے ہیں، ان میں زیادہ مناسب اشیاء کے حقائق و خواص ہیں،[2]

اس طرح علم سے جو علم مراد ہے جس سے صلاحیت کی طرف اشارہ ہے

علماً اجمالیاً لیس المراد العلم التفصیلی علم سے اجمالی مراد ہے نہ کہ تفصیلی

[1] تدریجی ارتقاء ... ص ... [2] تفسیر مظہری ج ۱ ص ... [3] تفسیر مظہری ص ۵۱

عقل و تجربہ کی رہنمائی اور علم کی بدولت ساری چیزیں انسان کے آگے سرنگوں کر دی گئی ہیں بلکہ انسان کو اس میں تابع بنانے کی اہلیت بخشی گئی ہے،

وسخر لكم ما في السموت وما في الارض جميعاً منه (جاثیہ - ۲) — اللہ نے آسمان و زمین کی ساری چیزیں تمہارے لیے تابع فرمان کر دیں

عالم غیب کے ادراک کیلئے محسوسات کی صلاحیتیں ناکافی ہیں

(۲) ایک اور عالم سے روشناس کرایا گیا جس کے لیے محسوسات کی صلاحیتیں ناکافی ہیں، اور وہ عالم غیب ہے،

عالم الغيب والشهادة هو الرحمن الرحيم (حشر - ۲) — اللہ غیب اور شہادت کو جاننے والا ہے وہ بے حد مہربان اور نہایت رحم والا ہے،

عالم غیب کی چیزیں خلاف عقل نہیں بلکہ ماورائے عقل ہیں، یعنی اگر محسوسات کے ادراک کیلئے عطا کیے ہوئے علم و عقل عالم غیب کے ادراک سے قاصر ہیں، تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، اس لیے کہ عالم غیب ان کے حدود سے باہر ہے، اور کسی چیز کا علم و ادراک نہ ہونے سے اس کے وجود کا انکار کرنا کوئی عقل کی بات نہیں،

انسان کی یہ عادت ہے کہ جس چیز کو وہ سمجھ نہیں سکتا اس کو جھٹلانے پر آمادہ ہو جاتا ہے، حالانکہ بہت سی چیزیں انسانی علم و عقل سے ماوراء ہوتی ہیں اور جو چیزیں حق کی صورت میں بھی ہوتی ہیں ان کو ایک شخص یا ایک زمانہ کی علمی و عقلی بساط ان کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے جبکہ دوسرے شخص کے نزدیک یا دوسرے زمانہ میں وہ مسلمات میں شمار ہوتی ہیں،

ایسی حالت میں کسی شے کے عدم ادراک کو اس کے نہ ہونے کی دلیل تصور کرنا بڑی نادانی ہے، قرآن حکیم میں ہے،

بل كذبوا بما لم يحيطوا بعلمه ولما — مگر جس چیز [illegible]

یاایہا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب — تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ ان لوگوں پر

علی الذین من قبلکم (بقرہ) — جو تم سے پہلے ہو گزرے فرض کیے گئے تھے

خدا تعالیٰ پر ایمان | ایمان کی وہ تفصیل جو آیت بالا میں بیان کی گئی ہے اس کا حصہ کیا ہے ایمان لانا ضروری ہے
ایمان کا محور ہے | جس میں سب سے زیادہ اہم ربانی توانائی ہے، اور جو قرآن کی تکوین میں دخیل ہے،

اس کے بعد اس پر ایمان لانا سب سے مقدم ہے، وہی سب سے تعالیٰ کی غیر محدود ایک طاقت ہے، اور قرآن کی تکمیل اسی کی تکمیل ہی سے عبادت پیدا ہوتی ہے۔

ربانی توانائی کے صفات کیا ہیں | یہ ربانی توانائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، اس کا علم سب پر محیط اور اس کی رحمت ہر شے کو وسیع ہے، اس کی طاقت سب پر غالب اور اس کی حکومت سب پر حاوی ہے، اس کی ہدایت سب کو عام اور اس کی ربوبیت سب پر یکساں ہے،

جیسا کہ خود قرآن حکیم میں ہے

الحمد للہ رب العالمین الرحمن — سب تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جو سارے

الرحیم مالک یوم الدین — جہانوں کا پالنے والا ہے، بڑا مہربان نہایت

(سورہ فاتحہ) — رحم والا بدلے کے دن کا مالک ہے۔

وہ ہر صفت میں [illegible] کسی کی محتاج نہیں ہے، ایک وہی سب سے بے نیاز ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں [illegible]

قل ہو اللہ احد اللہ الصمد [illegible] لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ

کفوا احد (اخلاص) — اور وہ ہے اور اس کا کوئی ہمسر نہیں

[illegible]

لیس کمثلہ شیء وھو السمیع البصیر (شوریٰ - ۲)

اس کے مثل کوئی چیز نہیں ہے وہ سننے والا دیکھنے والا ہے،

اس توانائی کی طرف پرواز کے لیے انسان میں ایک کھڑکی موجود ہے

اس توانائی کی طرف پرواز کے لیے ابتدا ہی سے ایک کھڑکی کھلی ہوئی ہے جس کا نام روح ہے،

یہ روح کیا ہے؟ اس کے بارے میں بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ ماورائے مادہ پرواز کے لیے ایک کھڑکی ہے، جو انسان میں موجود ہونے کے باوجود جسمانی و حیوانی صفات سے منزہ ہے،

ویسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی (بنی اسرائیل - ۱۰)

یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے"

اس توانائی پر ایمان سے انسان خود کو پا لیتا ہے

اس توانائی پر ایمان سے انسان خود کو پا لیتا ہے، جس کو ہزاروں سال کی جستجو کے باوجود نہیں پایا جا سکا۔

پھر خود کو پانے کے بعد انسان کا دائرۂ کار مادی دنیا تک محدود نہیں رہتا، بلکہ اس کی پرواز کے لیے ماورائے مادہ ایک اور عالم درکار ہوتا ہے جس کے مقابلے میں یہ دنیا نہایت حقیر اور کمتر ہے۔

مغربی تہذیب میں دنیوی زندگی حیات و ارتقاء کی آخری کڑی ہے

مغربی تہذیب میں دنیوی زندگی کو حیات و ارتقاء کی آخری کڑی قرار دیا گیا ہے جس کے بعد [illegible]

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے عقائد و تصورات اور افکار و نظریات [illegible] دنیا تک محدود ہو گئے ہیں، اس کے علاوہ کسی اور عالم کا کوئی تصور نہیں [illegible] پرواز کے لیے کوئی راستہ،

گویا انسان اپنے بارے میں جس مقام پر چودہ سو سال پہلے [illegible]

اور علم کی روشنی پھیلانے کے بارے میں جہل کی تاریکی کو دور کرنے میں ابتک کامیاب نہیں ہو سکا ہے۔
جیسا کہ دورِ جاہلیت کا عقیدہ تھا۔

وقالوا ما هي الا حياتنا الدنيا	یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی صرف
وما نحن بمبعوثين (انعام ۲۹)	دنیا کی ہے اور ہم دوبارہ نہ اٹھائے جائینگے۔

دوسری جگہ ہے :

وقالوا اءذا كنا عظاما ورفاتا	یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم ہڈیاں اور
ءانا لمبعوثون خلقا جديدا	چورا چورا ہو جائیں گے تو کیا از سرِ نو
(بنی اسرائیل ۔ ۵۰)	اٹھائے جائیں گے

تشکیل جدید ایک اور زندگی و عالم کا ثبوت

تشکیل جدید میں ایک اور زندگی پر جس کا نام حیات اخروی ہے اور ایک دوسرے عالم پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے جس کا نام عالم آخرت ہے
ان دونوں تک پہنچنے کے لیے ایک پل سے گذرنا ضروری ہے، جس کا نام موت ہے،

الموت جسر الى الحياة	موت ایک پل ہے دوسری زندگی
الاخروية او كما قال	کی طرف جانے کے لیے

اس طرح زندگی میں ایک تسلسل ہے، جو موت پر ختم نہیں ہوتا ہے، بلکہ ایک منزل کے بعد موت سے دوسری منزل شروع ہوتی ہے،

یہ منزل غیر واقف اور اجنبی نہیں ہے، بلکہ انسان اس سے شناسا ہے، وہ ایک دن اس کا قرآن نے ذکر کیا ہے،

كيف تكفرون بالله وكنتم امواتا	تم اللہ کیسے انکار کرتے ہو حالانکہ تم
فاحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم	بے جان تھے اس نے زندگی دی پھر موت

[illegible] ترجعون (بقرہ-۲۸)   پھر تم زندگی دیئے جاؤ گے پھر اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے

یہ منزل ادبیات کی نہیں بلکہ ماورائے مادہ معنویات کی ہے، یہاں بھی انسان کے اچھے برے اعمال کے اچھے برے خواص و نتائج اسی طرح ظاہر ہوں گے جس طرح دنیا میں چیزوں کے خواص اور حوادث کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔

جزاء بما کانوا یعملون (سجدہ-۱۷)   یہ ان کے اعمال کا بدلہ ہے۔

یہ اچھے برے اعمال ریکارڈ ہوتے رہتے ہیں، جن کے خواص و نتائج کا ظہور ہوتا ہے،

وان علیکم لحفظین کراما کاتبین   اور بیشک تم پر نگہبان مقرر ہیں، عزت والے

یعلمون ما تفعلون (انفطار-۱۰)   عمل لکھنے والے، جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو

مغرب کے ذرائع علم محسوسات تک محدود ہیں

بدقسمتی سے مغرب کے پاس کوئی ایسا ذریعۂ علم نہیں ہے جو موت کے بعد کی [illegible] کرسکے اور مرنے کے بعد کوئی واپس بھی نہیں آتا ہے جو پیش آنے والے حالات سے آگاہ کرسکے،

اس کے پاس جتنے ذرائع علم ہیں، ان سب کا تعلق محسوسات سے ہے، اور مابعد الموت کے حالات کا تعلق ماورائے محسوسات سے ہے، اس لیے وہ مابعد الموت زندگی کے احوال و کوائف سے لاعلم ہے،

[illegible] نہایت جلد بازی سے جو چیز سمجھ میں نہیں آتی اس کے نہ ہونے کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے، حالانکہ بعد میں وہی شے حقیقت ثابت ہوتی [illegible] اگر [illegible] قابل قبول ہوتا، تو صدیوں پہلے علمی تحقیقات [illegible] سکتا [illegible] کے لیے امکان [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک ایسا مقصد ... جس طرح پہلے کی امکانات اب واقع ہو چکی ہیں اسی طرح یہ ... ہے

کہ جو چیزیں آج امکانات میں شمار ہوتی ہیں وہ کل ثابت ہو کر رہیں گی، جیسا کہ بعض مفکرین (...

جوڈ وغیرہ) کے اشارات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اب حیات و ارتقاء کی اگلی منزل تلاش کرنے

میں مصروف ہیں، اور بات یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ انسان کی اگلی منزل مادی نہیں بلکہ نفسی و ذہنی ہوگی۔

تشکیل جدید میں اقبال مرحوم | تشکیل جدید میں ایک ایسا ذریعہ علم موجود ہے جو اگلی منزل کی وضاحت

تک کا علم موجود ہے | کرتا ہے، اور جس کی رسائی ماورائے محسوسات تک ہے۔

یہ ذریعہ "وحی" ہے، جس پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے، اور جس کی رہنمائی علم و ادراک کی

سرحد سے بہت آگے جاتی ہے۔

"وحی" سے حاصل شدہ علم ظنی و تخمینی نہیں ہوتا، بلکہ یقینی ہوتا ہے، اور وحی کے محرم کو فلک کا

رازدار بنا دیتا ہے۔

قل ان هدى الله هو الهدى	آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کی ہدایت اصل ہدایت
ولئن اتبعت اهواءهم بعد	ہے اور اگر بالفرض آپ ان کی خواہشات
الذي جاءك من العلم ما لك	کی اتباع کریں گے علم آ جانے کے بعد تو پھر
من الله من ولي ولا نصير (بقرہ ۱۲۰)	کوئی اللہ سے بچانے والا اور مددگار نہ ہوگا۔

وحی کا اصل موضوع "انسان" ہے، اور اس کی بحث صرف انسان کی زندگی سے متعلق

ہوتی ہے جس کی ایک کڑی موت اور ما بعد الموت ہے۔

[illegible] ... ہو | اگر زندگی اس کی رہنمائی سے محروم رہے گی تو زندگی کا مسئلہ

... [illegible] سکیں گے | حل نہ ہوگا اور نہ انسانیت کے مسائل حل ہو سکیں گے

[illegible] ... کو اس رہنمائی سے واقف کرایا گیا تھا

فاما یاتینکم منی ھدی فمن	اگر تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے
تبع ھدای فلا خوف علیھم	تو جو میری ہدایت کی اتباع کریں گے ان پر
ولا ھم یحزنون ۔ والذین	نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور
کفروا وکذبوا بآیتنا اولئک	جو لوگ منکر ہوں گے اور ہماری آیتوں کو جھٹلائیں گے
اصحب النار ھم فیھا خلدون (بقرہ)	وہ دوزخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے

اور ابتدائی نسل انسانی سے کہہ دیا گیا تھا:

یا بنی آدم اما یاتینکم رسل منکم	اے اولاد آدم اگر تمہارے پاس میرے
یقصون علیکم آیتی فمن اتقی	رسول آئیں، وہ تم کو میری آیتیں سنائیں
واصلح فلا خوف علیھم ولا	تو جو کوئی ڈرے گا اور اصلاح کرے گا تو ان پر
ھم یحزنون (اعراف ۴)	نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

جس کے پاس وحی آتی ہے، اس کی حیثیت محض خبر رساں ایجنسی کی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس منصب ومقام کے ساتھ وہ مامور ہوتا ہے کہ علم وحی کے مطابق انسانی تہذیب کی تشکیل اور اس کے درخشندہ نتائج وخوشگوار ثمرات کو دنیا کے سامنے بطور نمونہ پیش کرے۔

(باقی)

قرون وسطیٰ میں عرب و ہند کے سیاسی تعلقات

از جناب حافظ غلام مرتضیٰ صاحب، لکچرار الہ آباد یونیورسٹی

(۲)

مگر اس کے بعد یہاں قرامطہ قابض ہو گئے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

تیسری صدی ہجری کے نصف آخر میں عرب بیزار میلانات نے ایک خطرناک تحریک کی شکل اختیار کر لی جو تاریخ میں باطنی (اسمٰعیلی) اور قرمطی تحریک کہلاتی ہے، اس کا مقصد عربی حکومت کے بجائے ایرانی سلطنت کا احیاء اور اسلامی نظام کے بجائے مجوسی مذہب کو رائج کرنا تھا، اس کے ارکان اربعہ یہ تھے: محمد بن حسین دندان، عبد اللہ بن میمون القداح، حمدان قرمط اور ابوسعید الجنابی، کہتے ہیں کہ عبید اللہ بن میمون القداح ہی کی اولاد نے مصر میں جا کر فاطمیہ مصر کے نام سے ایک حریف خلافت قائم کر لی تھی، اگرچہ خود اسمٰعیلیوں کا عقیدہ ہے کہ فاطمیہ مصر کے مورث اعلیٰ سیدنا امام جعفر صادق کے بیٹے حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے، یہ مسئلہ [illegible] متنازع فیہ ہے جس میں پڑنے کا یہ موقع نہیں، مگر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ فاطمیین مصر شروع ہی سے مصر کی خلافت پر قناعت نہیں کر سکتے تھے بلکہ پورے عالم اسلام پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، [illegible] اور اس مقصد کے حصول کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں [illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

پاتے ہیں، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باطنیت یا اسماعیلیت نے اس دور میں کس قدر جڑیں پکڑ لی تھیں۔

لیکن چوتھی صدی کے ثلث آخر میں ایک دوسرا انقلاب رونما ہوا۔ خلافت بغداد پر آل بویہ کا اقتدار قائم ہو گیا اور عباسی خلیفہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے [illegible] شروع میں تو آل بویہ کو باطنی تحریک سے بڑی ہمدردی تھی لیکن بعد میں دنیاوی مصالح کی بنا پر اس کے خلاف ہو گئے۔ خاص طور پر عضد الدولہ تو اس کا بڑا دشمن تھا۔ اس نے ایک لشکر جرار کے ساتھ مصر پر فوج کشی کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر موت نے مہلت نہ دی۔ اس کی موت سے فاطمی خلیفہ العزیز باللہ کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس نے از سر نو مختلف اسلامی ممالک میں اپنے دعاۃ روانہ کیے۔ اس واقعہ کا ایک ہم عصر مورخ عبد القاہر بغدادی کہتا ہے:-

فلما قضى فناخسرو نحبه طمع	فناخسرو عضد الدولہ کی موت کے بعد
زعيم مصر في ملوك نواحي المشرق	حاکم مصر [illegible]
فكاتبهم يدعوهم الى البيعة	[illegible]
فاجابه قابوس بن وشمكير بكتبه	قابوس بن وشمگیر [illegible]
بقوله انى لا اذكرك الا على المستراح	[illegible]
واجابه ناصر الدولة ابن الحسين	[illegible]
[illegible]	[illegible]
على ظهر كتابه اليه بآية الكرسي	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

[illegible]

[illegible]

غرض ان دونوں کو ہر جگہ کا حال یہ ہوا، صرف دو جگہ کا مذہب [illegible] ایک منصورہ میں، دوسرے ملتان میں۔

جیسا کہ اس سے پہلے گزر چکا [illegible] میں جب ابن حوقل یہاں آیا تھا، تو عباسیوں کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اس نے ملتان کے شہر [illegible] کا بھی ذکر کیا ہے، جس کا [illegible] ذکر کر کے لکھتا ہے کہ جب [illegible] میں دوبارہ مقدسی ملتان پہنچا تو اسماعیلیوں کو برسر اقتدار پایا، جو فاطمی خلفاء مصر کے حامی تھے، چنانچہ وہ لکھتا ہے:-

واما بالملتان فیخطبون للفاطمی	ملتان کے حکمران فاطمی کا خطبہ پڑھتے
[illegible]	ہیں اور ان کے حکم کے بغیر کوئی کام
[illegible]	نہیں کرتے اور ہمیشہ تحفے [illegible]
[illegible]	مصر بھیجتے رہتے ہیں۔

[illegible]

لیکن [illegible] ملتان کے [illegible] کا ذکر نہیں کرتا [illegible] کوئی بھی [illegible] کا ذکر نہیں کرتا، مگر [illegible] کبھی ہندوستان نہیں آیا، [illegible] کے [illegible] معروف ہے۔

[illegible] کے درمیان [illegible] انقلاب [illegible] اقتدار ختم ہو گیا۔ [illegible] مگر اس انقلاب [illegible] نہیں بتایا۔

وہ لکھتا ہے کہ اسی کے ایام سے ملتان کا یہ شہرہ بت پرستی سے پاک ہو گیا ...

فلما استولت القرامطة على	جب قرامطہ ملتان پر قابض ہوئے تو جلم
الملتان كسر جلم بن شيبان	بن شیبان متغلب نے اس بت کو توڑا
المتغلب ذالك الصنم وقتل	اور اس کے پجاری کو قتل کر دیا۔
سدنته (كتاب الهند ص ۵۷)	

(۱) یہ انقلاب صرف ملتان ہی میں آیا یا سندھ میں بھی آیا، اس کے متعلق ہنوز کوئی قطعی رائے نہیں دی جا سکتی، بظاہر مقدسی کی شہادت کے مطابق سندھ میں ۳۷۵ھ تک اسماعیلی قابض نہ ہو سکے تھے، اس لیے یہاں اس کے بعد ہی قابض ہوئے ہوں گے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ غالباً یہ بھی بعد میں قابض ہو گئے تھے، اور ان ہی سے ۴۱۶ھ میں محمود غزنوی نے سندھ (منصورہ) کو چھینا تھا، ابن الاثیر ۴۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے:

وقصد المنصورة وكان صاحبها	محمود غزنوی نے منصورہ کا قصد کیا، وہاں
قد ارتد عن الاسلام فلما	کا حاکم مرتد ہو گیا تھا، جب اس کو محمود کی
بلغه مجئ يمين الدولة فارقها	پیش قدمی کی خبر ہوئی تو اس نے منصورہ
واحتمى بغياض اشبة فقصد	کو چھوڑ کر جھاڑیوں میں پناہ لی، محمود
يمين الدولة من موضعين	نے آ کر اس کو دو طرف سے گھیر لیا
فاحاط به وبمن معه فقتلوا	اور اس کے ساتھیوں کو قتل کر دیا
اكثرهم وغرق منهم كثير ولم	اکثر ... ڈوب کر مر گئے، بہت
ينج منهم الا القليل	کم لوگ بچ سکے ...
ثم رحل الى غزنة في سلخها	پھر محمود غزنہ چلا گیا ...

[illegible]

[illegible] میں وہاں پہنچا [illegible]

[illegible] فرخی کے اس قصیدے سے بھی ہوتی ہے جس کا مطلع ہے:

فسانہ گشت و کہن شد حدیث اسکندر — سخن نو آر کہ نو را حلاوتیست دگر

اس قصیدے کے عام انداز بیان سے ظاہر ہے کہ جس والی شہر کو محمود نے شکست دی تھی وہ اسماعیلی مذہب کا پیرو تھا۔ فرخی اس کا نام خفیف بتاتا ہے اور لکھتا ہے:

خفیف چون خبر خسرو جہان بشنید — دوان گذشت و بگری اندر افتاد و بجر [illegible]

ان واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں سمجھنے کے لیے ہمیں ایک مرتبہ پھر دارالخلافہ اور وسط ایشیا کی حکومتوں کے درمیان سیاسی تعلقات پر نظر ڈالنی ہوگی۔ عباسی خلیفہ آل بویہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ جب تک وہ انھیں روپیہ دیتا رہتا اس کی حکومت محفوظ رہتی اور جہاں وہ اس شورش میں کوتاہی ہوتی یا آزادی کا خواب دیکھنے کی جسارت کرتا تو تخت سے اتار دیا جاتا۔ [illegible] میں بہاء الدولہ نے الطائع للہ کو معزول کر کے القادر باللہ عباسی کو خلیفہ بنایا۔ مگر آل بویہ کے سب سے بڑے حریف مشرق میں بخارا کے سامانی تھے۔ وہ انھیں اپنے برابر نہیں سمجھتے تھے۔ لہذا ان کے ہر سیاسی اقدام کی تصویب کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ لہذا سامانی حکمران منصور بن نوح اور اس کے جانشین عبدالملک [illegible] خلیفہ طائع ہی کے عقیدت مند رہے۔ ان کی عظمت و شوکت ایسی تھی کہ [illegible] انھیں [illegible] آل بویہ کا زور توڑنے کے لیے ایک حریف پیش کی [illegible]۔

مگر سامانی سلطنت [illegible] زوال کی آخری منزل سے گزر رہی تھی۔ [illegible] میں سلطنت [illegible] تیسری صدی [illegible] سامانی حکومت [illegible] کی [illegible] الپتگین درباری سازشوں کی وجہ سے تنگ آ کر [illegible] غزنی میں اپنی خود مختار حکومت قائم کرنے پر مجبور ہو چکا تھا

کہ جب اس شہر سلطنت کا وارث سبکتگین ہوا، اس کا شاہ بابا محمد [illegible] ہو چکا تھا [illegible]
چاہیے تھا۔ اگرچہ وہ بھی سبکتگین کے عہد سے [illegible] اس کا [illegible] سامانی
دربار کی تائید حاصل تھی۔

لیکن جب سلطان محمود نے عہد خلیفہ القادر باللہ [illegible] سامانیوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور
ایک ترکی باز دولت کا [illegible] تو محمود کو بھی اپنے بھائی کے مقابلے میں تائید و استحقاق [illegible] کی ضرورت ہوئی
خلیفہ کی سند جو اس کی عزت [illegible] تھی، خود خلیفہ بھی ان لوگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا [illegible]
کی [illegible] کا نام [illegible] تھے۔ اس لیے القادر باللہ [illegible] کے [illegible] کا [illegible] اس کا
مقتضی تھا کہ [illegible] کے مقابلے میں [illegible] کی حمایت کی جائے۔ اس لیے القادر باللہ اور محمود کے
درمیان ایک قسم کا سمجھوتہ ہو گیا۔ خلیفہ کی پشت پناہی سے ترکی دل ہو کر محمود نے پہلے [illegible]
سے تخت چھینا، پھر اپنے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کو شکست دی۔
محمود نے اس موقع پر جو [illegible] خلیفہ کو بھیجا تھا، اس کا جواب جو خلیفہ نے [illegible]
ہے اور اس کی تاریخ کا یہ حصہ [illegible] ہے۔ اس نے لکھا تھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اما بعد [illegible]

[illegible]

[illegible] امیر المومنین [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] امیر المومنین [illegible]

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible] أمير المؤمنين [illegible] الله	[illegible]
[illegible] منابر	[illegible]
[illegible] عن ذكره ...	[illegible]
قد جرت [illegible] منصور [illegible] اليها ...	[illegible]
[illegible] الى اعذار وتذكير لهم	[illegible]
[illegible] الى انذار وتبصير	[illegible] بادشاہ بنایا [illegible]
الى ان [illegible] جنده [illegible]	[illegible] اس کے ساتھ [illegible]
بايعوا اخاه عبد الملك [illegible]	[illegible]
وجرت [illegible] مع هذا الاخير	[illegible] جب [illegible]
[illegible]	[illegible] امیر المؤمنین [illegible]
[illegible] .... [illegible] ...	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]
[illegible] ...	[illegible]
[illegible]	[illegible]

وتلاحقت الفتوح بالمشرق [illegible]
بخراسان [illegible] الظفر [illegible]
... فما نصب منهم احد ولم
ينتقض بعد عهده فكان هذا
وقد فتح الله تعالى لمولانا امير المؤمنين
بلاد خراسان قاطبة ... واياه
اسأل ان يهنئ مولانا امير المؤمنين
[illegible] ..... القادر بالله خيرة
الفتح الجليل خطره الواضح على [illegible]
الوزراء [illegible] كتاب التاريخ
(الجزء الثالث من الهلال الصابي [illegible])

[illegible]
کہ یہ خراسان کے کامل فتح کی [illegible]
امیر المومنین کے امام [illegible]
عظیم الشان فتح جس کی [illegible]
زمانہ میں ہے مبارک ہو

اس فتح نامہ کے پہنچنے پر القادر باللہ نے محمود کے لیے خطابات اور خلعت وغیرہ بھیجے جیسا کہ گردیزی لکھتا ہے:

چون امیر محمود رحمۃ اللہ از فتح مرو فارغ شد و امیر خراسان گشت [illegible]
[illegible] رسول القادر باللہ [illegible] بغداد [illegible] خراسان [illegible]
[illegible] لقب یمین الدولہ و امین الملۃ [illegible] محمود [illegible]
چون آن عہد و لوا [illegible] امیر محمود بر تخت سلطنت نشست و خلعت [illegible]
[illegible] ذی القعدہ سنۃ [illegible]
[illegible]

[illegible] القادر باللہ خلیفہ سے کشمکش بن گیا کیونکہ سلطنت کی شکل [illegible] بھی [illegible] خاندانِ [illegible] ہر چند سامانیوں نے اس جانب [illegible] میں جان [illegible] کی کوشش کی لیکن ان کی انقلابی سرگرمیوں کے لیے ایک گروہ اور ان کی بدولت سلطنت ایک مستحکم حکومت کے مقابلے میں زیادہ ضعیف تھی لیکن یہ علاقہ ایلک خان والیِ کاشغر اور محمود غزنوی کے درمیان تقسیم ہو گیا بقول گردیزی:

"تا دونِ النہر محمود را باشد و ماوراء النہر خان را باشد"

لیکن اب عباسی خلیفہ القادر باللہ کے لیے ایک دوسرا مسئلہ فاطمی خلافت کی حریفانہ سرگرمیوں کی روک تھام پیدا ہو گیا، کیونکہ اب تنہا القادر باللہ کا ذاتی مفاد معرضِ خطر میں نہ تھا بلکہ خود عباسی اقتدار چند دن کا مہمان نظر آ رہا تھا، اس لیے القادر کی نگاہیں پھر محمود کی طرف اٹھیں، اس نے اس کے اشارہ سے [illegible] میں ملتان پر حملہ کر کے اس کو فتح کر لیا اور [illegible] میں جب عزیز باللہ فاطمی کا سفیر تاہرتی خراسان پہنچا اور اس کی جامہ تلاشی لی گئی تو اس کے پاس قابلِ اعتراض کاغذات برآمد ہوئے، اس لیے محمود نے اس کو حسن ملکی کے ہاتھ سے قتل کرا دیا، گردیزی لکھتا ہے،

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس واقعہ سے ان افواہوں کی تصدیق ہو گئی کہ خراسان میں اسماعیلی داعی خفیہ سرگرمیوں میں مشغول ہیں، اس لیے محمود نے ان کی سخت نگرانی شروع کر دی، ان میں سب سے اہم اسماعیلی داعی [illegible] تھا جو دوسرے شیعوں کے ساتھ خوارزم کے دربار میں رہتا تھا، محمود سے ڈر کر بھاگ گیا [illegible] کے دربار میں پہنچ کر [illegible] شروع [illegible] اس سے

[illegible] القادر [illegible]

ودی کو شاہنامہ کا مسودہ [illegible] اس کے بعد محمود غزنوی نے [illegible]

جمادی [illegible] خوارزم [illegible] ۴۲۱ھ میں سندھ کو اور ۴۲۰ھ میں رے کو [illegible]

پر اسماعیلیت کا دور [illegible] ختم کیا۔ اس موقع پر جو فتح نامہ اس نے خلیفہ کو بھیجا تھا اسے ذہبی نے

تاریخ الاسلام میں محفوظ رکھا ہے۔

سلام على سيدنا ومولانا الامام	سیدنا و مولانا امام القادر باللہ امیر المومنین
القادر بالله امير المومنين فان	کو سلام پہنچے [illegible] لشکر [illegible]
كتاب العبد صدر من معسكره	جمادی الثانی ۴۲۰ھ کو [illegible]
بظاهر الري غرة جمادى الآخرة	[illegible] اس خطہ کو ظالموں کے ہاتھ سے چھڑا دیا
سنة عشرين وقد ازال الله	[illegible]
من هذه البقعة ايدي الظلمة	[illegible]
وطهرها من دعوة الباطنية	[illegible]
الكفرة والمبتدعة الفجرة وقد	[illegible]
تناهت الى الحضرة المقدسة	[illegible]
حقيقة الحال في ما قصر العبد عليه	[illegible]
سعيه واجتهاده من غزو اهل	[illegible]
الكفر والضلال وقمع من نبغ	[illegible]
ببلاد خراسان من الفئة الباطنية	
والفجار وكانت مدينة الري	

ماخذ القادر باللہ ... دیکھیے تاریخ الاسلام السیاسی ...

(ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن جلد سوم ص ...)

یہ خط عباسی خلیفہ اور محمود کے مخلصانہ تعلقات کا ثبوت ہے، خلیفہ نے بھی اس کی عزت افزائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کو اور اس کے بیٹوں بھائیوں اور افسروں کو بڑے بڑے خطابات دیے تھے، گردیزی لکھتا ہے:۔

و اندر شوال سنہ سبع عشر و اربعمائۃ از امیر المومنین القادر باللہ آمد با عہد و لوای خراسان و ہندوستان و نیمروز و خوارزم و امیر محمود را و فرزندان و برادران او را لقبہا دادہ، اما امیر محمود را کہف الدولۃ والاسلام و امیر مسعود را شہاب الدولۃ و جمال الملۃ و امیر محمد را جلال الدولۃ و جمال الملۃ و امیر یوسف را عضد الدولۃ و مؤید الملۃ و نامہ نوشتہ بودند و اندر نامہ گفتہ بود کہ ہر کسے را کہ تو خواہی ولی عہد خویش کن و اختیار ترا اتفاق است و بر آن عزوجل کہ امیر محمود کردہ بود قامادر ما شکر بجا آوردہ بود و دلہا بیاستردہ (زین الاخبار ص ۸۸)

محمود کے بعد مسعود تخت نشین ہوا، اس کو جلد ہی سلاجقہ کی شورش کا مقابلہ کرنا پڑا، اس میں ناکام ہو کر وہ ہندوستان واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں مارگلہ کے مقام پر خود اس کے غلاموں نے اس کا کام تمام کر دیا، اس کے بعد شوکت محمودی ختم ہو گئی، اور غزنوی سلطنت ایک تیسرے درجہ کی ریاست بن کر رہ گئی، اس کے بعد سلاجقہ کا دور شروع ہوا، جن کا ہندوستان کی تاریخ سے کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔

لیکن غزنوی سلطنت کے ضعف کا ہندوستان کی تاریخ پر خاصہ اثر پڑا، کیونکہ غزنوی سلاطین کی ہیبت و سطوت ایشیا میں ختم ہو جانے کے بعد ان کے لئے اور ہندوستان سے زیادہ دلچسپی لینے لگے۔

چنانچہ ولیعہد سلطنت کو یہاں نائب السلطنت بنا کر بھیجتے تھے، اور آخر میں جب غز قبائل نے ان سے غزنی چھین لیا تو وہ مستقل طور سے لاہور میں منتقل ہو گئے، یہیں ۵۸۲ھ میں محمد غوری نے غزنوی خاندان کے آخری تاجدار خسرو ملک کو گرفتار کر کے اس خاندان کا خاتمہ کیا۔

محمود کے بعد بھی یہ خاندان تقریباً ڈیڑھ صدی تک باقی رہا، مگر ان کی سیاسی اہمیت ختم ہو گئی تھی، اور ان کا تعلق دربار خلافت (بغداد) سے بھی محض رسمی اور سلاجقہ کے توسط سے رہ گیا تھا، جو بغداد میں آل بویہ کے جانشین تھے،

۵۸۲ھ میں غوری حکومت پنجاب میں قائم ہوئی اور اس نے بہت جلد غیر معمولی عظمت و شوکت حاصل کر لی، ادھر سلاجقہ غزوں کے ہاتھوں ختم ہو چکے تھے، اور وسط ایشیا میں خوارزم شاہی خاندان کا دور دورہ تھا، مگر یہ اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر عباسیوں کے خلاف تھے، اور ان کا زور توڑنے کے لیے علویوں کی خلافت کے متمنی تھے، دوسری طرف اس کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے قرامطہ سے بھی جو اب ملاحدہ کہلاتے تھے، مدد لینے میں کوئی باک نہیں تھا، جو لوگ تاریخ میں حشیشین یا Assassins کہلاتے ہیں، اس وقت بڑے بڑے وجوہ و اعیان ملک کے لیے ایک خطرہ بن گئے تھے،

محمد غوری بھی محمود غزنوی کی طرح اسماعیلیوں کا دشمن تھا، وہ اور اس کا بھائی غیاث الدین خوارزم شاہیوں کے اقتدار کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے، اس لیے ان سے جنگ کر کے خوارزم شاہی فوجوں کو مسلسل شکستیں دیں، غوریوں کی قوت بڑھنے کے بعد خلافت بغداد کو محمود کی طرح ان سے بھی تعلقات پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، چنانچہ تاریخ میں اس قسم کے متعدد سفارتی وفود کی آمد و رفت کا پتا ملتا ہے، منہاج سراج لکھتا ہے:

و چند کرت از حضرت دار الخلافت از امیر المومنین المستضئ بامر اللہ و الناصر لدین اللہ [illegible]

چنانچہ در وقت پادشاہی حضرت سلطان غیاث الدین شب ... [illegible] ... شد کہ مجد الملک [illegible] الربیع آمد و قاضی جمال الدین [illegible] ... ذکر [illegible] ... الخطیب [illegible] چند این دو امی [illegible] الدین [illegible] کردند[۱]

۵۹۹ھ میں غیاث الدین کی وفات کے بعد محمد غوری مستقل بادشاہ ہوا مگر اب اس کی مشکلات انتہا کو پہنچ گئیں، خوارزم شاہیوں نے اس کے مقابلے کی اپنے میں تاب نہ پاکر کفار خطا سے مدد مانگی اندخوی کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی جس میں محمد غوری کو شکست فاش ہوئی، یہاں تک افواہ پھیل گئی کہ وہ غائب ہو گیا، جس سے غوری مملکت میں بڑی ابتری پھیل گئی، ملتان میں جو ہمیشہ سے اسماعیلیوں کا گڑھ تھا، محمد غوری کے ایک سپہ سالار ایبک بالتر نے عمر بن یزدان کے اغواء سے بغاوت کر دی، ادھر کھوکھروں نے پنجاب میں علم بغاوت بلند کیا، قطب الدین ایبک میں ان بغاوتوں کے فرو کرنے کی سکت نہ تھی، اس نے محمد غوری کو صورت حال سے مطلع کیا جو کفار خطا سے انتقام لینے کے لیے جا رہا تھا، اس لیے اس نے ارادہ بدل کر ہندوستان کا رخ کیا، ایبک بالتر کو شکست ہوئی اور وہ عمر بن یزدان کے ہمراہ بحال تباہ قتل کر دیا گیا۔

اس کے بعد محمد غوری کھوکھروں کی تادیب کے لیے نکلا کھوکھر بڑی بے جگری سے لڑے مگر آخر میں انھیں بھی شکست فاش ہوئی، تقریباً دو مہینے لاہور میں قیام کرنے کے بعد خوارزم شاہ اور کفار خطا کی متحدہ فوجوں سے مقابلہ کی تیاری کے لیے غزنی روانہ ہوا مگر راستہ میں دمیک کے مقام پر کھوکھروں نے قتل کر دیا، اغلب خیال یہ ہے کہ یہ فدائی تھے اور اس وقت افواہ تو یہاں تک تھی کہ امام فخر الدین رازی جن کا محمد غوری بے حد معتقد تھا، اس کے قتل کی سازش میں شریک تھے، مگر [illegible] اس شبہ کو تقویت پہنچتی ہے، جس وقت اس کی لاش لے کر لوگ غزنی پہنچے تو قصر خلافت کا سفارتی وفد موجود تھا، جو غالباً خوارزم شاہیوں کے خلاف اس سے گفتگو کرنے آیا ہوگا،

---

[۱] [illegible]

محمد غوری کی وفات پر اسکی وسیع سلطنت کے ٹکڑے ہو گئے ہندوستان میں قطب الدین ایبک کا [illegible]

بعد محمد غوری کے بھتیجے نے خلعت و چتر بادشاہی ادا کیا یعنی ہندوستان کے ممالک محروسہ پر ایبک کی [illegible]

نہیں بلکہ محمد غوری کے بھتیجے غیاث الدین محمود کے توسط سے بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیاث الدین محمود

کی بیعت جلد ہی ختم ہو گئی اور قطب الدین کو بھی خلیفہ بغداد نے براہ راست مسند الخلافہ سے امیر المومنین

کے خطابات عطا کیے لیکن چونکہ ہندوستانی مورخین اسکی تفصیل کے بارے میں خاموش ہیں اس لیے قطعی طور پر نہیں

کہا جا سکتا کہ قطب الدین ایبک سے تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔

قطب الدین کی وفات پر پہلے آرام شاہ اور پھر اس کا منہ بولا بیٹا التتمش تخت نشین ہوا۔ التتمش کے

شروع کا زمانہ تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ سے معرکہ آرائی میں گزرا۔ شاید دربار خلافت بھی اسکے

نتیجے کا منتظر تھا اور دیکھ رہا تھا کہ اس سیاسی کشمکش میں کون کامیاب ہوتا ہے۔

۶۲۶ھ میں التتمش اس خانہ جنگی میں کامیاب ہوا۔ اسی سال بغداد کا سفارتی وفد ہندوستان پہنچا

اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ منہاج سراج لکھتا ہے:

"درین وقت رسل دار الخلافہ با تشریفات بحدود ناگور رسیدہ بودند [illegible]

بیست و دوم ماہ ربیع الاول سنہ ست و عشرین و ستمایہ بحضرت رسیدند و شہر را آئین

بستند و این پادشاہ و ملوک و فرزندان او با تشریف معظم [illegible]

بخلعت دار الخلافہ مشرف گشتند" (طبقات ناصری ص [illegible])

اسکے بعد ۶۵۶ھ میں بغداد سے خلافت عباسیہ ختم ہو گئی اور ہلاکو [illegible]

خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ گو اب [illegible]

کو ایک دوسرے سے بیگانہ [illegible] کے سیاسی [illegible]

تعلق ہوئی۔ اس کی تفصیل ایک نئی [illegible] کی متقاضی ہے۔

شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از جناب سید احتشام احمد صاحب ندوی ایم اے [illegible]

شام زمانہ قدیم سے عربی شاعری کا گہوارہ رہا ہے، جس کی سرزمین نے ابو العلاء معری، بحتری اور ابو تمام جیسے عظیم شعراء کو جنم دیا، عہد جدید میں بھی شام نے عربی شاعری کو آگے بڑھایا اور ترقی دی مگر چونکہ شام میں عیسائیوں کی تعداد بھی معتد بہ تھی اور پہلے اس میں لبنان بھی شامل تھا اس لیے یہاں عیسائی شعراء کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ عیسائیوں نے دور عثمانی ہی میں فرانسیسی زبان کی طرف توجہ کی اور اکثر شعراء نے اس زبان میں مہارت پیدا کی جس نے ان کے ذہنی افق کو وسعت اور بلندی عطا کی۔

شام میں جدید عربی شاعری کا دور دراصل ۱۹۰۸ء سے شروع ہوتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ یورپ کا مرد بیمار نزع کی کیفیت میں تھا اور مغربی طاقتیں ایشیا پر پوری قوت سے یلغار کر رہی تھیں، فرانس اور انگلستان عربوں کو عثمانیوں کے خلاف مشتعل کر رہے تھے، خود عرب عثمانیت کے بار گراں سے اکتا گئے تھے، ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۸ء تک کے عرصہ میں مغربی تہذیب کے اثرات بھی کافی عام ہو چکے تھے، خود عرب بھی اس سے متاثر تھے اور ان میں ذہنی بیداری [illegible] تک تھی اور اس کا پڑھنا لازمی تھا، اس لیے ان کا [illegible] ترکی زبان کا ذریعۂ تعلیم [illegible] حکومت کے خاتمے تک عربی ادب جمود کی حالت میں پڑا رہا۔

۱۹۱۸ء میں پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر شام نے ترکوں سے آزادی پائی اور ملک فیصل ابن حسین کی قیادت میں عربی حکومت قائم ہوئی، اس نے پہلا کام یہ کیا کہ حکومت کی سرکاری زبان عربی قرار دی۔

مصر پہلا عرب ملک تھا جس نے عثمانی اقتدار سے نجات حاصل کی، وہاں شیخ جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ کی حریت پسندانہ کوششیں بھی اپنا کام کر رہی تھیں جن کے اثرات شام و لبنان پر بھی پڑ رہے تھے، اور جمہوریت کی صدائیں عبد الرحمٰن کواکبی، شدیاق، ناصف یازجی، ادیب اسحاق، حسون اور دلال کے دلوں میں جاگزیں ہو چکی تھیں، ان سب نے مل کر شام و لبنان میں بیداری پیدا کی اور قومی احساس کو جنم دیا۔

فیصل کی حکومت قائم ہونے کے بعد تمام مدارس میں عربی رائج ہو گئی، اس زمانہ میں دو اہم شخصیتیں سامنے آئیں، ایک محمد کرد علی جن کی مساعی سے دمشق میں "المجمع العلمی العربی" قائم ہوا، انھوں نے بہت سی کتابوں کو ایڈٹ کیا، ان کے اغلاط کی تصحیح کی اور علمی طریقہ سے عربی زبان کی غیر معمولی خدمت کی، دوسری شخصیت ساطع الحصری کی ہے، جو فیصل کی حکومت میں وزیر تعلیم تھے، انھوں نے عربی زبان کی اشاعت پر غیر معمولی توجہ کی، اور طلبہ کی ذہنی تربیت کا خاص طور سے خیال رکھا۔

"المجمع العلمی العربی" کا قیام پوری عرب دنیا کے لیے رحمت ثابت ہوا، مشرق و مغرب کے عربی کے تمام ماہروں اور اس سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہیں کا ممبر بنایا گیا، وضع اصطلاحات کے لیے اصول و قواعد مرتب ہوئے، بے شمار مخطوطات کو اس ادارہ نے نہایت اہتمام سے طبع کرایا۔

۵ اپریل ۱۹۲۳ء میں (جامعہ سوریہ) یعنی یونیورسٹی دمشق کا قیام عمل میں آیا جس میں ابتداءً قانون اور طب کی تعلیم کا نظم تھا،

ابتدا میں یہ دقت پیش آئی کہ ان دونوں کالجوں میں ذریعۂ تعلیم عربی تھا اس لیے اصطلاحات کے مسئلے میں بڑی دقت ہوئی لیکن یہ عربی زبان کا معجزہ ہے کہ اس نے بڑی مہارت سے یہ مرحلہ آسانی سے طے کر لیا اور بہت سی ضخیم کتابیں اس موضوع پر لکھی گئیں۔ اس کے بعد ادب، سائنس، تعلیم اور انجینیرنگ وغیرہ کے الگ الگ کالج قائم کیے گئے، ادب و سائنس کے کالج ۱۹۲۳ء میں قائم ہوئے اور تعلیم و انجینیرنگ کے کالجوں کا قیام ۱۹۲۶ء میں عمل میں آیا، اس لیے کہ فرانس کالجوں کے قیام سے ڈرتا تھا، وہ اپنے تہذیبی اثرات پھیلانے کے لیے طلبہ کو اپنے یہاں بھیجتا تھا، مگر اس کا اثر الٹا ظاہر ہوتا تھا، جو طلبہ وہاں سے واپس آتے وہ جذبۂ حریت سے سرشار ہوتے اور فرانس کے لیے خطرہ بن جاتے۔

یہاں ایک سیاسی پس منظر کا بیان ضروری ہے جس نے شام کی پوری زندگی کو غیر معمولی طور سے متاثر کیا۔ گذشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ ملک فیصل جنوری ۱۹۱۹ء میں برسرِ حکومت آئے، لیکن یہ حکومت بن کھلی کلی کی طرح مرجھا گئی، اس لیے کہ فرانس نے شام پر حملہ کر دیا۔ اور مصر و لبنان کو اپنے قبضہ میں کر لیا، شام کی قوت ہی کیا تھی، ۲۴ مئی ۱۹۱۹ء کو شامی فوج اور فرانسیسی فوج میں جنگ ہوئی اور دوسرے دن فرانس کو غلبہ حاصل ہو گیا۔

ملک فیصل پہلے فلسطین گئے اور وہاں سے انگلستان چلے گئے۔

اہلِ شام ایک دن کے لیے بھی فرانس کی حکومت سے مطمئن نہ ہو سکے اور مسلسل جہاد میں لگے رہے تقریباً ۲۵ برس کی جدوجہد نے فرانس کے چھکے چھڑا دیے اور بالآخر فروری ۱۹۴۶ء میں شکری قوتلی کی قیادت میں ملک آزاد ہو گیا۔

چونکہ شامی قوم ربع صدی تک فرانسیسیوں کے خلاف ایک جہادِ مسلسل میں مشغول تھی، بلاشبہ اس جہاد نے سیاسی قوتوں کے علاوہ فکری قوتوں کو بھی وحدت بخشی اور شعرا نے دل کھول کر اپنے جذبات

[illegible] اسباب مہیا ہوتے ہی یہ جوش دوبارہ ابھرا، ان کی آزادی کی [illegible]

کو پامال کر دی گئیں، جلاوطنی اور قید و مشقت لوگوں نے آزادی کی راہ میں برداشت کی۔

مختلف شاعروں نے مختلف انداز سے فرانس کے ظلم و جبر کی داستان بیان کی ہے۔ یہاں نمونۃً چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ شفیق جبری کہتا ہے:

لئن طوى المستبد ادره ليلها   فما طوى عن مقلتي نجومها

اگر ظالم کے ظلم نے رات کو تاریک کیا ہے تو سحر بھی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ملک میں کسی وقت جان و مال محفوظ نہیں۔

ان تحرجوا الآساد في غابها   هيهات ما تكفيكم شرها

اگر تم شیروں کو جنگل میں بند کر دو تو ان کے شر سے محفوظ رہنے کا خیال خام ہے،

یعنی اہل شام سے تم کو ہمیشہ خطرہ رہے گا اور وہ جہاد جاری رکھیں گے۔ خیر الدین زرکلی کہتا ہے:

متى ترى تبسم لي؟ يا زمان   ألا حنان

اے زمانہ کب تو میرے لیے مسکرائے گا، کیا تیرے پاس رحم و مروت نہیں،

أسلمتني لا أمن ولا أمان   للحدثان

تو نے مجھے حوادث کے حوالے کر دیا۔ اب نہ امنیت ہے اور نہ امن

أبكي ربوعاً لا تطيق الهون   رهن امتهان

میں ان سبزہ زاروں کو روتا ہوں جو ذلت اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتے مگر ذلت کا شکار ہیں

يا زمن السوء منيت الشام   بأس الأيام

اے بُرے زمانے! تو نے شام کو مصیبت کا جام پلایا

إلى متى نبقى أسارى الانقسام   والانفصام

کب تک ہم قیدی بنے رہیں گے، منقسم و منقطع ہو کر

جنرل غورو نے صاف اعلان کر دیا کہ

یا غورو ارجعی بالخزی صاغرۃ ذکراک فی صفحۃ التاریخ آثام

اے غورو رسوائی کے ساتھ واپس لوٹ جا۔ تیرا ذکر تاریخ کے صحیفہ میں داغ اور بڑا معصیت ہے[1]

ایک دوسرا شاعر فرانس کا ذکر اس طرح کرتا ہے:

فکنت لئیمۃ حربا و سلما کلؤمک فی الغرائز والطباع

تو کمینہ تھا جنگ میں بھی اور امن میں بھی۔ اسی طرح جس طرح کہ تو لئیم ہے جبلیت اور فطرت کے اعتبار سے

اس کے علاوہ شام کی صحافت نے بھی فکری بیداری میں بڑا حصہ لیا، اگرچہ فرانسیسی استعمار صحافتی آزادی میں حائل تھا، محمد کرد علی نے "المقتبس" کے نام سے ایک علمی رسالہ جاری کیا خلیل مردم بک نے "الرابطۃ الادبیہ" کے نام سے ایک ادبی اور تنقیدی پرچہ نکالا۔ ۱۹۲۳ء میں شاکر الکرمی نے ایک ہفتہ وار پرچہ "المیزان" جاری کیا لیکن ان کی جواں مرگی سے یہ پرچہ زیادہ دنوں ادب کی خدمت نہ کرسکا، مجلۃ "الحدیث" اور "الثقافۃ" نے بھی شام میں آزادیٔ فکر اور بیداری کے پیام کو عام کرنے کا کام کیا، ان میں ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جو لوگوں میں فکری بیداری پیدا کرتے تھے۔

فرانسیسی ادب کے اثر سے شامی ادب میں قصہ نگاری کا رواج ہوا، ڈرامے، ناول اور افسانے کثرت سے لکھے جانے لگے، اور ان کے ترجمے عربی زبان میں ہونے لگے، اور مصر میں شامی اور لبنانی ادیبوں نے ڈرامہ نگاری کو نئی زندگی بخشی اور اس کا رواج عام کیا۔

ادب کی جدید تحریکوں کے اثرات جو یورپ کی شاعری میں عام تھے عربی شاعری خصوصاً شامی اور لبنانی شعراء پر زیادہ پڑے ہیں، چنانچہ "شعراء المہجر" میں سب سے زیادہ تعداد انہی

---

[1] الادب العربی المعاصر فی مصر، ڈاکٹر شوقی ضیف، دار المعارف مصر ۱۹۶۱ء ص ۲۰۳

علاوہ [illegible] کے شعراء کی تھی، جن کی شاعری میں روحانی تحریک کے اثرات نمایاں ہیں۔ ان کا دوسرا عنصر حسرت، یاس اور وطن کے لیے تڑپ اور شوق ہے[1]، چونکہ ان کی زندگیاں وطن سے دور ا[جنبیوں] میں گذری ہیں، اس لیے ان پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ان کے یہاں عجمیت زیادہ اور عربیت کم ہے[2]، لیکن دورِ جدید کا ایک بالغ نظر ناقد محمد مندور لکھتا ہے کہ یہ الزام صحیح نہیں، ان مہجری شعراء کے اسلوب میں ضعف نہیں پایا جاتا[2]۔

اگر ۱۸۶۰ء سے ابتک کی شامی شاعری کا جائزہ [illegible] اس کو تین دوروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱- دورِ اول: پہلی جنگِ عظیم کے قبل کا زمانہ
۲- دورِ دوم: دونوں جنگوں کے درمیان (کا عرصہ)
۳- دورِ سوم: دوسری جنگ کے خاتمہ سے [illegible]

پہلے دور میں شعراء زیادہ قبائلی رنگ میں ڈوبے رہتے، لیکن الفاظ بیداری فکر و [illegible] استعمال کرتے تھے، دوسرے دور میں مغرب کے اثرات ان کے ذہنوں پر [illegible] تھے، اور ہر چیز میں تغیر و انقلاب رونما تھا، تیسرے دور میں جدید اثرات میں پختگی اور زندگی کی حقیقت کا رنگ زیادہ نمایاں ہو گیا، ان جدید رجحانات نے شام کی شاعری میں تین عناصر پیدا کیے:

(۱) قومیت (۲) وطنیت (۳) انسانیت[3]

قومیت سے مراد عرب قومیت اور وطنیت سے مراد شامی وطنیت ہے، اس کے ساتھ شامی شعراء کے یہاں دینی جذبات اور اسلامی تصورات بھی جدید شاعری کا اہم عنصر ہیں، بلکہ جدید مصری اور عراقی شاعری میں بھی اسلامی عنصر پوری طرح موجود ہے۔

---

[1] الاتجاہات الادبیۃ فی العالم العربی الحدیث، انیس المقدسی ج ۲ ص ۹۰، [2] فی المیزان الجدید مصنفہ ڈاکٹر محمد مندور ص ۵۵، [3] محاضرات فی الاتجاہات الفکریۃ فی بلاد الشام و اثرہا فی الادب الحدیث، تالیف ڈاکٹر جمیل صلیبا ص ۱۱

عربی قومیت کے فخر کے لیے عربوں کی شاندار تاریخ اور ان کے دینی اور ثقافتی تاریخ کے اوراق پر ثبت تھے، اس لیے ناصف یازجی کہتا ہے:

ونحن اولو المآثر من قديم   وان جحدت مآثرنا اللئام

ہم قدیم زمانہ سے صاحب آثار ہیں خواہ کم ظرف لوگ ہمارے کارناموں کا اعتراف نہ کریں۔

عبدالرحمن رافعی کہتا ہے:

ولب آثارهم تذكارها   يهب الضمائر قوة الايمان

ان کے اکثر آثار کا ذکر ضمیر کو قوت ایمان بخشتا ہے۔

سلیمان تاجی فاروقی کہتا ہے:

بني انهضوا واحيوا حياة عزيزة   حياة نعيد المجد للعرب ثانيا

اے اہل عرب اٹھو! اور ایسی باعزت زندگی بسر کرو جو عربوں کی عزت و مجد کو دوبارہ واپس لے آئے۔

ان قومی اور وطنی رجحانات کے علاوہ عام اخلاقی و انسانی اقدار کی ترجمانی بھی جدید شامی شاعری میں موجود ہے۔ امجد الطرابلسی کہتا ہے:

كن رحيما انما الانسان   ذو القلب الرحيم

رحم دل بنو کہ انسان وہی ہے جو رقیق القلب ہے۔

جن شعرا کے کلام میں اسلامی جذبات کی ترجمانی ہے، ان میں زرکلی، خلیل مردم بک، عمر ابو ریشہ اور انور عطار قابل ذکر ہیں، جنھوں نے خدا کی حمد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں بہت سے قصائد لکھے ہیں[1]

بنیادی طور پر جدید شامی شاعری میں دو مکتب فکر ہیں، ایک تجدد پسند شعرا کا طبقہ جن کی

---

[1] الاتجاهات الفكرية ص ۱۴۴ - ۱۴۰۔

عربیت ناقص ہے، اور جو مغرب کی اندھی تقلید چاہتا ہے، دوسرا اعتدال پسند ہے، اور جدید و قدیم کی حسین آمیزش چاہتا ہے۔[1]

اگرچہ عربوں کی عملی سیاست میں باہم بڑا اختلاف ہے، مگر شعراء کے جذبات میں وحدت کا عنصر ہر جگہ موجود ہے، اور وحدت ملت عربیہ تمام شعراء کا بنیادی تخیل ہے، خصوصاً شامی شعراء میں خیر الدین زرکلی کی شاعری اس تخیل کی ترجمان ہے۔[2]

فرانسیس مراش	حلب میں ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے، جس سے
۱۸۳۶ء تا ۱۸۷۳ء	اگرچہ شفایاب ہو گئے مگر ... حلب میں

ایک انگریز ڈاکٹر سے جدید طب چار سال تک ... یہاں آنے

کے بعد ان کے فکر و خیال کی دنیا بدل گئی جو رفتہ، اور ... ساتھی،

پیرس کی تنگ دستی کی زندگی اور غیر معمولی ... نے بالکل مضمحل کر دیا، بیماری و ضعف بہت بڑھ گیا، آخر میں آنکھوں کی بصارت جاتی رہی ... تعلیم کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، اس پریشانی کے عالم میں خبر ملی کہ والدین نے سفر آخرت اختیار کیا، اس حادثہ نے زندگی کی مسرت چھین لی اور وہ وطن لوٹ آئے، مگر طبیعت میں حوادث کے اتنے شدید اثرات تھے کہ گھر ہی میں پڑے رہتے تھے، اسی عالم میں اکثر ابو العلاء المعری اور شوپنہار کے فلسفے سے تسکین حاصل کرتے

۱۸۷۳ء میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ دعوۃ الحق: اس میں فلسفیانہ خیالات ہیں

۲۔ مشہد الاحوال: اس میں اجتماعی زندگی کے متعلق ... فکر انگیز خیالات ہیں۔

---

[1] الاتجاہات الفکریۃ ص ۱۳۰۔ ۱۳۲ [2] دراسات ادبیۃ مصنفہ عمر الدسوقی ص ۱۰۶

٣- رحلۃ الی اوربا: پیرس کا سفرنامہ ہے۔

٤- شہادۃ الطبیعۃ فی وجود اللہ والشریعۃ: علم کلام پر ہے۔

٥- المرآۃ الصفیۃ فی المبادی الطبیعیۃ: سائنس سے متعلق بحث ہے۔

٦- الکنوز الفنیۃ فی الرموز المیمونۃ: ۵۰۰ اشعار پر مشتمل ایک قصیدہ ہے جس میں [illegible] اپنی مختصر کے دور کے حالات ہیں۔

٧- مرآۃ الحسناء: دیوان ہے جو ۱۸۷۲ء میں بیروت سے طبع ہوا۔

٨- تعزیۃ المکروب: ایک فلسفیانہ انداز کا رسالہ ہے۔

٩- دلیل الحریۃ الانسانیۃ

١٠- در الصدف فی غرائب الصدف: اجتماعی زندگی پر ایک ناول ہے۔

فرانسیس مراش کی شاعری میں جذبات اور یاس کی فراوانی ہے۔ اس نے اپنی پرغم زندگی سے سوز دروں حاصل کیا اور اس کی زندگی اس کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ فرانسیسی ثقافت نے جدید اثرات کو اس کی شاعری میں اہم مقام دیا ہے۔ اس کی پرسوز شاعری کا نمونہ یہ ہے:-

لعمری ما وجدت فی هذی البلاد   غیر داء لی و للغیر دوا

خدا کی قسم میں نے اس شہر (پیرس) میں مرض اور دوسروں کے لیے دوا کے علاوہ کچھ نہیں پایا۔

ذقت فیها کل کاسات النکد   وکما غیری من البشر ارتوی

میں نے اس میں تکلیف کے پیالے پیے جیسا کہ دوسرے لوگ (دنیا میں) سیر و شاداب ہوئے

یا فؤادی قد جری فیک الردی   فعلی هذا الردی بت ارعوی

اے دل تجھ پر مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ لہٰذا تو اس ہلاکت کے [illegible] ہو جاتا ہے۔

اپنے والدین کی وفات پر کہتا ہے:

فأنا أبكيكما يا والديّ   بدموع ما بكاها أحد

اے میرے والدین میں آپ کے غم میں ان آنسوؤں سے روتا ہوں جس سے کوئی نہیں رویا:

إن في موتكما القاسي لدي   مات حقا سندي والعضد

آپ کی المناک موت سے واقعۃً میری طاقت جاتی رہی اور میرا قوت بازو ٹوٹ گیا،

یہ اشعار اس کے ٹوٹے ہوئے دل کی صدا ہیں،

شاعر جب پہلی بار پیرس کے نگار خانے کو دیکھتا ہے تو اس کا دل اس کے حسن و عظمت سے معمور ہو جاتا ہے:

إنني جئت باريس العلى   رأت عيناي ما قد سمعت

میں عظیم پیرس پہنچا اور آنکھوں کے سامنے وہ کچھ دیکھ لیا جو سنا تھا

ثم ما لا نظرت عيني ولا   سمعت أذني ولا ذهن وعت

وہ دیکھا جو میری آنکھوں نے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ کانوں نے سنا تھا اور نہ ذہن کی وہاں تک رسائی تھی،

آه ما هذي المباني والعلى   هل بروج أم نجوم طلعت

یہ بلند عمارتیں برج ہیں یا ستارے طلوع ہو گئے ہیں،

مشهد يسطو على العقل   فيه من آي بهاء الأعين

ایک ایسا منظر ہے جو عقل پر چھا گیا ہے اس میں ایسی غیر معمولی چیزیں ہیں جن سے آنکھیں لطف اندوز ہوتی ہیں

رزق اللہ حسون
۱۸۲۵ء [illegible]

حسون کا مولد حلب ہے، خاندانی تعلق آرمینیہ سے تھا، اس کے خاندان کے لوگ عیسائی تھے، ابتدائی تعلیم حلب میں پائی پھر لبنان میں فرانسیسی، عربی اور ترکی زبانیں سیکھیں، ریاضی اور مذہبیات سے ان کو شغف تھا، ثانوی تعلیم کے بعد حلب واپس آگئے اور کچھ

وں میں مترجم کی حیثیت سے کام کیا، پھر پیرس آئے، لندن کا سفر کیا، اور عرصے تک وہاں مقیم رہے،
اور یورپ کی یونیورسٹیوں اور کتب خانوں سے پورا فائدہ اٹھایا، یورپ کی زندگی کے تمام
پہلوؤں کا بہت قریب سے مطالعہ کیا، پھر مصر آئے، وہاں بہت سے معلومات حاصل کرکے
قسطنطنیہ گئے، جہاں مشرق و مغرب کے بہت سے اہل فکر سے تعارف ہوا،

وہ استنبول میں تھے کہ روس اور دولت عثمانیہ میں جنگ چھڑ گئی، اس وقت حسون نے
ایک اخبار "مرآۃ الاحوال" جاری کیا، سنہ ۱۸۶۰ء میں شام کے حالات کو قابو میں رکھنے کیلئے
جو لوگ بھیجے گئے ان میں یہ بھی تھے، دمشق پہنچ کر حسون نے عبد القادر جزائری کی مدح میں
قصیدہ لکھا، پھر فؤاد اول کے ساتھ ترکی واپس گئے، اور ان کے سکریٹری کی حیثیت سے
کام کرتے رہے،

کچھ دنوں کے بعد محکمۂ مالیات کے کسی عہدہ پر مامور ہوئے، اور اس سلسلہ میں ان پر ایک
رقم کے غبن کا الزام لگا، اور وہ قید کردیے گئے، کچھ دنوں کے بعد قید سے فرار ہوکر روس
چلے گئے، روس سے لندن پہنچے اور دوبارہ مرآۃ الاخبار جاری کیا، جس میں عثمانیہ حکومت
پر سخت تنقید ہوتی تھی، ایک رسالہ "حل المسئلتین الشرقیۃ والغربیۃ" کے نام سے جو منظوم ہوتا تھا
جاری کیا مگر جلد ہی بند ہوگیا، وہ لندن میں سنہ ۱۸۸۰ء میں غربت کی حالت میں انتقال کیا۔

ان کے دو شعر ان پر صادق آتے ہیں

قد قضى الله ان اموت غريباً　　في بلاد اساق كرها اليها

خدا نے فیصلہ کیا ہے کہ میں غربت میں مروں ایسے ملک میں جہاں میں زبردستی کھینچ کر لایا گیا ہوں

وبقلبي تحفظت معانٍ　　نزلت آية الحجاب عليها

اور میرے دل میں ایسے بہت سے معانی ہیں جن پر حجاب کی آیت نازل ہوگئی ہے، یعنی ان کو خیالات کے اظہار کا
موقع نہیں

[illegible]

لبنان کے قیام کے زمانہ میں انھوں نے دیوان اخطل، ذوالرمہ، نقائض جریر و فرزدق، دیوان حاتم اور مجانی الادب جیسی اہم کتابوں کو زیور طباعت سے آراستہ کیا

ان کے دو دواوین شائع ہو چکے ہیں: (۱) اشعار الشعر (۲) النفثات

شاعری حسون عربی، ترکی، فرانسیسی اور روسی چار زبانوں سے واقف تھے، اسی لیے ان سب کے اثرات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔ وطن سے دوری اور مہجری کی بنا پر ان کی شاعری میں محبت، حزن وغم اور وطن سے اشتیاق کے جذبات موجزن ہیں،

اپنے دیوان "اشعار الشعر" میں توراۃ کے قصوں کو نظم کے قالب میں پیش کیا ہے جس میں حضرت ایوب علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کا ذکر ہے،

حسون کو جس زمانہ میں غبن کے الزام میں قید کر دیا گیا تھا تو انھوں نے اپنی صفائی میں قصائد کہہ کر فواد پاشا کو بھیجے تھے. ایک قصیدہ کے چند اشعار یہ ہیں:

اعیذک اللہ ان تمیل الی   مقال واش یسعی علی ختل

میں تم کو خدا کی پناہ دلاتا ہوں کہ تم چغلخوروں کی بات سنو جو شک پیدا کرنا چاہتے ہیں،

وکیف تاخذنی باغراء ذی   حقد یکثر الجهد او تحلی

اور تم میرے حاسدوں اور دشمنوں کے بھڑکانے سے کس طرح قید کر سکتے ہو،

اشبه خلقا بالذئب مفترسا   طار اسمه فی الذئب یا الحسل

وہ دشمن جو اپنی جبلت میں خونخوار بھیڑیا ہے اور جس کا نام اس حیثیت سے مشہور ہے

لولا البنون وما اخاف لهم   ضیما یلم بهم علی عجل

اگر بچے نہ ہوتے اور ان پر آنے والے مصائب کا خیال نہ ہوتا

ما کنت اضرع ان تحولنی   عن مقعد الفضل [illegible]

تو میں ہرگز اس عاجزی سے التجا نہ کرتا کہ مجھے اس رتبہ سے ہٹا کے [illegible]

ادیب اسحاق (۱۸۵۶ء–۱۸۸۵ء)

ادیب اسحاق ۱۸۵۶ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، وہیں تعلیم حاصل کر کے بیروت میں ملازمت اختیار کرلی، پھر اس کو چھوڑ کر اخبار "ثمرات الفنون" اور "التقدم" میں یکے بعد دیگرے کام کرنے لگے، اس کے بعد اسکندریہ چلے گئے اور سلیم نقاش کے ڈراموں کی تشکیل میں ان کی مدد کرنے لگے، وہاں سے قاہرہ آکر ایک ہفتہ وار رسالہ ۱۸۷۷ء میں "مصر" کے نام سے جاری کیا، اس کے بعد انھوں نے اور سلیم النقاش نے مل کر اسکندریہ سے ایک روزنامہ "التجارۃ" کے نام سے نکالا، کچھ دنوں کے بعد اخبار بند ہوگیا، اور پھر وہ پیرس چلے گئے اور ۱۸۸۰ء میں وہاں سے ایک عربی رسالہ "مصر القاہرہ" کے نام سے جاری کیا، وہاں سینہ میں کچھ تکلیف پیدا ہوگئی، اس لیے بیروت آگئے، اسی دوران میں مصر میں ان کا تقرر دیوان المعارف قاہرہ میں ترجمہ و انشا کے دیوان کے "ناظر" کی حیثیت سے ہوگیا، پھر پارلیمنٹ میں کاتب ہوگئے، لیکن اعراب کی بغاوت کے بعد بیروت لوٹ آئے، اور لبنان کے ایک گاؤں "حدث" میں وفات پائی۔

کل ۲۹ برس کی عمر پائی، مگر اس مختصر مدت میں انھوں نے بڑا کام کیا، فرانسیسی اور ترکی میں مہارت حاصل کی، مختلف ممالک کے سفر کیے، سیاسی مسائل سے دلچسپی لی، شاعروں میں امتیاز سے [illegible] مندرجہ ذیل کتابیں یادگار چھوڑیں:

۱۔ نزہۃ الاحداق فی مصارع العشاق،

۲۔ تراجم مصر فی ہذا العصر

۳۔ [illegible]: فرانسیسی ناول کا ترجمہ

۴۔ شارلمان: فرانسیسی ناول کا ترجمہ

۵۔ [illegible]: فرانسیسی ناول کا ترجمہ

[illegible] نظموں اور مقالات کا مجموعہ

ان کے کلام میں شاعرانہ خیالات کی پریشان خیالی کم اور مسائل حیات زیادہ ہیں، زندگی میں قوت، عمل اور حرکت تھی، یہی کیفیت ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے، منہ کے تھیٹ روایتی شاعری سے ان کا دامن پاک ہے، انھوں نے زندگی کے حقائق کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اور فکر و نظر کو نئی راہیں اس وقت دکھائیں جب مشرق میں ہر طرف اندھیرا تھا اور غلامی کا گھر چھایا ہوا تھا۔

انگریزی کی ایک مثل ہے: (Might is Right) قوت حق اور راستی ہے، شاید اسی تخیل سے متاثر ہو کر اور یورپ کے سیلاب قوت کو دیکھ کر انھوں نے "الحق للقوة" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں،

قتل امرئ في غابة جريمة لا تغتفر ۔۔۔ وقتل شعب آمن مسألة فيها نظر

کسی آدمی کا جنگل میں قتل کر دینا ناقابل معافی ہے، لیکن ایک پُرامن قوم کا قتل ایک ایسا مسئلہ ہے جو محل نظر ہے۔

والحق للقوة لا يعطاه الا من ظفر

حق صرف طاقت کے لیے ہے اور حق صرف کامیاب انسان کو دیا جاتا ہے

یہ دراصل یورپ کی خونخواری پر ایک طنز ہے، عورت کے بارے میں ان کے خیالات یہ ہیں:

حسب المرأة قوم آفة ۔۔۔ من يدن منها من الناس هلك

کچھ لوگوں نے عورت کو آفت تصور کیا کہ جو شخص اس کے قریب گیا وہ ہلاک ہو گیا،

ورآها غيرهم امنية ۔۔۔ ملك النعمة فيها من ملك

کچھ لوگوں نے اس کو (حسین) آرزو سمجھا کہ جس کو یہ نعمت مل گئی

وصواب القول لا يجهله ۔۔۔ حاكم في مسلك الحق سلك

لیکن راہ حق اختیار کرنے والا صحیح بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا

إنما الفتاة مرآة بها   كل ما تنتظر منها ...

... ایک آئینہ ہے جس میں تمھاری تمنائیں نظر آتی ہیں۔

فهي شيطان إذا أفسدتها   وإذا أصلحتها فهي ملاك

وہ شیطان ہے اگر تم اس کو خراب کر دو، اور اگر اس کی اصلاح کر لو تو وہ فرشتہ ہے

(جبرائیل الدلال ۱۸۳۶ء - ۱۸۹۲ء)

۲ فروری ۱۸۳۶ء میں حلب میں پیدا ہوئے، ان کے والد عبد اللہ دلال مشہور اہل علم میں تھے۔ ۱۱ سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا، ان کی ...چی نے ان کی پرورش کی، حلب میں انھوں نے فرانسیسی اور اطالوی زبانیں سیکھیں، ترکی میں بھی ...ک حاصل کیا، بچپن میں عربی ادب کے اہم ادبی نمونوں کو زبانی یاد کیا تھا جس سے ان میں ...ربیت رچ بس گئی تھی۔

وہ پہلے استنبول گئے، وہاں سے لوٹ کر شادی کی، پھر فرانس، اٹلی اور اسپین کا سفر کیا، اس سفر میں پرتگال بھی گئے، اس عرصہ میں وہ مختلف سرکاری کام بھی کرتے رہے، اور ان کی شہرت ایک مترجم کی حیثیت سے ہو گئی، عرب سفراء کے ترجمان کی حیثیت سے بڑی دولت پیدا کی، وزیر اعظم خیر الدین تونسی کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کیا، ایک کالج میں ملازمت بھی کی، ۱۲ برس یورپ میں گزار کر وطن آئے، مگر یہاں ان کے دشمنوں نے ان کے ایک قصیدہ "العرش والہیکل" پر اعتراضات کیے اور حکومت کی نگاہ میں ان کو باغی بنا دیا، اور وہ گرفتار کر کے قید کر دیے گئے، ۱۸۹۲ء میں ۵۶ برس کی عمر میں جیل میں انتقال کیا، ان کے اعزہ نے لاش لے جا کر وطن میں دفن کیا۔

"العرش والہیکل" ان کی بہت اہم یادگار ہے، اس قصیدہ میں ڈیڑھ سو سے زیادہ اشعار ہیں، اس میں پہلے سلطان اور بادشاہت کو ختم کر کے جمہوری حکومت کے قیام کی ترغیب ...

دی گئی ہے۔ تھا ... قصیدہ عبد الحمید کی حکومت میں اس سے بڑا جرم کوئی نہ تھا۔ یہ قصیدہ ... نے
پیرس کی آزاد فضا میں لکھا تھا،

اس قصیدہ کی ابتدا دینی طبقہ کی حرص دولت اور دنیا سازی سے ہوتی ہے:

كل الأنام وإن تباين حالها — فالمال جل القصد من مطلوبها

اختلاف احوال کے باوجود کل مخلوق کا سب سے بڑا مقصود مال ہے،

فلكنيسة احبار روما دونت — للناس كفارات عن ذنوبها

اسی کو کمانے کے لیے کنیسہ اور روم کے پادری گناہوں کے کفارے لوگوں کے لیے تقسیم کرتے ہیں۔

ولأجله القسان في بيعاتها — باعت ذخائرها وعود صليبها

اور اسی کے لیے پادری عبادت گاہوں کے ذخائر اور صلیب کی لکڑیاں فروخت کرتے ہیں۔

مطلق العنان بادشاہوں کے ظلم و جور کا ذکر ہے

وكذا الملوك طغت به كرما جرى — فينا من استبدادها وثوبها

یہی بادشاہوں کا حال ہے، ان کے ظلم و زیادتی کے خلاف کوئی آواز نہیں بلند کر سکتا۔

پھر قوم کو ان کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے پر ابھارتا ہے؛

هيا انهضوا وبطردها اجتهدوا فقد — ساد الدمار وعم من تخريبها

آؤ، اٹھ کھڑے ہو، بادشاہوں کو نکال باہر کرو، فساد پھیل گیا ہے اور تخریب عام ہو گئی ہے۔

آخر میں جمہوری نظام کے قیام کی دعوت دیتا ہے

"وليحكم الجمهور من عقلائه"

چاہیے کہ جمہور کا عقلمند طبقہ حکومت کرے

جمہوریت کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے:

فلسطین میں جمہوریت ... شعر و صوت ... [illegible]

تمام حقوق میں اتنی مساوات ہونی چاہیے کہ چھوٹے آدمی کی آواز بھی بڑے اور عقلمند آدمی کی طرح سنی جائے کہ بڑے آدمی اور چھوٹے کی تفریق باقی نہ رہے۔

حتی تری کل الوری فوق الثری ‖ بالامن یعیش شانها مع دینها

یہاں تک کہ وہ مذہب کی مخالفت [illegible] امن کی زندگی بسر کریں گے اور ہر ایک اپنے مذہب کے ساتھ رہ سکیں

عبد المسیح الانطاکی ۱۸۷۴ء - ۱۹۲۲ء

عبد المسیح کا خاندانی تعلق یونان سے تھا، مگر ان کے آباء و اجداد انطاکیہ چلے آئے تھے، پھر حلب میں آباد ہو گئے۔ عبد المسیح حلب میں ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے۔ اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ پھر تقریباً کل عرب ملکوں کا دورہ کیا، اور وہاں کے امیروں کی شان میں قصیدے لکھے خصوصاً عزیز علی خان شیخ المحمرہ کی شان میں کئی قصیدے پیش کیے اور بڑا انعام و اکرام حاصل کیا۔ خلیفہ عبد الحمید کے ظلم سے پوری عرب دنیا نالاں اور دستوری جمہوری حکومت کی خواہاں تھی، اس لیے عبد المسیح نے جمہوری حکومت کے قیام کو اپنا مقصد قرار دیا اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے لیے "الشذور" کے نام سے ایک رسالہ نکالا، پھر دوسرا رسالہ "مصر" "الشہباء" اس کے بعد "العمران" نکالا۔

ان کی حسب ذیل تصانیف ہیں:-

(۱) خلیفة الامانی فی دستور العثمانی (۲) النہضة الشرقیة (۳) القصیدة العلویة المبارکة،

عبد المسیح کا سب سے بڑا کارنامہ ان کا قصیدہ علویہ ہے، جس کو وہ "ملحمہ" کہتے ہیں، یہ قصیدہ اہل مغرب کے طرز پر لکھا گیا ہے۔ ملحمہ کے لغوی معنی واقعہ عظیمہ کے ہیں۔ اس قصیدہ میں حضرت علی کی عظمت، ان کی جوانمردی اور [illegible] اسلامی تاریخ اور ان کے [illegible] پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاعر اگرچہ عیسائی ہے مگر متعصب نہیں، وہ خود ایک جگہ کہتا ہے کہ بچپن میں ہمارے خاندانوں میں عیسائی اور مسلمانوں میں نفرت تھی، عیسائی مسلمانوں کی مذمت کرتے تھے لیکن [illegible] کے [illegible]

میری دانست اس معزز قوم کے بارہ میں دوسرے عیسائیوں کی رائے سے مختلف ہوگی سنیے،

ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:-

والعرب من اقدم الوری حسباً — اذا رجعنا الی تاریخ ماضیها

عرب تمام مخلوق میں عزت و وقار کے لحاظ سے قدیم تر ہیں، اگر ہم ان کی تاریخ پر نظر ڈالیں

مع خشونتها فی عیشها لطفت — اخلاقها وسمت سموا مبادیها

باوجود کھردرے پن کے انکی زندگی میں لطف ہے اور ان کے اخلاق بلند ہیں،

وانما الشعر تاریخ الاعاریب قد — ابقی لها ابدا ذکری معالیها

شاعری عربوں کی تاریخ ہے جس نے ان کی عظمتوں کو جاوداں بنا دیا ہے۔

فیه عرفنا مغازیها وهمتها — وکل سام عظیم من مآتیها

اسی سے ہم ان کی جنگوں اور ان کی بہادری سے آگاہ ہوئے اور انکے کارنامے عظیم ہیں،

اما شمائلها الغراء التی بلغت — بها الفخار فلیس العد یحصیها

ان کے بلند اخلاق قابل فخر اور حد شمار سے باہر ہیں،

ان عاهدت حفظت رغم الزمان لهو — وان تصدقه بالارواح تفدیها

اگر وہ عہد کرتے ہیں تو زمانہ کے خلاف دوستی کے عہد کو پورا کرتے ہیں، اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دیتے ہیں،

وضیفها الرحب حفظ الزمان به — حتی ولو کان من اعدی اعادیها

اور ان کا مہمان اپنے ساتھ زمانہ کی خیانت کا تصور نہیں کر سکتا، خواہ وہ بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو،

سه الادب العربی المعاصر فی سوریة، دار المعارف مصر، مصنفہ سامی الکیالی ص ۱۸

لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ

از جناب مولانا قاضی اطہر صاحب مبارکپوری ایڈیٹر البلاغ بمبئی

ہندستان کے علمی و تحقیقی مراکز میں دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد، دار المصنفین اعظم گڑھ، ندوۃ المصنفین دہلی اور مجلس علمی ڈابھیل بڑی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے علاوہ بعض دوسرے خالص علمی و تحقیقی ادارے بھی ہیں جو کسی طرح ہندستان کے اداروں سے کم نہیں ہیں، انہیں میں لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد بھی ہے، مگر افسوس کہ ہندستان کے اہل علم اس ادارہ سے بہت کم واقف ہیں اور ارباب علم و تحقیق کے حلقے کے علاوہ اس کا نام شہرت نہیں ہے، اس کی بڑی وجہ اس ادارہ کے مخلص ارباب نظم و نسق کی بے نیازی اور عام اہل علم کی بے پروائی ہے۔

۱۳۳۰ھ میں حضرت مولانا ابو الوفاء صاحب افغانی مدظلہ کی سرپرستی میں چند مخلصین نے فکر اپنے طور پر فقہ احناف کی امہات الکتب شائع کرنے کے لیے لجنۂ احیاء المعارف النعمانیہ کے نام سے اس ادارہ کو قائم کیا اور ہندستان میں فقہ احناف کی خدمات کا کفارہ ادا کیا، چنانچہ انہوں نے امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور دوسرے قدیم ائمہ احناف کی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible]

کے اہل علم اس کی پوری قدر نہ کر سکے، اور نادر نسخے و حدیث کی یہ نادر و نایاب اور اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں [illegible]
کیونکہ عام مذاق کے مطابق احیاء المعارف النعمانیہ کے کارکنوں نے اخبارات و رسائل اور دوسرے [illegible]
نہیں کیا، بلکہ کام میں لگے رہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس خالص علمی ادارہ سے ہم اتنے بے خبر اور
بے نیاز ہیں کہ اس کی مطبوعہ کتابوں تک سے ناآشنا ہوں، ہندوستان کے اہل علم خاص طور سے علمائے احناف کی
یہ ناقدرشناسی بڑی افسوسناک ہے۔

البتہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے علامہ سید سلیمان ندوی نے بعض خطوط میں جو مولانا [illegible] کے نام ہیں احیاء المعارف النعمانیہ کا ذکر نہایت فاضلانہ انداز میں قدردانی اور محبت افزائی کے طور پر کیا ہے (یہ خط معارف کی کسی گذشتہ اشاعت میں چھپ چکا ہے) خود اس کے بانی و صدر مولانا ابوالوفا افغانی نے راقم کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا ہے کہ سید صاحب ہمارے کام کی بڑی قدر کرتے تھے، اور جب ان کو ہماری کوئی کتاب یہاں سے شائع ہوتی اور ان کی خدمت میں روانہ کی جاتی تو نہایت مسرت و انبساط کے ساتھ معارف میں اس کا ذکر فرماتے اور ہماری ہمت افزائی فرماتے۔

پچھلے دنوں راقم نے اس ادارہ کی دو ایک کتابوں کا تفصیلی تعارف معارف میں کرایا ہے، جی چاہتا ہے کہ اسی سلسلہ میں اس ادارہ کی تمام مطبوعات کا سرسری تعارف کرا دیا جائے تاکہ اہل علم کو اس ادارہ کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہو سکے اور وہ ملک کے دیگر علمی و تحقیقی اداروں کی طرح اس سے بھی [illegible]۔

[illegible] میں اس ادارہ نے پہلی کتاب [illegible] شائع کی [illegible]
احیاء المعارف النعمانیہ کا تعارف بعنوان [illegible]

"امت اسلام کو [illegible]
اور آپ کے اصحاب اور اصحاب کے اصحاب کی تصانیف [illegible]
طباعت و اشاعت کا [illegible]
کا جتنا [illegible]

[illegible] مجلس [illegible] کتاب [illegible]

[illegible] شرح [illegible] السیر الکبیر [illegible]

[illegible] دستیاب [illegible] اہل علم [illegible]

مجلس ہذا کی مطبوعات [illegible] کتب [illegible] مقامات مندرجہ ذیل سے طلب کی جا سکتی ہیں (الف)

دفتر مجلس احیاء المعارف النعمانیہ [illegible] چال [illegible] حیدرآباد (ب) جناب [illegible]

[illegible] مجلس احیاء المعارف النعمانیہ مدرسہ نظامیہ حیدرآباد (ج) محمد اکبر علی معتمد مجلس احیاء المعارف النعمانیہ

بازار گھانسی حیدرآباد دکن

یہ اشتہار محمد اکبر علی معتمد مجلس کی طرف سے [illegible] میں شائع ہوا اور مجلس کی فہرست میں [illegible] ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ [illegible] میں یہ مجلس مولانا ابو الوفا افغانی مدرس مدرسہ نظامیہ اور محمد اکبر علی معتمد مجلس [illegible]

[illegible] کی کوشش سے قائم کی گئی جس کا بنیادی مقصد ائمہ احناف کی امہات کتب کی اشاعت تھا [illegible]

کتابیں [illegible] اشاعت [illegible] سے [illegible] تک ۳۰ سال کی مدت میں [illegible]

مندرجہ ذیل کتابیں شائع کیں [illegible] ہر کتاب کا [illegible] مختصر الفاظ میں کرتے ہیں تفصیلی [illegible]

مقصود نہیں۔

(۱) کتاب العالم والمتعلم [illegible] کی تالیف [illegible]

[illegible] اس کتاب [illegible]

[illegible] کتب خانہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کل صفحات ۳۰ تھے، تعداد طبع ایک ہزار تھی، کتابت، طباعت اور کاغذ معمولی تھا، [illegible]
اس وقت [illegible] تھا،

۲۔ شرح کتاب النفقات:۔ امام ابو بکر احمد بن عمر الخصاف الحنفی المتوفی ۲۶۱ھ کی کتاب
النفقات کی شرح ہے، اور امام ابو محمد حسام الدین عمر بن عبد العزیز بن مازہ الحنفی المعروف بالصدر الشہید کی تصنیف ہے۔
اس کتاب کے قلمی نسخے کتب خانہ شیخ الاسلام مدینہ منورہ میں تھے، وہاں سے اس کی نقل منگوائی گئی،
مگر یہ نسخہ اغلاط سے پر تھا، اس لیے مولانا ابو الوفا افغانی اور مولوی سید مبارک حسین اور حضرت مولوی حکیم
ارکان مجلس نے اس کی تصحیح کی، چونکہ شرح النفقات کی اکثر عبارتیں محیط برہانی سے منقول ہیں، اس لیے تصحیح میں اس کتاب
سے بھی مدد لی، یہ کتاب ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ میں طبع ہوکر شائع ہوئی، اس کے کل صفحات ۱۰۵ ہیں، اس میں
کتابت، طباعت اور کاغذ معمولی ہے، اس پر حاشیہ مولانا افغانی نے لکھا ہے۔

۳۔ کتاب الآثار بروایۃ القاضی ابی یوسف:۔ یہ کتاب دراصل مسند امام اعظم ابو حنیفہ ہے جس کو امام
ابو یوسف نے امام صاحب سے روایت کیا اور بعض مقامات پر اپنی مرویات دوسرے شیوخ سے بھی ذکر کی ہیں، اس کو مسند ابی یوسف بھی کہتے
ہیں، اس کی روایت امام ابو یوسف کے صاحبزادے یوسف بن یعقوب نے کی ہے، ہندوستان کے
اور مصر کے کتب خانوں میں تلاش بسیار کے باوجود اس کتاب کا کوئی نسخہ نہ مل سکا، صرف دار الکتب المصریہ میں
ایک قدیم ناقص نسخہ ملا، اس میں سقط اور تصحیف بہت زیادہ تھی، درمیان کے بعض اوراق غائب تھے، کتاب الصلوٰۃ،
کتاب الایمان، کتاب الحدود، اور کتاب الشہادۃ ناقص تھے، تقدیم و تاخیر کی وجہ سے کتاب بالکل درہم برہم ہو گئی تھی،
کتاب النکاح میں کتاب الطلاق کے آثار [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی کتاب ... صفحات میں ہے۔

[illegible] جامع کبیر امام محمد کی [illegible]

جن کے بارے میں امام محمد بن شجاع ثلجی نے فرمایا ہو کہ اسلام میں فقہ کے موضوع پر امام محمد کی جامع کبیر جیسی کوئی دوسری کتاب نہیں لکھی گئی۔ امام محمد کی مثال جامع کبیر میں ایسی ہے کہ کسی آدمی نے ایک محل بنایا جوں جوں عمارت اونچی ہوتی گئی سیڑھیاں بڑھتی گئیں یہاں تک کہ جب محل مکمل ہو گیا تو تمام سیڑھیاں گرا دیں اور لوگوں سے کہا کہ اب تم اس کے بام و در پر چڑھو۔ اس عظیم کتاب کی اشاعت کے لیے مجلس نے استنبول اور مصر کے کتب خانوں کو کھنگالا۔ استنبول میں ایک [illegible] نسخہ [illegible] کتب خانہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

جامع کبیر [illegible] کے بعد قابل اشاعت ہوئی [illegible]

[illegible]

[illegible] صفحات [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

کتاب السیر الکبیر لکھی جس میں امام اوزاعی کی کتاب السیر کے بعض بعض مقالات پر تنقید کی
ہے مستقل رسالہ لکھا چونکہ امام محمد اور امام ابو یوسف نے سیر الکبیر کا فن براہ راست امام سے [illegible]
اس لیے انھوں نے امام اوزاعی کی تنقید کا [illegible] جواب دیا، اس [illegible] کا
صرف ایک نسخہ ہندوستان میں مل سکا، اسی کو تصحیح و تعلیق کے بعد شائع کیا گیا، یہ خدمت مولانا
۱۳۵۷ھ میں مصر میں مجلس کے وکیل رضوان محمد رضوان کی زیر نگرانی شائع ہوا کاغذ [illegible]
اور فٹ نوٹ میں مولانا افغانی کے علمی و تحقیقی حواشی ہیں، کل صفحات ۱۳۵ ہیں، اس کے [illegible]
فہرست مضامین ہے۔

۲۔ اختلاف ابی حنیفۃ و ابن ابی لیلیٰ، للقاضی الامام ابی یوسف [illegible]

امام ابن ابی لیلیٰ سے تعلیم حاصل کرتے تھے پھر امام ابو حنیفہ کے یہاں پہنچے اور بعد میں اپنے دونوں کے مختلف فیہ فقہی مسائل کو اس کتاب میں جمع کیا، چونکہ امام ابو یوسف نے اس کتاب میں احادیث اور سنۃ منقطعہ [illegible] کو بکثرت جمع کیا ہے اس لیے اس کی بڑی اہمیت ہے، اس کا صرف ایک نسخہ ہی مل سکا، اس کو تعلیق و تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ۱۳۵۷ھ میں مطبعۃ الوفا مصر میں [illegible] زیر اشراف رضوان محمد رضوان وکیل مجلس چھپا، ابتدا میں [illegible] صفحات کا مقدمہ [illegible]

۳۔ مناقب الامام ابی حنیفۃ و صاحبیہ ابی یوسف و محمد بن الحسن، للامام ذہبی

[illegible] امام ابو حنیفہ اور صاحبین کے حالات و مناقب درج کیے ہیں، امام ابو حنیفہ کے مناقب [illegible] حیدرآباد کے کتب خانے سے [illegible] اور صاحبین کے حالات و مناقب کا حصہ مصر میں علامہ زاہد کوثری کے پاس [illegible] اس لیے [illegible] تمام [illegible] مولانا افغانی نے اس پر حاشیہ لکھا، اسی طرح [illegible] کی تعلیق [illegible] یہ کتاب [illegible] امام ابو حنیفہ کا ذکر [illegible] کے بعد امام ابو حنیفہ کا حال [illegible] امام محمد [illegible] کتاب کے کل صفحات ۱۰۴ ہیں، رضوان محمد رضوان وکیل مجلس مشرف ہیں، اس کا کاغذ معمولی ہے

[illegible]

[illegible] مختصر الطحاوی : یہ امام ابو جعفر طحاوی متوفی [illegible] کی [illegible]

[illegible] مختصر [illegible] امام [illegible] کی [illegible]

[illegible] کی کتاب مختصر القدوری کی ترتیب پر مرتب کیا ہے ، ابن [illegible]

[illegible] شیخ الاسلام [illegible] کے کتب خانہ میں تھا [illegible]

[illegible] کو اصل [illegible] دیا گیا ، اور [illegible] کر کے [illegible]

مولانا ابو الوفا افغانی کی [illegible] میں [illegible] مطبعہ [illegible] سے [illegible] کے ساتھ چھپ گئی ہے ،

کل صفحات ۴۰۰ ہیں ، اگر مختصر القدوری کی جگہ ہمارے مدارس میں اسے رواج دیا جائے تو بہت فائدہ

ہو ، اس میں بہت سے مسائل و فروع نادر ہیں اور طرز بیان اور ترتیب بھی بہت اچھی ہے ،

۹۔ اصول السرخسیؒ :۔ یہ امام ابو بکر محمد بن احمد بن ابی سہل سرخسی حنفی متوفی ۴۹۰ھ کی

اصول فقہ پر اہم ترین کتاب ہے ، ابتداء میں پتہ چلا کہ [illegible] کتب خانہ [illegible] اس کے دو نسخے [illegible]

ہیں [illegible] ابو الوفا افغانی نے نقل اور مقابلہ کر کے ایک نسخہ [illegible] حیدرآباد [illegible]

[illegible] کتب خانہ [illegible] کتاب کی طباعت کے آخری ایام میں [illegible]

اصول [illegible] اصول فقہ پر [illegible] کتاب [illegible]

[illegible]

[illegible]

۱۰۔ [illegible] شرح الزیادات [illegible]

۱۱۔ شرح الزیادات للعتابی :

[illegible]

[illegible]

بیاض [illegible]

[illegible] نسخہ [illegible] تحریر [illegible]

[illegible] کتب خانہ [illegible] کتب خانہ شیخ الاسلام [illegible] مدینہ [illegible]

فوٹو منگائے گئے، اور تینوں سے مقابلے کے بعد نسخہ مکمل کیا گیا، شرح معانی الآثار کا نسخہ [illegible] کتب خانہ [illegible]

کتب خانہ [illegible] پٹنہ میں تھا، اس کا عکس منگایا گیا، [illegible]

ایک صفحہ پر پہلے شرح [illegible] اور اس کے [illegible] رکھا گیا، پھر شرح معانی الآثار اور اس کے [illegible]

اس مجموعہ کی طباعت ۱۳۶۸ھ میں حیدرآباد میں نہایت عمدہ عربی ٹائپ میں ہوئی، کیونکہ [illegible]

سے مصر میں مجلس کی کتابوں کی طباعت کا سلسلہ منتقل ہو گیا تھا، کل صفحات [illegible] ہیں، اس کے بعد ۲۵

صفحات میں مختلف فہرستیں اور چار صفحات میں صحت نامہ ہے۔

۱۲۔ کتاب الحجۃ علی اھل المدینۃ: یہ امام محمد کی بڑی معرکہ کی کتاب ہے [illegible] تفصیلی

تبصرہ معارف میں چھپ چکا ہے، امام محمد نے اس کتاب میں امام مالک اور دیگر علمائے مدینہ کے مقابلہ میں امام

ابوحنیفہ اور علمائے عراق کے فقہی اختلافات میں اہل مدینہ کے مقابلہ میں اہل عراق کا [illegible]

والآثار ہونا ثابت کیا ہے، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ فقہ حنفی [illegible]

[illegible] کتب خانہ مدینہ منورہ میں اس کا ایک نسخہ [illegible] تھا، [illegible]

[illegible] صفحات [illegible] کتب خانہ [illegible] ایک نسخہ [illegible]

تھا، اور خود حیدرآباد میں مولانا انوار اللہ صاحب کے کتب خانہ میں ایک نسخہ [illegible]

اسی کو اصل قرار دے کر اصل نسخہ مرتب کیا گیا، اس کتاب کی تصحیح و تعلیق [illegible]

[illegible]

[illegible] صفحات [illegible]

دعوت اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی ہندوستان سے اور اہل ہند کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے واقفیت عہد رسالت میں عرب میں ہندوستانی اشیاء کے رواج اور اسلام اور مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کا ذکر ہے، کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جس میں عرب میں آباد سات ہندوستانی قوموں کے ناموں کی تحقیق اور ان کے متعلق تفصیلی معلومات لکھے گئے ہیں، ضمناً جاہلی عرب اور ہندوستانیوں کے بعض مذہبی عقائد مثلاً اصنام پرستی میں یکسانی، عرب کے ہندوؤں کے صابیہ و مجوس ہونے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہندوستانی راجاؤں کے وفود کی آمد اور ہدایا کی پیشکش، دونوں ملکوں کی زبانوں کے توارد کی بعض مثالیں بھی تحریر کی گئی ہیں، حضرت سید صاحبؒ کی تصنیف عرب و ہند کے تعلقات اس موضوع پر اتنی جامع اور مبسوط ہے، اور اس میں عرب و ہند کے تعلقات کے ہر پہلو پر اتنے معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں، کہ ان پر مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، اس کتاب میں بھی اس سے استفادہ کیا گیا ہے، تاہم مصنف نے بعض نئی باتیں بھی لکھی ہیں، لیکن عہد رسالت کے واقعات اور عرب و ہند کے تعلقات کے ذکر میں ماخذوں کی صحت و استناد کا جس قدر اہتمام و لحاظ ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہے، بعض مباحث میں غیر ضروری تکرار بھی ہو گئی ہے جو گراں گذرتی ہے، مجموعی حیثیت سے کتاب مفید اور مطالعہ کے لائق ہے،

عظیم بیداری اور جمہوریت کا چیلنج مترجمہ جناب جلیس عابدی صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۹۲، قیمت ۸ روپیہ

پتہ: نیشنل اکاڈمی، انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی، نمبر ۶

مشہور برطانوی مفکر جان سٹریچی نے اپنی وفات سے کچھ پہلے سنہ ۱۹۶۰ء میں چند تقریریں کی تھیں، یہ کتاب ان کا اردو ترجمہ ہے، اس کے پہلے حصہ میں پانچ اور دوسرے میں دس تقریریں ہیں، ان میں مصنف نے پرانی نوآبادیاتی حکومتوں کا اجمالی جائزہ لیا ہے، اور موجودہ

مطبوعاتِ جدیدہ

کتاب المعتمد فی اصول الفقہ مرتبہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، شائع کردہ مجمع علمی فرانسیسی

لابی الحسین البصری المعتزلی | دمشق، ضخامت ۱۰۸۰ صفحات، قیمت ؟

معتزلیوں کی کتابیں ناپید سی ہیں، ان کے عقائد پر کچھ چیزیں چھپی ہیں لیکن اصول فقہ پر اُن کی یہ پہلی کتاب ہے جو شائع ہوئی ہے، یہ اچھے کاغذ، اچھی طباعت اور اشاریہ وغیرہ کے ساتھ دو ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، شروع میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے چالیس پچاس صفحوں میں ایک ضخیم دیباچہ فرانسیسی زبان میں لکھا ہے، اس میں نہ صرف ابو الحسین کی سوانح عمری اور کتاب کے مختلف مخطوطات کا ذکر ہے، بلکہ دو اہم امور پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے، پہلے تاریخ عالم میں اصول فقہ کی اہمیت بتائی گئی ہے، دنیا کے ہر ملک اور ہر زمانے میں قوانین و احکام پائے جاتے رہے ہیں، چین، ہند، بابل، مصر، یونان، روما، جنوبی امریکہ ہر جگہ ایسے مجموعے قدیم زمانہ سے ملتے رہے ہیں، لیکن ایک ایسا علم قانون جس میں احکام و قواعد سے بحث نہ ہو بلکہ نفس قانون کی ماہیت پر مختلف پہلوؤں سے نظر ڈالی گئی ہو، یہ اسلام سے پہلے کسی قوم میں نہیں ملتا، اسی کو اصول فقہ کہتے ہیں، جس کا اطلاق کسی بھی ملک کے قانون پر کر سکتے ہیں، کیونکہ اس میں بحث اس سے ہوتی ہے کہ قانون کا فلسفہ کیا ہے؟ اس کے ماخذ کیا ہیں؟ اس کی تعبیر، تبدیلی، اشتباہ، تنسیخ وغیرہ کے کیا قاعدے ہیں؟ اس کی موجودہ قدیم ترین کتاب امام شافعی کا "الرسالہ" ہے، اگرچہ اس سے پہلے امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد شیبانی کی بھی ایسی تالیفوں کا ذکر سوانح نگاروں نے صراحت سے کیا ہے، یہ دلچسپ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ان مسلمان مؤلفوں نے قانون کو ایک درخت قرار دیکر اس کے دو حصے کیے ہیں، فروع یعنی شاخیں جن میں احکام کی تفصیل ہوتی ہے، اور اصول یعنی جڑیں جس میں علم قانون کی ماہیت سے بحث کی جاتی ہے

[illegible] ضرورت [illegible] نقل [illegible] بعد [illegible]

بعض [illegible] ہوجاتی ہے، مثلاً [illegible]

[illegible] کتاب [illegible] مقدم [illegible]

حدیث کے واجب العمل ہونے [illegible] تعلق نظام نے ایک [illegible]

کو فیصلے کے لیے دو گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے، گواہ صرف ایک دستیاب ہو تو وہ [illegible]

ثبوت کے لیے [illegible] کافی نہیں سمجھتا، اسی طرح [illegible] حدیث کے بھی دو راوی [illegible]

رد کرتا اور خبر واحد کو بھی واجب العمل قرار دیتا ہے۔

[illegible] مکرو [illegible] ملتان [illegible] مطبوعہ [illegible] متوسط [illegible]

[illegible] جماعت [illegible] جو کہ [illegible]

[illegible] جماعت اسلامی پاکستان کے مشہور رکن [illegible]

ہیں جب حکومت نے جماعت اسلامی کو [illegible] قرار دیا تو یہ بھی گرفتار ہو گئے تھے [illegible]

زیر تبصرہ کتاب اسی اسیری کی [illegible] حکومت [illegible] اور جماعت کی بے گناہی کا فیصلہ تو عدالت کر چکی ہے

لیکن مصنف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ جماعت کو اس کے جمہوری حق اور اسلامی نظام کے مطالبہ [illegible]

انھوں نے اسلامی تحریک کے بعض [illegible] کے واقعات تحریر کیے ہیں [illegible] اور

[illegible] بعض مسائل [illegible] ہے

[illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible] مولانا [illegible]

ایک مقالہ [illegible] جناب [illegible] کی صحت [illegible]

[illegible] اور ان کی تصنیفات نظم [illegible]

[illegible] مولانا [illegible] کیفیات کی [illegible] اور [illegible] ہندوستان کے [illegible]

[illegible] سب کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خصوصیت سے پڑھنے کے لائق ہیں۔ رسالہ مختصر ہونے

کے باوجود پُرمغز اور جامع ہے۔

گیتا: مترجمہ جناب حسرت سہروردی صاحب [illegible] صفحات ۱۰۲

مجلد قیمت [illegible] پتہ: ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی۔

گیتا [illegible] کتاب سنہ عیسوی سے بھی کچھ پہلے کی [illegible] ہے [illegible]

[illegible] اور خاتمہ عشق و محبت اور [illegible] آخری حصہ [illegible]

[illegible] عنوانات کے تحت [illegible] ذکر ہے [illegible]

بتایا جاتا ہے [illegible] مذہب ہندو مت سے متاثر ہے، اسلئے اس کتاب کے [illegible] بعض باتیں [illegible]

لیکن وہ اخلاقی نوعیت کی ہیں اور تقریباً سبھی مذاہب میں مشترک ہیں، اس لیے ان کا مطالعہ سب کے لیے مفید

اور سبق آموز ہوگا۔ ترجمہ سلیس اور شگفتہ ہے۔

مقالات شریعت و حکمت: مولانا حکیم محمد زمان صاحب [illegible] کاغذ، کتابت و

طباعت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد قیمت [illegible] پتہ: [illegible]

یہ مختصر مگر مفید علمی، مذہبی اور معاشرتی مضامین کا مجموعہ ہے [illegible]

[illegible] صاحب کی [illegible] سے ماخوذ ہیں [illegible]

[illegible] عام فہم اور آسان زبان میں [illegible] کے لائق [illegible]

جلد ۱۱۷ ماہ شوال المکرم ۱۳۹۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۷۶ء عدد ۲

مضامین

شذرات

عزیز محترم مولانا محمد عمران خان صاحب ندوی کئی برس سے بھوپال کے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی دعوت دے رہے تھے، مگر ایسے اسباب پیش آتے گئے کہ اس سے محرومی رہی، اس سال اس کی توفیق نصیب ہوئی بستی نظام الدین کے بعد غالباً سب سے بڑا سالانہ تبلیغی اجتماع بھوپال میں ہوتا ہے جس میں ہندوستان کے ہر حصے کے لوگ شریک ہوتے ہیں، تاج المساجد کے آس پاس ایک میلہ سا لگ جاتا ہے اور ایک پوری بستی آباد ہو جاتی ہے جس میں ضروریات زندگی کی تمام چیزیں ملتی ہیں، تاج المساجد میں تین دن تبلیغی مواعظ کا سلسلہ جاری رہتا ہے، پوری فضا دینی ترانوں سے معمور رہتی ہے جس سے ہر شخص بقدر ذوق وطلب حصہ پاتا ہے۔ آخری دن بڑی موثر دعا پر یہ مبارک اجتماع ختم ہوتا ہے اور ملک کے مختلف حصوں میں جماعتیں روانہ ہو جاتی ہیں، معلوم ہوا سورت کے اجتماع کی وجہ سے جو ایک ہی ہفتہ پہلے ہوا تھا اس سال بھوپال میں مجمع کم تھا، پھر بھی میرے تصور سے زیادہ تھا۔

اس دور میں سب سے بڑی تبلیغ خود مسلمانوں کو مسلمان بنانا ہے، اجتماعی شکل میں اس فریضہ کو مسلمان مدت سے فراموش کر چکے تھے، تبلیغی جماعت نے پھر اس کو زندہ کیا، اس کا سب سے بڑا اور نمایاں نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے دینی جمود میں حرکت پیدا ہوئی اور دعوتی نقطۂ نظر سے دین کی راہ میں تکلیف و مشقت برداشت کرنے کا جذبہ پیدا ہوا، یہ اسی جماعت کا فیض ہے کہ بڑے بڑے ناز پروردہ اور [illegible] طبقہ کے [illegible] اپنا عیش و آرام چھوڑ کر اپنے گھروں سے تبلیغ دین کے لیے مشقتیں برداشت کرتے پھرتے ہیں جن کا تصور بھی [illegible]

[illegible]

... اس کا قیام یہاں ... [illegible] ... [illegible]
... دولت ... [illegible] ... شیخ ... [illegible]

[illegible]

اس سفر کے سلسلے میں ایک اہم بات کا ذکر ضروری ہے تاج المساجد ہندوستان کی سب سے عظیم ترین مسجد ہے اس میں وہ حسن و تناسب تو نہیں جو دلی کی جامع مسجد میں ہے لیکن وسعت میں اس سے زیادہ ہے۔ اس کی تعمیر نواب شاہجہاں بیگم نے شروع کی تھی مسجد کی اصل عمارت اور مشرقی و جنوبی سمت کے دالان ان کی زندگی میں مکمل ہو گئے تھے، صدر دروازہ اور شمالی سمت کے دالان زیر تعمیر تھے کہ شاہجہاں بیگم کا انتقال ہو گیا، اور نواب سلطان جہاں بیگم ان کی جانشین ہوئیں۔ نواب شاہجہاں بیگم کے عہد ... بھوپال کی سیاست میں ایسا انقلاب آیا کہ تاج المساجد بھی اس سے نہ بچ سکی، اور نواب سلطان جہاں بیگم نے اس کی تکمیل کی طرف کوئی توجہ نہیں کی، اور وہ نامکمل رہ گئی۔ اس کا ... [illegible] ... میں چھوڑ دیا گیا۔ رفتہ رفتہ مسجد ایک ویرانہ، وحشی جانوروں کا مسکن اور چمگادڑوں کا اڈہ بن گئی۔ مولانا محمد عمران خاں نے جب بھوپال میں مستقل قیام اختیار کیا تو اس مسجد کی آبادی کی طرف توجہ کی اور اس کے ملبے جھاڑیوں اور دالانوں کو صاف کیا اور ان میں مرمت کے بعد ... کر کے ان میں عربی کا ایک مدرسہ قائم کر دیا، یہ دالان اتنے وسیع ہیں کہ ان میں درسگاہ، دارالاقامہ، کتب خانہ اور ان سے متعلق جملہ دفاتر سب ... آ گئے، اور جو مسجد پہلے کانٹوں اور جھاڑیوں کا جنگل تھی ایک صاف ستھری مسجد ... [illegible] ... جہاں دینی علوم کا ... [illegible] ہے۔

[illegible]

[illegible] ... ایک ... [illegible]
... عمران خاں صاحب نے جب اس کا ... [illegible]

تک ہوگئی، سال ۱۹۵۰ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہے، اس پر پچاس ہزار روپیہ صرف ہو چکے ہیں، لیکن ابھی بقیہ کام باقی ہے، خاص طور سے مسجد کی شان و شوکت کے لحاظ سے اس کے وسط اور صحن وغیرہ کو مکمل کرنے کیلئے بہت کچھ جس میں کئی لاکھ کا صرف ہے، موجودہ حالات میں اتنی بڑی ہمت کرنا ان ہی کا کام ہے، مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مسلمان قوم مسجد کی تعمیر میں بڑی عالی حوصلہ واقع ہوئی ہے، آج تک کسی مسجد کی تعمیر محض سرمایہ کی کمی کی وجہ سے نہیں رکی، اور تاج المساجد کی تو تاریخی حیثیت و اہمیت ہے، اگر وہ مکمل نہ ہو سکی تو مسلمانوں کا بڑا نقصان ہوگا اور یہ کہا جائے گا کہ جو کام ایک ریاست موافق حالات میں نہ کر سکی اسکو غریب مسلمانوں نے مخالف حالات میں انجام دیدیا، امید ہے کہ مسلمان خصوصاً اصحاب ثروت اس کار خیر میں پوری فیاضی سے حصہ لیں گے۔

افسوس ہے کہ گزشتہ رمضان میں مولوی محمد یحییٰ تنہا مرحوم نے کراچی میں انتقال کیا، مرحوم اردو زبان کے مشہور اہل قلم، اسکے پرانے خدمتگذار اور متعدد کتابوں کے مصنف و مترجم تھے، انکی سب سے مشہور و مفید کتاب سیر المصنفین اور مرآۃ الشعراء ہیں، دونوں دو دو جلدوں میں ہیں، سیر المصنفین میں شروع سے لیکر موجودہ دور تک کے مصنفین کے حالات اور انکی تصانیف پر تبصرہ ہے، اس میں اردو کی پوری تاریخ آگئی ہے، مرآۃ الشعراء اردو کے شعراء کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

پاکستان میں جن لوگوں کو دار المصنفین کی کتابیں مطلوب ہوں وہ شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب لوہاری گیٹ لاہور سے طلب کریں، معارف کا چندہ کسی صاحب کے پاس جمع ہوتا تھا، وہ اس سال حج کو گئے ہیں اسلئے انکی واپسی تک کوئی صاحب انکے پاس چندہ نہ بھیجیں۔

مقالات

ذالک الفوز العظیم

سفرنامۂ حج مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

[illegible]

حامداً و مصلیاً

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم نے تقریباً پچاس سال پہلے [illegible] میں حج بیت اللہ کیا تھا اور اس کی مختصر روداد بھی قلمبند فرمائی تھی جو اب تک غیر مطبوعہ تھی، یہ روداد ان کے خلف الصدق اور ہمارے محترم بزرگ جناب عبید الرحمن خاں شروانی کی عنایت سے [illegible] کی یادگار ہے، مصنف مرحوم کی تحریری خصوصیات اور اس مقدس سفر کے بعض واقعات کے علاوہ بعض اور دوسرے مفید معلومات پر مشتمل ہے، اس لیے اس تاریخی تبرک کو ناظرین معارف کی ضیافت کے لیے شائع کیا جاتا ہے، مصنف مرحوم نے اس روداد کا نام الفوز العظیم رکھا تھا اس لیے اسی کو قائم رکھا گیا ہے۔

"م"

"بفضلہ تعالیٰ میری تمنا [illegible] سالہا سال سے [illegible] تھا، ہر سال ارادہ ہوتا تھا کہ جو ہر قسم اس مبارک سفر کے لیے [illegible] آں حضرت [illegible] سال اس کا اطمینان نہ تھا، بالآخر فضلِ ربانی سے وہ باسعادت زمانہ آگیا جو [illegible] کے لیے مقدر تھا، [illegible] شروع ہوا،

رب کریم تعالیٰ شانہ حضرت رسول کریم علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کے طفیل میں قبول فرمائے۔

یہ مختصر یادداشت حالات و واردات کی ہے۔

الاعلام آغاز سفر سے قبل متعدد [illegible] وقوع پذیر ہوئے [illegible] قبل از وقت کہے جا سکتے ہیں، میں نشانِ فوز و کامیابی تصور کرکے الاعلام کے عنوان سے درج کرتا ہوں۔

(۱) رجب المرجب [illegible] میں دار [illegible] حاضر ہوکر عرس شریف کے موقع پر دستار [illegible] کی گئی اور حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز قدس سرہ العزیز کی درگاہ پر قرآن شریف سے استمداد [illegible]۔ وہاں ایک شب ایک گائے بیگانہ [illegible] [illegible] میں نے کچھ نذر کیا [illegible] بیٹھ گیا۔ [illegible] آواز [illegible] خواجہ میرا سوٹا ٹوٹ گیا" یہ آواز دلنواز تھی اور میں نے فال نیک لی۔

(۲) [illegible] ماہ رجب میں علماء کی ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا جس نے مسلم یونیورسٹی کے واسطے نصاب دینیات و علوم عربیہ تجویز کیا۔

(۳) ۱۲ شعبان المعظم کو میری بہن [illegible] کا عقد [illegible] ہوا۔

(۴) ۱۵ شہر [illegible] کو میری چھوٹی لڑکی کے عقب سے [illegible] عالم [illegible] ہوا۔ چند [illegible] سامان سفر بفضلہ تعالیٰ مہیا ہوگیا۔

(۵) اسی اثنا میں حصن حصین کے مطالعہ کی برکت سے مسجد [illegible] میں نوافل شروع کیے گئے جو الحمد للہ اب تک جاری ہیں[1]۔

(۶) ۲۲ شعبان کو حاضر حیدرآباد ہوگیا [illegible]

---

[1] بفضلہ تعالیٰ اب بھی جاری ہیں ۲۲ رجب المرجب [illegible] جاری ہیں [illegible] بفضلہ تعالیٰ اب [illegible]

[illegible]

[illegible] حضرت [illegible] حاصل [illegible]

حاصل کیے۔ [illegible] حبیب گنج آگیا۔ چند آدمی [illegible] لگے [illegible] وقت [illegible] حضرت حبیب [illegible]

کی خدمت میں حاضر ہو کر [illegible] برکت حاصل کی [illegible]

[illegible] صاحب [illegible] شوال المکرم [illegible]

دہلی قبل روانگی حضرت پیر و مرشد رضی اللہ عنہ کے تحت [illegible] حاضری ضروری تھی،

چنانچہ ۱۰ شوال المکرم کو شرفِ حضوری حاصل ہوا۔ ایک دن رات حاضر رہا۔ ۱۱ شوال کو بوقت صبح فاتحہ پڑھ کر رخصت ہوا۔ ابھی قلب پر ایک فیض کی سی کیفیت تھی جس کا خیال تھا بعد فاتحہ جاری رہا۔ قلب میں ایک کیفیت [illegible] پیدا ہوئی [illegible] قلب نے [illegible] لطف محسوس کیا [illegible] کی شفقت [illegible] سے حاصل ہوتا ہے [illegible] آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ دیر تک یہ کیفیت رہی۔ دل نے سمجھ لیا کہ [illegible] کرم فرمایا ہے۔

دورانِ حاضری میں مولانا [illegible] صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر [illegible] دعا فرما کر نصیحت کی کہ [illegible] ہو کر جاؤ تو لطف ہے ورنہ ادھر رہا اور دل ادھر تو سفر بے نتیجہ ہوگا۔" [illegible] ارشاد ذہن نشین فرمایا۔ یہ شعر بار بار پڑھا:

[illegible]

۱۲ شوال کو [illegible] آباد میں مولانا شاہ نیاز احمد صاحب کی خدمت میں حاضر رہا [illegible] شفقت [illegible] فرمایا، [illegible]

[illegible]

[illegible]

کے آستانۂ مبارک پر فاتحہ پڑھی، اسی طرح واپسی علی گڑھ میں استاذِ مکرمی مولانا عبد الحق خان اور مولانا لطف اللہ رحمہما اللہ کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی۔

(۸) ایام شرکت ریاست میں جن جن شرکاء کا کام کیا تھا، ان سے یہ کہہ کر کہ اپنی جانب سے تو خیانت نہیں کی تاہم اعتراف بشریت ہے، سب نے بطیب خاطر معافی دی، جزاہم اللہ خیراً۔ جملہ رعایا و ملازمین سے معافی چاہی، مطالبے ادا کیے، جو نہ ہو سکے ان کے ادا کرنے کی وصیت برخوردار عبید الرحمٰن خان سلمہ کو کی۔

(۹) ایک شرف عظیم یہ حاصل ہوا کہ اعلیٰ حضرت نظام نے یہ خدمت سراپا سعادت میرے سپرد فرمائی کہ مسجد نبوی اور روضۂ منورہ کی مرمت اور جانمازوں وغیرہ کی تیاری کا تخمینہ کرکے پیش کروں۔ اس خدمت میں امداد کے لیے میں نے مولوی سید عطا حسین صاحب انجینیر کی ہمرہی کی درخواست کی جو منظور فرمائی گئی۔

سفر | ۱۰ شوال المکرم ۱۳۴۲ھ شنبہ کو بعد نماز عصر حصن حصین کی دعائیں ادا کرکے حبیب گنج سے روانہ ہوا، بوقت روانگی جناب استاذی مولانا سید اکبر صاحب کی دعائے خیر کی سعادت حاصل ہوئی، مولانا سے میں نے عربی شروع کی تھی، کابو خان ضلع پشاور میں وطن ہے، ترمذی سادات سے تھے، اور حضرت اخون صاحب سوات کے مرید، اتفاقاً اسی زمانہ میں حبیب گنج تشریف لائے ہوئے تھے۔

علی گڑھ پہنچ کر دو روز حسب فرمائش برادر مکرم نواب سر محمد مزمل اللہ خان صاحب کی کوٹھی میں مقیم رہا، اعزہ و احباب نے رخصت کے لیے مہمان کرم فرمایا، محب قدیم منشی احتشام علی صاحب لکھنؤ سے تشریف لائے، یہ وقت بہت اطمینان و مسرت سے بفضلہ تعالیٰ بسر ہوا، جب [illegible] نے فرمایا کہ آج کو قافلے تو بہت گئے ہیں، مگر جب [illegible]

۔۔ حکیم سعید دہلوی سے بیعت ہوئی حضرت صاحب نے دست مبارک سے شرف فرمایا کہ بیعت سے نفع ہو
بخشا ہم سے ذکر سے مستفید فرمائی، نیز ملک آزمانے کا شغل بھی پیر دہلی کے وقت ہو گا اور دو شوال کو دہلی پہنچا
حکیم عبد الحمید خان صاحب نے سپہر کو دعوت کی اور شب پیاں صبح ہوا، شام کو حضرت خواجہ باقی باللہ
رضی اللہ عنہ کے آستانہ مبارک پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی، وہاں مغرب کی نماز با جماعت مسجد خانقاہ شریف
میں ادا کی، بعد نماز حضرات خانقاہ شریف کے مزارات پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی اور دعا مانگی، وقت
سیدھا اسٹیشن پہنچا اور ایکسپریس سے روانہ بمبئی ہوا، اسٹیشن پر ایک تعجب خیز حضرت پیر و مرشد قدس سرہ
کا دیکھا، چنانچہ جناب ہمشیرہ صاحبہ اپنی پیرانی بی کے پاس خانقاہ شریف میں ٹھہری تھیں، ان کے
اسٹیشن پہنچنے میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ تردد ہوا کل قافلہ مع سامان کے ریل میں بیٹھ چکا، دو پہلے
زرد سے بلند کر حکیم عبد الحمید خان صاحب کی فرمائش سے دو منٹ ریل رک گئی، اب بھی انتظار
تھا اسی اضطراب میں حضرت پیر و مرشد کی جانب میں نے توجہ کی، آنکھیں کھولیں تو پالکی پاس کھڑی
تھی، ہمشیرہ صاحبہ بھی باطمینان سوار ہو گئیں، اب ریل روانہ ہوئی، دہلی میں ریل کے انتظام
میں مولوی سید بہاء الدین صاحب رئیس دہلی نے بہت مدد دی جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیرا
اثنائے سفر میں بھوپال کے اسٹیشن پر تین حالی قدر مخدوم زادوں کی زیارت ہوئی یعنی حضرت مولانا
مولوی حافظ محمد عنایت اللہ خلف الصدق حضرت مولانا لطف اللہ، حکیم حاجی عبد الغفور خان صاحب
خلف رشید حضرت شاہ عبد الغفور خان صاحب مجددی نقشبندی، شاہ جہاں پوری اور شیخ
عبد اللہ میاں خلف الصدق حضرت شیخ حسین محدث یمنی رحمہم اللہ تعالیٰ، آگرہ کے اسٹیشن پر عزیز
عبد الحمید خان صاحب سپہر کی بھنگی کی ضیافت کی، ۱۰ شوال کی صبح کو قافلہ بخیریت بمبئی پہنچا،
نفیس صاحب حیدر آباد سے آگئیں سب مل کر شیراز کا کی بنگلے میں مقیم ہوئے، یہ بنگلہ حاجی
اسٹریٹ میں کلب روڈ پر فیض الفضل کے بنگلہ کے قریب واقع ہے، دو منزلہ ہے اور مکانات ستھرے

[illegible]

[illegible] شیخ [illegible] صاحب [illegible] کے یہاں انتظام [illegible] میں [illegible]

جہاز [illegible] صاحب [illegible] شیخ [illegible] قیام [illegible]

فرمایا [illegible] صاحب [illegible] شکر [illegible] خدمت [illegible]

[illegible] شیخ افضل بمبئی کے [illegible] ایجنٹ ہیں [illegible]

[illegible] ایجنٹ ہیں [illegible] صاحب نے ان کے ذریعہ [illegible] انتظام کیا [illegible]

آرام [illegible] حاصل ہوا [illegible] بمبئی میں قیام رہا [illegible] خوش [illegible]

[illegible] حیدرآباد کا [illegible] آیا ہوا تھا [illegible]

یہ وقت بہت اچھا گذرا۔ شیخ افضل نے میری [illegible] دعوت بھی کی۔

آخر حجاز کا سفر شروع ہوا ع دل [illegible] بسم اللہ مجریها ومرساها

[illegible] دوشنبہ کو سہ پہر کے وقت [illegible] کمپنی کے جہاز [illegible] پر [illegible]

[illegible] قیام رہا [illegible] جہاز [illegible]

[illegible] جہاز [illegible] انتظام [illegible]

[illegible] معقول تھا۔ حجاج کی آسایش [illegible] خیال رکھا [illegible]

[illegible]

جہاز پر سوار ہوتے ہی [illegible] بالکل [illegible]

چند روز قبل [illegible] شعر کہنے کا ذوق [illegible] پیدا ہو گیا [illegible] شعر [illegible]

[illegible] وقت [illegible]

[illegible]

[illegible] انتظام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

نے از راہ کرم ایک رسالہ مسائل حج پر لکھ کر [illegible] کر دیا تھا، وہ جا بجا [illegible]

اور ایک جگہ لکھا [illegible] لیکن [illegible]

ہی ساتھ تھا، لگاتار اسکے پڑھنے کو بھی دل نہیں چاہا، [illegible]

[illegible] حضرت [illegible]

[illegible] سکا۔

[illegible] کراچی پہنچ [illegible]

[illegible]

[illegible] کراچی سے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی کیفیت سے [illegible]

[illegible] پیدا ہوئی [illegible]

[illegible]

[illegible]

ملاحوں کو بھی اطمینان نے پہلے سے اس کے لنگر کی خبر دی تھی اس سے [illegible]
جلوہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و حقیقت سے دیکھی قلب میں رقت پیدا ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے
فوراً [illegible] دعا اور استغفار کا سلسلہ جو روانگی کے ساتھ جاری تھا بصورت [illegible]
[illegible] تر کیا تا شہر جدہ مقام پہنچی۔

دوشنبہ ۱۰ ذیقعدہ کو ۹ بجے صبح جہاز بندرگاہ جدہ میں داخل ہوا ۔

شکر کہ جہاز ما بمنزل رسید　　　زورق امید بساحل رسید

جدہ کے حمالوں کی دراز دستی اور کسٹم کی دقتوں کا اندیشہ بہت کچھ دلایا گیا تھا، اس لیے خیال تھا۔ اس کی بندہ نوازی، جہاز کے پہنچنے کے بعد ہی شیخ علی [illegible] نائب حاکم جدہ، رئیس البلدیہ جدہ (میونسپلٹی) اور مدیر اخبار ام القریٰ اور ایک صاحب [illegible] میں تشریف لائے، ملک حجاز ابن سعود کی جانب سے خیر مقدم کیا اور موٹر کشتی میں ہم کو سوار کرکے جدہ بآرام پہنچا دیا، قیام کے لیے قصر شریف علی تجویز ہو چکا تھا، یہ ایک شاندار عمارت سمندر کے کنارے پر ہے، جو شریف [illegible] میں [illegible] تھی۔ تھوڑی دیر میں بقیہ ہمراہی اور سامان بھی وہاں پہنچ گیا، جس دقت کا اندیشہ تھا، وہ بفضلہ تعالیٰ خواب میں بھی نظر نہ آئی، اس دن اور شب کو جدہ میں قیام رہا ضیافت بھی ابن سعود کی جانب سے تھی [illegible] کے وقت قائم مقام جدہ کے مشورہ کے بموجب ملک الحجاز کو اپنے جدہ پہنچنے کی اطلاع تار کے ذریعہ سے کی، اور ملاقات حاضری کی اجازت طلب کی، جواب میں پرتپاک خیر مقدم کا پیغام آیا، شام کو انگریزی کونسل سے ملاقات کی۔

۱۱ ذیقعدہ سہ شنبہ کو دوپہر کے قریب تین موٹر لاریوں پر جو حکومت کی جانب سے مہیا کی گئی تھیں ہمارا قافلہ روانہ مکہ مکرمہ ہوا، جناب [illegible]

[illegible] حضرت [illegible] ہو [illegible]

حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ [illegible] پاؤں کو اس قدر [illegible]

[illegible] بالکل غنچہ تھا، قلب فرحت سے باغ باغ ہو جاتا تھا

جدھر بھی گل چین گلستان خلیل آگ میں پھول ہی باغ باغ ہوں ہیں [illegible]

ایک بار سے زیادہ اس ویرانے میں رقت آمیز دعا و استغفار کی نوبت آئی خصوصاً حدود حرم میں داخل ہونے کے وقت بمقام جدہ پورا جوش نیاز و عجز تھا، ہم دعا و استغفار میں اشک رواں تھے، مکہ مکرمہ زادہا اللہ تعالیٰ تشریفاً کے قریب پہنچ کر [illegible] نظر آئے، حدود حرم شریف میں [illegible] اور لاری کے ڈرائیور نے اشارہ کرکے کہا "ہذا حرام المکی" عاجزوں نے محسوس کیا کہ مسافر نوازی فرمائی گئی، اس تصور سے دیر تک ایک کیفیت [illegible] دعاؤں کے ساتھ عصر کے وقت لاریاں مکہ مکرمہ پہنچیں اور ایک عمر کی تمنا بلکہ [illegible] تمنا فضل ربانی سے بر آئی، زیارت بیت اللہ المکرم و حاضری مسجد الحرام کا شرف حاصل ہوا فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، ظہر (قضا) اور عصر کی نماز مسجد الحرام میں ادا کی، طواف عمرہ و سعی صفا و مروہ سے مشرف ہو کر احرام اتارا [illegible] برف کی [illegible] خیالی واقعہ [illegible] تسکین ہوئی۔ الحمد للہ تعالیٰ، قیام و ضیافت کا انتظام [illegible] حکومت [illegible] تھا، حرم شریف سے بالکل متصل بیت [illegible] میں قیام ہوا، یہ مکان باب [illegible] کے قریب اور کتب خانہ سلطان عبدالمجید خان مرحوم کے بالکل سامنے ہے، [illegible] [illegible] تعلیم کے لیے مدرسہ [illegible] [illegible]

[illegible]

مولوی نذیر احمد صاحب مجددی سے حرم محترم کے دروازے پر حاضری کے وقت ملاقات ہوگئی تھی دوسرے روز مقامی اخبار ام القریٰ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ چیف قاضی القضاۃ حیدرآباد کی طرف سے مندوب ہوکر شرکتِ مؤتمر کے واسطے آیا ہوں، میں نے اول موقعہ پر اہل حکومت سے اس کی زبانی تردید کردی، کہدیا نہ میں قاضی القضاۃ ہوں اور نہ مندوب، مؤتمر میں شرکت بھی نہیں کروں گا، محض حج کی نیت سے ذاتی طور پر حاضر ہوا ہوں، جب وجہ عدم شرکت بار بار دریافت کی گئی تو بالآخر میں نے تجربے کی بنیاد پر کہا کہ ایسی مجالس سے سوائے بحث و مباحثہ کے کسی عملی نتیجے کی امید بیجا ہے، لہذا میں نیت حج میں کسی اور کام کی شرکت پسند نہیں کرتا۔

۲۲ ذیقعدہ کی شب کو بعد عشاء ابن سعود سے سقافیہ میں ملاقات ہوئی، حافظ وہبہ مجھ کو اہل حکومت کے موٹر میں لے گئے، سلطان اس وقت حدیث شریف سن رہے تھے، مجھ کو بہ اعزاز اپنے قریب بے تکلف بٹھایا، حدیث شریف کے سماع سے فارغ ہوکر گفتگو کی۔ ملاقات تو تقریباً ۴۵ منٹ تک رہی مگر باتیں کم ہوئیں، زیادہ حصہ سکوت میں گذرا، دو مرتبہ میں نے اجازت بھی چاہی، مزید نشست پر اصرار کیا، خیر مقدم کے بعد راستے کی خیریت دریافت کی، آسائشِ قیام کا حال پوچھا، مدینہ طیبہ کے راستے میں موٹر چلنے پر خیالات ظاہر کیے، کہا ابھی ممکنات نہیں جب ان سامان ضروری دستیاب ہو، اس لیے تاخیر ہے، عنقریب چلنے لگیں گی، حیدرآباد کی آبادی اور پیداوار پر گفتگو کی، ایک موقعہ پر میرے استفسار پر حافظ وہبہ نے (بتایا) کہ سقافیہ [illegible] کے بعد تمہاری نسبت کہا "هُوَ رَجُلٌ أَصِيْلٌ"۔

۲۵ ذیقعدہ کو مؤتمر الاسلامی کا اجلاس ہوا، افتتاح خود ابن سعود نے باضابطہ جشن کے ساتھ کیا، ایک روز قبل سات ٹکٹ بھیج کر مجھ سے بھی صرف جشن افتتاح کی شرکت کی خواہش کی تھی، چنانچہ میں بھی شریک ہوا۔ افتتاح کے بعد چائے [illegible]

ملحقہ کے بعد البلد الامین سے مدینہ منورہ کی تحقیق کی، ایک روز مسجد حنفیہ بھی دیکھی
مسجد قبلتین وغیرہ مسجد نمرہ کی تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے، نہ جانا تمام ہوا، مگر بہت کچھ ہو چکا ہے، مسجد ملکہ
شمالی ہند کے مشابہ کے نقشے کے مطابق ہے، مولوی محمد سعید صاحب مہاجر کا اہتمام و نگرانی
قابل صاد ہے۔

۸ ذی الحجہ سے قبل منیٰ میں جا کر مکان پسند کیا، اثنائے راہ میں جبل النور مطوف صاحب
نے دکھایا، ایک سیدھی بلند چٹان دیدہ و افروز تھی جس کا رنگ اودا ہرا سا محسوس ہوتا تھا
مبارک چٹان سے گویا لگاؤ لپٹ گئی جب تک سامنے رہا دیکھتا رہا، نظر جم جانے کے بعد
یا یہ ایک اثر اس پہاڑ کے آسمانی ملکوتی تعلق کا قلب محسوس کرتا رہا جس قدر احساس
قوی ہوتا گیا قلب پر ایک کیفیت بیخودی و وجد بڑھتی گئی، یہ اس امر کی شہادت ہوگی کہ ہنوز
نزول وحی کے برکات و آثار اس بقعۂ مبارکہ پر فیض بار ہیں ع ہنوز آں ابر رحمت در فشاں است

۸ ذی الحجہ کو جلسۂ امداد تعمیر نہر زبیدہ خاتون میں ابن سعود سے مکرر ملاقات ہوئی، ایک
ہزار روپیہ (1000) چندہ دیا گیا۔

۸ ذی الحجہ کو حطیم میں احرام باندھا اور منیٰ کو روانگی ہوئی، مکان آرام کا ملا، صاف و وسیع
ہوا دار، متعدد قطعے تھے، مغرب کی نماز مسجد خیف میں ادا کی، شب کو مصریوں اور نجدیوں سے
تصادم کا واقعہ پیش آیا، ہمارے مکان تک چند آوازیں فیر کی سی آئیں، بدوؤں میں اضطراب تھا،
سنا ہے نجدیوں کے بھاگنا چاہا، [illegible] (ا حاطے) کا دروازہ بند کر دیا گیا، دوسرے روز عرفات
کے راستے میں ایک بدو کی لاش گولی کے زخم سے مرا ہوا دیکھا، اس سے زیادہ واقعے کا کچھ اور
ہم کو معلوم نہیں ہوا۔

۹ ذی الحجہ کو عرفات میں دوپہر کے قریب حاضری ہوئی، ایک موقع پر جبل رحمت کے قریب

[illegible] سے مشرف ہو گئے۔ گرمی تیز تھی چلتی ہوئی [illegible]

[illegible] کیا تھا [illegible]

[illegible] پہنچ رہا تھا۔ حاجی محبوب خادم نے لا کر دیا۔ [illegible]

خود کھائی باقی رفقا کو کھلائیں۔ شکر نعمت ادا کیا۔ ظہر کی نماز مسجد نمرہ میں ادا ہوئی۔ [illegible]

نائب سلطان امام ہوتے ہیں اس لیے صرف ظہر کی نماز جماعت سے ادا کی۔ اس کے بعد خیمے

میں آکر تلاوت کلام مجید کی۔ حالت میں [illegible] اتنی قدرت پیدا ہی تھی کہ دل کے جو [illegible] کے اندر

[illegible] محسوس کر سکتے تھے۔ خیمے سے مسجد کا اندازہ ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ تاہم دل

اتنا [illegible] تھا کہ رحمت کا ایک جوش سینے میں محسوس ہوتا تھا۔ مسجد میں جس وقت پہنچا

تو نمازیوں سے معمور تھی۔ صحن میں دھوپ میں بیٹھنے کا قصد کیا۔ اتنے میں ایک صاحب نے

نام لے کر اندر بلایا۔ میں نہ گیا تو اصرار کر کے بلا لیا۔ صف اول میں جگہ بآسانی مل گئی۔ [illegible]

[illegible] معلوم ہوتے تھے۔ مگر میں باوجود غور کے پہچان نہ سکا۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیرا۔

اذا جاء احدکم فاوسع له اخوه فانما هی کرامة اکرمه الله بها [illegible]

نماز عصر خیمے میں ادا کی۔ اس کے بعد جبل رحمت کی حاضری سے مشرف ہوا۔ [illegible] جناب مولوی

[illegible] ساتھ لے گئے۔ مقام ناقہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب حاضر ہو کر دعا شروع کی۔

ہاتھ اٹھانے کے بعد دعا کے الفاظ زبان پر آتے تھے کہ قلب میں ایک [illegible] پیدا ہوا

[illegible] آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی [illegible]

[illegible] صاحبوں کی یاد [illegible]

سے رواں تھے۔ اسی عالم میں دیر تک استغفار و دعا کا سلسلہ جاری رہا۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] تعالیٰ [illegible] رضی اللہ تعالیٰ

[illegible] تعلیم [illegible] واحد

ین دلیل جو اُن رحمت کی تھی، الحمد للہ تعالیٰ ثم الحمد للہ کثیرا طیبا مبارکا فیہ۔ ظہر و عصر کے بعد قلب کی حالت
ون محسوس کی جو بفضلہٖ تعالیٰ دلیل قبول دعا ہوگی۔ مغرب کا وقت ابھی طاری ہو جانے پر عرفات
مراجعت ہوئی۔ روانگی کے وقت چاند نکلے اُس وسیع اور متبرک و مقدس میدان کو چھپا لیا
ہزاروں انسان اور روشنیاں اندھیرے میں رواں تھے۔ اس وقت مجھکو ایک عجیب
ہیبت کا احساس ہوا۔ قلب نے محسوس کیا کہ جس قدر میدان انسانوں سے خالی ہوتا جاتا ہے
سا ان سے نازل ہونے والے ملائکہ سے بھرتا جاتا ہے، یہ احساس دم بدم قوت پکڑتا گیا، آنکھیں
نہ دیکھتی تھیں باقی تمام کیفیت اُس قدسی گروہ کے نزول و اجتماع کی قلب محسوس کرتا تھا۔
میں قلب کو احساس قرب عظمت و تقدیس کا تھا۔ دیر تک اور دور تک یہ کیفیت طاری رہی۔
مزدلفہ پہنچ کر نماز مغرب و عشاء ملا کر پڑھی، رمی جمار کے لیے کنکریاں چنیں، اونٹوں کے حلقے میں
زمین پر بستر بچھائے گئے۔ تہاحد کی رات کا سماں دیکھا، اُس شب کی خنکی و راحت اور خوشبو
ساری عمر یاد رہے گی ؎

سقی اللہ لیلا کعہد الکواعب ۔۔۔ شبے عنبریں موے و مشکیں ذوائب

خاطر ایک عالم تھا جو عالم سفلی کی کیفیات سے بالاتر تھا۔ سونے میں سہاگا، چاندنی نے سرمد کو
پُرنور کر دیا تھا، یا رب کریم وہ پُرنور سرور پھر نصیب حبیب فرما آمین بجاہ سید المرسلین صلی اللہ
علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین

[illegible] کی صدا [illegible] سے بہ اطمینان فراغت حاصل ہوئی، شب و [illegible]

[illegible]

منیٰ میں مکہ کے قریب میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہتا ہے کہ جو سلام اور صلوٰۃ پہنچانے کی خدمت ہوئی ان کا جواب تمہارے متعلق ہے "مولانا عبدالکریم صاحب مراد آبادی کا مقولہ یاد کرو" اللہ پاک اپنے حبیب علیہ افضل التحیۃ والتسلیم کے صدقے میں اس زمرے میں مجھ عاجز گنہگار بندے کو بھی داخل فرمائے نیز میرے ساتھیوں اور دوسرے مسلمانوں کو۔

۱۲ ذی حجہ کی شام کو حرم شریف میں پہنچکر طواف زیارت سے مشرف ہوا۔

۱۴ ذی حجہ کی شب کو ایک اور خواب دیکھا، بوقت صبح، ایک میدان میں مکہ مکرمہ کے باہر کھڑا ہوا ایک متشکک فی الدین کو سمجھا رہا ہوں، اسی میدان میں کچھ فقراء بڑے بڑے بال والے کالے رنگ کے، اوپر کا جسم برہنہ، اپنا اپنا فقیرانہ سامان لیے بیٹھے ہیں، تھوڑی دیر میں بہت سے پرندے قاز اور بطوں کے برابر کثرت سے اڑتے نظر آئے جس متشکک کو میں سمجھا رہا تھا اسکو یہ پرندے دکھلانے لگا، وہ پرندے قریب آئے تو معلوم ہوا بڑے بڑے کبوتر ہیں، اسی عرصے میں اُن فقراء نے بھی اڑنا شروع کیا، بڑی قوت اور جوش سے، بال سب کے ہوا میں اڑتے تھے، بعض ان میں ایسے بھی تھے جو دوسرے کے کندھے پر سوار اڑ رہے تھے، ہاتھ میں دوربین تھی جس سے آسمان کی طرف دیکھتے جاتے تھے، میں اُن فقرا کو کھڑا دیکھتا رہا اور متشکک کو سمجھاتا رہا۔

منیٰ میں سوء ہضم کی شکایت ہو گئی، مکہ مکرمہ پہنچکر بڑھ گئی، تاہم نیچے اترنا، حاضر حرم محترم ہونا جاری رہا، مکہ مکرمہ حاضر ہونے پر حج سے قبل قاری عبدالرحیم صاحب کو (جو مصر اور قراء کے دور سابق کی یادگار اور قاری عبدالخالق صاحب مرحوم کے بھائی ہیں) قرآن شریف سنانا شروع کر دیا تھا، الحمد للہ سنا، ۱۶ ذی حجہ کو ختم ہوا۔ قاری صاحب نے فاتحۂ ختم پڑھی، اسی عرصے میں، شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی، نیز دیگر مرویات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی، شیخ ابو شرف صاحب مجددی سے متعدد بار ملاقات ہوئی، مرحوم

[illegible] تک برابر رہی،

ضعف کی زیادتی میں کثرت سے ان کا مکہ کے مشاہد متبرکہ میں حاضر ہونے کا قصد نہیں کیا جا

جبل ابوقبیس کی زیارت البتہ مکان ہی سے ہوتی رہتی تھی، یہ مقدس پہاڑ مکان کے بالکل سامنے تھا، آخر

میں پیچش کی زیادتی ہوگئی، نیچے اترنا بالکل موقوف ہوگیا، حکیم تفضل حسین خان صاحب رام پوری نے

نہایت عنایت و ہمدردی سے علاج فرمایا، دو مرتبہ روزانہ صبح و شام آتے، بعد عشاء مزاج پرسی فرمالیتے،

جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء، آخر آخر میں پیچش میں شدت ہوگئی تھی، دن رات میں کم و بیش ۴۰ اسہال

آجاتے تھے، تاہم بفضلہ تعالیٰ نماز صبح و مغرب جماعت سے ادا ہو جاتی، نیز حرم کی، بیت اللہ الحرام

سامنے تھا جس وقت جماعت شروع ہوتی میں بھی اقتدا کر لیتا، ان نمازوں کے سوا یہ حالت تھی

کہ نماز عشاء، دو، دو تیمموں سے ادا کی جاتی تھی، سُدّے خارج نہ ہوتے تھے، اس لیے مسہل کی

ضرورت معالج نے محسوس کی، علالت کے زمانے میں مولانا الحاج شفیع الدین صاحب خلیفہ

حضرت حاجی امداد اللہ قدس سرہٗ نے متعدد بار کرم فرما کر مزاج پرسی کی، ایک بار اس وقت

تشریف لائے جب مسہل تجویز ہو چکا تھا، فرمایا آب زمزم شریف بہ نیت اسہال پیو، پیا، مسہل

کامیاب ہوا، سُدّے خارج ہوگئے، اب حابسات کا استعمال شروع ہوا، ان دنوں میں تشریف

لائے تو فرمایا اب حبس کی نیت سے زمزم شریف پیو، پیا، نفع عاجل حاصل ہوا،

دوران علالت میں جس سلیقہ، ترتیب، دلسوزی اور استقلال سے دُرِ دانہ نے تیمارداری کی

وہ مثالی طرز پر دیکھی، اسی زمانے میں اسما، خاتون ان کی بھانجی بھی علیل ہوگئی تھی، بخار سخت تھا،

جس سے متاثر تھا تاہم ان کے استقلال میں ذرا بھی فرق نہ تھا، اہتمام علاج و تیمارداری اس سے

ظاہر ہوگا کہ ہر ساعت کے بعد ماحشت بدل دیا جاتا تھا، جزاہا اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء [illegible]

[illegible]

[illegible]

اس حادثے کی اطلاع ابن سعود کو ہوئی تو بڑی عنایت وہاں [illegible]
کہ نہایت [illegible] ہوا [illegible] مکان [illegible] گیا [illegible]
جب سب کچھ ہو گیا تو قلب کو اس تصور سے وحشت ہوئی کہ مدینہ طیبہ کی حاضری میں مزید تاخیر ہو گی کیا
ایک دوسرا سفر حائل قصد ہوتا ہے اس خیال کے آتے ہی فوراً طائف جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا
اور ابن سعود کو اطلاع کر دی۔ اب مدینہ طیبہ کے سفر کی تیاریاں بفضلہ تعالیٰ شروع ہو گئیں، قافلے
تمام روانہ ہو چکے تھے، ۲۰ محرم کو ہمارے روانگی شروع ہو چکی تھی، حرم شریف میں [illegible]
تھا۔ مدینہ طیبہ کے مبارک سفر سے پہلے بیت اللہ شریف میں داخلہ ضروری تھی، چونکہ [illegible]
سے پہلے شیبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو لیا تھا۔ ۱۰ محرم الحرام ۱۳۴۵ھ پنجشنبہ روانگی مدینہ
کے واسطے مقرر ہوئی۔ شب پنجشنبہ کو شیبی صاحب نے داخلہ کا انتظام کر دیا، داخلہ کا وقت بعد نماز
قرار پایا۔ قافلوں کے چلے جانے کی وجہ سے پورا سکون و سکوت اس موقعہ پر تھا۔ شدت علالت کے
سبب پہلی بار کرسی پر بیٹھ کر اس موقعہ پر پہنچے آیا، جوں جوں وقت حاضری قریب آتا جاتا تھا، دل پر ہیبت
بڑھتی جاتی تھی، عمامہ باندھنے کے وقت اپنی بد اعمالی و گنہگاری یاد کر کے بار بار اندیشہ ہوا کہ کہیں [illegible]
کے وقت صورت مسخ نہ ہو جائے، فضل و کرم کے بھروسے نے دل تھاما، خلاصہ شرف داخلی
دربار الٰہی سے مشرف ہو۔ فللہ الحمد حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ شیبی صاحب [illegible]
کے قریب اندر بیٹھے تھے، ایک [illegible] روشن تھا، داخلی کے وقت [illegible] محسوس ہوئی۔
نگاہ نیچی کیے ہوئے ادب کا [illegible] سامنے کے [illegible] داخلی کی [illegible]
دیوار کے قریب پہنچ کر دو رکعت نماز پڑھی، یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم
نے نماز ادا فرمائی تھی۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ بعد نماز [illegible]
دعا کی، استغفار میں زیادہ حصہ گزرا [illegible]

[illegible]

[illegible]ی۔ اس کیفیت نے گویا کایا پلٹ دی۔ اب اور ہی عالم تھا۔ [illegible]
عالمِ کیف میں ایک دعا بصورتِ الفاظ قلب پر گویا القا ہونے لگے۔ القا یوں مانتا ہوں کہ
اُن الفاظ کی طرف میرا خیال تھا اور نہ کبھی ان الفاظ یا ان کے مثل الفاظ میں دعا مانگی
تھی۔ نیز یہ کہ ان الفاظ کے ذہن میں آتے ہی ایسا وجد سا قلب میں ایک جوش سا ہو گیا
پیدا ہو گیا۔ ہاتھ بے اختیار اپنی پوری وسعت کی حد تک پھیل گئے۔ جیسے کہ وہ باعظمت بارگاہ
سے دور رہ رہے ہوں گے۔ خلاصہ خشوع و ذوق کا پیمانہ چھلک گیا۔ مبارک دعا یہ تھی:
یا کریم انت یا محبوب کو مرادوں سے بھر دے۔ کونسی عبارت یا زبان اُس عالمِ کیف و وجد کا ایک
ذرہ بھی بیان کر سکتی ہے جو اس دعا کے وقت قلب پر وجد طاری تھا۔ یہ معلوم نہ ہو گیا جسم
و قلب محویت ہو کر یہ الفاظ ادا کر رہا تھا اور گویا ظاہر و باطن دونوں مل کر زبان دعا بن گئے
تھے۔ سوائے محویت دعا کے نہ کوئی تصور تھا اور نہ کوئی احساس۔ شروع میں کبھی لفظ مبارک
”یا کریم“ زبان پر آتا اور کبھی ”یا مولیٰ“۔ جوش محویت تھا اور ان دو ہی لفظوں کی تکرار
تکرار تھی اور جوش کیفیت۔ مزید کرم فرمایا گیا۔ جوش کیفیت نے لذتِ حضوری حال کی حد تک پہنچا دیا۔
کہ مولائے کریم قریب ہی سن رہا ہے۔ اور یہ معرفت کہ وہ سب جگہ ہے اور دعا سے خوش ہو رہا ہے
اس ادراک نے کیفیت محویت کو اور تیز کیا۔ اس قدر پاک منظر پایا تھا جس کا کوئی بھی عالم ہوا،
کیا ہی خوب صحیح ہے جو اس کو صرف تصور کر سکتا ہے۔ [illegible]
[illegible] ہوا۔

[illegible]

[illegible]

عمر بھر کی تشنہ لبی سے محبت کو جذب و لذت میسر ہوا تھا، وہ محبت کی ہجرت و فرقت
دل کو زخمی کر کے رخصت ہوا ہے

اے فدا قربان احسانت شوم
ایں چہ احسان ست قربانت شوم

الحمد للہ، ان نقوش کی تحریر کے وقت بھی قلب نے کیفِ رحمت کا احساس کیا، آنکھوں نے اشک بہائے۔ فالحمد للہ تعالیٰ۔ ع

ہنوز آں ابرِ رحمت درفشان ست

قال الشيخ العارف بالله الامام ابو القاسم القشيري بل الحق قدس سره العزيز
البسط سرور واستياح يرد على القلب فينفي الضيق والوحشة.
ثم موجبات البسط تختلف فمرة يكون باقبال ومرة بتقريب ومرة يكون بلطف وبر ومرة باحسان وعطاء ومرة دون مختص من الافضال وشيء من لطيف النوال. الى غيرك من اقسامه مما لا ياتي الحصر على استيفاء احكامه (عيون الاجوبة في فنون الاسئلة)

وقال ايضا رحمه الله تعالى

اذا كان العبد في محل ... التقريب جعل الله غالبه البسط واذا كان مراداً فغالب احواله البسط. واذا اشهده الحق عيوب نفسه فغالبه القبض واذا اشهده كرم تقديسه فغالبه البسط واذا ادهشه لكثرة افضاله فغالبه البسط وان اشهده جلال جبروته فغالب وقته البسط" (عيون الاجوبة)

دوسرے روز شام کو ارادہ سفر مبارک تھا لیکن انتظام کی بعض بے عنوانیوں کے سبب روانگی ملتوی ہو گئی

چونکہ جمعہ کی شام کو ہونی، بے عنوانی منتج خیر ہو گئی، وہ حرم محترم تھا جہاں ہماری باتیں خطائیں صواب بن جاتی ہیں، روانگی بجائے شام پنجشنبہ کے جمعہ کی شام کو ہوئی، اس طرح ایک نماز جمعہ اور حرم محترم میں ادا ہو گئی، یعنی سات جمعے ادا ہوئے۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً مکہ مکرمہ میں منیٰ اور عرفات ملا کر ۴۰ دن حاضر رہا، پانچ دن منیٰ اور عرفات میں بسر ہوئے باقی دن مکہ مکرمہ جوار بیت اللہ تعالیٰ میں، اس طرح گویا چلہ (اربعین کاملہ) پورا ہو گیا، ایک دن کے مزید قیام سے مزید برکت بھی حاصل ہو گئی۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ

حاضری مکہ مکرمہ کے زمانے میں جب تک صحت درست رہی، چار وقت کی نماز باجماعت (باستثنائے ظہر) مسجد الحرام میں ادا ہوتی رہی، کبھی کبھی ظہر بھی، یعنی ساتوں باجماعت ادا ہوئے، نماز صبح و مغرب کے بعد طواف کا شرف حاصل ہوتا تھا، استلام نجدیوں اور حجاج کے ہجوم کی وجہ سے کمتر نصیب ہوا، زیادہ تر اشارہ ہوا، طواف میں ایذا دینے اور ایذا سے بچنے کا حکم برابر ملحوظ رہا، صبح ایک بار ایک طواف میں سات بار بہ اطمینان استلام کی سعادت حاصل ہوئی، آٹھ مرتبہ اس دفعہ بھی استلام نہ ہو سکا، کبھی کبھی مسجد الحرام میں اوقات تہجد اور بعد تہجد طواف کا شرف بھی ملا، ایک مرتبہ تہجد کے وقت اوپر سے اترا تو نیچے دروازہ پر ایک معمر صاحب شیشہ پانی سے بھرا ہوا لیے کھڑے تھے، مجھ سے پانی طلب فرمایا، لا کر پلایا، دعا دی اور کہا کل تک کے روزے کی نیت کی ہے۔

دوران طواف میں رکن شامی کی دعا میں جب الفاظ یا عزیز یا غفور زبان پر آتے، قلب نے قریباً ہمیشہ ایک وقت آمیز کیف محسوس کیا، کیا عجب کہ وہ وقت قبولیت ہو، فالحمد للہ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ روایت میں ہے کہ مقام ملتزم پر ایک فرشتہ [illegible]

ہیں جیسے پڑے سو رہے ہیں۔

ایک بار ملاقات کی جا در بکشی کی وقت بن نصیب ہوئی، کھانا بے انتہا لذیذ تھا، ایک اشرفی ان کی سرفرازی کی نذر کی۔

حرم شریف کے کبوتر حرم شریف میں کبوتروں کی کثرت ضرب المثل ہے، حجاج ان سے ضیافت کرتے رہتے ہیں، میں نے بھی متعدد مرتبہ یہ ضیافت کی، ہزاروں کبوتر جمع رہتے ہیں جو حرکت نہیں کرتے ہیں، دو باتیں عجیب دیکھیں، باوجود تلاش ان کی بیٹ حرم شریف میں نظر نہ آئی، میں نے بعض ساتھیوں سے کہا کہ تم بھی دیکھو، دیکھی نہ پائی، دوسرے یہ کہ بارہا دیکھا کہ ہزاروں کبوتر اڑ کر خانہ کعبہ کی جانب چلے، جب قریب پہنچے ادھر ادھر پھٹ گئے، کبھی اوپر سے نہیں گذرے، صرف ایک مرتبہ ایک کبوتر دو کنارہ کے اوپر سے گذر گیا تھا، اپنے مکان میں بیٹھا ہوا یہ نظارہ جھلملی میں دیکھتا رہتا تھا۔

(باقی)

تہذیب کی تشکیل جدید

جناب [illegible] صاحب [illegible]

(۳)

[illegible] | [illegible] زندگی کے [illegible] انسانیت کی سائنس ہے [illegible]
[illegible] | [illegible] ہو چکی ہے [illegible]

[illegible] اصول و نظریات [illegible] کرتا ہے۔

زندگی کا راز تحت الشعور میں پوشیدہ ہے اور انسانیت کی سائنس [illegible] ہے اور [illegible] [illegible] انسانوں کے [illegible] ہے جس [illegible] [illegible] کو سرتاسر مادی بنا دیا۔

[illegible] | علم الٰہی کے مطابق جو تہذیب کی تشکیل ہوتی ہے اس میں [illegible]
[illegible] | [illegible] شخصیت [illegible] پیدا کر دیا جاتا ہے۔

چونکہ انسان میں مادیت و الٰہیت دونوں کی نمود ہے [illegible] [illegible] شخصیت [illegible] کے لیے [illegible]

کے بغیر چارہ نہیں ہے جو عقل و تجربہ سے آزاد ہو کر مادیت و الٰہیت دونوں کی نمائندگی کر سکتی ہو،
اگر اس کے لیے عقل و تجربہ کی رہنمائی کو کافی سمجھ لیا جائے تو صرف مادی حصہ کی نمائندگی ہوگی اور ماورائی حصہ غلط رہنمائی کا شکار ہو کر زندگی کو زندگی سے گریزاں اور تہذیب کو خودکشی پر آمادہ کر دیگا، جیسا کہ مغربی تہذیب میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔

پھر پورے مادی حصہ کی بھی نمائندگی نہ ہو سکے گی کیونکہ زندگی کا بیشتر حصہ محض جذبات کی نیرنگیوں اور ہوس کی تاریکیوں میں گذرتا ہے جس میں نہ عقل کی رہنمائی کام دیتی ہے اور نہ تجربے کوئی خاص فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ عقل و تجربہ اس قدر زود اثر و متلون مزاج ہیں کہ ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں بلکہ ایک ہی زمانہ کے افراد اور ایک ہی شخص کے احوال میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے ایسی حالت میں ان دونوں کو کافی سمجھنے کے بعد زندگی اور تہذیب کا جو حشر بھی ہو جائے وہ کم ہے۔
خصوصاً ایسی حالت میں جب عقل و ہوس میں امتیاز کی کوئی صورت نہ ہو اور تجربات پر ہر شخص کی طبعی افتاد کے خول چڑھنے کا قوی اندیشہ ہو۔

انسان کے مقابلہ میں کائناتی تصرفات زیادہ آسان ہیں

انسان کے مقابلہ میں کائناتی تصرفات کا معاملہ زیادہ آسان ہے کیونکہ انسان خود حاکم و متصرف ہے اور نوع بنوع ترقیات اس کی غیر محدود خواہشوں اور ضرورتوں کی پیداوار ہیں، اس بنا پر تصرفات کے لیے کسی مستقل رہنمائی کی ضرورت نہیں ہے، مرکز و بنیاد متعین کر لینے کے بعد عقل و تجربہ کی رہنمائی سے کام چلتا رہتا اور ارتقا ہوتا رہتا ہے،

قرآن حکیم میں ہے

قل انما اعظکم بواحدۃ ... آپ کہہ دیجیے میں تمہیں ایک بات کی نصیحت

[illegible] — کتابوں [illegible]

ثم تتفکروا ما بصاحبکم من — ایک ایک کر کے پھر سوچو [illegible]

جنۃ (سباء ۔ ۴۶) — صاحب (محمدؐ) کو جنون نہیں ہے

علم وحی کا سرچشمہ ربانی توانائی ہے

علم وحی کا سرچشمہ ربانی توانائی ہے جس سے استفادہ کیلئے صلاحیت اور ماورائی حصہ کی تربیت درکار ہے، چنانچہ جن کے پاس وحی آتی ہے ابتدا ہی سے اس کے ماورائی حصہ میں ایک چشم بصیرت موجود ہوتی ہے جس کے ذریعہ غیب کا مشاہدہ اور ان چیزوں کا ادراک ہو سکتا ہے جن کے ادراک سے عقل عاجز رہتی ہے۔

ذرائع علم کی دو قسمیں ہیں

ذرائع علم کی دو قسمیں ہیں (۱) مادی اور (۲) غیر مادی

مادی وہ ذرائع ہیں جن کا مرکز جسم ہے، اور غیر مادی وہ ہیں جن کا مرکز ماورائے جسم ہے، پہلی کی کئی قسمیں ہیں، حسیات، تجربیات اور عقلیات وغیرہ، اسی طرح دوسری کی کئی قسمیں ہیں، کشف، الہام اور وحی وغیرہ۔

جس جگہ پہلی کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے دوسری کی ابتدا ہوتی ہے اور جس جگہ دوسری کی سرحد ختم ہوتی ہے وہیں سے ماورا الورٰی شروع ہو جاتا ہے، یعنی پہلی کی انتہا، عقلیات ہے جس کا مرکز اگرچہ جسم ہے لیکن وہ ماورا سے نہایت قریب ہے، اور دوسری کی انتہا وحی ہے جس کا مرکز اگرچہ ماورا ہے لیکن وہ ماورا الورٰی سے نہایت قریب ہے۔

وحی غیر مادی ذرائع علم کا انتہائی مقام ہے

گویا "وحی" مادیت کے لیے غیر مادی ذرائع علم کا انتہائی مقام ہے جو ماورائیت کی آخری سرحد پر ہے اور محض عطیۂ ربانی ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ (جمعہ) — یہ (رسالت) اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے دے

دوسری جگہ ہے:

[illegible]

[illegible]	[illegible]
[illegible]	[illegible]

اس عطیۂ ربانی کے لیے خاص "ظرف" کی ضرورت ہے جس کی تربیت ہوتی ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے:

وفتناک فتونا فلبثت سنین	اور ہم نے تمہیں بہت سی حالتوں میں
فی اهل مدین ثم جئت علی قدر	ڈال کر آزمایا پھر کئی برس تک تم مدین میں رہے
یموسی واصطنعتک لنفسی	[illegible]
(طہٰ - ۴۰)	[illegible] منتخب کر لیا۔

آیت میں "قدر" سے وہ "ظرف" مراد ہے جس میں وحی کو سمجھنے اور جذب کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے،

مفسرین نے "قدر" کے معنی بیان کیے ہیں۔

قدرنا لک سبیل المعرفۃ و	[illegible]
وقیل جئت الی [illegible] القدر	[illegible]
(تفسیر روح البیان ج ۵ ص [illegible])	[illegible]
دوسرے معنی بیان کیے گئے ہیں	[illegible]
علی حد من الکمال المقدر	[illegible]
بحسب استعداد	[illegible]

(تفسیر ابن عربی جلد ۲ ص ۳۰)

شخصیت کی تربیت کے لیے یا عمومی حالات سے گذرنا پڑتا ہے جو دوسرے لوگوں کو پیش آتے یا کچھ وحشت سے بھرپور ہوتے ہیں،

مثلاً پیغمبر جب وہاں کے ذمہ بکریاں چرانے کی ڈیوٹی سپرد ہوتی ہے، اور اس کے ذریعہ جذب و انجذاب کی خاص کیفیت مطلوب ہوتی ہے، جیسا کہ بخاری و مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا

"أكنت ترعى الغنم قال نعم وهل	کیا آپ بکریاں چراتے تھے، فرمایا "ہاں"
من نبي إلا رعاها	کوئی نبی ایسا نہیں گذرا جس نے بکریاں
(مشکوٰۃ کتاب الاطعمة)	چرائی ہوں

یا بڑی سخت آزمائش ہوتی ہے، اور اس کے ذریعہ زندگی کے سارے میں خاص نظم مقصود ہوتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا

اي الناس اشد بلاء قال	سب سے زیادہ سخت آزمائش کس کی ہوتی
الانبياء ثم الامثل فالامثل	ہے آپ نے فرمایا انبیاء کی، پھر جو جو ہم
(ترمذی و ابن ماجہ، مشکوٰۃ باب عیادۃ المریض)	ان سے قریب ہوتا ہے، پھر آگے جو قریب ہوتا

اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کتاب ملنے سے پہلے عرصہ دراز کی حالت میں کوہ طور پر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا روزہ رکھ کر سنسان جنگل میں عرصہ تک قیام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غار حرا میں ذکر و مراقبہ اور عبادت و ریاضت وغیرہ سب تربیت کے لیے تھا۔

ادوار الوہیت و فیضان کی کئی شکلیں ہیں | تربیت کے بعد ایک نظم کے تحت ماورائی ایجنسی سے فیضان شروع ہو جاتا ہے جس کے حاصل کرنے میں آدمی یہ جانے کہ کوئی دخل نہیں ہوتا۔

اس فیضان کی کئی شکلیں قرآن حکیم میں ذکر ہیں۔

وما كان لبشر ان يكلمه الله
الا وحيا او من وراء حجاب
او يرسل رسولا فيوحي باذنه
ما يشاء انه علي حكيم
(شوریٰ - ۵۱)

کسی انسان کی تاب نہیں ہے کہ اللہ اس سے بات کرے لیکن وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے اور وہ اللہ کے حکم کے مطابق جو اللہ چاہے وحی کرے، بیشک اللہ بلند اور حکمت والا ہے۔

یہ وہی فیضان ہے جس کا ذکر ابتدائی ہدایات اور ابتدائی نسل انسانی سے خطاب میں ہو چکا ہے، اور جس کے بغیر انسان و کائنات کے نظام میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نہ مادیت و ماورائیت کی روح میں یکسانیت برقرار رہتی ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

افغير دين الله يبغون وله اسلم
من في السموت والارض طوعا
وكرها واليه يرجعون (آل عمران - ۸۳)

کیا اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین ڈھونڈتے ہیں، حالانکہ اسی کے حکم میں خوشی یا لاچاری سے آسمان و زمین کی ساری چیزیں ہیں اور اسی کی طرف سب لوٹائے جائیں گے۔

فیضان کا یہ سلسلہ ہر قوم و ہر گروہ میں جاری رہا ہے، اور اس کے ذریعہ ان کی نشاۃ ثانیہ اور تہذیب کی تشکیل ہوتی رہی ہے۔

لكل قوم هاد (رعد - ۷)

ہر قوم کے لیے راہ بتانے والا ہوا ہے۔

دوسری جگہ ہے:

وان من امة الا خلا فيها نذير
(فاطر - ۲۴)

اور کوئی امت نہیں ہے جس کے لیے ڈر سنانے والا نہ ہو چکا ہو۔

اس فیضان میں ارتقاء و تسلسل پایا گیا ہے | اور تسلسل کے ساتھ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے،

ثم ارسلنا رسلنا تترا (مومنون۔۳)	ہم پھر اپنے رسول لگاتار بھیجتے رہے

دوسری جگہ ہے

ما ننسخ من آیۃ او ننسھا نات	جس آیت کو ہم منسوخ کر دیتے یا بھلا دیتے ہیں
بخیر منھا او مثلھا (بقرہ۔۱۳)	تو ہم اس سے بہتر یا اس کے برابر بھیجتے ہیں،

انسانیت کے عروج کمال پر | اس تسلسل کے ذریعہ جب انسانیت معراج کمال پر پہنچ گئی تو اس فیضان کا
فیضان کا خاتمہ ضروری ہو گیا ہے | خاتمہ ضروری ہو گیا کہ اس کے بغیر انسانیت کی حد بندی اور ما وراء الوری
کی سرحد پر سنگ نشان قائم ہونے کی کوئی شکل نہ تھی،

قرآن حکیم میں ہے

ما کان محمد ابا احد من رجالکم	محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں کسی کے باپ
ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین	نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور سب
(احزاب ۔ ۵)	نبیوں کے ختم پر ہیں،

معراج کمال کا یہ فیضان (وحی) ہر طرح کامل و مکمل ہے،

وتمت کلمۃ ربک صدقا و	آپ کے رب کی سچائی اور انصاف
عدلا (انعام۔۱۳)	کی باتیں پوری ہو گئیں،

اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے،

لا مبدل لکلمتہ (انعام۔۱۴)	رب کی باتوں کو کوئی بدلنے والا نہیں ہے،

کیونکہ تبدیلی اعلیٰ یا ادنیٰ کی طرف ہوگی، اعلیٰ کی طرف اس لیے نہیں ہو سکتی کہ یہ انسانیت
کی بالکل آخری سرحد ہے جس کے بعد کوئی درجہ نہیں ہے، اور ادنیٰ کی طرف اس لیے نہیں ہو سکتی کہ

[illegible] کے بعد جنت مثوبی کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔

معراج کمال کا فیضان انسانیت کی آخری سرحد پر ہے

اس میں شک نہیں کہ یہ فیضان (وحی) انسانیت کی آخری سرحد پر ہوتا ہے اور اس کے بھی درجات و مراتب ہیں جن کے آخری کنارے پر معراج کمال کا فیضان ہے لیکن ہر صاحب وحی بشریت کے جامہ میں ہوتا ہے اور وہ نہ ربانی قوائی کا سہیم و شریک ہوتا ہے اور نہ کسی اعلیٰ و ادنیٰ مخلوق میں تبدیل ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن حکیم میں ہے،

قالت لهم رسلهم ان نحن	ان کے رسولوں نے کہا کہ ہم تمہاری ہی طرح
الا بشر مثلكم ولكن الله يمن	بشر ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جن پر
على من يشاء من عباده (ابراہیم ۲)	چاہتا ہے احسان کرتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی پوزیشن واضح کرنے کا حکم ہوا ہے

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الى	آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری ہی طرح ایک
انما الهكم اله واحد	بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود
(کہف - ۱۲)	ایک ہی معبود ہے۔

دوسری جگہ ہے :-

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الى	آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہاری طرح بشر ہوں
انما الهكم اله واحد فاستقيموا	مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی
اليه واستغفروه	معبود ہے اس کی طرف سیدھے رہو اور
(حم السجدہ - ۱)	اس سے گناہوں کی معافی چاہو

انسانیت کا یہ مقام جس قدر نازک ہو اسی قدر اگر یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام جامہ بشریت میں نہ ہوں تو انسانی تقاضوں کے مطابق رہنمائی نہ کر سکیں [illegible]

ہو تقدس مآبی کے بہت عجیب انداز سے ہوئے

ان کی حرکات کو ملاحظہ کرتے ہیں کہ دنیا کے پیرو ں میں اس مقام کو سمجھنے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں ہوئی ہیں، کسی نے حضرت عیسیٰ کو ان کے مقام سے بلند کیا، ان کو خدا یا اس کا روپ، دیوتا، اوتار، اس کا بیٹا تک بنا لیا اور کسی نے اس قدر گرایا کہ پیغمبر پیشنگوئی کرنے والے کو نبی کا درجہ دے دیا اگرچہ وہ معصوم نہ ہوں اور ان کے اخلاق پاکیزہ نہ ہوں۔

یہ مقام انتہائی نازک و باریک ہے | یہ سرحد جہاں ختم ہوتی ہے وہ مقام اس قدر بلند ہے کہ مادی مخلوق کا کیا سوال خالص ملکوتی مخلوق بھی وہاں تک جانے سے عاجز ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے:

ثم رفعت الی سدرۃ المنتہی[1] — پھر میں سدرۃ المنتہی تک اٹھایا گیا،

یہ مقام ہے کہ اس تک کسی دوسری مخلوق کی رسائی نہیں۔

لو دنوت انملۃ لاحترقت — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اس مقام تک نہیں گیا

صلی اللہ علیہ وسلم[2]

لیکن اس کے باوجود یہ انسانیت و عبدیت ہی کا مقام ہے جس میں الوہیت کا شائبہ تک نہیں ہے، قرآن حکیم میں ہے:

سبحان الذی اسری بعبدہ — پاک ہے وہ جو راتوں رات لے گیا اپنے
لیلاً من المسجد الحرام الی — بندہ کو مسجد الحرام سے اس مسجد اقصیٰ
المسجد الاقصی الذی بارکنا — تک لے گیا جس کے گرد اگرد ہم نے برکتیں رکھیں
حولہ لنریہ من آیاتنا — تا کہ ہم ان کو اپنی قدرت کی
[illegible] بنی اسرائیل : ۱ — نشانیاں دکھائیں۔

---

[1] [illegible]

شانِ عبدیت کے ساتھ ماورأ الوریٰ سے قرب کا ذکر اس آیت میں ہے

فکان قاب قوسین او ادنیٰ	پھر وہ کمان یا اس سے بھی کم فاصلہ
فاوحیٰ الیٰ عبدہ ما اوحیٰ	رہ گیا، پھر وحی کی اپنے بندے کی طرف
(نجم ۔ ۱۰)	جو وحی کی۔

ماورأ الوریٰ کے قوانین مادیت کے قوانین سے بالکل مختلف ہیں

ماورأ الوریٰ سے قرب میں مادی قوانین ختم ہو جاتے ہیں، زمان و مکان کی قیدیں باقی نہیں رہتیں، حجابات اٹھ جاتے ہیں، اور براہِ راست دریائی توانائی سے استفادہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے اس مقام کو سمجھنے کے لیے مادی ذرائعِ علم ناکافی ہیں، اگر ان ذرائع سے حقیقت تک رسائی کی کوشش کی جائے تو اسی طرح ناکامی ہوگی جس طرح حیوان کی حسیات کے ذریعہ انسان کی عقلیات کو سمجھنے میں ہوگی، غالباً اسی وجہ سے قرآن حکیم نے بات نہایت مختصر کر دی ہے۔

لنریہٗ من اٰیٰتنا (نجم ۔ ۱)	تاکہ ہم بندہ کو اپنی نشانیاں دکھائیں۔

دوسری جگہ ہے

لقد رای من اٰیات ربہ	بے شک اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی
الکبریٰ (بنی اسرائیل ۔ ۱)	نشانیاں دیکھیں

فیضان کی ضرورت ہمیشہ اور ہر دور میں رہتی ہے

ارتقائے انسانیت کی آخری منزل ختم ہونے کے بعد فیضانِ وحی کا سلسلہ اگرچہ ختم ہو گیا ہے، لیکن اس کی ضرورت ہمیشہ اور ہر دور میں رہتی ہے، کیونکہ انسان میں دو قسم کی توانائیاں ہیں: (۱) نورانی اور (۲) حیوانی۔

نورانی فطرت کی پیدا کردہ ہیں اور حیوانی اجزائے ترکیبی کے خواص سے ابھری ہیں،

ان دونوں کے اپنے اپنے تقاضے ہیں، جن میں باہمی کشمکش اضطراب اٹھنے کی کوشش جاری رہتی ہے،

انسان چونکہ طبعاً اجزائے ترکیبی کے خواص کی طرف مائل ہے، اس لیے آسانی سے حیوانیت کے آثار و مظاہر میں الجھ جاتا ہے اور کبھی تو یہ الجھاؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ وجدان و احساس کا ذائقہ تک بدل جاتا ہے، اور مٹھاس میں بھی کڑواہٹ محسوس ہونے لگتی ہے، اس بنا پر نورانی توانائی کو ابھارنے اور دونوں میں عدل و توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک منظم پروگرام ناگزیر ہے، کیونکہ ایک نظم کے ساتھ جب تک مثبت و منفی تاروں کے چھیڑنے کا نظم نہ ہو زندگی میں وہ نغمہ نہ پیدا ہو سکے گا، جو ساز کا مقصود و مطلوب ہے۔

دراصل اسی نغمہ کو پیدا کرنے کے لیے فیضان کی ضرورت ہوئی اور صفحۂ ہستی پر جب تک انسان کا وجود باقی ہے بدستور اس کی ضرورت رہے گی۔

قرآن حکیم میں ہے:

هو الذي بعث في الأميين	وہ اللہ جس نے امیوں میں انہی میں سے
رسولا منهم يتلوا عليهم	ایک رسول بھیجا جو ان کو اس کی آیتیں
آياته ويزكيهم ويعلمهم	سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور ان کو کتاب
الكتب والحكمة (جمعہ-۱)	اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے۔

لقد من الله على المؤمنين اذ	بیشک اللہ نے مومنوں پر احسان کیا ہے
بعث فيهم رسولا منهم يتلو	کہ ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انکو
عليهم آياته ويزكيهم ويعلمهم	اس کی آیتیں سناتا، ان کا تزکیہ کرتا اور

الکتب والحکمۃ (آل عمران) ... ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے

ایک اور جگہ ہے

لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت و	بیشک ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی دلیلیں
انزلنا معھم الکتٰب والمیزان	دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور ترازو
لیقوم الناس بالقسط (حدید)	اتاری تاکہ لوگ عدل کو قائم کریں

ضرورت تھی کہ اس کی حفاظت کا خصوصی اہتمام ہو

اس فیضان کی ہدایت ہر جہانی ابد الآباد تک کے لیے تھی اس لیے خود ربانی قوت نے اس کی حفاظت اپنے ذمہ لی. قرآن مجید میں ارشاد ہے

انا نحن نزلنا الذکر وانا له	ہم ہی نے یہ قرآن اتارا اور ہم ہی اس کی
لحٰفظون (حجر - ۱)	حفاظت کرنے والے ہیں

پھر اس فیضان کو ہمیشہ کے لیے عملی شکل میں منتقل کرنے کے لیے صاحب وحی کی زندگی کو "نمونہ" بنا کر اس کی حفاظت کا بھی اہتمام کیا گیا.

لقد کان لکم فی رسول الله	بیشک تمہارے لیے رسول اللہ میں بہترین نمونہ
اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا الله	ہے اس کے لیے جو اللہ اور آخرت کے
والیوم الاٰخر وذکر الله کثیرا	دن کی امید رکھتا ہے اور اللہ کو بہت
(احزاب - [illegible])	یاد کرتا ہے

اس "نمونہ" کو جن لوگوں نے اپنی زندگی میں رچا بسا لیا ان کو بعد والوں کے لیے نمونہ بنانے کا حکم دیا گیا.

لیکون الرسول شھیدا علیکم	تاکہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر
وتکونوا شھداء علی الناس (بقرہ)	گواہ ہو

ماوراء سے ربط ہے

وكذلك جعلناكم أمة وسطا	اور اسی طرح بنایا ہم نے امت معتدل
لتكونوا شهداء على الناس	کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر
ويكون الرسول عليكم شهيدا (بقرہ)	گواہ ہو،

ارتقاء ختم ہونے کے بعد بھی تسلسل موجود ہے	اس طرح فیضان کا ارتقاء ختم ہونے کے بعد بھی اس کا تسلسل موجود ہے جس سے استفادہ جاری رہتا ہے،

كنتم خير أمة أخرجت للناس	تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے
تأمرون بالمعروف وتنهون	وجود میں لائی گئی ہو نیکی کا حکم دیتے ہو اور
عن المنكر وتؤمنون بالله (آل عمران)	برائی سے باز رکھتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

استفادہ سے محرومی میں زندگی خود زندگی سے گریزاں اور تہذیب خودکشی پر مجبور ہوگی	اگر اس استفادہ سے محرومی رہی تو زندگی میں نغمہ نہ پیدا ہوسکے گا اور وہ اپنے سے گریزاں رہے گی،

اسی طرح اگر تہذیب کی تشکیل میں استفادہ نہ کیا گیا تو نہ ماوراء الوریٰ سے ربط و تعلق پیدا ہوگا اور نہ زندگی کے ماورائی حصہ کی نمائندگی ہوسکے گی، اور اس تہذیب سے عمل و توانائی مفقود ہوکر تہذیب خودکشی پر مجبور ہوگی؛

ماوراء الوریٰ سے ربط و تعلق حیرت و خوف کا نہیں ہے بلکہ رحمت و محبت کا ہے

والذين آمنوا أشد حبا	اور جو لوگ ایمان لائے ان کو اللہ
لله (بقرہ - ۱۹)	سے نہایت قوی محبت ہے

دوسری جگہ ارشاد ہے:

ورحمتي وسعت كل شيء (اعراف)	میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے

اور اسی وقت سے ہے جبکہ نیچرل کانسٹی ٹیوشن بھی بنایا ہوا تھا، جیسا کہ کہا گیا تھا

واذ اخذ ربك من بنی آدم	اور جب آپ کے رب نے بنی آدم کی
من ظهورهم ذريتهم واشهدهم	پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور
علی انفسهم الست بربكم	ان سے ان کی جانوں پر اقرار کرایا کہ کیا
قالوا بلی شهدنا ان تقولوا	میں تمہارا رب نہیں ہوں، انھوں نے
يوم القيمة انا كنا عن هذا	کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں کبھی قیامت
غفلين (اعراف - ۲۱)	کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم اسکو بھولے ہوئے تھے

اس لیے جو تہذیب اس سے غفلت برتے گی اس کو نہ زندگی کا سرچشمہ و مقصد معلوم ہوگا اور نہ سمت سفر و منزل کی نشاندہی ہو سکے گی،

(باقی)

اسلام اور عربی تمدن

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

۲۔ ضلع بریلی

از

جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی

(۵)

لکھنؤ کیوں نہ بریلی کو کہیں ان روزوں اب تو سرسبز یہاں باغ سخن دیکھتے ہیں
(ربیع الموسمی لالی خاں)

ضلع بریلی اگرچہ شمالی ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے ایک قدیم ترین مرکز یعنی بدایوں سے ملحقہ ضلع ہے، پھر بھی یہاں اہل علم و صاحب تصانیف اصحاب کا ذکر اواخر عہد مغلیہ سے قبل نہیں ملتا، عہد شاہجہانی میں بریلی کو صوبائی صدر مقام بنایا گیا، اس کے بعد سے یہاں علمی و ادبی سرگرمیوں کا پتہ چلتا ہے، پہلی ذی علم شخصیت جس کا بریلی سے تعلق ہے اور جس کے متعلق ہمیں علم ہے، رفیع خاں باذل ہیں، جو عہد شاہجہانی میں مختلف اوقات میں مختلف صوبوں کے صوبیدار رہے، وہ شاہر دخلیفہ کے بھتیجے تھے، [illegible] میں بریلی کے صوبیدار مقرر ہوئے تھے، باذل ایک پرگو اور خوش گفتار شاعر تھے، مجموعۂ غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی حملۂ حیدری کے بھی مصنف ہیں، جو حقیقتاً معارج النبوت کی منظوم شکل ہے اور جس میں شاہنامہ کے طرز پر غزوات نبوی کو نظم کیا گیا ہے، اس مثنوی میں بقول بندرابن خوشگو اور شاہ نواز خاں جلیقی ہم نژاد

اور بقول آزاد بلگرامی تیس ہزار اشعار تھے، باذل کا انتقال بادشاہ اول کے عہد حکومت میں ہوا۔[1] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

دل در غمت نهادیم جان بود عرض کردیم | چیزی که یار خواهد هر چیست و ما نداریم
هشدار کاین چشم سیه بر سر مستی است | هر یک مژه بر هم زدنش تیغ دو دستی است
امشب چو شمع ریخت ز هر تار زلف ما | هر گریه‌ای که بود گره در گلوی ما
چه نشاط باده بخشد به من خراب بی تو | به دل گرفته ماند قدح شراب بی تو
تو چنان رمیدی از من که بخواب هم نیایی | بکدام دیده امشب برم بخواب بی تو
عشق را با هر کسی نسبت بقدر جوهر است | قطره بر گل شبنم و در قعر دریا گوهر است

باذل کے ہم عصر ایک دوسرے فارسی گو ایرانی نژاد شاعر جن کا دہلی سے تعلق تھا حکیم عبدالرزاق مشرب تھے۔ وہ اواخر عہد عالمگیری میں اصفہان سے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی اور وہیں قرابت داریاں کیں لیکن مستقل قیام نہیں کیا۔ دہلی سے ترک سکونت کے بعد کچھ دنوں تک لکھنؤ میں، پھر کچھ دنوں تک نوازش خاں ملتانی کے ہمراہ کشمیر میں رہے۔ آخر عمر میں سندھ چلے گئے اور وہیں ۱۱۲۶ھ / ۱۷۱۴-۱۵ء میں ان کا انتقال ہوا۔ آزاد بلگرامی کے قول کے مطابق انھوں نے ایک لاکھ اشعار کا دیوان[1] مرتب کیا تھا۔ ان کی پرگوئی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک دن میں سات سات آٹھ آٹھ غزلیں کہتے تھے۔

ان کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

[illegible] گل [illegible] | دل [illegible]
آخر گذشت مستی و نشئہ [illegible] ما | این باده را ز خم [illegible]

۱؎ آزاد بلگرامی [illegible]

[illegible] (الف)

قدرت اللہ شوق کے بیان سے عہد محمد شاہی میں بھی یہاں کے ایک فارسی گو شاعر کا پتہ چلتا ہے۔ یہ نواب ہدایت علی خاں ہیں جو اسی عہد میں صوبیدار بریلی اور بقول شوق فارسی کے صاحب دیوان شاعر تھے[1]

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

روہیلہ سرداروں خصوصاً حافظ رحمت خاں (پیدائش سنہ ١١٢٠ھ شہادت سنہ ١١٨٨ھ) کا دور حکومت بریلی کا عہد زریں تھا۔ انتظام حکومت کی بہتری اور عام خوش حالی کے ساتھ اس عہد میں بریلی کو علمی مرکزیت حاصل ہوئی۔ اس زمانہ میں یہاں کی دولت کی کشش اور اہل فضل کی قدر دانی کی شہرت علماء کو دور دور سے کھینچ کر کٹھیر کے مختلف شہروں میں لا رہی تھی۔ اس عہد میں اہل علم کی قدر دانی کا اندازہ مستجاب خاں کی درج ذیل عبارت سے کیا جاسکتا ہے:[2]

"پنج ہزار از فاضل و عالم و طالب علم موافق علم و فضل ما وجب می یافتند و برائے ہر یک از فضلاء و علماء کہ بہ درس و تدریس اشتغال می نمودند مدارس و مساجد از سرکار صورت اتمام پذیرفتہ بود و کتب درسی متعدد در ہمہ مدارس از حضور مقرر بودند تا بفراغ آں بتعلیم خلائق و عبادت خالق بپردازند و خرچ طلباء سوائے نوکران سرکار از نقد و طعام بطریق یومیہ در ہر مدارس می رسید و چوں طالب علمے بدرجۂ فضیلت می رسید، علماء جمع شدہ آں را بحضور می آوردند و آں حضرت دستار فضیلت بکتابت طالب علم را بدست خود بسر او می بستند و شیرینی و طعام وافر بنیاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم از سرکار مہیا و مرتب ساختہ بمیں علماء و فضلاء و طلباء حصہ رسد قسمت می فرمودند

[1] طبقات الشعراء [illegible] [2] گلستان رحمت [illegible]

واں باقی نامہ علما کی لازمہ قدر شناسی نموده بخواه موافق دیگر علماء و فضلاء مقرری می کردند وسوائے تعظیم و تکریم اہل علم به ایشان کار سے نمی فرمودند ......

اس کی تصدیق سعادت یار خاں کی مندرجہ ذیل عبارت سے ہوتی ہے :[1]

"...... و علی ہذا القیاس به استماع خبر قدر شناسی و دین پروری حافظ الملک صدہا علمائے متبحر مثل مولانا عبد العلی لکھنوی وغیرہم در تمامی شہرہائے کیٹہر مجتمع شده، مواجب کشیر زیاده از حاجت از سرکار می یافتند و در مدارس کہ برائے ایشان از سرکار ترتیب یافتہ و بفراغ به درس و تدریس اشتغال می ورزند و در ہر مدرسہ کتب درسی و وظیفہ طلباء از سرکار تعیین می یافت و ہرگاه طالبعلمے به درجۂ فضیلت می رسید، علماء جمع شده او را بحضور می آوردند و حافظ الملک بدست خود دستار فضیلت بر سرش بستہ مواجب او موافق دیگر علماء مقرر می فرمودند و آں قدر تکریم علماء می کردند کہ ہرگاه از تشرف مواجہت می نمودند و علمائے مدرسہ برائے ملاقات حاضر می شدند به عذر خواہی پیش آمده به ایشان می فرمودند کہ چرا سبقت نمی نمودید .... و در عہد ریاست حافظ الملک اہل کاران یارائے آں نبود کہ پیش ایشان دم خلاف زدن می توانست "

اس عہد میں اہل علم کی سرپرستی کی گواہی ایک دوسرے اسی دور کے مصنف کندن لال اشکی نے بھی دی ہے، وہ اپنی تصنیف نزہت الناظرین میں رقمطراز ہیں کہ خود ان کی بریلی کے تقریباً تین سو اہل علم سے ملاقات تھی۔[2] اہل علم کے قدرداں ہونے کے علاوہ حافظ رحمت خاں خود بھی شاعر تھے[3] اور پشتو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر موزوں کرتے تھے۔ مشہور مستشرق

---

[1] گل رحمت (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) ورق ۸۰ ب) [2] ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں (مصنفہ مولانا ابو الحسنات ندوی مرحوم سابق رفیق دار المصنفین اعظم گڈھ) [3] حیات حافظ رحمت خاں (مصنفہ الطاف علی بریلوی) ص ۲۹۲

[illegible] اسٹریچی (...) کی گواہی پر ... M. Dawson ... [illegible]

ہوئے ... لکھا ہے کہ جس عہد کے دو رسیلوں میں حافظ رحمت خاں صاحب دیوان شاعر تھے۔ اور ڈاسن نے ان کی ایک پشتو غزل خود ایک ایسے مجموعے میں دیکھی تھی جو اب برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔[1]

افسوس ہے کہ حافظ الملک کا فارسی کلام اب دستیاب نہیں ہوتا۔ اسٹریچی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حافظ الملک کے پاس ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا جو ان کی شہادت کے بعد اودھ منتقل ہو گیا تھا اور شاہان اودھ کے ۱۸۵۷ء میں تلف ہونے والے مشہور کتب خانہ کا بڑا حصہ اسی کتب خانہ کی کتابوں پر مشتمل تھا۔[2]

حافظ رحمت خاں کے معاصرین میں بھی کئی فارسی شاعر گذرے ہیں۔ مولوی احمد خاں یکتا شاہجہاں پوری حافظ الملک کے درباری تھے، اور مدتوں ان کی صحبت میں رہے۔ قدرت اللہ شوق کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قصائد عربی و غزلیات فارسی کے مجموعے مرتب کیے تھے۔ لالہ سری رام نے بھی انھیں صاحب دیوان شاعر لکھا ہے لیکن ان کا دیوان ناپید ہے۔[3] ان کے ایک دوسرے معاصر میر محمد نعیم نعیم ہیں، جن کا قدرت اللہ شوق نے تکملۃ الشعرا میں اور انھیں کے حوالے سے امیر مینائی نے انتخاب یادگار میں ذکر کیا ہے۔ ان کا اور مصحفی کا زمانہ وہی نواب محمد یار خاں امیر کے دربار میں ساتھ رہا ہے۔ بقول شوق وہ شاہجہان آباد کے باشندے تھے لیکن وہاں کی تباہی کے بعد قصبۂ آنولہ کے متصل اترچھندی میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۱۹۲ھ کے قریب ہوا۔[4] ان کے چند شعر بطور نمونہ پیش ہیں:

---

[1] ایضاً Hastings and The Rohilla war [illegible]

[3] خمخانۂ جاوید جلد اول ص ... طبقات الشعرا ... تذکرۂ ہندی ص ... انتخاب یادگار ص ... طبقات ... (مخطوطہ علم [illegible])

اور شیخ ابراہیم خلیل [illegible] کی بیعت [illegible] شہادت

شہدائے سن کی تعداد حافظ الملک کے قریب تھی۔ مصحفی کے تذکرہ [illegible]

کی ابراہیم خلیل ان کی وفات بعد ۱۲۰۲ھ میں [illegible] مصحفی نے [illegible] تاریخ

سے ان کی تاریخ ۱۲۰۷ھ نکالی ہے لیکن شیفتہ [illegible] تذکرہ نگاروں نے ان کا سال انتقال

۱۲۰۷ھ مطابق ۱۷۹۲ء لکھا ہے[1]

سودا کے مشہور شاگرد قیام الدین قائم کا قیام بھی عرصے تک [illegible] بریلی [illegible] رہا[2]
میں رہا۔ ان کے لائق شاگرد اور دوست قدرت اللہ شوق کا تعلق بھی [illegible] سے تھا۔ وہ
تحصیل بہیڑی کے ایک گاؤں موی میں پیدا ہوئے اور علوم دینیہ مولانا غلام طیب بہاری
سے حاصل کیے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، اور صاحب دیوان شاعر
تھے لیکن ان کی اصل شہرت ان کی نثر کی تصانیف پر مبنی ہے۔ ان کا انتقال ۱۲۲۴ھ (مطابق
۱۸۰۹ء) میں ہوا، اور حکیم احمد خان نے تاریخ وفات "چراغ شاعری از بزم شد"
سے نکالی۔[3]

حافظ رحمت خان کے بیٹے نواب محبت خان بھی اس دور کے شاعر تھے۔ عربی،
پشتو اور اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ حافظ الملک کی شہادت کے بعد
لکھنؤ میں مستقلاً مقیم ہو گئے تھے، اور وہیں ان کا [illegible] صفر ۱۲۲۳ھ میں انتقال ہوا۔[4]
فارسی کلام کا نمونہ پیش ہے۔

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۱۵، [illegible] ص [illegible]، گلشن بہار ص [illegible] [2]
Persian Literature by C. A. Storey, Section II Fasciculus I P. 143 and Vol. I Part II P. 877
[3] تذکرہ شعرائے رامپور (مصنفہ [illegible]) [illegible] ص [illegible]
[illegible] ص [illegible] گلشن بہار ص ۱۱۲ [4] اخبار [illegible] (مخطوطہ [illegible]) [illegible] گلشن ص [illegible]
[illegible] ص ۱۹۱ - گل رحمت (مخطوطہ رامپور) گلشن ہند (مطبوعہ [illegible]) [illegible]
(مخطوطہ ٹیگور لائبریری لکھنؤ) ورق ۴۹ (ب) طبقات الشعراء

تو من رشتۂ ناموس شکستہ چو بتاں — سوختہ ام من سرو تو شعلہ مرا

بیاد نگہ گرم کہ سوختہ نگران — کہ خود تیغ جنوں شوری محبت بہ میان آب

وانگہ کہ دم مرا نبود پیدا کردہ اند — این گلہ ہم بس کہ رنگ آمد و پیدا کردہ اند

چون لالہ دل سوختہ در گلشن و صحرا — ہر جا کہ روم بے گل رخسار تو داغم

وانم طلب رسوختن و کشتنم بکجا — چون عاشق توام چہ باشد سزائے من

گر کشش من اثرے داشتے — یار ببویم گذرے داشتے

گر زغش از پردہ برون آمدے — شام محبت سحرے داشتے

میاں مختار احمد نامی محبت غالب کے معاصر تھے، ان کا وطن اگرچہ دہلی تھا لیکن مسکن بریلی تھا۔ مصحفیؔ نے ان کا ذکر اس عہد کے شعرا میں کیا ہے، مگر افسوس ہے کہ نمونۂ کلام فارسی پیش نہیں کیا۔[1]

سیف اللہ متخلص بہ نعمت شیخ کفایت اللہ بریلوی بھی اسی دور کے فارسی گو شاعر تھے۔ وہ کریم الدین آزاد مراد آبادی کے شاگرد تھے۔ نواب نصر اللہ خاں کے عہد میں عرصہ تک رامپور میں مقیم رہے۔ ۱۲۲۶ھ (مطابق ۱۸۱۱ء) میں ان کا انتقال ہوا۔ مجموعۂ غزلیات کے علاوہ ایک مثنوی بنام [illegible] کے بھی مصنف تھے، لیکن یہ مثنوی اور تمام دوسرا کلام اب ناپید ہے۔ ان کا ایک شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہے:[2]

وائے طول شب ہجر تا قیامت — عمر خضر است کہ بے پایان است

[illegible] ایک اور شاعر [illegible] تھے، جو حضرت [illegible] شوق کے بیان کے مطابق [illegible] تھے لیکن آخر میں [illegible] رامپور میں اقامت پذیر ہو گئے تھے۔[3]

[illegible] ص ۲۰۴

ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

گر دیدہ است امروز آں نگاہ بے پرسش را — کہ امشب محتسب با خود شراب مستانہ می‌آید

پژمردہ شود عارضش از تاب نگاہم — آئینہ از جلوہ پرستان گلہ دارد

در غم زلف او سیہ پوش است — سوگوار مرا تماشا کن

اس عہد میں شیدا رام جوہری بریلی میں گذرے ہیں، انھوں نے صرف ونحو پر فارسی نظم میں ایک کتاب جواہر الترکیب ۱۲۳۷ھ (مطابق ۱۸۲۱ء) میں تصنیف کی جو طبع بھی ہو چکی ہے۔ حافظ رحمت خاں کے ایک پوتے حافظ یار خاں خلف نواب ذوالفقار خاں بھی انیسویں صدی کے نصف اول دور کے شعرائے بریلی میں تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، اردو میں حافظ اور فارسی میں راغب تخلص کرتے تھے۔[۱] نمونہ ان کا درج ذیل ایک شعر پیش ہے:

مریض عشقم و نومیدیم ہیں — کہ از امید پرسیدن ندارم

اسی زمانہ میں بریلی میں ایک بزرگ ہستی جن کا شاعری میں بھی بلند مقام ہے، شاہ نیاز بریلوی کی تھی۔ ان کا مولد سرہند تھا، لیکن انھوں نے تحصیل علم دہلی میں شاہ فخر الدین سے کی اور انہی کے حسب الحکم بریلی آکر مقیم ہو گئے اور بیس ششم جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ (مطابق ۱۸۳۴ء) میں ان کا انتقال ہوا۔[۲] فارسی اور اردو کلام پر مشتمل ان کا ایک دیوان شائع ہو چکا ہے، فارسی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

ز صنعت رخ خوباں ہمیں نمود رقم — کہ خط و خال و رخ و زلف چشم ابرو است

نظر عجیب مکن در ظہور باغ وجود — کہ ظہور یان چمن از غنچہ از غن جہاں است

---

[۱] تذکرۃ الشعراء (مخطوطہ مسعود) ... و دور روشن ص ۲۳۳ [۲] دیباچہ دیوان نیاز ... [illegible]

ز عشق جلوه [illegible] عشق و دل | که قیس و لیلی و شیرین و کوهکن همه اوست
شنیده‌ام صنم‌خانه از زبانِ صنم | صنم‌پرست و صنم‌گر صنم‌شکن همه اوست
وصالِ محبوب [illegible] | که چوب و تار و [illegible] همه اوست

حکیم بدیع الدین خلف شیخ محمد قائم تحریر کا ذکر بھی قدرت اللہ شوق نے اس عہد کے نومشق شعراء میں کیا ہے۔ ان کے متعلق رقمطراز ہیں کہ "جوانیست موزون قابلیت و مخزن اہلیت و در علم دسترس پیدا کردہ، در نظم و نثر مہارتے تمام دارد..... اگرچہ نومشق است اما شعر خوب می گوید"[1]

مہاراجہ رتن سنگھ زخمی کے والد راجہ بالک رام بریلی کے رہنے والے اور آصف الدولہ کے میر آتش تھے۔ ان کے نام سے توپ خانہ بالک رام ایک محلہ اب تک مشہور ہے۔ زخمی بھی شاہان اودھ کی خدمت میں منشی الملوکی کی خدمت پر مامور اور فخر الدولہ کے خطاب سے ممتاز ہوئے۔ محمد علی شاہ کے عہد میں دیوان کے منصب پر فائز ہوئے اور مہاراجگی کا خطاب پایا۔ ۱۲۶۴ھ میں مشرف بہ اسلام ہوئے اور ۱۲۶۷ھ (مطابق ۱۸۵۱ء) میں انتقال کیا[2]۔ زخمی بیشتر عربی علوم، فارسی، ترکی، سنسکرت اور انگریزی سے واقف تھے۔ ان کے فارسی کلام کا نمونہ یہ ہے:

زخمی اگر ز چشم سفید است که داوری | نسبت به کفِ پائے کسے برگِ سمن را
(کذا) هزار تیغ به یک زخم کار ما آسان کن | که نیست حل شدنی مشکلِ [illegible]
کجاست [illegible] که از [illegible] | [illegible]
ز قتلِ [illegible] | که [illegible] نزدِ [illegible]
چو [illegible] | [illegible] دیده [illegible]

[1] تکملۃ الشعراء (مخطوطہ [illegible]) ص ۳۰۳ [2] صبح گلشن، ص ۱۶۹

رنگین کے ایک دوسرے ہم عصر سید شاہ وکٹر ولی اشگی تخلص تھے، ان کا وطن بھی بریلی تھا، وہ بھی سلاطین اودھ کے خدمت گذار اور شجاع الدولہ کی خدمت پر مامور تھے، بعض مصنفین بہت عرصہ تک لکھنؤ میں مقیم رہے، علم حاصل کیا انھوں نے شاہ رفیع الدین دہلوی سے، ان کے اشگی کا انتقال ۱۲۱۶ھ (مطابق ۱۸۰۱ء) میں ہوا۔ نمونۂ شعر پیش ہے،

ترک عشق است و دل اشگی لیکن — نتوانم نتوانم نتوانم چہ کنم

ہزاری لال وحید بھی اسی عہد کے ایک بریلوی فارسی گو شاعر تھے، اور بقول مصنف صبح گلشن[1] "بلبل دلچسپ زبان بہ رنگ ہزار داستان زبان کشود۔"[2] نمونۂ سخن کا ایک شعر پیش ہے

می گشت مرا ناز و می گفت — اے ہجر کشیدہ دیدہ وا کن

پنڈت دیا ناتھ دقا بریلوی بھی اسی دور کے شاعر تھے جو اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے، ان کی ایک فارسی مثنوی گل و بلبل اور ایک دوسری اسرار دل (جو ۱۲۴۳ھ میں تصنیف ہوئی) کے قلمی نسخے رضا لائبریری رام پور میں ہیں، ان کا زمانہ آخری زمانہ محمد واجد علی شاہ میں لکھنؤ میں گذرا۔

غلام حضرت عشق بریلوی بھی اسی زمانہ کے شاعر تھے، وہ مرزا قتیل کے شاگرد تھے، ۱۲۴۳ھ (مطابق ۱۸۲۷ء) میں انھوں نے ایک دیوان فارسی ترتیب دیا تھا جو اب تک غیر مطبوعہ ہے۔

محبت خان ابن محمد یار خان خلف حافظ رحمت خان بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، ان کی ایک تصنیف ریاض محبت ... مطبوعہ ہے۔

متذکرۂ بالا شعراء کے علاوہ انیسویں صدی میں کچھ اور شعراء بریلی کا پتہ چلتا ہے جو فارسی زبان میں طبع آزمائی کرتے تھے، ان میں اخلاق الدین بریلوی متخلص بہ ... کے

---

[1] ہندو دوش، صفحہ ۵۰ [2] صبح گلشن، ص ... [3] اخبار ... مطبوعہ ...

پہنچ چکی ہوئی تھی۔ [illegible] ہم عصر [illegible] بریلی کے [illegible] شعرا کے [illegible] ہیں

میں ان کا ذکر میر ولی اللہ اشتیاق نے تذکرہ آیات [illegible] شعرا [illegible] میں کیا ہے[1]

اسی صدی کے نصف آخر میں ایک شاعر محمد حسن صاحب [illegible] تخلص [illegible] تھے

[illegible] فارسی میں [illegible] شعر کہتے تھے فارسی میں مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ انہوں نے

۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۸ء میں وفات پائی[2] ان کے کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے:

دیدم بچشم خود [illegible]   گرفت دست نگار [illegible] جام [illegible]

اسی زمانہ میں دو ایسے فارسی گو شعرا کا ذکر صاحب روز روشن نے کیا ہے اور ان

دونوں کا تخلص ذکی لکھا ہے میر محمد مہدی ذکی بریلوی کا حسب ذیل شعر روز روشن میں ملتا ہے[3]

مرغ گلگشت از چمن [illegible]   تو کاشے می کنی یارا کرد [illegible] شاید

دوسرے ذکی کے حالات دستیاب نہیں ہوتے لیکن ان کے حسب ذیل شعر روز روشن

میں ملتے ہیں[4]

بیقراری ما [illegible]   زہر قاتل [illegible] دل [illegible]

[illegible] گرفتست ہوائے چمنستان [illegible]   می رود [illegible] صبا [illegible]

دم عیسیٰ قلم یافت ذکی [illegible] کلیم   [illegible]

گذشتہ صدی کے اختتام سے قبل ہی ہندوستان میں فارسی زبان اور شاعری کا زوال

آنا شروع ہو گیا تھا اور اس کی جگہ رفتہ رفتہ اردو نے لے لی تھی بریلی بھی [illegible] دوسرا

جگہوں سے مختلف نہ تھے [illegible] گذشتہ صدی کے آخری زمانے سے یہاں فارسی شعر و [illegible]

۱۔ تذکرہ آیات [illegible] ۲۔ [illegible] غالب ص ۱۹۲

۳۔ روز روشن ص ۲۰۰ ۴۔ روز روشن ص ۲۹۲

کے حالات دستیاب نہیں ہو سکے، موجودہ صدی میں البتہ پنہاں ایک ایسے خاندان کی چشم و چراغ
جس کے افراد میں فارسی گوئی کا ذوق بدستور باقی تھا۔ بہر کیف خاتون پنہاں ان چند جلیل القدر
اہل ذی علم خاندان کی چشم و چراغ تھیں جو اردو کے ساتھ ساتھ فارسی میں بھی اپنا کلام چھوڑ گئیں۔
پنہاں ۱۹۰۵ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں لیکن اپنے والد مولوی عبدالاحد صاحب کے قیام الہ آباد
کی وجہ سے ان کی پرورش الہ آباد میں ہوئی۔ انھیں شعرگوئی کا شوق ۱۹۲۱ء سے پیدا ہوا اور
اس فن میں طالب علی طالب الہ آبادی کی شاگرد ہوئیں، لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا،
کیونکہ ۱۹۲۰ء میں اپنے والد کے انتقال کے بعد خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ پنہاں کو بھی
الہ آباد چھوڑنا پڑا اور وہ بریلی واپس آگئیں۔[۱] ان کے فارسی کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

(کذا) گفتند کہ از عشق بتاں رستہ نکوتر — گفتم کہ بر او عاشق ہشش رستہ نکوتر
گفتند دریں راہ خبر ہیچ نیاید — گفتم کہ ز دانستہ ندانستہ نکوتر

دلا از رمز ہستی باخبر زی — ز سودائے سکوں بیگانہ تر زی

امیر خسرو کی نعت میں ایک مشہور غزل کے جواب میں لکھی ہوئی پنہاں کی ایک غزل
کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں[۲]:

جمالش زینت دل بود شب جائیکہ من بودم — بہ چشمم دہر باطل بود شب جائیکہ من بودم
ببر من از رہبر کامل طریق عشق دانستم — سر تلہا منزل بود شب جائیکہ من بودم
نگاہم بر تجلائے رخ آئینہ رخسارے — سرم بر پائے قاتل بود شب جائیکہ من بودم
چہ ساں دل بردی بساز دریا دم کیفیت شوقش — دلم نخچیر قاتل بود شب جائیکہ من بودم
دلم پرداخت با یاد جمال روئے و ابرویش — وجود غیر باطل بود شب جائیکہ من بودم

---

[۱] تذکرہ شاعرات اردو، ص ۲۰۰ [۲] امیر خسرو کی اس غزل کا مطلع درج ذیل ہے:
خدا خود میر مجلس بود اندر لامکاں خسرو — محمد شمع محفل بود شب جائیکہ من بودم

[illegible]

[illegible]

[illegible] فارسی [illegible] حاجی [illegible]

[illegible] بنگی کا دیوان [illegible]

اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعرہ ہے، مرزا جانی کی ایک مشہور غزل کے جواب

میں ان کی کسی چھٹی ایک غزل کا شعر نمونہ پیش ہے[2]

چوں تماشائے دو عالم در نظر پیش شود — اے ہما [illegible]

اٹھارہویں صدی سے قبل بریلی میں کسی فارسی نثر نگار کا پتہ نہیں چلتا، اس صدی میں البتہ یہاں فارسی نثر کی کچھ کتابیں لکھی گئیں، ان میں اولیت کا شرف حافظ رحمت خاں کی تصنیف خلاصۃ الانساب کو ہے جو [illegible] کی ایک تاریخ ہے، جسے حافظ الملک نے علی محمد خاں کے زمانۂ حیات ہی میں لکھا تھا۔[3] حافظ الملک کے انتقال کے [illegible] بعد ۱۱۹۳ھ (مطابق ۱۷۷۹ء) میں نواب علی [illegible] نے شیخ نظامی کے سکندر نامہ کے پہلے حصہ کی جو شرف نامہ یا سکندر نامہ بری کہلاتا ہے) کی شرح لکھی، اسی شہر میں قدرت اللہ شوق (متوفی ۱۲۲۴ھ مطابق [illegible]) نے اپنی مشہور تاریخ عالم جام جہاں نما [illegible] ۱۱۷۴ھ [illegible] سال اختتام [illegible] اس کے [illegible] سال کے بعد یعنی [illegible] میں [illegible] شوق کی ایک تیسری تصنیف تکملۃ الشعراء ہے جو [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

Persian Literature [illegible] Hastings and The Rohilla War [illegible]

by C. A. Storey [illegible] Fasciculus I [illegible]

حالات میں قدیم ترین اور مستند ترین کتاب ہے، جسے حافظ رحمت خاں کے بیٹے محمد مستجاب خاں (متوفی ۸ر شوال ۱۲۴۸ھ مطابق ۲۶ر فروری ۱۸۳۳ء) نے ۱۱۹۳ھ میں مکمل کیا[1]۔ اسی دور میں حافظ رحمت خاں کے دوسرے بیٹے اللہ یار خاں نے ہندوستانی پشتو لغت مرتب کیا جس میں معنی فارسی زبان میں سمجھائے گئے تھے۔[2]

انیسویں صدی میں بریلی میں ہونے والی فارسی تصانیف میں اولیت کا شرف قدرت اللہ شوق کی تصنیف تکملۃ الشعراء کو ہے جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس دور کی ایک دوسری تصنیف عطر بہار ہے، جو حقیقتاً جہاندار شاہ کے عشق سے متعلق شیخ عنایت اللہ کی تصنیف بہار دانش کی سہل فارسی عبارت آرائی ہے۔ اس کتاب کو محمد ضیاء الدین حسن شائق ابن شاہ غلام محی الدین سرہندی متوطن بلدۂ بریلی نے ۱۲۲۲ھ (مطابق ۱۸۰۷ء) میں تصنیف کیا جیسا کہ درج ذیل شعر سے ظاہر ہے[3]

بہار بخش دل و دانش شعار گفتہ "زیبا نسخۂ عطر بہار"

تذکرۃ الشعراء، خلاصۃ العلوم، مفتاح جیبان، ہدیۃ التجارب، بدیع النوادر وغیرہ متعدد کتابیں (جن میں آخر الذکر دونوں فن طب سے متعلق ہیں)، اسی دور میں مولانا رحم علی بریلوی نے تصنیف کیں[4] اور ۱۲۲۸ھ (مطابق ۱۸۱۳ء) میں بریلی کے ایک دوسرے حکیم غلام امام نے فن طب پر ایک اور کتاب مصباح التجربات تصنیف کی جس کا ایک قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے۔ ۱۲۳۳ھ (مطابق ۱۸۱۸ء) میں حافظ رحمت خاں کے ایک پوتے مودت خاں خلف حافظ یار خاں بن حافظ رحمت خاں نے شرح سلم [illegible]

---

1. اخبار حسن Persian Literature, Section II Fasciculus III, P.696
2. Hastings and Rohilla war. Page 28
3. عطر بہار، مخطوطہ رامپور، عدد ، ص ۲ ؍ ۳   4. تاریخ فرخ آباد، مصنفہ سید ولی اللہ ص ۳۰۳

پر تقریباً دو سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب اسعد الاخبار بذکر سید الابرار تصنیف کی[1] اور اس کے چند سال بعد یعنی ۱۲۴۹ھ (مطابق ۱۸۳۳ء) میں حافظ رحمت خاں کے ایک اور پوتے سعادت یار خاں بن حافظ محمد یار خاں نے روہیلہ افغانوں سے متعلق ایک دوسری اہم تصنیف گل رحمت (جو حقیقتاً مستجاب خاں کی گلستان رحمت پر مبنی ہے) مکمل کی[2]، اسی زمانہ میں کندن لال اشکی نے نزہت الناظرین تصنیف کی اور ان کے بیٹے منولال فلسفی نے جغرافیہ پر ایک کتاب مساکن فلسفی لکھی جس کا ایک قلمی نسخہ رامپور میں موجود ہے[3]، فلسفی شاعر بھی تھے، اور تذکرہ روز روشن میں ان کا درج ذیل شعر ملتا ہے[4]

آں زلف گرہ گیر کہ جانم گرو اوست — گسترده بہ باشد کہ دگر دام بلا را

(باقی)

۱؎ تذکرۂ جواہر زواہر حصہ اول ص ۱۲۰، ۲؎ گل رحمت مخطوطہ رامپور ورق ۱ (الف)، ۳؎ Persian Literature by C.A. Storey, P.697 ۴؎ روز روشن، ص ۵۳۸

میرا وارڈ

اس سال میرا وارڈ کی رقم ہزار سے بڑھا کر ساڑھے بارہ سو روپیے کر دی گئی ہے، اس کے علاوہ میر تقی میر سے متعلق ۱۹۶۶ء کی بہترین تصنیف پر ایک طلائی تمغہ بھی دیا جائے گا،

میرا وارڈ ۱۹۶۶ء کی چھپی ہوئی اردو کی بہترین علمی، ادبی، تاریخی، تحقیقی تصنیف اور شعری مجموعے پر دیا جائے گا جس کا فیصلہ ایک کمیٹی کرے گی۔

انعام میں شامل کیے جانے والی کتاب کی پانچ جلدیں ۱۵ مارچ ۱۹۶۷ء تک جنرل سکریٹری کے پتے پر پہنچ جانی چاہئیں۔

مظفر احمد فاروقی جنرل سکریٹری آل انڈیا میرا کاڈمی
(ادبی ہاؤس، لکھنؤ۔)

شام میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از جناب سید احتشام احمد ندوی ایم اے، پی ایچ ڈی ریڈر شعبۂ عربی کالیکٹ یونیورسٹی

(۲)

قسطاکی الحمصی ۱۸۵۸ء تا ۱۹۴۱ء

قسطاکی حمصی حلب میں ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد فتح اللہ مشہور و معروف اعیان حلب میں تھے، ان کی تجارت بہت وسیع تھی، حمصی نے پہلے ایک مکتب میں پڑھا، پھر "رہبان ارض فرانسیس" کی تعلیم گاہ میں داخل ہو گئے اور فرانسیسی و اطالوی زبانوں میں مہارت حاصل کی، ۱۸۸۰ء میں فرانس کا سفر کیا اور ایک فرانسیسی پروفیسر سے فلسفہ کا درس لیا، ۱۹۱۳ء میں دوبارہ فرانس گئے، اس طرح فرانسیسی زبان میں ان کو عربی ہی کی طرح مہارت حاصل ہو گئی،

حمصی کو بچپن ہی سے شعر و ادب کا ذوق تھا، شیخ ابراہیم الیازجی سے ان کے قریبی تعلقات تھے، ۱۹۰۸ء میں انھوں نے استنبول اور ۱۹۱۰ء میں قاہرہ کا سفر کیا اور اہل فکر و نظر سے مل کر ذہن میں جلا پیدا کی،

زبان کی صحت کا ان کو بڑا خیال تھا، ان کے ترجموں تک میں غیر عربی طرز کا پتہ نہیں چلتا، ۱۹۱۹ء میں ان کو "مجمع العلمی العربی" [illegible]

[illegible] انھوں نے ایک کتاب "منہل الوراد" کے نام سے دو جلدوں میں لکھی پھر تیسری جلد کا اضافہ کیا، جس میں دانتے اور ابو العلاء معری کا تقابلی [illegible]

عربی میں شعر [illegible] کی [illegible] ہے

(۲) "ادباء حلب ذوو الاثر فی القرن التاسع عشر"

(۳) "مختارات من شعرہ"

(۴) ان کتابوں کے علاوہ ان کے محاضرات، مقالات اور رسائل کے مجموعے کئی ضخیم جلدوں میں ہیں جو ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔

۱۹۲۰ء میں لبنان کے ایک طبقہ نے نعرہ لگایا کہ فرانسیسی کو ملک کی سرکاری زبان بنا دیا جائے، اس کی ملک کے اہل نظر نے مخالفت کی، مخالفت کرنے والوں میں قسطاکی الحمصی بھی تھے، انھوں نے ایک قصیدہ میں عربوں کی فضیلت و مناقب بیان کرکے اس خیال کی مذمت کی ہے، اس قصیدہ کا نام "البدویۃ" ہے۔

فان لیلیٰ فتاۃ لا مثیل لها … صیغت من الحسن شکلاً ماله ثانٍ

بیشک لیلیٰ ایسی نوجوان لڑکی ہے جس کی کوئی نظیر نہیں، وہ بے مثال حسن کے سانچے میں ڈھالی گئی ہے

اس لیلیٰ سے مراد عربی زبان ہے۔

حور فما لبنات الغرب تطاولها … فی حسنها بنت یونان و رومان

اس کے حور جیسے روشن چہرے، یونانی اور رومانی لڑکیاں (زبانیں) اس کے حسن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

ہارون الرشید کے پرشوکت دور کے بارہ میں کہتا ہے

الدھر [illegible] … ولکم مشرق من نور عرفان

[illegible]

[illegible] کی کوشش [illegible] ہے۔

[illegible] … [illegible]

[illegible]

اما سمعتما باسحاق ینشدکم　　　یا بعض لبنان قد مزقت اکفانی

کیا تم نے نہیں سنا کہ ابراہیم ابو اسحاق (یازجی) کہتے ہیں کہ بعض لبنانیوں نے میرا کفن پھاڑ ڈالا۔

پھر کہتا ہے کہ عربی زبان کے حامی اس کی حفاظت کریں گے۔

لیلاک آمنة ما دام من رهنوا　　　عهودهم عندنا من خیر اعوان

تیری لیلیٰ (عربی زبان) امون ہے جب تک اس کے بہترین مددگار و حامی موجود ہیں۔

محمد البزم
۱۸۸۷ء–۱۹۵۵ء

محمد بزم ۱۸۸۷ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، ان کے والد تجارت کرتے تھے، بزم بیس سال کی عمر تک سواشد بد کے کوئی تعلیم حاصل نہ کر سکے، پھر تحصیل علم کا شوق پیدا ہوا، اور وہ اہل علم کے حلقوں میں جانے لگے اور دمشق کے علماء سے انھوں نے پورا استفادہ کیا اور بڑے انہماک کے ساتھ مطالعہ میں مشغول ہو گئے، آخر میں مدرس ہو گئے اور ۲۰ برس تک درس و تدریس کی خدمت انجام دی،

۱۹۲۳ء میں المجمع العلمی العربی کے رکن منتخب ہوئے، آخر میں بیماری کا سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی سال کی علالت کے بعد جولائی ۱۹۵۵ء میں انتقال کیا،

شاعری مصر میں عرب شعراء نے الفاظ کے مقابلہ میں معانی کی اہمیت پر زور دیا، مگر بعض شعراء نے الفاظ کی جانب سے بے توجہی برتی، بلکہ بالکل جدید مغربیت زدہ شاعروں نے تو زبان ہیئت کی اہمیت ہی سے صرف نظر کر لیا، اس کے ردعمل میں شام کے شعراء میں حسن الفاظ اور حسن ترکیب کی جانب رجحان بڑھا، چنانچہ محمد بزم، جبری، خلیل مردم اور زرکلی بھی حسن الفاظ کا خاص طور سے لحاظ رکھا، لیکن معنوی حیثیت سے بھی ان شعراء کی راہ [illegible] دور، شوقی، حافظ سے مختلف نہ تھی، ان کا بنیادی خیال یہ تھا کہ (۱) صیاغت [illegible] کو اولیت حاصل

(۲) فکر کا سنجیدہ ہونا کے عہد کی چیز ہے، (۳) مغرب و مشرق کی ثقافت بنیادی طور پر متباین ہے،

مجموعی خیالات کے لحاظ سے جاہلی اور جذبات کے لحاظ سے بدوی ہیں، ان کے یہاں بدویانہ طرز کی سادگی، حلاوت اور سچائی ملتی ہے، حسن تعبیر کے جلوے جا بجا نظر آتے ہیں، اسی کے ساتھ جاہلی شعرا کی غرابت الفاظ بھی کثرت سے نظر آتی ہے، ان کی تراکیب اور تلمیحات بھی جاہلی طرز کی ہوتی ہیں، رزمیہ شاعری میں ان کا کلام دور جدید میں شاعرانہ قوت وعظمت کا نشان ہے،

شاعری ان کے لیے محض تفریح طبع کا ذریعہ نہیں بلکہ گذارش احوال واقعی ہے اور زندگی سے حقیقی تعلق کے ساتھ ساتھ فن کی عظمت، الفاظ پر قدرت اور معانی کی فراوانی ملتی ہے، زمانہ کے مصائب، زندگی کی پریشانیوں اور حالات کی نامساعدت کے بیان میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے، نمونۃً چند اشعار ملاحظہ ہوں،

دع الدهر تمضو بالرزايا مصائبه   وتمطر اصناف البلايا سحائبه

زمانہ کے مصائب کو بڑھنے دو اور طرح طرح کی بلاؤں کے بادلوں کو برسنے دو

فما الدهر الا مر يوم وليلة   تروح بسعد او بنحس كواكبه

زمانہ کیا ہے؟ دن رات کا گذرنا، اس کے کواکب سعد و نحس کو لیکر گردش کرتے ہیں۔

تطاردنا خيل الزمان بلادنا   ويعدو علينا حقبة من نوائبه

زمانہ کے گھوڑے ہمارے ملک کو پامال کر رہے ہیں، ہم پر زمانہ کی گردش اور اس کے مصائب ٹوٹ پڑے ہیں۔

اہل مغرب کی غداریوں کا ذکر کرکے کہتے ہیں

ولو انّ ما منوا به اهل يثرب غدت   نادمت بنا في النائبات مخالبه

گرسنگی تھا ہمارے اہل یثرب کے تجربہ نے مصائب میں ہمارا ساتھ دیا تو افسوس نہ ہو،

فهيا وإن طال التمادي رشدكم | بقية مجد ضيعته الغفلة

اگرچہ قوم میں ان کی مدت طویل ہو گئی ہے اور ہلاکت اس کی ہولناک [illegible] ان سے جا لگی ہے [illegible]

فهبوا هبوب الليث المجد وانتضوا | من الحزم عضبا لا يفل مضاربه

اپنی عظمت و بڑائی کیلئے شیر کی طرح اٹھ کھڑے ہو اور عزم کی ایسی تلوار لے کر اٹھو جس کا جوہر [illegible]

قومي! لا ترضوا بالمذلة منزلا | تمشي اليكم بالسموم عقاربه

اے میری قوم! ذلت کی منزل پر راضی نہ ہو، تیری طرف بچھو زہریلے ڈنک کے ساتھ بڑھ رہے ہیں،

ان اشعار میں زرکلی نے عربوں کے عزم و ہمت کو للکارا ہے، اور اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے کا سبق دیا ہے اور حسن بیان کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا ہے،

خیرالدین زرکلی جس طرح مصر میں حافظ، شوقی اور مطران نے عربی شاعری کے خوابیدہ جادو کو جگایا اسی طرح شام میں خیرالدین زرکلی، محمد بزم، شفیق جبری اور خلیل مردم نے جدید عربی شاعری میں جدت، بلندی اور تابندگی کی نئی روح پھونکی اور اس کو ایک نیا آہنگ دیا، مذکورہ بالا شعرا نے جدید رنگ میں امتیازی شان پیدا کی اور اس کے ذریعہ قومی زندگی کے احیاء اور قوم میں جولانی و نشاط پیدا کرنے کی کوشش کی۔

خیرالدین زرکلی [illegible] میں دمشق میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جدید تعلیم کے لیے بیروت گئے، ان کی ذہنی تربیت میں مشہور ادیب کرد علی، شیخ عبدالقادر اور جمال الدین قاسمی کے افکار اور ان کے درس کو بڑا دخل تھا، جن سے زرکلی نے کسب فیض کیا تھا،

[illegible] میں جب امیر فیصل کی قیادت میں عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور عربی کا عام رواج ہوا[1] تو زرکلی نے تیس سال کی عمر میں ایک رسالہ الاصمعی کے نام سے

---

[1] اس سے پہلے سرکاری زبان ترکی تھی،

ان نے عربوں میں قومیت اور اپنی انفرادیت کا احساس پیدا کیا، اس وقت جب فرانسیسی امیر فیصل کا تخت الٹنے کے لیے دمشق میں داخل ہو رہے تھے، زرکلی مصر کے ارادہ سے فلسطین چلے گئے، پھر وہاں سے مصر روانہ ہو گئے، مصر سے حجاز گئے، ان کی عدم موجودگی میں جون ۱۹۲۰ء میں فوجی عدالت نے بجز سیاسی افراد کے لیے پھانسی کا حکم جاری کیا، ان میں زرکلی کا نام سرفہرست تھا، جب یہ خبر ان کو ملی تو مسکرائے اور یہ اشعار کہے:

نذروا دمي حنقاً عليّ وفاتهم   إن الشقي بما لقيت سعيد

انھوں نے میرے خون کی منت مانی ہے لیکن اسکو پا نہ سکے، جو کچھ مجھے ملا ہے اگر وہ کسی بدبخت کو مل جاتا تو وہ خوش نصیب ہے۔

الله شاء لي الحياة وحاولوا   ما لم يشاء، ولحكمه التأييد

خدا کو میری زندگی منظور تھی، انھوں نے اسکے خلاف چاہا، لیکن خدا ہی کا فیصلہ ناطق رہا،

زرکلی حجاز سے عمان چلے گئے، یہاں وہ فرانسیسی سامراج کے خلاف پرزور قصائد اور نظمیں لکھتے رہے، عمان میں وہ پہلے مجلس المعارف کے رکن مقرر ہوئے، پھر حکومت میں ایک اہم عہدہ مل گیا، اسی عرصہ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں صلح ہو گئی، اور زرکلی پھر مصر واپس ہونے پر مجبور ہو گئے،

مصر کی جلاوطنی کے زمانہ میں انھوں نے ایک اہم علمی خدمت انجام دی اور برسہا برس کی محنت شاقہ کے بعد انھوں نے عربی کے عرب و غیر عرب مصنفین و اہل قلم کے حالات میں کئی جلدوں میں ایک کتاب لکھی، جو ۱۹۲۷ء میں "الاعلام" کے نام سے چھپ گئی ہے، اس نے علمی دنیا میں غیر معمولی شہرت اور اہمیت حاصل کی اور حوالہ کی بنیادی کتابوں میں سمجھی جاتی ہے،

فضیل نے مصر سے لوٹ کر ایک رسالہ "الحیاۃ" کے نام سے جاری کیا جس میں انگریزوں اور فرانسیسی حکومت پر سخت تنقیدیں کیں، ۱۹۳۰ء میں شاہ سعود کی حکومت میں ان کو بعض معزز عہدے حاصل ہوئے،

۱۹۲۵ء میں ان کا دیوان "دیوان خیرالدین زرکلی" کے نام سے شائع ہوا جس میں وطن سے دوری، درد و الم اور شوق و حسرت کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے،

نثر میں "الاعلام" کے علاوہ "عامان فی عمان" اور "ما رأیت وما سمعت" ان کی تصانیف ہیں،

شاعری | ان کے اشعار میں تین نمایاں خصوصیات ہیں، پہلی خصوصیت یہ ہے کہ زرکلی نے شعرائے متقدمین کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا، اس لیے اس کا اثر ان کے کلام میں نمایاں ہے، اس نے کلام میں متانت، پختگی اور بلندی پیدا کر دی، قدما سے استفادہ کے باوجود زرکلی کے خیالات اور طرز اسلوب میں ان کی انفرادیت بھی قائم ہے،

وہ بڑی محنت و ریاضت سے شعر کہتے ہیں، اور مسلسل حک و اصلاح کے بعد اس کو حسین پیکر میں پیش کرتے ہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ پچاس شعر کہتے ہیں پھر کاٹ چھانٹ کے بعد صرف آٹھ دس شعر باقی رہ جاتے ہیں، جو اعلیٰ شاعری کا نمونہ ہوتے ہیں[1]

دوسری خصوصیت وطنیت و قومیت کا عنصر ہے، اگرچہ حافظ و شوقی نے بھی یہی نغمہ گایا تھا، مگر اس حیثیت سے شامی شعرا میں زرکلی کا درجہ بہت بلند ہے کہ انھوں نے اپنے وطن اور عرب قوم سے والہانہ محبت کا اظہار کیا ہے، تیسری خصوصیت سیاسی و اجتماعی مسائل کا بیان ہے، انھوں نے بہت سے قصیدے ولید بن فرنس کے خلاف اپنی زبان و قلم کے ہم

[1] مجلۃ المجمع العلمی العربی المجلد ۵ ص ۰۰۵ بحوالہ الادب العربی المعاصر فی مصر

دکھائے ہیں۔ ان اشعار میں وطن سے محبت اور شام سے والہانہ تعلق کا جذبہ جھلکتا ہے،

العین بعد فراقها الوطنا — لا ساکنا ألفت ولا سکنا

وطن سے فراق کے بعد آنکھ مضطرب و بے قرار ہے،

کانت تری فی کل سانحة — حسنا فباتت لا تری حسنا

پہلے ہر واقعہ میں حسن کا پہلو دیکھتی تھی مگر اب اس کو کسی چیز میں حسن نظر نہیں آتا،

ما کنت احسبنی مفارقهم — حتی تفارق روحی البدنا

میں اہل وطن کے فراق کا تصور نہیں کر سکتا تھا جب تک روح بدن میں باقی ہے،

عطفوا علیک فاوسعوک اذی — وهم یسمون الاذی مننا

اہل مغرب تجھ پر مہربان ہوئے تو مصائب سے لاد دیا اور مصیبتوں کا نام مِن رکھا،

نظم کے آخر میں کہتا ہے،

لی ذکریات فی ربوعهم — هن الحیاة تألقا وسنا

شام کے سبزہ زاروں میں میری حسین و خوش آیند یادوں کے گلدستے ہیں،

ان الغریب معذب ابداً — ان حل لم ینعم وان ظعنا

مسافر عذاب میں مبتلا ہے خواہ قیام کرے یا سفر کرے۔

لو مثلوا لی موطنی وثنا — لهممت اعبد ذلک الوثنا

اگر لوگ بت بنا کر وطن کو میرے سامنے پیش کرتے تو میں اس کے پوجنے کا عزم کرتا

ایک دوسری نظم "سوریة الشهیدة" (شام شہید) میں کہتا ہے:

ان الدم المهراق فی جنباتها — لدمی وان شعارها لشعاری

اس کے پہلوؤں میں بہایا ہوا خون میرا خون ہے اور اس کا شعار میرا شعار ہے

صبرت دمشق علی النکال لیالیا — حرم الرقاد بها علی الاشفار

دمشق نے مصیبت کی کتنی راتیں صبر سے بسر کیں اور مصائب میں کتنی راتیں عالم بیداری میں گذاریں

لهفی علی المتخلفین بر حبها — کیف القرار ولات حین قرار

افسوس ہے وہاں باقی رہ جانے والوں پر وہاں کیسے قرار آتا ہے جہاں قرار نہیں۔

یترقبون الموت فی غدواتهم — واذا نجوا فالموت فی الاسحار

صبح کو موت کا انتظار کرتے ہیں، اگر بچ گئے تو شام کو موت دھری ہے۔

ان اشعار میں وطن کی حمیت کے ساتھ اہل فرانس کے ظلم و ستم اور اہل شام کے رنج و غم کی داستان بھی بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں:

الوابل المدرار من حمم اللظی — متواصل کالوابل المدرار

آگ و شعلے اس طرح مسلسل برس رہے ہیں جیسے موسلا دھار بارش

ویح الحضارة کیف یتهمون سماءها — متکالبون علی الضعاف ضواری

غارت ہو تہذیب! اس نام کو کس طرح ذلیل کر رہے ہیں (اہل فرانس) کمزوروں پر کتوں کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں۔

أرأیت کیف طغی الفرنج وغروا — صدر الأسنة ایّما ایغار

تم نے دیکھا کہ اہل فرانس نے کیسا ستم کیا، جہاں پایا نیزہ کی انی سینہ سے چبھو دی

واستهدفوا الاطفال فی حجراتها — والمطفلات وهن فی الاخدار

انھوں نے بچوں کو ان کی ماؤں کی گود میں نشانہ بنایا اور ان پردہ نشین کو روند دیا۔

خلیل مردم بک | خلیل مردم ۱۸۹۰ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، سات سال کی عمر میں اسکول جانا شروع کیا، ابتدائے عمر ہی سے شاعری سے دلچسپی تھی، اسی زمانہ سے انھوں نے اشعار

[illegible] شروع کر دیے تھے۔ مختلف مدرسوں میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۸ء میں جب ترکوں کا اقتدار شام سے ختم ہوا، اور عربی حکومت قائم ہوئی تو خلیل مردم کو ایک ملازمت مل گئی۔ ۱۹۱۹ء میں جب حکومت کے ملازموں کے لیے "مدرسۃ الکتاب المنشئین" قائم کیا گیا، تو اس میں خلیل مردم بک مدرس مقرر ہو گئے۔ ۱۹۲۱ء میں "جمعیۃ الرابطۃ الادبیۃ" کی تاسیس ہوئی اور خلیل مردم اس کے صدر منتخب ہوئے، تو مجلہ رابطہ ادبیہ کے مدیر بھی قرار پائے۔ فرانسیسیوں کے قبضہ کے بعد انھوں نے اس جمعیۃ کو توڑ دیا، اس لیے ان کی یہ حیثیت بھی ختم ہو گئی۔

۱۹۲۵ء میں انھیں "المجمع العلمی العربی" کا رکن بنایا گیا۔

دمشق میں تھوڑی بہت انگریزی سیکھی تھی، پھر ۱۹۲۶ء میں لندن یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کی تحصیل کی، اور وہاں تین سال قیام کیا۔

۱۹۲۹ء میں "کلیہ علمیہ وطنیہ" میں لکچرر ہو گئے اور سات سال اسی خدمت پر مامور رہے، اسی اثنا میں "ائمۃ الادب العربی" کے نام سے ایک سلسلہ تصنیف شروع کیا، جس کے پانچ اجزا شائع ہوئے، یعنی جاحظ، ابن مقفع، ابن العمید، صاحب بن عباد اور فرزدق، ۱۹۳۳ء میں بعض ادبا کے تعاون سے مجلہ ثقافت جاری کیا جو دس سال تک نکلتا رہا۔

۱۹۴۲ء میں وزیر تعلیم ہوئے، پھر ۱۹۴۹ء میں وزیر صحت و تعلیم کی حیثیت سے سیاسی زندگی میں قدم رکھا۔ ۱۹۵۲ء میں پھر وزیر تعلیم ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں المجمع العلمی العربی کے صدر منتخب کیے گئے۔

شاعری | خلیل مردم بک بحیثیت شاعر کے ایک مخصوص اسلوب کے مالک ہیں، ان کے یہاں ساقی کا ایک نیا نقطہ آتا ہے جن کے کنارہ [illegible] نہیں، اجتماعی زندگی کے مسائل

اور سیاسی کوائف و حالات ان کی شاعری کا نمایاں عنصر ہیں، رزمیہ شاعری کے علاوہ بزمیہ شاعری میں بھی انھیں امتیاز حاصل ہے، انھوں نے وصف نگاری اور اشیاء کی تصویر کشی میں غیر معمولی شاعرانہ قدرت کا ثبوت دیا ہے، ان کی شاعری میں تخیل کی کمی اور حقائق و واقعات کی کثرت ہے، تخیل کا سہارا وہ اسی وقت لیتے ہیں جب وہ سمجھتے ہیں کہ حقیقت کے کھلے ہوئے اظہار سے حکومت کی گرفت کا خطرہ ہے، اس وقت وہ تخیل و استعارے کے ذریعے اپنا مفہوم ادا کرتے ہیں،

نمونۃً ان کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں انھوں نے اہل شام کو مخاطب کیا ہے،

یا لیت شعری ماذا یستفزکم   حمی مباح و اذلال و افقار

کاش میں جانتا کہ کونسی چیز تم کو بیدار کرے گی، قابل حفاظت و احترام چیز مباح ہوگئی ہے اور فقر و ذلت طاری ہے،

اری الحجارۃ احمی من انوفکم   کم ارسلت شرراً بالقدح اججا

تم سے زیادہ غیرت مند پتھر ہیں جن کو ضرب لگانے سے شعلے نکلتے ہیں،

اخوانکم فی فلسطین تنالھم   بالسوء والعسف ایادٍ ظلماً

تمھارے بھائی فلسطین میں ظالموں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں،

شفیق جبری | شفیق جبری کے والد دمشق کے دولت مند تاجر تھے، ۱۸۹۷ء میں دمشق میں پیدا ہوئے، قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھا تھا کہ ان کے والد کے ایک جیسوٹ دوست نے ان کو فرانسیسی مدرسہ میں داخل کرنے کا مشورہ دیا، چنانچہ ایک جدید فرانسیسی مدرسے میں ان کا داخلہ ہوگیا، اور انھوں نے سات برس تک وہاں ثانوی تعلیم حاصل کی اور فرانسیسی زبان پر ان کو پوری قدرت حاصل ہوگئی، اس کے بعد انھوں نے عربی ادب کا [illegible] کے

عربی کی استعداد بڑھائی اور عربی نحو میں مشق پیدا کی۔

[illegible]ء میں جب وزارت تعلیم نے دمشق میں یونیورسٹی قائم کی تو شفیق جبری اس کے انسپکٹر مقرر کیے گئے۔

ان کی تصانیف میں "البحر والصحراء" "العوامل النفسیہ فی سیاسۃ العرب" اور "ابو الفرج الاصبہانی" شائع ہو چکی ہیں، "محمد کرد علی" "المتنبی" اور "الجاحظ" ان کے مشہور محاضرات ہیں، "انا والشعر" اور "انا والنثر" وغیرہ بھی ان کی اہم تصانیف ہیں۔

شاعری | شفیق جبری بہت کم کہتے ہیں، لیکن جو کچھ بھی کہتے ہیں وہ ان کے دل کی آواز، ان کے سماج کی پکار اور ان کے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے، ہر غم کو وہ غم روزگار بنا دیتے ہیں، ان کی شاعری میں بڑی وسعت و عظمت ہے، اور اس میں سیاست و اجتماعیت اور زندگی کے حقائق کا بیان بڑی قوت و قدرت کے ساتھ موجود ہے، انھوں نے وطن کی تاریخ، اس کے جذبات اور تمناؤں کی تاریخ اور سیاسی کشمکش کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔

عربوں کو شاندار مستقبل کی دعوت کے لیے انھیں ماضی کے سنہرے اوراق کی طرف لے جاتے ہیں اور قرون اولیٰ کے ان مسلمانوں کا نقشہ کھینچتے ہیں جنھوں نے اسلام کا پیغام بحر و بر کے گوشے گوشے تک پہنچایا، اپنے علم و دین سے علم و حکمت کے گوہر لٹائے، اپنی زندگی سے عمل کا جادو جگایا، اور دلوں کی ویران بستی کو آباد کیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیدا کیے عظیم انقلاب کو انھوں نے بڑے سلیقے سے ایک قصیدہ "سیرۃ النبی" میں پیش کیا ہے، اور اس کا خلاصہ حال سے ملایا ہے، اس قصیدے کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

[illegible] فهشوا الی طیب من الوحی ناقع

[illegible] گلگشت کر دی اور وہ پاکیزہ وحی سے مسرور ہوئے۔

سری الوحی فیهم مثل سری الضحی — فای فتی من سحره غیر طائح

ان میں وحی کا اثر اس تیزی سے ہوا جیسے صحت بیار کو اچھا کرتی ہو، کوئی نوجوان کے اس سحر سے محروم نہ رہا۔

فطاروا الی الدنیا بدین محمد — وقد فتحوا الدنیا بلمح الجوارح

وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین لیکر دنیا کی طرف بڑھے اور اس کو پلک جھپکتے فتح کر لیا۔

فما عاقت الصحراء علی طول رملها — ولا ردت الامواج خوض اللجالج

صحراؤں نے ریگستان کی کثرت کے باوجود ان کی راہ نہ روکی اور نہ موجیں ان کو سمندر کی انتہا تک پہنچنے سے روک سکیں۔

ففی کل بر منهم رمح زاحف — وفی کل بحر منهم سبح سابح

اور بحر و بر میں وہ رواں دواں ہو گئے۔

اقبال نے اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے — بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے ہم نے

فما الموت فی الایمان مر مذاقه — ولا الحتف فی الاسلام صعب المعالج

ایمان کی راہ میں موت میں کوئی تلخی نہ تھی اور اسلام کیلئے مرنا آسان معلوم ہوتا تھا۔

فقادوا علی ارماحهم کل صعب — وراضوا علی اسیافهم کل جامح

اپنے نیزوں سے ہر مشکل کو قابو میں اور ہر باغی کو تلوار سے رام کر لیا۔

فلا قیصر یزهو علی الشام تاجه — ولا تاج کسری کالنجوم اللوامح

نہ قیصر کا تاج شام میں ضو فشاں رہا اور نہ کسریٰ کا ستاروں جیسا چمکدار تاج ہی باقی رہا۔

تناثرت الثیجان تحت خیولھم ۔۔۔ واھوی الی اقدامھم کل طامح

سارے تاج انکے گھوڑوں کی ٹاپوں میں ٹوٹ کر بکھر گئے اور تمام سرکش انکے قدموں پر گر پڑے۔

فاین رسول اللہ یشہد امۃ ۔۔۔ تئن انین الطیر من کل ذابح

حضور کہاں ہیں کہ آپ امت کا حال دیکھیں کہ وہ ذبح ہونے والی چڑیا کی طرح آہ و زاری کر رہی ہے

تعالت فطاحت ثم ثنت فاجہت ۔۔۔ الاذلا لھا یلھو بھا کل مازح

یہ امت سربلند ہوئی، پھر گر پڑی پھر کر ہلاکت کے قریب پہنچی حتی کہ ہر شخص اس کو ذلیل کر کے اس کا مذاق اڑانے لگا۔

فلا ملکھا فی ارضہ متثبت الذری ۔۔۔ ولا عیشھا فی الخلق عیش الصائح

نہ اس کا ملک مستحکم اور محفوظ رہ گیا اور نہ دنیا میں اس کو عیش و فراغت کی زندگی حاصل رہی

علی مثلھا من ذلۃ بعد عزۃ ۔۔۔ تفیض جفون بالدموع السوافح

عزت کے بعد ایسی ذلت پر آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔

فھذی فلسطین تنوح من الاذی ۔۔۔ فما نھضت منھا عزائم المداجح

فلسطین ہے جو اذیتوں پر گریہ و زاری کر رہا ہے مگر مسلمانوں کی آنکھیں اس کی حالت پر ابھی تک نہیں ہوتیں

فمن .... ناصح

عرب کے ....

....

....

....

"سلطان المشائخ نظام الدین اولیاءؒ کا شعری اور ادبی ذوق"

از جناب محمد شکیل احمد صدیقی صاحب ایم اے، شعبۂ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی

سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کا شمار اکابر اولیاء اللہ میں ہے، وہ صوفیائے کرام جنکی پیدائش کا فخر ہندوستان کی سرزمین کو حاصل ہے، ان میں سلطان المشائخ کا درجہ نہایت بلند ہے۔ آپ کی بزرگی، عبادت و ریاضت، زہد و اتقا کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر آپ کی زندگی کا ایک پہلو ابھی تک تشنۂ تحریر ہے۔

عام طور پر خیال کیا جا سکتا ہے کہ ...... ایسے بزرگ کہ جن کا سارا وقت یاد الٰہی میں صرف ہوتا ہو جن کی پیشانی دن رات معبود حقیقی کی بارگاہ میں سجدہ ریز رہتی ہو، شعر و ادب کیا سروکار ہو سکتا ہے لیکن حقیقۃً ایسا نہیں ہے۔

فارسی ادب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی شاعری کی ترقی میں صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ رہا ہے، بلکہ [illegible] ان میں درجہ رکھنے والوں کی [illegible] سلطان ابوسعید ابوالخیر، حکیم سنائی، خواجہ فریدالدین عطار، مولانا روم اور شیخ سعدی کی خدمات تا قیامت تک فراموش نہیں کی جا سکتیں، فارسی ادب ہمیشہ ان بزرگوں کا ممنون احسان رہے گا۔

حضرت سلطان المشائخ کو مبدأ فیض کی طرف سے گوناگوں صفات ودیعت ہوئی تھیں، اور آپ میں بڑی جامعیت تھی، منجملہ اور صفات کے ایک صفت یہ بھی تھی کہ آپ کو شعر و ادب سے بھی تعلق تھا، اور آپ نہایت بلند ادبی ذوق رکھتے تھے، اگرچہ باقاعدہ شعر نہیں کہتے تھے

اس کا وقت ہی آپ کے پاس کہاں تھا لیکن کبھی کبھی وہ اپنی [illegible] آپ کو کلام سنا چکے تھے
پر بہت سے اشعار برجستہ آجاتے تھے کبھی یہ اشعار وہ سر حلقہ یا تذکرے کے [illegible] اور کبھی [illegible] اور آپکا
آپکے ادبی ذوق کا یہ بھی ثبوت ہے کہ آپکے دامن فیض سے خسرو اور حسن جیسے باکمال شعراء
وابستہ تھے میرا خیال ہے کہ امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی نے شعر و سخن میں جو شہرت حاصل کی
وہ آپ ہی کا فیضان تھا، روحانی فیض سے قطع نظر اس میں اس حوصلہ افزائی کو بھی دخل
ہے جو وقتاً فوقتاً ان دونوں شعراء کی فرماتے تھے، یہ دونوں تو آپ کے مریدین با اختصاص
میں تھے جن کو آپ سے زیادہ تقرب حاصل تھا بلکہ ان کو آپ کی شمع جمال کے پروانے کہنا
زیادہ مناسب ہوگا، آپ نے ان کو شاعری سے روکا نہیں بلکہ ان کی تربیت فرمائی، اسلیے
آپ کی ذات بابرکات ان کے لیے صرف روحانی ہی نہیں بلکہ ادبی سرچشمہ بھی ثابت ہوئی
اور آپ کی صحبت کیمیا اثر سے ان دونوں کے شاعرانہ ذوق میں جلا ہوتی رہی،

مصنف سیر الاولیاء کے بیان کے مطابق آپ نے خسرو کو مشورہ دیا کہ اصفہانیوں کی
طرز میں شعر کہا کرو، یعنی کلام عشق انگیز ہو، مرشد کے اس حکم نے سوز و گداز پیدا کرنے کا کام دیا جس نے
ان کے کلام کو ہمہ تن [illegible] کر دیا، بعض روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خسرو کے کلام
میں یہ تاثیر سلطان المشائخ کے لعاب دہن کی برکت کا نتیجہ ہے،

امیر خسرو کو خود اس کا اعتراف ہے کہ ان کی [illegible] جو صلاحیت ہے وہ آپ ہی کا فیض

"ایں ہمہ [illegible] در [illegible] برکت [illegible] است کہ
[illegible] ۱؎"

وہ میری طرف سلطان المشائخ کی [illegible] امیر کی شاعرانہ عظمت کے معترف ہیں، جیسا کہ

۱؎ فضل الفوائد [illegible]

ذیل کی رباعی سے ظاہر ہے:

خسرو کہ بہ نظم و نثر مثلش کم خاست — ملکیت ملک سخن آن خسرو راست

این خسرو ماست ناصر خسرو نیست — زیرا کہ خدای ناصر خسرو ماست

یہ رباعی بھی حضرت سلطان المشائخ کے ذوقِ سخن کا ثبوت ہے، مرشد کے یہ چار مصرعے خسرو کے لیے ہفت اقلیم کی بادشاہت سے زیادہ قیمتی ثابت ہوئے ہوں گے، اس تعریف نے ان کے چمنستانِ تخیل میں کیسے کیسے گلِ رنگین کھلائے ہوں گے۔

اس دور کے شعراء میں امیر خسرو اور امیر حسن سب سے زیادہ مشہور ہیں، ایک بار آپ نے خسرو اور حسن دونوں کے کلام کے فرق کو بیان کرتے ہوئے فرمایا

"خسرو را دریاے شور است و حسن جوے شیرین"[1]

اس مختصر جملہ میں ایسا جامع تبصرہ ہے جس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا، اگر ان دونوں باکمالوں کے کلام کی خوبیوں پر دفتر کے دفتر لکھ ڈالے جائیں تو وہ بھی اسی اجمال کی تشریح ہوگی، اس قسم کے الفاظ گہربار نے اگر ایک طرف دونوں کے لیے شاعری کی ارتقائی منازل طے کرنے میں مشعل راہ کا کام دیا، تو دوسری طرف اس کا بھی ثبوت ہے کہ آپ بہت عالی پایہ کا ذوقِ سخن رکھتے تھے، لیکن آپ خود اس لیے شاعری سے احتراز فرماتے تھے کہ آپ کے نزدیک قرآن مجید کی تلاوت شعر گوئی سے بہتر تھی، امیر حسن سجزی لکھتے ہیں:

"حکایت در شعر افتاد بندہ عرضداشت کرد کہ بارہا از لفظ مبارک مخدوم شنیدہ ام می باید کہ قرآن خواندن و شعر گفتن تا بستہ و برکت نفس مخدوم بندہ ہر روز قرآن می خواند [illegible]

---

[1] تذکرہ مصنفین دہلی، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۱۱

[illegible]

ہی و صناعت پسندیدہ افتاد۔[1]

اس کے باوجود کبھی کبھی ذوق و شوق کے عالم میں اشعار کہنے پر مجبور ہو جاتے۔ "نشر عشق" میں آپ کے حالات میں لکھا ہے:

"از طبیعت و دردمندی و حالت ذوق و شوق گاہے فکر نظم ہم می فرمود۔"[2]

اور آپ کی یہ رباعی نقل کی ہے:

از تو نشود امید ہر کس آسانی مرا — گر بنی رانند کسے آخر تو می دانی مرا

گر برنجانی ز ترحم زانکہ بخشایند رحمت — جانی و آرام جان آندم کہ رنجانی مرا

رباعی کے تیور اور اس کی معنوی کیفیت اس کی شاہد ہے کہ وہ آپ ہی کا کلام بلاغت نظام ہے۔ افضل الفوائد کی دوشنبہ ۱۶ صفر ۷۱۲ھ کی مجلس میں امیر خسرو دہلوی سے منقول ہے کہ ایک دن گفتگو میں عشق کا ذکر چھڑ گیا، آپ پر ایک کیفیتِ اشتیاق طاری ہوئی اور یہ رباعی فرمائی:

گر عشق نبودے و غم عشق نبودے — چندیں سخن نغز کہ گفتے کہ شنیدے

گر باد نبودے سر زلفش کہ ربودے — رخسارۂ معشوق بعاشق کہ نمودے

آپ کی ایک نعت جو ذیل کے مطلع سے شروع ہوتی ہے بہت مشہور ہے، اور سوز و گداز اور کیفیت میں جواب نہیں رکھتی ــــ

صبا بسوئے مدینہ رو کن ازیں دعاگو سلام برخواں — بگرد شاہ رسل بگرد و بصد تضرع پیام برخواں

فوائد الفواد اور سیر الاولیاء میں ایسی بعض مثالیں ملتی ہیں جن سے آپ کی خوش ذوقی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک بار نظم و نثر کا ذکر چھڑ گیا، آپ نے نہایت عجیب انداز میں

---

[1] فوائد الفواد ص [illegible] [2] نشر عشق ص [illegible] مخطوطہ

دونوں کے فرق کو یوں فرمایا:

"سخن بنظم و نثر افتاد بر لفظ مبارک رانده که هر سخن خوب که شنیده شود چون آن منظوم باشد ذوقے حاصل آید و هر معنی که بنثر شنیده شود همان معنی اگر نظم کرده سماع افتد ذوقے بیشتر دست دهد الحال خوب ہمیں حکم دارد و ہر سخن خوب کہ شنیده شود در شنیدن آں ذوقے می باشد اما اگر ہماں سخن منظوم بشنوند ذوق بیشتر است[1]"

عالموں اور ادیبوں نے شعر کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے ہیں لیکن سلطان المشائخ نے چند فقروں میں جو تعریف فرمائی ہے اس سے جامع تعریف ملتی نہیں۔

"فرمود کہ شعر چیزے لطیف است اما چوں مدح می کنند و بر سر کسے می برند سخت بے ذوق است[2]"

اس سے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ مدح کرنا اتنا برا نہیں جتنا اسے کسبِ معاش کا ذریعہ بنانا۔ اسی کے بعد آپ نے علم کی بھی تعریف فرمائی

"و علم نیز ہم چنیں بنفس خویش بس شریف چیزے ست اما چوں آں را کسب می سازند و بہ سرای برند عزت آں می رود[3]"

تقریباً ہر وعظ کے دوران میں آپ برجستہ اور برمحل اشعار پڑھتے تھے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا مطالعۂ شعری بہت وسیع تھا اور اساتذہ کے بہت سے اشعار آپ کو زبانی یاد تھے۔ ایک بار امیر حسن سجزی نے عشق و محبت کے سلسلے میں یہ مصرع پڑھا

ع عشق بسیار جفا دید و کسے یار نکرد

آپ نے فوراً دوسرا مصرع پڑھ دیا

ع شافعی را چہ مدعا یے حجت[4]

---

[1] فوائد الفواد ص ۲۲۰ [2] ایضاً ص ۱۲۲ [3] ایضاً [4] ایضاً ص ۱۰۹

اور خیال ... کی مجلس میں ... ہونے کے بعد یہ گفتگو ہو چکی تھی ... رباعی نے اس سلسلہ

میں اس رباعی کے آخری دو مصرعے پڑھے تو صاحب ترمذی لگے ہیں ؎

گفتی کہ بنزد من حرامست سماع   گر بر تو حرامست حرامت بادا

ہو سکتا ہے کہ شروع کے دو مصرعے امیر حسن کے ذہن سے محو ہو گئے ہوں۔ آپ نے فوراً

پوری رباعی پڑھ دی ؎

دنیا طلبی جہاں بکامست بادا   واں جیفۂ مردہ لہ بدامت بادا

گفتی کہ بنزد من حرامست سماع   گر بر تو حرام است حرامت بادا[1]

ایک مرتبہ آپ کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی، اس لیے کمبل کو دوہرا کر کے اس پر بیٹھے اور حاضرین محفل سے اس کے لیے معذرت چاہی، تو تمام حاضرین نے دعا کی اور کہا کہ ہم آپ کی زندگی ... چاہتے ہیں، ہم لوگوں کی زندگیوں کا دارومدار آپ کی حیات پر ہے۔ حسن کو موقع کی مناسبت سے ذیل کا شعر یاد آگیا

جان جاناں تو ئی دشمن جان ہمکے   ای ہمہ دشمنان تو دشمن جان خویشتن

آپ نے فوراً اس قصیدہ کا مطلع پڑھ کر سنا دیا ؎

دوش ... بلبل مست ...   ... [2]

اسی مجلس میں حکیم سنائی کا ذکر چھڑ گیا، آپ نے فرمایا کہ شیخ سیف الدین باخرزی ... والے سنا گیا کہ ... حکیم سنائی کے ایک قصیدہ سے ... بنا دیا ... جو اس مجلس میں حاضر تھا شعر مندرجہ ذیل پڑھ کر کہا کہ یہ شعر اسی قصیدہ کا ہے ؎

... شہوت می زنی   عشق ... ترا ... خواری ...

اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ بیت اس بیت سے متصل ہے ؎

...   ...[3]

[illegible]

ان میں سے اشعار کے شعر میں آپ کی یادداشت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک مجلس میں امیر حسن نے کہا کہ شعراء کے لیے قرآن حکیم میں آیا ہے "الشعراء یتبعہم الغاوون" یعنی جو لوگ شعراء کے پیرو ہوتے ہیں وہ گمراہ ہیں، اور میں نے کئی بار آپ کی زبان سے یہ حدیث سنی ان من الشعر لحکمۃ، پس جب اہل شعر اہل حکمت ہوتے ہیں تو ان کی پیروی گمراہ کن کس طرح ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ شعرا جو ہزل، حشو اور ہجو کہتے ہیں ان کی پیروی گمراہ کن بتائی گئی ہے، ورنہ صحابہ کرام مثلاً حضرت علیؓ اور دیگر صحابہ نے بھی اشعار کہے ہیں، اس کے بعد حسن نے دوسرا سوال یہ کیا کہ شعر میں جو مبالغہ ہوتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ایک مشہور کتاب میں دیکھا گیا ہے کہ جھوٹ پر مواخذہ ہے لیکن وہ جھوٹ جو شعر میں بیان کیا جاتا ہے، اس پر مواخذہ نہیں ہے۔[1]

امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی سے آپ فرمائش کرکے کلام سنتے تھے، آپ کی سماع کی محفلوں میں قوال نہ ہوتا تو امیر خسرو ہی سناتے تھے، جو ان ہی کی ایجاد بھی ہے۔

کبھی کبھی آپ ان دونوں شاعروں کو شعر گوئی کی طرف متوجہ بھی کرتے رہتے تھے۔ فوائد الفواد کی ارذی الحجہ ۷۱۳ھ کی مجلس میں امیر حسن کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کل عید کے دن عید تھی، اس کی تہنیت میں تم نے کچھ کہا ہوگا۔ امیر حسن نے عرض کیا کہ اس سے چار دن پہلے نوروز تھا، بندہ نے ایک قصیدہ لکھا تھا جس میں نوروز اور عید کا ذکر کر دیا ہے، اس کے بعد وہ قصیدہ سنایا۔[2]

امیر خسرو جب بھی کوئی کتاب تصنیف کرتے تو سب سے پہلے اس کتاب کو آپ کی خدمت میں پیش کرتے، آپ اسے ہاتھ میں لیکر فاتحہ پڑھتے اور کبھی کبھی کتاب کھول کر چند سطریں ملاحظہ بھی فرماتے تھے۔[3]

یہ واقعات اس کے شاہد ہیں کہ امیر خسرو اور امیر حسن دہلوی کی شاعرانہ ترقی ہی میں نہیں بلکہ شعر و ادب کی اصلاح و ترقی میں بھی سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء کا بہت بڑا حصہ ہے، [illegible] کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

۱۔ فوائد الفواد ص [illegible] ۲۔ ایضاً ص [illegible] ۳۔ سیر الاولیاء ص [illegible]

مطبوعات جدیدہ

تاریخ دولت فاطمیہ، مرتبہ مولانا رئیس احمد جعفری، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، ضخامت ۵۰۰ صفحات مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ، پتہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ، لاہور۔

فاطمیہ مصر کی تاریخ پر اردو میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ڈاکٹر زاہد مرحوم کی کتاب تاریخ فاطمیین مصر جو عرصہ ہوا جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی، سب میں زیادہ مفصل اور مبسوط ہے، اب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رکن اور اردو کے زودنویس مصنف رئیس احمد صاحب جعفری نے اس موضوع پر یہ نئی ضخیم کتاب مرتب کی ہے، جو تین حصوں پر مشتمل ہے، حصہ اول میں فاطمیین کی اجمالی تاریخ، ان کے عقائد و افکار، نظام دعوت، اس کا تدریجی ارتقاء، تاویل و تفسیر، فرقہ اسماعیلیہ کی مختصر تاریخ، اس کی مختلف شاخوں اور اس سلسلہ کے دوسرے مباحث پر مفید اور ضروری معلومات ہیں، دوسرے حصہ میں خلفائے فاطمیہ کے حالات و سوانح کا اجمالی مرقع پیش کیا گیا ہے، تیسرے میں انکے نظام حکومت کی خصوصیات، فتوحات، سیاسی و تمدنی خدمات، سماجی و معاشرتی اصلاحات، علوم و فنون کی خدمت، صنعتی و حرفتی، تجارتی ترقی کا جائزہ، عدالتی و مالیاتی نظام اور دوسرے امور سلطنت کی تفصیل ہے، آخر میں فاطمی عہد کی مساجد اور عمارتوں کے بعض حصوں کی تصویریں بھی دی گئی ہیں، فاضل مصنف کی پہلی کتاب کا موضوع سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ ہے اس لیے فاطمیین

کے عقیدہ و فلسفہ اور دوسرے نزاعی مسائل پر بحث سے پرہیز کیا گیا ہے، لیکن غیر ارادی طور پر کہیں کہیں انداز بیان جانبدارانہ اور بنو فاطمہ کے مقابلہ میں بنو امیہ وغیرہ کی مخالفت میں لہجہ سخت ہو گیا ہے، ایک جگہ انھوں نے اسماعیلیوں کی یک زوجیت کے حکم کو سراہا اور تعدد ازدواج کے متعلق پاکستانی علماء کے نقطۂ نظر سے اختلاف کیا ہے، جو غلط ہونے کے علاوہ بے محل بھی ہے، اس سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے اعتدال و توازن کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اور کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اس سے فاطمی حکومت اور فرقۂ اسماعیلیہ کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔

اسلام کا نظام امن: مرتبہ مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۴، قیمت [illegible]، پتہ: شعبۂ تصنیف و تالیف مدرسہ مفتاح العلوم مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڈھ، یو۔پی۔

مولانا ظفیر الدین صاحب مفتاحی نے اسلامی نظام کے مختلف پہلوؤں پر کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے اسلام کے نظام امن کی تفصیلات تحریر کی ہیں، شروع کے چند ابواب میں امن کی اہمیت، اسلام سے پہلے کی مختلف قوموں اور ملکوں میں امن و امان کے فقدان کا ذکر ہے، اور اس کے مقابلہ میں اسلامی عہد کے امن، عدل اور مساوات کا اجمالی جائزہ لیا گیا ہے، اور ان اوصاف و خصوصیات کو بیان کیا گیا ہے جو اسلام نے حکمرانوں کے لیے ضروری قرار دیے ہیں، اس ضمن میں صحابۂ کرام اور قرن اول کے مسلمانوں کی عملی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد کے ابواب میں اسلام کے عدل و مساوات پر مفصل بحث کی گئی ہے، اور اس کو مذہب امن ثابت کیا گیا ہے، اور یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کی لڑائیوں کا مقصد بھی قیام امن تھا، اس سلسلہ میں دوسرے مذاہب کے بارہ میں اسلام کی آزادی و رواداری، غیر مسلموں کے ساتھ اس کے فیاضانہ برتاؤ، اقلیتوں کے

حقوق اور اس کی عالمگیر وحدت، اخلاقیات اور محبت وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے، آخر کے ابواب میں انسان کے جان، مال، عزت، عصمت، نسب اور عقل کی اہمیت و حفاظت کے متعلق اسلامی قانون کی ہدایات اور قتل، فساد، رہزنی، چوری، زنا، بہتان اور شراب نوشی وغیرہ کی ممانعت اور ان کی روک تھام کے اسباب کے علاوہ تعزیری قوانین کی تفصیل ہے، فاضل مصنف نے قرآن و حدیث، اسلامی تاریخ اور لٹریچر کے علاوہ غیر مسلم مصنفین کے بیانات بھی نقل کیے ہیں، گو اس موضوع پر اردو زبان میں کافی ذخیرہ موجود ہے، تاہم مصنف نے ہر بحث پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور اس حیثیت سے یہ کتاب بہت مفید ہے۔

امام ابو حنیفہ کی تدوین قانون اسلامی، از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۶۲، قیمت [illegible]، پتہ: حبیب اینڈ کمپنی، ، وکٹل منڈی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے عرصہ ہوا یہ مفید اور پر از معلومات مقالہ تحریر فرمایا تھا، جو کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے، معارف میں اس پر ریویو بھی کیا جا چکا ہے، موجودہ اڈیشن نظر ثانی اور مزید اضافہ و ترمیم کے بعد خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، اس لیے پہلے اڈیشنوں کے مقابلہ میں زیادہ جامع و مفید ہو گیا ہے، اس اڈیشن میں یہ فقرہ "وہ (آنحضرت) شہر مکہ کے ایک جو ہر گمرے کے جو ہری تھے" در اصل مستشرقین کا الزام ہے، خاص طور پر علامہ شبلی نے سیرۃ النبی جلد اول میں اس کی تردید کی ہے۔

حضرت اکبر کے شب و روز: از جناب محمد رحیم صاحب دہلوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت متوسط، صفحات ــــــ مجلد مع گرد پوش، قیمت عشر، پتہ: مکتبہ حنیفیہ، بابس لائنس روڈ، کراچی ۳

اکبر الہ آبادی مرحوم چھپ کر آ چکا ہے۔ اس نئی کتاب میں مختلف حضرات کے نام

مولانا اکبر مرحوم کے خطوط ہیں جن سے ان کے حالات، مذہب، ادب، تعلیم، سیاست اور دوسرے مسائل کے متعلق ان کے خیالات اس میں جمع کیے گئے ہیں۔ اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کیا ہے۔ اس طرح اس کی حیثیت اکبر کی کہانی خود ان کی زبانی یا ان کے خود نوشت روزنامچہ کی سی ہے۔ جو ان کے سوانح و افکار اور شاعری اور اس عہد کے واقعات کے متعلق ایک مستند دستاویز ہونے کے علاوہ ان کے شگفتہ اور ظریفانہ طرزِ نگارش کا دلچسپ نمونہ بھی ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم کی کتاب "غالب کا روزنامچہ غدر کے بعد" اس طرز کی یہ دوسری کتاب ہے۔ شروع میں ملا واحدی کے شگفتہ قلم نے تعارف اور مرتب نے مبسوط پیش لفظ لکھا ہے۔

نوائے شوق: مرتبہ پروفیسر واحد ادیب صاحب ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت نفیس، صفحات ۱۴۴، قیمت درج نہیں، پتہ: پروفیسر واحد ادیب، دانشمندان، امروہہ، یوپی

یوسف علی خاں عالم یوسف ریاست رامپور کے ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر ہیں، وہ اردو کی مختلف اصنافِ سخن کے علاوہ فارسی میں بھی دادِ سخن دیتے ہیں، لیکن غزل سے خاص ان کو مناسبت ہے، نوائے شوق ان کی غزلیات کا مجموعہ ہے، اس میں دو چار فارسی غزلیں بھی ہیں، یوسف صاحب کا تغزل ظاہری و باطنی خوبیوں سے آراستہ ہے۔ شروع میں واحد ادیب صاحب کے قلم سے طویل مقدمہ ہے جو شاعر کے حالات، شاعری پر تبصرہ اور مجموعہ کلام کے انتخاب کی روداد وغیرہ پر مشتمل ہے، تبصرہ میں ایک حد تک مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔

جلد ۹۹ ماہ ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۶۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

افسوس ہے کہ آصف جاہی خاندان کے آخری فرمانروا نظام الملک آصفجاہ نواب میر عثمان علی خاں نے ۲۴ر فروری کو جان جان آفریں کے سپرد کر دی، وہ محض ایک والی ملک نہیں بلکہ اپنے اوصاف اور کارناموں کے لحاظ سے پوری تاریخ اور ایک عہد تھے، آصفجاہی حکومت اپنی تہذیب و روایات اور آئین و آداب میں تیموری حکومت کی جانشین تھی، اور میر عثمان علی خاں اس کی آخری یادگار تھے، انھوں نے اپنے دور میں جو گوناگوں کارنامے انجام دیے اس کی مثال ہندوستان کے کسی والی ریاست میں نہیں مل سکتی، ہندوستان کا کوئی قومی و ملی ادارہ ان کی فیاضی سے محروم نہ تھا اور ان کا ابر کرم بلا تفریق مذہب و ملت سب پر یکساں برستا تھا، ان کی ذات سے سیکڑوں حاجتمند خاندانوں اور ہزاروں غربا پرورش پاتے تھے، ان کی علم نوازی نے ہندوستان کے ہر فن کے اہل کمال کو حیدرآباد میں جمع کر کے بغداد و قرطبہ کی یاد تازہ کر دی تھی، ان کا سب سے بڑا کارنامہ عثمانیہ یونیورسٹی ہے جس میں جملہ جدید علوم کی تعلیم اردو زبان میں ہوتی تھی اور اس کے تعلیم یافتہ استعداد و قابلیت میں ہندوستان کی کسی یونیورسٹی کے طلبہ سے کم نہ تھے، یہ یونیورسٹی پورے ایشیا کے لیے قابل فخر تھی، مگر افسوس ان کے تعصب نے اسکو ختم کر دیا اور اسکا بیش قیمت علمی ذخیرہ [illegible]

دولت کے لحاظ سے میر عثمان علی خاں دنیا کے امیر ترین آدمیوں میں تھے، حکومتوں اور بڑے بڑے بینکوں کو چھوڑ کر نقد سونے کی شکل میں اتنی دولت شاید ہی کسی فرد واحد کے پاس نکل سکے، اس ثروت کے ساتھ ان کی زندگی اتنی سادہ تھی کہ اس کا قیاس بھی مشکل ہے، ان سے بعض غلطیاں بھی ہوئیں جو ان کے غلط اندیش مشیروں کا نتیجہ تھیں، جن سے ریاست حیدرآباد اور یہاں کے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور خود نظام کی زندگی کا آخری [illegible] بیچارگی میں گذرا، ورنہ ریاست حیدرآباد کو اس ہندوستان [illegible]

شخصی معاملہ نہیں کہ غلطیوں سے کوئی دوسرا متاثر نہ ہو [illegible]

[illegible] ان کی [illegible] سے [illegible]

لیکن حکومت [illegible] تنزل و انتشار کی اس منزل پر پہنچ

[illegible] کانگریس حکومت کا [illegible]

شک نہیں کہ [illegible] بعض حیثیتوں سے اس نے ملک کو بہت آگے بڑھایا، بڑے بڑے منصوبے

پورے کیے گئے، بین الاقوامی دنیا میں ہندوستان کی ساکھ قائم کی، لیکن سب سے بڑا بنیادی مرض یہ ہے کہ

ہندوستان کا پیٹ نہ بھر سکی، روزمرہ زندگی کی مشکلات ناقابل برداشت حد تک پہنچ گئیں، اس نے اپنے

اعلیٰ اصولوں کو بالکل فراموش کر دیا، اور اخلاقی حیثیت بہت گر گئی، حکومت کے نشے [illegible] وہ

ساری خرابیاں پیدا کر دیں جو اقتدار کی ہوس اور طاقت کا گھمنڈ پیدا کر سکتے ہیں، اس نے حکومت کو

اپنی میراث سمجھ لیا، خدمت اور ایثار و خلوص کے بجائے حکومت و اقتدار اس کا اصل مقصد ہو گئے،

اس کے لیے خود کانگریسیوں میں جنگ اور گروہ بندی شروع ہو گئی، حکومت میں طرح طرح کی بدعنوانیاں

پیدا ہو گئیں [illegible] کا نظام اتنا بگڑ گیا اور زندگی کی مشکلات اتنی بڑھ گئیں کہ لوگ [illegible]

کا [illegible] کانگریس کا اقتدار [illegible] ختم کر دیا اور اس سے ایک عام بیزاری پھیل گئی [illegible]

کر دیا [illegible] کا اعتراف [illegible] خود [illegible]

کانگریس کے [illegible] جیسا کہ [illegible] کی غلطیوں کی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اس حال میں اور جس نے ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں کی [illegible]

قربانی اور خلوص کے نام سے ناواقف تھے، ان کے پیش نظر صرف حکومت اور اس کے فوائد تھے، بعض پرانے خام کانگریسی بھی اسی رنگ میں رنگ گئے، جو دو چار مخلص باقی رہ گئے تھے، انھوں نے یہ رنگ دیکھ کر یا خاموشی اختیار کرلی یا گوشہ نشین ہو گئے، اور کانگریس پر ان لوگوں کا غلبہ ہوگیا جو اس کی روح سے ناآشنا تھے، جب تک پنڈت جواہر لال نہرو زندہ رہے اپنی شخصیت سے ان کو دبائے رکھا، ان کے بعد یہ بند ٹوٹ گیا اور اس پر نئی طاقتیں غالب آگئیں، جن کو کانگریس کے اصولوں اور نظریات سے کوئی تعلق نہ تھا۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے کانگریس نے انھیں بالکل نظرانداز کردیا، ان کی ایک شکایت بھی دور نہیں کی بلکہ ان کو ان کے جائز حقوق سے بھی محروم کردیا، ان کی زبان اور ان کی تہذیب کو مٹانے کی کوشش کی، فرقہ پرور جماعتوں کو ان کے مقابلہ میں بالکل آزاد چھوڑ دیا، ایسی جماعت سے مسلمانوں کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے، یوں تو ان کے بہت سے مسائل ہیں، لیکن ان میں سے تین سب سے مقدم ہیں، اردو زبان، سیکولر تعلیم اور مسلم یونیورسٹی، اردو زبان اور سیکولر تعلیم پر ان کے مذہب و تہذیب کا دارومدار ہے، اردو ان کی تہذیبی و علمی زبان ہے، اسی میں ان کے مذہب کا بڑا ذخیرہ ہے، سیکولر تعلیم سے کم سے کم ان پر کسی دوسری تہذیب و مذہب کا نقش قائم نہ ہوسکے گا، مسلم یونیورسٹی ان کی تہذیب و حیات کا مرکز اور ان کے دل و دماغ کا سرچشمہ ہے، جب تک ان کے حسب منشا یہ مسائل حل نہ ہوں گے وہ مطمئن نہیں ہوسکتے، اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت کانگریس اب بھی دوسری پارٹیوں کے مقابلہ میں غنیمت ہے، کم سے کم اس کے اصول و نظریات اعلیٰ ہیں، اس کے سامنے ایک تعمیری پروگرام ہے، اس کو ۲۰ سال کا برا بھلا تجربہ ہے، جو کسی دوسری پارٹی کو حاصل نہیں ہے، اس لئے اگر اب بھی وہ اپنی خامیوں اور غلطیوں کا جائزہ لے کر ان کی اصلاح کرے تو اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتی ہے، ورنہ اس کا خاتمہ یقینی ہے۔

مقالات

ذالک الفوز العظیم

سفرنامۂ حج مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

(۲)

مدینہ طیبہ کا مبارک سفر

۴ محرم الحرام کو صبح کے وقت بعد نماز فجر بے فکر کے یہ مصرع موزوں ہوگیا

ع خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو

تھوڑے سے خیال میں دوسرا مصرع بھی موزوں ہو کر شعر پورا ہوگیا

ع نوید آنکھ کو ہو، تہنیت ہو سینے کو

روانگی تک اکثر ایک ذوق کے ساتھ یہ شعر ورد زبان رہا ؎

خوشا نصیب کہ حسرت چلا مدینے کو　　نوید آنکھ کو ہو، تہنیت ہو سینے کو

جیسا کہ بیان ہوا، روانگی ۴ محرم الحرام کو نہ ہو سکی، جمعہ ۵ محرم الحرام کو بعد مغرب اونٹوں پر ہوئی، دو دانا شیفتہ خیرزادان میں ساتھ تھے، میرے قافلے میں چار شغدف خیرزادان تھے ۱۳۲۴ھ کا انجام حج پر ہوا تھا، ۱۳۴۴ھ کا آغاز سفر مبارک مدینہ طیبہ سے ہوا، میرے ساتھ قافلے میں تین حاجی ایسے بھی تھے جو محض زیارت مدینہ طیبہ کے شوق سے ۱۱ اونٹ کرایہ میری جانب سے شریک قافلہ

کر لیے گئے تھے۔ ایک اُن میں سے کئی سال سے شوق زیارت میں مکہ مکرمہ میں مقیم تھے یہ سعادت بھی حاصل ہوئی کہ تین صاحبوں کا عزم سفر مدینہ طیبہ کا مذبذب ہو گیا تھا اور مکہ مکرمہ ہی سے وا ہند ہونا چاہتے تھے میرے عرض و التجا پر پھر راسخ الارادہ ہو کر شریک زیارت ہو گئے۔ مدینہ طیبہ میں ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی۔ ان کو دیکھ کر خاص سرور قلب کو ہوا۔

شام ۵ محرم الحرام روز جمعہ سے لیکر ۱۰ محرم الحرام روز پنجشنبہ کی مبارک صبح تک سراپا سعادت مسافرت جاری رہی، قافلہ صرف اپنا ہی تھا، سہارنپور والی منجھلی دلہن مرحومہ بھی شریک قافلہ ہو گئی تھیں، کل چھتیس ۳۶ اونٹ تھے، مغرب کی نماز روزانہ با جماعت اذان و اقامت کے ساتھ ادا ہوتی تھی، کبھی کبھی ظہر کی جماعت بھی ہو جاتی تھی، پیچش کی تکلیف کا بقیہ ہنوز تھا، بار بار دست زیادہ تو نہ آتے مگر جو آتا پیچش اور درد کے ساتھ۔ بدن اجابت بھی درد کی زحمت ہو جاتی خصوصاً تہجد وقت شب کو رات کو نیند کم آتی، شب کی بیخوابی کی تلافی دن کو مدد والوں کے سلیقہ و خوش تدبیری سے ہو جاتی یعنی دن میں شقدف مثل پالکی کے ہموار با قاعدہ بنا ہوا اور وسیع ہوتا ہے، رضائیاں اور کمل ڈالکر ایسا ٹھنڈا اور تاریک کر دیا جاتا کہ دوپہر کو آسایش سے نیند آ جاتی، جزاہا اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء، باوجود سفر غذا اور دوا کا اہتمام بھی مددوالوں نے حسب اطمینان رکھا، رابغ کی منزل میں دو روز بغرض استراحت قافلہ کا قیام ہوا، عائشہ بدوالی کا (جن کے مکان میں ہم اترے تھے) وقار اور اہتمام آسایش و حفاظت ساری عمر یاد رہے گا، جزاہا اللہ تعالیٰ عنا خیر الجزاء، میرے خاص جمال حامد، حمید اور محمد نامی تھے، تمام راستے میں ان سے سوائے محبت اور شفقت و منفعت کے برتاؤ کے اور کوئی برتاؤ میں نے نہیں دیکھا، ان کی آسایش و رضا جوئی و بزرگ داشت کا اہتمام بھی حتی الامکان رکھا گیا، اللہ تعالیٰ ان کو کامیاب و با مراد رکھے۔

اس مبارک سفر میں حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی کتاب جذب القلوب الی دیار المحبوب

کا مطالعہ جاری رہا، اور حسبِ انتخاب کر کے کہیں، قابلِ زیارت مقامات کی یادداشت مرتب کی،

حسبِ ارشادِ شیخ درود شریف کا وِرد کثرت سے رہا، بعد اہتمام نمازِ فرض بھی اہتمام تھا،

گیارہویں منزل پر دستِ پیش تھی، اس کے بعد مدینہ طیبہ میں حاضری کا شرف حاصل ہونے والا تھا، یہیں میری پیچش کی شکایت بھی رفع ہوگئی، درد وغیرہ سب جاتا رہا، اسی منزل میں مدینہ منورہ سے واپس آنے والا ایک قافلہ ملا، میاں مصطفیٰ علی صاحب علوی کاکوروی نے مدینہ طیبہ کے جاں نواز پانی کی ایک صراحی عنایت فرمائی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

یک شربۂ آب از کفِ سقائے مدینہ　　دادی بہ بو آبِ حیاتِ دلِ مردہ

(مولانا محمد سعید عظیم آبادی رحمۃ اللہ تعالیٰ)

پہلی مرتبہ یہ روح پرور آبِ حیات نصیبِ حبیب ہوا، دل نے کہا کہ غریب پروری و عاجز نوازی نے ایک منزل پہلے کر نوازش فرمائی، فالِ خیر ہے، جس شب کی صبح کو حاضری مدینہ طیبہ ہونے والی تھی، سارے قافلے میں جوشِ مسرت تھا، غسل کیا، نئے کپڑے بدلے، عطر لگایا، بدوؤں نے بھی لباس بدلا، حاجی میر جو تقریباً چالیسویں مرتبہ حاضر ہو رہے تھے، تاہم ایسے ہی خوش تھے، جیسے دوسرے نئے حاضر ہونے والے، پچھلی شب سے قافلے والے بیدار ہو کر لباس بدلے ہوئے، پاپیادہ چل رہے تھے، یہ بھی پیادہ ہو لیا، ہمشیرہ صاحبہ نے ازراہِ شفقت فرمایا "تھک جاؤگے سوار ہو لو" میں نے کہا میں بھی جانتا ہوں کہ اب سوار ہو کر سفر نہیں کر سکتا، اتمنے کے بعد اول نماز تہجد ادا کی جو الحمد للہ شریف کیمپ [illegible]، اس کے بعد پیادہ چلا اور بقیہ مسافت پیادہ پا طے کی،

صبح صادق کی روشنی میں مبارک مسجد نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے نورانی مناروں [illegible] ہوئے، فالحمد للہ تعالیٰ [illegible]

[illegible] آں شب قدرے کہ ایں تازہ براتم دادند

[illegible] حاضر ہو کر [illegible] کی، [illegible]

خوف سے تکیۂ مصری کی مسجد میں ادا کی، یہ پہلی نماز مدینۂ طیبہ میں ادا ہوئی۔

یارب مدینہ ست ایں حرم کز خاکش آید بوئے جاں ۔۔۔ یا ساحت باغ ارم یا روضۂ رضوان جناں

باشد نسیمش مشک سا، آبش زلال جانفزا ۔۔۔ خاکش بود کحل جلا در دیدۂ اہل عیاں

بعد نماز حاضر مسجد شریف ہوا، داخلی کی دعا پڑھکر اول تحیۃ مسجد محراب نبی صلی اللہ علیہ وسلم (جمالی) میں ادا کی۔ پھر روضۂ اقدس پر حاضر ہوکر درود و سلام عرض کرنے کا شرف حاصل کیا، زہے سعادت، زہے نصیب حبیب۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ جس نور و سرور کی نوید و تہنیت آغاز سفر سے پہلے نو موزوں شعر میں ملی تھی، اُس کا یہ مبارک آغاز تھا، شرف حضور کے بعد فرودگاہ پر آیا، یہ مکان حرم شریف سے چند ہاتھ کے فاصلے پر باب رحمت کے متصل تھا، دیر دیر سے حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہی۔ اس مکان کا نام بیت پشاوری تھا، اتفاقی نیاز بھی قائم رہا، یہ پنجشنبہ کا بابرکت دن تھا۔ بارک اللہ لنا فی یوم السبت والخمیس۔ اگلے دن یوم مبارک جمعہ تھا، نماز جمعہ مسجد شریف میں ادا کرنے کی برکت دلنواز ہوئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ اسی روز بعد دوپہر جناب سید حمزہ صاحب رفاعی شیخ سلسلۂ رفاعیہ کی خدمت میں حاضر ہوکر ملاقات کی۔ یہ فیض آثار دولت خانہ حضرت امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ کا جیسا بیان شیخ موصوف ہے، غایت شفقت سے حضرت شیخ نے پذیرائی فرمائی، اس کے بعد حاکم مدینۂ منورہ سے ملا، یہ بھی رشید میں اور مدنیوں کے غمخوار، ان کے نائب سید حمزہ خوث بھی ان ہی صفات کے ہیں، جزاہما اللہ تعالیٰ عنا خیراً۔ بہت اخلاق سے ملے، بعد عصر بقیۂ مبارکہ جنۃ البقیع میں حاضر ہوا، سب سے اول حضرت ذی النورین عثمان الغنی خلیفۂ ثالث رضی اللہ عنہ کے مرقد مطہر پر حاضر ہوا، حاضر ہوتے ہی وہ مظلومیت جو بعد خلافت ظاہر ہوئی کہ کھڑا رہنا دشوار ہوگیا، شدت جلال سے دل لرزا ہا تھا ... کر اس

لہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب مجددی کی وصیت تھی کہ مدینۂ طیبہ میں مکان بجانب حضرت عثمان کے قریب ... جہاں برکات اور انوار کا زیادہ ظہور ہے۔ (تذکرۂ کاملان رامپور از احمد علی شوق)

کیفیت کو بیان کرنا ممکن نہیں جو قلب پر جلال و عظمت سے طاری ہوئی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و ارضاہ عنی۔

اسلام میں سب سے زیادہ با عظمت مزار ظاہری ہے، حضرت خلیفۂ اول و ثانی رضی اللہ عنہما بھی جو یہیں ہیں، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مزار پر انوار کے تعین میں اختلاف ہے، بلکہ معلوم ہوا کہ بعض ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک پر حاضر ہوا، حاضر ہونے پر امومیت کی نسبت اس وقت سے قلب پر طاری ہوئی کہ بیان میں نہیں آسکتی۔ جوش رقت میں امی، امی کی صدا دل و زبان کے ساتھ گویا جسم کا ریشہ ریشہ دے رہا تھا اور روح محو ذوق تھی بے شائبۂ تکلف محسوس ہوتا تھا کہ بچے نے مدت دراز کی مفارقت کے بعد شفیق ماں کو دفعتہً پالیا ہے، اور جوش محبت و احساس شفقت سے بیتاب ہو ہو کر امی امی پکار رہا ہے۔ الفاظ کچھ ایسا ہی نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ غرض ایک عالم تھا جو اسی آستانۂ رحمت کا شانے ساتھ مخصوص تھا، رضی اللہ تعالیٰ عنہا و ارضاہا عنی۔ یہ دو فریب کیفیتیں اپنی اپنی نوعیت میں عجیب و غریب تھیں۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

شنبہ کے روز صبح کو مسجد قبا اور بیر اریس پر حاضری ہوئی، مسجد قبا میں دوگانہ تحیت ادا کیا، نفل کے بعد بیر اریس کے قریب بیٹھ کر ناشتہ کیا، وہیں کا پانی پیا۔ اس پانی کی لطافت و نفاست و عذوبت کیا بیان ہو، بظاہر کوثر و سلسبیل اور اریس ایک ہی سرچشمے کے چشمے ہیں، مدینہ طیبہ کے آب حیات کی یہ تاثیر ہے کہ [illegible] کی اس میں استعداد اور [illegible] ہے کہ جہاں [illegible] ٹھنڈا ہو جائے گا کھانا زائد کے بعد بھی ہضم ہو جاتا ہے، بارہا تجربہ کیا۔ اسی فیض بار کنوئیں سے نہر زرقا جاری ہوئی ہے جس سے باغ طیبہ سیراب ہوتے ہیں۔

کیفیت کو جب حضرت شیخ محمد صاحب رفاعی کے دولت کدہ میں حلقۂ ذکر میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی [illegible] ہو کر باآواز بلند [illegible] فرماتے ہیں۔

حرم محترم میں روز شنبہ کو [illegible] شیخ الاسلام دیکھا، شیخ ابراہیم حمدی خربوتی [illegible] ایک

جو عموماً ترک اصحاب کا کتب خانوں کو دیتے ہیں، عمارت خوبصورت [illegible] اور ہوادار۔ اخلاص سلاطین [illegible]
شیخ الاسلام [illegible]، کتابوں کی نگہداشت فہرست کی شکل، آمدنی مستقل [illegible] اوقاف آستانہ قسطنطنیہ
اور جبال سلونیک وغیرہ) میں جو زرخیز جائداد کی صورت میں تھی، آمدنی وافر تھی اور سالانہ باقاعدہ
حاصل ہو جاتی تھی، دور جدید میں انتظام بے نظم ہو گیا۔ شیخ عزوقی نے اپنی وجاہت و تدبیر سے اس وقت
تک انتظام قائم رکھا تھا، اول ناشتہ کی ضیافت نہایت سلیقہ اور صفائی سے ہوئی، اس کے بعد کتب خانہ
دیکھیں، کتابیں حسب ذیل تعداد میں تھیں؛

قلمی نفیس ۱۲۰۴۳ - مطبوعہ ۲۷۳۲ - بعد وقف اضافہ ہوئیں ۱۰۲۲ - کل کتابیں [illegible]

یہ کتب خانہ شیخ الاسلام السید احمد عارف حکمت بک الحسینی نے ۱۲۷۰ھ میں بعہد سلطان عبدالمجید خان مرحوم
تعمیر کیا تھا، مکان کتب خانہ شیخ شاہین سے خریدا گیا۔ شیخ شاہین کو بسلسلہ بسلسلہ یہ مکان حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ
کے ترکہ میں سے پہنچا تھا۔ سالانہ مصارف کتب خانہ ۱۲۵۰ گنی تھے، ایک جزو تفسیر [illegible] ۲
لکھا ہوا ہے، کاغذ مثل چمڑے کے ہے، رنگ [illegible]، خط ایسا ہے جیسا نسخ لکھا ہو، بعد عصر امیر مدینہ
کے ہاں بتقریب شادی فرزند ممدوح کی دعوت میں شرکت کی۔ بعد دعوت [illegible]
[illegible] کے قریب آبادی کے کنارہ پر ہے۔ پانی پیا۔

۱۶ محرم الحرام سہ شنبہ۔ بعد نماز صبح شیخ ابراہیم عزوقی [illegible] مسجد شریف [illegible]
زیارت کی، بیت حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ، مقام نشست [illegible] العشرۃ
المبشرۃ رضی اللہ عنہم یہی مقام مشورہ گاہ حضرت امیر المومنین عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تھا، [illegible]
[illegible] حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا بیت [illegible]
کے بنائے گئے۔ ایک چھوٹا سا حجرہ اس میں ہے جو حضرت [illegible]
[illegible] بیٹھا کرتے تھے، وہاں دو نفل ادا کرنے کا شرف [illegible]

دیکھا۔ بیت مبارک [illegible] حضرت [illegible] علیہم [illegible] کے ایک حصہ میں ایک [illegible] امانت میں [illegible]

ان سے منسوب [illegible] جاتی ہے۔ مسجد بدستور قائم ہے۔ [illegible] جن کے بعد حضرت حمزہ

رضی اللہ عنہ خاندان کے لئے وقف فرمایا تھا۔ دوسرا بیت الحمزۃ کا جو حضرت [illegible] کا وقف کردہ

یہ مقدس مکان کے بالکل سامنے تھا جس میں یہ [illegible] قیام پذیر تھا۔ مسجد شریف میں شیخ [illegible]

مقدس مقام دیکھے۔ محراب تہجد حضرت سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ ستون [illegible]

ستون توبہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ خوخہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ صفہ۔

مسجد شریف کے تدریجی اضافے۔ جوار مسجد شریف میں مشہد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی بھی زیارت

کی۔ سلطان نور الدین کا مزار دیکھا جس کا دروازہ نجدیوں نے تیغہ کرا دیا ہے، شام کو بئر حاء اور

بئر بصہ کی زیارت کی۔ یہ دونوں کنوئیں اندرون آبادی مبارک مسجد شریف سے [illegible]

پر واقع ہیں۔ پانی پیا۔

۲۴ محرم الحرام چہار شنبہ۔ صبح کو جبل مبارک احد کی زیارت سے مشرف ہوا۔ حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پر انوار مزار پر فاتحہ پڑھی، مسجد میں دوگانہ ادا کیا نیز حضرت شہدائے احد رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مزارات سراپا خیرات پر فاتحہ پڑھی۔ جہاں [illegible] پر ایک چٹان کے سایہ میں آرام لینے کو بیٹھ گیا تھا کہ وہیں سے روضۂ منورہ کے گنبد خضرا کا جلوۂ جانفزا دو پہاڑوں کے درمیان عجیب شان دلربائی سے [illegible] پر ظاہر ہوا۔ دیر تک اس جلوے سے میں فیضیاب رہا۔ فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ حضرت شیخ [illegible] نے لکھا ہے [illegible] جذب القلوب میں کہ گنبد شریف فاصلے سے ایک خاص شان [illegible] کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ یہ ناچیز بھی اس جلوۂ جاں فزا سے مشرف ہوا۔ جبل مبارک احد میں ایک [illegible] جس کو نور النبی صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں۔ چنانچہ

شامل اور تناول فرمالیا گیا۔ ابتک پاس شب دو آب بتاریخ ۲۲ جمادی الاول ۱۳۸۸ھ [illegible] مدینہ منورہ کے ہشت نمک میں تازگی و نورانیت بدستور ہے، حالانکہ پندرہ برس گزر گئے۔ اب بھی پاس ہے۔

۲۵ محرم الحرام پنجشنبہ۔ سلطان محمود خاں مرحوم کا کتب خانہ دیکھا، جو اہتمام میں شیخ الاسلام کے کتب خانے سے کم ہے۔ اس میں ایک نسخہ کلام مجید کا ۲۳۸ھ کا لکھا ہوا دیکھا۔ مسجد شریف میں کلام مجید کا جو نسخہ قدیم ترین ہے وہ دیکھا، وہ ۴۸۸ھ کا لکھا ہوا ہے، بخط ابوسعد محمد بن اسمٰعیل غفرلہ۔ اس کے بعد شیخ احمد عباسی کا کتب خانہ دیکھا، اس میں کتاب المدخل امام بیہقیؒ کا نسخہ ہے۔ حفاظت کتب کا بڑا اہتمام ہے۔

۲۶ محرم الحرام، جمعہ۔ قبل نماز جمعہ بیر بضاعہ کی زیارت کر کے غسل بھی بہ نیت ترقی صحت کیا۔ یہ سنت بھی ہے۔

شنبہ، ۲۷ محرم الحرام۔ مولوی عبدالباقی صاحب فرنگی محلی کا مدرسہ دیکھا۔ اس مدرسہ کو ریاست حیدرآباد سے امداد ملتی ہے، اہتمام تعلیم غنیمت ہے۔ ناشتے کی ضیافت بھی مولانا نے فرمائی۔ یہ مدرسہ اس دور میں علمی خدمت کر رہا ہے۔ مولوی صاحب کی ذات بھی مغتنمات سے ہے۔ نجدیوں کی وحشت کا مقابلہ جرأت صداقت سے کیا، کلمۂ حق کے اظہار میں ڈرے نہیں، جزاہ اللہ عن المسلمین خیر الجزاء۔ (۱۳۶۴ھ میں مولانا نے رحلت کی، غفرلہ)

یکشنبہ، ۲۸ محرم الحرام۔ زیارت مسجد القبلتین، بیر رومہ و خندق سے مشرف ہوا۔ خندق کے نشانات پہاڑ کے دامن میں ابتک صاف دیدہ افروز ہیں۔ امرائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے جہاں مورچے تھے، وہاں مساجد بنی ہوئی تھیں[1]، ان میں سے متعدد ہیں، وہ گنبد والی [illegible] دیکھیں، نیز مسجد القبلتین میں۔ مسجد الفتح، مسجد ابی بکر، مسجد عمر، مسجد علی اور مسجد سلمان الفارسی رضی اللہ عنہم اجمعین،

---

[1] جبل الفتح، مسجد ابی بکر، مسجد عمر، مسجد علی، مسجد سلمان فارسی [illegible] رضی اللہ عنہم [illegible] مسجد [illegible]

ن پانچوں وقت ساتھ کہ عنایت کی الحمد للہ کہ پانچ نمازیں مسجد نبوی میں دوگانہ بھی پڑھا۔

۹ر صفر المظفر جمعہ۔ حضرت شیخ دہلوی قدس سرہ نے جذب القلوب میں تحریر فرمایا ہے کہ حضوری مدینہ طیبہ کی سعادت نصیب ہو تو مسجد شریف میں شب بیداری کی سعادت بھی حاصل کرے۔ اسی بنا پر میں نے مولوی نذیر احمد صاحب مجددی سے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو موصوف نے حضرات اغوات سے التماس کر کے انتظام کرا دیا۔ ۱۰ بجے شب کو مسجد شریف کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور بلا اجازت محافظین کوئی اندر نہیں رہ سکتا، خلاصہ۔ شب موصوف کو حاضری کی اجازت مجھکو بھی حاصل ہو گئی، جوں جوں وقت قریب آتا دل پر ہیبت سی طاری ہوتی جاتی تھی۔ یہ خیال بھی آتا تھا کہ کہیں نیند نہ آ جائے۔ حضرت شیخ نے خصوصاً ہدایت فرمائی ہے کہ حاضری نصیب ہو تو اہتمام بیداری رکھا جائے، ایسا نہ ہو غلبۂ خواب و غفلت میں شب گزر جائے۔ پیشتر بھی تو حضرت پیر و مرشد قدس سرہ کی جانب توجہ کی، الحمد للہ تعالیٰ اطمینان حاصل ہوا۔

حاضری شب کا اہتمام کر کے نماز عشاء کے لئے حاضر مسجد شریف ہوا۔ صحن میں چونکہ نشست ہوتی اسلئے اپنے لئے شمعدان اور موم بتی کا بھی اہتمام کر لیا تھا، خلاصہ۔ نماز عشاء سے فارغ ہو کر صحن میں تلاوت کلام مجید شروع کی، حاجی بھی ساتھ تھے، نیز معتقدی خاں، ان دونوں جو دور کلام مجید تلاوت میں تھا اس میں ۲۴ پارے ہو چکے تھے، بقیہ ساڑھے پانچ پارے اس موقع پر ختم کر کے مجھ سے کلام مجید کی تلاوت کا ثواب بارگاہ رسالت پناہ میں پیش کیا، اس کے بعد نفل پڑھی، پھر صلوٰۃ تسبیح پڑھی، تمام شب رہا، نماز تہجد بھی ادا ہوئی، صبح کی نماز عشاء کے وضو سے ادا کی، تمام شب نہایت سکون اور اطمینان سے بفضلہ تعالیٰ بسر ہوئی، تکان یا نیند کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دس بجے دروازے بند ہو گئے تھے، روشنی گل کر دی گئی تھی، ایک قندیل روضۂ مبارک میں روشن نظر آتی تھی جس سے اندر کی روشنی یوں ہی چھن چھن کر نظر آتی تھیں، علاوہ حاجی اور معتقدی خاں کے ایک بخاری بھی

اجازت ملی تھی، ان کے پاس شمع نہ تھی، میں نے اپنی شمع کے قریب لاکر بٹھالیا، وہ بھی تلاوت کرنے لگے
کیا مبارک شب تھی، کیا مبارک سحر۔ ؎

ضیا بخشی دریغ پر ز سنے صبح بہاراں کو — دل تمام کردیا زلف معطر سے شبستاں کو
(حسرت قمر ۱۶)

بعد نماز صبح مکان میں آکر سویا، کیا بیداری سعادت تھی اور کیا خواب راحت۔ فالحمد منہ تعالی
حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔ وصلی اللہ تعالی علی رسولہ الکریم وسلم۔

جو شمعدان اس مبارک شب میں، میں نے روشن کیا تھا وہ مع بقیہ موم بتیوں کے لاکر حبیب گنج
کی مسجد میں روشن کردیا۔

چہارشنبہ ۱۳ صفر المظفر۔ زیارت مسجد قبا کر کے زیارت مسجد الجمعہ و قبہ بنات النجار رضی اللہ تعالی عنہن۔
ایضاً بیر العین و بیر الغرس۔ دو ضیافتیں بھی آج شرف افزا ہوئیں۔ ایک بیر الغرس پر، یہ کنواں ایک
حسینی شریف کے باغ میں ہے، زیارت بیر کے موقع پر ممدوح سے بھی شرف ملاقات حاصل ہوا، بڑے
اخلاق سے دل فرمایا، قہوہ اور رطب کی ضیافت سے مشرف فرمایا، حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ
کی اولاد میں ہیں، شیخ علی کابلی نے جب اس سلسلۂ پاک کا تذکرہ کیا تو شریف نے فخریہ لہجہ میں اپنی
چھوٹی سی بچی کی طرف (جو پاس بیٹھی تھیں) اشارہ فرما کر کہا کہ حسین سے لیکر اس لڑکی تک سلسلہ مسلسل
ہے، شجرۂ نسب بڑے بھائی کے پاس ہے جو شہر میں ہیں، وہاں دیکھ سکتے ہو، میں نے شریف ممدوح
کی پاکیزہ آنکھوں میں ایک ایسا جلوۂ پاکیزگی و نفاست دیکھا جو عالم علوی کا ایک نظارہ محسوس ہوا
تھا، دوسری ضیافت بیر العین پر، یہ کنواں مشہور شیخ علی شحادہ کے باغ میں ہے، یہ شیخ جو الجزائر کے باشندے
سے ہیں، ترکوں کے عہد ان کا بھی دور رہا، اب مجبور ہیں، مجھ سے کہا کہ بدوؤں کی جھڑپ کے سوا
مغلوب ہو کر میرا ساتھ چھوڑ دیا ورنہ ابن سعود مدینہ پر قابض نہ ہوتا۔ قصہ مختصر ہم باغ میں اجنبیانہ
داخل ہوئے اور بیر عین کے قریب بیٹھکر صبح کا ناشتہ شروع کیا۔ شیخ علی کابلی ساتھ تھے جو شیخ شحادہ

کے ہمرلیف ہیں، خادموں نے ان کو پہچانا اور اپنے آقا کو خبر کی، دیا آدمی بھیجکر اپنے پاس بلا لیا، خانہ باغ میں تھے، یہ مکان بہت پُر فضا ہے اور وسط باغ میں تھا، قالینوں اور ہتھیاروں سے آراستہ تھا، ہم نے وہیں ناشتہ کیا، شیخ نے اس پر اظہار ندامت کیا کہ ہم ان کے مکان میں اپنا کھانا کھا رہے تھے، قلت فرصت ان کے یہاں کھانا تیار ہونے سے مانع تھی، کھانے کے اثنا میں خادم نے مجھکو پانی گلاس میں دیا تو کہا کہ میرے پانی پینے کے برتن میں دو۔ یہ برتن بیضاوی ناریل کے پوست کا سیاہی مائل دانہ دار تھا، کھانے کے بعد تلواریں دکھائیں، ایک اصفہانی عمدہ تھی، میں نے تعریف کی تو کہا بطور یادگاری کے لیجاؤ، میں نے انکار کیا تو اصرار ہوا، مولوی ندیم احمد صاحب نے خوبصورتی سے ٹالدیا یہ کہکر کہ یہ ہند میں جاکر بیکار ہو جائیگی، یہ سنکر شیخ کی آنکھوں میں ایک چمک آگئی اور کہا کہ اس سے بہت سر اڑائے ہیں، پھر باغ دکھایا آبپاشی کیلیے تیل کے انجن لگے تھے، نارنگیاں بھی تھیں جو مصر سے منگا کر لگائی ہیں، انکا نام یوسف آفندی تھا جنکو [illegible] بھی تھے، جس کو "حضرت خان" کہتے تھے، گھوڑے دکھائے، ایک بچھیری کمیت رنگ کی بہت نفیس تھی، اصرار کیا اسے لے جاؤ۔ راستے کی دقت میں نے بیان کی تو خاموش ہوگئے،

یکشنبہ، ۱۰ صفر المظفر۔ مولوی سید احمد صاحب فیض آبادی کا مدرسہ دیکھا، ابتدائی تعلیم کا یہ اچھی خدمت کر رہا ہے، طلباء کو صناعی بھی سکھائی جاتی ہے،

دوشنبہ، ۱۱ صفر المظفر۔ آج صبح روضۂ مبارک کے خدام میرے اور سارے عملہ کے مخدوم اغوات نے میرے قیام گاہ پر قدم رنجہ فرما کر ضیافت چاء قبول فرمائی، مجھکو شرف و کرم فرمایا، عجیب با ادب اور سلیقہ شعار بزرگ ہیں، کیسے ادب اور قاعدے سے خدمت روضۂ مبارک ادا فرماتے ہیں جس کو دیکھکر دل عش عش کرتا ہے، ایک موقع پر جب حاجی احمد مرحوم بمبئی کے تاجر سیٹھ نے اپنے مکان میں دعوت میں مجھکو بھی بلایا تھا، تو آغا مسرور شیخ الاغوات صدر نشین تھے، میں پہلو میں قریب حاضر تھا، اثنائے کلام میں میں نے پوچھا کہ کس قدر زمانے سے روضۂ مبارک پر حاضر ہیں، فرمایا [illegible]

سعادت خدمت حاصل تھی، ساٹھ برس کی عمر میں حاضر ہو گیا تھا، یہ شیخ ممدوح کی طہارت کا
استعداد تصور ہے کہ مجھکو اپنا وجود نجس محسوس ہونے لگا اور میں شیخ کے قریب سے علیحدہ ہو گیا،
جس طرح طاہر جسم کو نجاست سے بچاتے ہیں،

سہ شنبہ۔ ۷ صفر المظفر۔ صبح کو مسجد غمامہ میں دوگانہ نفل ادا کیا، یہ مسجد اس موقع مبارک
پر تعمیر ہوئی ہے جہاں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نماز عید ادا فرماتے تھے۔

چہار شنبہ، ۸ صفر المظفر۔ بعد عصر امیر مدینہ ابراہیم الصبہان ابن الرشید سے رخصتی ملاقات کی،

پنجشنبہ۔ ۹ صفر المظفر۔ مدینہ طیبہ کی آبادی کے اندر حضرت عبد اللہ بن عبد المطلب اور حضرت
مالک ابن سنان کے مزاروں کی زیارت کی۔ مزارات نجدیوں نے تیغہ کرا دیے ہیں، باہر سے
فاتحہ پڑھی، اس روز قاری حسن الشاعر السیوطی کے رسالۂ قرأت کا آخری سبق شیخ ممدوح کی خدمت
میں مسجد شریف نبوی میں پڑھا، شیخ اس وقت مدینہ طیبہ کے قراء میں درجۂ امتیاز رکھتے ہیں۔

جمعہ۔ ۱۰ صفر المظفر۔ دوران حاضری مدینہ طیبہ میں عرض درود و سلام کا یہ طریقہ رہا کہ
شروع میں تو مزور و زائرین کے ہمراہ چند بار روضۂ مبارک کے قریب حاضر ہو کر یہ شرف حاصل
کیا، لیکن اس کے بعد قریب حاضر ہونے کا قصد ہی نہ ہوتا تھا، نہ جرأت ہوتی تھی، دور سے باادب
ایستادہ ہو کر عرض کر لیتا، برابر یہی طریقۂ ادب ملحوظ رہا، اسی اثنا میں ایک موقع پر جناب مدیر حرم شریف
نے روضۂ منورہ میں داخلی کی مجھ سے تحریک فرمائی تو میں ہیبت زدہ سا ہو گیا، اور اپنی نا اہلی
ظاہر کر کے معذرت کی، نماز جماعت میں بھی روضۂ مبارک کی جالیوں کے قریب کھڑے ہونے کی
جرأت نہ ہوئی، مدینہ طیبہ میں ایک مہینہ حاضر رہنے کا پورا انتظام تھا، یہ بابرکت زمانہ بھی ختم ہوا تھا
کہ یہ خبر ملی جہانگیر جہاز کے پہنچ جانے کی تاریخ کی اطلاع مدینہ طیبہ پہنچی، اس خبر کے ساتھ کہ جلد دیگر
[illegible] ایک مہینہ تک جہاز نہ ملے گا، وہ بھی [illegible] پر ٹھہرنا ہو جاتا [illegible]

مدینہ طیبہ سے قافلے کے قافلے تو پہلے ہی جا چکے تھے۔ اس وقت حضرت اپنا ہی قافلہ بظاہر وہاں تھا، اسلیے اہل قافلہ میں بے چینی ہوئی اور چلنے کی تحریک کی۔ حکیم تفضل حسین خاں صاحب نے زیادہ اصرار کیا، میں چونکہ حکیم صاحب کے معالجے کا ممنونِ کرم تھا، اس لیے ان کے اصرار پر لحاظ کرنا پڑا اور قصدِ مراجعت قبل از وقت ہوگیا۔

جمعہ ۱۰ صفر المظفر تاریخ روانگی قرار پائی۔ اس قرارداد سے دل پر عجب افسردگی طاری ہوئی، پنجشنبہ کی شب کو کھانا کم کھایا تھا، ایک بجے شب کو سوتے سے آنکھ کھل گئی تو فرطِ وحشت و قلق سے قلب کا عجب حال تھا، صبح کو مسجد شریف میں حاضر ہوا تو دل بھر آیا، چند قدم چل کر بے اختیار پُردرد لہجے میں "یارسول اللہ" زبان سے نکلا، اب چلنے کی بھی تاب نہ رہی، کھڑا ہوگیا اور فرطِ غم سے قریب کے ستون شریف سے سر کو ٹیک دیا، اس رنج اور صدمے کی حالت میں دیر تک ساکت کھڑا رہا، بالآخر نماز صبح ادا کی اور بعد نماز صحن مبارک میں بیٹھکر پڑھنے میں مصروف ہوگیا، دل بدستور مضطرب تھا، اسی عرصہ میں خدام کرام روضۂ اطہر سے روشن قندیلیں باہر لانے اور ذخیرے کے مکان میں لیجانے لگے۔ اسی سلسلے میں ایک صاحب میرے متصل ہوکر تشریف لے گئے، ان کے ہاتھ میں ایک کشتی تھی، اور اس میں روشن کنول رکھے ہوئے تھے، اس اتصال سے قلب میں ایک کیف پیدا ہوکر یہ داعیہ پیدا ہوا کہ روضۂ مبارک میں داخلی کا شرف حاصل کرنا چاہیے، اول تو اس خیال پر گونہ استعجاب ہوا، مگر آہستہ آہستہ یہ مبارک خیال غالب و دلنشین ہوتا گیا، یہانتک کہ مصمم ہوگیا، بعد تصمیم مولوی ندیم احمد صاحب سے ظاہر کیا، موصوف نے از راہ کرم انتظام فرما دیا، جمعہ کی شب کو حسب ارشاد حضرات خدام خلاف معمول نماز بوقت امام شافعی رضی اللہ عنہ ادا کی اور بعد نماز حضرات ممدوح کی خدمت میں حسب قرارداد حاضر ہوگیا، بعد حاضری وہ لباس شریف زیب بدن فرما دیا گیا جو یہ حضرات بوقت خدمت استعمال کرتے ہیں، یعنی ایک صاف سپید

نیچا جبہ (فرجیہ) آستین چوڑی، اور عربی عمامہ، یہ لباس پہنا کر اس چبوترے پر بٹھا دیا جو ان حضرات کی نشست کے لیے مخصوص ہے، تصور کریں میری اس عزت و شان کا جب میں اس مبارک ہیئت منتظر خدمت و حاضری درگاہ ملائک پناہ، موقف خدمت میں حاضر تھا، دل میں سکون و عجز کی کیفیت تھی، بالآخر خدام کرام حسب قاعدۂ مقررہ غایت ادب کے ساتھ روضۂ اقدس کے باب علی پر حاضر ہو کر صف بستہ ایستادہ ہوئے، زہے شرف کہ یہ عاجز بندہ بھی اس باشرف صف میں تھا، کلید بردار خادم سب سے آگے ایستادہ تھے، ان کے گلے میں بھاری چاندی کی زنجیریں آویزاں تھیں، جن میں بڑی بڑی کنجیاں تھیں، سب نے اول درود و سلام عرض کیا، پھر بعد استیذان در سعادت کھولا، سب خاموش نیچی نظر کے ساتھ آہستہ بدن کو سمیٹے ہوئے داخل ہوئے، ایک سپید تہ کیا ہوا رومال میرے ہاتھ میں پہلے سے دیدیا گیا تھا، اندر داخل ہونے کے بعد ایک صاحب نے قندیل زجاجی کے پاس پہنچکر اس میں سے روشن کنول نکال کر دوسرے صاحب کو دیا، قندیل میرے سامنے جھکا دی، میں نے رومال سے صاف کر دی، اسی طرح درود و سلام آہستہ پڑھتے ہوئے پھر کر قندیلیں صاف کیں، مقام صدر اشرف کے قریب حاضر ہوئے تو کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی، ثواب پیش کیا، اس کے بعد حضرت سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مرقد مبارک کے قریب حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی، یونہی آہستہ آہستہ درود و سلام پڑھتے خدمت کرتے باہر آ گئے، ادب نے نگاہ کو اتنا قابو میں رکھا کہ باہر آنے پر یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ کیا دیکھا، فرط ادب سے نگاہ فرش مقدس پر بھی نہ جمی لہذا اس کی ہیئت بھی ذہن میں نہ تھی، باہر آنے پر قلب میں پورا سکون تھا، مفارقت و مہاجرت کا تصور بھی نہ رہا، قلب کو طمانیت کامل ہو گئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، اللہم صل علی سیدنا محمد و عترتہ بعدد کل معلوم لک۔ اس سعادت کے حصول کے بعد مکان پر آیا، وہاں شیخ حسن الشاعر المصری نے بھی کرم فرمایا، ملنے کے بعد موصوف کے ساتھ مسجد نبوی شریف

میں حاضر ہو کر حضورؐ کو فاتحہ سنائی، بعد حضرت استاذ شیخ ممدوح نے فاتحہ خیر و دعا سے مشرف فرمایا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، جمعہ کی نماز کے وقت منبر شریف سے بالکل متصل بیٹھنے کو جگہ مل گئی جو ایک نرالی تھی، خطبہ بہ اطمینان سنا، نماز کے وقت تیسری صف میں کھڑا، دو تین مصلی میرے اور مبارک جالی کے درمیان میں تھے صفیں درست ہونے پر اگلی صف میں ایک جگہ خالی ہوئی، میں وہاں پہنچ گیا، اب جالی شریف اور میرے درمیان میں ایک مصلی تھے، اس کے بعد اول صف میں جگہ خالی ہوئی، میں وہاں حاضر ہو گیا، اب جالی شریف اور میرے درمیان میں کوئی حائل نہ تھا، اسی قرب کے ساتھ نماز جمعہ ادا ہوئی، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔
یہ اس باسعادت قیام میں جمعہ کی اخیر نماز تھی۔

دو چار روز قبل خدام کرام کے ساتھ مسجد شریف میں جاروب کشی کا شرف بھی حاصل ہوا تھا، اور یہ شرف بھی کہ اس خدمت کے بعد خدام کرام نے مولوی ندیم احمد صاحب سے میری غیبت میں فرمایا کہ "شیرینی لاؤ، ہم میں شامل ہو گئے"۔ اتفاق حسنہ دیکھو روز جمعہ موصوف ایک صاحب چند جاروبیں فروخت کے لیے اس قسم کی لائے جو کسی زمانے میں خاص روضۂ اطہر کی جاروب کشی کے لیے قسطنطنیہ سے تیار ہو کر آیا کرتی تھیں، اب موقوف ہو چکی ہیں، میں نے ایک اشرفی پیش کر کے لیں اور خدام کرام کی نذر کر دیں، یہ اتفاق حسنہ قبول خدمت جاروب کشی کا مژدہ متصور ہوا۔

عصر کی نماز کے بعد روضۂ اقدس پر حاضر ہو کر الوداعی درود و سلام عرض کیا گیا، اہل قافلہ صدمۂ مفارقت سے بے چین مضطرب آہ و بکا تھے، میرا قلب الحمد للہ تعالیٰ سکینۂ حضور محسوس کر کے مطمئن تھا، تصور مفارقت بھی نہ تھا اور آج تک بھی نہیں ہے، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ، بعد نماز عصر قافلہ شیخ المکرم مدہ کو روانہ ہوا۔

مدینہ طیبہ میں ۲۳ دن تک شرف حضور حاصل رہا، ایک عجیب واردات جو حج سے قبل
ایک قافلہ زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہو کر مکہ مکرمہ پہنچا تھا، اس میں کے ایک صاحب سے جو
بہار کے رئیس تھے، شاہ ابو شرف صاحب مجددی کے دولت خانے پر ملاقات ہوئی، اثنائے کلام میں
میں نے پوچھا کہ مدینہ طیبہ میں کس قدر حاضری رہی، مسرور ہو کر کہا الحمد للہ اکیس ۲۱ دن، مجھکو تمنا ہوئی
کہ کاش مجھکو بھی طویل مدت حضور نصیب ہو، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ تمنا بھی پوری فرما دی،
حالانکہ مکہ مکرمہ میں مطوف ترک نے بلا اطلاع صرف چار ۴ دن کے قیام کا معاہدہ بدوؤں سے کر لیا تھا،
بجائے ۲۱ دن کے ۲۳ دن کے قیام و حضور کا شرف حاصل ہو گیا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ
چار ۴ جمعے مسجد شریف میں ادا ہوئے، دوران قیام میں تمام نمازیں باجماعت مسجد شریف میں (جہاں تک
یاد ہے) ادا ہوئیں، شہر مدینہ طیبہ اور نواح کے مقامات پاک میں سیر و مشی کی خوب سعادت
حاصل ہوئی، روزانہ بعد نماز صبح مشی کرتے ہوئے ٹہل کر مناخہ جاتے، ترکاری، میوہ، شہد وغیرہ
خریدتے، شام کو بازار میں جاتے، ایک روز مولانا عبد الباقی فرنگی محلی نے بازار میں دیکھ کر فرمایا
یہ بھی سنت ہے، ان مقامات میں بھی حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قدم رنجہ فرمایا ہے،
کتابیں کئی خریدیں، ان پر مدینہ طیبہ کی خریداری کی یادداشت لکھ کر داخل کتابخانہ حبیب گنج کیں،
علی ہذا القیاس مکہ مکرمہ کی خرید کردہ دو کتابیں رجال حدیث کی حسن اتفاق سے جدہ میں ہدیۃً
ملیں، اس طرح ان تینوں مبارک شہروں کی یادگار قیام حبیب گنج کے کتاب خانے میں ہے،
مسجد شریف میں یہ تین سعادتیں بھی حاصل ہوئیں، امامت صلوٰۃ، ایک روز صبح کو (غالباً حاضری
کے دوسرے دن) ایسے وقت مسجد شریف میں صحن جماعت میں حاضر ہوا کہ امام سلام پھیر چکے تھے،
میں تنہا فرض پڑھنے لگا، تو دو تین مصلی اور موجود ہو گئے اور باصرار مجھکو امام کیا، تفہیم نسخہ کلام مجید
قلمی، مسجد مبارک کے کتاب خانے میں ایک نسخہ کلام مجید کا تھا جو عبد المجید خاں صاحب مرحوم ٹونکی

کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے جو نواب وزیر الدولہ مرحوم کے والد تھے، خوشخط مطلا ہے، ایک روز شیخ الحرم مہتمم کتاب خانہ نے وہی نسخہ تلاوت کے لیے مجھکو عنایت فرمایا، منبر شریف کے قریب میں تلاوت میں معروف ہوا، اثنائے تلاوت میں ایک سے زیادہ کتابت کی غلطیاں معلوم ہوئیں، مثلاً آیۂ پاک قُلْ إِنَّ الْهُدَىٰ هُدَى اللَّهِ میں لفظ اللہ چھوٹ گیا تھا، یہ غلطیاں شیخ الروضہ کو میں نے بتائیں تو بعد اطمینان و دعائے خیر دیکر صحیح کر دیں۔

اجازت روایت حدیث شریف۔ شیخ عمری سے میں نے مسجد شریف میں اجازت حدیث شریف حاصل کی تھی، اجازت کے بعد شیخ ممدوح نے مجھ سے اجازت کی فرمایش کی، میں نے خجالت کے ساتھ اپنی بے مائگی کا عذر کیا، اس پر بھی اصرار فرماتے رہے، مجبور ہو کر میں نے خیال کیا تو ایک حدیث شریف خیال میں آگئی جس کی اجازت حضرت پیر و مرشد قدس سرہٗ نے اس وقت فرمائی تھی، جب میں اور شیخ احمد مکی مرحوم مل کر ایک بار حاضر خدمت شریف ہوئے تھے، یہ حدیث مسلسل بالاولیۃ حضرت کو حضرت شاہ عبدالعزیز قدس سرہٗ کی اجازت سے ملی تھی، حدیث موصوف کے یہ الفاظ یاد تھے، المتحابون فی اللہ تعالیٰ تحت ظل العرش یوم لا ظل الا ظلہٗ، اس حدیث شریف کی اجازت سے شیخ ممدوح بہت ہی خوش ہوئے، اور فرمایا میری سند سے عالی ہے۔

شیخ عمری فقیر منش، آزاد، وش قانع عالم ہیں، مولوی سید سلیمان ندوی نے مدینہ طیبہ میں ممدوح کی مجھ سے تعریف کی تھی، میرے اظہار اشتیاق پر فرمایا کہ ملنے میں بہت محتاط ہیں، یہ سنکر میں چپ ہو گیا۔ ایک روز تنہا ملاقات ہو گئی، فقیرانہ لباس، درویشانہ صورت و سیرت، اہل اللہ کا سا استغنا، سلف صالحین کے اخلاق کا نمونہ، مل کر ایسے مانوس ہوئے کہ اکثر ملتے رہے، مکان پر بھی تشریف لاتے رہے، مطالعہ بہت وسیع ہے، معلومات مستحضر، مطالعہ کا شوق اب بھی جو کچھ ہے بہت آگاہی ہے، بغدادی کتب میں بہت مفید مشورہ دیتے رہے، شوق مطالعہ

کی تعریف شیخ خربوتی نے بھی کی، حضرت شاہ عبدالغنی مجددی قدس سرہ العزیز سے تلمذ حاصل ہے، کہیں سے دس روپئے ماہوار ملتے ہیں، ان ہی پر قناعت کئے ہیں، خربوتی نسبت ہے خربوت کی جانب جو کردستان کا ایک حصہ ہے، شیخ ابراہیم خربوتی مہتمم کتب خانہ شیخ الاسلام نہایت مہذب اور متین، شگفتہ مزاج اور باہنر ہیں، کتابوں کی نگہداشت نہایت شفقت و اہتمام سے مثل بچوں کے فرماتے ہیں اور اس فن میں ماہر ہیں، میرے حال پر بہت مہربان رہے، کتاب التقصی امام ابن عبدالبرؒ کی، موصوف کی عنایت سے نقل ہوکر میری مراجعت کے بعد میرے پاس پہنچی۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنی خیرالجزاء۔

موسم رُطب | یہ بھی ایک فضل ربانی تھا کہ میری حاضری ایسے زمانے میں ہوئی جو مدینہ طیبہ میں رطب کی بہار کا تھا، باغات عوالی مدینہ شریف میں کثرت سے ہیں، عموماً ہر باغ میں کنواں اور پختہ حوض ہوتا ہے، زیرِ درختی کاشت رزقہ (لوسن) کی ہوتی ہے، بھنڈی، کریلہ وغیرہ ترکاریاں بھی پیدا ہوتی ہیں، نیز پودینا، ہرا دھنیا، اس طرح باغات کی زمین عموماً سرسبز رہتی ہے، کھجوروں کے درخت رُطب سے لدے ہوئے تھے، اقسام اقسام کی کھجوریں دیکھیں اور کھائیں عجوہ کھجور تلاش کرکے اور درخت کے نیچے کھڑے ہوکر کھائی، جس باغ میں دل چاہا بے تکلف چلے گئے، مالک باغ کو عموماً خیر مقدم کے لیے کشادہ پیشانی مستعد پایا۔ اہلاً، سہلاً مرحبا کے بعد محبت سے بٹھلاتے، چاء اور کھجور کی ضیافت سے مشرف فرماتے، کھانے کی فرمائش فرماتے، شیخ عبدالقادر حجار کے باغ میں دوپہر کا کھانا بھی کھایا، صبح کی اور سہ پہر کی چاء پی، اہل مدینہ اس موسم میں مع اہل و عیال باغوں میں قیام کرتے ہیں، بنگلے ہوتے ہیں، خوش الحان نعت شریف سناتے ہیں، شیخ حجار کے باغ میں ایک بڑا پختہ حوض شفاف پانی سے چھلک رہا تھا، اس کے کنارے پر بیٹھ ہوا دار مجلس تھی، مجلس کے کناروں پر خوشنما چھینٹ سے منڈھے ہوئے نرم گدے تھے، درمیان میں سر تا سر ایرانی خوشنما قالین

کا زخم تھا، جو لوگ تبرک سے حرمین میں پہنچنے، ملاجی سے اور شیخ سے اثنائے غسل میں تعزیت بھی ہو گئی۔

باوجود پیرانہ سالی شیخ حجا بہت ہی ظریف و خوش طبع ہیں، مہمان نوازی، زندہ دلی، نرم خوئی، شیریں زبانی اور پاکیزگی و صفائی اہل مدینہ طیبہ کے عمومی اوصاف ہیں، بہار رطب اور باغات کو دیکھ کر حدیث و ادب کے بہت سے مضامین عیاں ہو گئے۔

عمارات مدینہ طیبہ عموماً بلند اور وسیع سنگین ہیں، خصوصاً محلہ ساحہ کی عمارات بہت ہی عالی شان ہیں۔

ایک روز وادی العقیق کی بھی سیر کی، بعض قصور کے کھنڈر ابتک باقی ہیں،

۱۰ صفر المظفر یوم جمعہ کو بعد نماز عصر مدینہ طیبہ سے واپسی ہوئی تو اسٹیشن کے قریب شام ہو گئی تھی، جہرک والوں نے حجت کی، حکومت کو ٹیلیفون کیا تو حکم آیا فوراً قافلہ کو جانے دو، چنانچہ اس پر قصہ طے ہوا، نماز مغرب بیر علی کے قریب پڑھی، منزل بہ منزل سیدھے جدہ آئے،

آثار | اب چونکہ حج و زیارت سے بفضلہ تعالیٰ مشرف ہو لیے اس لیے اس کے بعد کے واقعات آثار کے تحت میں لکھے جاتے ہیں۔

۱۹ صفر المظفر کو صبح کے وقت جدہ پہنچے، جدہ کے بازار اس وقت طائف کے انگوروں سے بھرے ہوئے تھے، قسم قسم کے انگور اور انار، فضل باری تعالیٰ دیکھو، بمبئی میں امرود کی بہار تھی، مدینہ طیبہ میں [illegible] کی، جدہ میں [illegible] کی، جدہ میں پانچ دن قیام رہا، "اماں حوا" کے مزار پر حاضر ہو کر جناب عم مغفور مولوی محمد عبد الشکور خان صاحب رئیس [illegible] کی روح کو فاتحہ کا ثواب بخشا، نیز [illegible] مرحوم مغفور کو۔ قصد کیا کہ ہم دوبارہ مکہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ کرنے کا شرف حاصل کیا جائے، مگر موٹر کا انتظام نہ ہو سکا۔

جمعہ ۲۴ صفر المظفر کو جہاز جہانگیر پر سوار ہوئے، جہاز کا نام کامیابی کی فال خیر تھا، روانگی سے قبل مولوی ندیم احمد صاحب مجددی طائف کے انار اور ترکاریاں لاکر اہل جہاز کو تقسیم فرماگئے، انار اس قدر لطیف تھے کہ میں نے ایک مثل آم کے مولوی ندیم احمد صاحب کے اصرار پر چوسا، تمام دانے عرق ہوگئے، صرف باریک پوست ہاتھوں میں رہ گیا، اثنائے راہ میں عدن اور مکلا کی سیر کی، بندر عدن میں یاسین خاں صاحب مشن حج جہاز پر آکر شہر کو لے گئے، میرے بعد شب کا کھانا بھی کھلایا، موصوف علیگ ہیں اور خاندان کنبوہ کے فرد، ہوشیار، بااخلاق، مکلا خوشنما بستی ہے، جہاز میں میرے ہونے کی خبر پاکر سلطان نے مدعو کیا، لینے کو معتمد بھیجے، کنارہ پر موٹر موجود تھی، حیدرآباد کے تعلق کے لحاظ سے بہت اخلاق سے پیش آئے، کپتان کو بھی پکڑ بلایا تھا، تاکہ جہاز کی روانگی کے خیال سے ملاقات میں تنگی نہ ہو، جہاز پر واپس آجانے کے وقت دعوت بھیجی، شہد، قہوہ، بکرے، دنبے اور غالباً ایک بڑی ایرانی قالین کی جانماز، بکرے یہاں آئے ہیں اور ان کی نسل لی گئی ہے، جو انشاء اللہ اس مبارک سفر کی یادگار رہے گی،

جہاز براہ کراچی آیا، عدن خاص ضرورت سے گیا تھا، راستے میں ویراول (کاٹھیاواڑ) کا بندر پڑتا ہے جس کے متصل سومنات کے شہداء کے مزار ہیں، رحمہم اللہ تعالیٰ، روانگی اسی راہ سے ہوئی تھی، واپسی میں اطلاع ہونے پر قلب کو بہت تعلق ہوا اور فاتحہ خوانی کو دل چاہا، کپتان نے مہربانی سے موقع بتانے کا وعدہ کیا، خلاف امید طوفان کے اثر سے دن میں جہاز وہاں سے نہ گزرا، ۹ بجے شب کو پہنچا، کپتان نے مطلع کیا، تو فاتحہ پڑھ کر دعائے خیر کی، جب تک فاتحہ نہ پڑھی، دل کا تعلق و شوق زیارت قائم رہا، درود شریف کثیر تعداد میں پہلے سے پڑھ لی تھی، اس کا ثواب بھی بخشا، دل جوش کے ساتھ تھا، عجیب ربط روحانی کی خبر دیتا تھا،

۱۰ ربیع الاول روز شنبہ دن کو دس بجے بمبئی میں جہاز سے اترا [illegible]

عزیز عبدالرحمن خاں سلمہ کے دیدار سے مسرت حاصل ہوئی، عزیز موصوف از راہ سعادت مندی بیتاب ہو کر قدموں پر گر پڑے، میں نے روکا کہ یہ مت کرو، جہاز کے کنارے سے نیچے نظر کی تو دو محبوب چہرے اور نظر آئے، مولوی سید مناظر احسن صاحب اور مولوی عبدالباری صاحب ندوی، عزیزی مولوی عبدالحمید خاں بھی پہنچ گئے تھے، بمبئی میں ورود ایسے مبارک وقت میں ہوا کہ شہر مجالس میلاد مبارک کی برکت سے منور تھا، کئی مجلسوں میں شرکت کا شرف حاصل ہوا، جامع مسجد کی بالائی منزل کی روشنی ایسی دلفریب تھی کہ نگاہ ہٹتی نہ تھی، تعجب خیز مجلس الفضل کے یہاں کی تھی، یہ لوگ نجدی خیال کے آدمی ہیں، مگر اس سال مجلس مبارک کی اور اس اہتمام سے کہ تجدید و قیام وسلام، نعت خوانی، ذکر شریف، ضیافت سب ہی لوازم مجلس ادا ہوئے، جزاہ اللہ تعالیٰ خیراً۔ بمبئی سے روانہ ہو کر میں تو مع نفیس دولہن وغیرہ حیدرآباد ۱۳ ربیع الاول کو پہنچا۔ تاکہ اول شاہ اسلام اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہ کے سلام کی عزت حاصل کر دں، باقی قافلہ علی گڑھ روانہ ہوا، بعونہ تعالیٰ تمام قافلہ زندہ وسلامت سفر سے واپس ہو کر فائز وطن ہوا، اور گھر پہنچنے پر بھی کسی نے کوئی خبر بد نہ سنی، حیدرآباد میں تھوڑا سا قیام کر کے بعد اجازت خسروی میں بھی ۲۰ ربیع الاول روز شنبہ کو بوقت عشا بخیریت حبیب گنج پہنچ گیا، اول سب سے ملاقات کی، دوگانہ نفل ادا کیا، اس کے بعد اعزا کے دیدار سے مسرور ہوا، فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

یاد آیا حیدرآباد پہنچنے کے دوسرے روز یہ خوش خبری حبیب گنج سے پہنچی تھی کہ نور چشمی کلاں کے یہاں دختر نیک اختر تولد ہوئی، حمیدہ خاتون نام ہے، سلمہا اللہ تعالیٰ۔ حبیب گنج میں اطلاع ہوئی کہ اعلیٰحضرت نظام نے براہ کرم خسروانہ من ابتدا رکیم ربیع الآخر میری ملازمت میں ایک سال کی توسیع منظور فرمائی۔ حبیب گنج سے روانگی ۲۰ شوال المکرم روز شنبہ کو ہوئی تھی، واپسی ۲۰ ربیع الاول روز شنبہ ہوئی جملہ ایام سفر مبارک پانچ مہینے ؎

شکر کہ جمازہ بمنزل رسید   زورق امید بساحل رسید

(باقی)

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

ضلع بریلی (۲)

جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی

(۶)

شمالی ہند کے دوسرے ادبی مرکزوں کی طرح بریلی میں بھی اردو زبان اٹھارہویں صدی عیسوی میں مقبول ہو چکی تھی، اور روزمرہ بول چال میں فارسی کی جگہ لے چکی تھی، اس زمانہ میں عہد محمد شاہی کے صوبیدار بریلی نواب ہدایت علی خاں خود شعر کہتے تھے، اور قدرت اللہ شوق نے ان کے اردو کلام کا نمونہ طبقات الشعراء میں پیش کیا ہے، اس میں سے ایک شعر درج ذیل ہے،

ہاتھ سے دلبر کے سرگرداں ہوں تو ‏ ‏ بے طرح پھیرا ہے تجھکو کبو

حافظ رحمت خاں (متوفی ۱۷۷۴ء) کے عہد میں ہمیں بریلی میں چند ایسے شاعروں کا پتہ چلتا ہے جو فارسی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی شعر کہتے تھے اور اس فن میں شعرائے دہلی کے مقلد تھے، چنانچہ مکند سنگھ فارغ شاہ حاتم کے بریلوی شاگرد تھے، اگرچہ سعادت خاں ناصر نے انھیں قائم کا شاگرد لکھا ہے، سرور ان کے کلام کے مداح ہیں، اور انھوں نے ان کے درج ذیل اشعار بطور نمونۂ کلام پیش کیے ہیں،[۱]

ابروئے یار یہ کس پر ہے چڑھائی تیری ‏ ‏ قتل کو بس ہو مرے چشم نمائی تیری

---

[۱] عمدہ منتخبہ، ص ۶۴۹ ۔ خوش معرکۂ زیبا (مخطوطہ لکھنؤ یونیورسٹی) ورق ۲ (الف)

دو دست و کیونکہ مجھ چھپ کہیں ہو جاتا — تا کہ کچھ کہہ نہ سکوں بل بے رکھائی تیری

پلٹے پیٹ جو زلف کی تیرے چل چلی — گلشن میں بلبل باغ چھوڑتی ہے گلی گلی

ہم وہاں جلوں کے باغ میں گر آئے شمع بھی — دیکھ آہ شعلہ بار پکارے جلی جلی

دم غنیمت ہو جو بچ جائے یہ جان آج کی رات — شمع ساں سر پہ ہمارے ہے گراں آج کی رات

ہو سکے دیوانگی میں کون ہمسر ہم سے آج — پھرے آباد ان ہواز نجیر کا گھر ہم سے آج

بہادر سنگھ بہادر بھی اسی دور کے ایک اور شاہ حاتم کے شاگرد تھے، جو اگرچہ دہلی کے رہنے والے تھے لیکن بریلی میں آباد ہو گئے تھے، ان کا نمونۂ کلام درج ذیل ہے[1]۔

ملا دلا نظر آتا ہے کچھ گل رخسار — دہا ہے کس کے گلے کا تو ہار ساری رات

ادھر تو مسکی ہے چولی اُدھر ہیں ٹوٹے بند — نہ جانے کس نے یہ لوٹی بہار ساری رات

وا در یغا ہزار دا ڈیلا — حال سے میرے ایسی بے خبری[2]

راجہ نہلاس رائے مہراج قوم کے کائستھ اور حافظ الملک کے دیوان تھے، بریلی کے رؤسا میں شمار کیے جاتے تھے، حکیم قدرت اللہ قاسم ان کی جوانمردی، مروت، نیک نہادی کے بڑے مداح ہیں، لکھتے ہیں کہ "بہ ہر کس و ناکس بہ مردمی و فتوح می ساخت و با ہر حالی و اہل ہنر محبت و اخلاص می باخت با اہل فضل و کمال بکمال عجز و انکسار ملاقات می نمود و با صاحبان علم و دانش بہ نہایت مسکنت و غربت اختلاط می فرمود" قاسم اور سرور دونوں ان کے صاحب دیوان ہونے کی شہادت دیتے ہیں[3]، ان کے چند اشعار نمونتاً درج ذیل ہیں:-

آرام کا ہے کو نہ اسباب فلک پر — عیسیٰ کو بھی نہ آئے نہ کبھی خواب فلک پر

---

[1] عمدۂ منتخبہ، ص ۱۲۶، مجموعہ نغز، ص ۱۱۱ [2] یہ شعر مجموعہ نغز میں راجہ رام پنڈت برادر راجہ دیا رام بہادر کے نام سے منسوب ہے۔ [3] مجموعہ نغز، حصہ دوم، ص ۲۲۹ - عمدۂ منتخبہ، ص ۶۰۰ (مجموعہ نغز میں ان کا نام نہلاس رائے دیا ہے جبکہ عمدۂ منتخبہ میں یہ نام ہلاس رائے لکھا ہے)

دیکھا ہے کہیں اس نے ترے حسن کا جلوہ — آئینۂ خورشید ہے بے آب فلک پہ

کھوٹے کو جو دیکھا ہے کہیں رات کو تیرے — رہتا ہے کھلا دیدۂ مہتاب فلک پہ

اسی عہد کے ایک اور شاعر احمد خاں احمد کا ذکر فارسی گو شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے، اللہ یار رام کے بقول وہ کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہہ لیا کرتے تھے[۱]، ان کے اردو کلام کے چند شعر درج ہیں،

کیوں نہ ہووے دل مرا نخچیر زلف — عاشقوں کی قید ہے زنجیر زلف

مار ڈالے چاہنے والوں کو وہ — دیکھی ہم نے کچھ عجب تاثیر زلف

مصحف خوبی کا کرتی ہے بیاں — حسن معنی کی لکھے تفسیر زلف

وحشت مجنوں کا مجھے احمد ہے شوق — دل پہ میرے ہے مگر تا ثیر زلف

اسی زمانے میں بریلی میں ایک اور شاعر احمد خاں کا ذکر شوق نے کیا ہے، وہ انھیں بھی حافظ رحمت خاں کا مقرب بتاتے ہیں، ان کے بیان کے مطابق طبقات الشعراء کی ترتیب سے کچھ پہلے ان کا لکھنؤ میں انتقال ہوا،

نعیم اللہ خاں نعیم جن کا ذکر سرور اور مصحفی نے کیا ہے، اسی عہد کے ایک اور شاعر ہیں جن کا بریلی ضلع سے تعلق تھا، بقول سرور وہ شاہ جہاں آباد کے باشندے اور شاہ حاتم کے کہنہ مشق شاگرد تھے، مصحفی کا بیان ہے کہ وہ اپنی پُرگوئی کے لیے مشہور تھے، اور ایک ضخیم دیوان کے مصنف تھے، مصحفی سے ان کی پہلی ملاقات آنولہ میں ہوئی تھی، اور ان کے بعد محمد یار خاں کے دربار میں دونوں کا ساتھ رہا، سکرتال میں ضابطہ خاں کی شکست کے بعد جب روہیلوں میں انتشار پیدا ہوا تو وہ بھی محمد یار خاں کے دربار سے ہٹ کر بریلی چلے آئے[۲]، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

---

[۱] خمخانۂ جاوید، جلد اول، ص ۱۸۶ [۲] تذکرہ ہندی ص ۲۵۹-۲۶۰، عمدۂ منتخبہ ص ۷۷، خوش معرکۂ زیبا، (ورق ۱۱۲ ب) (اس تذکرہ میں نعیم کو بھی شاہ حاتم کے بجائے قائم کا شاگرد بتایا گیا ہے)۔ طبقات الشعراء (مخطوطہ دارالمصنفین، ورق ۳۸ الف)

الفت کی نشانی ہی رہی ہو جو ہم زمیں پر — جو سنگ ملا چھنا سے آیا ستمیں پر

یار تو کل ہم سے ملا تھا لیکن — ایک حجاب آ کے دغا کر گیا

کچھ تو ادھر شرم سے بولا نہ یار — کچھ میں ادھر آپ حیا کر گیا

بدھ سنگھ قلندر قوم کے کھتری دہلی کے باشندے تھے، خوشحال خاندان سے تعلق رکھتے تھے لیکن تقریباً دو لاکھ روپیہ کی نقد و جنس لٹا کر تارک دنیا فقیر ہو گئے تھے، موت سے کچھ سال قبل بریلی میں آکر متوطن ہوئے لیکن درویشانہ زندگی نہ چھوڑی، عالم نزع میں وصیت کی کہ ان کا لاشہ کسی سنسان وادی میں ڈلوا دیا جائے تاکہ آخری رسوم کے لیے لیجانے کی تکلیف نہ کرنا پڑے ان کے انتقال کے بعد ان کے اشعار کے مسودے ہولاس رائے رنگین نے جمع کیے تھے، اور قدرت اللہ شوق کی نظر سے اُن کا دیوان گزرا تھا،[1]

زہر اب تیغ ناز و ادا کا جو پی گیا — کہنے کو مر گیا یہ جو پوچھو تو جی گیا

مست ہی رہتے ہیں ہوں کیا ذات کیا — ہم قلندر ہیں ہماری بات کیا

قلندر تو کیا دل کی پوچھے ہے باتیں — تجھے دل کا رونا مجھے اپنے جی کا

طالب نہیں ہوں دین کا نہ دنیا پرست ہوں — عاشق ہوں درد کش ہوں قلندر ہوں مست ہوں

جدائی میں تری اے یار جانی — ہوئی ہے موت ہم کو زندگانی

فیض اللہ بیگ فدوی لاہوری بزعم خود اساتذہ میں تھے، اور سودا سے چشمک کی وجہ سے کافی شہرت کے مالک تھے، یہ بھی اپنی زندگی کے آخری زمانہ میں بریلی میں تھے اور یہیں ان کا انتقال ہوا، شوق سے ان کی آخر میں ملاقاتیں بھی ہوئیں، یوسف و زلیخا کا قصہ انھوں نے اردو میں نظم کیا تھا، فدوی کا ایک شعر بطور نمونہ کلام پیش ہے[2]

---

[1] طبقات الشعراء، مخطوطہ دار المصنفین اعظم گڑھ [2] ایضاً

پہلو میں اپنے دو دو نشا جی کے متصل
بیٹھا رقیب ساتھ جو دل کے متصل

خواجہ حسن، تخلص حسن، خلف خواجہ ابراہیم اسی عہد کے ایک اور شاعر تھے، جن کا بریلی سے تعلق تھا، سرور ان کے بے حد مداح ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں کہ

"صوفی مشرب، عالم باعمل و فاضل اکمل کہ بہ تقدس ذات و پاکیزگی صفات مقتدا و پیشوائے عصر خود است و تشنہ لبان وادی حقیقت را بہ زلال معرفت و ہدایت سیراب و شاداب می فرماید و اوقات شریف خود را با وصف تعلقات دنیوی بہ یاد و ذکر معاملات الٰہی مصروف می دارد و در علم موسیقی ہم یکتا و یگانہ و مستثنیٰ است بلکہ در ایں زمان بے عدیل و اجابہ ... فضل و کمالش صد راقم نیست کہ حرفے از آں نگارد۔"

مرزا علی لطف کے بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شاہجہاں آباد وطن تھا لیکن مصحفی کا قول ہے کہ فیض آباد اور لکھنؤ آنے سے قبل بریلی میں ان کا قیام رہتا تھا۔ لکھنؤ آنے کے بعد وہ رستم نگر میں مقیم ہوئے اور بقول لطف توسل امور دنیا انھیں سرفراز الدولہ مرزا حسن رضا خاں سے حاصل تھا، اور یہ درویشی اور فقیری میں آدھا لکھنؤ ان کا معتقد تھا۔ فن شعر میں جعفر علی حسرت سے مشورہ کرتے تھے۔ اس فن کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کو دخل تھا، چنانچہ میر حسن انھیں فن طلسم و شعبدہ و بازی کا ماہر اور لطف علم نجوم سے واقف بتاتے ہیں۔ ان علوم میں بھی ان کی متعدد تصانیف تھیں۔ حسن اردو کے صاحب دیوان شاعر تھے۔[1] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے۔

جو بندہ خانہ میں آئیے گا فقیر تم کو دعا کرے گا
کسی کے دل کو جو خوش کرو گے خدا تمہارا بھلا کرے گا

بھلا میں دیوانہ سہی پر یہ ناصح
مرے ساتھ بکتا ہے عاقل کو دیکھو!

یہاں تھک کے بیٹھے ہو کیا راہ رو تم
چلو راہ رو اپنی منزل کو دیکھو

---

[1] تذکرۂ ہندی ص ۷۷۔ عمدۂ منتخبہ ص ۱۹۲۔ تذکرۂ میر حسن ص ۷۹۔ طبقات الشعراء۔ مخطوطہ ... گلشن ہند (مطبوعہ ...) ص ۵۹۔ قاموس المشاہیر، جلد اول ص ۲۰۳

کر کے قسمت میں کہیں کو جا نکلا   اس وقت کسو نے دیکھ کے کیا کیا ہوا

ہوا اشک سے تماشے کو رستہ رنج کے پر   میں لے اس وقت میں جہان کا تماشا کیا

جوں شمع اشک و آہ سراپا بنا دیا   اے عشق مجھکو زور تماشا دکھا دیا

وقت وداع یار دل بیقرار نے   دو آہ کی کہ عرش معلیٰ ہلا دیا

جوں نقش پا گلی میں ہوں اب اسکے پائمال   میری ہوا نے خاک میں مجھکو ملا دیا

عہد حافظ رحمت خاں کے ایک اور شاعر جن کا بریلی سے تعلق ہے، میر عوض علی ماہر ہیں، جو حقیقتاً شاہجہان آباد کے رہنے والے اور طبیب حاذق تھے، اپنے پیشہ ہی کے سلسلہ میں حافظ رحمت خاں کے بیٹے عنایت خاں کے دربار سے وابستہ تھے، میر حسن ان کے بہت مداح ہیں، انھیں "شاعر بے نظیر، منشی خوش تقریر، مخزن اشعار غرا، معدن انشا و املا" کے القاب سے یاد کیا ہے، اور ان کے ایک قصیدہ کے مندرجہ ذیل اشعار بطور نمونہ پیش کیے ہیں،[1]

پھر ہے باول شدگان در پے آزار فلک   متصل چھڑکے ہے ناسور پہ سینہ کے نمک

نشۂ عیش سے ہو سرد بیاتک شرار   کر لیا چاہے ہے ہر غنچے کے ٹکڑوں سے گزک

سنی کے طوطیاں نغمہ خاں بند می میں   شعلے سے باندھے ہیں پروانے کے پاؤں پہ کٹک

محفل عیش میں بلبل نے بجائی شہنا   گوشۂ باغ میں غنچہ نے اٹھائی ڈھولک

نواب محبت خاں محبت کا ذکر فارسی گو شعرا کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، اردو میں وہ جعفر علی حسرت کے شاگرد تھے، اور تمام اصناف میں طبع آزمائی کرتے تھے، ممتاز الدولہ مسٹر جانسن کی خواہش کے مطابق انھوں نے سسی پنوں کے قصہ کو نظم کیا، اور اس مثنوی کا نام اسرار محبت رکھا، ان کے کلام کے سلسلے میں سعادت خاں ناصر نے ایک دلچسپ قصہ لکھا ہے، کہ قلندر بخش جرأت نواب محبت خاں

---

[1] تذکرہ شعرائے اردو (میر حسن) ص ۱۸۱

کوئی تم بن سے بھی چلتا ہو تو آ جائے شتاب — ورنہ اب یاد تو کوئی دم میں سفر کرتے ہیں
کچھ نگہ میں نہیں آتا ہے بجز جلوۂ یار — جبکہ ہم دل میں تصور اپنے نظر کرتے ہیں

مرزا مغل جرأت خلف عبدالباقی خاں بھی اٹھارہویں صدی کے آخری حصے کے شاعر ہیں، مرزا سودا کے شاگرد تھے، بریلی میں وفات پائی۔[1] نمونۂ درج ذیل شعر پیش ہے۔

کیوں نہ ہو دیں جاں و دل سے ہم نثار آئینہ — عکس ہے مکھڑے کا تیرے جھمکتا آئینہ

میر غلام علی عشرت بھی اسی دور کے شاعر ہیں، ان کا شمار بریلی کے اساتذہ میں ہے، مرزا علی لطف (شاگرد سودا) سے مشورۂ سخن کرتے تھے، ماہر فناغ کے بقول انھوں نے سنہ ۱۲۱۱ھ میں ایک مثنوی پدماوت تصنیف کی تھی، صاحب دیوان شاعر تھے، اور بقول مصحفی "دیوانہائے و مثنویات متعدد" رکھتے تھے۔[2] عشرت کے چند شعر نمونۃً درج ذیل ہیں:

در نایاب تھا ہر چند کہ ڈھونڈھا نہ ملا — اشک جو میرا گرا دیدۂ تر سے باہر
کیے ہیں سجدے ترے در پہ یاں تلک ہم نے — کہ داغ مٹنے قیامت تلک جبیں سے نہیں
رکھیں گے بعد مرگ اگر خاک کے تلے — ساقی تو مجھکو رکھیو کسی تاک کے تلے
بہ رب کعبہ بھلا جھوٹ کیوں کہیں عشرت — بتوں کے گھر میں تو ہم نے خدائیاں دیکھیں
چہرہ، دہن و دنداں کرتے یہ اشارے ہیں — خورشید میں ذرہ ہے ذرے میں ستارے ہیں
غنچہ کہاں، دہن وہ کہاں وہ سخن کہاں — پھوٹے ہزار پھول ڈلے وہ پھبن کہاں[3]
شب وصال میں دل پر قلق ابھی سے ہے — سحر ہے دور مرا رنگ فق ابھی سے ہے
ہنوز دفن ہوا بھی نہیں مرا بسمل — کہ زلزلے میں زمیں کا طبق ابھی سے ہے

---

[1] مجموعۂ نغز، ص ۱۴۰، طبقات الشعرا، سخن شعرا، ص ۱۰۱ [2] عہد منتخب، ص ۱۲۲، سخن شعرا، ص ۳۲۲، ریاض الفصحا، ص ۲۲۸

[3] تذکرۂ شعرائے رامپور، خوش معرکۂ زیبا، ورق ۱۶۴ (الف)، طبقات الشعرا، ص ۳۶۰، مقابلہ مجموعۂ [illegible]
جنت کہاں بہار دیارستاں کہاں — تو پر کرو دیں کہاں آسماں کہاں

نمودِ صبح سے پہلے وہ جو مسافر تھا — کہیں نہ جا کے دیکھے کہ نشانِ منزل تک

اسی عہد کے ایک اور شاعر جن کا سرور اور قدرت اللہ صدیقی نے ذکر کیا ہے، شاہ غلام محی الدین ہیں جو میر جھنگ کے پیرزادے اور دہلی میں متوطن تھے، ان کا مفصل ذکر فارسی شعراء کے ضمن میں ہو چکا ہے، ان کے اردو کلام کا نمونہ یہ ہے:

لائق دسے ہم تو کہیں سیر و سفر کے — جیوں نقشِ قدم چل نہ سکیں ہیں ترے در کے

باغ میں گل صد ادھر ہو فصلِ بہار ہو نہ ہو — میں ہوں غزل سرا وہاں بلبلِ زار ہو نہ ہو

رکھے ہے گلستان کو جوں بادِ سحر تازہ — ہے آہ سے اب میری ہر زخمِ جگر تازہ

مشہور چمن میں تیری گل پیرہنی ہے — قربان ترے ہر عضو پہ نازک بدنی ہے

اسی زمانہ کے ایک اور شاعر سید پایندہ مسافر ہیں، جن کا ذکر فارسی گو شعراء کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، ان کے چند اردو شعر پیش ہیں:

جو اٹھا دے چشمِ دل سے پردۂ پندار کو — بے تامل ہر مکاں میں دیکھ لے وہ یار کو

دیکھ کر بے ثباتیِ عالم — گاہ ہنستے ہیں گاہ روتے ہیں

عمر غفلت میں مفت کھوتے ہیں — دن کو پھرتے ہیں رات سوتے ہیں

بخت مل تمکین بھی اسی زمانے کے شاعر ہیں، جو کشمیری الاصل تھے، اور شاہجہان آباد میں پیدا ہوئے تھے، لیکن بریلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، سرور[1] نے ان کے درج ذیل اشعار بطور نمونۂ کلام دیے ہیں:

قید سے ہو تیرے ظالم جو رہائی مجھکو — پھر نہ دوں دل تجھے ہے تیری دہائی مجھکو

بن گیا آئینہ ساں صاف سراپا حیرت — تیرے چہرے کی جو یاد آئی صفائی مجھکو

آہ سر پنجۂ مژگاں جو بخون رنگیں ہے — کس کا یاد آیا ہے یہ دستِ حنائی مجھکو

---

[1] مجمع نغز، ص ۱۰۱ ۔ بہار گلشن کشمیر

فصل گل باقی ہے اور کنج قفس سے تکلیں[۱] ۔۔۔ واویلا نہیں سو جب ہے زباں مبتلا

دیوالی سنگھ جوہر، قوم کے کھتری اور بریلی کے باشندے تھے، سرور نے ان کا ذکر کیا ہے، لیکن حالات نہیں لکھے ہیں، لالہ سری رام نے بھی اسی عہد کے ایک شاعر جوہر بریلوی کا ذکر کیا ہے لیکن حالات ان کو بھی نہ معلوم ہو سکے، غالباً لالہ سری رام کے متذکرہ جوہر بھی دیوالی سنگھ جوہر تھے[۱]، جوہر کے تین شعر سرور اور سری رام نے لکھے ہیں:

تجھ بن ہے خراب زندگانی ۔۔۔ دل پر ہے عذاب زندگانی

ہے دست شانہ زلف بت خود پسند پر ۔۔۔ یا یہ چڑھا ہے چور لپٹ کر کمند پر

سوار نقرے کے دیلے کون گزرا ہو ۔۔۔ ہلال کپڑے ہو جس کی رکاب ورنہ آب

کلو خاں ہنر پسر فدائی خان، قوم افغان، متوطن آنولہ، فیض اللہ فدوی کے شاگرد تھے[۲]، ان کے چند شعر یہ ہیں:

صورت سے اگر جبیں بجبیں کیجئے گا ۔۔۔ باز آنے کا نہیں دل یہ یقیں کیجئے گا

دعوی نہ کیجیو دہن تنگ یار سے ۔۔۔ یہ بات غنچہ رکھیو تو اپنے دہن کے بیچ

جبکہ دل کو تری زلفوں سے سروکار نہ تھا ۔۔۔ اس قدر دام بلا میں یہ گرفتار نہ تھا

میر عزت اللہ جذب (ان کا نام سرور نے سید عجکاری لکھا ہے)، بھی اسی دور کے بریلوی شاعر تھے، سرور ان کو ماہر شاعر کہتے ہیں، اور ان کے کلام کو دلکش بتاتے ہیں، شیفتہ اور لالہ سری رام کے بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے، اور جاسوسی کے سلسلہ میں سیر و سیاحت میں مشغول رہتے تھے، یہاں تک کہ نواح بخارا میں قتل کر دیے گئے[۳]، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

---

[۱] عمدہ منتخبہ ص ۱۰۶، خمخانۂ جاوید جلد دوم ص ۲۰۰ [۲] طبقات الشعراء (مخطوط دار المصنفین اعظم گڑھ) [۳] عمدہ منتخبہ ص ۹۰، گلشن بیخار ص ۳۴، خمخانۂ جاوید جلد دوم

واں صفائی ہے تو دغائی ہے — یاں مری جان کی صفائی ہے
اے فلک مجھ سے اتنی بے رحمی — یہ ترے دل میں کیا سمائی ہے
یاں ہوئے ہم تو جان بحق تسلیم — واں ابھی عشق آزمائی ہے
ہوں مسلمان بندہ و کافر — کچھ عجب طرح کی خدائی ہے
جذب چل دیکھ آستانۂ یار — ہم ہیں اور واں کی جبہ سائی ہے

سید شاہ حسین حقیقت، ان کے اجداد بلخ کے رہنے والے تھے، لیکن حقیقت خود سرکار بریلی میں پیدا ہوئے اور فکر معاش میں لکھنؤ پہنچے۔ قلندر بخش جرأت سے مشورۂ سخن کرتے تھے، اور معلمی پیشہ تھا، سرور نے ان کے کلام کو دلکش لکھا ہے۔ نثر میں تذکرۂ احباب کے مصنف ہیں، جس کی مصحفی نے مذمت کی ہے[1]، ان کے چند اشعار پیش ہیں:

کیا ترے عشق میں لے عربدہ جو ہاتھ لگا — بیشے سے ہاتھ بھی دھویا نہ کوئی ہاتھ لگا
ساقیا پیوے جو زاہد مے ناب اک گھونٹ — بسر پیر مغاں اس کا گلا دابکے گھونٹ
ہجر میں کیوں نہ کروں یاد ملاقات اس کی — کہ بہلتا ہے ذرا وصل کی تقریب سے دل
بسکہ موج دریا اضطراب دل کے لئے — چلے جاتے ہیں کیا جانے کدھر ہم بیقراری میں

فروغ شاہ فارغ، ان کا وطن بریلی لیکن مسکن شکارپور تھا، آزاد طبع درویش تھے، سرور نے ان کا صرف ایک شعر بطور نمونۂ کلام پیش کیا ہے[2]:

دیدار دو دو جلوۂ ذات ایک ہے — شان و صفت جدا ہوں ولے ذات ایک ہے

ضیاء الدین شائق بریلی کے باشندے اور سرہند کے پیرزادے تھے۔ سرور، اور سری رام دونوں نے

---

[1] تذکرہ ہندی ص ۳۳۷۔ مجموعۂ نغز حصہ اول ص ۲۱۹۔ تذکرۂ ہندی۔ گلشن بیخار ص ۱۰۵۔ ...

[2] عمدۂ منتخبہ ص ۴۴۸

ان کا صرف عمدہ منتخبہ ذیل ایک شعر نقل کیا ہے[1]:

اگر اس طرح سے ہمیشہ کو مری چشم نم سے تری رہی ۔۔۔ تو مزار عوں کو یہ مژدہ دو کہ تمہاری کھیتی ہری رہی

شائق تخلص ایک دوسرے شاعر بھی بریلی میں اسی زمانہ میں گزرے ہیں، یہ محمد نذیر اکرم یا حسن ابن شاہ غلام محی الدین ادیبی ہیں، جن کا ذکر بحیثیت مصنف عطر بہار فارسی نثر نگاروں میں ہو چکا ہے یہ بھی سرہند کے پیرزادوں میں تھے اور بریلی میں آباد ہو گئے تھے[2]، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے

ڈرتا نہیں وہ ظالم خونخوار کسی سے ۔۔۔ بھڑ جائیگا اب کھینچ کے تلوار کسی سے

یہ جو سب گل عذار بیٹھے ہیں ۔۔۔ باغ دل کی بہار بیٹھے ہیں

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا ۔۔۔ دن گیا رات گئی رات گئی دن آیا

گلشن میں اگر ناز سے ہو لے وہ خراماں ۔۔۔ غنچے بھی کریں اپنے گریبان کے ٹکڑے

نہ ہو اس حسن پر مغرور اے گل ۔۔۔ یہ سُن لے ہر کا لے رانڈ والے

اگر شائق تو چاہے لذت عشق ۔۔۔ بتوں سے بھاگ اور راہ خدا لے

میر سعادت علی خلف میر غلام علی عشرت، ان کا تخلص سرور نے سعادت اور میر مینائی نے عیش لکھا ہے، بریلی کے باشندے تھے، لیکن نواب محمد علی خاں کے دربار سے ملازمت کی وجہ سے رامپور میں رہا کرتے تھے[3]، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

خاک چمن ہوئی موسم گل میں یہ عشق خیز ۔۔۔ لازم ہے اُگتا ہے سینہ پہ کھائے گل

اب دام سو جھتا ہے نہ صیاد پر نگاہ ۔۔۔ اللہ رے عندلیب کا شوق لقائے گل

چہرے سے اسکے پردہ جو اٹھا نقاب کا ۔۔۔ پس دو پہر رہے کہ نمک زرد ہوا آفتاب کا

جھمکتے ہیں شکل حباب وہ لعب اس لف عنبریکا ۔۔۔ جو تمہاری چشم بد سے کا [illegible]

---

۱ عمدہ منتخبہ ص ۲۰۲، خمخانۂ جاوید جلد ۲ ص ۵۰۰ ۲ عمدہ منتخبہ ص ۳۰۳، عطر بہار (مخطوطہ دار المصنفین) طبقات الشعراء (مخطوطہ دار المصنفین)

۳ عمدہ منتخبہ ص ۲۲۲ ۔ انتخاب یادگار، ص ۲۳۹

طالب جنت نہیں ہیں سالکان کوے دوست　　 دوش پر رکھتے ہیں سر افتادگان کوے دوست

قدرت اللہ شوق کا ذکر فارسی اہل قلم کے سلسلہ میں ہو چکا ہے، اردو شاعری میں بھی ان کا بلند مقام ہے، وہ قائم چاند پوری سے مشورۂ سخن کرتے تھے،[1] نمونۂ ان کے چند شعر پیش ہیں:

دل ودیں صبر و قرار و خرد و تاب و تواں　　 گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا

کیا دل کا فر ترا مردود دیر و کعبہ ہے　　 نے بتوں سے ربط اس کو نے خدا سے آشنا

در بدر خاک بسر کرتے ہی دیکھا شب و روز　　 مثل خورشید جو طالب کوئی زر کا نکلا

وسعت دل یہ چاہتی ہے مری　　 لامکاں پر مکاں بنایئے گا

مغفرت ہاتھ باندھ کر آئی　　 دیکھ میرے گناہ کی حشمت

کٹی جس طرح عمر حسرت میں سب　　 تو یہ دن بھی دم میں گذر جائے گا

تو بھی تو آکے سیر دل داغ داغ کر　　 روشن کیا ہے گھر ترا لاکھوں چراغ سے

مثل گل گو کہ رکھیے پردوں میں　　 بوئے الفت چھپی نہیں رہتی

میرے ملنے سیتیں اتنا پرہیز　　 بل بے غیرت اسے کیا کہتے ہیں

اے شوق تیرے شعر کی اب تو پڑی ہے دھوم　　 سودا و میر و قائم و درد و الم تلک

گل کترتا ہے ہر اک بات میں تو تو اے شوق　　 کیا بیاں کیجئے تیرے طرز سخن کی خوبی

ہزاروں صورتیں دیکھیں پہ یہ نقشا نرالا ہے　　 یہ قدرت نے شاید آپ کو سانچے میں ڈھالا ہے

ہر اک عضو اس کا جو دیکھو تو عالم سے نرالا ہے　　 غضب جوبنا عجب گھڑا ستم کانوں کا بالا ہے

کہے ہیں شوق کے اشعار سن جرأت یہ حسرت سے　　 عجب انداز ہے کچھ اس کی کیا کہنے کا ہوالا ہے

غافل تجھے گھڑیال کرتا ہے یہ منادی　　 گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور گھٹا دی

---

[1] انتخاب یادگار، ص ۱۸۳، گلشن بیخار ص ۱۱۲، تذکرۂ شعرائے اردو، ص ۔۔۔، مجموعہ نغز، ص ۔۔۔، خمخانۂ جاوید، ج ۵، ص ۸۳

[2] ۱۷۱ھ

اے صنم یہ بھی کبھی تیری خدائی ہوگی ● کہ مجھے اس کی چال سے جدائی ہوگی

قدرت اللہ شوق نے طبقات الشعراء میں مقالۂ چہارم میں اپنے جن عزیزوں اور دوستوں کا ذکر کیا ہے، اُن شعراء میں بریلی کے ایک صاحب ناصر خاں تھے، جنھیں شوق نے "آدم بے مثال" کہا ہے اور غلام جیلانی بیدم کا شاگرد بتایا ہے، انکے جو اشعار پیش کیے ہیں، ان میں سے چند درج ذیل ہیں،[1]

جب غنچہ نمط خوش دل غمناک کروں گا ● داماں و گریباں کے تئیں چاک کروں گا
بیٹھا ہے مرے دل پہ غبار غم ہجراں ● فرقت میں تیری کیا میں خوشی خاک کروں گا
اب فیض قدم اپنے سے اے قیس ترے بعد ● میں خانۂ زنجیر کو معمور کروں گا
ہو جائیں خاک جل کے زمیں آسماں تلک ● آوے جو دل سے آہ ہماری زباں تلک
محفل ہو تیری اس دل سوزاں کی زندگی ● جیسے بقائے شمع کہ ہو انجمن تلک

شوق نے بریلی کے چند دوسرے خوشگو شعراء کا بھی ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک حافظ عزت اللہ عباس تھے، جو اگرچہ شعرگوئی کو باعث ننگ جانتے تھے، پھر بھی گاہے ماہے شعر کہہ لیا کرتے تھے، ان کا ایک شعر پیش ہے،[2]

تیرے ہی کچھ پڑی نہیں یہ زلف پیش پا ● اہل زمیں پہ اتری ہے بالا سے یہ بلا

حافظ محمد معتصم عباسی کو بھی شوق نے خوشگو شعراء میں شمار کیا ہے اور ان کا صرف ایک شعر نمونۃً نقل کیا تھا،[3]

شیخ عبداللہ نکہت کو بھی شوق نے اسی دور کے خوشگو شعرائے بریلی میں شامل کیا ہے اور انھیں حافظ عزت اللہ عباس کا شاگرد بتایا ہے۔[] ان کے دو شعر پیش ہیں۔

ہے زیست عاشقوں کی خوباں کے ہاتھ یارو ● معشوق بھی جہاں میں کرتے ہیں کیا خدائی

---

[1] طبقات الشعراء (مخطوطہ) دارالمصنفین اعظم گڈھ [2] ایضاً [3] ایضاً

نگہ کیا جانئے کس کس کے جگر پر تھم نے — نیچی مجھ سے ہو رہا ہے صاحب کلہ جانی

انیسویں صدی کے اوائل کے شعرا میں میر محمد جان ناداں کا ذکر مصحفی نے کیا ہے، وہ محلہ کلی خاں صوبہ دار بانس بریلی کے بیٹے اور ابتداءً مصحفی کے ایک شاگرد موجی رام موجی کے شاگرد تھے لیکن بعد کو مصحفی سے اصلاح لینے لگے تھے۔[1] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں:

وصل کی شب مجھے کیا یار نے سونے نہ دیا — دیدۂ طالب دیدار نے سونے نہ دیا

گرچہ افسانے سے نیند آتی ہے مجھ کو لیکن — قصۂ عشق دل زار نے سونے نہ دیا

گیا مرنے پہ بھی درد جو دل کا میرے — قبر میں بھی دل بیمار نے سونے نہ دیا

گرچہ ہوں ساکن گلزار ولے نرگس وار — یاد یاران گرفتار نے سونے نہ دیا

چشم انجم کی طرح رات ہی کٹ دیدۂ شوق — اک شب آرزوئے یار نے سونے نہ دیا

چھیڑنے کو مجھے تصویر خیالی بھیجی — خواب میں بھی مجھے دلدار نے سونے نہ دیا

وہ تو اس بات پہ راضی تھا مگر اے ناداں — پاس میرے اسے اغیار نے سونے نہ دیا

کیا نازکی سے رکھے وہ جعد سیاہ دوش پر — ہوتا ہے بار کیوں کہ زلف سیہ فام دوش پر

عاشق مزاج کہتے ہیں بچپن سے مجھ کو لوگ — آتا نہ تھا کبھی مجھے الزام دوش پر

پھرتے ہیں ترے عشق میں سب برہمن بسیر — زنار رکھ کے صاحب اسلام دوش پر

اسی عہد کے ایک اور شاعر محمد شریف عاصی ہیں جنہیں قدرت اللہ شوق نے اکبر آباد کا باشندہ بتایا ہے۔[2] وہ ان ہی کے بقول وہ ایک مختصر دیوان کے مصنف تھے۔ عاصی کی اکثر غزلیں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کی مدح کے اشعار سے شروع ہوتی ہیں۔ چند اشعار درج ذیل ہیں:

زلف سیہ کے پیچ میں جو آ پھنسا خود بخود — اس دل کو ہائے کھینچ نکالا ہے بال خوب

[1] [illegible] ص [illegible] ۔ [2] [illegible] ورق [illegible] [illegible]

تیغ نگاہ ڈوب رہی ہے لہو میں آج — کس خانماں خراب کو تم پار کر چلے

سید عابد حسینی راحت بریلوی سنہ ۱۸۲۰ء تک زندہ تھے، لیکن حالات کا پتہ نہیں چلتا،[1] ان کے ایک معاصر بلاس رائے رنگین برادر راجہ بلاس رائے تھے، سعادت خاں امر (صاحب خوش معرکۂ زیبا) نے انھیں قدرت اللہ شوق کا شاگرد بتایا ہے، اور خود قدرت اللہ شوق کے قول کے مطابق رنگین صاحب دیوان شاعر تھے،[2] لیکن شوق ان سے خفا معلوم ہوتے ہیں، چنانچہ لکھتے ہیں: "بسیار بے فیض و نا قدر دان .... دیوان ریختہ ترتیب دادہ .... اشعارش خالی از لطف معانی و شاعری است۔" ان کے چند شعر پیش ہیں۔

غیروں کے پاس جانا ہم سے کبھی نہ ملنا — افسوس ہے تو یہ ہے ارمان ہے تو یہ ہے

پہچان لیجو مشہد رنگین سے اے صبا — اٹھتا ہے اس کی خاک سے اب تک غبار سنگ

اسی زمانہ میں بریلی میں ایک اور شاعر باقر علی وحشت تھے جو مرزا محمد جان تاباں کے چچا زاد بھائی اور مرزا حسین علی خاں برادر مہدی علی خاں صوبیدار پالس بریلی کے بیٹے تھے، خاندانی رئیس تھے، مصحفی ان کے بہت مداح ہیں، ریاض الفصحا کی ترتیب کے وقت ان کی عمر چالیس سال بتاتے ہیں،[3] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے:

گو رنگ تنگ کرگئے کیونکر نہ دے وحشت فشار — ایک مدت ہم رہے آغوش یاد سے جدا

ٹھہرا نہ کوئی بھی میرا آزار دیکھکر — آنکھیں تلک تو پھر گئیں بیمار دیکھکر

نگہ آفت، بلا قامت، مکر ہیچ و دہن معدوم — جو دیکھو غور سے تو وہ صنم پتلا ہے جادو کا

ہے جا رہی بہر میں زوال کمال حسن — لکھا قضا نے یہ ورق مہر و ماہ پر

رنگ ثبات بس کہ نہیں اس نگار میں — آتی ہے بوئے یاس گل انتظار میں

۱؎ مخانۂ جاوید ج ۳ ص ۱۰۳ ۲؎ خوش معرکۂ زیبا ورق ۱۰ (الف) مخانۂ جاوید ج ۳ ص ۳۳۰۔ طبقات الشعراء (از قدرت اللہ شوق) ۳؎ ریاض الفصحا صفحات ۲۵۰ تا ۲۵۲

کتنوں کی جاں بخشی کریں گے وہ اب — کتنے ہی اس بات پہ مر جائیں گے
تیغ سے خنجر سے نہ ڈر جائیں گے — چین جبیں دیکھی تو مر جائیں گے
خوف اسیری میں رہائی کا ہے — ضعف یہی ہے تو کدھر جائیں گے
کاٹنی ہیں گور کی اندھیاریاں — کیا شب دیجور سے ڈر جائیں گے

از بس کہ مجھ کو مرگ سے اپنی سرور ہے — یہ گور کی بغل نہیں آغوش حور ہے
تن پروری سے اپنی ہے منظور نفع غیر — آخر تو ایک دن یہ بدن رزق مور ہے

نقش تقدیر کا ہوں کا گریباں گیر میں — بن پڑھائے لکھ دیا کیوں خط پیشانی مجھے
کس کے جلوے سے منور یہ مرا کاشانہ ہو — ہے گل خورشید گر گل بھی چراغ خانہ ہے

شاہ نیاز احمد نیاز بریلوی کا ذکر فارسی شعرا کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ اگرچہ مصحفی نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا لیکن مصحفی کی شاعری کے عروج کے زمانہ میں انھوں نے مصحفی کو ایک غزل بغرض اصلاح بھیجی تھی[1]۔ نمونۃً ان کے چند اردو شعر پیش ہیں:

مجھے چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال — یہ جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا
وہ جو نقش پا کی طرح رہی تھی نمود اپنے وجود کی — سو کشش سے دامن ناز کے اسے بھی زمیں سے مٹا دیا

یا الٰہی زورق گردوں سنبھال — بے طرح امڈا ہے یہ طوفان اشک

صبر و قرار و شکیب و تاب و تواں عقل و دیں — سب لے تو لی اپنی راہ رہ گئی کیوں جان تو

عقل کے مدرسے سے اٹھ عشق کے میکدے میں آ — جام فنا و بیخودی اب تو پیا جو ہو سو ہو

روشن شاہ، روشن علائق دنیوی سے پاک ایک خوش سلیقہ درویش تھے۔ اگرچہ مستقلاً میرٹھ میں رہتے تھے لیکن وطن بریلی تھا، وہ انیسویں صدی کے پہلے نصف دور کے شاعر ہیں اور صاحب دیوان تھے[2]۔

---

[1] مخزن شعرا ص ۵۰۲۔ ریاض الفصحا ص ۲۷۲ [2] عمدۂ منتخبہ ص ۲۰۱۔ سخن شعرا ص ۱۹۱

نمونۂ کلام پیش ہے:

غیر سے ہوتی ہیں پیار کی باتیں — ہیں یہ پروردگار کی باتیں

آپ کرتے ہیں بار بار نہیں — ہم کو ہاں کا بھی اعتبار نہیں

دیکھ کے مجھ کو منہ چھپایا اور حیا کا نام کیا — واہ ری تیری دانشمندی اس میں بھی اک کام کیا

مجھ کو بسنی چاہیے کہ جس جا گزر اس کا ہو — مثل خورشید جہاں دیکھیے گھر اس کا ہے

دل کی تپش سے گرمی خورشید سرد ہے — سینہ اگر یہی ہو تو دوزخ بھی گرد ہے

کشور محبت کا پیش ہے سفر دل کو — عاشقو دعا کرنا اس کی کامیابی ہو

پری ہے رشک گل ہے نازنیں ہے — وہ اک غارتگر دنیا و دیں ہے

نہ دنیا کا رہا میں اور نہ دیں کا — نہ چھوڑا عشق نے مجھ کو کہیں کا

داغوں سے عشق کے ہو گلزار باغ دل کا — [illegible] ہے ہر اب کچھ داغ دل کا

گل کی روش کھلا ہے ہر ایک داغ دل کا — گلہ ہے تو سیر کیجے ہے طرفہ باغ دل کا

کرامت علی خاں شہیدی ولد عبدالرسول خاں مولد [illegible] لکھنؤ کے باشندے تھے لیکن زندگی کا کافی حصہ بریلی اور رامپور میں گزرا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے غالباً اسی وجہ سے انھیں بریلوی لکھا ہے۔ فن شاعری میں شاہ نصیر اور مصحفی کے شاگرد تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں مدینہ منورہ چلے گئے تھے، اور وہیں ۱۲۵۶ھ (مطابق ۱۸۴۰ء) میں انتقال ہوا۔[1] ان کے چند شعر بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

قاتل نے چل تصفیہ شمشیر سے تنگ — زخم اک اب پہلو ہے خنجر سے تنگ

ہم میت کو نہ لے ہے جب غش آتا ہو — وہ جنازے پہ شہیدی کے نظر آیا

ایام معیشت کے ترے کاٹے نہیں کٹتے — دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں جیسے

۱۔ گلشن بیخار، ص ۱۱۳۔ سخن شعرا، ص ۲۷۰۔ تذکرہ نادر، ص ۱۲۲۔ خوش معرکۂ زیبا، ورق ۱۳۴ (ب)

مصحفی کے ایک دوسرے بریلی کے رہنے والے شاگرد، جو بجائے خود اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، شیخ علی بخش بیمار تھے، وہ ابتدا ؔ احمد خاں غفلت سے اصلاح لیتے تھے، اور نہایت پُرگو تھے، انھوں نے کئی دیوان مرتب کیے تھے لیکن سب تلف ہو گئے، عربی و فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے، نواب سعید خاں والی رامپور کی فرمایش سے انھوں نے بوستان خیال کے کچھ حصوں کو شعر کا جامہ پہنایا تھا، لیکن وہ بھی اب ناپید ہے، ان کا جو کچھ کلام ملتا ہے وہ نہایت دلکش و موثر اور سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور ان کی استادی کی شہادت دیتا ہے، ان کا انتقال ۱۴ ربیع الاول ۱۲۷۱ھ مطابق ۱۸۵۵ء کو رام پور میں ہوا۔[1] ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں:

کون پرساں ہے حال بسمل کا / خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار / ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

نہ ہنا آج جو دن جدائی کا / کیا بگڑتا تری خدائی کا

نہ رہنے دے گی وحشت تنگ دے میں / اٹھو بیمار جو مرضی خدا کی

بیاں ہو عیب طبیعت یہ ہو چکا مجھ سے / خدا کرے کہ نہ پوچھیں وہ مدعا مجھ سے

کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار / کہ اٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

اب اور آرزو نہ رہی اے خدا مجھے / کیا درد دل دیا کہ سبھی کچھ دیا مجھے

دل چاک چاک ابروئے خمدار نے کیا / کعبہ کو کربلا تری تلوار نے کیا

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز / بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں

موت سے بھاگ گئے تھے بیمار / کیا اسے تم شکستہ پا سمجھے

اور مطلب آہ سوزاں سے نہیں / خاک ہونے کی تمنا ہو مجھے

---

[1] انتخاب یادگار، ص ۷۵، تذکرۂ شعرائے رامپور، خمخانۂ جاوید جلد اول ص ۴۴۳

بیآر کو غفلت سے بہت خیر نہیں آج | ہر چند کہ تھی حالتِ غش کل مگر ایسی
ہر روز وہ پھر جاتے ہیں در تک مرے آکر | کچھ جذبِ محبت کو لگی ہے نظر ایسی
جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی | دنیا میں تو مانگی نہ ملی موت خدا سے

بیآر کے ایک معاصر محمد ضیا خاں یاؔس تھے، جو حافظ رحمت خاں کے پوتے اور احمد خاں غفلت کے شاگرد تھے، بڑے پُرگو شاعر تھے، کلام بہت تھا لیکن تلف ہوگیا، ۱۲۶۶ھ (مطابق ۱۸۵۰ء) میں یاؔس نے وفات پائی،[1] نمونۂ کلام درج ذیل ہے:

گھر میں آنے سے مرے آپ کو ڈر کس کا ہے | شوق سے لایئے تشریف یہ گھر کس کا ہے
یاؔس اب تو سوائے ذاتِ خدا | ہم کسی کے نہ کوئی اپنا ہے

اسی دور کے ایک شاعر مشہور بریلوی بھی ہیں، جن کے متعلق صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ بریلی کے ایک کائستھ گھرانے کے فرد تھے، شیفتہ نے ان کا صرف ایک درج ذیل شعر نقل کیا ہے،[2] رعایت لفظی کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں۔

خوشی سے کیوں نہ اے مشہور اب بغلیں بجائیں ہم | لے گا بار ہم سے تو پھر بازو پھڑکتے ہیں

(باقی)

---

[1] انتخاب یادگار، ص ۱۰۴ [2] گلشن بیخار، ص ۱۷۱

عماد الدین الاصفہانی مورخ و ادیب

از جناب محمود الحسن صاحب شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

عماد الدین اصفہانی تاریخ اسلام کی اہم علمی شخصیتوں میں ہے، اس کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس دور کا مختصر تذکرہ کر دیا جائے، جس میں اس نے آنکھیں کھولیں اور اس کی نشو و نما ہوئی۔

عماد الدین بارہویں صدی کے نصف آخر میں پیدا ہوا، اس وقت سلاجقہ کی عظیم الشان حکومت مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو رہی تھی، کہیں آزاد سلجوق حکمرانوں کے غلام اپنے کمزور آقاؤں پر حاوی ہو گئے تھے، یا انھیں ختم کر کے اپنی حکومتیں قائم کر رہے تھے، عباسی اقتدار جو سلاجقہ کے گرم اور بہادر خون سے نئی زندگی حاصل کر چکا تھا، وہ بھی اب کمزور ہو چکا تھا، ان دونوں میں اتنی قوت نہیں تھی کہ اس انتشار کی شیرازہ بندی کر سکیں، شام پر تتش کے غلام طغتگین نے اپنے اقتدار کا اعلان کر دیا تھا، موصل میں عماد الدین زنگی نے ایک نئی آزاد سلطنت کی داغ بیل ڈال دی تھی، مصر میں فاطمیوں کی حکومت تھی جو افریقہ تک پھیلی ہوئی تھی، مگر اس میں بھی زوال کا گھن لگ چکا تھا، اندلس جو قبائل اور مقامی باشندوں کی کشاکش کی آماجگاہ بنا ہوا تھا، پڑوس کی عیسائی حکومتیں اندلس کے باشندوں کی مدد کر رہی تھیں، بحر روم کے مشرقی ساحل پر آباد ریاستوں کی حالت اور بھی ناگفتہ بہ تھی، اس دور کی ابتری کا نقشہ ہم عصر مورخ ابن الاثیر نے ذیل کے الفاظ میں پیش کیا ہے:

"عماد الدین کی ملک گیری کا حال بیان کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے سلاطین

کی زبوں حالی اور ضعف اور مشرکین کی قوت اور کامرانی کا حال بیان کیا جائے، جس وقت عماد الدین شہید حکمران ہوا تو فرنگیوں کی مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو چکا تھا، انکی فوجی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا، ان کی ہیبت کا سکہ جم چکا تھا، وہ اسلامی ملکوں پر مسلسل دست درازی کر رہے تھے، مسلمان اپنا دفاع کرنے میں ناکام تھے، فرنگیوں کی بربریت کا دور دورہ تھا، مسلمان اہانت و ذلت کی زندگی بسر کر رہے تھے، ماردین و شبختان کے کنارے سے لیکر عریش مصر تک انہی کا بول بالا تھا، صرف حلب، حمص، حماۃ اور دمشق مسلمانوں کے زیر اقتدار تھے، عیسائیوں کے فوجی جتھے دیار بکر سے آمد تک اور جزیرہ سے نصیبین و راس العین تک لوٹ اور غارتگری پھیلائے ہوئے تھے، رقہ و حران کے لوگ ذلت و اہانت کے ساتھ اُن کا ساتھ دینے پر مجبور تھے، دمشق کا راستہ بند ہو گیا تھا، جو تجارتی قافلہ وہاں پہنچنا چاہتا تھا تو اسکو میدانوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھرے ہوئے ویرانوں سے گذرنا پڑتا جس میں عرب لٹیروں کی غارتگری کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا، رفتہ رفتہ فرنگیوں کا اثر اتنا بڑھ گیا کہ بڑے شہروں میں وہ زبردستی گھس کر خراج وصول کرتے تھے، ان کی جرأت کا یہ عالم تھا کہ دمشق کے عیسائی غلاموں کو یہ حق دلایا کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے آقاؤں کے پاس رہیں، چاہیں اپنے وطن و اہل و عیال کے پاس لوٹ جائیں، چنانچہ جس نے غلامی میں رہنا پسند کیا اس کو انہوں نے چھوڑ دیا، باقی سب کو آزاد کرا لے گئے، اس سے زیادہ مسلمانوں کی ذلت و سیاسی پستی کا اور کیا عالم ہوگا، حلب و حماۃ کے وہ حصہ دار ہو گئے تھے، ان کے علاوہ باقی ملک شام کی حالت اور بھی ابتر تھی[1]

اسی سیاسی زوال کے نتیجہ میں اخلاقی و مذہبی حالت بھی ابتر ہو چکی تھی، اخلاق و شجاعت کا

---

[1] تاریخ دولت اتابکیہ ابن الاثیر ص ۳۳ ـ ۳۹

اختلافات محض ذہنی و فکری میدانوں تک محدود نہیں تھا بلکہ اس کے مظاہر جنگ و جدال کی شکل میں پیدا ہو چکے تھے، اس کو ہوا دینے میں ان خفیہ تنظیموں اور خود غرض جماعتوں کا بھی ہاتھ تھا جو معاشی و سیاسی اسباب کی بنا پر اس وقت کے سیاسی نظام سے غیر مطمئن تھیں، یہ گروہ کبھی کبھی خود بھی متشددانہ رویہ اختیار کر لیتا تھا اور جہاں بھی موقع ملتا قتل و غارت برپا کرتا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت کے مسلمان سیاسی، معاشی اور اخلاقی تصادم و انتشار کے ہمہ جہت حملوں کا شکار ہو گئے۔

ایسے تاریک و ہمت شکن دور میں سلاجقہ کے غلاموں میں سے ایک نامور غلام آقسنقر کا بیٹا عماد الدین امید کی روشنی بنکر نمودار ہوا، اس نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا، سب سے پہلے ناکارہ اور بے جان چھوٹے چھوٹے سلاطین کو ختم کیا، اس کے بعد اندرونی سیاسی فضا کو ساز گار بنایا اور بڑی بہادری اور فیصلہ کن جرأت کے ساتھ صلیبیوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ صرف روکا بلکہ بقول لین پول "صلیبیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کا محافظ اور صلاح الدین کا صحیح معنوں میں پیش رو ثابت ہوا"[1]

اس خاندان نے سیاسی، تعلیمی، معاشی اور اخلاقی ہر میدان میں شاندار کارنامے انجام دیے، اسی گھرانے کے ایک زبردست حکمران نور الدین زنگی کے دو مشہور فوجی افسر شیر کوہ و صلاح الدین نے جو چچا بھتیجے تھے، اپنی فوجی قوت اور بے مثال جنگی مہارت سے یورپ کی متحدہ قوتوں کا بڑھتا ہوا سیلاب روک دیا، یہی زمانہ ہے جب عماد الدین کاتب الاصفہانی پیدا ہوا، اور اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔

اصفہانی کا نام محمد، باپ کا صفی الدین، عماد الدین لقب تھا، ۵۱۹ھ میں اصفہان میں پیدا ہوا،[2] مگر ابن الفوطی نے اپنی کتاب مجمع الآداب میں اس کو عربی النسل اور قریشی لکھا ہے[3]، اصفہان میں پیدائش کی وجہ سے بہت سے مورخین کو دھوکا ہوا کہ وہ ایرانی النسل ہے، بچپن اور

---

[1] Muhammadan dynasties Lane Pool. P162 ۲؎ طبقات الشافعیہ، السبکی ج ۴ ص ۹۷، وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۲ ص ۱۷۷، ۳؎ خریدۃ القصر وجریدۃ العصر، عماد الدین الاصفہانی، مرتبہ محمد بہجۃ الاثری ج ۱ ص ۹

ابتدائی حالات کے بارے میں مورخین خاموش ہیں، لیکن قیاس ہے کہ اس نے تقریباً ۱۵ سال اصفہان میں گذارے اور یہیں قرآن، حدیث، منطق، حساب اور فقہ وغیرہ کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔

عماد الدین کا گھرانہ شعر و ادب، علم و فضل اور دنیاوی وجاہت میں مشہور تھا، اسکے دادا شعر و ادب کے شیدا تھے، چچا بھی شاعر تھے، محمود بن محمد بن ملک شاہ سلجوقی کے وزیر اور اپنے دور کے نامور مدبر تھے، عماد الدین کا دوسرا بھائی تاج الدین خلیفۂ بغداد کا سفیر بن کر صلاح الدین کے دربار میں گیا تھا، عماد الدین کی ماں دولت سلجوقیہ کے نامور امیر امین الدین کی لڑکی تھی، عماد نے اپنے نانا کو دیکھا تھا۔

عماد الدین کی پرورش فارسی ماحول میں ہوئی۔ اس ماحول نے اس کو شعر و ادب کیجانب مائل کر دیا، پہلی دفعہ ۵۳۴ھ میں بغداد آیا اور حصول تعلیم کے بعد ۵۴۳ھ میں اصفہان واپس ہوا اور یہاں کے مشہور فقیہ خجندی اور ورکانی سے فقہ حاصل کی، ۵۴۶ھ میں وہ مستقل قیام کی غرض سے بغداد آگیا، اس دوسرے سفر میں اس نے نظامیہ کالج میں تعلیم کی تکمیل کی، اس وقت یہاں مشہور فقیہ و ادیب علی ابو منصور سعید بن رزاز درس و تدریس کے منصب پر فائز تھے، ان کی توجہ سے اصفہانی میں فقہ کا ذوق پیدا ہوا اور اختلافی مسائل میں گہری نظر اور نحو و ادب میں اچھی صلاحیت پیدا کی، حدیث میں ابو الحسن علی بن ہبۃ اللہ، ابو منصور محمد ابن عبد الملک بن جیرون، ابو المکارم مبارک بن علی سمرقندی اور ابو بکر احمد بن علی الاشقر جیسے اساتذۂ فن سے شرف تلمذ حاصل تھا، شعر و شاعری کا ذوق موروثی تھا، اس میں پختگی قیام بغداد کے زمانہ میں حاصل ہوئی، اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز تھا، فقہ شافعی سے متعلق ہونے کی بنا پر شافعی کہلایا۔

عماد الدین کے اساتذہ کی فہرست خاصی لمبی ہے، چند کے نام درج کیے جاتے ہیں:

القاسم ابن الحصین (۴۳۲ھ ۔ ۵۲۵ھ)، ابو عبداللہ الفراوی (۴۴۱ھ ۔ ۵۳۰ھ)، جمال الدین
بن الاخوۃ الشیبانی ، ابن بنا البغدادی (۴۵۳ھ ۔ ۵۳۱ھ) ابو البرکات نیشاپوری (۴۶۲ھ
۔ ۵۴۲ھ)، ابو الفتوح الاسفرائینی (۴۷۴ھ ۔ ۵۳۸ھ)، ابن عبدالسلام البغدادی (۴۵۱ھ
۔ ۵۳۹ھ)، ابو المکارم السندی (۴۵۳ھ ۔ ۵۴۴ھ)، ابن الصباغ (۵۲۲ھ) ابو المعالی الورکانی
(۵۵۹ھ)، یوسف الدمشقی (۵۶۳ھ)، زین الاسلام ابن الجزیری (۵۵۶ھ) ابو الفوارس التمیمی
(۵۴۴ھ)، ابن الحکیم ابن الاحمر التمیمی ، ابن ذی البراعتیق النظری، ابن عساکر (۴۹۹ھ ۔ ۵۷۱ھ)
ابو طاہر السلفی (۴۷۴ھ ۔ ۵۷۶ھ)، ابو زرعۃ المقدسی (۴۸۱ھ ۔ ۵۶۶ھ) ابن عوف
الزہری الاسکندرانی (۵۸۱ھ) ۔

عماد الدین نے اپنی عمر کا بہترین حصہ بغداد ہی میں گذارا، وہاں کی سنجیدہ علمی محفلوں میں اس کا نام عزت واحترام سے لیا جاتا تھا، اور اس کی جودت طبع اور ذہانت کی وجہ سے ان محفلوں میں اس کو نمایاں مقام حاصل تھا، اسی زمانہ میں اس کی شخصیت کا چرچا بغداد سے باہر دوسرے علمی مراکز میں بھی ہونے لگا تھا، اور حکمراں طبقوں میں بھی وہ معروف ہوگیا تھا،

عملی زندگی میں داخل ہونے سے پیشتر اس نے بیشتر اسلامی ملکوں کی سیاحت کی تھی اور ان کے اکابر علماء سے ملا تھا، صفدی نے لکھا ہے کہ عماد نے اسکندریہ میں سلفی سے روایت اور سماعت کیا۔[1] اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسکندریہ جاتے ہوئے اس نے موصل، دمشق اور عراق و شام کے دیگر شہروں میں قیام کیا ہوگا، جہاں اعلیٰ درجہ کے مدارس موجود تھے، ان میں بڑے بڑے علماء و فضلاء درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے، اسکندریہ سے واپسی میں مشہور وزیر عون الدین یحییٰ بن ہبیرہ سے ربط و ضبط پیدا ہوا، عون الدین چند ہی دنوں میں عماد کی

[1] معجم الادباء ۔ یاقوت حموی ۔ ج ۱۹ ص ۲۸ ۔ ۱۱ ۔ الوافی بالوفیات ، خلیل الصفدی ج ۱ ص ۱۴۵ ۔ ۱۳۲

صلاحیت اور شخصیت سے اتنا متاثر ہوا کہ اس کو بصرہ پھر بعد میں واسط کا منتظم مقرر کر دیا[1]، عماد الدین نے اس کی جانب اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے "میں مقتفی باللہ کے زمانہ میں بغداد آیا اور خلیفہ کی مدح میں سب سے پہلا قصیدہ لکھا، یہ وہ زمانہ تھا جب محمد شاہ نے بغداد سے محاصرہ اٹھا لیا تھا، اس وقت میں دربار سے وابستہ ہو گیا اور عون الدین ابن ہبیرہ نے مجھے اعلیٰ مناصب عطا کیے[2]، جب تک عون الدین زندہ رہا، عماد الدین عزت و خوشحالی سے زندگی بسر کرتا رہا، مگر اس کے انتقال کے بعد ہی آزمایش اور پریشانی میں مبتلا ہو گیا، عماد الدین اور اس کے تمام ساتھیوں کو قید میں ڈال دیا گیا، اور طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، یہ مستنجد باللہ کا زمانہ تھا، اس کے ایک اعلیٰ عہدہ دار عماد الدین بن عضد الدین بن رئیس الرؤساء سے عماد کے گہرے تعلقات تھے، عماد نے ایک پرزور قصیدہ لکھ کر خلیفہ سے رحم کی درخواست کی، جو افسر مذکور کی سفارش پر قبول ہوئی اور عماد چھوڑ دیا گیا، ساتھ ہی اس کا روزینہ بھی بڑھا دیا گیا[3]، اس کے باوجود عماد الدین خوش نہیں تھا، اسکے مخالفین آئے دن سازشیں اور ایذا رسانی کے طریقے اختیار کرتے رہتے تھے، معاشی سکون بھی حاصل نہیں تھا، تنگی و عسرت سے زندگی بسر ہوتی تھی، آخر کہاں تک تاب لاتا، مجبوراً بغداد چھوڑ کر دمشق کی راہ لی، ۵۶۲ھ میں دمشق پہنچا، اس زمانہ میں نور الدین کا ستارہ اوج کمال پر تھا، خوش قسمتی سے اس کے اردگرد لائق اور فرض شناس افسر اور منتظم جمع تھے، ان میں مشہور قاضی کمال الدین ابوالفضل محمد بن شہرزوری بھی تھے، ان کا تدبر اور معاملہ فہمی اس زمانہ میں مسلم تھی، نور الدین اگر صاحب شمشیر تھا، تو قاضی صاحب ہمہ صفت صاحب قلم، مدبر اور منتظم ریاست تھے، عماد الدین کی قابلیت اور ذہانت کا چرچا دور دور پھیل چکا تھا، اسی لیے جب وہ بغداد سے دمشق آیا، تو قاضی کمال الدین کے یہاں ٹھہرا، قاضی صاحب نے دمشق کے مشہور شافعی مدرسہ نوریہ میں تعظیم و تکریم کے ساتھ ٹھہرایا، کمال الدین

---

[1] الوافی بالوفیات صلاح الدین الصفدی ج ۱ ص ۱۳۲-۱۳۳۔ [2] خریدة القصر و جریدة العصر عماد الدین، القسم العراقی ص ۹۶-۹۹۔
[3] ایضاً ص ۱۶۷-۱۶۶

قاضی القضاۃ تھے، بڑے بڑے امراء، وزراء اور خود سلطان ان کا بڑا احترام کرتے تھے، زنگی مملکت میں عدلیہ کو بڑی اہمیت حاصل تھی، انصاف و عدل اس کا اعلیٰ نصب العین تھا، قاضی صاحب کے وسیلے اور عماد کی ذاتی شہرت ولیاقت کی وجہ سے اس کی بڑی پذیرائی ہوئی، حکمراں طبقہ سے عماد الدین کے خاندانی مراسم بھی تھے، نجم الدین ابوالشکر ایوب اور اسد الدین شیرکوہ نے پرانے تعلقات کو یاد رکھا تھا، نجم الدین قلعہ تکریت کا والی تھا، سلطان محمود بن محمد بن ملکشاہ نے عماد الدین کے چچا احمد بن حامد کو اسی قلعہ میں قید کردیا تھا، نجم الدین نے ازراہِ انسانیت احمد کو بچانے کی بڑی کوشش کی تھی، مگر کامیابی نہیں ہوئی تھی[1]، اس لیے بھی عماد الدین سے لوگ واقف تھے، جب اس کے آنے کی اطلاع نجم الدین کو ملی تو وہ فوراً ملاقات کے لیے آیا، عماد الدین نے اس عزت افزائی کے شکرانے میں ایک پرزور قصیدہ لکھکر اس کی خدمت میں پیش کیا[2]۔

قاضی کمال الدین نے سلطان نورالدین سے عماد الدین کی بڑی تعریف کی، اس کے علم وفضل اور انشاء پردازی کا پرزور الفاظ میں تذکرہ کیا، چنانچہ سلطان نے عماد الدین کو دیوان الانشاء میں ملازمت کی پیشکش کی[3]، پہلے اس کو قبول کرنے میں جھجھک محسوس ہوئی، وہ خود لکھتا ہے[4]

"میں اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہوئے پس وپیش میں تھا، کیونکہ یہ کام بالکل نیا تھا، مگر یہ پس وپیش ایک نوآموز کی نفسیاتی کیفیت تھی، ورنہ اس کی اہلیت مسلم تھی، چنانچہ جب اس کام کو شروع کیا تو بڑی خوش اسلوبی اور کامیابی سے اس کو انجام دیا، وہ عربی زبان کا ادیب وانشاء پرداز تو تھا ہی، فارسی پر بھی یکساں قدرت حاصل تھی[5]، چنانچہ اس نے چند دنوں میں اپنی قابلیت، حسن خدمت اور حسن معاملگی سے سلطان کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اس کے

---

[1] مرآۃ الزمان فی تاریخ الاعیان، ج۸۔۱ ص ۲۴۰، حیدرآباد ایڈیشن [2] ایضاً ج ۸ ص ۲۲۶
[3] اعلام خیرالدین زرکلی، ج ۶، ص ۲۴۴۔۲۵۳ [4] وفیات الاعیان، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۳۵
[5] معجم الادباء، یاقوت الحموی ج ۱۹ ص ۱۳۔

بڑا اعتماد کرنے لگا، اہم ملکی امور میں اس سے مشورہ کر لیتا تھا، اسی اعتماد کی بنا پر اس کو مستنجد باللہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا، اور جب عماد الدین بغداد سے واپس آیا تو نور الدین نے اس کو مدرسۂ نوریہ میں منصب درس پر مامور کیا، غالباً یہ ۵۶۷ھ کا زمانہ تھا، مگر حموی کا خیال ہے کہ ۵۶۵ھ میں مدرسہ میں مامور ہوا اور ۵۶۶ھ میں دیوان اشراف میں تقرر ہوا،

یہی زمانہ ہے کہ جب صلاح الدین ایوبی سلطنت نوریہ کے ایک ممتاز فوجی افسر کی حیثیت سے منظر عام پر آیا تھا، اس سے عماد الدین کے مراسم پیدا ہو گئے جو رفتہ رفتہ گہری دوستی میں بدل گئے اور دونوں میں باہم بڑا اعتماد پیدا ہو گیا، اور عماد الدین بڑی مسرور و مطمئن زندگی بسر کرنے لگا، اسی اثنا میں نور الدین کا انتقال ہو گیا، اس حادثہ نے عماد کے مستقبل پر دور رس اثرات چھوڑے۔

نور الدین کے انتقال کے بعد اس کا لڑکا ملک الصالح اسمٰعیل جانشین ہوا، اس وقت وہ بہت کمسن تھا، اس کی کم عمری سے فائدہ اٹھا کر امراء کی ایک جماعت اس پر حاوی ہو گئی، اور سلطان ذہنی ناپختگی کی وجہ سے ان کا آلۂ کار بن گیا، اور امراء کی وہ جماعت جو نور الدین کے زمانہ ہی سے عماد الدین سے حسد رکھتی تھی، مگر بے بس تھی، اب سامنے آگئی، اس نے عماد الدین کو تنگ کرنا شروع کر دیا، جب اس سے مطلب برآری نہیں ہوئی تو ڈرانا اور دھمکانا شروع کر دیا، آخر میں عماد الدین نے مجبور ہو کر دمشق چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا، اور بغداد کے ارادہ سے وہ موصل پہنچا، یہاں کے دوران قیام میں سخت بیمار پڑا، مگر حیات باقی تھی، اور خدا کو اس سے کام لینا منظور تھا، اس لیے صحتیاب ہو گیا، موصل ہی میں اس کو پتہ چلا کہ صلاح الدین مصر سے دمشق پر قبضہ کی غرض سے روانہ ہو چکا ہے، یہ خبر امید نو کا پیام ثابت ہوئی، وہ بغداد کا ارادہ ترک کر کے ۵۷۰ھ میں شام لوٹ آیا، دمشق پہنچ کر معلوم ہوا کہ صلاح الدین حلب میں مقیم ہے، اس لیے حلب جا کر صلاح الدین سے ملاقات کی، صلاح الدین اس سے مل کر بہت خوش ہوا اور اس کی قدر افزائی کی اور اس کو

صلاحیت سے بہت متاثر ہوا، عماد الدین نے اس کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جس کے چند اشعار عمومی نے مجموعہ دل میں نقل کیے ہیں، اس کے بعد وہ دیا وہتر صلاح الدین کے ساتھ رہنے لگا، سلطان جہاں بھی جاتا عماد الدین کو اپنے ساتھ لیجاتا، اور کبھی کبھی اس سے سکریٹری کا کام لینے لگا، ایک مرتبہ قاضی فاضل نے سلطان سے عرض کیا آپکے پاس عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی خطوط آتے ہیں، جس سے مشکل پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس کو حل کرنے کے لیے عماد الدین بہت موزوں ہیں، صلاح الدین نے جواب دیا میں تمھیں کیسے چھوڑ دوں تم میرے وزیر اور سکریٹری ہو تمھاری ذات میں مجھے برکت نظر آتی ہے، اگر میں کسی اور کو مقرر کر دوں تو دنیا کیا کہے گی، قاضی نے کہا کہ ترجموں کا معاملہ اہم ہے، اکثر میں غائب بھی رہتا ہوں، میری عدم موجودگی میں عماد الدین حسن و خوبی میری قائم مقامی کر سکیں گے، آپ نے سلطنت نوریہ میں ان کو قریب سے دیکھا ہے، اس لیے میری رائے ہے کہ سکریٹری کا عہدہ انھیں سونپ دیجئے، اس مشورہ اور عماد کی مسلمہ صلاحیت کی بنا پر وہ نہ صرف سکریٹری کے عہدہ پر مامور بلکہ معتمد وزارت کے عہدہ پر بھی ممتاز ہوا، جب کبھی قاضی الفاضل ملک کے باہر جاتے تو عماد الدین ان کی نیابت کرتا تھا، اس عہدہ کی وجہ سے صلاح الدین کے امرا اور مصاحبین اس کا بڑا لحاظ کرتے تھے، وزیر اعظم قاضی الفاضل عماد الدین کی ذہانت و فطانت کے بڑے معترف تھے، اس لیے بڑی شان و شوکت کے ساتھ صلاح کے عہد میں چند سال گذرے، مگر سنہ ۱۱۹۳ء میں صلاح الدین کے انتقال کے بعد عماد کا ستارہ پھر گردش میں آگیا اور وہ پریشانیوں میں مبتلا ہو گیا،

صلاح الدین کی موت کے بعد اس کی مملکت اس کے بیٹوں میں بٹ گئی، عزیز کو مصر کا علاقہ ملا اور افضل کو شام کا، عماد الدین نے کوشش کی کہ افضل کے یہاں رسوخ حاصل کر کے اپنی

لہ القاضی فاضل، ڈاکٹر احمد البدوی ص ۲۱ ؎ Saladin Prince of chivalry

عزت و اقتدار کو بحال کرلے، مگر کامیابی نہیں ہوئی، اس نے اپنے مشہور رسالہ "العتبی و العقبیٰ" میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ جب سلطان کا انتقال ہوا اور اس کی اولاد اس کی جانشین ہوئی تو مصر میں عزیز نے اپنے باپ کے مصاحبین اور وزرا کو اپنی عزت و احترام سے اپنے سابق عہدوں پر برقرار رکھا، ان کی ہر طرح قدر دانی کی، اس کے مقابلہ میں افضل نے تمام وزرا، مصاحبین اور اعلیٰ حکام کو برطرف کرنا شروع کردیا، افضل نے یہ طرز عمل محض چند لوگوں خاص طور پر ضیاء الدین ابن الاثیر کے اشارہ پر اختیار کیا تھا، ضیاء الدین ہی کے ایماء پر صلاح الدین کا مایۂ ناز وزیر قاضی الفاضل دمشق چھوڑنے پر مجبور ہوا۔

جب عماد الدین کو افضل کے یہاں کامیابی نہیں ہوئی تو وہ مصر گیا، افضل نے اتنی مہربانی کی تھی کہ اس کو ایک سفارشی خط اپنے بھائی عزیز کے نام دیدیا تھا، عزیز کو اپنے بھائی افضل کی سیاست سے اتفاق نہیں تھا، اس لیے صلاح الدین کے امرا اور علما نے عزیز کو آمادہ کیا کہ سلطنت کی تقسیم مناسب نہیں ہے، اس کے استحکام کے لیے پھر دونوں کو متحد کرنا ضروری ہے، چنانچہ عزیز اور اس کے چچا عادل نے ۵۹۲ھ میں افضل پر فوجکشی کی، دونوں میں شدید جنگ ہوئی عزیز نے افضل کو شکست دے کر دمشق پر قبضہ کرلیا اور افضل اور اس کے وزیر ضیاء الدین دونوں کو نکال دیا، اور اپنے چچا عادل کو دمشق کا والی مقرر کیا، اس کے بعد عادل کا لڑکا معظم جانشین ہوا، عماد الدین ان دونوں کے ساتھ رہا اور تصنیف و تالیف کرتا رہا، کچھ عرصے کے بعد محمد بن ملک العادل کے ہمراہ مصر آیا، اسی دوران میں مصر میں زبردست قحط پڑ گیا، ہزاروں انسان بھوکوں مرنے لگے بہت سے لوگ ملک چھوڑ کر آس پاس کے ملکوں میں چلے گئے، کچھ لوگوں نے حجاز و شام کی راہ لی ان ہی میں عماد الدین بھی تھا، وہ دمشق چلا آیا۔

عماد الدین قحط کے منہ سے نکلا تھا کہ ۵۹۷ھ میں ایک زبردست زلزلہ آیا، اس نے آذربیجان

سے لیکر مصر تک ہلاکر رکھ دیا، سینکڑوں شہر تباہ ہوگئے، جان و مال کا بے حد نقصان ہوا، اس تباہی کا تذکرہ بیشتر مورخین نے کیا ہے، اس وقت عماد الدین کی عمر ۰ ۷ سال کی تھی ان آفات ارضی و سماوی نے اس پر گہرا اثر ڈالا، اور بڑھاپے اور ان خارجی موثرات نے اسے بیمار کردیا، اور ۵۹۷ھ میں بڑی غمگینی و مایوسی کی حالت میں اس دنیا سے چل بسا، اس کو دمشق کے مقبرہ صوفیہ میں دفن کیا گیا، عماد الدین کے انتقال سے چند مہینے پہلے قاضی الفاضل کا بھی انتقال ہو چکا تھا، عماد الدین کے ایک لڑکے کا ابن شداد نے ذکر کیا ہے، اور اس کا نام عزیز الدین لکھتا ہے، اس کی اولاد میں شیخ شرف الدین آٹھویں صدی میں بڑے عالم گذرے ہیں،

عماد الدین نے کئی مفید کتابیں تصنیف کی تھیں، ان میں سے بعض چھپ چکی ہیں بعض ابھی غیر مطبوعہ ہیں، ایک کتاب کا نام "خریدۃ القصر وجریدۃ العصر" ہے، یہ کتاب شعر و ادب کی ہے، اور اسے ہم تذکرۂ شعراء کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں، یہ دس جلدوں میں ہے، اس کتاب میں ان شعراء کا کلام اور مختصر حال درج ہے جو ۵۰۰ھ اور ۵۷۰ھ کے درمیان، شام، عراق، جزیرہ، مغرب اور ایران میں گذرے ہیں، اس طرح اس دور کے بہت سے شعراء کے حالات محفوظ ہو گئے، اور ان کے کلام کے منتخب نمونے ہم تک پہنچ سکے، جو عماد الدین کا عربی ادب پر بڑا احسان ہے، شعرائے شام کا حصہ ڈاکٹر شکری فیصل نے اڈٹ کرکے ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع کیا ہے، مصر، صقلیہ، مغرب، اور اندلس کے شعراء کا حصہ احمد امین اور شوقی ضیف وغیرہ نے اڈٹ کرکے دو جلدوں میں مصر سے طبع کرایا ہے،

دوسری کتاب "الفتح القسی فی الفتح القدسی" ہے، یہ کتاب ان جنگوں کے حالات پر مشتمل ہے جو ۵۸۳ھ سے لیکر ۵۸۹ھ کے دوران صلیبیوں اور صلاح الدین ایوبی میں ہوئیں، اس میں بیت المقدس کی فتح کا تفصیلی

۱؎ البدایۃ والنہایۃ، حافظ ابن کثیر ج ۱۳ ص ۳۱، ۳۰۰، [illegible]، مفتاح السعادۃ ج ۱ ص ۲۱۵، ۲۱۳، [illegible] ذہبی ج ۵ ص ۹۹، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین، ابو شامہ ج ۲ ص ۲۲۵، کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین، ابو شامہ ج ۵ ص ۲۲۲

صیدا، بیروت، بیت المقدس کی لڑائیوں وغیرہ کے مشاہدات مندرج ہیں، یہ کتاب [illegible] سے بہت ہی اہم ہے کہ اس میں مصنف نے آنکھوں دیکھا حال قلمبند کیا ہے، اس کتاب کے متعدد قلمی نسخے یورپ اور ایشیا کے کتب خانوں میں موجود ہیں، بروکلمان نے اس کا ذکر کیا ہے۱؎، اس کتاب کا غالباً پہلا اڈیشن ۱۳۲۱ھ میں مطبع موسوعات سے اور دوسرا مطبع خیریہ سے ۱۳۲۲ھ میں شائع ہوا۔

تیسری کتاب البرق الشامی ہے، اس کتاب کے ناقص مخطوطات متعدد لائبریریوں میں موجود ہیں، یہ کتاب اس زمانہ کے تاریخی معاملات پر مشتمل ہے جب عماد الدین، نور الدین و صلاح الدین سے منسلک تھا، یہ کتاب سات جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس کتاب کا پانچواں حصہ جو ۵۷۳ھ ۵۷۵ھ (۱۱۷۷ء – ۱۱۸۰ء) کے حالات پر مشتمل ہے، بوڈلیان، آکسفورڈ میں موجود ہے، اس کا انتخاب لائیڈن میں بھی ملتا ہے، اس کا نمبر ۹۹۶ – ۸۲۴ ہے، بہجۃ الاثری نے اس کا عکسی نسخہ مجمع العلمی العربی دمشق میں دیکھا ہے جس کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے: "ذکر العزم علی قصد حلب وعبور الفرات الی بلاد الجزیرۃ والاستیلاء علیہا والنزول علی الموصل والعود الی سنجار وأخذہا سنۃ ۵۷۸ھ" یہ ۳۱۶ اوراق یعنی ۶۳۲ صفحات پر مشتمل ہے،

چوتھی کتاب "السیل علی الذیل" ہے، اس کتاب کو بعض مورخین خطیب کی تاریخ بغداد کا ضمیمہ بتاتے ہیں، جو اس نے ابن السمعانی کے ضمیمہ پر لکھا تھا، مگر حموی اور صفدی دونوں کا خیال ہے کہ یہ کتاب خود اس کی تصنیف "خریدۃ القصر وجریدۃ العصر" کا ضمیمہ ہے،

پانچویں کتاب "نصرۃ الفترۃ وعصرۃ الفطرۃ" ہے، یہ کتاب سلجوق خاندان کی تاریخ ہے، [illegible] کا خلاصہ فتح بن علی البنداری نے "زبدۃ النصرۃ ونخبۃ العصرۃ" کے نام سے کیا ہے، جو تاریخ آل سلجوق کے نام سے چھپ گئی ہے، فتح بن علی نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "عماد کی کتاب عبارت [illegible]

۱؎ Brockelmann, vol I/548 [illegible] اسلام۔ خیر الدین زرکلی [illegible]

اتنی طویل ہوگئی تھی کہ اصل مواد کو تلاش کرنا مشکل تھا، اس لیے اس کا خلاصہ کرنا پڑا،[1] بنداری نے اصل متن کی نشاندہی کی ہے،[2] اس کتاب کا ذکر ابن خلکان، یاقوت الحموی نے بھی کیا ہے،

صفدی نے عماد کی بعض اور تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے، مثلاً کتاب "خطفۃ البارق وعطفۃ الشارق"، "کتاب عتبی الزمان فی عقب الحدثان" اور "نحلۃ الرحلۃ وحلیۃ العطلۃ"۔ صفدی نے انھیں علیٰحدہ علیٰحدہ کتاب تسلیم کیا ہے، مگر ابو شامہ نے "کتاب عتبی الزمان فی عقب الحدثان" کو "البرق الشامی" کا ایک حصہ قرار دیا ہے، اور ایک رسالہ کی حیثیت سے اس کا ذکر کیا ہے، ابو شامہ نے عماد الدین کے بعض تراجم کا بھی تذکرہ کیا ہے، چنانچہ لکھا ہے کہ امام غزالی کی کتاب "کیمیائے سعادت" کا عربی ترجمہ اس نے کیا تھا، ۵۵۶ھ میں اس ترجمہ سے فراغت ہوئی تھی،[3] ایک اور کتاب "فتور الزمان وصدور زمان الفتور" کا بھی ترجمہ کیا تھا، اس کا مصنف وزیر انوشروان بن خالد تھا، یہ تاریخ کی کتاب ہے، اس میں نظام الملک کے درمیانی عہد سے لیکر طغرل بن محمد بن ملک شاہ کے دور تک کے حالات ہیں،[4] اس کتاب کا ایک نسخہ بوڈلین میں موجود ہے، اس کا نمبر ۷۶۲ اور پیرس والے نسخہ کا نمبر ۲۱۴۵ ہے۔

مذکورہ کتب کے علاوہ عماد الدین کے خطوط و رسائل کا بڑا ذخیرہ ہے جسے جمع کیا جائے تو کئی جلدوں میں آئیں گے، یہ خطوط اس دور کے سماجی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی ماحول کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتے ہیں، ان کے ذریعہ ایسے گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے جو ہمارے لیے نئے ہوں گے،

عماد الدین بحیثیت مورخ عماد الدین ان مورخین کی صف میں شامل ہے جنھوں نے علاقائی اور خاندانی تاریخ مرتب کی ہے، اسے سوانح نگاروں کی صف میں بھی شامل کیا جا سکتا ہے، اس کی تاریخی کتابیں

---

[1] کتاب تاریخ دولۃ آل سلجوق، تاریخ ابن علی البنداری ص ۲ [2] Brockelmann, S. I/548

[3] کتاب الروضتین، ابو شامہ ج ۲ ص ۱۱ [4] ایضاً ج ۲ ص ۱۲۲ و ۱۱۱

شخصیت، عہد اور کسی مخصوص علاقہ کے سیاسی حالات سے متعلق ہیں، اس لیے اس کو ان مسلم مورخین کے زمرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا جو عالمی تاریخ نگار کہے جاتے ہیں، اگرچہ محدود معنوں ہی میں سہی، اس کی مورخ کی حیثیت پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا عماد الدین کا کوئی نظریۂ تاریخ بھی تھا، اور وہ علم تاریخ کو دیگر علوم میں کیا مقام دیتا تھا؟ پہلے سوال کے جواب میں فتح القسی ہماری رہنمائی کرتی ہے، عماد الدین نے اس کتاب میں تاریخ کے بارے میں چند باتیں کہی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو تاریخ کے بارے میں عماد الدین کے تصور کا استخراج ہوسکتا ہے، مثلاً وہ فتح القسی میں لکھتا ہے: "اگر تاریخ نہ ہوتی تو سیاست کے مساعی فاضلہ ضائع ہوجاتے اور اچھی بری اشیا میں تمیز کرنا مشکل ہوجاتا۔"[1] یہ عبارت اگرچہ براہ راست تاریخ کا تصور پیش نہیں کرتی، لیکن بالواسطہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ عماد الدین تاریخ کو انسانی قوت تخلیق کا مظہر سمجھتا تھا، اور اس کا خیال تھا کہ تاریخ سیاست کے تدبر سے وجود میں آتی ہے، اصحاب سیاست جس طرح حکومت چلاتے ہیں وہی تاریخ بنجاتی ہے، اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ تاریخ انسانی کو انفرادی قوتوں کا کرشمہ سمجھتا ہے، یعنی چند اشخاص ہی تاریخ پیدا کرتے ہیں، تاریخ کا یہ تصور مارکس سے پہلے مستند مانا جاتا تھا، اور جو آج بھی قدیم مورخین کے یہاں مقبول ہے۔

اس تاریخی تصور سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ عماد الدین تاریخ کا وہ تصور نہیں رکھتا تھا جو عہد وسطیٰ کے مسیحی مورخین کے ذہن میں تھا، انکا خیال تھا کہ تاریخ مشیت ایزدی کا مظہر ہے، خدا کا ارادہ مادی شکل میں آنے کے لیے انسان کو بطور آلہ کے استعمال کرتا ہے، یعنی انسان مشیت ایزدی کے ہاتھوں میں جکڑا ہوا ہے، اس کے اپنے ارادہ اور خواہش کا کوئی دخل نہیں، طبری نے اپنی تاریخ کے مقدمہ میں اسی تصور کی تائید کی ہے، اس کے برخلاف ابن الاثیر کے یہاں تاریخ

---

[1] الفتح القسی فی فتح القدسی ص ۵،

ارضی تصور رکھتا ہے، اس نے تاریخ کا رشتہ انسان کی فکری جد و جہد اور تخلیقی قوتوں سے جوڑا ہے، یہی فکر عماد الدین کے ذہن میں بھی ہے، سخاوی نے عماد الدین کو ان مورخین میں شامل کیا ہے، جو تاریخ کے بارے میں اپنا ایک نظریہ رکھتے تھے۔[1]

عماد کی منقولۂ بالا عبارت سے یہ بات خاص طور سے واضح ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کو دیگر علوم کی طرح ایک مفید علم سمجھتا تھا، کیونکہ یہ علم اچھے برے میں تمیز کرنا سکھاتا ہے، ماضی کے واقعات کا علم حال میں صحیح و غلط، مفید و غیر مفید اشیاء کے درمیان فرق کرنا سکھاتا ہے،

مورخ کی صفت یہ ہونی چاہیے کہ وہ واقعات کی تدوین میں صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے، اس کی پوری کوشش کرے کہ اس کے بیانات سچے ہوں، کسی غلط محرک کا شکار نہ ہو، گروہی، نسلی، علاقائی، مذہبی اور خاندانی تعصبات سے بالاتر ہو کر واقعات کی تحقیق اور اسکو قلمبند کرے، عماد الدین نے اپنی کتابوں میں اس اصول کو پیش نظر رکھا ہے، اور اس کو برتنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ لکھتا ہے، کہ میں نے مشاہدہ کے بعد واقعات قلم بند کیے ہیں، سبھی باتوں کو لیا ہے اور حق و صحت کو اپنایا ہے[2] لیکن اس دعوی کے باوجود وہ واقعات کی تحقیق میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوا ہے، اسکا ثبوت اس جنگ کے واقعات ہیں جو صلاح الدین اور سیف الدین کے درمیان ہوئی تھی، ابن الاثیر نے تعداد کی تردید کی ہے جو عماد الدین نے بیان کی ہے، مگر بحیثیت مجموعی عماد الدین کے بیانات باوثوق اور قابل اعتبار ہیں، چنانچہ خود ابن الاثیر نے بعض مواقع پر عماد الدین کی کتابوں کو بطور سند پیش کیا ہے۔

عماد الدین کا پیرایۂ بیان تاریخ کے لیے موزوں نہیں ہے، تاریخی واقعات کو لکھنے کے لیے جس سہل زبان اور سادہ اسلوب کی ضرورت ہے وہ اس کی تحریروں میں نہیں ملتا، وہ بہت

---

[1] سخاوی، الاعلان بالتوبیخ لمن ذم التاریخ ص ۴۷۴۔۴۷۵ مرتبہ الیف اوز نتھال

[2] الفتح القسی فی فتح القدسی ص ۹

مغلق، بلیغ اور مرصع عبارت لکھتا ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے بجائے ادب کی کتاب ہے، عبارت آرائی کی وجہ سے مفہوم اور معنی کہیں کہیں خبط اور مبہم ہو گئے ہیں، اور تاریخی واقعات میں مبالغہ کا رنگ آگیا ہے، مگر اس دور کے دوسرے مورخین اس اسلوب سے متاثر نہیں ہوئے، مثلاً ابن القلانسی کی تاریخ دمشق، حموی کی ارشاد الادیب، ابن الاثیر کی الکامل اور ابن خلکان کی وفیات الاعیان کی زبان عام فہم سلیس اور متین ہے، بالخصوص الکامل کی سادگی قابل تعریف ہے،

عماد الدین بہت بڑا ادیب تھا، عربی انشاء پر اس کو بڑی قدرت حاصل تھی، اسکی ایک نمایاں خصوصیت جدت طبع اور تخیل کی فراوانی ہے، ان دونوں نے اسکی تحریروں میں بڑی ندرت اور خوبی پیدا کر دی ہے، ایک خط میں قاضی الفاضل لکھتا ہے "اس رسالہ میں صنعت تجنیس سے کام لیا ہے اور تطبیق، ترصیع، مقابلہ، موازنہ اور توشیح کا بھی استعمال کیا ہے" اس سے ادب انشاء پر اسکی قدرت اور اسکے اسلوب بیان پر روشنی پڑتی ہے، ان خصوصیات کا عکس اسکے تمام نثری سرمایہ میں نظر آتا ہے، خواہ وہ کسی موضوع سے متعلق ہو، تاریخ کے علاوہ ادبی موضوعات میں یہ طرز اس زمانے کے مذاق کو دیکھتے ہوئے مذموم نہیں کہا جا سکتا، اس دور کے تمام ادباء جو سکریٹری اور وزراء کے عہدوں پر فائز تھے انکی ٹکسال میں یہی زبان معتبر تھی، خود قاضی فاضل جیسا بے مثل ادیب جسکا عماد الدین کی آثار پر گہرا اثر ہے اس طرز تحریر کا زبردست علمبردار ہے، مرصع اور مترنم زبان لکھنے والے ادباء میں عماد الدین کا نام خاص طور پر مستحق ذکر ہے۔

عماد الدین شاعر بھی تھا، اسکو ددھیال اور ننھیال دونوں طرف سے شاعرانہ ذوق ورثہ میں ملا تھا، اسکی شاعری کے نمونے "خریدۃ القصر وجریدۃ العصر" میں ہیں، ان سے عماد الدین کے قدرت کلام، جودت طبع، حسن فکر اور تخیل کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے، اسکے علیحدہ دیوان کا پتہ نہیں چلتا، عماد الدین نے سیکڑوں رسائل مختلف موضوعات پر تحریر کیے ہیں جو ابتک غیر مرتب شکل میں پڑے ہیں، یہ رسائل تنہا ادبی حیثیت ہی کے حامل نہیں ہیں بلکہ ان کے منظر عام پر آنے سے اس دور کے بہت اہم اور دلچسپ گوشوں پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

معین بن محمود کشمیری

اور

ان کی تصانیف

(صحیح بخاری کا ایک نادر نسخہ)

از جناب مولوی حکیم قاضی محمد عمران خاں صاحب قضاۃ بائے سعیدیہ شرکت لائبریری ٹونک

صحیح البخاری، اصح الکتب بعد کتاب اللہ کا درجہ رکھتی ہے، اس کو امت میں وہ مقبولیت حاصل ہوئی جس کی دوسری نظیر نہیں ملتی، ہر زمانہ میں یہ کتاب مقبول و متداول رہی، چنانچہ ہر دور اور ہر صدی کے لکھے ہوئے اس کے بیشمار نسخے ہر علاقہ میں پائے جاتے ہیں،

پیش نظر نسخہ صحیح البخاری کا ایک اہم اور نادر نسخہ ہے، جو ابتدائے کتاب سے کتاب المناقب تک ہے، تقطیع متوسط، خط جلی، واضح، صاف، ۴۰۰ ورقوں پر مشتمل ہے، ورق ۱۳۲ تک مجدول، طلائی و شنجرفی، لوح کتاب مطلی و مینا کار آسمانی، جدول پر کیس کا اس قدر اثر ہو گیا ہے کہ حاشیہ جوض سے جگہ جگہ علیحدہ ہو چکا ہے، اور اس کی مرمت کی گئی ہے، ورق ۱۳۲ سے آخر کتاب تک کا حصہ غیر مجدول اور کسی دوسرے کاتب کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اول سے آخر تک محشّٰی ہے، اور حاشیہ اسی خط میں ہے جو مجدول حصہ کا خط ہے،

اس نسخہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے کاتب کشمیر کے مشہور عالم خواجہ معین الدین خاوند محمود بن خاوند ہیں، جو اپنے دور کے مشہور عالم اور مشائخ نقشبندیہ میں بلند مرتبہ کے مالک تھے، صاحب ثمار روضۃ الاصفیاء لکھتے ہیں

"از خلفائے مشائخ و کبرائے علمائے کشمیر جنت نظیر است، در زہد و ورع و تقوی و اتباع سنت و ترویج نسبت و ترفیع بدعت، ثانی نداشت و در ہمہ علما، و فضلائے وقت تحریر و تقریرش مقبول و مشائخ عظام و علمائے کرام را رجوع تمام بخدمتِ وے بود"

مولانا عبدالحئی صاحب لکھنوی "نزہتہ الخواطر" میں تحریر فرماتے ہیں:

"احد المشائخ النقشبندية والفقهاء الحنفية ...... تولى المشيخة بها (كشمير) وصار مرجعاً اليه في المذهب والفتوى وانقاد العلماء لأوامره وخضعوا له"

تاریخ کشمیر اعظمی میں ہے:

"فی الواقع تزئین خانقاہ (پدر خود) و ترویج سلسلہ و تنظیم علم و علما، بسیار نمود، باوجود صفائی معنوی لقائی صوری بکمال داشتند، حسن الوجہ و احسن الاطلاق بود"

خواجہ معین الدین کشمیر میں پیدا ہوئے، وہیں تربیت پائی، اپنے والد سے علوم حاصل کیے، پھر دہلی جاکر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے شاگرد ہوئے اور حصول تعلیم کے بعد کشمیر واپس آئے، آپکے والد عارف کبیر خاوند محمود کبار مشائخ نقشبندیہ میں تھے، بخارا کے رہنے والے تھے، ہندوستان آکر کشمیر میں مقیم ہوئے، لاہور، دہلی، آگرہ ان کی آمد و رفت رہتی تھی، سلاطین دہلی اور امرائے وقت کی نظر میں نہایت معزز اور محترم تھے، ہزاروں آدمی آپ سے بیعت ہوئے، جب خاوند محمود نے بادشاہ شاہجہاں کے ایماء[1] سے کشمیر کی سکونت ترک کرکے لاہور میں قیام اختیار کیا تو اپنے صاحبزادے خواجہ معین الدین کو لاہور سے کشمیر بھیجدیا، تاکہ وہاں کی خانقاہ سنبھالیں اور رشد و ہدایت کی خدمت انجام دیں، خاوند محمود کا انتقال ۱۲ رشعبان ۱۰۵۲ھ کو لاہور میں ہوا،

---

[1] خزینۃ الاصفیاء

اور وہیں شہر سے جانب شرق شالامار باغ سے متصل آپ کا مزار واقع ہے[1]، خواجہ معین الدین کا انتقال کشمیر میں محرم ۱۰۸۵ھ میں ہوا، ان کا مزار آج تک زیارت گاہ خلائق ہے[2]،

صحیح البخاری کے اس نسخہ کے شروع میں شیخ الکل مولانا عبد الحق صاحب محدث دہلوی (۹۵۸ھ تا ۱۰۵۲ھ) کا رسالہ "تحقیق الاشارۃ الی تعمیم البشارۃ" شامل ہے، یہ رسالہ بھی مولانا معین الدین بن محمود کے قلم کا لکھا ہوا ہے، جس کی کتابت ۱۰۵۹ھ میں ہوئی ہے، اس کا طلائی جدول بھی ان ہی کی قلم کاری کا نمونہ ہے، قدرے محشی بھی ہے، رسالہ کے آخر میں کاتب نے تاریخ کتابت کے ساتھ اپنا پورا نسب نامہ بھی لکھا ہے، یہی شجرہ انھوں نے اپنی مصنفہ کتاب شرح القرآن میں بھی تحریر کیا ہے، نسب کا طویل حصہ چھوڑ کر تاریخ کتابت کے سلسلہ کا نوٹ یہ ہے:

"قد وقع الفراغ بعون اللّٰہ الکریم وفضلہ العمیم من تسوید ھذہ الرسالۃ الشریفۃ المبارکۃ المیمونۃ فی سلخ ربیع الاول یوم الاثنین فی وقت الضحی فی شھور سنۃ الف وتسع وخمسین بید احقر عباد اللّٰہ واضعف عبید اللّٰہ معین الدین خاوند بن حضرۃ قدوۃ الواصلین وزبدۃ العارفین قطب الارشاد حضرت خواجہ خاوند محمود نور اللّٰہ مرقدہ"...... الخ

یہ رسالہ بھی مجدول طلائی و شنجرفی اور اس کی لوح مطلی و مینا کار آسمانی ہے، رسالہ کے شروع میں ایک نوٹ ہے جس کی ابتدائی عبارت قدرے محو شدہ ہے، باقی کی عبارت یہ ہے:

"کاتب السطر نظام الدین محمد شاہ بن شیخ الاسلام مولوی قوام الدین محمد المفتی بن شیخ الاسلام السعید مولوی معز الدین امان اللّٰہ الشہید علیہ الرحمۃ من اللّٰہ المجید بن مولانا خیر الدین ابو الخیر، اللّٰھم اختم

---

[1] خزینۃ الاصفیاء، [2] ایضاً

بالخیر وارفع عنا شئالغیر برحمتك یا ارحم الراحمین وصلی اللہ علی خیر خلقه وآله اجمعین"

اس عبارت کے تحت میں ایک دوسرے خط سے یہ نوٹ دیا ہوا ہے :

قد اخذ جدی خیر القراء عن استاذہ مولانا محمد امین امنه اللہ یوم
الجزاء عن ملا محمد افضل بن خواجه حمید عن مولف الرسالة الشیخ المطلق
الشیخ عبد الحق نور اللہ تربته وقد اخذ مولانا خیر الدین عن مولانا محمد طیب
بن مولانا محمد حمید بن فیروز الکشمیری الچرخی"

مولانا معین الدین نے "صحیح البخاری" کے اس نسخہ کی کتابت مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں وقف کرنے کی نیت سے کی تھی لیکن وہ صرف ابتدائی ۱۳۱ ورق اپنے قلم سے لکھ سکے، اس کا جدول تیار کیا، رسالہ تحقیق الاشارہ لکھا اور اس کا جدول تیار کیا، باقی حصہ کی کتابت خود نہیں کرسکے، کسی دوسرے کاتب سے لکھوایا لیکن اول سے آخر تک حاشیہ اپنے قلم سے لکھا، محشی میں شروح بخاری اور لغات ورجال کی کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے، کتاب کے آخر میں ان کی مہر ثبت ہے، جو مدور ہے، اور اس میں ذیل کی عبارت کندہ ہے :

" چو نام مرا ازل کردی معین الدین بفضل خود معین دین بگردان الٰہی "

مہر چونکہ پوری طرح واضح نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہ الفاظ میں قدرے تقدیم و تاخیر ہوگئی ہو، مہر میں ۱۱۶۲ھ کندہ ہے، اس مہر کے ساتھ وقف کے سلسلہ میں ذیل کا قطعہ تحریر کیا ہے:

لواقفه

یارب انی نذرت اذا وصلت الی المدینة نقد صحیح البخاری عند محدث المدینة
لتحصل لی اجازته من اعلم المدینة وقفته رجاء ان یرضی عنی حبیب المدینة

اس کے بعد کاتب نے اس نسخہ کی کتابت دوسرے کاتب کے قلم سے اس کی تکمیل، بشمولہ رسالہ کی

کتابت اور تحشی کے سلسلہ میں ایک طویل تحریر لکھی ہے، جس کا کچھ حصہ ضائع ہو گیا ہے، کاتب مولانا حیدر[1] کشمیری محدث کے شاگرد تھے، اس لیے اس کے بعد وہ سند بھی لکھی جو سماع حدیث کی ان کو حاصل ہوئی، اس سند کا بھی کچھ حصہ اوراق کے چسپاں ہو جانے کی وجہ سے ضائع ہو گیا ہے، اس لیے ما بقیہ ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم، احمد اللہ علی عظمتہ جلالہ واشکرہ بجزیل نوالہ واثناء علیہ ثناء لاینقطع بل یزید رافعا اکف الضراعۃ والابتہال فی ان یوفقنا لما یحب ویرضی واشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الموصوف بصفات الکمال المنعوت بنعوت الجلال والجمال واشھد ان سیدنا محمداً عبدہ ورسولہ ذو المقام الاعلی الارفع ..... اما بعد فلما شمر عن ساق جدہ فی علوم الحدیث الشریف وسعی فی الاخر تقلہ ..... واتمم الفرصۃ بتوفیق الملک المنان الشیخ الفاضل الصالح الکامل .... الاعز الاکرم معین الملۃ والدین بن حضرۃ قدوۃ العارفین زبدۃ آل طٰہ و یٰسین خواجہ خاوند محمود العطاری النقشبندی علوی الحسینی شکر اللہ سعیہ وحصل منہ ما یکفیہ لخذ منہ ...... طلب الاجازۃ ...... وان لم اکن صالحا لذلک ولکنی احببت اقتداء

---

[1] کشمیر کے بڑے محدث مشہور عالم اور حیدر بن فیروز محدث کے نام سے مشہور تھے۔ سات سال کی عمر میں حفظ قرآن کیا، مختصرات شیخ نصیب الدین سے پڑھیں، مولانا جوہر محدث کی صحبت میں تحصیل علوم کی، پھر دہلی جا کر شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے تلمذ حاصل کیا، کشمیر واپس ہو کر درس و افادہ میں مشغول ہو گئے، وقت کے سلاطین نے کئی بار خدمت قضا آپ کے سپرد کرنا چاہا مگر آپ نے منظور نہیں کی۔ ۱۰۵۷ھ میں کشمیر میں انتقال ہوا۔ (نزہۃ الخواطر بحوالہ العدائق حنفیہ)

للسلف الصالحین وبقاء لهذه السنة السنیة واجزت له ان یروی عنی
کتاب مشکوٰة المصابیح وجمیع ...... روایة عنی مما اجازنی شیخی ......
فرید دهره الشیخ المحدث عبدالحق الدهلوی بن ...... اجازة تامة
...... کتب هذه الاسطر العبد الضعیف الفقیر الی الله القوی حیدر
بن فیروز ...... الجوخی عفی عنه فی ...... سنة الف واربع وخمسین"

نسخہ کی ابتدا میں وقف کے سلسلہ میں ذیل کی عبارت پختہ خط میں درج ہے :-

وقفت هذا الکتاب من خالص	یہ کتاب میں نے خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ،
ملکی لله تعالیٰ طلبا لثوابه وهربا	ثواب کی طلب اور اس کے عتاب سے بچنے کیلئے
من عقابه علی طلبة العلوم ینتفعون	طالبعلموں پر وقف کی تاکہ وہ تعلیم و تعلم اور
بها تعلیما وتعلما ومطالعة وکتابة	مطالعہ وکتابت میں اس سے فائدہ حاصل
وقفا صحیحا مؤبدا لا یوهب ولا	کریں ، یہ وقف صحیح و دائمی ہے ، اس کا نہ
یورث ولا یباع ولا یرهن ولا	ہبہ ہو سکتا ہے نہ وراثت نہ بیع ہو سکتی ہے
یملك بسبب من الاسباب قائما	نہ رہن ، اور کسی سبب سے وہ کسی کی ملک نہیں
علی اصوله ماضیا علی سبیله	ہو سکتا ، وہ ہمیشہ وقف کے اصول پر
ابد الآبدین الا ان یرث الارض	قائم و دائم جاری رہے گا ۔
ومن علیها وهو خیر الوارثین	

اس عبارت کے ساتھ ایک مدور بیضوی مہر ثبت ہے جس کا زیریں حصہ" ملا قوام الدین"
پڑھا جاتا ہے ، یہ وہی مولوی قوام الدین محمد معلوم ہوتے ہیں جن کے لڑکے نظام الدین محمد شاہ
کا نوٹ اوپر گذر چکا ہے ، اس صفحہ پر تین اور مہریں بھی ثبت ہیں جو محو شدہ ہیں ، اس لیے پڑھی

نہیں جا سکتیں، غالباً یہ مہریں شاہی تحویلداروں کی ہیں، کیونکہ ہر مہر کے ساتھ تو عرض دیدہ شد لکھا ہوا ہے، اس کے بھی مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ایک عبارت کے ساتھ سنہ بھی درج ہے جو ایک ہزار اور کچھ ہے، دہائی پڑھنے میں نہیں آتی،

ان مہروں اور عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ معین بن محمود اس نسخہ کو مدینہ طیبہ نہیں بھیج سکے اور وہ ہندوستان ہی میں رہا، اور شاہی کتب خانوں میں داخل ہو گیا یا علماء و فضلا کے زیر مطالعہ رہا، یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ معین صحیح البخاری کی دوسری جلد (نصف آخر) بھی نہیں لکھوا سکے، کیونکہ اس سلسلہ کے تمام نوٹ اور ضروری عبارتیں اس جلد کے اول یا آخر میں درج ہیں، اگر دوسری جلد بھی تیار ہو گئی ہوتی تو اختتام کتاب سے متعلق نوٹ اس دوسری جلد کے آخر میں ہوتے،

صحیح البخاری جس حصہ سے شروع ہوتی ہے اس کے اوراق اول پر شیوخ بخاری کا سلسلہ کاتب کے قلم سے اس طرح لکھا ہوا ہے:

ذکر الشیوخ التی بلغ من جہتہم الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم بثلاثۃ وسائط۔

البخاری عن:

ن عاصم بن خالد عن جریر بن عثمان عن عبید اللہ بن بشر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ن خلاد بن یحییٰ عن عیسیٰ بن جہمان عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ن المکی بن ابراھیم عن یزید بن عبید عن سلمہ بن الاکوع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ن ابی عاصم النبیل عن یزید بن ابی عبید عن سلمہ بن الاکوع عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ن محمد بن عبد اللہ الانصاری عن حمید عن انس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اسی صفحہ پر ایک مدور مہر بھی ثبت ہے جو محو شدہ ہے اس کا کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا، اسی صفحہ کے بالائی حصہ میں غالباً کاتب کے کسی شاگرد کے قلم سے ذیل کا نوٹ ہے جس میں کاتب کا نسب نامہ نقل کیا گیا ہے۔

صحیح البخاری کا یہ نسخہ مختلف حیثیتوں سے بڑا اہم اور تاریخی ہے، عرصۂ دراز سے آبائی کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس وقت بھی والد مرحوم حکیم محمد عرفان خان صاحب ناظم شریعت ٹونک کے کتب خانہ میں ہے، یہ کتب خانہ سعیدیہ لائبریری کے بعد ٹونک میں سب سے اہم کتب خانہ ہے، جو متعدد نوادر پر مشتمل ہے، اور درسی و غیر درسی قلمی و مطبوعہ کتابوں کا ایک اچھا ذخیرہ ہے، اس کتب خانہ پر ایک مضمون علحدہ زیر ترتیب ہے جو انشاء اللہ ناظرین کے سامنے بعد میں پیش کیا جائے گا،

خواجہ معین الدین بن محمود متعدد تصانیف کے مالک ہیں، مختلف تذکروں میں ان کی مندرجۂ ذیل تصانیف کا ذکر ہے:

(۱) فتاوی نقشبندیہ۔ یہ فتاوے آپ نے علمائے عصر کی خواہش پر ان کے اتفاق سے مرتب کیے،

(۲) کنز السعادت، یہ رسالہ مسائل فقہیہ کے سلسلہ میں تالیف کیا گیا۔

(۳) رسالہ رضوانی (فی السیر والسلوک) اس رسالہ میں اپنے والد خاوند محمود کے حالات، کرامات اور مراتب بیان کیے ہیں، اور اپنا آبائی نسب نامہ بھی دیا ہے،

تاریخ کشمیر اعظمی میں ان تصانیف کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے "تالیف دیگر دارند" لیکن ان کی تفصیل نہیں دی ہے، اسی طرح دوسرے تذکروں میں بھی صراحۃً کسی دوسری تصنیف کا نام نہیں مل سکا، سعیدیہ لائبریری ٹونک میں ان کی دو اہم تصانیف محفوظ ہیں، چونکہ ان کتابوں کا ذکر دوسرے تذکروں میں نہیں ہے، اور ان کے خطبے سے آپ کی کچھ دوسری تصانیف کا بھی پتہ چلتا ہے اس لیے ذیل میں ان کا اجمالی تعارف کرایا جاتا ہے،

(۱) زبدۃ التفاسیر (عربی)۔ کاغذ خانی مجدول نیلگوں و شنجرفی، تقطیع متوسط خوشخط بخط نسخ، صفحات ۱۰۱۷۔ ابتدائی عبارت اس طرح ہے:

الحمد للہ الذی نزل کتابہ الذی ھو ناسخ الادیان ۔۱۔۱

آخر کی عبارت اس طرح ہے:۔ "الحمد للہ حمداً کثیراً قد وقع الفراغ من تالیف ہذا التفسیر.... وفی کشف وجوہ عرائس الفرائد مع الاقتصاد عن طرفی الاکثار والاقلال۔"

کتاب کا خطبہ اورنگ زیب عالمگیر کے نام کا لکھا گیا ہے۔ "شاہ اورنگ زیب عادلے عالمگیر" تاریخ تصنیف ہے، اس کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ میں عرصہ دراز سے ان بدعات واہوار کی وجہ سے پریشان تھا، جو اس ملک میں رائج ہیں، بیس سال کے بعد عالمگیر کا دور آیا اور مجھے اور اہل ملک کو اطمینان حاصل ہوا تو بطور شکریہ میں نے یہ تفسیر لکھی اور بادشاہ کے حضور میں پیش کی، متن قرآن کو "ق" سے اور تفسیر کو "ت" سے ظاہر کیا گیا ہے۔

یہ نسخہ نواب محمد علی خاں والی ریاست ٹونک کے ایک درباری عالم محقق العلماء مولانا عبدالکریم صاحب خوشنویس کے قلم کا لکھا ہوا ہے، کاتب نے تاریخ کتابت لکھتے ہوئے ان الفاظ میں کتاب پر تبصرہ کیا ہے،

"التفسیر الذی لا نظیر لہ فی وجازۃ لفظہ وسلاسۃ مبانیہ وایضاح معانیہ"

یہ نسخہ نواب محمد علی خاں کے صاحبزادہ محمد اسحق خاں کیلئے لکھا گیا تھا، اور ۲۵ رشوال ۱۲۹۴ھ کو اس کی کتابت سے فراغت ہوئی، کتاب کا اصل نسخہ بھی نواب صاحب کے پاس محفوظ تھا لیکن وہاں کی قدیم وجدید فہرستوں میں اب اس کا ذکر نہیں ملتا، یہ حسن اتفاق ہے کہ ایک روز میں اپنے دادا قاضی عبدالحلیم خاں (المتوفی ۱۳۲۳ھ) کی کتابوں کی قدیم فہرست جو موصوف نے اپنے والد قاضی عبدالکریم خاں (المتوفی ۱۳۱۳ھ) کے انتقال کے بعد ترتیب دی تھی دیکھ رہا تھا کہ اس فہرست میں صرف اسی کتاب کا نام "تفسیر زبدۃ التفاسیر قلمی خوشخط طلائی مجلد" نظر آیا، اس کے ساتھ دادا صاحب مرحوم کے قلم سے یہ نوٹ بھی دیا ہوا ہے "مجلد کتب ہذا کے تفسیر زبدۃ التفاسیر بقیمت مبلغ چالیس روپیہ کلدار نواب صاحب محمد علی خاں صاحب بہادر نے بمقام بنارس خرید فرمائی تھی،

اور میرے والد مرحوم (قاضی عبدالکریم صاحب) کے پسند کرنے پر حضور نے عنایت کی تھی"۔

قاضی عبدالکریم صاحب چونکہ مولوی محمد مفتی صاحب کے بیٹے تھے جو نواب وزیر الدولہ اور نواب محمد علی خاں دونوں کے استاد تھے اس لیے دونوں میں گہرے مراسم تھے، قاضی صاحب موصوف نے اسی تعلق کی وجہ سے جب نواب صاحب بنارس میں مقیم تھے، ان سے ملنے کیلئے بنارس کا پیدل سفر کیا تھا، غرض اس طرح زبدۃ التفاسیر کا مذکورہ نسخہ ٹونک منتقل ہوا، مگر افسوس یہاں بھی محفوظ نہ رہ سکا اور کسی وقت کہیں منتقل ہوگیا، راقم اس کتاب کے دوسرے نسخے کی تلاش میں رہا اور محب محترم مولانا عرشی رامپوری کے تحریر فرمانے کے مطابق پٹنہ لائبریری سے رابطہ پیدا کیا گیا، وہاں اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ محفوظ ہے، پٹنہ لائبریری کے لائبریرین صاحب کی تحریر کے مطابق یہ نسخہ ۱۱۰۱ھ کا مکتوبہ ہے، کاتب کا نام درج نہیں، صفحات کی تعداد ۶۸۲ ہے، کتب خانہ کی فہرست میں نمبر ۱۴۴۶ اس کا اندراج ہے، بانی کتب خانہ کا خرید کردہ نسخہ ہے، کتاب پر کسی طرح کی کوئی تحریر نہیں جس سے اندازہ کیا جاسکے کہ یہ نسخہ کہاں کہاں رہا اور کس طرح وہاں پہنچا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ نسخہ مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ہے، یا تصنیف کے بعد مصنف کی زندگی میں کسی دوسرے کاتب سے لکھوایا گیا، کسی موقع پر انشاء اللہ مصنف کے قلم کے صحیح البخاری کے نسخہ سے مقابلہ کرکے خط کا اندازہ لگایا جاسکے گا۔

(۲) شرح القرآن۔ (فارسی) یہ بھی فارسی تفسیر ہے جو ۱۱۰۲ھ میں تصنیف ہوئی۔ تمہید میں مصنف علام لکھتے ہیں کہ جب حج بیت اللہ کا عزم مصمم ہوا تو اس خیال سے کہ اس طویل سفر میں تفسیر کی متعدد کتابیں ساتھ رکھنا مشکل ہے، مختلف تفاسیر سے اخذ کرکے تفسیر اول جس کا نام زبدۃ التفاسیر من عبد المعین ہے لکھی، پھر بعض احباب و تلامذہ کا اصرار ہوا کہ اسی طرز پر فارسی میں بھی ایک تفسیر لکھنی چاہیے، اس سے پہلے کہ اس فرمائش کی تکمیل کی جاتی، سفر حج کے لیے مسائل فقہیہ پر مشتمل ایسے ہی مجموعہ کی ضرورت تھی، اس ضرورت سے فتاوی نقشبندیہ ترتیب دیا گیا، اور اس کا نام فتاوی

النقشبندیہ بعنوان "الفقہ المعینیہ" رکھا گیا، علم تصوف میں بھی ایسی ہی جامع کتاب کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک کتاب ترتیب دی گئی اور ابتداءً اس کا نام "مفرح القلوب" رکھا گیا، پھر بعد میں "المرققة القلوب و ورقة العیون" تجویز کیا گیا، ابھی اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ حسب الہام غیبی تفسیر فارسی شرح القرآن کا خطبہ لکھنا شروع کیا گیا، خیال تھا کہ دو سال میں اس کی تکمیل ہو سکے گی، لیکن صرف چھ مہینہ میں مکمل ہوگئی، ۲۲ رجب ۱۰۷۱ھ کو اس کی ابتدا ہوئی اور محرم ۱۰۷۲ھ میں اس سے فراغت ہوگئی،

مصنف نے مقدمہ میں یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ ان کتابوں کی ترتیب سے پہلے کتب احادیث کا ایک انتخاب[1] بھی اسی طرح تیار کر چکے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے فارسی کے چند دوسرے رسائل کا بھی ذکر کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ "مرآة العدالة" اور "رسالہ رد الملاحدة" بھی آپ کے مصنفہ رسائل ہیں،

شرح القرآن فارسی کا پیش نظر نسخہ ٹونک کے کتب خانہ میں محفوظ ہے، اس کا کاغذ سفید حنائی دبیز، تقطیع کلاں، قدرے کرم خوردہ، مجدول، خط نسخ پختہ، خوشخط، ۱۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے، شروع کی عبارت یہ ہے:

> اولاً۔ حمد نامحدود و ثنائے نا معدود معبودی را سزا است کہ حمد جمیع حامدان و ثنائے جمیع ثناخوان باجمع ذات پاک اوست الخ

آخر کی عبارت اس طرح ہے:

> قد وقع الفراغ من تصنیف شرح القرآن بعد ستة اشھر زید علیھا عشرة عند وسط یوم الخمیس من آخر شھر اول من سنة ثانیة السبعین بعد الف حول حول من ھجرة النبی سید الانبیاء افضل المرسلین صلوات اللہ والسلام علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین"

---

[1] ہو سکتا ہے کہ کچھ نقشبندیہ کا پیش نظر نسخہ اس سلسلہ کی ایک کڑی ہو اور اسی ضمن میں آپ نے حزب نبوی پر حاشیہ لکھنے کی غرض سے

نسخہ قدیم و نادر اور مصنف کی حیات کا لکھا ہوا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے اس نسخہ کی کتابت کسی دوسرے کاتب سے کرائی ہے، پھر اس کی تصحیح اپنے قلم سے کی ہے، اس لیے کہ تصحیح کا خط اکثر مقامات پر وہی ہے جس خط میں صحیح البخاری کی تصحیح کیگئی ہے، کتاب کی حالت اور فہرست مضامین مشمولہ کتاب سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کی حیات کا ہے، رمضان ۱۲۶۹ھ میں جب نواب صاحب بنارس میں مقیم تھے، یہ نسخہ مولوی عبداللہ کی معرفت نواب صاحب کے کتب خانہ کیلئے بائیس روپیہ آٹھ آنہ میں سندیلہ سے خرید اگیا، ان تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شرح القرآن کا یہ نسخہ، زبدۃ التفاسیر کا مذکورۂ بالا نسخہ اور صحیح البخاری کا اصل نسخہ جس پر یہ مضمون حوالۂ قلم کیا جارہا ہے، نواب محمد علی خاں صاحب نے غالبًا ایک ساتھ سندیلہ سے خریدے ہوں، جہاں یہ نسخے کسی طرح پہنچے ہوں گے، شرح القرآن کا نسخہ نواب صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ رہا، اور زبدۃ التفاسیر و صحیح البخاری کے نسخے ہمارے خاندان میں منتقل ہوگئے،

علامہ معین بن محمود کی تصانیف میں فتاوی نقشبندیہ کے نسخے اکثر کتب خانوں میں محفوظ ہیں اسی طرح رسالہ رضوانی کے نسخے بھی ملتے ہیں، چنانچہ تذکروں میں اس رسالہ اور اسکے مندرجات کا ذکر موجود ہے، زبدۃ التفاسیر کے نسخے ٹونک اور پٹنہ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں، شرح القرآن فارسی کے کسی نسخہ کا علم ٹونک کے کتب خانہ کے علاوہ ابتک نہیں ہوسکا ہے، اسی طرح مصنف کے باقی رسائل کا پتہ نہیں چل سکا، اگر کسی صاحب کے پاس ہوں یا کسی صاحب کے علم میں ہوں تو ان کی تفصیلات شائع کرنے کی تکلیف فرمائیں۔

ادبیات

غزل

از جناب تسکین قریشی

ادھر ساقی، اُدھر پیرِ خرابات
مبارک مے پرستانِ خوش اوقات

غمِ دل کے بہت نازک ہیں حالات
شکایت لب پہ آئی اور گئی بات

سمجھ لیں اہلِ دنیا خوب یہ بات
کہ دنیا ہی نہیں دار مکافات

بہت دلکش سہی ہر عالمِ حسن
مگر ہو بے رخی میں اور ہی بات

کمالِ عشق میں یکساں ہیں دونوں
غمِ فرقت ہو یا عیشِ ملاقات

سراپا شوق، و یکسر بے نیازی
یہی جذب و جنوں کی ہیں علامات

چلے ہیں کارواں کے پیچھے پیچھے
ہمارے رہبروں کی بھی ہو کیا بات

زیارت گاہِ اہلِ جستجو ہیں
مری ہر لغزشِ پا کے نشانات

خرد کی جستجو حدِ نظر تک
جنوں ہر صاحبِ کشف و کرامات

مجھے کل صحبتِ واعظ میں تسکینؔ
بہت یاد آئے میخانے کے دن رات

غزل

ازجناب طالب جے پوری

دلِ امیدوار کا عالم بے بہار اک بہار کا عالم
ہر نفس اشتیاق کی دنیا ہر نظر انتظار کا عالم
جانفزا ہر نگاہ لطف آگیں دل فریب اعتبار کا عالم
گفتنی ہو تو کوئی بتلائے دلِ بے اختیار کا عالم
بجلیاں مہربان ہوں جس پر ہائے اُس شاخسار کا عالم
دامن تار تار ہے اور ہم کچھ نہ پوچھو بہار کا عالم
روبرو اُن کے دیدنی ہے آج ناصحِ غم گسار کا عالم
اے اسیرِ فسونِ چشمِ بتاں دیکھ لیل و نہار کا عالم
ہم نے دیکھا ہے عمر بھر طالب گردشِ روزگار کا عالم

غزل

ازجناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

محبت میں خرد کی این وآں کیا یہاں ہنگامۂ لفظ و بیاں کیا
خموشی سوزِ باطن کی زباں ہو طریقِ عشق میں آہ و فغاں کیا
رہے گی آنکھ کب تک محوِ حیرت نہ اٹھے گا حجابِ درمیاں کیا
جہاں میں تھک کے بیٹھوں میری منزل محبت میں تلاشِ کارواں کیا
چمن ہی سے وجودِ آشیاں ہے چمن ہی جب نہیں تو آشیاں کیا
گماں بھی ہے یقیں کی ایک منزل یقیں جس پر نہ آئے وہ گماں کیا
خرد کی منزلِ خوش آگہی کا جنوں سے بڑھ کے کوئی رازداں کیا
محبت جس کو راس آجائے جوہر اُسے اندیشۂ کون و مکاں کیا

مطبوعات جدیدہ

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے۔ از مولانا تقی الدین ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، ضخامت ۲۵۰ صفحات مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ، پتہ ابو سعد مجلس علمی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کے محدثین عظام پر جو مضامین بعض علمی رسالوں میں شائع ہوئے تھے، اب انھوں نے ان کو افادۂ عام کے لیے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس میں صحاح ستہ کے مصنفین کے علاوہ ائمۂ اربعہ اور امام طحاوی کے حالات، خدمات حدیث، دوسرے کارناموں اور ان کی مشہور تصنیفات حدیث پر تبصرہ کیا گیا ہے، شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں حدیث کی اہمیت و حجیت اور اس کے ضبط و تحفظ میں اہتمام و احتیاط کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے اور منکرین حدیث کے اعتراضات کا شافی جواب دیا گیا ہے، لائق مصنف کو فن حدیث سے خاص مناسبت ہے، اور احادیث اور اس کے متعلقات پر ان کی اچھی نظر ہے، اور یہ کتاب انھوں نے بڑی محنت و تحقیق سے لکھی ہے، زبان و بیان سلیس اور شگفتہ ہے، شروع میں مولانا ابو الحسن علی ندوی کا ایک مختصر مگر جامع تبصرہ بھی ہے، حدیث کے طلبہ اور اساتذہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت مفید ہے۔

تاویل الاحادیث فی [illegible]: مترجمہ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت [illegible]، صفحات [illegible]، قیمت [illegible]، پتہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی [illegible]

[illegible] پاکستان [illegible]

[illegible]

انداز میں انبیائے کرام کے ان واقعات اور قصوں کے جو قرآن میں مذکور ہیں، اسرار و رموز بیان کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ معجزات مادی اسباب اور قانون فطرت کے خلاف نہیں بلکہ ان کے عین مطابق ہیں، اور منکرین انبیاء کے عذاب کا تعلق طبیعی واقعات اور مادی اسباب سے بھی ہوتا ہے، یہ کتاب پہلے چھپ چکی ہے، اور غالباً اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے، اب الرحیم کے اڈیٹر غلام مصطفیٰ قاسمی صاحب نے اس کا عربی متن دو قدیم اور اہم نسخوں کی مدد سے مع حواشی اور مقدمہ کے شائع کیا ہے، مقدمہ میں شاہ صاحب کے علم و کمال اور اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور حاشیے میں زیادہ تر اختلاف نسخ ظاہر کیا گیا ہے، اس کتاب سے حضرت شاہ صاحب کا نکتہ آفرینی اور دقیقہ سنجی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے، مگر اس کا موضوع بڑا نازک اور پیچیدہ ہے، اس لیے اہل علم اور خواص ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، عوام کے لیے اس کا مطالعہ مضر بھی ہو سکتا ہے،

ارمغان آصف : مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۰۰، قیمت چہ ر، پتہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

آصف علی بیرسٹر مرحوم تنہا سیاست ہی کے مرد میدان نہ تھے، بلکہ وہ دلی کی پرانی تہذیب کا بھی نمونہ تھے، خار زار سیاست کی الجھنوں کے ساتھ شعر و ادب کا بھی نہایت بلند ذوق رکھتے تھے، خود بھی شاعر و ادیب تھے، اور چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن بھی جاری رہتی تھی، چنانچہ ان کے مضامین اور شاعری کا بڑا حصہ ان کی یادگار ہے، خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ان کو جمع کر کے ارمغان آصف کے نام سے شائع کیا ہے، اس مجموعہ کے ادبی و تنقیدی مضامین میں [illegible] حسن نظامی، کلام بیدل پر ایک نظر، و پیام اقبال [illegible] مضامین ہیں جو تمام علمی [illegible] خالی خاصے کی چیزیں ہیں، سوانحی خاکوں میں میر [illegible] صاحب [illegible] [illegible]

[illegible] ظرف و لطافت [illegible]

طبع ادا کی اور سب میں چونچ اور ان کی کا ثبوت دیا ہے، فارسی میں بھی ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی، ان کی نظم و نثر کے نمونے بھی اس مجموعہ میں موجود ہیں، اس لیے اردو داں اصحاب ذوق کے لیے دلچسپی کا سامان ہے، لائق مرتب نے اس کو شائع کرکے مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

دیوان بقا اکبر آبادی، مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۱۰۰، مجلد قیمت [illegible]، پتہ شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی

میر و سودا کے زمانے کے ایک گمنام شاعر بقاء اللہ بقا صاحب دیوان تھے، جن کا چراغ ان دونوں باکمالوں کے سامنے نہ جل سکا، خواجہ احمد فاروقی صاحب نے ان کا دیوان جو اب تک غیر مطبوعہ تھا مرتب کرکے شائع کیا ہے، اس کی اصل اشپرنگر کے ذخیرہ سے حاصل کی گئی ہے، یہ دیوان غزلیات، رباعیات، قطعات، قصائد، ہجویات وغیرہ مختلف اصناف سخن پر مشتمل ہے، کچھ فارسی کا کلام بھی ہے، شروع میں لائق مرتب کے قلم سے بقا کے کلام پر تبصرہ ہے، یہ دیوان رطب و یابس کا مجموعہ ہے، ہجویں خاص طور سے رکیک اور مبتذل ہیں، لیکن کچھ اچھے اور بلند پایہ اشعار بھی مل جاتے ہیں، اور ایک قدیم شاعر کی حیثیت سے ان کا کلام قابل قدر ہے، اور اس کو شائع کرکے خواجہ صاحب نے بقا کو فنا سے بچا لیا، اور ان کے بقول اس کا مطالعہ میر و سودا کے عہد کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

(ض)

صہبائے سخن، انتخاب ڈاکٹر محمد عبد المنعم صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ قیمت بہتر، کتابت و طباعت بہتر، صفحات [illegible] مجلد قیمت تحریر نہیں، پتہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

ذوق نظر کا یہ حال تھا چونکہ وہ بھی بچپن ہی سے زمانہ سے مشق سخن کرتے تھے، مگر ابتدا سے اخلاق و ذوق بلند و بہتر تھا، اس لیے اس دور کی شاعری کا بیشتر حصہ غزل سرائی کے ابتذال سے پاک اور پاکیزہ تغزل کا نمونہ ہے۔ حضرت تھانوی سے ارادت کے بعد یہ شراب دو آتشہ ہو کر شراب طہور بن گئی اور بادۂ عرفان کی مستی اور وارفتگی کی شرربار نظمیں کرنے لگیں، صہبائے عارفی اسی مینائے عرفان کی صہبا ہے، اس دور کا کلام محض شاعری نہیں بلکہ ایک صاحب دل کی آواز ہے، اس لیے خیالات کی لطافت و پاکیزگی، واردات قلبی اور روحانی کیفیات باطنی کوائف سے معمور اور اس کا ہر شعر بادۂ معرفت کا چھلکتا ہوا جام ہے، زبان نہایت شستہ و رفتہ، انداز بیاں شگفتہ اور اشعار ڈھلے ہوئے سے معلوم ہوتے ہیں، یہ حسن ظاہری بھی نفاست و لطافت کا مرقع ہے، یعنی جیسی مصفا و پاکیزہ صہبا ہے ویسا ہی شفاف شیشہ و ساغر ہے، اور اس لائق ہے کہ اصحاب ذوق اس سے لطف اندوز ہوں۔

(م)

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڈھ

مقام اشاعت	دار المصنفین اعظم گڈھ
نوعیت اشاعت	ماہانہ
نام پرنٹر	صدیق احمد
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام پبلشر	[illegible]
قومیت	...
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام اڈیٹر	شاہ معین الدین احمد ندوی
قومیت	ہندوستانی
پتہ	دار المصنفین اعظم گڈھ
نام و پتہ مالک رسالہ	[illegible]

میں صدیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔

جلد ۹۹ ماہ ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۶۷ء عدد ۴

مضامین

شذرات

ستمبر ۱۹۹۶ء کے معارف میں ناظرین کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ دار المصنفین سے دو نئی کتابیں مقالات سلیمان اور ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں شائع ہوئی ہیں، اس مہینہ میں چار اور نئی کتابیں دین رحمت، صاحب المثنوی، عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں جلد اول اور کشمیر سلاطین کے عہد میں چھپ کر تیار ہوئی ہیں، دین رحمت میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلام بلا تفریق مذہب و ملت اور دوست و دشمن سارے انسانی طبقہ بلکہ پوری کائنات کیلئے سراسر عدل و رحمت ہے، صاحب المثنوی میں مولانا جلال الدین رومی کی مفصل سوانح عمری ہے، عہد مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں جلد اول میں ظہیر الدین محمد بابر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارنامے عہد مغلیہ اور دور جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین کی اصل تحریروں کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں، چوتھی کتاب کشمیر سلاطین کے عہد میں ہے جس میں مغل فرمانرواؤں سے پہلے جن مسلمان حکمرانوں کی حکومت کشمیر میں رہی، اس کی بہت ہی مستند سیاسی اور تمدنی تاریخ قلمبند کی گئی ہے۔

سندھی ہندوستان کی قومی زبانوں میں قانونی طور پر تسلیم کر لی گئی ہے، اس کو تسلیم کرتے وقت حکومت ہند کے وزیر داخلہ نے فرمایا کہ اس کو جائز مقام دیا جا رہا ہے، جو اب تک نہیں دیا گیا تھا، اس اطلاع سے ہر ہندوستانی کو خوشی ہوگی، مزید مسرت کی یہ بات ہے کہ اب پارلیمنٹ میں ایک ممبر کو اپنی مادری زبان میں تقریر کرنے اور سوالات پوچھنے کی اجازت ہوگی، ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ساتھ یہ فراخدلی اس بات کا ثبوت ہے کہ لسانی سامراجیت اور استبداد کے بجائے اب لسانی جمہوریت اور رواداری کا خیال پیدا ہو چکا ہے، افسوس ہے کہ شمالی ہند میں اب تک اردو کو وہ جائز مقام نہیں مل سکا جس کی وہ مستحق ہے، ۱۹۴۷ء کے بعد اردو کی مخالفت کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان کے اردو بولنے والے مسلمانوں کی اکثریت نے پاکستان بنوایا ہے، تو یہ زبان اب صرف پاکستان ہی میں بولی جائے، سندھی بھی جب سندھ میں [illegible] پاکستان کی زبان اور بنگالی بھی ہے، سندھی تو خاص اسی کے ایک علاقہ کی زبان ہے جب ہندوستان میں پاکستان کی

نیا ہے کہ حکومت کسی بغاوت کا خطرہ نہیں ہے بلکہ ملک کی پہلی سرحدی جنگ جاری ہے تو پھر وہ کون

خالص ہندوستانی زبان ہے، اس کے حقوق سے اب تک کیوں محروم رکھا گیا ہے،

یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۴۷ء کے بعد اردو زبان جتنی زیادہ دبائی گئی اتنی ہی زیادہ ابھری، مختلف علوم و فنون پر اس میں جو کتابیں برابر نکل رہی ہیں وہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کی کسی اور زبان سے کم نہیں ہیں، اس کا اعتراف مرکزی حکومت اردو کی کتابوں پر ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے ہر سال انعام دے کر کرتی رہتی ہے پھر ہندوستان کے ادیب اور شاعر جو وطنی خدمات انجام دے رہے ہیں اس کی مثال ہندی کے علاوہ ہندوستان کی کسی اور زبان میں شاید ہی ملے، وہ پاکستان کے ادیبوں اور شاعروں سے ذہنی جنگ میں بھی مصروف ہیں اور جو نہیں ہیں ان کو وفادار نہیں کہا جاتا لیکن وفاداری کیلئے دلداری کی بھی شرط ہوتی ہے جیسی دلداری ہوگی ویسی ہی وفاداری بھی ہوگی، اب اردو کی بین الاقوامی حیثیت بھی ہو گئی ہے، لندن، ماسکو، تاشقند، واشنگٹن، پیکنگ، طہران، انقرہ، قاہرہ، کابل اور جدہ وغیرہ سے اردو میں ثقافتی خبریں نشر ہوتی ہیں، ہندوستان میں روسی اور امریکی سفارت خانوں کی طرف سے اردو میں رسالے بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ خود ہندوستان کے ریڈیو سے بھی اب اردو میں خبریں سنی جاتی ہیں، ریڈیو پاکستان نے اعصابی جنگ تو اردو ہی کے ذریعہ ہوتی رہی ہے، مگر جموں اور جالندھر کے ریڈیو تو پاکستان کو اردو ہی میں مخاطب کرتے ہیں، یہ بھی معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ دہلی ریڈیو میں اردو میں اضافہ گھنٹوں کا پروگرام ہوتا ہے جو صرف پاکستان والوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے، اس میں مشاعرے بھی ہوتے ہیں، اچھی اچھی غزلیں بھی سننے میں آتی ہیں، جذباتی [illegible] قومی گیت [illegible] تقریریں بھی ہوتی رہتی ہیں، اردو مجلس کے پروگرام تو ہندوستانی [illegible] سے منسوب کئے گئے ہیں، کیا ریڈیو پر اس زبان کے ساتھ حکومت کی یہ توجہ اس کی حیثیت کا ثبوت ہے [illegible] کہ اس سے یہ احساس بھی دور کرایا جا سکے

اور اسے ذہنی جنگ کی [illegible] ہوا تھا کہ وہ اپنے وطنی [illegible]

گذشتہ انتخاب کے موقع پر بھی اردو کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا [illegible] کانگریس کا امیدوار [illegible] کے بھی

مظاہرات اردو میں جا بجا چپکائے گئے۔ دہلی کی ایک اردو ٹریٹ پر اردو کے خوبصورت جلی حروف میں پوسٹر لگائے گئے
"جنتا کا لایا ہوا انقلاب زندہ باد"، "ہندو مسلم اتحاد زندہ باد"، "جن سنگھ راج زندہ باد"، بہار کی غیر کانگریسی حکومت کے
منشور میں یہ بھی ہے کہ وہ وہاں اردو زبان کو ثانوی حیثیت سے تسلیم کریگی، اور اب یہ بالکل ظاہر ہو چکا ہے کہ بہار اور یوپی
میں کانگریسی حکومتوں نے اردو زبان کو اسکا جائز حق دیدیا ہوتا تو انکے برے دن نہ آتے، امید ہے کہ کانگریسی اور
غیر کانگریسی حکومتیں دونوں اس تلخ تجربہ سے سبق لیکر اردو کیساتھ وہ روا نہ رکھینگی جو ابتک کیا جا رہا ہے۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے پارلیمنٹ میں اپنی تقریر میں صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا ہے کہ وہ ریاستوں کے
وزرائے اعلی سے اردو کے متعلق گفتگو کرینگی لیکن اب تقریروں اور وعدوں سے محض تسلی دینے کا وقت نہیں رہا،
ہم کر خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا۔ اردو بولنے والے کھلونے دیکر کافی دنوں تک بہلائے جا چکے
ہیں، وہ اب ستم کو کرم اور جفا کو وفا سمجھنے کیلئے تیار نہیں ہیں، وہ زبانی نہیں بلکہ قانونی تحفظ چاہتے ہیں۔
حکومت کو صحیح اندازہ ہے کہ زبان کا مسئلہ بہت جذباتی ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ہر حصہ میں لسانی تحفظ کا مطالبہ
ہو رہا ہے، آسام میں بنگالی اور آسامی جھگڑے میں خونریزی ہو چکی ہے، جنوبی ہند زبان کے مسئلہ پر مرکز سے
بغاوت کرنے کیلئے تیار ہے، پنجاب میں پنجابی زبان کے نام پر کیا کیا نہیں ہو چکا ہے، اسی طرح اردو کی ناانصافی پر
اردو بولنے والوں کے جذبات میں جو درد پیدا ہو رہا ہے، اس کو نظر انداز کرنا موجودہ حکمرانوں کے
سراسر خلاف ہے، اردو بولنے والے اپنی خاموش زبان سے کہہ رہے ہیں

چھاتی جلا کرے ہے سوز دروں بلا ہے — اک آگ سی رہے ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

یوپی میں اردو بولنے والوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان کا ہر بچہ اپنی مادری زبان میں تعلیم پاتا ہے، انکے بچوں کو آخر کیوں
تعلیم کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے، کیا اردو بولنے والے برابر کے شہری نہیں، کیا انکو ہندوستان کے دستور میں وہ حقوق حاصل
نہیں جو اور شہریوں کو ہیں، کیا انکی زبان بہت چھوٹی زبان ہے، کیا انکی زبان میں ہندوستانی کلچر اور تہذیب کا سرمایہ
نہیں ہے؟ مرکز اور ریاستوں کی حکومتوں سے قوم کہتا ہے

کوئی ان سے کہے منہ پھیر کر تم قتل کرتے ہو — تڑپنا ہے تمہارا کشتہ بیداد کیسے جاؤ

اور خود اردو بولنے والوں سے یہ کہتا ہے

یہ جرم ہے تیری ہاں کوتاہ دستی میں سمجھ کروی — جو لیکر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مقالات

ذلک الفوز العظیم

سفرنامۂ حج مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم

(۳)

رویائے عظیمہ

(بلحاظ جلالتِ شان اس مبارک خواب کا مستقل عنوان قائم کیا گیا ہے)

۲۹ صفر المظفر روز چہار شنبہ کی مبارک شب کو مراجعت مدینہ طیبہ کے بعد، منزل بیر الشیخ اور مستورہ کے درمیان ایک بجے کے وقت میں ایک عظیم الشان رویا سے مشرف ہوا۔

چونکہ بفضلہ تعالیٰ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کشادہ میدان میں برابر برابر دو خس پوش بنگلے بنے ہوئے ہیں، ان کے احاطے جدا جدا ہیں، احاطوں میں درخت نصب ہیں جن میں کچھ درخت بڑے کابلی ہیں، ایک بنگلے میں بطور مہمان حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم، وہاں قیام ہے، اسی اثنا میں حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مع ایک رفیق کے میرے قیام گاہ کے بنگلے کے احاطے میں ورود فرمایا، اس طرح کہ جیسے کوئی کہیں جاتے جاتے مہمان پرسی کے لیے اس کے قیام گاہ پر ہو جاتا ہے، رفیق کے پاس گھوڑا سوار تھا، خوبصورت عربی النسل و اس کا رنگ بند کا جیسی ایک سپیدی

مدینہ شریف میں ملی تھا، مجھکو دیتے تھے) زین کسا ہوا استادہ میں کھڑا تھا جب ارشاد میں سوار ہوا، اس خیال یقین کے ساتھ کہ یہ محض مہمان نوازی و غریب پروری ہے، ایک جانب دست راست مبارک سے حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی باگ پکڑی اور دست چپ سے دوسری جانب دوسرے بزرگ نے جو ذات اقدس سے صورتاً و لباساً اشبہ تھے۔

جسم مبارک دبلا تھا، ریش مبارک دراز تھی، لباس مبارک اُجلا دھلا تھا، دوسری جانب کے بزرگ بھی اسی صورت و لباس کے تھے، دل میں از خود خیال آیا کہ یہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں، یہ خیال برابر دل میں قوت کے ساتھ آتا رہا کہ یہ محض عاجز نوازی اور غریب پروری ہے، میرے قیام کے بنگلے میں رونق افروزی بھی اسی قصد سے فرمائی گئی، ورنہ اصل مقصد دوسرے بنگلے میں تشریف بری کا ہے، غرض اسی ہیئت مبارک سے گھوڑا احاطے سے باہر آیا، اور سامنے کے میدان کی جانب چلا، اس وقت بھی یہ خیال آیا کہ دوسرے بنگلے کے قریب کے راستے کو ترک فرما کر میدان کی جانب تشریف فرمائی بھی بخیال مذکورۂ بالا ہے، گھوڑا چلتا تو آہستہ تھا، مگر خوب بناؤ اور قدم، روش کی چلبلی رفتار سے (جس کو انگلے غسرو اور تعلیم دیتے تھے) چاروں قدم سے چاروں طرف کھیلتا چل رہا تھا، رفتار کے انداز کی یہ حالت جاتا تھا، اور کسی طرح سے قدم ڈالتا لیکن سب آہستہ۔

دوسرے صاحب گھوڑے کی رفتار کی برابر تعریف فرماتے جاتے اور رفتار کے تمام کمال ظاہر فرماتے، مگر میں اس کا مخاطب نہ تھا، تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا کلام نہیں فرمایا گیا، اسی طرح دور تک گھوڑا آگے بڑھا چلا گیا، اس کے بعد دوسرے بنگلے کی جانب مراجعت فرمائی ہوئی، اس وقت حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ ملفوظ فرمائے۔

"استقامت مرکز بہ ہو، جائزہ دلوا دیا جائے گا"

اس کے بعد دوسرے بنگلے میں داخل ہونے میں گھوڑے سے نیچے اتر آیا اس وقت

[illegible] جھکے ہوئے [illegible] رفتار کی ترتیب تھی، اس وقت [illegible]
[illegible] محسوس کی

" یا رسول! [illegible] فرنگی بھی انتہا نہ رہی "

بہ آواز بلند فرمایا " بے شک "۔ اس کے بعد بنگلے کے اندر قدم رنجہ فرمایا۔ کمرے میں ایسا سماں تھا جیسے کچہری ہو۔ حاکم مسند پر کرسی پر تھا، میز سامنے تھی، اہل دفتر اور اہل معاملہ سے کمرہ بھرا ہوا تھا، حاکم کا چہرہ گورا تھا مگر میلا، داڑھی منڈھی ہوئی، دونوں جانب صرف قلمیں، سر پر ٹوپی بگڑی ہوئی تھی، گردن جھکائے لکھنے میں مصروف تھا، انگریزی لکھ رہا تھا، قریب پہنچ کر ارشاد فرمایا جناب ہوا جائزہ وغیرہ، ان الفاظ کے ادا ہوتے ہی حاکم قلم ہاتھ سے رکھ کر کھڑا ہو گیا، اس کے بعد دوسرے کمرے میں تنہا گیا، وہاں بھی یہی سماں تھا، دل میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوا کہ یہ نائب حاکم ہے وہ نائب بھی مصروف تحریر تھا، شکل و صورت بھی وہی تھی، اسی حالت میں اس نے یہ جو سنا کہ جائزہ دلوا دیا گیا، اس نے بھی فی الفور قلم پھینک کر ہاتھ سے رکھ دیا، اس کے بعد آنکھ کھل گئی، گھڑی دیکھی تو ایک بجا تھا، ہوا سرد چل رہی تھی، چاندنی کا دریائے زمرد [illegible] میں موجزن تھا، جلالت خواب سے متاثر ہو کر میں [illegible] شکر میں گرا، دیر تک حق تعالیٰ کا شکر ادا کیا، سر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ [illegible] کیا [illegible] ہوا ہے

[illegible] بیہوشی نے بھی کام کیا ہوشیار کا

[illegible] خواب سے [illegible] یہ خیال بھی آیا تھا کہ یہ خواب [illegible] صاحبوں سے بیان کرنے لگا، ایک مولانا سید سلیمان اشرف صاحب [illegible] [illegible] کرنا سکتا ہے، اس شعر کو یاد کر [illegible]

[illegible] تہنیت [illegible]

دیکھو آنکھ نے کیا دیکھا۔ یعنے کو کیا سرور ملا۔ یہی ہیں کہ حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ العزیز نے جو دعا جذب القلوب میں داخلۂ حرم محترم نبوی کے وقت کی تلقین فرمائی تھی، اس میں یہ مبارک الفاظ بھی تھے:

وارزقنی فی زیارۃ نبیک ما رزقتہ اولیائک واہل طاعتک

واغفر لی وارحمنی یا خیر مسئول

الحمد للہ ہر داخلے کا شرف حاصل ہونے پر یہ مبارک دعا بار بار پڑھی گئی، آثار تو کہتے ہیں کہ دعا نے اجابت کا شرف پایا۔

بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

فالحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

عجیب حسن اتفاق | حضرت پیر و مرشد قدس سرہ کے آستانۂ مبارک پر قیام کے آخر وقت میں ظاہر کیا فرمایا گیا، عرفات میں، حرم محترم میں، مسجد شریف میں، سفر میں بھی آثار رحمت کا ظہور آخر مواقع میں زیادہ تر ہوا، جیسا کہ اوپر کے بیان سے واضح ہوا۔

حضرت پیر و مرشد قدس سرہ کی توجہ مبارک کا مشاہدہ بار بار ظہور ہوا، اول دلی کے اسٹیشن پر بھی ہوا حجاز کے وقت جو اوپر بیان ہو چکا، دوسرا مدینہ شریف کی حاضری کے سفر میں ایک منزل پر پہنچ کر صبح کو معلوم ہوا کہ حاجی عبدالرشید خاں دواساز رات سے غائب ہیں، مخبل ہوا، تلاش کی، پتہ نہ چلا، ہو گئے، بے نیل مرام واپس آئے، اب تردد ہوا، حضرت پیر و مرشد کی جانب توجہ کی، تھوڑی دیر کے بعد دیکھا، دواساز آ رہے ہیں۔

تیسری مرتبہ، مسجد شریف نبوی میں شب بیداری کے وقت، چوتھی مرتبہ، دلی تمنا طلبہ میں تھی حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار مبارک سے مشرف ہونے کی تھی، چنانچہ حضرت پیر و مرشد

کی جانب ذرہ نوازی کی، الحمد للہ تعالیٰ سعادت دیار سے مشرف ہوا اور کس شان سے حاضر ہو گیا

والحمد للہ تعالیٰ حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ۔

تعمیر مسجد شریف کا تخمینہ یہ بھی آثار سفر مبارک میں سے ایک عظیم الشان اثر ہے۔ اوپر مذکور ہو چکا ہے کہ حضور نظام نے مسجد شریف کی تعمیری و عمرانی ضروریات کا تخمینہ کرنے کی خدمت میرے سپرد فرمائی تھی مولوی سید عطا حسین صاحب مہندس ہمراہ گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے کو ہر موقع پر آسان فرمایا، ابن سعود نے کشادہ پیشانی سے اجازت دی، امیر مدینہ طیبہ کو خط امداد کے واسطے لکھ دیا، امیر مدینہ نے جناب مدیر حرم کو مدد کے لیے مامور فرمایا، جملہ مصارف کا تخمینہ نو لاکھ روپے ہوا، اس تخمینے میں ضروری تعمیر قالین اور دری کے مصلے، برقی روشنی، آب رسانی وغیرہ شامل تھے، نیز حرم محترم مکہ مکرمہ کی برقی روشنی، بعد حاضری حیدر آباد یہ تخمینہ بارگاہ خسروی میں پیش کیا گیا حسب ضابطہ باب حکومت سے رائے طلب فرمائی گئی، وہاں سے صرف ایک لاکھ تیس ہزار کی منظوری کی رائے عرض کی گئی، فنانس نے اس سے بھی کم تجویز کی تھی، باقی رقم کی بابت دونوں جگہ سے اختلاف قوت کے ساتھ کیا گیا، مگر بارگاہ خسروی سے پورے نو لاکھ منظور فرمائے گئے، اللہ تعالیٰ حضور نظام کے جاہ و اقبال میں ترقی بخشے اور یہ خدمت قبول فرمائے، ان کے طفیل میں اس عاجز بندے اور مولوی سید عطا حسین صاحب کو بھی نوازے۔

ایک سعادت یہ بھی ہے کہ مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ کے لیے میری سفارش پر حضور نظام نے پچیس ہزار روپئے کلدار منظور فرمائے۔

عرض صلوٰۃ و سلام کا سلسلہ جاری کرنا ایک سعادت عظمیٰ یہ بھی بحمد اللہ حاصل ہے کہ اس عاجز بندے کو جناب سے ایک گونہ وظیفہ منیرہ کے حضور میں درود و سلام پیش کرتا رہتا ہے جیسے اخوی صاحب مولوی عبد الجلیل خان صاحب مقیم مدینہ طیبہ ہیں، از راہ شفقت بندگانہ موصوف اس سعادت کے

مجھ کو برابر یاد دلاتے رہتے ہیں، ایک قرابت دار کے ذریعے سے میں نے درود و سلام عرض کیا تھا
لکھتی ہے، امین صاحب مدینہ شریف سے ۱۰ر جمادی الاخریٰ ۱۳۸۲ھ کو تحریر کرتے ہیں:۔

"آج پچھلی رات کے حصے میں بحضور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حاضر تھا، خود بخود میرے دل میں یاد آیا بالوکالۃ آپ کی طرف سے عرض کیجیو، صلوٰۃ و سلام پیش کرنے کو کہا گیا یہ خیال چھا رہا تھا، چنانچہ اطلاع عرض کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔"

دوسرا مکتوب:۔

"خوشخبری مسعود اکرم و جمیل ڈیڑھ مہینہ تک حرم شریف میں حاضری ہو سکی، بیماری کی وجہ سے حاضری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت آپ کی یاد خود بخود میرے دل میں پیدا ہوئی، جب میں فاتحہ و درود پیش کر چکا آپ کی طرف سے میرے دل میں اشارہ ہوا، سورہ فاتحہ اور پڑھو، چنانچہ تین بار وہ بھی آپ کی طرف سے پڑھی گئی۔"

(۔ رجب المرجب ۱۳۸۲ھ)

فالحمد للہ تعالیٰ حمداً طیباً کثیراً مبارکاً فیہ۔ تم بالخیر

حبیب الرحمٰن

حبیب گنج ضلع علی گڑھ، ۱۰ر رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ یوم جمعہ

متفرقات

شب جمعہ، ۱۰ر شوال المکرم ۱۳۳۶ھ بمقام حیدرآباد۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ مدینہ منورہ میں حاضر ہوں کہ ایک مکان میں ... ہوں ... دل
اس صورت سے باغ باغ ہے کہ دوبارہ حاضری نصیب ہوئی نفیس ... میں ...
وہ طلب دیکھ کر ... سے ... پر کر ... سفر ... کر ...

کی بابت یہ مشہور قول ہمارا ہے کہ اس شب سے پہلے جمعہ کی شام کو میلاد نواب مہدی یار جنگ بہادر کا ان دونوں کے متعلق اہم مشورہ ہوا تھا جو حکومت حجاز کے ایک مراسلہ کے مضمون سے مسجد نبوی کی تعمیر میں پیش آگئی ہیں، حاضری مدینہ منورہ و سفر مکہ مکرمہ اور وفور مسرت دل کیا عجب ہے کہ کامیابی و دفع مشکل کی بشارات ہوں۔

کل شب کو مولوی میر فیض الرحمٰن صاحب ناظم دال نے رحلت کی، اللہم اغفرلہ وارحمہ۔ مرحوم بمبئی سے مکہ مکرمہ تک سفر حج میں رفیق تھے، اور اپنے رفیق، میری علالت کی وجہ سے مدینہ طیبہ پہلے پہنچ گئے تھے، حاضری پر اس مبارک بقعہ میں ملاقات ہوئی تو مل کر فرط محبت سے بہت روئے، ان کا مرحوم سفر حج میرے سفر کے اعلام میں شامل ہو سکتا ہے، اس لیے یہاں تحریر ہوتا ہے،

جب میرا ارادہ حج کا مصمم ہو گیا اور سرکار سے اجازت مل گئی تو مولوی صاحب ملاقات کو آئے، اثنائے کلام میں کہا کہ چار مہینے کی رخصت میں نے بھی لی ہے، میں نے سبب رخصت دریافت کیا تو کہا استحقاق تھا، کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں، آرام کے خیال سے اعزہ کے ہاں جاؤں گا، میں نے کہا کہ اور رخصت لیکر عزم حج کر دیجئے، رفاقت ہو جائیگی، دفعتہ یہ صورت پیش ہوئی، کہا سامان نہیں کس طرح ہو سکتا ہے، اگر کہا چلتے وقت میں نے کہا غور کر لیجئے، اب اتنا اثر ہو گیا تھا کہ غور کرنے کا وعدہ کیا، غالباً تیسرے روز آئے اور مجھ سے تذکرہ کیا کہ ارادہ مصمم ہو گیا، چار دوست اور آمادہ کر لیا ہے، ان میں ایک حکیم [illegible] مرحوم وکیل بھی تھے، چنانچہ مولوی صاحب مع چاروں دوستوں کے بمبئی آکر شریک قافلہ ہو گئے، اس طرح ان کے ارادہ سے وہ خود اور [illegible] اور جلد دنیا سے [illegible] سعادت حج سے مشرف ہو گئے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو آخرت کی نعمت بخشے، [illegible] حقیقت و صداقت قرین ہے۔

۱۶ ر شوال المکرم ۱۳۵۳ھ دو شنبہ

تعمیر مسجد نبوی کا ایک دوسرا پہلو | گذشتہ رمضان المبارک کے آخر [illegible] کی

حسب معمول باغ میں ٹہل رہا تھا، اور اوراد سے فارغ ہو چکا تھا، لانے کا ایک پھول نو شگفتہ نظر آیا، اس کی رعنائی و شادابی نگاہ میں کھب گئی، دیر تک دیکھتا رہا، جتنا دیکھا اسی قدر نیا انداز رعنائی پیدا ہوتا گیا، بقول مرزا داغ، ع

اک نیا انداز پیدا ہو گا جتنا دیکھئے

جب اس کی تابش نے دل کو مبہوت سا کر دیا تو تعجب ہوا کہ کس قدر رنگینی و دل آویزی اس پھول میں ہے، ع

ز سرخی و تری خواہد چکیدن

آفتاب بلند ہو چکا تھا، خیال ہوا کہ آفتاب پھول کی تابش کو ترقی دے رہا ہے، اس خیال کے آتے ہی خیال آیا، اپنا بھی آفتاب ہے، اس خیال کے آتے ہی روضۂ مبارک کے گنبد خضرا کا تصور بندھا، اور پھول کی طرح قلب کو اس آفتاب انوار سعادت کے مقابل پایا، ایک کیفیت رقت پیدا ہوئی، پھول اپنے ہی قلب کی سیر تھی، لالہ غائب ہو گیا، دیر تک یہ عالم رہا، فالحمد للہ تعالیٰ علیہا۔

ایک خواب

یوم الخمیس، ۱۰ رجمادی الآخر ۱۳۴۱ھ حیدرآباد، پچھلی شب کو خواب دیکھا، ایک میدان ہے اور بڑے بڑے درختوں کا باغ ہے، باغ کے ایک جانب میدان میں ایسا سماں ہے جیسا حکام کے دورے کا ہوتا ہے، خیمے ہیں، بڑی سی میز ہے، اس کے دونوں طرف کرسیاں بچھی ہیں، میز کے صدر میں کوئی افسر ہیں، جو امتحان لیتے ہیں، ایک پہلو سے دو کرسیاں، دوسرے پہلو پر بھی کرسیاں ہیں، ایک جانب میں ہوں، میرے برابر کی کرسی پر حضرت آدم علیہ السلام تشریف فرما ہیں، سامنے کی ایک کرسی پر مولانا سید سلیمان اشرف صاحب ہیں، دوسری پر مولوی سید ضیاء الدین صاحب ہیں، طالب علم دینیات کا امتحان دینے ایک ایک کر کے آتے ہیں، میز پر کاغذ ہے جو کہ سوال کا جواب دیتے

مشق عالم کون میں یہ خیال میں نہیں رہا کہ دیکھا بھی یاد نہیں، اسی اثنا میں ایک خوبصورت، دو بچے گورے چٹے تندرست، پانچ چھ سال کے بچے میز کے کنارے سے لگے، اوپر جانا چاہتے تھے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے ان کو روک کر مسرت و محبت کے لہجے میں فرمایا کہ پہلے مجھکو پیار تو کر لینے دو، خدا کا شکر ہے کہ اب بھی میری اولاد میں ایسے دیندار بچے موجود ہیں، یہ کہکر خوب ان کو پیار کیا، اسکے بعد مولوی سید سلیمان اشرف صاحب اور مولوی سید زین الدین صاحب رخصت ہو کر چلے، میں بھی رخصت کر کے چلا، باغ کی دوسری جانب ایک چھوٹے خیمے میں چائے ناشتہ کا اہتمام تھا، قصد یہ ہوا کہ جانے سے پہلے دونوں صاحبوں کو چائے پلا دی جائے۔ باغ کے اندر داخل ہوئے تو وہ دونوں صاحب تو آگے بڑھ گئے، میں پیچھے رہ گیا، دیکھا کہ دو چیتے پلے ہوئے ہیں، جیسے آجکل یہاں سرکار میں شکار کے لیے تیار کیے جاتے ہیں، ایک ذرا بڑا اور بھاری ہے، وہ تو زنجیر میں بندھا ہوا ہے، ایک ذرا اس سے جسم میں ہلکا ہے وہ کھلا پھرتا ہے، میرے پہنچنے پر میرے پاس آیا، گزر گیا، دوسری مرتبہ آیا ذرا گھور کے مجھکو دیکھا، اس کا میں نے خیال نہیں کیا، اس نے میری بائیں جانب میری آنکھ کو دیکھا، جو سرخ تھی، اب مجھکو ایسا خیال ہوا کہ مبادا حملہ کرے، اب اس نے اور زیادہ نگاہ جما کر دیکھا اور اس کی وحشت کے آثار نمایاں ہوئے، اس وقت تردد ہوا کہ حملہ کرنے والا ہے، اس کے تربیت کرنے والوں میں سے کوئی سامنے نہ تھا، آواز دینے میں خیال ہوتا تھا کہ آواز سنتے ہی حملہ کر بیٹھے گا، اس کی وحشت میرے تردد کو ترقی دے رہی تھی کہ ایک بھورا دوسرے جسم کا پتلی سی سانٹا لیے نمودار ہوا، سانٹا کو زور سے زمین پر مار کر للکارا، چیتا ڈر کر بھاگ گیا میں بہ اطمینان دونوں مہمانوں کی جانب دوسری جانب بڑھا، اس عرصے میں آنکھ کھل گئی،

خواب بمقام اعظم گڑھ دار المصنفین

شب ۱۴ شعبان روز جمعہ گویا پھر بمبئی میں ہوں، سمندر کا وہ کنارہ جہاں سے حاج

سوار ہوتے ہیں، ایک موٹر میں چند احباب کنارۂ مذکور دیکھنے گئے ہیں، انھیں میں حاجی محمد اسحاق خاں صاحب رئیس جہانگیر آباد بھی ہیں، میں بھی ہوں، موٹر سمندر کے رخ سڑک پر کھڑی ہے، سڑک بلند اور سپید ہے، سامنے گھونگھٹ کی دیوار ہے، دائیں بائیں اس میں ایک ایک دالان ہے، بائیں دروازہ حاجیوں کے جانے کا ہے، میرے قلب پر رقت طاری ہے اور آنسوؤں کا تار آنکھ سے بندھا ہوا ہے، نواب صاحب موصوف میری طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے ہیں، تھوڑے توقف سے دیکھا، مدینہ منورہ میں آستانۂ نبوت پر حاضر ہوں، مزاج اقدس شگفتہ ہے، کاشانۂ نبوت میں رونق افروز ہیں، میں باہر اجرائے احکام اسلام کے لیے عمال اطراف میں بھیج رہا ہوں، یہ دیکھ کر آنکھ کھل گئی۔

جمعہ کے وقت مسجد دار المصنفین تو تعمیر دمرۂ نواب سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب کا افتتاح ہوا، میں نے نماز پڑھائی، آیۂ انما یعمر مساجد اللّٰہ الخ کا بعد نماز بیان کیا، اعظم گڈھ اسی لیے گیا تھا، دل میں خیال تھا کہ مقبولیت مسجد کا اشارہ پایا۔

جذبات عقیدت

از قاضی فدا حسین صاحب اٹیہ (پیربھائی)

در حبیب لائے حبیب وارد ہے دل یقین کیجے آسان ہوگی ہر مشکل

تاریخ مراجعت سفر حج ہنگام ملاقات از شاہ سید ابراہیم صاحب خلیل مدیری بدا ہشتم ورند

چو مبارک و خجستہ
۱۳۴۵ھ

مصرعہا بر تاریخ مذکورہ

آمد ز حرم حبیب رحمٰن گل چیدہ ز فضل دستہ دستہ

پیوستہ بہ بزمِ قدسیِ وحدت — پیوند ز ما سوا گسستہ
در دیدہ و خاکِ طیبہ نورے — نقشِ کرمش بجاں نشستہ
تاریخ مراجعت خلیلم — گفتہ "حج مبارک و خجستہ"
۱۳۴۵ھ

تحریر مدیر اخبار صحیفہ حیدرآباد

۱۵ ربیع الاول ۱۳۴۵ھ — صحیفہ نگر، پل چادر گھاٹ

عالیجناب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سرزمین تقدس آگین حجاز سے بعد فریضۂ حج وزیارت مقامات مقدسہ مع الخیر والعافیہ مراجعت فرمائے ہند ہونے پر اس نیاز نامہ کے ذریعہ سے تبریک وتہنیت پیش کیجاتی ہے اور تمنا ہے کہ اس سعادت سے وہ در ماندگی جلد بہرہ اندوز ہو جو ابتک محروم ہیں۔

جناب والا کے عزیمت افروز حجاز ہوتے وقت ملاقات نہ ہو سکنے کا قلق رہا، شاید اسی کا اثر ہوگا کہ ایک خاص ملاقات عالم رؤیا میں نصیب ہوئی، غالباً ماہ صفر المظفر کی ۱۷ تاریخ تھی لیکن یہ بخوبی یاد ہے کہ صبح جو نکلنے والی تھی وہ جمعہ کی تھی، شب کے ساڑھے چار بجے کا وقت تھا، خواب میں جناب کو دیکھا کہ ایک بلند مقام پر ایک منبر پر اس طرح ایستادہ ہیں جس طرح ٹاؤن ہال میں تقریر فرمائی تھی، انداز یہی ہے کہ میلاد پر تقریر فرما کے فارغ ہو چکے ہیں، اس کے بعد مجھ سے خطاب کیا ہے کہ بیان کرو، میں نے بلند آہنگی سے یہ آیۂ کریمہ پڑھی، الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

ٹھیک یاد نہیں کہ میں نے اس آیت کو دوسری اور تیسری مرتبہ بھی پڑھا یا نہیں لیکن ایک مرتبہ بہت صاف وواضح پڑھکر سنایا، اتنے میں بیدار ہو گیا، چونکہ خواب موکد تھا، بالکلیہ محفوظ رہ گیا، تذکرۃ الحبیب کی مفصل سالانہ پیش نظر ہے، گوناگوں معروفیتوں کا ایک حصہ اب کچھ کچھ

اختتام کو پہنچ رہا ہے، اس کے بعد عون ایزدی سے توقع ہے کہ اس قابل ہو سکوں کہ جو تقریریں
تاحال حافظہ میں ہیں وہ کاغذ پر آجائیں، اس کے بعد طباعت شروع کرا دی جائے۔ فقط

خاکسار محمد اکبر علی، مدیر اخبار صحیفہ حیدرآباد دکن

مخدومنا المعظم و مطاعنا المحترم صاحب الفضل والمجد والکرم   زید مجدہم السامی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ   جزاکم اللہ و تقبل اللہ منکم

اس وقت یہ یادداشت پیش نظر ہے، اور آج سے دو برس قبل وہ سماں پیش نظر تھا، جو انتہائی سکون اور غایت فراغ قلب کا ایک سچا نمونہ تھا، فارسی کا ایک شعر ہے ؎

بگیر ترک تعلق و وا رہ ز ہر خرابی   میان آب ہم بماست خشک پر بط مست

اس کا یہ مصداق جیسا کہ میں نے آپ کے سفر حجاز کو پایا، ایسی دوسری مثال میری نگاہ سے نہیں گذری، بعض اہل اللہ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا ہے لیکن ان کی جناب میں دنیا کو کہیں جگہ نہیں دی گئی تھی، وہ تھے اور خدا کی یاد تھی، عبادت کا سرور تھا، فکر و مراقبہ کی سلطنت تھی، وجد و سرور کا خزانہ تھا، جب اس عالم سے کوچ کا وقت آیا تو اپنی سلطنت اپنا خزانہ اپنے ساتھ لیتے گئے اور ظاہرا اجر غیر ممنون کا نقشہ دکھا گئے، لیکن اس مشاہدے کے نتیجہ میں ہم زدہ دل آنکھیں محروم ہیں، الحمد للہ کہ آپ کے سفر نے یہ نظارہ بھی دکھا دیا، ریاست و جاہ، دولت و جائداد سے گھر مالا مال، ایک سلطنت کے رکن رکین، انا امرا الکم و اعلاء کے مستبد سلاسل ہر چہار طرف سے محیط لیکن جب وقت رب جلیل کے بیت عظیم اور آستانۂ رؤف و رحیم صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کا آیا تو ساری سنگینی زنجیریں تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ گئیں، اور والہانہ شوق جس میں استقامت کا وقار عجیب انداز پیدا کر رہا تھا، اس شان سے لے چلا کہ جیتا محسوس ہو رہا تھا کہ رحمت الٰہی اپنے لطف خاص کے ساتھ تشریف جا رہی ہے۔ بیشک کار دنیا مشغول ست ونجیب ؎

این سعادت بزور بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

یہ اثر میرے دل پر اس وقت ایسا گہرا ہوا تھا کہ اس کا متعدد مجالس میں میں نے ذکر کیا ہے، اور پھر بھی یاد تازہ ہے،

واردات اور کوائف قلبیہ اس کا یقین دلاتے ہیں کہ حج مبرور اور زیارت مقبول ہوئی، فقہاء، محدثین، مشائخ اور صوفیہ نے بھی علامتیں تحریر فرمائی ہیں، کلام پاک سنانا، حدیث مقدس کی اجازت لینا، یہ تحفۂ سرمدی ہے، جو آپ کو عطا ہوا، اسی پاک مقام پر قرآن پاک کا نزول ہے اور اسی مقدس بقعہ سے وحی غیر متلو کی سعادت امت کو حاصل، پھر اب اور کیا چاہیے، خادم بنکر خدمت جاروب کشی کی سعادت حاصل کی اور علم کا خلعت جو عطا ہوا اسے پہنکر تعلیم کلام پاک اور امامت نماز۔ تقبل اللہ منکم ثم تقبل اللہ منکم۔

دل چاہتا تھا کہیں مسافر ہیں عزم سفر کے وقت یہ حسرت کے آثار تھے وہ جب حرمین شریفین تا شرعاً و عقلیۃً پہنچکر سامان خاص پیدا ہوگا تو رحمت و انعام کے کیسے کیسے خلعت پہنے ہوں گے، ذوق آتا ہوتا لیکن حیدرآباد کی مصروفیتوں نے اس کا موقع نہ دیا، سوال کرنے سے شرم آتی تھی، اس لئے کہ محرومیت کی قابلیت نہ تھی، مگر آنجناب کا کرم جسے میں اپنی خوش نصیبی جانتا ہوں ہر موقع پر جیسا کو یاد رکھتا ہے، اس لئے خود ہی بڑھکر حسب معمول یہ تمنا بھی پوری کر دی، جزاکم اللہ جزاکم اللہ۔

دو ڈھائی ماہ کی خدمت اور کیفیت استقلال پڑھ کر دل سے بے ساختہ دعائیں نکلیں، خوش نصیب اس ماں کے بچے سے فخر ہر ایسا خوش ہوا اور جس کو ایسی مبارک سرزمین پر ایسی خدمت اور اعتکاف رسالت کی سعادت حاصل ہو۔ ربنا تقبل منہما۔

حضرت مولانا گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک خاص نسبت حضرت سیدہ فاطمۃ الصدیقہ رضی اللہ عنہا سے تھی، یہ اسی نسبت کا پرتو تھا جو مزار مقدس پر حاضری کے وقت کچھ ہوا اور جو

گھونٹا اعمال صالحہ اور عقیدت حسنہ ہے، اس کی رفتار بنا بر سنوار عمل کی صداقت اور عقیدہ کی رزانت ہے، بیعت آپ کی سلسلۂ عالیہ نقشبندیہ میں ہے، اس لیے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ایک طرف اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسری طرف ہونا نسبت محمدی اور نسبت صدیقی کا جلوہ ہے۔

الحمد للہ دو مرتبہ اس یادداشت مسمی بہ "فوز عظیم" کو اس وقت تک پڑھ چکا ہوں، ہر بار ایک نیا لطف دل نے محسوس کیا، باوجود تاریکی قلب آپ کے پر درد جوش عقیدت میں ڈوبے ہوئے جملے کیفیت پر کیفیت پیدا کرتے گئے، میں انداز تحریر سے یوں خوش ہوں کہ حال قال میں پوری طرح جلوہ نما ہے، جزاکم اللہ وتقبل اللہ منکم۔ زیادہ اللہ بس و باقی ہوس۔

حررہ بقلمہ

فقیر محمد سلیمان اشرف عفی عنہ

۲۷ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ شب دوشنبہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ کہ بعنایات و برکات خاتم الرسل، رحمۃ للعالمین، امام الانبیاء و المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم آج بتاریخ ۱۰ ذیقعدہ ۱۳۴۶ھ اس "فوز عظیم" کی دید اور مطالعہ آثار و ثمرات سے مستفیض ہونے کا موقع اس عبد خائن کو ملا جس کی پینتیس ۳۵ سالہ زندگی غالباً صرف خیانتوں میں بسر ہوئی،

رب اغفرلی وتب علی، انک انت التواب الرحیم۔

اس کتاب نے یا چند اوراق نے جو اپنے انتساب کی بدولت قدسی آب ہو چکے ہیں مجھ کو کیا اثر دیا الا اسے قلمبند کرتا ہوں، واللہ علی ما نقول شہید۔ یہدی واللہ مخلصین اللہ کی تفسیر باطن کے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہدی الیہ من ینیب کے قلبی نتائج، جو قلبی تجربات ...

ان کو ایسے قلم سے مکتوب پایا جس کے متعلق میرا وجدانی تجربہ ہے کہ اس کے الفاظ، حتی الوسع اپنے معانی کے حدود سے متجاوز نہیں ہوتے، رحمہ اللہ الکاتب المغفور السعید۔ کہ انھوں نے اپنے جیتے جاگتے احساسات اور مشاہدات و مبشرات کو احتیاط کے ساتھ جمع فرمایا ہے، اغراق و غلو سے پاک، وساوس و خطرات نفسانی سے مصفا وارادت کا یہ مجموعہ ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندہ خالق رحمٰن کی جستجو ناکام نہیں ہوتی، بیت اللہ کے داخلہ کا احساس اور روضۂ مطہرہ مقدسہ میں خادموں کے ساتھ اسی حیثیت کے ساتھ داخل ہونا جس حیثیت سے ایک امت مرحومہ کے ایک فرد مرحوم کو داخل ہونا چاہیے، اور اس کے بعد تمام ذہنی تغیرات کی تحلیل کے بعد بھی غیر اختیاری سکون کی یافت، دلیل ہے کہ انسانی روح صرف کسی کے خیال اور دھیان سے نہیں، بلکہ مطلوب کی قرب واقعی و نفس الامری سے اسی طمانیت کو حاصل کرتی ہے جو تصور و خیال کے نتائج سے قطعاً ممتاز ہے، مجھ پر خارجہ کے تاثر کا اثر، عرفات کے تاثر اضطراری سے کم مترتب نہیں ہوا، اور معلوم نہیں کہ جامع اوراق کے بیان کے سبب سے بلکہ اس وقت سے جس وقت انھوں نے اپنی زبان مبارک سے اس مراقبہ وجدان و ذوق کا تذکرہ کیا ہے، ایک خاص نسبت پیدا ہو گئی ہے، اور اکثر اس کا خیال آکر عجیب و غریب ہیجانوں کا ایک سلسلہ دل و دماغ میں ہلچل ڈالتا ہے۔

ع۔ خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

بہر حال مبارک ہے وہ شخص جس کو احمد کی شہادت میں بسطہ کی بشارت سنائی گئی، جس کے دل پر فضل ربانی و توجہات نے لنگر کا کام کیا، اور جس کے لیے اسٹیشن پر، خود اس کے پیر و مرشد رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت انگوٹھی کے ساتھ مجسم ہوئی، اور جس کے لیے نجد کے وحشیوں نے رافت و رحمت کا کرشمہ اپنے اندر محسوس کرایا، اور جس نے عرفات میں وہ دیکھا جو "انھوں اور ہم قد" والے کو کھلا ہوا ملتا ہے، اور محمد کی دعا پر اس کے ارادہ و اختیار کو سوخت کر کے خود کریم کریم بنکر آیا،

اور اس سے وہی کھلوایا جس کا وعدہ اپنے اچھوں سے کرتا ہے۔ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ
اور جس کے لیے کوثر کے پیمانہ بردار صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طیبہ کا آب زلال عالم شہادت میں اس
احساس کے ساتھ بھیجا کہ پانے والے نے اس کو اسی طرف سے پایا جہاں سے وہ آیا تھا۔ کتنی قیمتی
ہے وہ جار رب جی کو لے نواب صدر یار جنگ بہادر آپ نے کس زمین مبارک پر سجدہ ریزی کے لیے
چھوڑا ہے، وانت حل بہٰذا البلد کی قسم وہ کھاتا ہے، جس کی قسم سب کھاتے ہیں۔ مفسر
نے کو معظمہ مراد لیا ہو لیکن وصف کا اشتراک، ملکہ اس تخصیص، اس قسم کو کہاں پھیر دیتی ہے، آپ نے
تاثیر قرآن کا جلال اور امت کی آسانیوں کی اشاعت کرنے والی حقیقت صدیقیہ کو محسوس کیا،
عمر بھر میں قرآنی دشت کے کوچہ کی خاک چھانتے رہے آج اس کے سرچشمہ پر پہنچ کر نصیب ہوا،

الحاصل آپ نے مجاہدہ کیا، شعب ابی طالب کے پاس ہی، آپ پر بھی تین سال کیلئے
نہیں بلکہ چند دنوں کے لیے کھانا پینا کسی وجہ سے روکا گیا، تو پھر اس کا شکر کیوں نہیں ادا کیجئے
اس گمنامی میں آپ کی غم خواری بھی اسی حقیقت کے رنگ میں رہی جو ابو طالب کے شعب میں
اس کے درجہ کے لحاظ سے غم خواری کر رہی تھی۔ جعل اللہ ما بھا مع ما بھا۔ اس گمنامی سے نکلنے
کے بعد، آپ حرم محمدی علی صاحبہ الف سلام و تحیہ سے روانہ ہوئے، اور ٹھیک رات کی تاریکی
میں جس میں چاندنی کا نور ہو رہا تھا، آپ نے اپنے بے تاب نفس کو اپنی بالوں کے نیچے پایا ہوگی
چال کا حال براق کے علاوہ میں پڑھیے، میں کس قدر غبطہ کروں، کس قدر شک کروں کہ جبریل امین
کی جگہ آپ کا عروج اس واسطہ کبریٰ جلیلہ کے ذریعہ ہوا جس سے بلاواسطہ انسان اور
خدا کے درمیان کوئی پردہ نہ ہوگا۔ آپ نے "صدیقیت" کی اشاعت میں اپنے کو شریک کیا تھا
پھر دیکھا کہ اس کا معاوضہ کس شکل میں ملا، بہت کم وہ، اور بہت زیادہ، اور جس کا تصور کیا گیا
تھا، جو آیت کا منشاء معراج کی میں ہوا تھا، اسی کا ظہور شہادت میں ہوا کہ محمد کے

گذر گئے ہوں گے، دعا ہے ابراہیم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابراہیمی فرض کو ادا کرنے کے بعد اذا جاءَ نصر اللہ والفتح الآیۃ۔ کی سورہ سنا کر صدیق اکبرؓ کے سینۂ انور یعنی طوفانِ غمِ فراق کے سمندر کو متلاطم کر دیا،

پھر آلِ یعقوب کو اگر ولا تیئسوا من روح اللہ کی شہادت سناتے ہوئے کوئی اسمٰعیلی دیوانہ یہ کہے کہ "جائزہ دلانے" کا ظہور ہونے والا ہے، تو اس اچھی اور پاک امید کا کیوں نہ انتظار کیا جائے، آپ نے غضب کر دیا،

"ایک سیاہ کار کو اس پیاری رات کی ٹھنڈی چاندنی میں اس کوہستان میں ہاں انہی پاک میدانوں میں، جس کے متعلق دل کے کیا کیا ارمان ہیں، اللہ اکبر اس عروج کی حالت میں اپنے دامنِ عالی میں جگہ دیدی، جس کا وہ کسی طرح مستحق نہیں تھا، ای "بے شک" فرمانے والے اپنے پر کیا کیا"

حدیث میں آیا ہے کہ تہلیل و تسبیح حولِ عرش میں گھومتی ہیں، اور مسبح کا ہلل کی یاد دلاتی ہیں، کیا کہوں کہ آپ میرے کیا بن گئے، بس اب آپ اس عبدِ خاطی کے لیے استغفار کیجئے اور اسی طرح اپنے قلبِ صافی میں کبھی کبھی گذرنے کی اجازت مرحمت فرمایئے، حدیث میں ہے:

من استغفر للمؤمنين والمؤمنات في كل يوم خمس عشرة مرات يرزق بعمه

اهل الارض

المستغفر لذنوبہ

مناظر احسن گیلانی

اور اس سے وہی کھلوایا جس کا وعدہ اپنے اچھوں سے کرتا ہے۔ ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ
اور جس کے لیے کوثر کے پیمانہ بردار صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عطیہ کا آب زلال عالم شہادت میں اس
احساس کے ساتھ بھیجا کہ بانٹنے والے نے اس کو اسی طرف سے پایا جہاں سے وہ آیا تھا۔ کتنی قیمتی
ہے وہ جاروب جس کو لے نواب صدر یار جنگ بہادر آپ نے کس زمین مبارک پر سجدہ ریزی کے لیے
چھوڑا ہے، وانت حل بھذا البلد کی قسم وہ کھاتا ہے، جس کی قسم سب کھاتے ہیں، مفسرین
نے گو مظہر مراد لیا ہو لیکن وصف کا اشتراک، بلکہ اتنی تخصیص، اس قسم کو کہاں پھیر دیتی ہے۔ آپ نے
ناشر قرآن کا جلال اور امت کی آسانیوں کی اشاعت کرنے والی حقیقت صدیقیہ کو محسوس کیا،
عمر بھر جس قرآنی دشت کوچہ کی خاک چھانتے رہے آخر اس کے سرچشمہ پر پہنچ کر نصیب ہوا۔

الحاصل آپ نے مجاہدہ کیا، شعب ابی طالب کے پاس ہی، آپ پر بھی تین سال کے لیے
نہیں بلکہ چند وقتوں کے لیے کھانا پینا کسی وجہ سے روکا گیا، تو پھر اس کا شکر کیوں نہیں ادا کیا
اس گھاٹی میں آپ کی غم خواری بھی اسی حقیقت کے رنگ میں رہی جو ابوطالب کے شعب میں
اس کے وجہ کے لحاظ سے غم خواری کر رہی تھی۔ جعل اللہ ما بہا مع ما بہا۔ اس گھاٹی سے نکلنے
کے بعد آپ مرحوم محمد علی صاحب الف سلام و تحیہ سے روانہ ہوئے، اور ٹھیک رات کی تاریکی
میں جس میں چاندنی کا نور موج مار رہا تھا آپ نے اپنے بے تاب نفس کو اپنی بالوں کے نیچے پایا، کی
چال کا حال براق کے حالات میں پڑھیے، میں کس قدر ضبط کروں، کس قدر رشک کروں کہ جبرئیل امین
کی جگہ آپ کا عروج اس واسطۂ کبریٰ جلیلہ کے ذریعہ سے ہوا، جس سے بلا واسطہ انسان اور
خدا کے درمیان نہ کوئی ہوا نہ ہوگا، آپ نے "صدیقیت" کی اشاعت میں جسے کو فخر کیا تھا،
چھوڑ کیا کہ اس کا سارا حصہ کس شکل میں ملا، بہت کم رہا اور بہت زیادہ لوٹ کا تماشا کیا، عجیب
تھا جو آیات کا مشاہدہ معراج کی میں ہوا تھا، اسی کا ظہور شہادت میں ہوا کہ جو حقیقت [illegible]

گذرتے ہوئے دعائے ابراہیم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے ابراہیمی فرض کو ادا کرنے کے بعد اذا جاء نصر اللہ والفتح الآیۃ۔ کی سورہ سنا کر صدیق اکبرؓ کے سینۂ انور میں طوفانِ غمِ فراق کے سمندر کو متلاطم کر دیا،

پھر آلِ یعقوب کو اگر ولا تیئسوا من روح اللہ کی شہادت سناتے ہوئے کوئی اسماعیلی دیوانہ یہ کہے کہ "جائزہ دلانے" کا ظہور ہونے والا ہے، تو اس اچھی اور پاک امید کا کیوں نہ انتظار کیا جائے، آپ نے غضب کر دیا،

"ایک سیاہ کار کو اس پیاری رات کی ٹھنڈی چاندنی میں اس کوہستان میں ان الٰہی پاک میدانوں میں جس کے متعلق دل کے کیا کیا ارمان ہیں، اللہ اکبر اس عروج کی حالت میں اپنے دماغ عالی میں جگہ دیدی، جس کا وہ کسی طرح مستحق نہیں تھا، ای بے شکستہ فرزانے اپنے یہ کیا کیا"

حدیث میں آیا ہے کہ تہلیل و تسبیح حول عرش میں گھومتی ہیں، اور مسبح و مہلل کی یاد دلاتی ہیں، کیا کہوں کہ آپ میرے کیا ہی گئے، بس اب آپ اس عبد خاطی کے لیے استغفار کیجئے اور اسی طرح اپنے قلب صافی میں کبھی کبھی گذرنے کی اجازت مرحمت فرمایئے، حدیث میں ہے:

من استغفر للمومنین والمومنات فی کل یوم خمس عشرۃ مرات یرزق بعمہ
اھل الارض

المستغفر لذنوبہ

مناظر احسن گیلانی

سفرنامۂ مصر و شام و روم

۱۸۹۲ء میں مولانا شبلیؒ نے جو سفر کیا تھا اس کے حالات و واقعات، یہ سفرنامہ دور میں ممالک اسلامیہ کا سفرنامہ ہے جس میں ٹرکی، مصر اور شام کے علمی تعلیمی و تمدنی حالات کی تصویر کھینچی ہے،

صفحات ۲۲۲ صفحے قیمت:- ۳/ے

منیجر

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

ضلع بریلی (۲)

از
جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی

(۶)

اسی عہد کے بریلی کے ایک اور شاعر مرزا عباس بیگ مرزا ز کی ندیم کی اولاد میں تھے، مدت تک رامپور میں رہے، پھر لکھنؤ جاکر آتش کے شاگرد ہوگئے، اور ان کے مشورے سے نادر تخلص اختیار کیا، لکھنؤ سے باندہ گئے، اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ میں چالیس سال کی عمر میں بغاوت کے الزام میں پھانسی پائی، اس الزام کا باعث ان کا درج ذیل شعر تھا، جس میں انگریزوں کو اپنی توہین نظر آئی تھی،

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے   گوروں کے ہاتھ اٹھ گئے کالوں کے سامنے

منجملہ دیگر تصانیف کے ان کی ایک ایسی مثنوی بھی تھی جس میں انھوں نے فسانۂ عجائب کو لیلیٰ مجنوں کی بحر میں نظم کیا تھا، دیوان بھی مرتب کیا تھا لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا،[1] نمونۂ حسب ذیل اشعار درج ہیں:-

بدلا ہوا ہے رنگ سیاہی گھٹا کی ہے   لا ساقیا شراب کہ رحمت خدا کی ہے
پیتا نہیں شراب کبھی بے وضو کئے   قالب میں میرے روح کسی پارسا کی ہے

---

[1] انتخاب یادگار صفحہ ۲۱۸ - خمخانۂ جاوید، جلد چہارم ص ۵۹۰

باب قبول کھلتی ہے جس کو تمام خلق — کھڑکی وہ اے صنم تری دولت سرا کی ہے
عباس روز حشر یہ کہتا انھوں کا میں — لوٹا مجھے بتوں نے دہائی خدا کی ہے

رائے گنگا پرساد رونق خلف منشی بھوانی پرشاد بریلی کے رؤسا میں تھے، اور ڈپٹی کلکٹری کے عہدے پر فائز تھے، ان کے دو شعر بطور نمونہ کلام پیش ہیں[1]،

آغاز میں نہ فکر کی انجام کے لیے — چھوڑا خدا کو الفت اصنام کے لیے
تو بھی تو کام دل کبھی ہوتا نہیں حصول — گر جان دیجئے بت خود کام کے لیے

پنڈت دیوی پرساد صادق بھی انیسویں صدی کے وسطی زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، تذکرہ نادر میں ان کے درج ذیل اشعار بطور نمونہ ملتے ہیں[2]۔

خوف دوزخ کا نہیں اور نہ جنت کی ہوس — ہم غرض رکھتے ہیں اس صورت نورانی سے
کیا عجب ہے جو عنایت سے خدا کی صادق — بڑھ کے ہو میری غزل سعدی و خاقانی سے

سید عرفان علی عرفان کا ذکر بھی نادر نے اسی عہد کے شاعروں میں کیا ہے، بریلی ان کا وطن تھا، اور وہ خود نواب محمد علی خاں بہادر رئیس شمس آباد کے لڑکوں کے اتالیق اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے[3]،

ان کا ایک شعر پیش ہے،

مہ انور کو کچھ نسبت نہیں ہے روئے جاناں سے — ضیا اسکے کف پا میں ہے افزوں ماہ تاباں سے

مولوی محمد بخش نازاں کرامت علی شہیدی کے شاگرد تھے اور فن شعر میں کافی دخل رکھتے تھے[4]۔

ان کا درج ذیل شعر بطور نمونہ کلام پیش ہے،

[illegible] — زنجیر میں اندازہ ہے زلفوں کی رسن کا

میر [illegible] وحشت مراد آباد علی بخش خلف میر غلام علی عشرت کے بیٹے اور شاگرد تھے اور سلسلہ ملازمت

---

[1] تذکرہ نادر ص ۴۹، [2] ایضاً ص ۹۵، [3] ایضاً ص ۱۱۰، [4] سخن شعراء ص ۵۰۴

رامپور میں مقیم تھے۔[۱] نمونۂ کلام درج ذیل اشعار ہیں۔

زاہد خشک کا رونا دیکھو — گھر میں خاک اڑتی ہے باہر برسات
تم بھی الٹ دو منہ سے مری جان نقاب کو — بلبل کو گل کے گل دکھاتے ہیں جو بن بہار میں

لطف علی خاں لطف بریلوی بھی اسی دور کے ایک نعت گو شاعر تھے، اور نعت کے ایک دیوان کے مصنف ہیں۔[۲] ذیل کے چند اشعار ان کے کلام کا نمونہ ہیں

اچھا نہ ہو یا رب کبھی بیمارِ محمدؐ — کم ہو نہ کبھی خواہشِ دیدارِ محمدؐ
مومن ہوا جس نے کیا اقرارِ محمدؐ — کافر ہوا جس نے کیا انکارِ محمدؐ
ہے سر میں ازل سے سرِ سودائے محمدؐ — ہے دل میں خیالِ رخِ زیبائے محمدؐ

سید مہربان علی مہر بھی اسی عہد کے ایک دوسرے نعت گو شاعر تھے، بریلی کے باشندے لیکن دربار رامپور سے وابستہ تھے، اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔[۳] انکے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں۔

من زلیخائے جمال دیگرم — یوسف من یوسف بازار نیست
گل جس کو لوگ کہتے تھے پیدا کیا عرق — کہتے ہیں جس کو عطر وہ ہے بوئے مصطفیٰ

نواب بہادر خاں ولد نواب ذوالفقار خاں بن حافظ رحمت خاں معروف تخلص کرتے تھے صاحب دیوان شاعر تھے، نمونتہً درج ذیل شعر پیش ہے:

تا حشر اب خیال دمِ مرا کر گیا دل — تو اس کو مل گیا تو مجھے کیا کر گیا دل

حافظ رحمت خاں کے ایک اور پوتے حافظ محمد عبدالعزیز خاں عزیز ابن محمد سعادت یار خاں ابن محمد یار خاں بھی اسی دور کے بریلوی شاعر اور صاحب دیوان تھے، ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ان کا مجموعۂ کلام ۱۳۱۲ھ میں ان کی وفات کے دو سال کے بعد شائع ہو گیا تھا، انہوں نے حسن و عشق کی صنف

---

[۱] انتخاب یادگار، ص ۲۰۲ [۲] سخن شعراء، ص ۵۰۰ [۳] انتخاب یادگار، ص ۴۲۴

کا بیشتر کلام کب کے عنوان سے ۱۸۰۰ء و نظم میں مجموعہ بھی کہا تھا ان کی نظم بھی ۱۸۵۵ء میں شائع ہو گئی تھی۔[1]

عزیز کے دو شعر بطور نمونہ پیش ہیں:

خوش جاں جیسے مخانۂ دست ہو گی ... شیخ میخانے میں کعبہ کی زیارت ہو گی

نام رکھیں گے وہ ہم لیں گے اگر نام جفا ... بات شکوے کی کہیں گے تو شکایت ہو گی

جولاں ایک آزاد منش وارستہ مزاج درویش تھے جن کا وطن بدایوں تھا لیکن مسکن بریلی تھا،
آتش لکھنوی کے شاگرد تھے، فقر اختیار کرنے کے بعد سیاحی میں زندگی گزار دی یہاں تک کہ ۱۲۶۲ھ (مطابق
۱۸۴۶ء) میں وفات پائی، نمونۂ کلام پیش ہے:[2]

کیا بتائیں کہ ہے کہاں مسکن ... کوئے قاتل میں رہا کرتے ہیں

معشوق پر بھی ہوتی ہے تاثیر جاہ کی ... چمکی کلی جو بلبل بیدل نے آہ کی

ترکِ الفت میں بھی منہ تجھ سے نہ موڑا میں نے ... آ آ جاتا ترے کوچے میں نہ چھوڑا میں نے

خاک سے واں کے ہوا چشمۂ زمزم پیدا ... جس جگہ دامن ترا آ کے نچوڑا میں نے

سید ولایت علی متین مولوی غلام نجف کے شاگرد اور اسی عہد کے بریلی کے ایک شاعر تھے۔
ان کے دو شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں:[3]

تازہ ادا کرشمہ تکلم ہے بات سے ... شکر خدا کہ اب نظر التفات ہے

اب وصال یار پہ ہوتے تو ایاب ... پر کیا کریں کہ پاؤں میں بندھا حنا ہے

سید محمد ہادی احمد نجم بریلی کے رہنے والے پرگنہ [illegible] کے تحصیلدار تھے۔ ان کے دو شعر پیش ہیں:[4]

[illegible] ... گل اِکل ہے تم نے نظر سے

کسے ہے تجھ دل دینے سے انکار ... دو ماتحیں ز قلف کی نظر سے

[1] تذکرہ [illegible] ص ۱۱۱ [2] مخزن نادر، [illegible] [3] تذکرہ ادب [illegible] [4] ایضاً ص ۶۰

کے رئیس اور صاحبِ دیوان شاعر تھے، ان کے دو شعر درج ذیل ہیں[1]

امید | خاک میں مجھ کو ملانے کو احبا آئے
[illegible] | دامن خاک میں چھپ جاؤں جو دعا آئے

[illegible] ور بریلی کے باشندے تھے، لیکن آبائی وطن لکھنؤ تھا، صاحبِ دیوان
[illegible] رہے ہیں، چند شعر نمونۃً پیش ہیں[2]

اس آہِ نارسا نے کلیجہ ہلا دیا | اس گل کے کان تک گئے نالہائے دل
ہوا ہے دفن دل بیقرار پہلو میں | بنا ہے کشتۂ غم کا مزار پہلو میں
کون ہوتا ہے برے وقت میں اپنا یاور | مرد وہ ہیں جو مصیبت میں خبر لیتے ہیں

سید اکبر علی تمیز بریلوی مادشور علی صاحب کے شاگرد تھے، اور ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۳ء) میں شائع ہونے والے رسائل میں ان کا کلام چھپا کرتا تھا[3]، نمونۂ کلام درج ذیل ہے۔

دم نہیں باقی ہے چشم طالب دیدار میں | ہے ضیائے طور کس کے شعلۂ رخسار میں
لے بتوں سے گر خوفِ کردگار رہے | وہ آدمی ہے جو غفلت میں ہوشیار رہے
بتوں کے حکم کی تعمیل کب ہوئی ہم سے | ستم یہ ہو کہ خدا سے بھی شرمسار رہے

منشی غلام اللہ دیا (بقول مالک رام شاکر علی) بسمل بریلوی خلف منشی سرفراز علی ۱۸۲۳ء کے قریب میرٹھ میں پیدا ہوئے، تعلیم مارہرہ اور بریلی میں پائی، مدتوں مارہرہ اور میرٹھ میں ناظر عدالت رہے، پنشن لینے کے بعد مستقلاً بریلی میں مقیم رہے، اور وہیں ۱۹۰۵ء میں وفات پائی، غالب کے شاگرد تھے، اور ان ہی کے رنگ میں کہنے کی کوشش کرتے تھے، آخر عمر میں نعت گوئی سے زیادہ شغف ہو گیا تھا،[4] ان کی ایک مسلسل غزل سے چند شعر پیش ہیں،

---

[1] تذکرہ نادر ص ۱۷۰ [2] سخن شعرا ص ۵۶۸ [3] خمخانہ جاوید ج ۲ ص ۱۸۳ [4] ایضاً ج ۱ ص ۵۰۵ [5] تلامذہ غالب، ص ۸۴

شب جو اشک سے گردوں تک سیلاب تھا | دورۂ چشم کو اک حلقۂ گرداب تھا
واں حنابندی عناں گیر خرام ناز تھی | یاں تن کا بید غرق اشک خونناب تھا
واں رخ پُرنور تھا صبحِ امید زندگی | یاں ہر اک داغ جگر خورشید عالمتاب تھا
واں نگاہِ سرمہ آلودہ بھی گلچین بہار | موجزن یاں چشم تر سے خون کا سیلاب تھا
یاں دلِ شوریدہ کو سر پھوڑنے کا تھا خیال | زیر سر واں غیر کا زانوں برائے خواب تھا
حسن تمکیں آزما کو پاس خودداری ادھر | خانہ زاد عشق کو ملحوظ یاں آداب تھا
ان کو پاس ننگ دامنگیر مجھکو پاس وضع | وہ ادھر بیتاب تھے اور میں ادھر بیتاب تھا
جلوۂ گل اب کہاں وہ شور قلقل اب کہاں | نغمۂ بلبل فسانہ جلوۂ گل خواب تھا
میں نے دیکھا رات بسمل کو پڑا تھا خاک پر | بستر سنجاب نے بالش کمخواب تھا

اسی عہد میں بسمل تخلص کے ایک دوسرے شاعر محمد یار خاں بریلوی تھے جن کا ایک مجموعہ کلام نوحہ بسمل ۱۲۶۵ھ میں شائع ہوا تھا۔

سید رحمت اللہ جنون بریلوی حکیم نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد تھے ۱۸۷۲ء تک حیات تھے۔ شعر خوب کہتے تھے اور بریلی کے مشاعروں کی جان سمجھے جاتے تھے۔ انکے چند شعر درج ذیل ہیں:

دید کے قابل ہے رحم ان کا کہ وقت ذبح وہ | پانی ٹپکاتے ہیں میری حلق میں تلوار کا
مرگ کے بعد ہوا خانۂ تربت پُرنور | شمع کا کام کیا داغ نے روشن ہوکر
عشق نے برباد کر دی حسن کی دولت جنوں | کوڑیوں کے مول یوسف بک گیا بازار میں
بعد مردن بھی اگر آوارگی یوں ہی رہا | خاک اپنی دیکھئے کس کس کے دامنگیر ہو
فنا کے بعد ہو نشانیاں نہ اپنی کہیں | ہوا چمن میں رہے دشت میں غبار رہے
وہ چشم مست دیکھے کبھی جو ایک نظر | تو میں تو کیا ہوں کہ زاہد کو بھی خمار آئے

۱؎ ممتاز علماء دیہ، جلد دوم ص ۳۰۷

دوسرے شاعر قاضی عبدالجلیل تھے۔ ان کے اجداد میں قاضی ثناء اللہ ...ل ۱۲۵۱ھ (مطابق ۱۸۳۵ء) میں پیدا ہوئے اور اٹھارہ برس غالب کے چہیتے شاگرد تھے۔ اور خود فن تاریخ گوئی میں کمال رکھتے ... بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے اور ۱۳۰۱ھ میں وفات پائی۔ کلام ان کا بہت تھا، مگر افسوس کہ انھوں نے خود اسے تلف کر دیا[1]۔ ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں

دیکھ کر اس بت کو کیا کہیے کہ کیا یاد آ گیا | ہم کو اس کی بے وفائی سے خدا یاد آ گیا
جو رخصت ہو کے اٹھ کر پھر گیا تو یوں کہا | کیوں گئے کیوں آئے کیا تجھ کو بھی کیا یاد آ گیا

سامنے سے یوں نکل جاتے ہیں وہ | ان سے گویا کچھ شناسائی نہیں

نہ سہی لطف و عنایت ستم و جور ہی ہو | غم تو یہ ہے کہ نہیں حال کا پرسان کوئی

کہاں یہ تاب کہ آنکھیں ملا سکوں تجھ سے | کہ اک نظر میں دگرگوں ہے حال محفل کا

ہے سر شام ہی سے بھاری رات | ہائے کیسے کٹے گی ساری رات

انھوں نے آئینہ دیکھا تو بنے منہ ان کا | حواس و ہوش بجا ہاں نہیں تو ہاں بھی نہیں

ہجر میں کون تھا ہمارا ہمدرد | کچھ ترے غم نے غمگساری کی

مرزا ہادی حسن ہتوابی انیسویں صدی کے آخری عہد کے ایک بریلوی شاعر ہیں، وہ اسیر کے شاگرد تھے[2]۔ ان کے چند شعر پیش ہیں،

روتے ہیں اپنے حال شکستہ پہ صبح تک | منہ ڈھانکے ہیں دامن چاک سحر سے ہم
آنکھوں سے دل میں کھینچتے ہیں عکس روئے یار | نشتر کا کام لیتے ہیں تار نظر سے ہم
رخ میری سمت اور نظر لطف غیر پر | اپنی نظر میں گر گئے ان کی نظر سے ہم

---

[1] خمخانہ جاوید، جلد دوم ص ۵۰، [2] ایضاً ج ۱ ص ۳۲۰

بہار محبت سوز پنہاں میں نہاں جب تک — کچھ سوز دل اک شعلہ پہ تب عیاں ہو لوں

جلا ہے جسم خاک کر کر جہاں متصل ہو اتنا — بہار اک قید تازہ اں میں کچھ جا بجا ارمان ہوں

تمنا کے معاصرین میں شیخ محمد علی حسین طالب اور کفایت اللہ قید بریلوی بھی تھے۔ طالب کا مجموعہ کلام موسوم بہ مدح مرغوب ۱۲۷۸ھ میں اور آخر الذکر کا دیوان موسوم بہ بہار بے خزاں ۱۲۸۰ھ میں شائع ہوا۔

حکیم برج موہن لال خود بریلوی، نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد تھے۔ ۱۸۸۰ء تک حیات تھے۔ بعد کے حالات کا پتہ نہیں چلتا۔[1] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل اشعار ہیں:

آسماں کیا کریں ہم سر کے جانے کا بھلا غم — چلو اچھا ہوا گردن سے اتری بار سر کا

اے شیخ جا کے بزم میں اس مست چشم کی — دیکھوں گا میں کہ کس طرح ہشیار جائیگا

کچھ تو کیوں نہ بریلی کو کہیں اس کی زمیں — سب کو سرسبز یہاں باغ سخن پاتے ہیں

ہو اسیر و ہوش کی جو ہے بیعت اے خود — کیوں نہ پھر اس کا ہر اک شعر بیاں ہو جائے

شیخ حامد حسین خلف نعمت کبیر بریلوی حضرت ہوش کے ایک ہونہار شاگرد تھے اور ۱۸۷۰ء کے مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔[2] نمونۂ کلام یہ ہے:

بلبل کی قید کا سن کے افسوں کیسے کھلا حال — صیاد جب بتا چکی گلشن سے غارت کیا

پھرا ہوں حسرت دیدار میں جو کچھ کیا ہو — چھپ کر بھی دیکھیے اپنا اشک ارمان ہے

کسی طرح مشق نہیں دل سے — محبت بھی اب تو جگر ہو گئی

عبث ہم کیا تھا میں شیخ پیشوا — یہ عمر دو روزہ بسر ہو گئی

وہی بیساختہ کا تربت بھرا — پسینہ میں کاکل جو تر ہو گئی

میر محمد حسن علی خاں بریلوی نواب کے ہم عمر ایک قرینہ شاعر تھے۔ ۱۸۷۶ء تک زندہ تھے،

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد سوم ص ۷۲ [2] ایضاً ص ۳۷۳

بعد کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، نمونۂ کلام حسب ذیل ہے۔

ایک سے ایک شب ہجر میں بڑھ کر آیا — کبھی پسو کبھی کھٹمل کبھی مچھر آیا
پھوس سے یار کو جاڑے میں تپایا شب وصل — کام آخر مرا ٹوٹا ہوا چھپر آیا
مرا رقیب الٰہی ذلیل و خوار رہے — گلے میں طوق ہو جوتیوں کا ہار رہے
جو شعر غیر کو اپنا بنا کے پڑھتا ہے — چھپے ہزار وہ لیکن مری نگاہ میں ہے

قاسم علی خواہاں ۱۲۶۰ھ (مطابق ۱۸۴۳ء) میں بریلی میں پیدا ہوئے اور اسی شہر میں بریلی بنیے ہائی اسکول میں فارسی کے مدرس رہے، بریلی کے اساتذہ میں شمار کیے جاتے تھے[۲]، نمونہ کلام یہ ہے

وہ مہروش اگر سر بازار آئے گا — خود ماہ مصر بن کے خریدار آئیگا
دیدار چشم ساقیِ میکش کریگا مست — جو میکدے میں جائیگا سرشار آئیگا
آیا خیال ہمسریِ زلف یار کا — بگڑا دماغ نافۂ مشک تتار کا
آجکل زور پہ ہے گردش قسمت اپنی — عیب ہو جاتا ہے خواہاں جو ہنر کرتے ہیں
چھٹے کا عشق بتوں کا کبھی نہ خواہاں سے — ہزار متقی بن جائے پارسا ہو جائے
پڑی جس طرف کارگر ہو گئی — قیامت وہ تیغ نظر ہو گئی

نواب محمد حسن علی خاں ودود تمنا بریلوی حافظ رحمت خاں کے خاندان سے تھے، اور انیسویں صدی کے آخر برسوں میں ایک مشاق شاعر تھے[۳] ان کے کلام کا نمونہ درج ذیل ہے،

دل عشاق میں کرتے ہیں ٹھکانا اپنا — گھر میں اللہ کے بت دیکھو گھر کرتے ہیں
محبت بتوں کی خدا کی قسم — رگ جاں کو نیشتر ہو گئی

نواب اسماعیل خاں ذبیح بھی بریلی کے رئیس اور حافظ رحمت خاں کی اولاد میں تھے،

۱؎ خمخانۂ جاوید، جلد سوم ۲؎ ایضاً ج ۳ ص ۴۲ ۳؎ ایضاً ص ۲۱۴

...بھی اسی دور کے شاعر تھے۔[1] ان کے چند شعر پیش ہیں،

ل جائے کوئی بت تو لے لیں بگڑ کے دل — کعبہ کیلئے ڈھونڈتے پھرتے ہیں صنم ہم
عشق نے ہم سے ازل ہی میں لیا تھا آرام — آنکھ بھی پائی نہ تھی جب گیا خواب اپنا

مرزا رضا حسین بیگ رضا بھی اسی دور کے شاعر اور حکیم نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد تھے،[2] انکے چند شعر علاوہ نمونہ کلام پیش ہیں،

صاحب حیرت ہیں دنیا کے حوادث سے پرے — قید کیا دام قفس میں طائر تصویر ہو
قسمتی ہے زار دہ ہے بلبل کی — چند روزہ بہار ہے گل کی
کر نہ پامال گل کو اے خزاں — جان جاتی رہے گی بلبل کی

گنگا پرشاد اوج بریلوی سکسینہ کایستھ اور بریلی کے باشندے تھے، وہیں کلکٹری میں ملازم تھے، فارسی کا ذوق بزرگوں سے میراث میں ملا تھا، خود آتش لکھنوی کے شاگرد اور بلند پایہ شاعر تھے، اپنا ایک دیوان بھی مرتب کیا تھا، طب میں بھی دستگاہ حاصل تھی، اور اس فن میں ایک کتاب مجربات اوج کے مصنف تھے، ۱۸۹۶ء میں ان کا انتقال ہوا،[3] نمونہ کلام پیش ہے۔

وحشت ہو طبیعت کو غزالان ختن سے — دیوانہ ترا بن میں بھڑکتا ہے ہرن سے
مستانہ کوئی شعر سناؤں تجھے ساقی — تازہ ہو دماغ اپنا جو صہبائے کہن سے
پر بھی نہ پرندوں کا ملا فصل خزاں میں — ملتا ہوا صیاد گیا ہاتھ چمن سے
نل عشق کی جو سر میں ہوا تیرے غضب — وہ حسن کی شعلوں کی ہوا جیتے ہیں دم سے

حاجی حسن رضا خاں حسن بریلوی خلف مولانا نقی علی خاں صاحب اور برادر مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی اپنے زمانہ کے ایک زبردست عالم شریعت تھے اور صاحب طریقت بھی، ۱۲۷۶ھ (مطابق ۱۸۵۹ء) میں بریلی میں پیدا ہوئے، علوم دینی اپنے والد اور بھائی سے حاصل کیے، فن شعر میں اگرچہ وہ داغ دہلوی

---

[1] تذکرہ جاوید ج ۳ ص ۲۲۰ [2] ایضاً ص ۲۴۹ [3] یادرفتگاں (مصنفہ مظہر بریلوی)

کے شاگرد تھے لیکن حسنیہ کلام اپنے برادر بزرگ نواب محمد رضا خاں حسنؔ کا ہی یوں کر کے کہتے تھے ان اگرچہ حسنیہ کلام کے بہت دہلی کے معتقد ہیں، لیکن ان کے کلام کا اصل رنگ عاشقانہ ہے اور ان کا وہ کلام جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا فی الحقیقت بہت اچھا ہے مضامین کی سادگی، بندش کی چستی اور شوکت الفاظ کے علاوہ ان کے کلام میں ایک عجیب سوز اور تاثیر ہے، طرز بیان میں تیکھا پن غضب کا ہے، تصنع اور آورد نام کو نہیں، "لذت سوز و گداز" سے ان کا کلام مملو ہے جو غالباً داغؔ سے اصلاح کا نتیجہ ہے، جیسا کہ خود کہتے ہیں۔

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذت سوز و گداز اے حسنؔ شاگرد ہوں میں داغؔ سے استاد کا

ان کا دیوان اگرچہ شائع ہو چکا ہے پھر بھی چند شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں[1]

کیوں دل زار محبت کا نتیجہ دیکھا درد فرقت کا کوئی پوچھنے والا دیکھا
بس رخ یار سے اٹھتے ہوئے پردہ دیکھا پھر خبر ہی نہ ہوا کیا کہیں پھر کیا دیکھا
کان وہ کان ہے جس نے سنی آواز تری آنکھ وہ آنکھ ہے جس نے ترا جلوا دیکھا
آپ کہتے ہیں کہ جا دیکھ لیا حال ترا کیسے تڑپتے ہوا دل میں مرے کیا دیکھا

دل کو جاناں سے حسن سمجھا بجھا کر لائے تھے دل ہمیں سمجھا بجھا کر سوئے جاناں لے چلا
بسملوں کو زخم زخموں کو مبارک لذتیں سوئے مقتل پھر کوئی تیغ و نمکداں لے چلا

میں کیا پوچھوں کہ ہے میرے خفا کیا خفا ہے بے سبب کا پوچھنا کیا

وہ رنج الفت جگر میں رکھتے ہو گیا اب تو اعتبار ہوا

کیا قیامت ہے بیمار کی غفلت ظالم پھر ہوا ہے دل کا ہوا

بے خبر ہو بے خبر کو کیا خبر اے بے خبر سے ... دل ہو گیا ...

[1] خمخانۂ جاوید، ۵۰۲ تا ۵۰۴

[illegible] / اے [illegible]

اس شوخ [illegible] / یا [illegible] نہیں ہے

جس [illegible] / اس دل کو [illegible]

سنگ ستم فراق سے دل پر لگا وہ چوٹ / آئینہ ٹوٹ جائے گا تیرے جمال کا

جلوے کی روک تھام کرنا تھا حجاب کیا / دیکھ کے آگے اب وہ اس کی نقاب کیا

درد الفت میں اذیت کیسی / موت کو کون چارہ گر ہوگا

خنجر لگے ہیں [illegible] دلربا / اے [illegible] عشق تمہارا خوش نصیب

جانا اگر تمہیں بہت اچھا ہوا کیا / بخشو گے بھی خطائے محبت کسی طرح

آپ کے لطف سے تو [illegible] کیا / خوب [illegible] آسماں تک ہم

آئے تھے کیا جانے کیا حسرت لیے / پھر چلے محروم تیرے در سے ہم

دل میں خیال گیسوئے [illegible] / ہم [illegible] اپنے [illegible] ہیں

نقاب رخ جاناں کی [illegible] / وہ بے حجاب [illegible] بے حجاب نہیں

[illegible] / [illegible]

[illegible] / [illegible] ساقی [illegible]

میں جانتا تھا [illegible] / لیکن تمہارے ظلم ہی حد سے گزر گئے

میں جانتا ہوں [illegible] فراق / دل جانتا ہے مجھ پہ جو صدمے گزر گئے

دیکھ آ کے مریض فرقت کو / [illegible] دنیا بھی ہے [illegible]

[illegible] / وہ [illegible]

[illegible] / [illegible]

نہ باغ جنت کی آرزو کر نہ جام کوثر کی جستجو کر — شراب الفت حرام ٹھہری پھر اس سے بہتر کیا ہے

آپ کی منہ لگے مجھے اور پلائی عشرت — شیخ جی اتنی نصیحت بھی بری ہوتی ہے

یہ گل فشانیاں تو نہ ہوتیں کبھی حق — تم نے چمن میں پھول یہ گلزار داغ کے

منشی سرفراز علی رفعت داغ کے ایک دوسرے ہم پایہ شاگرد تھے، پختہ کلام اور خوشگو شاعر تھے،[1] نمونۃً چند شعر پیش ہیں،

نزع میں یار ہے مہمان میرا — دم نکلتا ہے کہ ارمان میرا

اس دست حنائی نے ترا داغ آگ لگا دی — سمجھا تھا کمی ہوگی مرے سوز جگر میں

بھلا راحت کہاں تقدیر میں ہم غم نصیبوں کے — اگر ہوں شادماں دم بھر رہیں اندوگیں برسوں

اے قیس کہاں ڈھونڈنے جاتا ہے سوئے دشت — لیلیٰ ترے دل ہی میں ہے محمل میں نہیں ہے

جو داغ میرے دل کو ملا عشق میں رفعت — لالہ میں نہیں ہے مہ کامل میں نہیں ہے

تری آنکھوں کے جادو کے مقابل — نہیں کچھ اصل سحر سامری کی

لیے جاتی ہے دنیا سے عدم کو — تمنا شیخ جی کو حور ہی کی

وہ ملتے ہیں تو یوں ملتے ہیں مجھ سے — شناسائی نہیں گویا کبھی کی

کہا جب میں نے مرتا ہوں تو بولے — کہی یہ بات تو نے میرے جی کی

نگاہ یار بھی ہے کیا زمانہ — کسی کی دوست ہے دشمن کسی کی

نہ آیا راہ پر وہ شوخ رفعت — کریں کیا ہم نے کوشش تو بڑی کی

لچھمن لال شوق بریلی کے باشندے اور امیر مینائی کے شاگرد تھے، طبیعت میں جودت اور فکر میں پرواز تھی،[2] نمونۂ کلام حسب ذیل ہے،

اس بے خبر سے کوئی تو میرا کہے گا حال — ہر ایک کی زباں پہ مری داستان ہے

---

[1] خمخانۂ جاوید، جلد سوم ص ۴۱۵ [2] ایضاً ص ۲۰۴

شہرت ہے جتنی خلق میں حسن و جمال کی بدنام کیوں ہیں آپ ہی جور و جفا سے آپ
اللہ شانہٗ اس بت مغرور کی خودی کہتا ہے طنز سے "مجھے مانگیں خدا سے آپ"

شرمندہ کر گیا وہ اعزاز دیکھیے آغوش میں لیے ہوئے رحمت خدا کی ہے

قاضی محمد خلیل حیراںؔ، قاضی عبدالجلیل جنوںؔ کے بیٹے تھے، ۱۲۷۰ھ (مطابق ۱۸۵۴ء) میں پیدا ہوئے، قاضی جلیل الدین حسن حافظ کے شاگرد تھے[1]، نمونہ کلام یہ ہے

جہاں دیکھا نئے انداز سے وہ شوخ جہاں تھا جگر میں نوک تھا، پہلو میں دل تھا، دل میں ارماں تھا
بجز خار حسرت کچھ نہ پایا باغ عالم میں گلوں کا ذکر کیا کانٹوں سے بھی محروم داماں تھا

حافظ علی احمد خاں آثمؔ بریلی کے باشندے اور امیر مینائی کے شاگرد تھے، ۱۸۹۱ء تک حیات تھے، اور اسی سال بسلسلہ تجارت کلکتہ چلے گئے تھے، دیوان آثم موسوم بہ منظوم حق ان کی یادگار ہے[2] جو ۱۳۱۰ھ میں شائع ہوا تھا، ان کی ایک دوسری مثنوی ذائقہ عشق بھی ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوئی،

حسینان جہاں دیکھیں جو اسکے رنگ و روغن کو یہ حسرت ہو ملا دیں خاک میں سب اپنے جوبن کو
جو ہیں اہل کرم شرمندہ رہتے ہیں وہ سائل سے جھکاتا ہے سر ساغر پہ شیشہ اپنی گردن کو

حکیم عبدالصمد سرشارؔ خلف شاہ فیض غوث ساقیؔ بریلی کے شرفا میں سے تھے، بڑے ذی علم تھے اور فن عروض میں اچھا دخل رکھتے تھے، بریلی کے اساتذہ میں شمار ہوتے تھے، نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ بریلوی کے شاگرد اور حسنؔ اور جوہرؔ ان کے معاصر تھے، طب میں مہارت کامل رکھتے تھے[3]،

کلام کا نمونہ پیش ہے،

محبت کی نہ پوچھو کچھ یہ عالم ہی نرالا ہے کہ ہو سکتا ہے کیا کیا ہو، اس میں کیا کیا ہو نہیں سکتا

نغمہ ساز محبت نالۂ دل ہو گیا تیرے جاتے ہی دگرگوں رنگ محفل ہو گیا

---

[1] خمخانۂ جاوید، ج ۲، ص ۲۰۰ [2] ایضاً ج ۱، ص ۴۰ [3] ایضاً ج ۴، ص ۱۸۰

باغ جنت کی آرزو کیں برباد کر چکے ہم کر — خدا کے واسطے [illegible]

آپ کی نازکی اور گلزار کی ہے جو [illegible] — [illegible] کچھ آ رہا ہے

گلے کی مجھ میں قوت نہ اشک پینے کی تاب [illegible] — [illegible] کیا تم [illegible] ملاقات [illegible]

غم و رنج و مصائب ذلت خواری و ناکامی — ہم [illegible] کا محبت نام رکھا ہے

قاضی عبد الحق زہیر بھی اسی دور کے ایک شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا نمونہ پیش ہے۔[1]

آپ نے دوست جو دشمن کو سمجھ رکھا ہو — مہرباں [illegible] آپ کی نادانی ہے

میں کسی اور سے اور آپ کا شکوا کرتا — بندہ پرور یہ فقط غیر کی لن ترانی ہے

[illegible] دہلی کے باشندے اور جناب [illegible] کے شاگرد تھے۔ کبھی کبھی [illegible] حسن [illegible] سخن کرتے تھے۔ نمونۂ کلام پیش ہے۔

دوست و دشمن دیکھ کر — [illegible] چشم پر نم دیکھ کر

آئینہ اٹھا کر — کیا [illegible] رات بھر

دل میں بھر کے — ہے آگ [illegible] گھر میں

کوئی بھی غیر کو اپنا سمجھتا ہے زمانے میں — مگر [illegible] آپ ہی ایسے زمانے [illegible]

شوق سے ٹکڑے کرو دل نہیں انکار مگر — دیکھ لو [illegible] کو خدا [illegible] پہلے

مولوی علی احمد خاں اسیر دہلی کے باشندے تھے لیکن قیام زیادہ [illegible] میں رہتا تھا، حضرت ذوق کے شاگرد تھے۔[2] ان کے دو شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں۔

ادائیں نرگس چشم کی ہوں پسند — اٹھاتے ہیں سب [illegible]

[illegible] دو دن کا ہے رنگ و بو باغباں — [illegible]

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد ۳ ص ۰۹ و [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۲۲ [illegible]
صبح تھا [illegible] ذرا آئینہ تو دیکھ لے دوست — تب [illegible]
[3] خمخانۂ جاوید جلد ۱ ص ۳۰۰

مولوی محمد حسین صاحب شاکر بریلوی نواب عبدالعزیز خاں عزیز کے شاگرد اور اپنے عہد کے خوش فکر شاعر تھے[1]

محمد حسین سحر کا وطن بدایوں تھا لیکن مسکن بریلی تھا، ریلوے کی ملازمت کے سلسلہ میں لکھنؤ میں بھی رہے، حسن بریلوی کے شاگرد تھے[2]، نمونہ کلام پیش ہے،

چرخ برگشتہ تھا وہ شوخ نہ وقت مرگ ہوئے　　سننے والا کون ہے مظلوم کی فریاد کا

بتاؤں کیا جو کانٹا سا مرے دل میں کھٹکتا ہو　　نکل جائے تو نالہ ہے جو رہ جائے تمنا ہے

کنہا لال دل بریلوی منشی درگا پرشاد کے بیٹے تھے، سنہ ۱۸۱۸ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، شاعری سے طبعی لگاؤ تھا اور غلام حسین قدر بلگرامی سے مشورہ سخن کرتے تھے، گھر میں آگ لگنے سے کلام تلف ہو گیا[3]، ان کا ایک شعر پیش ہے،

شعر کہنے کے لیے عالم نہ فاضل چاہیے　　کشتۂ عشق صنم ہو جو وہی دل چاہیے

کالکا پرساد شاد رام نگر ضلع بریلی کے رہنے والے تھے، سنہ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے، پولیٹیکل ایجنسی باروتی، کوٹہ میں ملازم تھے،[4] ان کے چند شعر پیش ہیں،

تحریر مقدر کی مٹائی نہیں جاتی　　بگڑی ہوئی تقدیر بنائی نہیں جاتی

نہ گھبرا آبلہ پائی سے اے دل　　رہ مقصود کی منزل کڑی ہے

الجھن ہے انتظار سے دل بیقرار ہے　　آتا ہے کون کس کا تجھے انتظار ہے

منشی سید اولاد حسین رتسوا بریلوی (متوفی سنہ ۱۹۱۲ء) شعر کم کہتے تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے خوب کہتے تھے[5] انکے چند شعر پیش ہیں:

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد چہارم ص ۳۸۵ [2] ایضاً ص ۱۰۶ [3] یادرفتگاں [4] خمخانۂ جاوید جلد ۳ ص ... [5] ایضاً جلد ۳ ص ۴۰۴

بہار چھا گئی آنکھوں میں جب سرور آیا شراب پینے سے کافر کے منہ پہ نور آیا

شراب چھوڑ کے بہت ہوئی ہے شوخ انواز دل یہ کیسی توبہ کہ ایمان میں فتور آیا

ہماری آنکھ کی اللہ رے مستیاں بے مے کسی حسین پہ نگہ جب پڑی سرور آیا

اک جہان کشتۂ انداز خود آرائی ہے آپ جو چاہیں کریں آپ کی بن آئی ہے

ہم اتنی زیست میں تنگ آ گئے ہیں حضرت خضر کہاں سے لاتے جگر عمر جاوداں کیلیے

لالہ ہیبت رام صادق، بریلی میں قانون گو تھے، پرانے الفاظ و محاورات نہایت مرغوب تھے، اور خد و خال کے مضامین بہت پسند تھے۔ ان کے تین شعر پیش ہیں، [1]

اسکے ہر دم مجھے تصور کس طرح خوش نہ گزرے لیل و نہار میرا

یں کو تم انکار کر چلے اے واہ واہ میاں یہ بھلا پیار کر چلے

یہ سب خانۂ خدا تم خانۂ خدا کو بھی مسمار کر چلے

شاکی بے چین بریلوی کے شاگرد تھے، اور عموماً ظرافت کے مضامین نظم کرتے

آغاز جوانی میں ستم ڈھائے ہوئے ہیں اٹھتے ہوئے جوبن پہ وہ اترائے ہوئے ہیں

ڈرتے ہیں وفا کہتے ہوئے حضرت شاکی یہ لوگ حسینوں سے وفا پائے ہوئے ہیں

سوہن لال شفا بریلوی نیاز احمد خاں ہوش کے شاگرد اور خوش فکر شاعر تھے، ان کے دو شعر درج ذیل ہیں [3]

گیسوؤں کا نہ رہتا نہیں کب دل کو خیال یہ وہ کافر ہیں کہ کعبہ میں بھی گھر کرتے ہیں

نصیب شربت دیدار ہو اگر ان کا تو پھر شفا کو نہ کیونکر بھلا شفا ہو جائے

---

[1] خمخانۂ جاوید، جلد پنجم، ص ۲۰۰ [2] ایضاً ج ۴ ص ۴۴۴ [3] ایضاً ج ۵ ص ۵

پادری لے، آر بیلی شفا کا تعلق بھی بریلی سے تھا، وہ عطا بدایونی اور وسیم خیرآبادی سے مشورہ سخن کرتے تھے[1]، ان کے دو شعر پیش ہیں،

ہو گیا ہے مری نظروں سے جو پنہاں کوئی | زندگی کا نظر آتا نہیں ساماں کوئی
اب تو پردہ نہ کرو آ وہ دکھا دو دیدار | آنکھ میں دم ہے کوئی دم کا ہے مہماں کوئی

مشتاق احمد شوق موضع مونڈیا ضلع بریلی کے رئیس اور پرانی روش کے دلدادہ تھے[2]، ان کا ایک شعر پیش ہے،

تری زلف معنبر کا اگر مضموں رقم ہوگا | سیاہی مشک ہوگی سنبل تر کا قلم ہوگا

محمد ضیا خاں ضیا بریلوی خواہاں کے شاگرد اور بریلی کے اچھے غزل گو شعرا میں تھے[3]، ان کے دو شعر پیش ہیں:

دیکھئے ان کا کمر تا ہے یہ جوبن کس دن | رنگ لاتی ہے بہار رخ روشن کس دن
دوری یار ستاتی ہے تو رہتے ہیں ضیا | تر غم یار میں ہوتا نہیں دامن کس دن

سید صادق علی صادق بریلی کے باشندے تھے لیکن اکثر بمبئی میں مقیم رہتے تھے، شستگی اور سادگی زبان کے دلدادہ تھے[4]، ان کے دو شعر درج ذیل ہیں،

کوچۂ جاناں میں ہم بستر لگائیں گے ضرور | پاسباں سے ادھم ہے اس میں جھگڑا کیوں نہ ہو
نامراد ایسا بھی اٹھا ہے زمانے سے کوئی | حسرتوں کا تربت صادق پہ میلا کیوں نہ ہو

اسی زمانہ میں صادق تخلص رکھنے والے ایک دوسرے شاعر بھی بریلی میں گزرے ہیں، وہ پنڈت دیوی پرشاد خلف پنڈت کشن لال کشمیری الاصل برہمن اور منیر شکوہ آبادی کے شاگرد تھے، انہیں کے مشورے سے محو سے بدل کر صادق تخلص اختیار کیا[5]، ۱۹۲۱ء میں ستانوے سال کی

---

[1] خمخانۂ جاوید جلد پنجم ص ۹۶ [2] ایضاً ص ۱۴۸ [3] ایضاً ص ۸۸ [4] ایضاً ص ۲۴۹

عمر میں وفات پائی،[1] ان کے تین شعر پیش ہیں:

خوش طینتی سے اے دل ہوتا ہے نام سب کا
نافے سے اپنے آہو مشہور ہے ختن میں

جب نہ ہو خرچ تو کیا مال سے حاصل ہو حریص
یوں تو ہر غنچہ کی مٹھی میں بھی زر ہوتا ہے

سخت دل سوز سے خالی نہیں ہوتے صادق
دیکھ پتھر کے بھی سینے میں شرر ہوتا ہے

مشہور قومی رہنما مولانا محمد علی جوہر کا بھی بریلی سے خاص تعلق تھا، وہ اگرچہ ۱۸۷۸ء میں رامپور میں پیدا ہوئے لیکن ان کی ابتدائی تعلیم بریلی میں ہوئی، ۱۸۹۶ء میں علی گڑھ سے بی اے پاس کیا اور انگلینڈ چلے گئے، جہاں سے ۱۸۹۹ء میں وہ واپس ہوئے، ۱۹۱۹ء میں خلافت کی تحریک چلا کر جامعہ [redacted] ڈالی، اور ۱۹۲۳ء میں صدر کانگریس منتخب ہوئے، ۱۹۳۱ء میں لندن [redacted] المقدس میں دفن ہوئے، اگرچہ ان کی اصل شہرت ایک قومی رہنما کی [redacted] ثیت شاعر بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے، جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل

[redacted] ل قضا کے بعد
ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

[redacted] تاب ہو دے
میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

ہے رشک کیوں یہ ہم کو سردار دیکھ کر
"دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر"

شہد و شراب خلد میں یہ چاشنی کہاں
کچھ خون دل سے بڑھ کے مزا ہو تو جانیے

شفقت علی طرب بریلوی بھی موجودہ صدی کے شاعر تھے، حضرت ... بریلوی سے شرف تلمذ

---

[1] خمخانۂ جاوید، ج ۵ ص ۱۰۴ [2] جدید اردو شعرا، ص ۳۷۹

کرتے تھے۔ کلام میں کافی روانی پائی جاتی ہے[1]، نمونۂ کلام درج ذیل اشعار ہیں۔

تربت سے اٹھ کے جا نہ سکا کوے یار تک
یہ ناتوانیوں کا اثر ہے غبار میں

کس خوبرو کو دیکھ لیا کس پہ مٹ گئے
کیوں اے طپش تم آج نہیں اختیار میں

آغاز محبت ہی میں گھبرا گئے ایسے
کیوں حضرت دل نالہ و فریاد ابھی سے

منشی عبد الکریم عروج بریلوی بھی داغ دہلوی کے شاگرد تھے، زبان صاف اور شستہ تھی، ایک شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہے[2]

دل کو بہلاؤ ذرا اٹھو ہنسو بولو عروج
رنج و غم میں آدمیت سے گزر جاتے نہیں

عبد الرزاق کلامی بھی موجودہ عہد کے ابتدائی دور کے شاعر تھے، ان کا ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ایک مجموعۂ کلام موسوم بہ حسام الاسلام ۱۳۳۲ھ (مطابق ۱۹۱۴ء) میں شائع ہوا تھا، اور اسی سال بریلی کے ایک ریختی گو شاعر محمد محسن خاں پوری بریلوی المتخلص بہ محسن و عفت بیگم کا ایک دیوان ریختی موسوم بہ رنگیلی بیگم بھی شائع ہوا،

(باقی)

---

[1] خمخانۂ جاوید ج۵ ص۵۰۰ [2] ایضاً ص۵۰۶

وحدتِ ادیان

از جناب شبیر احمد خانصاحب غوری ایم اے ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

پر امن بقائے باہم اجتماعی زندگی کی اہم ترین ضرورت ہے، اور اگر چھ ہزار سال کی مسلسل تہذیب و اصلاح کے بعد بھی انسان امن و آشتی کے ساتھ رہنا نہ سیکھ سکا تو پھر اس کے اشرف المخلوقات ہونے

ازندگی کی اس اہم ترین ضرورت" کا ضامن و متکفل کیا ہے؟ یہ ایک ایسا سوال قدیم زمانہ سے سوچتے چلے آرہے ہیں اور ابتک کچھ نہ سوچ پائے، لہذا اس کا کوئی نہیں ہے،

ریں اس "اہم المہمات" کے حل کے سلسلے میں ایک حل کا بڑے زور و شور سے پرچار کیا جا رہا ہے، اور وہ ہے "وحدت ادیان" کا نظریہ، ہمارے یہاں اس نظریہ کے قائلین میں بعض عظیم شخصیتیں رہی ہیں، مگر مشکل یہ ہے کہ اتنی ہی عظیم شخصیتیں اس کی مخالف بھی رہی ہیں، اس لیے اس نظریہ کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی اور معقولیت یا نامعقولیت پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا، غور و فکر دو طرح سے کیا جا سکتا ہے، منطقی استدلال کے ذریعہ یا تاریخی استقراء کی روشنی میں۔

(۱) منطقی استدلال کا فیصلہ

اس سلسلے میں ایک مسلمہ حقیقت کا اعادہ مستحسن ہوگا، وہ یہ کہ ایک جانب مذہب اور عقل میں اور دوسری جانب مذہب اور اخلاق میں بہت گہرا تعلق ہے، مذہب انسان کا ذاتی معاملہ سہی، یہ بھی

تسلیم ہے کہ وہ انسان کے جذبات و احساسات کے دائرہ میں آتا ہے یا عقل سے زیادہ اُس کا انسان کے جذبات و احساسات سے تعلق ہے لیکن کسی نہ کسی منزل میں انسان اُسے ایک خالص عقلیاتی صداقت" ضرور سمجھتا ہے،

مثلاً ایک مسلمان معبود حقیقی کو "واحد اور احد" سمجھتا ہے، اللہ رب العزت کے سوا دوسرے معبودوں کے آگے سر جھکانے یا مبہم طور پر انھیں معبود و مسجود سمجھنے سے اس کا ابا کرنا ایسی چیز ہے جسے ممکن ہے خارج سے اس کی نفسیات کا مشاہدہ کرنے والے اس کی شدت جذبات کا نتیجہ قرار دیں، لیکن شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کی زندگی میں ایسے لمحات تو ضرور آتے ہیں جب وہ ہر قسم کے جذبات سے معرا ہو کر ٹھنڈی منطق کے ذریعہ سوچتا ہے تو "توحید" کو ایک خالص عقلیاتی حقیقت" سمجھتا ہے۔

اسی طرح ایک مسیحی تثلیث پر ایسا ہی عقیدہ رکھتا ہے، یہ ممکن ہے کہ کوئی اسے "تین برابر ایک اور ایک برابر تین" کی سخافت کے بارے میں قائل کر دے، مگر وہ نہ صرف جذباتی طور پر بلکہ عقلیاتی طریقہ پر بھی اس عقیدہ کی صحت پر منطقی اذعان و یقین رکھنے پر مصر رہے گا، اور یہ یقین واثق رکھے گا کہ وہ اپنے مذہبی علم کلام میں مزید تبحر و تمہر حاصل کر کے اس شکست کی تلافی کر سکتا ہے۔

اب ایک ایسے انسان کی نفسیات پر غور کیجئے جس نے "وحدت ادیان" کو اپنی تفکیری سرگرمیوں کا سنگ بنیاد بنایا ہے، ظاہر ہے دو چیزوں کی وحدت ان کی ماہیت یا بنیادی اصولوں کی عینیت کا نام ہے، مثلاً سنی اور شیعہ کی وحدت ایک مسلّم حقیقت ہے کیونکہ دونوں اسلام کی بنیادی تعلیم یعنی توحید و رسالت میں متفق العقیدہ ہیں، یہی حال مختلف ہندو فرقوں کی وحدت کا ہے، جو "کرم" اور "آواگون" کے اعتقاد میں ہمزبان ہیں،

بہر حال اس مزعومہ "وحدت ادیان" کے اصول کی رو سے اسلام اور مسیحیت کی بنیادی تعلیمات واحد اور تین یکدیگر ہیں یعنی منطقی طور پر یہ دونوں حقیقتیں کر

(الف)

۱۔ "ایک" "ایک" ہی رہتا ہے، اور "ایک سے زیادہ" کا عین نہیں ہو سکتا۔ (ورنہ "خدائے واحد" کی عبادت کے ایجابی امر کے ساتھ "خدایان کثیرہ" کی عبادت اسلام میں ممنوع نہ ہوتی) اور

۲۔ "ایک" "ایک سے زیادہ" [یا تین] کا عین ہو سکتا ہے (اور یہی تثلیث یا "توحید فی التثلیث" کا اصل الاصول ہے)

بیک وقت صادق ہیں۔

اس طرح اس مزعومہ "وحدت ادیان" کے نفسیاتی نتائج تین ہی ہو سکتے ہیں:۔

(الف) یا تو منطقی استدلال کا یہ کلیدی قانون ہی غلط ہے کہ "اثبات" اور "نفی" قول واحد میں

جمہ نمبر [illegible]

...صحت کی ہمہ گیری سے انکار کے لیے عقل انسانی کسی منزل میں بھی تیار نہیں ہو سکتی،
...تک کہ اسی نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ
...نے خدا ایک ہے یا بہت سے ہیں۔" (نعوذ باللہ منہا)۔
...لا ادریت ہے جسے عقل انسانی صرف انتہائی بے بسی اور درماندگی کے عالم ہی میں اختیار کرنے پر مجبور ہوتی ہے،

(ج) یا پھر ان دونوں متضاد دعووں کو باطل سمجھ لے یعنی اسلام بھی ڈھکوسلا ہے اور مسیحیت بھی ڈھکوسلا ہے اور اسی طرح دوسرے مذاہب بھی ڈھکوسلے ہیں۔ یہ چیز "لامذہبیت" نہیں تو کیا ہے؟

غرض اس "وحدت ادیان" کا انجام تشکیک و لا ادریت اور آخر کار بے دینی اور لامذہبیت کے سوا کچھ نہیں،

اس لیے منطقی طور پر "وحدت ادیان" کا نظریہ یا تو باطل محض ہے یا پھر تشکیک و لا ادریت اور بے دینی بلکہ انکار مذہب کا پیش خیمہ ہے۔

مذہبی اتحاد | اب اس ساری گفتگو کی ایک ہی شکل رہ جاتی ہے، وہ یہ کہ مختلف مذاہب کی بنیادی تعلیمات میں "وحدت و عینیت" ثابت کرنے کے بجائے ان میں جو بھی اچھی باتیں مشترک ہیں، ان پر غور کیا جائے" بات تو بظاہر بڑی معقول ہے، مگر یہ "مشابہت" ہوئی، "مماثلت و عینیت یا "وحدت" نہ ہوئی اور یہ اصل دعویٰ سے فرار ہے۔

پھر آج تک یہ "بڑی معقول بات" تجزیہ کے دائرہ سے نکل کر عمل کی کھلی فضا میں کبھی نہ آ سکی اور اس کی ایک وجہ ہے:-

مذہب اور اخلاق میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اور کوئی پائدار اخلاقی نظام مذہبی بنیاد پر استوار کیے بغیر عمل میں نہیں لایا جا سکتا۔ یورپ کی مثال ہمارے سامنے ہے، جب تک مسیحیت پر یورپ کا ایمان و ایقان رہا، پوری آبادی اس کی مخصوص اخلاقی تعلیمات پر کاربند رہی، مگر جب سائنس کی ترقی ہوئی اور اس کے نتیجے میں مسیحیت کی مذہبی تعلیمات سے بیزاری بڑھنے لگی تو پھر وہاں کے مفکرین نے غیر مذہبی بنیادوں پر اخلاقی تعلیمات کا نظام استوار کرنا شروع کیا، مگر اس میں انہیں سو فیصدی ناکامی ہوئی اور نفس اخلاق کا دیوالہ نکل گیا، یورپ کی یہ اخلاقی بے مائیگی اور گراوٹ جو آج دنیا میں ضرب المثل بنی ہوئی ہے، اسی مذہب سے بے اعتنائی کا نتیجہ ہے۔

لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی، "اخلاقی پختگی و استواری" کی اساس محض مذہب پسندی ہی نہیں بلکہ "مذہب واحد کا التزام" ہے، اور "وحدت ادیان" کا عقیدہ منطقی طور پر "تشکیک و ارتیابیت" بلکہ "بے دینی اور لادینیت" کی طرف لے جاتا ہے، اور یہ ظاہر ہے نہ "تشکیک و ارتیابیت" کسی ایجابی نظام کی اساس بن سکتی ہے، اور نہ "لادینیت" ہی اس چیز کی بنیاد بن سکتی ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے یا مذہب جس کا [illegible] ہے

وحدت ادیان اور رواداری ۔ یہ ہے منطق اور معقولیت پسندی کا فیصلہ، مگر ہماری خوش فہمی (یا خود فریبی) نے ان تمام سنگین حقائق سے صرف نظر کر کے ایک اور پر فریب ڈھکوسلے کا سہارا لیا ہے، جس کا نام رواداری ہے، مگر

۱۔ تجربہ بتاتا ہے کہ "وحدت ادیان" کے عقیدے کی اشاعت "رواداری" کے جذبے کو ترقی دینے کے بجائے اس کے ضعف و اضمحلال ہی کا موجب بنتا ہے؛ چنانچہ عہد حاضر کی فرقہ وارانہ تباہکاریوں کی تہ میں جو سازشیں کارفرما ہیں، وہ اسی نظریے کے نام نہاد علمبرداروں کی رہین احسان ہیں،

۲۔ رواداری کا حقیقی علمبردار اسلام ہے، نہ صرف اس کی تعلیمات بلکہ اس کی تاریخ بھی رواداری کی روشن مثالوں سے بھری ہوئی ہیں، اور اسلام "مذہب واحد" ہی کے التزام کی تعلیم دیتا ہے، ا

(۲) "تاریخ کا فیصلہ"

غرض "وحدت ادیان" کے نظریے کا اگر منطقی دقت نظری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے تو انسان دوستی اور اخلاقی ترفع کی توقعات پوری کرنے میں ناکام ہی ثابت ہوگا،

یہ تو منطق کا فیصلہ ہے جس کی اصابت کو بہر حال چیلنج کیا جا سکتا ہے، مگر منطق کے علاوہ ایک اور حاکم بھی ہے، یہ ہے تاریخ ۔ اور تاریخ کا صدیوں کا فیصلہ ہے کہ

"وحدت ادیان کے مفروضہ نے صلح کل کے بہانے معاشرے کے اخلاقی نظم و ضبط کو منتشر کرنے میں بہت زیادہ کام کیا ہے"۔

اس کے ساتھ یہ بھی تاریخ کا ایک ناقابل تردید واقعہ ہے کہ تشکیک، وحدت ادیان، اباحت اور سفاکی و باطل خواہی میں چولی دامن کا ساتھ رہا ہے، اس حقیقت کا تاریخی جائزہ غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا،

یہ ایک تلخ اور ناخوشگوار حقیقت ہے کہ فلسفہ وحدت ادیان سب سے پہلے سیاسی مقاصد کے لئے

کے ساتھ ساتھ اس کی مذہبی و تعلیمی گرفت کے انحلال کا بھی خواہاں تھا۔ تاتاری چیرہ دستیوں نے اس کی اس حسرت دیرینہ کو پورا کیا۔ اس کے بعد تفلسف نے تصوف کے نام سے اسلام کے امتیاز کو "وحدت ادیان" اور "صلح کل" کے نام پر ختم کر دیا، چنانچہ حافظ ابن تیمیہؒ ان مدعیان تصوف کے بارہ میں جو "یا مسلمان اللہ اللہ یا برہمن رام رام" کے قائل ہیں، الرد علی المنطقیین میں فرماتے ہیں،

وهؤلاء المتفلسفة والمتصوفة	اور یہ مدعیان فلسفہ و تصوف جیسے ابن سبعین
كابن سبعين واتباعه يجوزون	اور اس کے پیرو اس بات کو جائز رکھتے ہیں
ان يكون الرجل يهوديا او	کہ آدمی یہودی و نصرانی حتیٰ کہ بت پرست
نصرانيا او مشركا يعبد الاوثان	مشرک بھی ہو سکتا ہے، اسلام ان کے نزدیک
فليس الاسلام عندهم واجبا ..	ضروری نہیں ہے ..... چنانچہ جب کوئی مرید
واذا جاء المريد الى شيخ من	ان کے کسی شیخ کے پاس آکر کہتا ہے کہ میں آپ کے
شيوخهم وقال اريد ان	ہاتھ پر راہ سلوک طے کرنا چاہتا ہوں تو شیخ
اسلك على يديك يقول له	پوچھتا ہے کہ کس دین کے مطابق، مسلمانوں
على دين المسلمين او اليهود	کے یا یہودیوں کے یا نصرانیوں کے؟ اگر مرید
او النصارى؟ فاذا قال له	ان سے کہے کہ کیا یہود و نصاریٰ کافر نہیں؟
المريد: اليهود والنصارى	تو وہ جواب دیتا ہے نہیں، ہاں مسلمان
اما هم كفار؟ يقول لا ولكن	ان سے بہتر ہیں، یہ بالکل جاہل تاتاریوں
المسلمون خير منهم وهذا من	کے جیسا معاملہ ہے جو شروع شروع
جنس جهال الترك الذين اسلموا	میں اسلام لائے تھے، کیونکہ اسلام
فان الاسلام عندهم غير	ان کے نزدیک سب مذاہب

غیرہ وان کان غیرہ جائزاً بشرطیکہ وہ دوسرے مذہب کو بھی

لا یوالون علیہ ولا یعادون علیہ جائز سمجھتے تھے جس سے نہ انھیں دوستی تھی نہ دشمنی

شام اور عراق و ایران وغیرہ اسلامی ملکوں میں جہاں اکثر شیعہ مسلمانوں کی تھی، وحدت ادیان کے رجحان کو پر پرزے نکالنے کا زیادہ موقع نہ مل سکا لیکن ہندوستان میں اسے پوری طرح کھل کھیلنے کا موقع مل گیا، بالخصوص مغلوں کی حکومت کے زمانہ میں، رواداری جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، اسلام کی تعلیمات کا رکن رکین ہے، لیکن مذہب معین کا التزام بھی ہمیشہ سے اخلاقی نظم وضبط کا ضامن رہا ہے، ہندوستان میں جب اس نام نہاد "صلح کل" کو پر پرزے نکالنے کی آزادی ملی تو اخلاقی نظم وضبط بڑی تیزی سے منہدم ہونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیادار اہل غرض، ان صوفیائے کرام کے پاس بیشتر حالات میں صرف دنیوی مرادوں کے لیے دعا کرانے جاتے تھے، اس لیے منطقی طور پر انجام کار اس میں مسلم وغیر مسلم کی تفریق بیکار ثابت ہوئی، اس لیے مسلم سوسائٹی کے اعلیٰ طبقہ نے جب مسلمان صوفیاء کی خدا ترسی و عقبیٰ شناسی کو اپنی نفسانی خواہشات کے بر لانے میں حارج پایا تو انھوں نے غیر مسلم متصوفین، بالخصوص جوگیوں وغیرہ کی جانب رجوع کیا، اس کا آغاز ہمیں محمد تغلق (۷۲۵ھ - ۷۵۲ھ) کے زمانہ سے ملتا ہے، عصامی اس کے بارے میں لکھتا ہے:-

زآئین اسلام سر تافتہ ابا زمرۂ کفر در یافتہ

بر انداختہ رسم با ملک نہاد شب وروز با اہل ہندو گشاد

جماعت ہمہ در انداختہ ابا ہندوان ہمرہی ساختہ

ابا جوگیان گشتہ خلوت گرا دل از مکھارا دادہ چا

عصامی محمد تغلق کا نکتہ چیں ناقد تھا، مگر ابن بطوطہ تو اس کا احسان مند تھا، وہ بھی اس کی خلوت کا

ایک واقعہ لکھتا ہے جہاں جوگی اسے "شکتی جوگیہ" کی تعلیم دیا کرتے تھے، اور انھوں نے اس کا عملی مظاہرہ کر کے اسے دہشت زدہ کر دیا تھا۔

پھر بھی سلاطین دہلی کو کچھ دینی پاسداری اور کچھ غیرت ایمانی محمد تغلق کی روش پر چلنے سے مانع رہی، مگر مغلوں کے زمانہ میں جوگیوں سے خلا ملا اور استمداد کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اکبر پرکھوتم برہمن سے اقتدار پرستی کے سے نسخے سیکھا کرتا تھا۔ بدایونی نے لکھا ہے:۔

"چند گاہے پرکھوتم نام برہمنے کہ معبر نامہ خرد افزا بود، در خلوت بردہ اسامی ہندی از
برائے موجودات اشیاء بزبانِ خاص بہ اختراع می خواستند و چند گاہے دیوی برہمن
را کہ از جملہ معبرانِ مہابھارت بود، بر چارپائے نشاندہ و بالا کشیدہ نزدیک بُرجے
کہ آنرا خواب گاہ ساختہ بودند معلق داشتہ از وے اسرار و افسانہائے ہندی و
طریق عبادت اصنام و آتش و آفتاب و تعظیم کواکب و احترام اساطین کو مثل برہما
و مہادیو و بشن و کشن و رام و مہامائی کردن ایشاں از بنی نوع انسان موہوم است
و نمودن تیقن ...... بآنجانب گرائیدند" (منتخب التواریخ ص ۲۲۲)

اس زمانہ میں جدروپ (چترروپ) سنیاسی کی بڑی شہرت تھی، جو اجین میں رہتا تھا، اکبر بھی خاندیش کی فتح کے بعد اس سے ملنے گیا، وہ ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتا تھا، جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے:۔

"در حالت کہ والد بزرگوارم قلعہ اسیر و ولایت خاندیش را فتح نمودہ بتوجہ
دار الخلافہ آگرہ بودند۔ در ہمیں جا (مقام اجین) او را دیدہ بودند و ہمیشہ خواب
یاد می کردند" (تزک جہانگیری ص ۱۷۲)

اکبر کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا، اس کی تخت نشینی حضرت مجدد الف ثانی اور شیخ عبد الحق محدث

دہلوی اور ان کے انداز فکر پر سوچنے والے دوسرے مصلحین کی مساعی کا نتیجہ تھی، اور اس میں فرید خاں بخاری وغیرہ اسلام پسند امراء کی کوششوں کا بڑا دخل تھا، اس لیے شروع میں جہانگیر نے اس نام نہاد "صلح کل و رواداری" اور "مزعومہ وحدت ادیان" کی حقیقت الحاد اور ہذیانات کے علاوہ اباحت اور بدترین فسق و فجور کی پہلی منزل تھی، بڑی سختی سے بیخ کنی کی، چنانچہ پانچویں سال جلوس میں اس سے شکایت کی گئی کہ کچھ لڑکے ایک سنیاسی کے پاس جاکر بیٹھتے ہیں، اس اختلاط و مجالست میں اسے الحاد و ارتداد کا خطرہ نظر آیا، اس لیے حزم و دور اندیشی کے پیش نظر ان لڑکوں کی تنبیہ و تادیب کے لیے سخت احکام جاری کیے، چنانچہ خود پانچویں سال جلوس کے واقعات میں لکھتا ہے:

"دریں روزہا ظاہر شد کہ کوکب پسر قمر خاں بہ سنیاسیے آشنائی پیدا کردہ و رفتہ رفتہ سخنان او کہ تمام کفر و زندقہ است بمذاق آں جاہل جا کردہ، عبداللطیف پسر نقیب خاں و شریف عم زادہائے خود را دریں ضلالت با خود شریک ساختہ بودہ است، تادیب و تنبیہ آں را لازم دانستہ کوکب و شریف را بعد از شلاق مقید و محبوس ساختم و عبداللطیف را یک صد و دو صد فرمودم کہ در حضور زدند۔ ایں تنبیہ خاص بجہت شریعت بود تا دیگر جاہلاں اخلال دریں امور ہوس نکنند" (تزک جہانگیری ص ۸۲)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ "الناس علی دین ملوکھم" کے مصداق اکبر نے سنیاسیوں وغیرہ سے جو الحاد و زندقہ سیکھنا شروع کیا تھا، اس سے یہ سم عوام میں بھی پھیل گئی تھی، اور اگر آئندہ بھی جہانگیر اسی طرح "جہت حفظ شریعت" میں کمر بستہ رہتا تو شاید وہ اس کی بیخ کنی میں کامیاب ہو جاتا، یا کم از کم اسے وبائی شکل اختیار نہ کرنے دیتا۔

لیکن جب ہشتم جلوس میں نور جہاں حرم میں داخل ہو گئی تو پھر "جہت حفظ شریعت"

یہ اتفاق ایسا پڑ گئی کہ خود بادشاہ سلامت ان جوگیوں اور سنیاسیوں سے استمداد کیلئے ان کی کٹیوں پر جانے لگے، پہلے پہر بندگوار کے مقتدا جدروپ سے عقیدت ہوئی، اور اسے دربار میں بلانے کا ارادہ کیا، مگر پھر اسے زحمت دینے کے بجائے خود بدولت نے زحمت فرمائی اور گیارہویں سال جلوس میں اس کے پاس پہنچے، چنانچہ اس سال کے واقعات میں لکھتے ہیں:-

"مکرر شنیدہ بودم کہ سناسیے مرتاضے جدروپ نام کہ چندیں سال است کہ در نزدیک معمورۂ اجین در گوشۂ صحرا از آبادانی دور متوجہ و مشغول پرستش معبود حقیقی است، خواہش صحبت او بسیار داشتم، وقتیکہ در دارالخلافہ آگرہ بودم، می خواستم کہ او را طلبیدہ ببینم، خاتماً ملاحظۂ تصدیع او کردہ نطلبیدم، چون بحوالی شہر مذکور رسیدم از کشتی برآمدہ نیم پاؤ کروہ پیادہ بدیدن او متوجہ گشتم...... خالی از دانش نیست، علم بیدانت را کہ علم تصوف باشد خوب ورزیدہ، تا شش گھڑی با او صحبت داشتم، سخنان خوب مذکور ساخت۔ چنانچہ خیلے در من اثر کرد۔ او را ہم صحبت من در افتادہ" (تزک جہانگیری ص ۱۶۵-۱۶۶)

دو سال بعد وہ پھر اس کی زیارت سے مشرف ہوئے، چنانچہ تیرہویں سال جلوس کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"روز کم شنبہ بست و نہم با جدروپ کہ از مرتاضان کیش ہنود است تفصیل احوال او در اوراق سابق نگاشتۂ کلک وقائع نگار گردیدہ صحبت داشتہ، بسیار تماشائے صحبت او بوزیدیم، بے تکلف صحبت او از مغتنمات است" (تزک جہانگیری ص [illegible])

اگلے سال جب جدروپ اجین سے متھرا آگیا تو جہانگیر کو پھر اسکی کشش نے کھینچا اور وہ پھر اس کی خدمت میں حاضر ہوا، چنانچہ چودہویں سال جلوس کے ضمن میں لکھتا ہے،

"گوسائیں جدروپ کہ در اجین گوشۂ انزوا داشت ...... در تیولات اوجین بخاطر از اعاظم معابد ہنود است نقل مکان نمودہ بر کنار دریائے جمنا بعبادت معبود حقیقی اشتغال دارد۔ چوں صحبت او پیرامون خاطر می گشت، بقصد ملاقات او شتافتم و زمانے ممتد در خلوت بیش صحبت خیر صحبت داشتہ شد۔ الحق کہ وجودش بغایت مغتنم است۔ در مجلس او محظوظ و مستفید می تواں شد۔" (تزک جہانگیری، ص ۲۷۹)

دو سال کے بعد بنارس کا ایک اور ہندو "درودان" دربار میں آیا، اس کا نام رودھ بھٹاچارج تھا، چنانچہ سولہویں سال جلوس کے ضمن میں مرقوم ہے:

"دریں ایام رودھ بھٹا چارج نام برہمنے کہ از دانشوران ایں گروہ است، در بنارس بافادہ و استفادہ اشتغال داشت، دولت ملازمت دریافت۔ الحق مطالب عقلی و نقلی را خوب ورزیدہ و در فن خود تمام است۔" (تزک جہانگیری ص ۳۲۹)

جہانگیر کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا، وہ ان ڈھکوسلوں کے بجائے نصرت خداوندی اور اپنی قوت و بازو پر زیادہ بھروسہ کرتا تھا، اس لیے اس نے بہت سی غیر شرعی رسوم کا خاتمہ کر دیا، گریہ وبا عام ہو چکی تھی، اور خصوصیت سے امراء کا طبقہ ہندو جوگیوں اور سنیاسیوں کا بڑا عقیدت مند تھا، ان میں عبدالرحیم خانخاناں خاص طور سے قابل ذکر ہے، وہ تو جدروپ کا اس درجہ عقیدت کیش تھا کہ اس کے آگے سجدہ کرتا تھا، صاحب دبستان المذاہب نے جہانگیر کو جدروپ سے جو عقیدت تھی، اس کے ذکر کے بعد لکھا ہے:-

"گسائیں جدروپ از گروہ سنیاسی است از نژاد برہمنان گجرات کہ آن فرقہ را ناگر برہمن گویند، و پدرش در سلک جوہریان آں دیار انتظام داشت، او بامتداد سالہای چند بود ..... چوں وے در زیر سن پست سالگی یافتہ از آں دیار و چند از فرزنداں را باشہ رو [illegible]

اختیار نمود...... حضرت جنت مکانی شاہ نورالدین جہانگیر بادشاہ بابا نہ معتقد بود

پاس خاطر او را کما ینبغی می داشت۔ و عبدالرحیم خانخاناں پیش او سجدہ می کرد۔"

(دبستان المذاہب)

اس سجدۂ غیر اللہ میں تو کوئی استبعاد نہ ہونا چاہیے۔ اقتدار پرستی کا یہی انجام ہوتا ہے، جس سر کو مسجودِ حقیقی کے سامنے جھکنے میں تکلف ہوتا ہے، غیرت خداوندی اس کی پیشانی پر داغ ذلت و رسوائی لگائے بغیر نہیں چھوڑتی، اپنے ہی ابنائے جنس کے سامنے سر جھکانے سے لیکر کائنات کی حقیر ترین مخلوقات تک کے سامنے اس کا ماتھا ٹکوا دیتا ہے، شرک سے قطع نظر "وحدت ادیان" اور "صلح کل" کا نتیجہ کبھی کبھی فسق و فجور کی شکل میں بھی ظاہر ہوتا ہے، اس کی مثال ظفر خان والی کشمیر اور گسائیں ترلوچن کے تعلقات ہیں، ہوس اقتدار کے بھوکے ظفر خان نے تبت کی فتح کے لیے گسائیں ترلوچن کی خوشامد کی اور اسکی فرمائش پر اس کے لیے طوائفیں مہیا کیں، چنانچہ صاحب "دبستان المذاہب" نے ترلوچن کے تذکرے میں لکھا ہے:

"احسن اللہ مخاطب بظفر خان خواجہ ابوالحسن ترمذی کہ حاکم کشمیر بود، بتوسط محرمان حرم خویشس کہ با گسائیں کمال ربط داشتند، آشنا شد، التماس نمود کہ بر تبتیان فیروزی یابد ترلوچن گفت تسخیر تبت توان کرد، اگر بموجب فرمودہ عمل نمائی۔ ظفر خان پذیرفت، عہد و پیمان بالا جانبین استوار کردند۔ ترلوچن فرمود، جمعہ از لولیان را تعین کن کہ پیوستہ از من جدا نشوند، چہ در کیش ما لولی آمیزش ستودہ تر از زنان دیگر است...... والا شراب و مسکرات دیگر نیز مباح نباشد...... ظفر خان بدانچہ گسائیں فرمود عمل نمود۔ چوں بہ تبت لشکر کشید، فیروز گشت و مظفر باز آمد، انجام میان گسائیں و ظفر خان بگشت

میں چند بڑے پیغمبروں اور ہندوستان کے بعض سادھو سنتوں کے قصے، مہاراشٹر کے بعض دیوی اور بمبئی کے مخیر لوگوں کا ذکر ہے، تیسری کتاب میں اسکول، پنچایت، گاؤں پنچایت، میونسپلٹی، ڈسٹرکٹ بورڈ، صوبائی اسمبلیوں، بمبئی کے نظم و نسق، اور تمدن و شہریت وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں، ہر کتاب میں ضروری، مذہبی، اخلاقی، اور معاشرتی آداب سے بچوں کی واقفیت کا بھی خاص لحاظ رکھا گیا ہے، اس حیثیت سے ان کتابوں میں مذہب، اخلاق، معاشرت، سائنس، جغرافیہ، شہریت اور تمدن وغیرہ کے متعلق گوناگوں قسم کے ضروری اور مفید معلومات جمع کر دیئے گئے ہیں، اور بچوں کے ذہن کو بار سے بچانے کے لئے مکالمہ کا انداز اختیار کیا گیا ہے، یہ تینوں کتابیں بچوں کے لئے نہایت مفید اور اُن کے کورس میں شامل کئے جانے کے لائق ہیں،

تفسیر المعوذتین: از حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مترجمہ مولانا حمید الزماں کیرانوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت، وطباعت، عمدہ، صفحات ۵۲، قیمت: عمر، مجلس معارف القرآن دار العلوم دیوبند،

مجلس معارف القرآن دیوبند نے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کی تصنیفات کی اشاعت کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے، یہ رسالہ اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اس میں حضرت نانوتوی کے فارسی رسالہ" اسرار قرآنی" کے ایک حصہ کا جو معوذتین کی تفسیر کے متعلق تھا اردو میں ترجمہ کیا، رسالہ استعاذہ کی حقیقت، مستعاذ بہ اور مستعاذ منہ کے متعلق لطیف اسرار و نکات پر مشتمل ہے، شروع میں مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند نے مصنف کے حالات و کمالات تحریر فرمائے ہیں،

" ض "

مولانا ابوالکلام آزاد پر پہلی کتاب

از جناب ابوسلمان شاہجہانپوری

مولانا ابوالکلام آزاد پر چھوٹی بڑی چالیس کتابیں میری نظر سے گذر چکی ہیں، اخبارات ورسائل کے وہ تیس نمبران کے علاوہ ہیں، جو مولانا کی یاد میں شائع ہوئے ہیں، یہ تمام کتابیں اور رسالے بجز ایک عربی رسالہ کے اردو اور انگریزی میں ہیں، برصغیر پاک وہند کی دوسری کسی زبان کی کوئی کتاب یا رسالہ میری نظر سے نہیں گذرا، لیکن یہ معلوم ہے کہ بنگالی، تلنگی پنجابی، پشتو، سندھی وغیرہ زبانوں میں بھی مولانا مرحوم پر کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ہیں، اردو اور انگریزی کے بارے میں بھی یہ دعوی نہیں کیا جاسکتا کہ مولانا آزاد پر صرف وہی کتابیں اور رسالے ہیں جو میری نظر سے گذرے ہیں، عام اندازے کے مطابق مولانا آزاد پر تقریباً ایک سو کتابیں اور اخبارات ورسائل کے خصوصی شمارے شائع ہوئے ہیں، اس مضمون میں مولانا پر ایک کتابچے کا تعارف کرانا مقصود ہے، اس کا نام "امام الاحرار حضرت مولانا ابوالکلام آزاد" ہے، اور "عصر جدید بک ایجنسی کلکتہ" کے زیر اہتمام فروری ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا، مولانا کے سلسلے میں یہ کتابچہ بوجوہ ذیل اہمیت رکھتا ہے

۱- جہانتک میری معلومات کا تعلق ہے مولانا آزاد پر سب سے پہلی مستقل تصنیف ہے،

۲- پیش نظر کتابچہ "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" مرتبہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا ملخص ہے، کہانی کا کوئی حصہ ایسا نہیں جو اس کتابچے میں اختصار کے ساتھ آگیا ہو

اور اس لیے وہ غلطیاں بھی جو واقعات کی تفصیل، اشخاص و کتب کے ناموں اور تاریخ و سنین کے بیان میں ہیں سہو سے ہوئیں،

۳۔ مولانا ملیح آبادی کی تصنیف "ذکر آزاد" کی ایک کمی اس سے پوری ہوگئی ہے "ذکر آزاد" میں مولانا ملیح آبادی نے ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور نصب العین کے بارے میں چند سوالات کے جوابات میں مولانا کی ایک تحریر نقل کی ہے، سوالات کے بارے میں انھوں نے معذرت کی ہے کہ اصل پرچہ ضائع ہوگیا، لیکن اس کتابچہ میں نہ صرف جوابات ہیں بلکہ سوالات بھی ہیں، نیز اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ "ذکر آزاد" میں ایک اہم سوال کا جواب بھی چھوٹ گیا ہے،

۴۔ اس کتابچے کے مطالعے سے مولانا آزاد کی زندگی کے بارے میں بعض دلچسپ واقعات اور جیل کے معمولات کا علم ہوتا ہے، اور ان کے اخلاق و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے،

۵۔ آسان و سادہ و صحیح زبان، دل کش طرز تحریر اور مضامین و مباحث کی سائنٹفک تقسیم و ترتیب کی بنا پر بھی اس کی ایک خاص اہمیت ہے،

یہ کتابچہ بہتر صفحات پر مشتمل ہے، صفحہ ایک سے تینتیس تک "آزاد کی کہانی" کا خلاصہ ہے، جسے مصنف نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے الفاظ میں بیان کردیا ہے، اس میں مولانا کے خاندان، تعلیم و تربیت، ابتدائی علمی و ادبی مشاغل وغیرہ کا تذکرہ اور "مذہبی خیالات کا نشو و نما" کے زیر عنوان خیالات میں تبدیلی کے اسباب و محرکات کا بیان کیا ہے، اور اسی سلسلے میں مولانا آزاد کی وہ تحریر نقل کی ہے جو انھوں نے ۱۹۲۱ء میں علی پور جیل میں مولانا ملیح آبادی کے ایک سوال کے جواب میں لکھ دی تھی اور ذکر آزاد میں موجود ہے (صفحہ ۲۳۰-۲۲۹)

کتابچے کے ابتدائی حصے میں جو "آزادی کی کہانی" کا خلاصہ ہے، مولانا [illegible] اور ان کی حیرت و استعجاب کے متعلق "کہانی" سے مختلف واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ "انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں، مولانا نے اس چھوٹی سی عمر میں نہایت دلیری [illegible] کے ساتھ لکچر دیا، مولانا حالی کو تو اس واقعے سے اس قدر تعجب ہوا کہ انھوں نے [illegible] کہ انھیں یقین نہیں ہوتا کہ یہ لکچر خود مولانا کا ہے، چنانچہ اس کے بعد انھوں نے [illegible] ایک موضوع دیا اور جب مولانا نے اسی وقت اس موضوع پر بھی تقریر کی [illegible] ماننا پڑا مگر تعجب دور نہ ہوا۔" (صفحہ ۹)

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انجمن کے جلسے میں اس قسم کے امتحان کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا، بات وہی صحیح ہے جو ملیح آبادی نے تحریر فرمائی ہے، یعنی مولوی وحید الدین سلیم نے مولانا حالی مرحوم سے مولانا آزاد کی تقریب کی تو انھیں بڑا تعجب ہوا اور بمشکل انھوں نے یقین کیا، کہ "لسان الصدق" کے اڈیٹر یہی ہیں، چوں کہ یہ صورت وحید الدین سلیم سے ملاقات کے وقت بھی پیش آچکی تھی، اس لیے انھوں نے تقریب کی یہ صورت اختیار کی، مولانا آزاد کی زبانی ملیح آبادی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

"بہرحال جب انھیں (مولوی وحید الدین سلیم کو) یقین ہو گیا تو اصرار کیا کہ چلو مولانا حالی سے ملیں، مولانا (حالی) کی قیام گاہ پر آئے اور آتے ہی انھوں نے مولانا سے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا کہ آپ کے خیال میں ان کی عمر کیا ہے؟ مولانا نے بہت سنجیدہ لہجے میں بہت تامل کر کے کہا کہ ابھی کمسن ہیں، انھوں نے پھر دوبارہ کہا کہ نہیں بتائیے عمر کتنی ہے؟ مولانا نے کہا کہ پندرہ سولہ برس کی ہوگی، انھوں نے کہا "لسان الصدق" کے یہی اڈیٹر ہیں،" مولانا نے کہا "جو کلکتہ سے نکلتا ہے؟" میں نے کہا "ہاں!" "لیکن انھیں

احساس ہوا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ معاملے میں کوئی پیچیدگی سی محسوس کرتے ہیں، جب مولوی وحید الدین سلیم نے اپنے تعجب کا بھی ذکر کر کے انھیں یقین دلایا کہ یہی اڈیٹر ہیں بجزہ، اس یقین کے وہ بہت ہی خوش ہوئے۔ میں دور بیٹھا تھا، مجھے قریب بلایا اور حالات پوچھنے لگے "کیا آپ ابھی پڑھتے ہیں؟" میں نے کہا نہیں، میں اپنی تعلیم ختم کر چکا ہوں"۔ کہنے لگے "کتنا عرصہ ہوا؟" میں نے کہا "دو تین سال" اس پر انھیں اور بھی تعجب ہوا، اس دن سے وفات تک وہ برابر شفقت فرماتے رہے اور ہمیشہ ان کے خطوط آتے رہے۔

اس واقعہ کے تذکرے پر "کہانی" کا خلاصہ ختم ہو جاتا ہے اور مصنف کا اصل کارنامہ شروع ہوتا ہے۔ سب سے پہلے "اصلاح، ہدایت و ارشاد" کے عنوان سے الہلال کے اجراء کا پس منظر بیان کیا گیا ہے اور ہندوستان کی مذہبی حالت، جدید و قدیم علماء، ان کے کردار اور اسلام و قرآن کے بارے میں مسلمانوں کے رسمی و روایتی تصورات پر روشنی ڈالی ہے، اور الہلال کے اجراء اور اس کی دعوت و خدمات سے بحث کی ہے اور اکابر مثلاً حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا شوکت علی کے اعترافات کو نقل کیا ہے، صفحہ ۳۳ سے ۶۳ تک الہلال کی بندش، کلکتہ سے مولانا کے حکم اخراج اور رانچی میں نظر بندی کا تذکرہ ہے، اس سلسلے میں "تذکرہ" کی آخری پوری فصل نقل کر دی گئی ہے، رانچی میں مولانا کے قیام، خطبات جمعہ کے اہتمام اور مسلمانوں کی بیداری کا تذکرہ ہے، مدرسہ رانچی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بہت سے لوگوں نے مدرسہ کے قیام کے ارادے سے منع کیا تھا اور کہا تھا کہ کامیابی ممکن نہیں بلکہ خود کمشنر نے ہنسی اڑائی تھی اور مسٹر ایس پی سنہا سے کہا تھا، ہائی اسکول قائم کریں گے یا کھپریل کا ایک جھونپڑا ڈالیں گے، لیکن مولانا نے ہمت نہ ہاری اور کچھ دنوں کے بعد لوگ ایک عالی شان عمارت دیکھ کر حیران رہ گئے، خود کمشنر عمارت دیکھ کر سخت متحیر ہوا اور اسی کی سفارش پر بہار گورنمنٹ نے خرید زمین، پندرہ ہزار روپیہ نقد

اور تین سو روپئے ماہوار کا عطیہ اسکول کو دینا چاہا لیکن مولانا نے سرکاری امداد لینے سے انکار کر دیا۔ (ص ۳۷)

کتابچہ کے مطالعہ سے مزید معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کی عمارت پر سولہ ہزار روپئے صرف ہوئے تھے، مولانا کی کوششوں سے ۲۵ ہزار روپئے کی زمین مدرسہ کے لیے وقف کی گئی تھی، مولانا آزاد اس زمانے میں سخت تنگی اور عسرت میں زندگی گذار رہے تھے، گھر کی قیمتی اشیاء اور زیور فروخت ہو چکا تھا۔ لیکن نہ تو انھوں نے گورنمنٹ کا وظیفہ قبول کیا، نہ کسی انجمن کی کسی قسم کی امداد قبول کی اس سلسلے میں مصنف نے لکھا ہے

"کلکتہ سے دو ہزار روپئے اور دہلی سے ڈھائی ہزار روپئے بھیجے گئے مگر مولانا نے اسے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور جب بہت مجبور کر دیئے گئے تو یہ ساڑھے چار ہزار روپئے اسکول فنڈ میں منتقل کر دیا جس سے اسکی چھت پاٹی گئی، حالانکہ جس روز انھوں نے ایسا کیا ہے گھر میں ایک ہفتہ سے تقریباً فاقہ کی نوبت تھی" (ص ۳۸)

اس کے بعد مولانا کی رہائی، مسئلۂ خلافت اور تحریک ترک موالات کے سفر و جلسہ، ترک موالات کے پروگرام، مولانا آزاد کے زیر صدارت صوبائی خلافت کانفرنس کے اجلاس کلکتہ، مولانا کا خطبۂ صدارت وغیرہ کا تذکرہ ہے، اسی زمانہ میں مولانا محمد علی جوہر نے ایک تقریر میں کہا تھا؛

"اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ آور ہوگا تو مسلمانان ہند افغانستان کا ساتھ دیں گے، کیونکہ یہی ان کا مذہبی حکم ہے۔ (ص ۴۴)

مولانا محمد علی کے اس بیان پر ہنگامے اور اس سلسلے میں مولانا آزاد کے ایک معرکہ آرا مقالے اور تحریک لاتعاون کے سلسلے میں مولانا آزاد کی خدمات کا تذکرہ ہے، یہ تمام مباحث پیش نظر رسالے کے صفحہ ۴۰ سے ۴۸ تک پھیلے ہوئے ہیں، اس سلسلے میں مختلف سیاسی مسائل کی نسبت مولانا کے خیالات بھی پیش کیے گئے ہیں، ڈاکٹر عابدین مولانا آبادی تحریر فرماتے ہیں،

"جب کبھی ہم نے آپ سے مولانا سے درخواست کی کہ آپ ہمیں سوراج کی تشریح کر دیں

مولانا نے فرمایا سوال مرتب کر دو جواب لکھ دوں گا۔ میں نے سوال پیش کر دیے، افسوس سوالات

کا مسودہ محفوظ نہیں رہا، مگر جواب میں مولانا کی تحریر محفوظ ہے، یہاں نقل کرتا ہوں۔" (ص ۲۰۳-۲۰۴)

لیکن اس کتابچہ میں نہ صرف مولانا کے جوابات ہی ہیں، بلکہ مولانا ملیح آبادی کے سوالات بھی درج ہیں، جن کے محفوظ نہ رہنے کا انھیں افسوس تھا، پیش نظر کتابچہ سے صرف سوالات ہی کا علم نہیں ہوتا یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوال کا جواب بھی ضائع ہو گیا تھا، ان سوالات کی اہمیت کے پیش نظر انھیں یہاں نقل کیا جاتا ہے،

(۱) سوراج کے معنی برٹش امپائر کے ماتحت ہیں یا کلی؟

(۲) کیا مہاتما گاندھی جی کے نان وائلنس نان کوآپریشن سے ہندستان کو سوراج مل سکتا ہے؟

(۳) نان کوآپریشن میں نان وائلنس کی شرط آپ کے نزدیک کیسی ہے؟

(۴) موجودہ ہندو مسلم اتحاد کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

(۵) خلافت کے مطالبات کیا ہیں؟ اور گورنمنٹ کی کس کارروائی سے اطمینان ہو سکتا ہے؟

(۶) مخالفین ہند کے اس اعتراض کا کیا جواب ہے کہ اگر سوراج ہو جائے تو مسلمان ترکی یا افغانستان کو نہ بلا لیں گے؟

(۷) کیا چرخہ قومی زندگی میں مستقل جگہ لے سکے گا؟

یہ تمام سوالات اور جوابات اس رسالے کے صفحہ ۲ سے ۲۸ تک درج ہیں۔ "ذکر آزاد" میں سے چھ سوالوں کے صرف جواب درج ہیں، سوال نمبر ۵ کا جواب "ذکر آزاد" میں نظر انداز ہو گیا ہے، اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں:

"مطالبات خلافت کی تشریح میں میری کتاب اردو اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہے

مطالبات یہ تھے کہ ان مقامات مقدسہ کو خلیفہ المسلمین کے زیر انتظام کر دیا جائے، جزیرۃ العرب کو غیر مسلموں کے تسلط سے آزاد کرا دیا جائے، ترکوں کو اُن علاقوں میں رکھنے کا حق دیا جائے جو ترکی کے ہیں، مصر اور عراق کو آزاد کیا جائے اور انھیں بالکل چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ آزاد و خود مختار حکومت خلیفۃ المسلمین کے زیر سایہ قائم کر لیں، تھریس اور سمرنا ترکوں کو واپس دے دیا جائے، قسطنطنیہ، درہ دانیال اور خلیفۃ المسلمین کی حکومت پر کسی طرح کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ اسلام کے مقدس مقامات کا اہتمام خلیفہ کے زیر اقتدار رہنا چاہیے۔" (ص ۵۲)

صفحہ ۴۵ سے ۶۰ تک مولانا آزاد کی تصنیفات کا تعارف کرایا ہے، اور اس مقصد کیلئے مولانا کی وہی تحریر درج کی گئی ہے جو مولانا ملیح آبادی مرحوم نے "ذکر آزاد" میں نقل کی ہے۔

صفحہ ۶۰ سے ۷۲ تک علی پور جیل میں مولانا کے معمولات اور اخلاق و عادات کا ذکر ہے، اس سے ہمیں بعض اہم اور دلچسپ باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ

(۱) مولانا ہمیشہ اپنے سیل (کوٹھری) میں علمی مشاغل میں مصروف رہا کرتے تھے، اپنی کوٹھری سے کبھی نہیں نکلتے تھے، البتہ جب ایک مرتبہ پاؤں میں کچھ تکلیف ہو گئی تو صبح و شام جیل کے احاطے میں چہل قدمی کرنے لگے تھے۔

(۲) مغرب اور عشا کی نماز ایک وارڈ میں جس کا نام "سیگریگیشن" تھا، باجماعت ہوتی تھی، اور مولانا اس میں روز تشریف لاتے تھے۔

(۳) صبح و شام جب جیل کے احاطے میں مولانا نکلتے تو مشتاقین دید و کلام کی تمنائیں پوری ہو جاتیں اور چاروں طرف سے خدام پروانہ وار گھیر لیتے تھے۔ اس وقت میں جو کم و بیش ایک گھنٹہ ہوتا، مولانا مختلف مسائل پر گفتگو فرماتے اور لوگوں کو استفادہ کا موقع عنایت فرماتے (ص ۶۸)

(۴) عید کی نماز کے موقع پر جیل کے بیچ جو امام صاحب مقرر تھے وہ تشریف لائے مگر

چونکہ وہ ریشمی کپڑے پہنے ہوئے تھے اس لیے تارکین موالات نے کوشش کی کہ مولانا امام بنیں مولانا نے انکار کردیا اور فرمایا کہ جو یہاں کا قاعدہ ہے ہم کو اس کی مخالفت کی ضرورت نہیں۔

عیدالاضحیٰ کے موقع پر وہ امام صاحب کسی وجہ سے نہ آئے اور جیل کے حکام نے کہدیا کہ نماز کا انتظام لوگ خود کرلیں، چنانچہ اس مرتبہ مولانا نے امامت کی مصنف رسالہ تحریر فرماتے ہیں

"اللہ اکبر وہ بھی عجیب منظر تھا جب جیل کے احاطے کے اندر تین سو تارکین موالات اور کئی سو عام قیدیوں نے ایک بڑی جماعت کے ساتھ مولانا کی امامت میں نماز ادا کی اور جیل کے اندر مولانا نے اردو میں خطبہ دیتے ہوئے حق کا اعلان کیا مولانا نے معمولی قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کس قدر افسوس ہے کہ تم لوگ چوری، ڈکیتی اور قتل و غارت کے جرم میں جیل آئے ہو جس سے خود تمہارے خدا نے تمھیں روکا ہے، اگر تم مذہب و ملک کے لیے جیل آتے تو یہ ایک بات ہوتی، یہ سزائیں جو تم یہاں بھگت رہے ہو یہ تو دنیاوی حکومت تم کو دے رہی ہے اب خدا کے یہاں جو سزا تم کو ایسے جرائم کی ملے گی وہ اس کے علاوہ ہے بس تمھیں چاہیے کہ اپنے انجام کو سوچو اور اللہ کے آگے عاجزی سے اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرو۔" (۹۹تا۱۰۰)

مولانا مرحوم کے ضبط و برداشت کے متعلق اس رسالے کے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

"...... سیاسی قیدی آزادی کے ساتھ آپس میں ملتے جلتے تھے، مگر مولانا کے صبر و ضبط کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جیل میں آپ ہی تنہا تھے جو اپنا زندگی کے دائمی اصول پر قائم رہے، جیل کی تنہائیوں نے کوئی اثر آپ پر نہیں ڈالا اور آپ کو وہاں جاکر اپنی کوئی وضع چھوڑنی نہیں پڑی۔

یہ بات بظاہر کوئی اہم نہیں معلوم ہوتی مگر اس سے "دل کی مضبوطی اور عزم و استقلال

گے رسوخ کا اندازہ ہوتا ہے، اور کچھ شک نہیں کہ یہ خدا کا ایک عظیم الشان فضل ہے۔" (ص ۔۔۔)

علی پور جیل سے مولانا کی رہائی کے سلسلے میں لکھا ہے:

"مولانا کی رہائی کا دن حساب سے ۹ر جنوری تھا مگر حکام جیل نے اس خیال سے کہ شاید اسی دن جیل کے دروازہ پر کلکتہ ٹوٹ پڑیگا دفعتاً ۸ر جنوری کی رات کو مولانا کو خبر دی کہ آپ کو رہا کیا جاتا ہے، مولانا نے فرمایا کہ سردی کی رات ہے اور صحت اچھی نہیں، اس وقت جانے میں تکلیف ہوگی، اس لیے میرے لیے اس میں آسانی ہے کہ صبح کو جاؤں، سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ اس میں حرج تو کوئی نہیں ہے مگر مجھے اندیشہ ہے کہ جیل کے پھاٹک پر لوگوں کا اژدہام ہو جائے گا۔ مولانا نے فرمایا کہ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ ایسا نہ ہونے دوں گا، سپرنٹنڈنٹ راضی ہوگیا، اکثر اسباب اور کتابیں تو رات ہی میں مولانا کے مکان پہنچا دی گئیں اور صبح کو اندھیرے ہی مولانا رہا کر دیے گئے،

.... مولانا نے جیل سے آتے ہی فرمایا کہ "کانگریس میں جو دو جماعتیں ہوگئی ہیں یہ ملک کے لیے نہایت مضر ہے"، اور جب پوچھا گیا کہ آپ کا اب کیا پروگرام ہوگا تو فرمایا کہ "سب سے پہلے میں کانگریس کی دونوں جماعتوں میں صلح کرانے کی کوشش کروں گا"۔ چنانچہ مولانا نے فوراً بمبئی اور الہ آباد کا سفر کیا اور دونوں جماعتوں کو آمادہ کیا کہ دونوں کچھ نرم ہوکر ایک پلیٹ فارم پر آجائیں۔"

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن جلد اول کے دیباچے میں مدت اسارت ۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء سے پندرہ ماہ بتائی ہے، یعنی اس حساب سے فروری ۱۹۲۳ء کے اواخر میں رہائی پائی، انڈیا ونس فریڈم میں بتایا ہے کہ مجھے ایک سال کی سزا ملی تھی لیکن میں یکم جنوری ۱۹۲۳ء تک رہا نہیں کیا گیا لیکن اس رسالہ سے مدت اسارت اور تاریخ رہائی کا قطعی تعین ہو جاتا ہے

اوپر جو اقتباس نقل کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی رہائی کی تاریخ ۹ر جنوری سنہ ۲۳ء تھی لیکن انھیں ۸ر جنوری کی شام کو گھر جانے کی اجازت مل گئی تھی، اور اگرچہ مولانا نے اپنا کچھ سامان رات ہی کو گھر بھیج دیا لیکن وہ خود ۹ر جنوری کو صبح سویرے جیل سے نکلے تھے

یہ رسالہ چونکہ کانگریس کے اسپیشل اجلاس (ستمبر ۱۹۲۳ء) سے پہلے شائع ہوا تھا جو مولانا آزاد کے زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا اس لیے اس میں مولانا کی اس شاندار کامیابی پر تبصرہ نہیں کیا جا سکا، جو کانگریس کے دونوں گروہوں کو ایک پروگرام کے تحت لانے میں مولانا کو حاصل ہوئی تھی، البتہ حالات کی رفتار کی بنا پر صلح کی امید کا اظہار کیا گیا ہے اور اسی بیان پر رسالہ ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ ان آخری سطور سے رسالہ کی تاریخ تصنیف کا تعین بھی ہو جاتا ہے، اس لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ آخری سطور نقل کر دی جائیں۔

مصنف رسالہ فرماتے ہیں :-

"آج کہ ۱۰ر فروری ہے، یہ خبر آ چکی ہے کہ دونوں پارٹی صلح پر آمادہ ہیں اور مولانا کی پیش کی ہوئی شرطوں کو تسلیم کرتی ہیں، اب ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں کا اجلاس عنقریب ہوگا، اور پوری امید ہے کہ مولانا کی کوششوں سے صلح ہو جائیگی۔" (ایضاً ۔ ۶۲)

اس رسالہ کے سلسلے میں اب ایک اہم سوال یہ رہ گیا کہ اس کا مصنف کون ہے؟ تو یہ بات قطعی طور پر معلوم ہے کہ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی "ملیح آبادی کی روایت ہے، اور ۱۶ برس تک ان ہی کے قبضے میں رہی، مولانا کے سیاسی مسلک کے بارے میں سوالات ملیح آبادی نے پہلے ہی سے لکھے تھے، جیسا کہ ذکر آزاد سے صاف طور پر ظاہر ہے، اور مولانا کے جوابات کا مسودہ ان ہی کے پاس محفوظ تھا۔ ملیح آبادی بھی پہلی جیل میں مولانا کے ساتھ تھے، [illegible]

گمان یہی ہوتا ہے کہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اس رسالے کے مصنف ہوں گے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، اس رسالے کے مصنف کلکتہ کے مشہور اخبار عصر جدید کے مالک و ایڈیٹر مولانا شائق احمد عثمانی ہیں۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا عثمانی بھی مولانا آزاد اور ملیح آبادی کے رفیق جیل تھے۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا شائق احمد عثمانی جیل سے رہا ہوئے تو مولانا ملیح آبادی نے "آزادی کی کہانی......" کا مسودہ ان کے ہاتھ جیل سے باہر بھیج دیا اور جیسا کہ راقم الحروف کے نام مولانا عثمانی کے ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ نومبر ۱۹۲۲ء سے جب عصر جدید کو دوبارہ جاری کیا گیا تو آزاد کی کہانی کا خلاصہ اور مولانا آزاد سے متعلق ایک طویل مضمون عصر جدید کی کئی اشاعتوں میں شائع کیا۔ فروری ۱۹۲۳ء میں یہی مضمون کتابی صورت میں شائع کیا۔"

مولانا آزاد کے مذہبی خیالات کے نشو ونما یا سیاسی مسلک کی وضاحت کے سلسلے میں سوال و جواب کی تمہید میں یہ بات واضح کی جا سکتی تھی کہ جیل میں مولانا آزاد سے یہ سوالات مولانا ملیح آبادی نے کیے تھے، اور مولانا آزاد کے خاندانی اور دیگر حالات کا ماخذ آزاد کی کہانی ہے، جو ملیح آبادی نے جیل میں مولانا ہی کے الفاظ میں قلم بند کی ہے، لیکن مولانا ملیح آبادی اس وقت جیل میں تھے، اس لیے ان کا نام ظاہر کرنا خلاف مصلحت تھا۔ آزاد کی کہانی کا مسودہ اور دوسری تحریریں جو مولانا ملیح آبادی نے مولانا شائق احمد عثمانی کے ذریعے جیل سے باہر بھیجی تھیں، اس وقت تک انہی کے قبضے میں رہیں، جب تک مولانا ملیح آبادی رہا نہیں ہو گئے۔

تلخیص و تبصرہ

برطانیہ میں اسلام

برطانیہ میں مسلمان بہت کم ہیں، ان کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں ہے، اور اسلام کی اشاعت اسی صدی کے آغاز یعنی ۱۹۱۳ء میں بیان ہوئی، جبکہ ایک برطانوی لارڈ نے اسلام قبول کیا، ان کے مختلف مضامین میں جو اس زمانہ کے رسالوں میں شائع ہوئے تھے اس کی تفصیل نکل چکی ہے، مصر سے محمد رشید رضا کی ادارت میں نکلنے والے مجلہ المنار میں بھی ان کے اسلام کی سرگذشت چھپی تھی، اس میں ان اسباب و علل کا بھی ذکر تھا جن کی بنا پر وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے،

انگلستان میں اسلام کی اشاعت کی رفتار سست مدھم رہی ہے کیونکہ حکومت برطانیہ اسلام قبول کرنے والے مسلمانوں کو طرح طرح کے مصائب اور دشواریوں میں مبتلا کر دیتی تھی، بیان کیا جاتا ہے کہ ایک لارڈ نے جب اپنے اسلام کا اعلان کیا تو برطانوی استبداد نے لارڈ کا لقب ختم کر کے اس کو تمام حقوق و مراعات سے محروم کر دیا، آخر میں اس کو ایسے سخت حالات کا سامنا کرنا پڑا کہ اس نے مجبور ہو کر اسلام ترک کر دینے کا اعلان کیا، اس کے بعد اس کو تمام حقوق دوبارہ مل گئے۔

اسلام سے ان لوگوں کی واقفیت یا تو اصل ماخذوں کے مطالعہ یا مسلما

پڑوسیوں اور کاروباریوں سے تعلقات پیدا کرنے سے ہوئی، ان لوگوں نے ایسے اہل علم
سے واقفیت حاصل نہیں کی جو واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے ذوق کے مطابق اسلام کی تعبیر اور
ترجمانی کرتے ہیں، شروع میں تو یہ رجحان یورپین مصنفین کی تصنیفات میں بہت زیادہ کارفرما
تھا، مگر اب وہ ایک حد تک اعتدال سے قریب تر ہوگئے ہیں، اور اکثر اسلام پر ایسی کتابیں
لکھ رہے ہیں جو مجموعی حیثیت سے اقرب الی الصواب ہوتی ہیں، یہ تبدیلی اول تو اس
احساس کا نتیجہ ہے کہ گذشتہ طرز عمل پر قائم رہنا مناسب اور درست نہیں، دوسرے
اب اکثر لوگ اسلام سے اس کے اصلی ماخذوں کے ذریعہ واقف ہوتے ہیں، اس لیے
وہ اس کی خالص اور اصلی حقیقت کو سمجھ لیتے ہیں، تاہم کچھ پھر بھی گذشتہ اثرات کی وجہ سے
وہ غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں،

بعض انگریزوں نے عربی زبان میں اچھی دستگاہ حاصل کی، اور اسلام کو ٹھیک
ٹھیک سمجھ کر اس کو قبول کیا، اور وہ اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام بھی کر رہے ہیں،
اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اس سے متعلق مضامین اور کتابیں بھی لکھتے رہتے ہیں،

نومسلم انگریزوں کی مادری زبان انگریزی ہے، لیکن ان میں سے اکثر کو عربی
سیکھنے کا شوق ہے، تاکہ وہ قرآن مجید پڑھ سکیں اور نماز عربی تلفظ میں ادا کرسکیں۔

انگلستان میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو انگریزی نسل سے تعلق نہیں رکھتے
بلکہ وہ دوسرے ملکوں سے آکر یہاں آباد ہوئے ہیں، ان میں انگلستان سے سیاسی
تعلقات رکھنے والے ممالک پاکستان، ہندوستان، ملیشیا، جنوبی افریقہ، نائیجیریا،
گھانا اور کینیا وغیرہ کے لوگ زیادہ ہیں، ان سب کی ٹھیک مجموعی تعداد بتانا مشکل ہے
بعض لوگوں کا اندازہ ہے کہ یہ دو لاکھ ہوں گے، ساحلی شہروں مثلاً لورپول، کارڈف

میں بعض عربی النسل یمنی اور جنوبی جزیرہ اور صومالیہ کے لوگ بھی ہیں یہ لوگ زیادہ تر
جہازوں اور بندرگاہوں میں کام کرتے ہیں۔ انگریز نسل کے لوگوں کے حلقہ بگوش اسلام
ہونے کا سبب ان مسلمانوں کی موجودگی بھی ہے، جن سے وہ گھل مل کر کاروبار میں
شریک ہوتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جو مسلمان طلبہ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں
تعلیم پاتے ہیں ان میں اکثر اچھے مسلمان ہوتے ہیں، ان کے اثرات ان کے انگریز دوستوں
اور ساتھیوں پر بھی پڑتے ہیں،

برطانوی مسلمانوں کے مسائل و معاملات کے لیے حکومت کی جانب سے کوئی ذمہ دار اور
جوابدہ شعبہ نہیں ہے، جس طرح کہ اسلامی حکومتوں میں عیسائیوں وغیرہ کے لیے ہوتا ہے،
برطانوی مسلمانوں کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کے مسائل و
معاملات کی جانب دھیان دے اور ان کی نماز وغیرہ کی تنظیم کرے، اس قسم کی جماعتیں ان
علاقوں میں تو بن گئی ہیں، جہاں مسلمانوں کی خاصی تعداد ہے، یہ لوگ اپنے دین کی خاطر
انگریزی تہذیب و تمدن میں ضم ہونا نہیں چاہتے، اسی خیال سے جماعت کی تشکیل کرنے کی کوشش
میں لگے رہتے ہیں، اسلام کا نام بڑا جاذب ہے، اس لیے اسی کے نام پر جماعت کا نام رکھتے ہیں
اور ایسے مرکز کی تلاش میں رہتے ہیں جہاں وہ نماز کے لیے اکٹھا ہو سکیں تاکہ بعد میں مسجد
میں بھی تبدیل ہو جائے، جیسا کہ کیرک وغیرہ میں ہوا ہے کہ وہاں لوگوں نے ایک مسجد
اور ایک مدرسہ کی تعمیر کر لی ہے، ان لوگوں کو اسلامی ممالک خصوصاً متحدہ عرب جمہوریہ
سے جیسی مدد اور رعایت اور جامعہ ازہر مصر سے امداد ملتی رہتی ہے [illegible]
اسلامی مطبوعات و رسائل موجود ہوتے ہیں اور بعض مقامات میں کتب خانہ [illegible]
[illegible] مسجد و محل [illegible] جس کو [illegible] اسلامیات کی [illegible]

اس طرح کی جماعتیں اکثر بڑے شہروں مثلاً لیورپول، مانچسٹر، برمنگھم، آکسفورڈ، کیمبرج اور اڈنبرا وغیرہ میں پائی جاتی ہیں،

اسلامی مرکز انگلستان کا سب سے بڑا اسلامی مرکز "اسلامی ثقافتی مرکز" کہلاتا ہے، اس مجلس میں انگلستان میں رہنے والے تمام اسلامی حکومتوں کے سفرا، شریک ہیں، اور انگلستانی مسلمان اپنے جملہ امور و مسائل میں اسی کی جانب رجوع کرتے ہیں، اس کا منتظم اور منیجر ہمیشہ جامع ازہر کا کوئی ماہر اور فاضل ہوتا ہے، اس کی حیثیت یہاں شیخ الاسلام جیسی ہوتی ہے، مرکز مسلمانوں کے حالات سے باخبر رہتا ہے، اور ان کے فتاوے اور استفسارات کے جواب دیتا ہے، اسلامی طریقہ کے مطابق شادی بیاہ کراتا ہے، اور اسلام سے متعلق تقریروں کا بھی انتظام کرتا ہے، مقررین انگلستان کے سربرآوردہ مسلمان یا وہاں باہر سے آئے ہوئے مشہور لوگ ہوتے ہیں، بعض اوقات غیر مسلم مستشرقین بھی مدعو کیے جاتے ہیں،

مرکز میں ایک بڑا اسلامی کتب خانہ بھی ہے، جس میں زیادہ تر عربی کتابیں ہیں، انگریزی کتابیں بھی ہیں، گو اس میں اضافہ کی بڑی ضرورت ہے، انگلستان کے مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ ایک نہایت اہم مقام سمجھا جاتا ہے، اور یہیں تمام مسلم جماعتوں کے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، انگلستانی عدالتیں بھی اسلامی مسائل و موضوعات کے متعلق اسی مرکز کی جانب رجوع کرتی ہیں اور اس کی رائے کو آخری اور قطعی سمجھتی ہیں،

مرکز کے ایک حصہ میں نماز ادا کرنے کی بھی ایک جگہ ہے، جس میں ہر ہفتہ جمعہ پڑھا جاتا ہے، ابھی تک کوئی مسجد نہیں تعمیر کیجا سکی ہے، کیونکہ اس کے لیے برطانوی حکومت نے سیاسی طور پر اجازت اور منظوری نہیں دی ہے، لندن میں ۱۶ مقامات میں جمعہ کی نماز پڑھی جاتی ہے، لیکن وہاں مسجدوں جیسی عمارت نہیں ہے، لندن سے ۰۵ میل کے فاصلہ پر

وو کنگ میں مسجد کی طرح کی ایک عمارت ہے جس میں ایک چھوٹا سا مینار بھی ہے، لوگ عربی زبان میں نماز ادا کرتے ہیں، خطبہ جمعہ عربی اور انگریزی دونوں زبانوں میں دیا جاتا ہے، تاکہ عام مسلمانوں کو اسلامی احکام و تعلیمات سے آگاہ کیا جاسکے، زیادہ تر لوگ عربی زبان نہیں جانتے، صرف السلام علیکم کہہ لیتے ہیں اور عربی میں نماز ادا کرتے ہیں،

اسلام اور مسلمانوں کا برطانوی حکومت کو نہ تو کوئی خیال ہے اور نہ ان سے کوئی دلچسپی، وہ اپنے ملک کے مسلمانوں اور ان کے امور و مسائل کے سلسلہ میں کسی قسم کی امداد و اعانت بھی نہیں کرتی، اس کا اندازہ صرف اسی ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے، کہ گزشتہ ۱۹۶۵ء میں لندن کے اسلامی ثقافتی مرکز کے ایک حصہ میں تعمیر مسجد کا مسئلہ طے ہوگیا ہے لیکن برطانوی وزارت تعمیرات نے ابتک اس کی تعمیر کی اجازت نہیں دی۔

برطانوی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسجد کے معاملہ کی اہمیت کو سمجھکر دنیا کے کروڑوں مسلمانوں کے جذبات کا خیال رکھے، اور اپنے ملک کے مسلمانوں کو ان کے دینی شعائر کو کسی رکاوٹ کے بغیر بجالانے کا موقع دے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مساجد کا طرز تعمیر وہاں کے عام طرز تعمیر کے برعکس ہے لیکن در اصل کوئی قوی دلیل نہیں ہے، کیونکہ وہاں کی شاندار اور بلند عمارتیں بھی قدیم اور مالوف طرز تعمیر کے مطابق نہیں ہیں، اس کا مشاہدہ لندن کی زیارت کرنے والا ہر شخص اس کے گلی کوچوں میں کرسکتا ہے، اسلامی ملکوں میں غیر مسلموں کو اس بات کے لیے مجبور نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنی عبادت گاہیں مسجدوں کے طرز پر تعمیر کریں، ہر دین و مذہب کے لوگوں کو اپنے شعائر اپنے طریقہ کے مطابق انجام دینے کا موقع دینا چاہیے، انگریزوں کو بھی مسلمانوں کے معاملہ میں اسی فیاضی اور رواداری کا ثبوت دینا چاہیے۔

(عرب)

کمیونسٹ ملکوں کے مسلمان

فلسطین کے بعد سب سے اہم مسئلہ اشتراکی حکومتوں کے مسلمانوں کا ہے، متحدہ سوویٹ یونین میں تین مسلم حکومتیں ہیں، یہاں کے مسلمانوں کی تعداد ۴ کروڑ ہوگی، یہ تینوں حکومتیں یعنی قوقاز، ترکستان اور قازان اسلامی تاریخ کی اہم حکومتوں میں شمار کی جاتی تھیں، لیکن اس وقت ان کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی ہے،

ان ملکوں کی ایک طویل اور قدیم تاریخ ہے، مسلمان پہلی صدی ہجری ہی میں ان کے اندر داخل ہوئے تھے، اور یہاں ان کے شہر آباد ہوگئے تھے، تاریخ کی کتابوں میں بلاد ما وراء النہر کے نام سے اُن کا ذکر ملتا ہے، اُس زمانہ میں یہاں کے اہم شہر تاشقند، بخارا، سمرقند، نیشاپور، فرغانہ اور آذربائیجان کا ذکر کوفہ، بصرہ، دمشق، بغداد، مکہ اور مدینہ ہی کی طرح کیا جاتا تھا، ان کے علماء، علمائے ماوراء النہر کہلاتے تھے،

ائمہ محدثین امام بخاری، امام مسلم اور ابن ماجہ وغیرہ کا یہیں سے تعلق رہا ہے، گیارہ سو برس تک یہ اسلام کے قلعے سمجھے جاتے رہے ہیں،

کئی صدیوں کے بعد یہ شہنشاہ روس کے محکوم بن گئے، مسلمان روسی امپیریلزم کا جس قدر مقابلہ کرسکتے تھے، کرتے رہے، لیکن وہ شخصی حکومت موجودہ کمیونسٹ حکومتوں سے بہتر تھی کیونکہ اس زمانہ میں یہاں سے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان مکہ معظمہ جا کر حج کرتے تھے، لیکن ۱۹۱۷ء میں جب لینین کی مارکسی اشتراکیت کی حکومت قائم ہوئی تو یہ ممالک اس کا حصہ بن گئے، یہاں کے مسلمانوں کو ان کے جائز اور فطری حقوق سے محروم کردیا گیا، مذہبی عقائد و عبادات وغیرہ کی آزادی سلب کرلی گئی،

اشتراکیت دین و مذہب کی دشمن ہے، اسکے لیڈر کارل مارکس نے مذہب کو فقیروں کا افیون بتایا ہے
ایک اشتراکی اول مرحلہ ہی میں خدا کے وجود کی نفی اور صرف مادیت کو اپنا دین سمجھتا ہے، اسلیے دین
خواہ کوئی ہو کمیونزم کا اس سے تصادم ناگزیر ہے،

سوویٹ یونین کی اشتراکی حکومت کو مسلمانوں سے جنگ کا اندیشہ تھا، اسلیے اس نے ۱۹۱۸ء ہی میں انکو
اپنی متحدہ حکومت میں مدغم کرنے کیلیے ایک ایسا اعلان جاری کیا جس میں مسلمانوں کو مذہبی فرائض و عبادات
کی بجاآوری اور ریاست کے اسلامی مدرسوں میں بچوں کے تعلیم دلانے کی آزادی کا ذکر تھا،

اشتراکیوں نے اسلامی حکومتوں کو اپنے اندر شامل کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی
ہمدردی اور تائید حاصل کرنے کیلیے ۱۹۱۹ء میں ان سے یہ اعلان کرایا کہ روس میں مسلمانوں کو انفرادی آزادی حاصل ہے،
لیکن اس قسم کے اعلانات خواہ وہاں کی مسلم حکومتوں ہی کی جانب سے کیوں نہ ہوں محض فریب ہیں،
ترکستان کی حکومت کی مکمل خودمختاری کا اعلان تو کر دیا گیا لیکن باوجود اسکے وہاں کے شہروں سے قوم پرور
امراء و حکام کو معزول کر دیا گیا اور انکی جگہ ایسے لوگ لائے گئے جو اشتراکی تحریک میں شامل ہو چکے تھے، اعلیٰ
اور متوسط طبقہ کے لوگوں سے انکی ملکیتیں چھین لی گئی تھیں، اور جن لوگوں میں بغاوت یا انقلاب کا دم خم تھا
انکا زور اور اثر اس طرح ختم کر دیا گیا کہ بعض لوگ قتل کر دیے گئے اور بعض کو شدید ترین سزائیں دی گئیں،
ترکستان ہی جیسے حالات قوقاز میں بھی پیش آئے، یہاں کا دارالسلطنت باکو جو تیل کے چشموں کی وجہ سے
نہایت مالدار شہر ہے، اشتراکیوں نے یہاں کی قومی و وطنی حکومت کو بھی تبدیل کر دیا اور وہ سارے مظالم
کئے جو اشتراکی انقلاب کا خاصہ ہیں یعنی قتل و غارت گری، لوٹ مار، دہشت انگیزی، اعلیٰ و متوسط
طبقوں کے مال پر قبضہ اور املاک کی ضبطی وغیرہ،

ان مغلوب و محکوم حکومتوں نے اشتراکیت کے ظلم و جبر کے سامنے سپر نہیں ڈالا، ترکستان کے دارالحکومت بخارا
میں مشہور لیڈر انور پاشا کی قیادت میں ۱۹۲۱ء و ۱۹۲۲ء میں دوبارہ بغاوت اور شورش برپا ہوئی جو وہاں کے تمام صوبوں
میں سے جلد ہی پھیل گئی، مسلمانوں کی اس زبردست کامیابی سے اشتراکیوں کو شدید دھکا لگا، آخر کار انھوں نے

اس کو فرو کرنے کے لیے ۸۰ ہزار کی فوج بھیجی، اسکے نتیجہ میں انور پاشا کی شہادت ہوئی اور بغاوت کو پوری فوجی طاقت سے دبا دیا گیا، جب اشتراکی حکومت کا راستہ بالکل ہموار ہوگیا اور اسکو اپنی قوت پر پورا اطمینان بھی ہوگیا تو اس نے ۱۹۳۲ء میں یہ اعلان کیا کہ "سوویٹ یونین کے تین کروڑ مسلمان ابتک کسی مزاحمت کے بغیر آزادی رہتے ہیں مگر قرون وسطیٰ کے لغو و باطل مذہبی عقیدوں کو مانتے ہیں اور بغاوت کرکے ملک کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں اس لیے" غور و فکر کے بعد ایسی حکمت عملی مرتب کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے ذریعہ انکے بہترین افراد کے اذہان سے باطل عقیدوں کو ختم کر دیا جائے

اس کے بعد مدرسوں میں اسلامی تعلیم ممنوع قرار دیدی گئی، مسجدوں میں قفل لگا کر انکو شراب خانوں، رقص و سرود اور فسق و فجور کے مرکزوں میں تبدیل کر دیا گیا، مسلمانوں کی دلآزاری کیلیے سمرقند کی مشہور جامع مسجد کے پاس ملحدین کی انجمن قائم کی گئی، صرف ترکستان میں ۱۴ ہزار مسجدوں کو بند کر دیا گیا، دین کے خلاف جذبات ابھارنے کیلیے مختلف قسم کے کلچرل پروگرام بنائے گئے۔

جن مسلمانوں کیلئے بھاگ جانا ممکن ہوا وہ ہجرت کرکے ہندوستان، افغانستان، ترکی، ایران اور مکہ معظمہ چلے گئے، ایک مہاجر ترکستانی عالم محمد معصومی نے جو حرم شریف میں درس دیتے تھے مجھے بتایا کہ کمیونسٹ مسلم نوجوانوں سے کہتے تھے کہ اپنے علماء کی باتیں نہ مانو وہ جس جنت کا وعدہ کرتے ہیں وہ مؤجل ہے، ہم تم کو فوراً جنت دیں گے، باغوں اور پارکوں کو رقص و سرود اور فسق و فجور کا مرکز بنا کر نوجوان مردوں اور عورتوں کو کھلی آزادی دیدی گئی تھی کہ جو چاہیں کریں۔

۱۹۳۲ء میں کمیونسٹ پارٹی نے اعلان کیا کہ "۱۹۳۷ء تک کوئی عبادتگاہ باقی نہ رہ سکے گی، خدا پرستی کا وہ تصور جو قرون وسطیٰ کے تاریک دور کی یادگار ہے ختم کر دیا جائے گا"

دوسری جنگ عظیم میں جب ہٹلر نے فوجکشی کی تو مجبوراً مسلمانوں کی تالیف قلب کے لیے انکو کچھ آزادی دیدی گئی لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد جب اطمینان حاصل ہوا تو متعدد نئے شہروں کو سوویٹ یونین میں شامل کرکے مسلمانوں کی رہی سہی آزادی بھی ختم کر دی گئی، روسی کمیونزم نے اپنی ۷۰ سالہ عمر میں وسط ایشیا میں اسلام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے، اسکے باوجود وہاں نوجوان مسلمانوں کی نشوونما ہوئی انھوں نے اپنے

آباؤ اجداد کی مرضی کے برخلاف خدائے واحد پر ایمان لانے کے بجائے مادیت اور الحاد کو اپنا وطیرہ بنالیا ہے اور جن مسجدوں سے تقریبا ۱۳ صدیوں سے اذان کی آواز بلند ہوتی تھی انکو بند کردیا گیا ہے، اس سے زیادہ ہولناک مصیبت کی مثال چند صدی پہلے صرف اندلس میں ملتی ہے لیکن بیسویں صدی میں کیمونسٹ حکومتیں مسلمانوں کے ساتھ جو برتاؤ کررہی ہیں وہ کم دردناک نہیں ہیں، اسکے باوجود کیمونزم اپنے کو مظلوموں کا حامی اور استعماریت کا دشمن بتارہا ہے، اور مسلمانوں پر ان مظالم کو روا رکھنے کے باوجود اسلامی سلطنتوں سے دوستی اور تعلق کا دعویٰ بھی کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس منکر خدا اور مادہ پرست جماعت کے فریب میں آکر بعض مسلمان ممالک بھی اس سے اخلاص اور دوستی کا دم بھرتے ہیں، اور انکو اپنے ملکوں میں رسوخ قائم کرنے کا موقع بھی دے رہے ہیں، حالانکہ یہ لوگ انکے سراسر دشمن ہیں، یہی کیمونسٹ تھے جنہوں نے عرب ممالک کے خلاف زنجبار میں انقلاب کی اسکیم تیار کی اور انڈونیشیا کی بغاوت میں بھی انکا ہاتھ تھا، ماسکو اور چین کی اشتراکیت میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ کیوبا اور یوگوسلاویہ کی اشتراکیت میں کوئی فرق ہے، کفر کا مذہب ایک ہی ہوتا ہے، اگرچہ اس کی صورتیں مختلف ہوں، زہر کو شہد میں ملا دیا جائے یا شیشہ و بلور میں رکھا جائے تو وہ بہر حال زہر ہی رہے گا۔

اشتراکیوں نے پروپگنڈہ کیلئے کچھ مسجدیں باقی رکھی ہیں، جب مسلم حکومتوں کے نمائندے ماسکو کا دورہ کرتے ہیں تو انھیں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کو عقیدہ وعمل کی آزادی ہے، اور انکی عبادت گاہیں محفوظ ہیں یہ صرف ایک جھوٹا اور سیاسی پروپگنڈہ ہے۔

بایں ہمہ اشتراکیت کے ظلم وتشدد پر پردہ پڑا ہوا ہے، یہ مسلمان اہل قلم اور دانشوروں کا فرض ہے کہ وہ اپنا مہر سکوت توڑ کر روس اور دوسرے کیمونسٹ ملکوں میں مسلمانوں پر کیے جانے والے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھائیں، اس وقت اشتراکیت ہر مسلم ملک میں اپنی نمائشی دوستی کا اظہار کرکے وہاں اثر قائم کررہی ہے، ان کے ظلم اور خطرناک عزائم سے مسلمانوں کو باخبر ہوکر متحدہ محاذ بنانے کی ضرورت ہے۔

(ایک کم)

ادبیات

جمال و کمال

از

جناب اثیم خیرآبادی

اے اگر ترا نہ ہوگا اور تھا، نہ کوئی جواب ہے ”کُن“ بھی ترا کرشمۂ قدرتِ بے حساب ہے

اسمِ جمیل آپ کا فاتحۃ الکتاب ہے میری کتابِ شوق کا ہر ورق انتخاب ہے

میں کہ ترا سوال ہوں تو کہ مرا جواب ہے رازِ صدائے بازگشت منتظرِ خطاب ہے

حسنِ بیانِ زندگی ذکرِ دلِ خراب ہے ساری کتاب میں یہی ایک مزے کا باب ہے

روح کو اک سکون ہے، دل کو اک اضطراب ہے آج مرے خیال میں صبحِ ازل کا خواب ہے

اپنی خودی سے منفعل بحر میں ہر حباب ہے دامن تر لیے ہوئے شرم سے آب آب ہے

دل میں شکستگی سی ہے ہاں، یہی فتحِ باب ہے میری دعا کا حرف حرف شکر ہے، مستجاب ہے

حسن کی جلوہ گاہ میں، حسن ہے ہر نگاہ میں آئینے میں ہے آفتاب، آئینہ آفتاب ہے

ہے جو یہ منظرِ جمیل، عکس ہے حسنِ ذوق کا شوق اگر دل میں تھا خیال آنکھ میں آکے خواب ہے

شوق نے دی صدائے شوق، گونج اٹھی فضائے شوق پھر کے وہیں صدائے شوق آئی، یہی جواب ہے

پہلے نہ جانتا تھا کہیں، شوق کچھ آج تھا نہیں روزِ ازل سے بس یونہی روح میں اضطراب ہے

جملہ خلاصۂ کتاب یوں تو ہے ایک "حرفِ دل"
ورنہ جو حرفِ شوق ہے اپنی جگہ کتاب ہے

میکدۂ خضر کا مقام، عرش کا ہر طرف نظام
چشمۂ آفتاب جام نورِ بقا شراب ہے

کرتے ہیں رند "آب آب" پیرِ مغاں! بلا شراب
داروئے تشنگی یہی شعلۂ آب آب ہے

اٹھی جو یک بیک نظر، ساقیِ مست کی اُدھر
خوشہ جہاں تھا شاخ پر اپنی جگہ شراب ہے

آفتِ جاں، بلائے ہوش، اُف وہ نگاہِ مے فروش
جان میں جس سے سو خروش، روح میں اضطراب ہے

مطربِ مے ہیں سب ہوس، دل میں رسا ہے جرس
اپنی جگہ نفس نفس زمزمۂ رباب ہے

کاسہ نگوں کیے ہوئے، کیفِ خودی لیے ہوئے
جامِ فنا پیے ہوئے، بحر میں ہر حباب ہے

خضر کے جب نہیں صفات، تجھ سے بنے گی خاک بات
ہے یہیں چشمۂ حیات اور یہیں سراب ہے

موج نے توڑ کر طلسم، اپنی زباں میں کہا
دامنِ بحرِ زندگی بحرِ فنا حباب ہے

عزمِ سفر کا منتہی بامِ بلندِ کبریا
تن میں قرارِ جان کا اصل میں پا تراب ہے

حسن کے زیرِ سایہ ہوں کیوں نہ تمام جلوہ ہوں؟
میں، کہ حقیر ذرہ ہوں اور وہ آفتاب ہے

کیوں نہ ہو شخصیت عظیم؟ سر پہ ہے سایۂ کریم
اپنی نگاہ میں اثیم آپ ہی انتخاب ہے

(سلسلۂ تاریخ ہند کی نئی کتاب)

عہدِ مغلیہ مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

اس میں ہر بادشاہ کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارناموں کو عہدِ مغلیہ اور دورِ جدید کے مسلمان و ہندو مورخین کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے

از سید صباح الدین عبد الرحمٰن ایم اے

مطبوعات جدیدہ

تاریخ ہند و پاکستان حصہ اول۔ مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۷۵۶ مع گردپوش قیمت لعہ۹ر

پتہ دائرہ معین المعارف ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی نمبر ۵

اس وقت ہند و پاک کی تاریخ کے متعدد پہلوؤں پر جو مختلف نوعیت کے کام ہو رہے ہیں ان کی جانب حضرت سید صاحبؒ نے اہل علم کو متوجہ کرتے ہوئے دسمبر ۱۹۳۴ء کے معارف میں اس کا مفصل خاکہ پیش فرمایا تھا۔ اس پروگرام کے مطابق دار المصنفین نے ان کی نگرانی اور سرپرستی میں اس کام کو شروع کیا تھا جو اب بھی جاری ہے، اور اس سلسلہ کی اکیس ۲۱ جلدیں یہاں سے شائع ہو چکی ہیں،

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی تاریخ پر ڈاکٹر سید معین الحق کی نظر وسیع اور گہری ہے اور وہ اس کے بعض پہلوؤں پر اردو اور انگریزی میں کئی مفید کتابیں لکھ کر کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، ان کی یہ نئی کتاب ہندوستان کی عام تاریخ ہے جو تین جلدوں میں مکمل ہوگی۔ اس پہلی جلد کے شروع کے ۱۶ ابواب ہندوستان کی ابتدائی اور قدیم تاریخ اور آخر کے ۱۲ ابواب فتح سندھ سے لے کر لودی خاندان، علاقائی ریاستوں، بہمنی سلطنت اور وجے نگر کے حکمرانوں تک کے حالات پر مشتمل ہیں، اس ضمن میں سلاطین کے کردار، شخصیتوں، ان کے ملکی، سیاسی، تمدنی اور عمرانی کارناموں اور خدمات اور دوسرے معلومات

بھی آگئے ہیں، عہد قدیم کے فن تعمیر اور سنگ تراشی پر بھی ایک مفید باب ہے، پھر مسلم سلاطین کے نظام حکومت، اقتصادی و معاشرتی اصلاحات اور مذہبی معاملات میں ان کی رواداری، علمی و ادبی سرپرستی، ہر دور کے مشہور مصنفین و مورخین کا مختصر تذکرہ اور فن تعمیر کے متعلق مفید معلومات ہیں، مختلف نقشے، عمارتوں کی تصویریں، اور آخر میں ہندوستانی تاریخ کے اہم اور مشہور واقعات کے سنین کی ایک فہرست بھی درج ہے، لائق مصنف نے مستند معلومات فراہم کرنے میں محنت اور سلیقہ سے کام لیا ہے اور قدیم ماخذوں کے علاوہ جدید تحقیقات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، غلط واقعات و روایات کی تردید بھی کی ہے، گو یہ کتاب یونیورسٹیوں کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے، اس لیے تفصیلات سے پرہیز کر کے اختصار کو مد نظر رکھا گیا ہے، تاہم عام قارئین کے لیے بھی اس کا مطالعہ مفید ہے، اس کے لب و لہجہ میں ہندوستانیوں کو بھی کوئی ناخوشگواری محسوس نہ ہوگی، انداز بیان میں اعتدال و توازن کو برقرار رکھا گیا ہے اس لیے جانبدارانہ اور جذباتی رنگ نہیں آنے پایا ہے، پاکستان کے مورخوں کو ہندوستان کے گذشتہ مسلمان حکمرانوں کی تاریخ لکھنے میں بڑی ذمہ داری سے کام لینا چاہیے کیونکہ فارسی میں جو تاریخیں گذشتہ عہد میں لکھی گئیں، ان کے انداز بیان سے اس عہد کی تاریخ کو بڑا مہلک نقصان پہنچ چکا ہے، اور موجودہ دور کی ہر قسم کی تحقیقات کے باوجود اس نقصان کی تلافی اب تک نہیں ہو سکی ہے، مسلمان اور خصوصاً پاکستان کے مورخوں کو اس تلخ تجربہ کو سامنے رکھنا ہے۔

الاجابۃ الی اشعر الصحابۃ — مرتبہ مولانا مظفر حسین صاحب شائق کاکوری، تقطیع [illegible]، عمدہ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات [illegible]، قیمت [illegible]

پتہ: جامعہ عربیہ دار السلام عمر آباد شمالی ارکاٹ مدراس

جنوبی ہند کے مشہور دینی مدرسہ جامعہ دار السلام عمر آباد کے عربی مدارس [illegible]

کی غرض سے درسی کتب میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو طلبہ کی علمی استعداد اور ذہنی و اخلاقی تربیت دونوں حیثیتوں سے مفید ہوں، یہ کتاب اس مفید سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، ابھی اس کا پہلا حصہ شائع ہوا ہے جو ۱۲ شعرائے صحابہ کے قصائد کا مختصر انتخاب اور ازردیف الف تا دال پر مشتمل ہے، مرتب نے حاشیہ میں مشکل اشعار کے مفہوم، دقیق الفاظ اور نحوی ترکیبوں کی تشریح بھی کر دی ہے، دار العلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے اس قسم کی جو کتابیں شائع کی ہیں وہ نثری انتخابات پر مشتمل ہیں، یہ پاکیزہ شعری انتخاب عربی مدرسوں کے نصاب میں شامل کیے جانے کے لائق ہے۔

مخطوطہ شعر الاخرس۔ مرتبہ ڈاکٹر یوسف عز الدین، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۹۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ مطبوعات دار البصری بغداد

عبد الغفار بن عبد الواحد اخرس انیسویں صدی کا مشہور اور صاحب دیوان عراقی شاعر ہے، ۱۳۰۴ھ میں اس کا ایک نامکمل دیوان استنبول سے شائع ہوا تھا۔ اب اس شاعر کے ہم وطن بغداد کے مشہور فاضل ڈاکٹر یوسف عز الدین ہیں، انھوں نے زیر نظر کتاب میں اس کے طویل و مختصر قصائد کو شائع کیا ہے جو اس کے مطبوعہ دیوان میں نہیں تھے، فاضل مرتب نے ان قصائد کو دوسرے مخطوطات کی مدد سے محنت سے اڈٹ کیا ہے۔ شروع میں چند مخطوطہ قصائد کا عکس بھی دیدیا ہے، عربی زبان و ادب کے شائقین کے لئے یہ دلچسپ چیز ہے۔

جگر معاصرین و ناقدین کی نظر میں }
بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو } از جناب ڈاکٹر محمد اسلام صاحب،
مختصر تاریخ غزل اردو }

تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات بالترتیب ۹۲، ۱۰۸، ۱۹۰، قیمت بالترتیب عہ، ۸ روپیہ

ملنے کا پتہ ڈاکٹر محمد اسلام، مطب منزل، جوہری محلہ، لکھنؤ

ڈاکٹر محمد اسلام نے اپنے مقالہ "جگر مرادآبادی، حیات اور شاعری" پر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ معارف میں ان کی کئی کتابوں کا تعارف کرایا جا چکا ہے اب وہ تین چھوٹے چھوٹے رسالوں کے اور مصنف ہوگئے ہیں۔ "جگر معاصرین و مخلصین کی نظر میں" جگر کے متعلق ان کے عزیزوں، شاگردوں اور معاصرین کے دلچسپ تاثرات ہیں، اس میں جگر کے علاوہ خود ان کے احباب کی شخصیت و شاعری کے متعلق بھی معلومات ہیں، اکثر تاثرات عقیدت مندانہ ہیں لیکن بعض میں جگر کی شخصیت و شاعری کے کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی گئی ہے، دوسرے رسالہ "بیسویں صدی کے چند اکابر غزل گو" میں اصغر، فانی، جگر، اثر اور فراق کے مختصر حالات اور ان کی شاعری پر مختصر تبصرہ کے ساتھ ان کے کلام کے نمونے مختلف عنوانات کے تحت دیئے گئے ہیں۔ "مختصر تاریخ غزل اردو" میں شروع سے اب تک کی غزلیہ شاعری کی مختصر تاریخ ۹ ادوار میں بیان کی گئی ہے، امید ہے کہ یہ رسالے طلبہ کے لئے مفید ہونگے، ڈاکٹر محمد اسلام میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے اس لئے امید ہے کہ آئندہ وہ چھوٹے رسالے لکھنے کے بجائے اہم موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھ کر اپنی محنت و خوش مذاقی کا ثبوت دیں گے۔

انتخاب اردو - مرتبین کا نام تحریر نہیں، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، ٹائپ، صفحات ۸۰، قیمت عہ/ ۳ روپیے، پتہ: ادبی پبلشرز، شیخ نور سعد بمبئی ۳

اردو کے مضامین نظم و نثر کا انتخاب برابر شائع ہوتا رہتا ہے، زیر نظر انتخاب مہاراشٹرا اسٹیٹ بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن نے ایس ایس سی امتحانات ۱۹۷۵ء کے لئے شائع کیا ہے، پہلا حصہ تفصیلی مطالعہ کے لئے ہے اس میں مضامین میں مضامین اور نظموں کے انتخاب میں رنگا رنگی کے ساتھ حسن ذوق کا پورا ثبوت ہے، امید ہے کہ یہ انتخاب نہ صرف مہاراشٹرا بلکہ اس سے باہر کے تعلیمی مدارس میں بھی مقبول ہوگا۔

ض۔ ص

جلد ۹۹ ماہ محرم الحرام ۱۳۸۶ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۶۶ء عدد ۵

مضامین

مقالات

باب التقریظ والانتقاد

ادبیات

شذرات

اردو ادب مخالف حالات میں بھی جس طرح ترقی کر رہا ہے وہ اردو زبان کی مقبولیت کی دلیل ہے لیکن مگر اس کی تعلیم کا دروازہ بند رہا تو ایک دو نسلوں کے بعد اس کا خاتمہ یقینی ہے، یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ بہت سے اونچے مسلمان گھرانوں کے لڑکے اردو لکھنے پڑھنے پر قدرت نہیں رکھتے، اس میں حکومت سے زیادہ ان کے والدین کا قصور ہے، اردو کے معاملہ میں زبانی دعووں کے باوجود تمام پارٹیوں کا نقطۂ نظر ایک ہے، جب کانگریس کی حکومت اپنے اعلیٰ اصولوں، اقلیتوں کے دستوری تحفظات اور سیکولرزم کے دعویٰ کے باوجود بیس ۲۰ سال کی طویل مدت میں اردو کے لیے کچھ نہ کر سکی تو متضاد عناصر کی معجون مرکب حکومتوں سے جن کو خود کوئی ثبات و قرار نہیں، کیا امید کی جا سکتی ہے، جس کا تجربہ بھی شروع ہو گیا ہے، یہ ذکر ضمناً آگیا، اصل مقصود یہ دکھانا ہے کہ اردو کا دامن کمیت کے لحاظ سے تو بلاشبہ وسیع ہو رہا ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے سمٹ رہا ہے، اردو کے بیشتر ادیبوں اور اصحاب قلم کی پرواز شعر و ادب، ادبی تنقید، ترقی پسند ادب اور افسانوں سے آگے نہیں بڑھتی اور مشق بھی ان ہی سے طبع آزمائی کی ابتدا کرتے ہیں، اس لیے ان کی تو اتنی بہتات ہو گئی ہے کہ ان سے دل گھبرانے لگا ہے لیکن ادبیات سے ہٹ کر علمی و تحقیقی کاموں کی بڑی کمی ہے، یہ غنیمت ہے کہ یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبوں میں ان کے اساتذہ کے ذوق کے مطابق تحقیقی کام بھی ہو رہے ہیں جن کی بدولت اردو زبان و ادب سے متعلق بعض اہم اور مفید کتابیں اور تحقیقی مقالات نظر آجاتے ہیں [illegible] لیکن باہر علم و فن کی دوسری اصناف اور علمی مسائل و مباحث پر تحقیقات و تصانیف کی رفتار بہت سست ہو گئی ہے، بلکہ اس کا پایۂ ذخیرہ بھی نایاب ہوتا جا رہا ہے،

اس کے مقابلہ میں پاکستان میں اردو کا دامن علمی حیثیت سے وسیع ہو رہا ہے [illegible]

لیے وہ مگر چند علمی و ادبی ادارے ہیں، وہ جس طرح چل رہے ہیں اُن کے کارکن ہی جانتے ہیں، اس کے مقابلے میں پاکستان میں پرانے ادارے بھی موجود ہیں اور نئے نئے برابر قائم ہوتے جاتے ہیں، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، اقبال اکیڈمی لاہور، ادارۂ تحقیقات پاکستان، لاہور یونیورسٹی، اور اورینٹل کالج لاہور اگرچہ تعلیمی ادارہ ہے لیکن اس کی خدمات کسی علمی ادارے سے کم نہیں ہیں، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی، انجمن ترقی اردو کراچی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اکیڈمی کراچی، ادارۂ تحقیقات اسلامی راولپنڈی، شاہ ولی اللہ اکیڈمی حیدرآباد، جماعت اسلامی، یہ چند اہم نام ہیں، ان کے علاوہ اور بھی اشاعتی ادارے ہیں، یہ سب نہایت مفید علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے بہت سے ناشرانِ کتب ہیں جن کی خدمات علمی اداروں سے کم نہیں ہیں، اور ان کی حیثیت چھوٹے پیمانہ پر پرانے نولکشور بک ڈپو کی ہے، جو نہ صرف مختلف علوم کی اور اہم مسائل و مباحث پر نئی نئی کتابیں شائع کرتے ہیں بلکہ انھوں نے اردو کی کلاسیکل اور عربی و فارسی کی اہم مذہبی، علمی اور تاریخی کتابوں کے اردو تراجم کی اشاعت کا سلسلہ بھی شروع کیا ہے، جو بڑا مفید کام ہے، اس طرح پاکستان میں اردو زبان میں مختلف علوم اور موضوعوں پر نئی علمی تحقیق اور پرانی کلاسیکل کتابوں کا بڑا ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے۔

ہندوستان میں اردو کے صرف چند معیاری اخبار اور رسالے نکلتے ہیں، پاکستان کی مذکورہ بالا علمی اکیڈمیوں کے بلند پایہ اور معیاری رسالے بھی ہیں، اردو کے اخبارات کا معیار ہندوستان کے اخبارات سے بہت بلند ہے، ان کی بڑی اشاعت ہے، اور ان کے ایڈیٹروں اور نامہ نگاروں کو جو معاوضہ ملتا ہے اس کا ہندوستان میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں اردو کی کتابوں اور اس کے اخبارات و رسائل پڑھنے کا عام ذوق ہے، اور ہندوستان کے ادیب اور اردو کے خدمت گزار تک اس کو اپنے لئے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ پاکستان میں اردو کو دفتروں میں حکومت کی اور سرکاری حیثیت کو بھی دخل ہے اور حکومت

کی سرکاری زبان ہے، پاکستان مسلمانوں کی کثریت کا ملک ہے، اس لیے اردو کو ترقی کے جو مواقع وہاں حاصل ہیں وہ ہندوستان میں نہیں ہیں، اور اردو کتابوں کی جتنی مانگ وہاں ہے یہاں نہیں ہو سکتی، مگر یہ بھی واضح ہے کہ اس ترقی میں زیادہ، بلکہ قریب قریب کل حصہ مغربی پاکستان کے مسلمانوں کا ہے جن کی تعداد ہندوستان کے مسلمانوں سے بہت کم ہے، اور ان کی مادری زبان بھی اردو نہیں، ہندوستان میں آج بھی چھ کروڑ مسلمان ہیں، ان میں سے بڑی تعداد کی مادری زبان اردو ہے، اگر تنہا وہی اردو کی خدمت اور علمی حیثیت سے اس کو ترقی دینے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو بھی کافی ہیں، ادبی خدمت میں تو ہندو ادیبوں کا قدم بھی مسلمانوں سے پیچھے نہیں ہے، البتہ اس کا اعتراف ہے کہ شعر و ادب کے میدان میں ہندوستان کے شعرا و ادیبوں کی خدمات زیادہ ہیں، انھوں نے شعر و ادب کا ایسا بلند معیار قائم کر دیا جس سے پاکستان کو بھی فائدہ پہنچا، اس میں شبہ نہیں کہ زبان میں ادب کا بھی ایک مقام ہے، لیکن زبانیں محض ادب کے سہارے نہیں بلکہ علم و فن سے ترقی کرتی ہیں۔

زہد و رقاق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقاق اہم اور قدیم ترین کتابوں میں ہے، جو اب تک غیر مطبوعہ تھی، اور اس کے قلمی نسخے بھی کمیاب تھے، مولانا حبیب الرحمن اعظمی صاحب نے ان کے فوٹو حاصل کر کے ان کی مدد سے اس کتاب کو تصحیح و تحشیہ اور تعلیق کے جملہ لوازم کے ساتھ مرتب کیا، اور مجلس احیاء المعارف مالیگاؤں ناسک نے اس کو اہتمام کے ساتھ خوبصورت ٹائپ میں چھپوا کر شائع کیا ہے، فاضل مرتب نے حواشی میں اختلاف نسخ کے ساتھ متن کے اغلاط کی تصحیح، اس کے مشکل الفاظ کی تشریح اور احادیث کی تخریج بھی کی ہے، کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں کتاب اور مصنف کے حالات کے ساتھ اور بہت سے مفید اور اہم معلومات بھی آگئے ہیں، مرتب کی محنت اور تلاش و تحقیق کا اندازہ کتاب کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے، اس کی کتابت و ترتیب و اشاعت سے ایک مفید اور اہم دینی خدمت انجام پائی ہے جس کے لیے فاضل مرتب اور ناشر دونوں اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں۔

مقالات

مشکل الآثار

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

امام طحاوی کی ایک اہم ترین تالیف مشکل الآثار ہے، اس کی سات جلدیں استنبول کے کتب خانہ فیض اللہ میں موجود ہیں[1]، دائرۃ المعارف النظامیہ نے اس کو نا تمام صورت میں ۴ جلدوں میں شائع کیا ہے، یہی حصہ ہمارے پیش نظر ہے، اس کے مطالعہ کے دوران میں اسکے جو اہم خصوصیات سامنے آئے اُن کو اس مضمون میں پیش کیا جاتا ہے۔

مقصد تالیف — امام طحاوی نے خود اسکا موضوع و مقصد تالیف یہ بتایا ہے کہ "ثقہ و ثابت رواۃ سے مروی مستند و مقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت دیکھکر میں نے ان پر غور و تامل کیا، اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل و احکام مستنبط ہوئے ان کو بیان کرکے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات اور اشکالات کو دفع کرنے کی کوشش کی ہے"[2]

طریقۂ تصنیف — مشکل الآثار کی ترتیب و تصنیف اور نقل روایت و حدیث کا عام انداز یہ ہے کہ پہلے ایک حدیث ذکر کرکے اس کے متابعات اور مؤید حدیثیں بیان کی گئی ہیں، متابعات میں زیادہ تر

---

[1] الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۴۴ [2] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳

فرق واختلاف کو ظاہر کیا گیا ہے، لیکن اگر کسی روایت میں کوئی خاص اضافہ پایا گیا ہو تو اس کو بھی ذکر کیا گیا ہے، پھر روایت کا صحیح مدلول ومنشا متعین کر کے اس پر عائد ہونے والے شبہات ... دوسری حدیثوں سے ان کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت واستدلال میں قرآنی آیات، احادیث، آثار صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین اور فقہاء کے اقوال وآراء بھی ضرورت کے مطابق بیان کیے گئے ہیں، نحوی ولغوی مسائل پر بحث وگفتگو اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کیے گئے ہیں، روایت کے اسناد ومتون، اس کی صحت وضعف اور رواۃ وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کیے گئے ہیں،

احادیث میں تضاد وتعارض نہیں | امام طحاوی سب سے پہلے اس اصول کو بیان کرتے ہیں کہ درحقیقت کلام رسول میں تعارض اور تناقض سرے سے ہوتا ہی نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:-

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو اس لیے خطاب کیا ہے کہ اس کو دین کے حدود وضوابط اور آداب واحکام سے واقف کرائیں، اس لیے ارباب حق کو یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آپ کے احکام وحدود میں کوئی تضاد نہیں ہو سکتا، اگر آپ کے ایک خطاب اور دوسرے خطاب کے الفاظ مختلف معلوم ہوں تو اس کی وہی نوعیت ہے جو زیر بحث حدیث کے سلسلہ میں ہم نے بیان کی ہے، لیکن اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ بات ہو کہ آپ کے خطاب میں تضاد ہے تو اس کو تلاش وتحقیق سے کام لینا چاہیے، مگر اس سے اس کا خیال رفع نہ ہو تو اس کو اپنے قصور علم وفہم کا اعتراف کرنا چاہیے کیونکہ احادیث میں درحقیقت اختلاف نہیں ہوتا، جب خدا نے رسول کے صدق کی ضمانت اور ذمہ داری لی ہے تو پھر اس کے کلام میں تناقض کو کیسے اور کیا جا سکتا ہے، البتہ

ولو کان من عند غیر اللہ   اگر یہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کا کلام ہوتا

امام طحاوی نے اس سلسلہ میں بحث و استدلال کا جو انداز اختیار کیا ہے اس سے ہمارے زمانہ کے منکرین حدیث و روایت کے بعض اعتراضات کا تشفی بخش جواب بھی ہو جاتا ہے، کیونکہ ان کا سب سے بڑا سہارا احادیث کا ظاہری فرق و اختلاف ہے، اسی بنیاد پر وہ اکثر حدیثوں کو واہی، ضعیف اور ناقابل عمل و رد قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ ان کے قلت تدبر اور کم فہمی کا نتیجہ ہے، مثلاً

عمر بن ابی سلمہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری ماں کے گھر میں کھانا تناول فرما رہے تھے، میں داخل ہوا تو فرمایا کہ "اللہ کا نام لیکر دائیں ہاتھ سے اپنے سامنے اور قریب کا کھانا کھاؤ" اس کے بعد میں ہمیشہ اسی پر عمل کرتا رہا، دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے یہ مروی ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پیالہ کے بیچ میں برکت نازل ہوتی ہے اس لیے بیچ سے کھانے کے بجائے پیالہ کے کناروں سے کھانا چاہیے"

امام طحاویؒ نے ان روایتوں کی اسناد وغیرہ پر محققانہ بحث کرکے لکھا ہے کہ دونوں روایتوں میں فی الواقع کوئی تضاد نہیں ہے، ابن عباسؓ کی روایت میں کناروں سے کھانے کا منشا بھی یہی ہے کہ آدمی صرف اپنے سامنے اور قریب کے کنارے سے کھائے، لیکن اگر اس سے پیالے کے سب کناروں سے کھانے کی اجازت اور گنجایش بھی نکل آئے تو حدیث کی مناسب توجیہ یہ ہوگی کہ اس میں تنہا کھانے والے کے متعلق ہدایت بیان کی گئی ہے، دسترخوان پر اور کئی آدمیوں کے ساتھ ایک برتن میں کھانے کے متعلق اس میں کوئی ہدایت نہیں ہے، اس کا ذکر پہلی روایت میں ہے کہ جب آدمی متعدد لوگوں کے ساتھ ایک برتن میں کھائے تو ہر شخص کو اپنے قریب اور سامنے کے کنارے سے کھانا چاہیے، جو ادب اور شائستگی کا بھی تقاضا ہے، حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کا جو مفہوم

۱؎ مشکل الآثار ج ۲ ص ۲۰۰

اس صورت میں بیان کیا گیا ہے، اس کی تائید دوسری حدیثوں سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تنہا کھانا تناول فرماتے تھے تو پیالہ کے مختلف حصوں اور جس جگہ سے چاہتے تھے کھانا تناول فرماتے۔" اس توجیہ سے تضاد خود بخود رفع ہوگیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ہر روایت کا مفہوم الگ الگ اور جدا جدا ہے۔[۱]

منکرین حدیث بعض حدیثوں کی اس لیے بھی تردید کرتے ہیں کہ وہ بظاہر منطوق قرآنی کے خلاف معلوم ہوتی ہیں حالانکہ واقعہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ تم لوگ یہ آیت پڑھتے ہو:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ — اے ایمان والو تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا،

لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ — تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر'

حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

ان الناس اذا راؤا الظالم فلم یاخذوا — اگر لوگ ظالم کو اس کے ظلم سے باز نہ

علی یدیه یوشك ان یعمهم — رکھیں تو اللہ ظالمین کے ساتھ ان کو

الله بعقاب — بھی سزا دے گا۔

اس بارہ میں بعض روایتیں بھی ہیں جن میں کچھ فرق اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ "حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ تم لوگ یہ آیت [یاایھا الذین آمنوا] پڑھتے ہو لیکن اللہ نے اس کو جس محل و مقام میں رکھا ہے تم اس محل و مقام میں اس کو نہیں رکھتے، کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

اذا عمل فیھم بالمعاصی او — جب گناہ اور نافرمانی کے کام کیے جائیں

---

[۱] مشکل الآثار، ج اول از صفحہ ۹۲ تا ۹۵

بغیر الحق ثم لم یغیروہ یوشک — اور (عام لوگ) اس کو نہ بدلیں تو اللہ
ان یعمہم اللہ بعقاب منہ — سب کو عذاب دے گا۔

اس روایت میں جو حقیقت بیان کی گئی ہے وہ زیادہ مناسب اور حضرت ابوبکرؓ کے شایانِ شان معلوم ہوتی ہے، اس لیے دوسرے صحابہ کے مرویات کو سامنے رکھکر آیت کا محل و مقام معلوم کرنے کی ضرورت ہے، ابو امیہ نے ابو ثعلبہؓ خشنی سے اس آیت کے بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "تم لوگ نیکی کا حکم اور برائی سے منع کرتے رہو یہاں تک کہ جب یہ دیکھو کہ شح و ہوائے نفس کی پیروی کیجاتی ہے، دنیا کو ترجیح دیجاتی ہے، ہر شخص اپنی رائے پر فریفتہ اور مگن ہے، اور صورت حال اتنی خراب ہوگئی ہے کہ نیکی کی تلقین اور برائی کی مذمت کرنے کی گنجایش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے تو صرف اپنی فکر کرو اور عام لوگوں کے معاملات سے تعرض نہ کرو، کیونکہ اس کے بعد ایسا وقت آئیگا جس میں صبر کرنا ویسے ہی دشوار ہوگا، جیسے چنگاری اور آگ کے شعلہ کو ہاتھ میں لینا مشکل ہے، ایسے نازک وقت میں عمل کرنے والے کو پانچسو گنا زیادہ اجر ملے گا"، اس حدیث سے حضرت ابوبکرؓ کے قول کا صحیح منشا معلوم ہوگیا کہ جس زمانہ میں اس آیت پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اسی میں اسپر عمل کیا جائیگا اور اس زمانہ کی تشریح ابو ثعلبہؓ کی روایت میں مذکور ہے، ورنہ عام حالات میں اللہ نے اپنے بندوں پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو فرض قرار دیا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسکے علاوہ متعدد حدیثیں موجود ہیں جن میں اس کی تاکید اور اس کے ترک کے سنگین نتائج سے خبردار کیا گیا ہے، البتہ اگر ایسا زمانہ آجائے جس کا ذکر حضرت ابو ثعلبہؓ نے کیا ہے تو آدمی کی ذمہ داری صرف اپنی جماعت تک محدود ہو جاتی ہے، اور دوسروں کو گمراہی سے نہ روکنا اس کے لیے گناہ نہیں ہوتا

علمائے تاویل کی ایک جماعت نے تو مذکورہ بالا آیت کے متعلق یہ بھی کہا ہے کہ اس میں فریضۂ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سقوط کا کوئی ذکر نہیں ہے، یہ لوگ اپنی تائید میں متعدد آیتیں بطور ثبوت پیش کرتے ہیں، ایک آیت ہے

لیس علیک ھدٰھم ولکن — ان لوگوں کو راہ پر لانا تیرے ذمہ نہیں،

اللہ یھدی من یشآء (بقرہ) — اللہ جس کو چاہے راہ پر لائے،

اس آیت سے یہ استدلال کرنا صحیح نہیں ہے کہ تبلیغ و ہدایت فرائض نبوت میں داخل نہیں ہے، بلکہ تبلیغ و ہدایت تو درکنار، دشمنان دین سے جہاد و قتال کرنا بھی نبی کا فرض ہے، تاکہ لوگ امر الٰہی کے سامنے سرفگندہ ہو کر دین حق کو اختیار کرلیں۔[1]

منکرین حدیث بعض اوقات کمزور روایتوں کو صحیح روایتوں کے معارض قرار دے کر انکار حدیث کا سامان فراہم کرتے ہیں، امام طحاوی کی دوربیں نگاہوں نے اس اشکال کو بھی حل کیا ہے، مثلاً ایک حدیث میں ہے "عید کے دونوں مہینے یعنی رمضان اور ذی الحجہ ناتمام اور ناقص نہیں ہوتے" اس پر جو شبہات ہوتے ہیں ان کو رفع کرنے کے لیے پہلے وہ یہ روایت نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا "چاند دیکھ کر روزہ رکھو اور افطار کرو اور اگر چاند نظر نہ آئے تو ۳۰ دن پورے کرلو" اس سے ظاہر ہو گیا کہ رمضان کا مہینہ بھی ۲۹ دن کا ہوتا ہے، البتہ اس کی حیثیت دوسرے مہینوں سے اس لیے مختلف ہے کہ اس میں روزہ رکھا جاتا ہے، غالباً اسی وجہ سے عام ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ ۲۹ کو چاند ہونے سے روزوں میں نقص پیدا ہو جائے گا، اس لیے آپ نے فرمایا کہ چاند چاہے ۲۹ کو ہو یا ۳۰ کو ان دونوں مہینوں کی فضیلت اور خصوصیت میں فرق نہیں آسکتا، اس توجیہ سے ظاہری تضاد دور ہو جائے گا، لیکن اسکے

---

[1] مشکل الآثار ج ۲ ص ۶۲ تا ۶۶

متعلق یہ جو روایت کی گئی ہے کہ "ہر ترم دست دس مہینے کا ہوتا ہے" تو وہ صحیح نہیں ہے، اسلیے کہ اس کے راوی عبدالرحمن بن اسحٰق کا پایہ حفظ وضبط اور ثقاہت کے اعتبار سے گذشتہ روایت کے راوی خالد حذاء سے بہت کمتر ہے، دوسرے یہ روایت مشاہدہ اور بداہت کے بھی سراسر خلاف ہے۔"[1]

حقیقت یہ ہے کہ احادیث و روایات میں جو تضاد و اختلاف نظر آتا ہے وہ عموماً ان کے موقع و محل، وقت و زمانہ، تقیید و اطلاق، تخصیص و تعمیم اور ناسخ و منسوخ وغیرہ کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہوتا ہے جس سے منکرین حدیث غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، امام طحاوی نے ان سب پہلوؤں پر اس کتاب میں بحث کی ہے لیکن طوالت کے خوف سے انکو قلم انداز کیا جاتا ہے۔

صحابہ و تابعین اور ائمہ و فقہا کے اختلافات اس کتاب میں صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کے اقوال و فتاوی بھی نقل کیے گئے ہیں، اور ان کے اختلافات کی نوعیت، ان کے درمیان ترجیح و تطبیق وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اگر اختلافات میں تطبیق کی صورت نظر نہیں آتی ہے تو وہ اولیٰ اور مرجح قول کو ذکر کرتے ہیں، ان مسائل و مباحث سے امام طحاوی کی فقہ و اجتہاد میں عظمت و برتری کا اندازہ ہوتا ہے۔

طحاوی مقلد جامد نہیں امام طحاوی کا شمار ان علمائے احناف میں ہے جن کا حنفی مذہب کی ترویج و اشاعت میں بڑا حصہ ہے، لیکن وہ مقلد جامد نہیں ہیں، اور احادیث کی سند کے بغیر محض مسلک کو تسلیم نہیں کرتے، ان کے نزدیک اصل مرجع رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہی ہے فرماتے ہیں:

"اصل اور قوی مرکز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس ہے، اس لیے آپ کے ارشاد کے

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۲۲۲

مقابلہ میں اللہ کی رائے رد کر دی جاسکتی ہے۔[۱]

ایک جگہ اساطین احناف میں امام زفرؒ کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"امام زفرؒ کا یہ مسلک ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم نے جو کچھ روایت کی ہے وہ ہمارے نزدیک اولیٰ واحسن ہے۔"[۲]

آثار صحابہ کے بارہ میں لکھتے ہیں:۔

"صحابہ کی مخالفت اور ان کے مذہب ومسلک سے انحراف سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں، اس کی نوعیت کتاب الٰہی سے استکبار وانحراف کی ہے، جو شخص کتاب اللہ، سنت رسول، اصحاب اور تابعین کے مسلک سے اعراض وانحراف کریگا اللہ اس کو فہم قرآن سے محروم کر دے گا۔"[۳]

مطلقہ کے نفقہ وسکنی کے متعلق احادیث اور فقہاء کے اختلافات نقل کرکے فرماتے ہیں:۔

"ہم جو باتیں تحریر کر چکے ہیں وہ ان علماء (احناف) کے اقوال کے مقابلہ میں زیادہ صحیح وثابت ہیں۔"[۴]

ایک مسئلہ میں امام مالک کی رائے کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"امام مالکؒ نے اس بارہ میں جو کچھ فرمایا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے قول سے بہتر ہے، اور امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا قول امام دار الہجرت کے قول سے قریب تر ہے۔"[۵]

مشکلات کا حل | کتاب میں اصلاً مشکلات حدیث کا جائزہ لیکر ان کا مفصل اور محققانہ جواب دیا گیا ہے، اس کی مثالیں کثرت سے ہیں، لیکن کتاب کی صحیح نوعیت ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک مثال دی جاتی ہے۔ احادیث صحیحہ میں حضرت ابی بن کعبؓ کو اقرءہم لکتاب اللہ (کتاب اللہ کے سب سے بڑے قاری وعالم) حضرت معاذ بن جبلؓ کو اعلمہم بالحلال والحرام (حلال وحرام سے بہت زیادہ واقفیت رکھنے والے) اور حضرت زید بن ثابتؓ کو افرضہم (علم الفرائض کے بڑے ماہر) کہا گیا ہے، اس لیے یہ سوال

---

[۱] مشکل الآثار ج ۳ ص ۳۷۲ [۲] ایضاً ص ۱۰۰ [۳] ایضاً ج ۲ ص ۳۰۵ [۴] ایضاً ج ۲ ص ۳۱۰ [۵] ایضاً ج ۲

یہاں ایک سوال ہوتا ہے کہ کیا یہ حضرات خلفاء عشرہ مبشرین اور دوسرے جلیل صحابہ بھی ان خصوصیات کے اعتبار سے فضیلت رکھتے تھے اور وہ لوگ ان سے فروتر تھے، امام طحاوی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"اگر کوئی شخص کسی وصف میں اتنا بلند مرتبہ ہو کہ اس وصف میں عام لوگوں کے اعتبار سے وہ زیادہ ممتاز اور نمایاں ہو تو اس کے بارہ میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ اس وصف میں افضل و بہتر (افضل الناس) ہے اگرچہ اس وصف میں اس پایہ بلکہ اس سے بھی ممتاز و بلند مرتبہ اور فائق تر لوگ موجود ہوں۔ چونکہ وہ اس فن میں ایک گونہ خصوصیت اور امتیاز رکھتا ہے اس لیے اس کو افضل کہا جا سکتا ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کے متعلق فرمایا تھا کہ

یقتله اشقی البریة — ان کو بدترین خلائق قتل کرے گا

حالانکہ یہ بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ابن ملجم جس نے جناب امیرؓ کو قتل کیا تھا موحد تھا، تاہم آپ نے اسکے ایک نہایت مذموم و شنیع فعل کی بنا پر اسکو اشقی البریہ کہا، یہ اس لیے کہ اس کے دوسرے جرائم اور معصیتوں کے مقابلہ میں اس کا یہ سب سے زیادہ شنیع اور سنگین جرم تھا، لیکن ظاہر ہے کہ اس کے مقابلہ میں وہ شخص زیادہ بدبخت اور اشقی ہے جو سرے سے توحید کا منکر ہو اور دوسروں کو خدا کا شریک ٹھہراتا ہو۔ اسی طرح آپ نے خوارج کے بارہ میں فرمایا ہے

هم شرار الخلق والخليقة — وہ لوگ بدترین خلائق ہیں

ظاہر ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کا شریک و ساجھی ٹھہرانے والے اور انبیاء و رسل کی تکذیب کرنے والے ہیں وہ خوارج سے بھی بدتر و خبیث ہیں، اس سے ظاہر ہو گیا کہ اگر کوئی شخص کسی وصف میں زیادہ ممتاز اور کسی خصوصیت کے لحاظ سے عام لوگوں میں زیادہ نمایاں ہو

مقابلہ میں اندازِ کس حمت کے حامل تھا ۔ ۔ ۔ ۔ یا اس سے بھی بہتر دوسرے لوگ جو دینی امور کو ایک گونہ فضل کہا جا سکتا ہے ، اسی حیثیت سے آپ نے ان حضرات کو بھی فائق کہا ہے ، کیونکہ وہ لوگ ان فنون میں زیادہ ممتاز اور برتر تھے لیکن اس سے یہ قیاس نہیں کرنا چاہیے کہ دوسرے تمام ہی صحابہ ان چیزوں میں ان سے کمتر تھے ۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر قائل کا منشاء و مقصد عام طور پر لوگوں کو معلوم ہوتا ہے اور وہ مخاطب کی رعایت اور اس کے علم کا اندازہ کر کے بات کہتا ہے ، اسی وجہ سے کہ علمائے راسخین کو بے تکلف اعلم الناس کہہ دیا جاتا ہے ، حالانکہ کسی کو اعلم الناس کہنے والا اور لوگوں سے کوئی واقفیت رکھتا ہے اور نہ اس کو سارے لوگوں کے علم کے متعلق کوئی اندازہ ہوتا ہے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائل کی ایک خاص مراد ہوتی ہے جس کو مخاطب سمجھتے ہیں ، اس طرح گویا یہ بطور مجاز کہا جاتا ہے حقیقت سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہوتا ۔"[1]

ثبوت واستدلال | اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت اس کی قوتِ استدلال ہے ، اس کا اندازہ اس مثال سے ہوگا ، طحاوی فرماتے ہیں :-

"تارکِ صلوٰۃ کے حکم کے متعلق اہل علم میں اختلاف ہے ، بعض لوگوں کے نزدیک ایسا شخص مرتد ہے ، اگر وہ توبہ نہیں کرتا تو قتل کر دیا جائے گا ، یہ امام شافعی کا قول ہے ، لیکن دوسرے علماء کے نزدیک ایسا شخص فاسق اور اہل کبائر میں ہے ، اس کو مرتد نہیں کہا جا سکتا ، امام ابو حنیفہ کا مسلک یہی ہے ، اور ہمارے نزدیک بھی یہ زیادہ اولیٰ ہے ، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بعض ایسے فرائض مقرر کیے ہیں جن کا مخصوص وقتوں میں آدمی مکلف ہوتا ہے پانچوں وقتوں کی نمازیں اسی ضمن میں آتی ہیں ، یہی حال رمضان کے روزوں کا بھی ہے

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۵۰ - ۳۵۴

اب اگر کوئی شخص قصداً رمضان کے چند روزے ترک کر دے مگر وہ اس کی فرضیت کا منکر نہ ہو تو وہ مرتد اور کافر نہیں ہوگا، اسی طرح اگر کوئی شخص انکار و کفر کی وجہ سے نماز ترک نہیں کرتا تو اس کو مرتد اور خارج از اسلام نہیں قرار دے سکتے، اس کی بڑی واضح دلیل یہ ہے کہ ہم ایسے شخص کو نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں لیکن کافر کو نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیتے، اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص محض ترک صلوٰۃ کی بنا پر کافر ہوگیا ہوتا تو پہلے ہم اس کو اسلام کی تجدید کی دعوت دیتے اور جب وہ اسلام قبول کر لیتا تو اس کے بعد اس کو نماز کا حکم دیتے، لیکن جب ہم ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کو صرف نماز کی تلقین کرتے ہیں تو یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ شخص ترک صلوٰۃ کے باوجود مسلمان رہتا ہے، اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں قصداً روزہ توڑنے والے کو کفارہ کا حکم دیا تھا، اس کفارہ میں روزہ بھی شامل تھا، اور ظاہر ہے کہ روزہ ایک مسلمان ہی رکھے گا،

اس کی دوسری دلیل یہ ہے کہ آدمی اقرار اسلام کے بعد مسلمان ہو جاتا ہے حالانکہ ابھی اس نے ان واجبات و فرائض کو جو اسلام نے مسلمانوں پر عائد کیے ہیں یعنی نماز اور روزے وغیرہ انجام نہیں دیا ہے، ٹھیک اسی طرح اگر وہ مسلمان ہو کر ان کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کو کافر و مرتد نہیں کہا جا سکتا جب تک وہ سرے سے انکار نہ کر دے، اس سے واضح ہوگیا کہ تارک صلوٰۃ کافر و مرتد نہیں ہے[1]۔"

امام طحاوی نے بحث و استدلال کی طرح تحقیق و کاوش کا بھی پورا حق ادا کیا ہے، خصوصاً بعض مسائل مثلاً کل صلوٰۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فہی خداج اور انزل القرآن علی سبعۃ احرف، نیز سورۂ انفال اور سورۂ توبہ کے درمیان بسم اللہ نہ ہونے کے وجوہ پر انھوں نے بڑی مفصل

---

[1] مشکل الآثار [illegible]

اور محققانہ بحثیں کی ہیں، لیکن ان کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔

قرآنی آیتوں کی تشریح | امام طحاوی ان آیتوں کی جو کسی خاص حدیث میں مذکور ہیں تشریح کرتے ہیں ان کے مفہوم و منشاء کو واضح کرتے ہیں، اسی طرح بعض حدیثوں کی تشریح میں وہ قرآنی آیات سے استدلال کرتے ہیں، قرآن کے مشکل الفاظ و کلمات کے معنی و مفہوم کی جانب اشارہ کرتے اور انکی توضیح فرماتے ہیں، سبب نزول اور شان نزول وغیرہ پر روشنی ڈالتے ہیں،

اصول حدیث کی بحث | اصول روایت کے اعتبار سے بھی یہ کتاب بڑی اہمیت رکھتی ہے، مصنف نے احادیث کی صحت و عدم صحت، رجال و اسناد کی تحقیق اور اصول حدیث وغیرہ پر بڑی عالمانہ اور محققانہ بحثیں کی ہیں، وہ جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ وہ صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے وجوہ اور غلط ہے تو اس کے اسباب و علل بیان کرتے ہیں، اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مسند، مرسل ہے یا مرفوع، غریب منکر ہے یا مقبول و مشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ و ضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ و تفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی موافقت اور متابعت کی ہے، اس کو وہم و شک ہوا ہے یا نہیں؟ نفس روایت کے اندر اس سے کیا سہو یا خطا ہوئی ہے، راوی نے کوئی اضافہ کیا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے؟ ایک قسم کی متعدد روایتوں کو بھی اس لیے نقل کرتے ہیں کہ ان کا باہمی اختلاف اچھی طرح نمایاں ہو جائے، راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع و عدم سماع اور ارسال و اعلام کے متعلق بعض وضاحتیں وغیرہ تفصیل سے بیان کرتے ہیں، اس کی مزید وضاحت کے لیے چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ایک روایت جس میں یوم الحج الاکبر (حج اکبر) کا ذکر ہے، انھوں نے اس کے

متعدد جگہ اپنا بیان بھی شامل کر دیتے ہیں، ایک متن میں ہے کہ انما قیل الحج الاکبر من اجل قول الناس
الحج الاصغر، حج اکبر اس لیے کہا گیا ہے کہ لوگ حج اصغر کہتے تھے، اس کے متعلق امام طحاوی
فرماتے ہیں کہ یہ متعین طور پر نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کس کا قول ہے، ممکن ہے زہری کا قول ہو کیونکہ اکثر
وہ اپنی بات کو حدیث میں خلط ملط کر دیتے ہیں، جس سے یہ اشتباہ ہو جاتا ہے کہ وہ حدیث ہی
کا حصہ ہے، حالانکہ درحقیقت وہ حدیث کا حصہ نہیں ہوتا، اسی لیے امام زہری کو موسیٰ بن عقبہ
نے اس سے منع کیا تھا کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام اور اپنے کلام میں فصل و تفریق کر دیا کرو۔"[1]

"علمائے اسناد کے نزدیک عطا بن سائب سے روایت کرنے والوں میں چار آدمی
شعبہ، ثوری، حماد بن سلمہ اور حماد بن زید حجت ہیں، ان کے علاوہ دوسرے لوگوں کو وہ
مستند نہیں قرار دیتے، اس کے باوجود ہمام کی روایت کو جو انھوں نے عطاء سے بیان کیا ہے
ہم نے صرف اس لیے نقل کیا کہ ہمام کا بصرہ میں عطا سے سماع ثابت اور قوی ہے، اسلیے کہ
ایوب سختیانی جب بصرہ تشریف لائے تو انھوں نے لوگوں سے ان کے پاس جا کر نماز کے بعد
تسبیح پڑھے جانے والی حدیث کو دریافت کرنے کیلیے کہا، اس سے ہمام کا وہ سماع قوی ثابت ہوتا
ہے جو بصرہ میں ہوا، ان سے اختلاط والتباس اس وقت ہوا جب وہ کوفہ واپس چلے آئے تھے"[2]

اسناد کی قوت و صحت کو انھوں نے حدیث کی صحت و عدم صحت کا معیار بتایا ہے، مثلاً
"اس باب کی جملہ حدیثیں دو قسم کی ہیں، ایک میں "فلیعتق رقبۃ" کا حکم ہے اور اسی کو
صاحب حدیث ابراہیم بن ابی عبلہ سے چار اشخاص امام مالک، ابن مبارک، یحییٰ بن حمزہ اور ابن عبدالر[illegible]
ہشیم نے روایت کیا ہے، دوسری قسم میں اعتق اعتقہ رقبۃ ہے، اس کو ابراہیم سے دو آدمیوں
یعنی عبد اللہ بن سالم اور ضمرہ بن ربیعہ نے بیان کیا ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے

---

[1] مشکل الآثار ج ۲ ص ۱۹۷، ۱۹۸ [2] ایضاً ج ۳ ص ۵۵، ۵۶

مقابلہ میں چار آدمیوں کا زیادہ لحاظ کیا جائیگا لیکن بیان ترجیح کا ایک خاص سبب یہ بھی ہو کہ ان چار آدمیوں میں مالکؒ اور ابن مبارکؒ جیسے بلند پایہ لوگ ہیں جو بڑے حافظ وثابت سمجھے جاتے ہیں، اور جن کا ضبط و ثقاہت ابن سالم اور صفرہ کے مقابلہ میں زیادہ مسلم ہے[1]"

ایک راوی کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہم کو یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ابو حذیفہؒ جن سے یہ حدیث بیان کی گئی ہے کون ہیں؛ ایک اور حدیث میں اس کی یہ وضاحت موجود ہے کہ وہ عبداللہ بن مسعودؓ کے اصحاب تلامذہ میں تھے، اس سے ان کی عظمت شان اور علوے مرتبت کا پتہ چلتا ہے، ان کے قبیلہ کے متعلق امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں یہ تصریح کی ہے کہ ان کا نام سلمہ بن صہیب ارحبی تھا اور ارحب قبیلہ ہمدان کی شاخ ہے[2]"

لغت وعربیت مشکل الآثار میں الفاظ ولغات کی تشریح اور لغت وعربیت کے متعلق نہایت محققانہ معلومات ہیں جو عموماً حدیث کی کتابوں میں نہیں ملتے، اس لیے ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے،

امام طحاویؒ جب الفاظ وغیرہ کی تحقیق کرتے ہیں تو قرآن مجید اور کلام عرب کے استعمالات سے نہایت لطیف بحث کرتے ہیں، مثلاً لفظ "زعموا" کے متعلق لکھتے ہیں:-

"اس لفظ کو قرآن مجید نے اکثر ایسے مواقع پر استعمال کیا ہے جہاں مذموم لوگوں کی مذموم حرکتوں وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً

زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنْ لَنْ يُبْعَثُوا (تغابن - ۱۴)	منکر دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہرگز اٹھائے نہ جائیں گے۔

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۱ [2] ایضاً ج ۲ ص ۱۹

اور اس کے بعد فرمایا :-

بَلٰی وَرَبِّیْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ (تغابن ع ۱)

تو کہدے کیوں نہیں قسم ہے میرے رب کی بیشک تم کو اٹھانا ہے پھر تم کو جتلانا ہے جو کچھ تم نے کیا۔

دوسری جگہ فرمایا :-

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ (بنی اسرائیل ع ۶)

کہہ دو کہ پکارو جن کو تم سمجھتے ہو سوائے اس کے،

اور اس کے بعد کہا گیا :-

فَلَا یَمْلِکُوْنَ کَشْفَ الضُّرِّ عَنْکُمْ وَلَا تَحْوِیْلًا

سو وہ اختیار نہیں رکھتے کہ کھول دیں تکلیف کو تم سے اور نہ بدل دیں۔

اس قسم کی متعدد آیتیں ثبوت میں نقل کر کے لکھا ہے کہ ان میں مذموم لوگوں کے مذموم اعمال کی خبر دی گئی ہے۔[۱]

الفاظ کی تشریح و وضاحت | بعض الفاظ و کلمات کا خاص مفہوم مراد ہوتا ہے، اور اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "سباب المسلم فسوق" یعنی مسلمان کو سب و شتم کرنا فسق ہے۔ امام طحاوی اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہاں فسوق کے معنی محمود اور قابل ستائش کام کو چھوڑ کر مذموم کام کی طرف جانا ہے

اس کی نظیریں بہت ہیں، خود کلام پاک میں ہے

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ (کہف ع ۷) سو نکل بھاگا اپنے رب کے حکم سے

جو نکلنا امر رب کے مفہوم میں ہے، اسی طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم کے اندر جن

---

[۱] مشکل الآثار ج ۱ ص ۹۰

پانچ چیزوں کے قتل کو مباح قرار دیا ہے ان کے لیے فواسق کا لفظ استعمال کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں لوگوں کو اذیت دینے کے لیے نکلتی ہیں۔[1]

اسی حدیث کے دوسرے ٹکڑے "وقتاله کفر" یعنی مسلمان سے قتال کرنا کفر ہے، کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"کفر سے مقصود اللہ کا انکار نہیں جس کی وجہ سے آدمی مرتد ہو جاتا ہے بلکہ یہ تغطیہ (چھپانا، ڈھانکنا) کے مفہوم میں ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ ہے

کمثل غیث اعجب الکفار نباته (حدید ع ۳) جیسے حالت ایک مینہ کی جو خوش لگا کسانوں کو اس کا سبزہ

چنانچہ عام علماء تاویل کا اتفاق ہے کہ یہاں کفار سے زُرّاع (کاشتکار) مراد ہیں، اس لیے کہ یہ لوگ زمین کے اندر بیج ڈالتے ہیں اور ان کے اس عمل سے وہ چھپ جاتا ہے، حدیث مذکور میں کفر سے کفر باللہ مراد نہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو قتل کرنے کے بعد بھی کافر و منکر نہیں ہوتا اس لیے عام مسلمانوں کو قتل کرنے کے بعد وہ بدرجۂ اولیٰ کافر نہ ہوگا، اسی طرح کسوف شمس (سورج گرہن) والی حدیث میں ہے کہ آپ نے جہنم کا مشاہدہ فرمایا اور اس میں آپ کو اکثر عورتیں نظر آئیں، صحابہ نے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ نے فرمایا، یہ ان کے کفر کا نتیجہ ہے، انھوں نے عرض کیا کیا وہ انکار خدا کرتی ہیں، ارشاد ہوا نہیں بلکہ شوہروں کے احسان کا کفر کرتی ہیں، اگر تم کسی عورت کے ساتھ سو بھلائیاں کرو، لیکن اگر وہ اتفاقاً تمھاری جانب سے ایک بھی ناپسندیدہ کام دیکھے گی تو کہے گی میں نے تمھاری جانب سے کوئی بھلائی کا کام کبھی نہیں دیکھا، پس اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے فعل کو کفر سے اسلیے تعبیر کیا کہ وہ احسان فراموشی کرتی ہیں جس کی ممانعت کی گئی ہے۔[2]

اسی قسم کی اور حدیثیں مثال میں بیان کر کے دکھایا ہے کہ کفر سے یہاں کفر باللہ مراد نہیں ہے

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۶۶ [2] ایضاً ص ۳۶۷ - ۳۶۸

<u>دو کے مشترک معنی</u> اہل عرب کا عام اور معروف قاعدہ ہے کہ وہ جب دو چیزوں کا تذکرہ کرتے ہیں وخطاب کے اندر ان دونوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک ہی چیز سے متعلق وصف اور خصوصیت کو دونوں کی طرف منسوب کر دیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ — اللہ نے دو دریا چلائے مل کر چلنے والے

لَا يَبْغِيَانِ (رحمٰن ع۱) — ان کے درمیان ایک پردہ ہے۔

اس کے بعد ہے

يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ — ان سے موتی اور مونگا نکلتا ہے،

حالانکہ موتی اور مونگے ایک ہی سمندر سے نکلتے تھے لیکن خطاب میں دونوں کا ذکر ہے اسی طرح دوسری جگہ ہے

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ أَلَمْ يَأْتِكُمْ — اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تمہارے

رُسُلٌ مِنْكُمْ (انعام ع۱۶) — پاس تمہارے ہی اندر سے رسول نہیں پہنچے تھے

ظاہر ہے کہ خدا کے رسول صرف انسانوں کے اندر سے ہوتے تھے، اور جنات میں سے نہیں ہوتے تھے، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجلس میں فرمایا کہ

تبایعونی علی ان لا تشرکوا باللہ — مجھ سے بیعت کرو کہ تم لوگ کسی چیز کو خدا کا شریک

شیئا ...... فمن وفی منکم فاجرہ علی اللہ — نہ بناؤ گے ... جو لوگ مجھ سے اس بیعت کے مطابق ٹھیک

ومن اصاب من ذلک شیئا فعوقب علیہ فھو — عمل کریں گے ان کا بدلہ اللہ کے ذمہ ہے اور جس نے

کفارۃ لہ ومن اصاب من ذلک شیئا — کچھ غلطی کی اور اس کو سزا دی گئی تو یہ سزا اس کا کفارہ ہوگی

فسترہ اللہ علیہ فامرہ الی اللہ — اور جس کی غلطی کی اللہ نے پردہ پوشی کی اس کا معاملہ

ان شاء عذبہ وان شاء غفر لہ — اللہ کے ذمہ رہے گا، وہ چاہے تو عذاب دے چاہے تو بخش دے

حالانکہ یہ معلوم ہے کہ اگر کسی شخص نے خدا کا شریک بنایا اور اس کو اس کے شرک کی سزا دی گئی تو یہ سزا

لیے کہ اللہ کا عام فیصلہ یہ ہے کہ

بیشک اللہ نہیں بخشتا ہے اسکو وہ کہ اسکا شریک ٹھہرائے

اور بخشتا ہے اس کے سوا جس کو چاہے ،

یا اضاعوا من ذالک شیئا" الخ اس کے جلا امور

ہے ، نہیں کیا جائیگا ، بلکہ چند ہی کیجا نب کیا جائیگا ۔"[1]

ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے اہل مدینہ کے بارہ میں فرمایا (اللھم بارک لھم فی کیالھم و بارک لھم فی صاعھم و فی مدھم) یعنی اے اللہ تو ان کے ناپ تول میں برکت دے ، ظاہر ہے کیال ، صاع اور مد میں برکت سے مقصود دراصل ان پھلوں میں برکت ہے جو مدینہ والوں کے مال تھے اور جن پر ان کی زندگی کا دارومدار تھا ، یہ کلام عرب کا عام استعمال ہے ، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

وَاسْئَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِي كُنَّا فِيهَا وَالْعِيرَ الَّتِي أَقْبَلْنَا فِيهَا (یوسف ـ ع)	اور پوچھ لے اس بستی سے جس میں ہم تھے اور اس قافلہ سے جس میں ہم آئے ہیں ۔

یہاں قریہ (بستی) اور عیر (قافلہ) سے اہل قریہ اور اہل عیر مراد ہیں ، اسی طرح آپ نے کیال وغیرہ کا ذکر اسلیے کیا ہے کہ وہ دراصل پھلوں کے ناپ تول کے پیمانے تھے ۔[2]

اہل عرب اختصار کی وجہ سے اکثر کلام میں حذف سے کام لیتے ہیں جس کو مخاطب موقع و محل سے سمجھ لیتا ہے ، حذف الفاظ اور جملوں دونوں میں ہوتا ہے ، مثلاً کفی بالسیف شاھد یعنی تلوار شہادت کیلئے کافی ہے ، یہاں شاہد کے لفظ کو مختصر کرکے صرف شا ، کہا گیا ہے ، اسی طرح کلام مجید میں ہے :

وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَىٰ (رعد)	اور اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ اس سے پہاڑ چلائے جاتے یا زمین ٹکڑے ہو جاتی یا اس سے مردے بولنے لگتے ۔

اس کے بعد بقیہ کلام حذف ہے ، اسی طرح فرمایا

---

[1] مشکل الآثار ج ۱ ص ۲۰۳ ، [2] ایضاً ج ۲ ص ۹۰

[illegible] کہ جو اللہ کے فضل [illegible]

یہاں اللہ کے فضل و رحمت کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا اس کو حذف کر دیا گیا۔"[1]

ثالثاً: زبان کے استعمالات میں کنایہ سے بھی کام لیا جاتا ہے، امام طحاوی ایک حدیث میں "دخل فی الصلوٰۃ" یعنی آپ نماز میں داخل ہوئے کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اس کے معنی قرب دخول کے ہیں حقیقۃً دخول مراد نہیں ہے اور یہ زبان کا معروف استعمال ہے، قرآن مجید میں ہے:۔

وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ ... اور جب تم نے عورتوں کو طلاق دی پھر پوری کر چکیں اپنی عدت کو

یہاں بلوغ اجل کا قرب مراد ہے نہ کہ حقیقی بلوغ اجل، کیونکہ یہ معنی مراد لینے میں متعدد اشکالات پیدا ہوتے ہیں، اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ مسلمان حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو جنکے ذبح کرنے کا خدا نے حکم دیا تھا، ذبیح کہتے ہیں، حالانکہ وہ ذبح نہیں کیے گئے تھے بلکہ قریب تھا کہ ذبح کر دیے جاتے۔"[2]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

"ایک حدیث میں ہے کہ ان رسول اللہ قاء فافطر یعنی قے کی وجہ سے آپ کا روزہ جاتا رہا حالانکہ علمائے امت کا عام مسلک یہ نہیں ہے بلکہ انکا اعتماد دوسری روایت پر ہے کہ ان من ذرعہ القیئ [illegible] یعنی اگر کسی شخص کو دفعۃً بغیر قصد و ارادہ کے قے ہو گئی تو اس کا روزہ نہیں ٹوٹیگا، دونوں روایتیں بظاہر باہم متعارض ہیں اور ان سے کوئی خاص وہم و اشکال پیدا ہوتا ہے اسلئے کہ یہ عربی زبان کا کلام ہے اور اس میں مخاطب کے فہم کی رعایت سے اکثر کنایات کا استعمال ہوتا ہے، اس صورت کو مدنظر رکھنے کے بعد قاء فافطر قاء فضعف فافطر کے معنی میں ہوگا، قرآن مجید میں ہے: ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ (یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب قسم کھا بیٹھو) جو در اصل ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ فَحَنِثْتُمْ یعنی یہ کفارہ ہے تمہاری قسموں کا جب تم قسم کھا بیٹھو اور حانث ہو جاؤ، کیونکہ عام اتفاق ہے کہ محض قسم کھا لینے سے [illegible] کفارہ لازم نہیں ہوتا بلکہ حانث ہونے کے بعد ہی وہ لازم ہوگا۔"[3]

---

[1] مشکل الآثار ج ۲ ص ۲۱۲-۲۱۳ [2] ایضاً ج ۱ ص ۲۵۹-۲۶۰ [3] ایضاً ج ۲ ص ۲۶۶-۲۶۷

شعراء کلام سے استشہاد | بعض اہل عرب [illegible] اسکے شواہد [illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible]

آدمی دوسرے سے کہتا ہے کہ انت منی مکان القریب (تم مجھ سے قریب [illegible]

ظاہر کرتا ہے جس طرح قرب کے اظہار کیلئے کہا جاتا ہے انت منی

[illegible] قریب ہو) یا انت منی نصب عینی (تم میری نگاہوں کے سامنے ہو) یا انت منی

[illegible] (تمہارا اور میرا حال [illegible])

لغوی تحقیقات میں انھوں نے علمائے لغت کے اقوال و اختلافات بھی ذکر کیے ہیں۔

نحوی مسائل | لغت و عربیت کی طرح وہ نحوی مسائل پر بھی بحث کرتے ہیں، مثلاً ایک جگہ سلسلہ میں آیۂ کریمہ

إِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (انبیاء ع ۷) (تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو دوزخ کے ایندھن ہیں)

میں "ما" کے متعلق تحریر فرماتے ہیں: "ما غیر بنی آدم کے لیے اور من بنی آدم کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً

وَمَن يَقُلْ مِنْهُمْ إِنِّي إِلَٰهٌ مِّن دُونِهِ (انبیاء ع ۲) اور جو کوئی ان میں سے کہے کہ میں معبود ہوں اللہ کے سوا

وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (فرقان ع ۶) اور جو کوئی کرے یہ کام وہ جا پڑا گناہ میں

یہ اور اس طرح کے دوسرے مواقع پر "من" بنی آدم کیلئے استعمال ہوا ہے اور غیر بنی آدم کیلئے "ما" آتا ہے جیسے

وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ (مائدہ ع ۱) اور جس کو کھا گیا ہو درندہ مگر جس کو تم نے ذبح کر لیا [illegible]

لیکن اس عام قاعدہ اور معروف طریقے کے خلاف بھی مثالیں ملتی ہیں اور اہل عرب کبھی "ما" کو بھی بنی آدم کیلئے "من" کی جگہ استعمال کرتے ہیں، گو یہ استعمال "من" کی طرح زیادہ نہیں ہوتا ہے مگر اس کی بعض مثالیں موجود ہیں، جیسے

وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (نساء ع ۴) اور خاوند والی عورتیں مگر جن کے مالک ہو جائیں تمہارے ہاتھ

۱؎ مشکل القرآن ص ۹۰

[illegible]

یہاں الحقیقۃ (اور) لکن کی جگہ دیا گیا ہے مثلاً قول الٰہی ہے [illegible]

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے سب اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں

يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (حشر) ۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اس کی پاکی بیان کرتے ہیں

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ (البلد) ۔ اور قسم ہے جننے والے کی اور جو اس نے جنا۔

مشہور حدیث "کل عمل ابن آدم له الا الصوم" کے سلسلہ میں الا کے اتصال و انفصال کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ استثناء لکن کے مفہوم میں ہے کیونکہ الا کبھی کبھی لکن کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے، اور اس صورت میں اس کا وہ مفہوم نہیں ہوتا جو استثناء والے الا کا ہوتا ہے مثلاً قرآن مجید میں ہے:

فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ ۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۔ سو تم سمجھاتے جاؤ تمہارا کام تو بس سمجھانا ہے تم ان پر داروغہ نہیں (ترجمہ)

إِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ ۔ فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْأَكْبَرَ ۔ جس نے منہ موڑا اور کفر کیا تو اللہ اس کو بڑا عذاب دے گا۔

یہاں استثناء مقصود نہیں ہے بلکہ یہ الا لکن من تولی وکفر کے مقام پر آیا ہے [illegible] علامت فارقہ جس سے دونوں مفہوموں کا اختلاف معلوم ہوتا ہے، یعنی اگر الا کے بعد جو چیز بیان کی گئی ہو اس کی خبر آئے تو وہ لکن کے مفہوم میں ہوگا جیسا کہ اس آیت میں ہے لیکن خبر ذکر نہ ہو تو الا استثناء کیلئے ہوگا۔ مثلاً

وَالْعَصْرِ ۔ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ۔ إِلَّا الَّذِينَ ۔ زمانہ کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے مگر وہ لوگ جنہیں

آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ الخ (عصر) ۔ اور انھوں نے نیک عمل کئے۔

تمثیل: تمثیل و تشبیہ کی بھی جا بجا وضاحت ہے مثلاً حضرت علی سے روایت ہے کہ "فیکم مثلہ [illegible] [illegible]" [illegible] لکھتے ہیں۔

"تمثیل و تشبیہ صرف [illegible] کے اعتبار سے ہے، کیونکہ ایک چیز کو دوسری چیز کے مشابہ قرار دینے کے لیے کلی مشابہت اور اشتراک ضروری نہیں [illegible] [illegible] جیسے

[illegible]

اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ (طلاق۔ ع ۲) اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور ان ہی کے مثل زمین بھی۔

ظاہر ہے کہ آسمان کے مثل زمین کو صرف اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ ان کی تعداد بھی سات ہے یعنی صرف عدد میں اشتراک اور یکسانی کی وجہ سے زمین کو آسمان کے مثل کہا گیا ہے ورنہ دونوں کی عام نوعیتیں بہت مختلف اور جدا جدا ہیں۔" (مشکل الآثار ج ۲ ص ۱۸۵)

ایک حدیث یغسل الاناء من الھرۃ کما یغسل من الکلب یعنی بلی کا جوٹھا برتن بھی کتے کے جوٹھے برتن کی طرح دھویا جائیگا۔ کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:-

"یہاں کما کی تشبیہ صرف اس معنی میں ہے کہ کتا اور بلی دونوں کی وجہ سے برتن دھویا جائیگا۔ لیکن دونوں کی وجہ سے برتن دھوئے جانے کی تعداد جدا جدا ہے، لیکن چونکہ دھوئے جانے کا وصف دونوں میں مشترک ہے، اس لیے کما لایا گیا ہے، یہ عربی زبان کا ایک اسلوب ہے، کلام عرب میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں، مثلاً

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا طَائِرٍ يَطِيرُ — نہیں ہے کوئی چلنے والا زمین میں اور نہ کوئی پرندہ جو اڑتا ہے
بِجَنَاحَيْهِ إِلَّا أُمَمٌ أَمْثَالُكُمْ (انعام۔ ع ۴) — اپنے دونوں بازوؤں سے مگر ہر ایک تمہاری ہی طرح امتیں ہیں

یہاں چوپایوں اور چڑیوں کو انسانوں کے مثل و مشابہ اس لیے نہیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عام نوعیت اور خلقت وغیرہ کے اعتبار سے انسانوں کے مشابہ ہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں بھی انسان ہی کی طرح خدا کی عبادت و اطاعت کی آزمائش میں ڈالی گئی ہیں، اور اس اعتبار سے ان کی انسانوں سے مماثلت ہے، پس حدیث زیر بحث سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بلی کا جوٹھا بھی کتے کے جوٹھے کی طرح سات مرتبہ دھویا جائیگا۔" (ایضاً)

مصنف کا ایک اور بڑا امتیازی وصف یہ ہے کہ انھوں نے اس میں جگہ جگہ نادر اور دلچسپ مباحث بیا

کیے ہیں، ان کے متعلق ماہرین اور ائمہ فن کے خیالات بھی تحریر کیے ہیں، اور اس سلسلہ میں اہم کتابوں کے حوالے دیے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی نظر احادیث کے علاوہ مختلف فنون پر بھی تھی۔

افسوس ہے کہ یہ اہم اور بلند پایہ کتاب ابھی تک مکمل زیور طباعت سے آراستہ نہیں ہوئی، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے صرف اس کی ۴ جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً ۱۴۳۲ صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۴۰ ہے، چوتھی جلد کے آخر میں ایک تقریظ ہے، مرتبین نے مختصر مگر مفید حواشی بھی تحریر کیے ہیں، جو الفاظ و لغات کی تشریح، اور اسماء و رواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں ان کو حاشیہ میں مکمل اور مفصل نقل کیا گیا ہے، الفاظ کی تشریح میں مجمع بحار الانوار اور اسماء و اعلام کے لیے تہذیب التہذیب اور نقل احادیث میں شرح معانی الآثار اور دوسری مستند کتابوں کو ماخذ بنایا گیا ہے۔

محدث ابو الولید ابن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، اس کا مختصر قاضی القضاۃ جمال الدین یوسف ابن موسیٰ ملطی نے المعتصر من المختصر کے نام سے کیا ہے، یہ دائرۃ المعارف سے ۱۳۱۷ھ میں بڑی تقطیع کے ۴۰۰ صفحات میں شائع ہوئی، صاحب کتاب نے شروع میں لکھا ہے:-

"مشکل الآثار بڑی اہم کتاب اور گوناگوں فوائد و لطائف پر مشتمل ہے لیکن وہ غیر مرتب اور غیر منظم ہے، ایک باب کی حدیثیں ایک جگہ کے بجائے متفرق اور منتشر طور پر پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، ایسی صورت میں طلبہ اور اہل علم کے لیے پوری کتاب کا مطالعہ کیے بغیر اس سے استفادہ مشکل اور دشوار تھا، اس لیے مجھ کو اس کے گوناگوں فوائد کے خیال سے اس کی ترتیب اور جمع کا خیال ہوا، لیکن اپنی بے بضاعتی کے سبب اس اہم کام کو شروع کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، حسن اتفاق سے مجھ کو ابو الولید الباجی کا مختصر دستیاب ہوا، انھوں نے بڑے عمدہ اور مناسب طریقہ پر مشکل الآثار

مختصر کیا تھا، پھر ابواب کی حدیثیں یکجا کر دی تھیں، ترتیب میں حسن و موزونیت کا بھی خاص لحاظ رکھا تھا، حدیثوں کی سندیں اور طرق حذف کر دی تھیں، اگرچہ الفاظ اس طرح پر مختصر کیے تھے کہ معنی میں خلل بھی نہ ہو اور لوگوں کو اس کے سمجھنے میں دقت بھی پیش نہ آئے، مجھے اس کتاب کے ملنے پر بڑی خوشی ہوئی اور خدا کا شکر ادا کیا اور اس کا خلاصہ اور مغز لے لیا، الفاظ وغیرہ ان کے جوں کے توں نہیں نقل کیے ہیں بلکہ سے الفاظ میں معانی و مفہوم کو ادا کرنے کی کوشش کی ہے، کتاب کی ترتیب اس طور پر ہے کہ پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور اوصاف و خصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر آپ کے معجزات اور سن وفات سے متعلق روایات ہیں، اس کے بعد احکام و شرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں، پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول وغیرہ کے ابواب مختصر کی ترتیب کے مطابق ہیں، باجی کے اعتراضات و استدراکات بھی نقل کر کے میں نے بعض کے جوابات دیے ہیں، پورے مجموعہ میں ۳۳۰ حدیثیں ہیں، ان کے علاوہ ایسی بھی حدیثیں ہیں جو مصنف نے اپنی بحث و تحقیق کے سلسلہ میں بطور ثبوت و استشہاد بیان کیے ہیں[1]"

صاحب معتصر نے طویل سندیں حذف کر دی ہیں، مصنف نے جو متعدد طرق و اسناد بیان[2] کیے ہیں، ان میں صرف وہی نقل کی ہیں جن میں بین طور پر اختلاف پایا جاتا ہے، وہ مختلف روایتوں کے صرف اس حصہ کا ذکر کیا ہے جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق و تضاد ظاہر ہوتا ہے، مصنف نے روایت کے متعلق جو شبہات تحریر کیے ہیں اور پھر ان کی جو توجیہ بیان کی ہے صاحب معتصر نے اس کو نہایت مختصر کر کے اس طرح نقل کیا ہے کہ مفہوم بآسانی سمجھ میں آجائے۔

---

[1] المعتصر من المختصر من مشکل الآثار، ص ۳

جاہلی شاعری میں زہدیہ رجحانات

از

جناب حافظ غلام مصطفٰے صاحب ایم اے استاد شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جاہلی شاعری عربی ادب کا قدیم ترین سرمایہ ہے، جو آج ہمارے پاس موجود ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل کا زمانہ اسلامی اصطلاح میں عہدِ جاہلیت کہلاتا ہے، اس لیے اس زمانہ کی شاعری کو جاہلی شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ کل سرمایہ پانچویں صدی اور زیادہ تر چھٹی صدی عیسوی کے عرب شعراء کی طرف منسوب ہے جو زبانی روایت کے ذریعہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا رہا، تا آنکہ آٹھویں اور نویں صدی میں اس کو ضبطِ تحریر میں لایا گیا۔ یہی اشعار عربی ادب کے ابتدائی نقوش ہیں، لیکن درحقیقت یہ عربی شاعری کے عہدِ طفولیت کے خد و خال نہیں ہیں، بلکہ اس کے شباب کی توانائیاں ہیں۔ جب اہلِ نظر اس کے بانکپن کو دیکھتے ہیں تو حیران و ششدر ہو کر سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ نکھار صدیوں کی مشق و محنت اور تراش و خراش کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن یہ سب کچھ کب اور کیسے ہوا، اس کا صحیح علم آج کسی کو نہیں ہے۔ بہرحال جاہلی شاعری کا مرتبہ فصاحت و بلاغت، شوکت و سطوت، جمال و جلال، معانی کی گہرائی اور دوسری فنی خصوصیات کے لحاظ سے بہت بلند اور بڑی حد تک مکمل اور معیاری ہے۔[1] یہی وجہ ہے کہ عباسی دور کی چند بے باک ہستیوں کے سوا کسی نے آج تک اس سے آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کی، اور ہر زمانہ میں اس کے حسن و جمال اور فضل و کمال

---

1 جاہلی شاعری کی خصوصیت کیلئے دیکھیے، تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ الیف جرجی زیدان، الجزء الاول، قاہرہ ۱۹۵۷ء، ص ۔

کا اعتراف کیا گیا ہے اور آج بھی اس کی عظمت و برتری اپنی جگہ مسلم اور ناقابل تردید ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر قوم کا ادب اس کی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے، اگر زندگی مطمئن و پرسکون ہوتی ہے تو ادب میں بھی سکون و اطمینان کی جلوہ گری ہوتی ہے، اور اگر زندگی میں ہیجان و اضطراب ہوتا ہے تو ادب کی تحریریں بھی متلاطم نظر آتی ہیں، جاہلی شاعری بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہے، چنانچہ صحیح معنی میں عربوں کی حقیقی زندگی کی جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں بدوی زندگی کی روح چلتی پھرتی نظر آتی ہے۔

صحرائی زندگی میں جو سادگی، سچائی، بے تکلفی اور بے باکی کے جوہر ہوتے ہیں عرب فطری طور پر حریت پسند، دلیر، [illegible] اور جفاکش ہوتا ہے، اس کے احساس میں شدت، مزاج میں تیزی، حوصلے میں بلندی، طبیعت میں جوش، دل میں امنگ اور جذبہ میں اشتعال ہوتا ہے، وہ عموماً ضعف، عجز، تواضع و خاکساری اور تحمل و پست ہمتی سے نفرت کرتا ہے، لڑائی میں ثابت قدم اور مصیبت میں صابر ہوتا ہے، فخر و حماسہ، کبر و نخوت، غیظ و غضب، عصبیت و حریت اور عداوت و انتقام کے جذبات سے سرشار ہوتا ہے، یہی صفات جاہلی شاعری کے نمایاں خصوصیات ہیں جن کے ذیل میں عرب شعراء نے زبان و بیان اور فصاحت و بلاغت کے کمال دکھائے ہیں۔

ایسی صورت میں جاہلی شاعری کے متعلق یہ کہنا کہ [illegible] کا شکار ہے [illegible] معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایک زاہد کی طبیعت جو شکست خوردہ [illegible] قناعت و [illegible] غمگینی اور فکر کی طرف مائل ہوتی ہے، وہ [illegible] کے تصور میں محو ہوتا ہے، دنیا اور اس کی آرائش و زیبائش اور [illegible] اس کی نظر میں [illegible] اور بے وقعت ہوتے ہیں، [illegible] زندگی سے [illegible] کوئی مناسبت نہیں معلوم ہوتی۔

[illegible]

ص ۲۳۰ تا ۲۳۴

یہ دیتے ہیں کہ [illegible] صرف بعض حالات میں ہو سکتی ہے تمام ممکن [illegible] کے باوجود
جب ہم جاہلی عصر پر نظر ڈالتے ہیں تو جابجا ہمیں وہ خصائص ملتے ہیں جو دورِ اسلام سے بڑی حد تک مشابہ ہیں۔
لیکن جیسے ملک کے تمام افراد ہر لحاظ سے ایک ہی سطح پر نہیں ہوتے بلکہ طبیعت، مزاج، احساس اور فکر کے اعتبار سے، تمدنی، اقتصادی اور ثقافتی حالتوں کے لحاظ سے ان میں بہت فرق ہوتا ہے، ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں بھی یہ فرق بہت نمایاں تھا۔ ایک طرف ریگستانی علاقوں میں بدوی قبائل صحرا نوردی کی زندگی گذارتے تھے تو دوسری طرف یمن کے شاداب علاقے کے علاوہ خود قلبِ عرب میں مکہ، طائف، یثرب اور خیبر جیسی بستیاں بھی تھیں، جہاں کے باشندے حضری یا کم از کم نیم حضری متمدن تھے، ان میں سے بعض بستیاں بہت اہم تجارتی منڈیاں بن گئی تھیں۔ وہ تجارتی قافلوں کے راستے پر آباد اور مختلف ممالک کے درمیان اتصال کی نہایت اہم کڑیاں تھیں۔ اس لیے یہاں کے باشندے قدرتی طور پر مختلف بیرونی اقوام کی تہذیب و تمدن سے متاثر تھے اور ان کی ذہنی و فکری سطح بھی صحرائی بدوؤں کی بہ نسبت بلند تھی۔

اس کے علاوہ عرب کی شمالی سرحد پر دو عرب حکومتیں[1] قائم تھیں، دریائے فرات کے ساحل پر حیرہ کی حکومت تھی جہاں لخمی خاندان کے عرب ایرانی بادشاہوں کی سرپرستی میں حکومت کرتے تھے۔ شام کے مغرب میں غسانی عربوں کی حکومت تھی جو رومیوں کے زیرِ سایہ تھی۔ ان عرب حکومتوں پر ایرانی، رومی اور یونانی ثقافت کا رنگ غالب تھا۔ صرف ان ہی علاقوں تک محدود نہ تھا بلکہ ان کے اثرات اندرونِ ملک تک پہنچتے تھے کیونکہ عربوں کی آمد و رفت ان حکومتوں کے دربار میں اور ان کے علاقوں میں برابر ہوتی رہتی تھی۔

---

[1] ان دونوں حکومتوں کے متعلق دیکھئے: [illegible] تاریخ العرب [illegible]
[illegible]

مذہبی[1] عقائد کے لحاظ سے بھی جاہلی عربوں میں یکسانیت نہیں تھی، ریگستانی بدوؤں کا کوئی مذہب نہیں تھا یا بت پرست تھے بستیوں میں رہنے والے نیم حضری عرب عام طور پر ملت ابراہیمی کے قائل تھے، اور ان میں شریعت ابراہیمی کی کچھ باقیات رائج بھی تھیں، لیکن ان میں بھی شرک وبت پرستی کا رواج عام تھا، اس کے علاوہ یثرب اور خیبر وغیرہ میں یہودی بھی بہت قدیم زمانے سے آباد تھے، جن کے اثر سے ہمسایہ عربوں کے کچھ افراد یہودی ہو گئے تھے، اور اکثر لوگ یہودیوں کے عام مذہبی عقائد و رسوم سے واقف تھے، شمال میں عیسائیت کا اثر غالب تھا، اس کے اطراف وجوانب کے متعدد عرب قبیلے عیسائی ہو گئے تھے، یا کم از کم عیسائیت کی طرف مائل تھے،

اسی طرح جب ہم جاہلی شعراء کی زندگیوں[2] پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں بھی تین فرق دکھائی دیتا ہے، کچھ شعراء نے خالص بدوی زندگی بسر کی اور ہمیشہ صحرانوردی، غارتگری اور طلب انتقام میں مشغول رہے، اس کے برعکس بعض شعراء نہ صرف عرب کی بستیوں، بازاروں اور میلوں میں نظر آتے ہیں بلکہ ان کے تعلقات حیرہ اور غسان کے بادشاہوں سے بھی پائے جاتے ہیں، وہ ان کے درباروں میں جاتے ہیں اور انکو اپنے اشعار سناتے ہیں علاوہ انعام واکرام سے نوازے جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ شعراء عجمی افکار و خیالات سے بھی متعارف ہوں گے، جیسا کہ ان کے اشعار سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ کچھ شعراء یہودی اور عیسائی بھی تھے، مگر چہ ان کی تعداد کم ہے اور ان کا شعری سرمایہ بھی بہت قلیل مقدار میں پایا جاتا ہے، لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح جاہلی شعراء تمدنی، ثقافتی، ذہنی، فکری اور مذہبی اعتبار سے ایک دوسرے سے کافی دور تھے، چنانچہ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات اگرچہ بڑی حد تک یکساں ہیں لیکن تفصیل

---

[1] ادیان عرب کے لیے دیکھئے: تاریخ العرب قبل الاسلام، تالیف الدکتور جواد علی، الجزء الخامس، مطبع المجمع العلمی العراقی [illegible]

[2] جاہلی شعراء کے حالات کے لیے دیکھئے: تاریخ آداب اللغۃ العربیۃ تالیف جرجی زیدان، الجزء الاول ص ۱۰۵ تا ۱۰۹

بیانات کے درمیان چار ایسے معانی و مطالب اور افکار و خیالات ملتے ہیں جو تمام شعراء کے کلام میں یکساں طور پر نہیں پائے جاتے،

یہی حال زہد یہ مضامین کا بھی ہے، اگرچہ زہد ان کی شاعری کا مستقل موضوع نہیں تھا، تاہم بعض شعراء کے کلام میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں دنیا سے بے رغبتی، مال و متاع کی بے وقعتی، زندگی کی بے ثباتی، موت کی ہولناکی، زمانہ کا جبر، تقدیر کا قہر اور گذشتہ اقوام کی تباہی و بربادی کا ذکر کہیں اختصار اور کہیں تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے،

یہ مضامین بعض بت پرست اور بدوی شعراء کے قصائد میں بھی ملتے ہیں، حالانکہ وہ حیات بعد الممات کے قائل نہیں تھے، البتہ اسلام سے قبل بعض ایسی رسموں کے وجود کا پتہ چلتا ہے جن کی روشنی میں صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض بدوی عرب غالباً موت کے بعد ایک مبہم قسم کی زندگی کا تصور رکھتے تھے، مثلاً بعض قبائل میں "بلیّہ" کے نام سے ایک رسم رائج تھی، "بلیہ" اس اونٹنی کو کہتے تھے[1] جو قبر پر باندھ دی جاتی تھی اور اسکو کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں دی جاتی تھی، یہاں تک کہ وہ اسی جگہ مر جاتی تھی، اس کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اونٹنی آیندہ زندگی میں مرنے والے کے لیے سواری کا کام دے گی، اسی طرح "ہامہ"[2] کا تصور ملتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ مرنے کے بعد انسان کے دماغ سے ایک پرندہ نکلتا ہے، جو اسکی قبر کے گرد اڑتا رہتا ہے، اس پرندہ کو وہ "ہامہ" کہتے تھے، بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور صرف ان مقتولین کے ساتھ مخصوص تھا جن کا انتقام ان کے قاتلین سے نہیں لیا جاتا تھا، چنانچہ انکے خیال کے مطابق ایسے مقتول کا "ہامہ" ہر وقت "اسقونی، اسقونی" چلاتا رہتا تھا، یعنی مجھے پلاؤ، مجھے پلاؤ، مطلب یہ ہے کہ میرا انتقام لو، اور قاتل کے خون سے مجھے سیراب کرو۔

ان تصورات کے پیش نظر صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ بدوی عربوں کے ذہن میں حیات بعد الممات کا ایک دھندلا سا خاکہ تھا جس کے نقوش واضح نہیں تھے، مگر اس کے ساتھ جزا و سزا یا جنت و جہنم

---

[1] بلوغ الارب، تالیف آلوسی مصر ۱۹۲۳ء ج ۲ ص ۳۰۶، [2] ایضاً ص ۳۱۱

کا کوئی قصد نہیں تھا اس لیے ان کے بیان خوف آخرت کا کوئی دخل [illegible]

میں جو زہد یا زہد کے مشابہ خیالات پائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا سبب خوف آخرت نہیں تھا،

اور نہ اس کا مقصد تحصیل اجر و ثواب یا اصلاح نفس تھا [illegible]

حقیقت یہ ہے کہ زہد کا تعلق ایک حیثیت سے خود انسان کی فطرت سے بھی ہے، جس طرح دولتمندوں اور عیش پرستوں کی دلفریب زندگی کو دیکھ کر مال و متاع کی محبت اور طمع دل میں پیدا ہوتی ہے، اسی طرح زندگی کے انقلابات اور زمانہ کے حوادث کو دیکھ کر دنیوی لذات کی بے ثباتی اور مال و دولت کی بے وقعتی کا نقش بھی خود بخود دل و دماغ پر کھنچ جاتا ہے، انسان کتنا ہی مالدار، خوشحال، صحت مند اور با اقتدار ہو لیکن کبھی زندگی کے انجام کا خیال اس کے دل میں آتا ہی ہے، اس وقت موت کو یاد کر کے وہ غمگین ہوتا ہے، خواہ یہ تاثر چند لمحات ہی کے لیے کیوں نہ ہو بلکہ جو شخص دنیا میں جتنا زیادہ خوشحال ہوتا ہے، موت کے تصور سے وہ اتنا ہی زیادہ مغموم ہوتا ہے، اس کے علاوہ بعض انسان فطری طور پر خاموش، تنہائی و خلوت پسند، منکسر المزاج، افسردہ دل اور غمگین طبع ہوتے ہیں، اور بعض کچھ حوادث کو دیکھ کر یا ان میں خود مبتلا ہو کر ان صفات سے متصف ہو جاتے ہیں،

غرض زہدیہ رجحانات کے محرکات متعدد ہو سکتے ہیں، اس لیے جاہلی شعراء کے کلام میں جو زہدیہ خیالات پائے جاتے ہیں، ان کے وجوہ و اسباب اور مقاصد و اغراض مختلف ہوتے ہیں، کبھی شاعر مال و متاع کی ناپائداری اور زندگی کی بے ثباتی کا ذکر اصحاب ثروت کو سخاوت و فیاضی کی ترغیب دینے کے لیے کرتا ہے، کبھی طلب شہرت و نیکنامی پر ابھارنے کے لیے ان باتوں کا بیان کرتا ہے کہ دنیا میں ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے، اگر آج بھی [illegible] زندگی ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے اس لیے دنیا [illegible] زیادہ مال جمع [illegible] دوسروں کی حاجت روائی کر سکو تو [illegible] نیک نامی ہمیشہ باقی رہے گی۔ کبھی شاعر کبھی موت و فنا کا ذکر کر کے جرأت و شجاعت کی ترغیب و تشویق کا سبب [illegible]

وقت مقرر پر پہنچ جانا ہے، کسی طرح نجات ممکن نہیں ہے کہ سپاہیوں کا بھاگنا فضول ہے بے سود ہے اگر زندگی کی آخری ساعت آگئی ہے تو پھر اطمینان سے میدان میں موت آسکتی ہے اور اگر اس کا وقت ابھی نہیں آیا تو انسان حالت جنگ میں بھی اپنے محفوظ و مستحکم ہے پھر کیوں نہ شجاعت کے جوہر دکھا کر عزت و نیکنامی حاصل کرے اور کیوں بزدل بن کر ذلت و بدنامی کا داغ لگے۔

اس کے علاوہ جاہلی شاعر جب کسی حادثہ سے دوچار ہوتا ہے تو کبھی اپنے نفس کو تسلی دینے کے لیے بھی حوادث روزگار اور مصائب زمانہ کا بیان کرتا ہے کیونکہ یہ فطری بات ہے کہ دوسروں کے مصائب کے ذکر سے خود اپنا غم ہلکا ہوتا ہے اور طبیعت کو تسکین حاصل ہوتی ہے۔

اسی قسم کے مختلف اغراض و مقاصد ہیں جن کے ذیل میں جاہلی شعراء نے اپنے قصائد میں زہدیہ خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ کہیں کہیں تو زہد و قناعت کے بالکل متضاد امور یعنی لذت پرستی اور عیش کوشی کے ذکر کے درمیان زندگی کی بے ثباتی اور موت کی قاہری کا بیان ایسے موثر انداز سے کرنے لگتے ہیں کہ اگر سیاق و سباق سے صرف نظر کر کے ان اشعار کو پڑھا جائے تو بڑی شدت کے ساتھ زہدیہ جذبات دل کی گہرائی میں موجزن ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں قبیلہ بنو بکر کے مشہور جوان مرگ شاعر طرفہ بن العبد کا ذکر مثال کے طور پر کیا جا سکتا ہے جس کا شمار اصحاب معلقات میں ہے۔ طرفہ ایک عیش پرست، رند مشرب، بادہ خوار اور لاابالی قسم کا انسان تھا اس نے اپنے اشعار میں بھی لہو و لعب، عیش و تنعم اور رندی و مے نوشی کی بڑی تفصیل کی ہے چنانچہ اپنے مشہور معلقہ میں شعری روایت کے مطابق پہلے اس نے تشبیب اور اپنی ناقہ کی تفصیل بیان کی ہے اس کے بعد جہاں اس نے اپنی عیش پرستی، لذت طلبی اور مے نوشی کا تذکرہ بڑے جوش و خروش کے ساتھ کیا ہے وہیں درمیان میں زندگی کی ناپائیداری، عیش و نشاط کی بے ثباتی اور موت کی بے رحمی کا تذکرہ بھی بہت موثر انداز میں کیا ہے۔ اس سلسلہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

أرى الموت أعداد النفوس ولا أرى ... بعيداً غداً ما أقرب اليوم من غد

أرى العيش كنزاً ناقصاً كل ليلة ... وما تنقص الأيام والدهر ينفد

لعمرك إن الموت ما أخطأ الفتى ... لكالطول المرخى وثنياه باليد

متى ما يشأ يوماً يقده لحتفه ... ومن يك في حبل المنية ينقد

(میں دیکھتا ہوں کہ موت ایک ایک کا طالب ہے جس سے اتنا بچاؤ اور کل کو میں دور نہیں سمجھتا، آج میرے نزدیک کل سے بہت قریب ہے، میں سمجھتا ہوں کہ زندگی ایک خزانہ ہے جس میں ہر وقت کمی ہو رہی ہے اور زمانہ جس کو کم کرتا ہے وہ ایک دن ضرور ختم ہو جائیگا۔ تیری عمر کی قسم! موت کا تیر کسی انسان سے خطا نہیں کرتا، اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے گردن میں رسی باندھ کر چھوڑ دیا گیا ہو، لیکن رسی کے دونوں سرے ہاتھ میں ہوں، جب بھی چاہے اسے ہلاکت کی طرف کھینچ لے اور جو موت کی رسی میں بندھا ہوا ہے وہ لامحالہ کھینچ آئے گا۔)

أرى الموت لا يرعى على ذي جلالة ... وإن كان في الدنيا عزيزاً بمقعد

لعمرك ما أدري وإني لواجل ... أفي اليوم إقدام المنية أم غد

فإن تك خلفي لا يفتها سواديا ... وإن تك قدامي أجدها بمرصد

(میں دیکھتا ہوں کہ موت کسی کی عظمت و بزرگی کا کوئی لحاظ نہیں کرتی خواہ دنیا میں وہ کتنی ہی عزت والا ہو۔ تیری عمر کی قسم! میں خوفزدہ ہوں اور مجھے نہیں معلوم کہ میری موت آج ہی آ جائیگی یا کل۔ اگر موت میرے پیچھے ہے تو بھی میں اس سے بچ نہیں سکتا اور اگر میرے آگے ہے تو بھی کسی نہ کسی گھات میں مجھے اس سے دوچار ہونا ہے۔)

لیکن ان زہدیہ خیالات کے اظہار سے شاعر کا مقصد کیا ہے؟ اس کا علم سیاق و سباق کے مطالعہ سے ہو سکتا ہے۔ اس کے لیے اسی قصیدہ کے مندرجہ ذیل دو اشعار پیش کر دینا کافی ہے:

الا ایہذا اللائمی احضر الوغی وان اشہد اللذات ہل انت مخلدی

فان کنت لا تستطیع دفع منیتی فدعنی ابادرہا بما ملکت یدی

(اے میرے ملامت گر جو مجھے اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ میں لڑائیوں میں کود پڑتا ہوں اور لذتوں میں شریک ہوتا ہوں کیا تو مجھے ہمیشہ زندہ رکھ سکتا ہے۔ پس اگر تو موت کو مجھ سے دور نہیں کر سکتا تو مجھے چھوڑ دے کہ میں اپنے مال و دولت کو مرنے سے پہلے پوری طرح استعمال کر لوں۔)

ان دو شعروں کی مدد سے شاعر کا مقصد اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے، وہ درحقیقت آزادی و بے فکری کی زندگی بسر کرتا ہے، میدان جنگ میں بے محابا کود پڑتا ہے اور خطرات کی مطلق پروا نہیں کرتا، اور امن و امان کی حالت میں کھل کر داد عیش بھی دیتا ہے اور فردا کی کوئی فکر نہیں کرتا، ایک ملامتگر اس کی زندگی پر اسے ملامت کرتا ہے تو وہ اپنے ملامتگر کو خود اسی کی غلطی پر متنبہ کرتا ہے کہ اگر وہ جنگ میں بے جگری اور بے پروائی سے کام نہ لے تو بھی اسے موت سے کوئی نہیں بچا سکتا، اسی طرح اگر وہ دنیا کی لذتوں سے منہ موڑ لے تو بھی اسے حیات ابدی نصیب نہیں ہو سکتی، موت کا خوفناک پنجہ امیر و غریب، قوی و ضعیف، سخی و بخیل اور بہادر و بزدل ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرتا ہے، پس جب موت سے کسی طرح فرار ممکن نہیں ہے اور زندگی کی انتہا بہرحال فنا ہے جس کے بعد کچھ نہیں ہے تو بہتری اسی میں ہے کہ انسان چند روزہ زندگی کو خوشی خوشی گزار دے، اور دنیا کی لذتوں اور نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ لطف اٹھا لے۔ ان خیالات کا اظہار شاعر نے ایسے دلنشین انداز میں کیا ہے کہ کوئی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، جو شخص حیات اخروی کا قائل نہیں ہے اور جس کے نزدیک موت [illegible] شاعر کی تائید کرے گا اور جو حیات بعد الممات اور جزا و سزا پر یقین رکھتا ہے [illegible] ہے کہ دنیوی زندگی

کے احوال سے اخروی زندگی متاثر ہوگی۔ وجہ یہ ہے ان اشعار کا مطالعہ کرنے کا قارئین پر اثر ان کے قلب و ذہن میں نہایت تاثرات بیدار ہوں گے اور زندگی کی بے ثباتی کی تصویر تو بہرحال ہر ایک کی نگاہ کے سامنے پھر جائے گی۔

ایک دوسرے شاعر متمم بن نویرہ نے بھی ایک قصیدہ میں تقریباً یہی اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

صرمت زُنَيْبَةُ حبل من لا يقطع ... حبل الخليل وللأمانة تفجع[1]

(زنیبہ نے اس شخص کا رشتہ کاٹ دیا جو دوست کے رشتے کو منقطع نہیں کرتا اور وہ امانت کو ودیعت کرتی ہے)

متمم بھی اس قصیدہ میں تشبیب کے بعد پہلے اپنی ناقہ اور گھوڑے وغیرہ کے اوصاف بیان کرتا ہے پھر اپنی بادہ نوشی، عیش و مسرت اور لہو و لعب کا ذکر کرتا ہے، اسی اثناء میں اس کو موت یاد آجاتی ہے اور بڑے افسوس کے ساتھ اس کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے کہ وہ ایک دن جنگل میں مارا جائیگا اور درندے جانور اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھائیں گے اس وقت کوئی اس کا مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ پھر کہتا ہے:

ولقد غبطتُ بما الاقي حقبةً ... ولقد يمرُّ عليَّ يومٌ اشنعُ

(ایک عرصہ سے میں نعمت و لذت اور خوشحالی و کامرانی سے بہرہ یاب ہوں لوگ اس پر رشک کرتے ہیں، حالانکہ ایک بدترین دن بھی مجھ پر آنے والا ہے۔)

اس کے بعد شاعر کچھ سنبھل جاتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے اس دن سے نہ ڈرنا چاہیے کیونکہ وہ تو بہرحال آکر رہے گا جیسا کہ ماضی کے بڑے بڑے صاحب جاہ و اقتدار بھی اس سے بچ نہیں سکے، اور وہ قوم عاد، آل محرق، ملوک یمن اور تبع کا ذکر کرتا ہے کہ یہ سب موت کے شکار ہوئے اور آج ان کا کوئی نشان باقی نہیں ہے، چنانچہ وہ اس شعر پر قصیدہ ختم کرتا ہے:

فلئن بقيتُ لألحقنَّ بهم ... [illegible]

---

[1] المفضلیات، مصر ۱۳۲۴ھ ص ۲۸

ولیأتین علیک یوم مرة   یبکی علیک مقنعاً لا تسمع

(وفات سے دوچار ہونا ہے اس سے نہیں دس کا انتظار کر، تو ایک دن ضرور ہلاک ہوگا خواہ اپنے ملک میں ہو یا غیر ملک میں۔ ایک دن ضرور ایسا آئے گا جبکہ تیرا چہرہ کفن میں چھپا ہوگا، تجھ پر روئیں گے اور تو ان کی آواز بھی نہ سن سکے گا۔)

اسود بن یعفر نے ایک موقع پر یہ ترتیب پلٹ دی ہے، وہ قصیدہ کے آغاز ہی میں رنج و غم اور ضعف و پیری کا بیان شروع کر دیتا ہے، اور اسی ضمن میں متعدد دلکش انداز میں موت و فنا کی تصویر کھینچتا ہے، اس کے بعد ایام شباب کو یاد کر کے اپنے گذشتہ لہو و لعب، بادہ نوشی، سیر و شکار، گھوڑے اور ناقہ کا ذکر کرتا ہے، قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

نام الخلیّ وما أحسّ رقادی   والهمّ محتضرٌ لدیّ وسادی [1]

(فارغ البال ساتھی سو گیا اور مجھے ابھی تک نیند کا کچھ احساس نہیں ہے، غم میرے پاس حاضر ہے اور وہی میری تکیہ گاہ ہے۔)

پھر چند اشعار میں اپنے افکار و آلام اور حوادث و مصائب کا ذکر کر کے موت کا بیان اس طرح کرتا ہے

ان المنیة والحتوف کلاهما   یوفی المخارم یرقبان سوادی

لن یرضیا منی وفاء رهینة   من دون نفسی طارفی وتلادی

(موت اور ہلاکت دونوں بلندیوں سے مجھے تاک رہی ہیں اور یہ دونوں میری جان کے بجائے پرانی یا نئی مال و دولت کا کوئی فدیہ لے کر بھی جان چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔)

اس کے بعد چند اشعار میں گذشتہ زمانہ کے چند بادشاہوں اور شہزادوں اور ان کے قلعوں اور محلوں کا ذکر کر کے کہتا ہے:

جرت الریاح علی مکان دیارهم   فکأنما کانوا علی میعاد

(ان کے مقامات پر ہوائیں چلیں، گویا وہ ایک مقررہ وقت تک کے لئے تھے جو ختم ہو گیا۔)

---

[1] المفضلیات ص ۲۱۶

پھر انکی پوری جماعت ختم ہو گئی اور انکی تمام سلطنت و امارت کی یادگار کے متعلق سوال کرتا ہے:-

این الذین بنوا فطال بناؤهم ... وتمتعوا بالاهل والاولاد

(جنھوں نے بڑی بڑی عمارتیں بنوائی تھیں اور جو بہت اونچی ہو گئی تھیں اور جو اپنے اہل و عیال اور اولاد سے متمتع تھے وہ سب کہاں گئے؟)

پھر خود ہی اس طرح جواب دیتا ہے:-

فاذا النعیم وکل ما یلهی به ... یوما یصیر الی بلی ونفاد

(یہ سب فنا ہو گئے اور اسی طرح ہر نعمت و لذت جس سے لوگ متمتع ہوتے ہیں ایک دن فنا کی نذر ہو جائیگی)

موت و فنا کا ذکر متعدد جاہلی شعراء نے کیا ہے، بعضوں نے تفصیل سے بھی کام لیا ہے، لیکن ممزق عبدی نے اس سلسلہ میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس میں وہ بالکل منفرد ہے، اس نے تخیلی طور پر ان معاملات کی عکاسی کی ہے جو مرنے کے بعد اسکے ساتھ کیے جائیں گے چنانچہ کہتا ہے:

هل للفتی من بنات الدهر من واق ... ام هل له من حمام الموت من راق [1]

کانني قد رماني الدهر عن عرض ... بنافذات بلا ريش وافواق

اذ غمضوني وما اغمضت من وسن ... وقال قائلهم مات ابن خذاق

قد رجلوني وما رجلت من شعث ... والبسوني ثيابا غير اخلاق

وطيبوني وقالوا ايما رجل ... وادرجوني كاني طي مخراق

وارسلوا فتية من خيرهم حسبا ... ليسندوا في ضريح الترب اطباقي

(کیا انسان کو حوادث دہر سے بچانے والا کوئی ہے؟ کیا اسے موت کے پنجے سے چھڑانے والا کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا کوئی ہے؟ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نے اچانک مجھ پر بغیر پر کے تیر چلائے ہیں اور نوک ... جب انہوں نے میری آنکھیں بند کر دیں ...

---

[1] المفضلیات، ص ۳۰۰

بیٹا نہیں ہوں؟ یقیناً میں اور کمزور دانت نکل آئے کہ ابن مفقود چل بسا، پھر لوگوں نے میرے بالوں میں کنگھی کر کے ان کو سنوارا، یہ اس وجہ سے نہیں کیا گیا کہ میرے بال پراگندہ تھے، پھر انھوں نے مجھے نیا لباس پہنایا، پھر خوشبو لگائی اور کہا کیسا بھلا آدمی تھا، اس کے بعد مجھے کپڑوں کی تہوں میں لپیٹ دیا اور میں اس کپڑے کے مانند ہو گیا جس کو بچے کھیلنے کے لیے لپیٹ کر کوڑے کی طرح بنا لیتے ہیں، پھر بہترین حسب والے جوانوں کو بھیجا کہ میرے جسم کو قبر کے سپرد کر دیں۔)

جاہلی قصائد عام طور پر ایسے مقامات اور کھنڈروں کے نشانات کے ذکر سے اس طرح شروع ہوتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے بھی یہاں قیام کیا تھا، اور اب اثنائے سفر میں اتفاقاً دوبارہ یہاں آگیا ہے اور ان نشانات کو دیکھ کر پرانی یاد اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی ہے، یہ مذاق عرب شعراء کے لیے بالکل واقعی اور حقیقی ہے، کیونکہ عرب قبائل ہمیشہ خانہ بدوشوں کی طرح چراگاہوں اور چشموں کی تلاش میں گھومتے رہتے تھے، چند روز کسی چراگاہ میں قیام کرتے، پھر وہاں سے کوچ کر جاتے، اس عارضی قیام کے زمانہ میں مختلف قبیلوں کے درمیان محبت اور عداوت کے متعدد واقعات رونما ہوتے، لہٰذا جب کبھی دوبارہ اس مقام سے ان کا گذر ہوتا تو پرانی یادوں کا تازہ ہو جانا قدرتی بات تھی، چنانچہ ان کھنڈروں کو دیکھتے ہی شاعر کی نگاہوں کے سامنے گذشتہ زندگی کی تصویر کھنچ جاتی ہے، وہ بچے کھچے آثار میں سے ایک ایک کو غور سے دیکھتا ہے اور قرب و جوار کی پہاڑیوں، ٹیلوں اور درختوں پر نظر ڈالتا ہے، ان سے اپنی محبوبہ اور بچھڑے ہوئے ساتھیوں کے متعلق سوال کرتا ہے کہ وہ سب کہاں گئے، اس طرح خود بھی روتا ہے اور دوسروں کو بھی رلاتا ہے، پھر اپنی محبت کے واردات اور جذبات کی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا ہے، یہی حصہ قصیدہ کی تمہید یا تشبیب کہلاتا ہے، اور اکثر قصائد کے شروع میں کم و بیش یہی مضمون ملتا ہے، لیکن کبھی کبھی شاعر اس مضمون کو زیادہ طویل کر دیتا ہے اور اس کے ذیل میں انقلاباتِ زمانہ، حوادثِ دہر اور گردشِ ایام وغیرہ

...ی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری کا نقشہ سامنے آجاتا ہے،
...کا ایک قصیدہ پیش کیا جاتا ہے جس کا مطلع یہ ہے:-

...لحوب　　　　فالقطبیات فالذنوب[1]

(...ہوگیا اور قطبیات اور ذنوب بھی سنسان نظر آتے ہیں۔)

اسی طرح متعدد مقامات کا ذکر کرکے کہتا ہے کہ یہ سب انسانوں سے خالی ہوگئے اور اب یہاں جنگلی جانور گھومتے پھرتے ہیں، حوادث نے ان کے حالات کو متغیر کر دیا ہے، یہ دنیا بھی ایسی جگہ کہ یہاں جو کوئی آتا ہے لوٹ لیا جاتا ہے یا قتل کر دیا جاتا ہے یا ہلاک ہوجاتا ہے، موت ہی اس دنیا کی اصلی وارث ہے، اگر کوئی جوانی میں موت سے بچ کر بڑھاپے تک پہنچ بھی گیا تو بڑھاپا تو خود ایک عیب ہے۔

اس کے بعد چند اشعار میں مختلف تشبیہات کے ذریعہ اپنی اشکباری و گریہ وزاری کو بیان کرکے پھر اسی مضمون کی طرف عود کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر یہ مقامات متغیر ہوگئے اور یہاں کے بسنے والے منتقل ہوگئے یا آبادی کے بعد اب یہاں کی فضا ویران ہوگئی اور خشک سالی اور قحط کے آثار نمودار ہوگئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، اس کی توجیہ وہ اس طرح کرتا ہے:

فکل ذی نعمة مخلوس　　　　وکل ذی أمل مکذوب
وکل ذی ابل موروث　　　　وکل ذی سلب مسلوب
وکل ذی غیبة یؤوب　　　　وغائب الموت لا یؤوب

(یہاں ہر نعمت والے کی نعمت چھین لی جاتی ہے اور ہر امید والے کی امید باطل کر دی جاتی ہے، ہر اونٹوں والے کے اونٹ دوسرے کی وراثت میں چلے جاتے ہیں اور ہر سامان والے کا سامان لوٹ لیا جاتا ہے، اور ہر غائب ہونے والا ایک دن واپس آجاتا ہے لیکن موت جس کو غائب کر دے وہ کبھی واپس نہیں آتا۔)

---

[1] دیوان عبید بن الابرص، بیروت، ۱۹۵۸ء ص ۲۳

اس سلسلہ میں مرقش اصغر کے اس قصیدہ پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لینا مناسب ہوگا، جو اس طرح شروع ہوتا ہے :-

لابنة عجلان بالجو رسوم — لم يتعفين والعهد قديم[1]

لابنة عجلان إذ نحن معاً — وأي حال من الدهر تدوم

(مقام جو میں یہ بنت عجلان کے گھروں کے نشانات ہیں جو ابھی بالکل محو نہیں ہوئے ہیں اگرچہ کافی زمانہ گذر چکا ہے۔ یہ بنت عجلان کے اس زمانے کے گھر ہیں جبکہ ہم یہاں ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور زمانہ کی کوئی حالت ہمیشہ قائم نہیں رہتی۔)

اس کے بعد افسوس کے ساتھ کہتا ہے کہ اب یہ مقام ویران ہو گیا حالانکہ اس سے قبل یہاں بڑے بڑے اونٹوں کے گلے والے لوگ رہتے تھے، اب وہ سب ہلاک ہو گئے، پھر اپنی محبوبہ بنت عجلان کی تعریف و توصیف میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کے بعد اپنی شب تنہائی اور غم جدائی وغیرہ کا ذکر کر کے آخر میں پھر حوادث دہر اور انقلابات زمانہ کا بیان کرنے لگتا ہے، اس مقام کے چند اشعار یہ ہیں :-

كم من أخي ثروة رأيته — حل على ماله دهر غشوم

ومن عزيز الحمى ذي منعة — أضحى وقد أثرت فيه الكلوم

بينا أخو نعمة إذ ذهبت — وحولت شقوة إلى نعيم

وبينا عامر ذو شقة — إذ حل رحلا وإذ خف المقيم

ولقد غائل يقوله — يا بنة عجلان من وقع الحتوم

(کتنے دولتمندوں کو دیکھا جن کے مال و دولت کو زمانے اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا، اور کتنے عالی مقام اور عزت و رفعت والے لوگ گذر گئے جن پر اب زخموں کے نشانات ہیں۔)

---

[1] المفضليات، ص ۲۴۰

دیکھتے دیکھتے کتنے نعمت والوں کی نعمت چلی گئی اور نعمت کی بجائے [illegible]

مسافر نے کجاوہ کھول دیا اور اقامت گزیں ہو گیا اور جو مقیم تھا وہ سفر پر روانہ ہو گیا ہے۔

بنت عجلان! انسان کے پیچھے ایک ہلاک کرنے والا لگا ہے جو اسے ضرور ہلاک کرے گا،

اور ایک دن یقیناً موت اس کو پکڑ لے گی۔)

جاہلی شعرا جب اپنی سخاوت و فیاضی پر فخر کرتے ہیں تو اس مضمون کے تحت بھی کبھی کبھی زوال نعمت و مال اور بے ثباتی احوال کا بیان کرنے لگتے ہیں۔ جود و سخا کا مضمون جاہلی شاعری میں کثرت سے ملتا ہے لیکن اس کے اسالیب بیان مختلف ہوتے ہیں، ایک اسلوب یہ ہے کہ شاعر پہلے کسی ملامتگر کو مخاطب کرتا ہے اور ملامت و نصیحت کا فریضہ عام طور پر کسی عورت کے سپرد کرتا ہے جو شاعر کو اس کی فضول خرچی پر ملامت کرتی ہے، اور نصیحت کرتی ہے کہ وہ اس قدر بے پروائی سے دولت صرف نہ کرے بلکہ احتیاط سے کام لے۔ پھر شاعر اس کو جواب دیتا ہے کہ وہ بذل مال کے ذریعہ شہرت حاصل کر رہا ہے تاکہ مرنے کے بعد بھی اس کا نام زندہ رہے، کیونکہ ایک دن وہ ضرور ہلاک ہوگا جس طرح اس سے پہلے کے لوگ ہلاک ہوئے، اس وقت اس کی دولت پر اس کا کوئی تصرف نہ ہوگا، وہ اس کے وارثوں کے قبضہ میں ہوگی اور اس کے کچھ کام نہ آئے گی۔ اس مضمون کو متعدد شعرا نے اپنے اپنے انداز میں بیان کیا ہے۔ یہاں مثال کے طور پر لبید کا ایک قصیدہ پیش کیا جاتا ہے جس میں شروع سے آخر تک اسی مضمون کی جھلک پائی جاتی ہے۔ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے:

أعاذل قومي فاعذلي الآن أو ذري ... فلست وإن أقصرت عني بمقصر[1]

أعاذل [illegible] ... [illegible]

[illegible]

[illegible]

---

[1] [illegible] ص ۲۲

میں کے ہمیشہ شکر گزار ہوں دل اس کے ذریعہ مدح و ثنا اور شہرت و عزت حاصل کرتا ہوں،
کیونکہ میں ان لوگوں سے زیادہ زندہ رہنے والا نہیں ہوں جو مجھ سے پہلے زندگی گزار چکے۔
یہاں سے یہی مضمون تقریباً تیس بتیس اشعار تک مسلسل چلتا ہے، شاعر متعدد اشخاص کے
نام گناتا ہے اور ان کی موت و ہلاکت کا ذکر کرتا ہے جس کے ذریعہ وہ ملامت گر کے سامنے
فنا اور نیستی کی تصویر پیش کر کے اس کو بتانا چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہی صحیح ہے یعنی
مال خرچ کرنا ہی بہتر ہے، پھر کہتا ہے کہ ہم اس دنیا کی بہت ہی کمزور مخلوق ہیں، اور
آج جہاں بھی ہم قیام کرتے ہیں ہم سے پہلے لوگ وہاں مقیم رہ چکے ہیں، آخر میں قصیدہ
اس طرح ختم ہوتا ہے۔

وانا ما اخواننا قد تتابعوا	لکالمغتدی والرائح المتعجل
هل للنفس الا متعة مستعارة	تعار فتأتی ربها فرط اشهر

(ہمارے بھائی جو ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ان کی اور ہماری مثال ایسی ہے جیسے
صبح کو جانے والا اور شام کو جانے والا۔ جان محض ایک مستعار چیز ہے جو عاریت کے طور پر
دی جاتی ہے، پھر کچھ عرصہ کے بعد اپنے مالک کے پاس واپس چلی جاتی ہے۔)

حوادث و مصائب، تباہی و بربادی اور موت و فنا کے بیان کے لیے ایک وسیع میدان
مرثیہ بھی ہے، جاہلی شاعری کا معتد بہ حصہ مراثی پر مشتمل ہے، شعراء عموماً اپنے اعزہ و اقرباء یا سرداروں
کے مرنے پر مرثیہ کہتے تھے جس میں اپنے رنج و غم کا اظہار اور متوفی کے اخلاق و عادات کی تعریف و
توصیف کرتے، اگر متوفی مقتول ہوتا تو طلب انتقام کے لیے جوش دلاتے اور اگر کسی حادثہ یا
مرض سے اس کی موت واقع ہوتی تو حوادث زمانہ اور گردش روزگار کا ذکر کر کے قضا و قدر
کے آگے سر جھکا دیتے اور مرثیوں میں انسان کی بے بسی اور بیچارگی کا اظہار طرح طرح سے کرتے تھے،

لبید نے اپنے بھائی اربد کے مرنے پر بہت سے مرثیے کہے ہیں، ان میں سے شعر ایک کو مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے :۔

بلینا وما تبلی النجوم الطوالع ۔۔۔ وتبقی الجبال بعدنا والمصانع[۱]

(ہم فنا ہو جائیں گے اور یہ طلوع ہونے والے ستارے فنا نہ ہوں گے۔ یہ پہاڑ اور قلعے ہمارے بعد بھی اسی طرح باقی رہیں گے۔)

اس موقع پر اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ جاہلی شعراء کے افکار و خیالات عام طور پر براہ راست زمانہ کے تجربات اور دنیا کے مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں، ان میں زیادہ گہرائی یا پیچیدگی نہیں ہوتی، بلکہ وہ عموماً بہت سادہ، عام فہم اور بدیہی اور ان کی صحرائی زندگی کے حسب حال ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کی نگاہوں کے سامنے دن میں پہاڑوں کے طویل سلسلے اور رات میں آسمان پر بے شمار ستاروں کے جلوے ہی ہوتے تھے، جن کے استقلال و استحکام کو دیکھ کر انسانی زندگی کی ناپائداری کا خیال آنا بالکل فطری بات ہے، کون انسان ہے جس نے رات میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کو دیکھ کر کبھی یہ نہ سوچا ہو کہ ایک دن ایسا آئے گا جب کہ وہ نہ ہوگا اور ستارے اسی طرح چمکتے ہوں گے۔

اس کے بعد شاعر اپنے بھائی کی موت پر افسوس کرتا ہے، پھر یہ کہہ کر اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر زمانے نے ہمارے درمیان جدائی پیدا کر دی تو کوئی رنج کی بات نہیں ہے کیونکہ زمانہ کا تو ایک دن ہر انسان کو شکار ہونا ہی پڑتا ہے، اس مضمون کو اس نے متعدد اسالیب میں پیش کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں،

وما الناس الا کالدیار واهلها ۔۔۔ بها یوم حلوها وغدوا بلاقع

(لوگوں کی مثال دیار اور اہل دیار کی مانند ہے کہ جس دن وہاں قیام کرتے ہیں، اور کل وہ ویران ہو جاتے ہیں۔)

وما المرء الا کالشهاب وضوئه ۔۔۔ یحور رمادا بعد اذ هو ساطع

(انسان تو بس شہاب کے مانند ہے جو روشن ہوتا ہے پھر خاکستر ہو جاتا ہے)

---

۱ دیوان لبید، ص ۲۱

وما المال والأهلون إلا ودیعة ولا بد یوماً أن ترد الودائع

(مال اور اہل و عیال سب امانت ہیں اور امانتوں کا ایک دن واپس کرنا ضروری ہے۔)

ویمضون أرسالاً ونخلف بعدهم کما ضم أخری التالیات المشائع

(لوگ گروہ کے گروہ چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے پیچھے ایسے ہی ہیں جیسے اونٹوں کی قطار کے پیچھے ان کا ہانکنے والا ہو)

وما الناس إلا عاملان فعامل یتبّر ما یبنی وآخر رافع

(لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو عامل ہوں ایک تو اپنی تعمیر کو ڈھا رہا ہو اور دوسرا بلند کر رہا ہو)

زندگی کی ناپائداری اور ہلاکت و بربادی کی تصویر مرثیوں میں اکثر اس طرح بھی ملتی ہے کہ شعرا اپنی تسکین خاطر کے لیے گذشتہ زمانہ کے جابر و قاہر بادشاہوں اور قوموں کا حال بیان کرتے ہیں اور کبھی ان جانوروں اور پرندوں کا ذکر کرتے ہیں، جو زیادہ طاقتور یا طویل العمر ہوتے ہیں، مثلاً شیر، عقاب، اژدہا، پہاڑی بکرا اور جنگلی گدھا وغیرہ۔ پھر ان کی موت و ہلاکت کا بیان کرتے ہیں، اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جب ایسی مخلوقات بھی موت سے نہ بچ سکیں تو کون بچ سکتا ہے، اس طرح وہ اپنے غم کو تسکین دیتے ہیں۔

اس قسم کا مضمون اکثر مرثیوں میں پایا جاتا ہے، یہاں مثال کے طور پر صرف ابو ذویب ہذلی کے ایک مرثیہ کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے، جسے اس نے اس وقت کہا تھا جب اس کے پانچ بیٹے ایک ہی سال کے اندر طاعون کی وبا میں مر گئے تھے، مطلع اس طرح ہے:۔

أمن المنون وریبها تتوجع والدهر لیس بمعتب من یجزع[1]

(کیا تو زمانہ اور اس کی مصیبتوں سے گھبرا رہا ہے، زمانہ تو کسی کے درد کو دور نہیں کرتا خواہ وہ کتنا ہی آہ و بکا اور جزع فزع کرے)

پھر یکایک اپنے درد و غم سے ہٹ کر وہ ظلم کا بیان شروع کر دیتا ہے، اس سلسلہ کے چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں:

---

[1] جمہرۃ اشعار العرب، بیروت ۱۹۶۳ء ص ۲۲۱

ولقد حرصت بأن أدافع عنهم — فإذا المنية أقبلت لا تدفع

(میں نے ان کی مدافعت کی خواہش کی تھی، مگر میں نے دیکھا کہ جب موت آ جاتی ہے تو اس کو کسی طرح بھی نہیں روکا جا سکتا۔)

وإذا المنية أنشبت أظفارها — ألفيت كل تميمة لا تنفع

(جب موت نے اپنے پنجے چبھو دیے تو میں نے ہر تعویذ کو بے سود پایا۔)

پھر اپنے صبر و تحمل کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:-

والنفس راغبة إذا رغبتها — وإذا ترد إلى قليل تقنع

(نفس کو اگر تم ترغیب دو تو اس کے اندر رغبت پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اسے تھوڑی چیز پر لگا دو تو وہ قانع بھی ہو جاتا ہے)

اسکے بعد اس مرثیہ میں تین حصے نمایاں طور پر آتے ہیں اور ہر حصہ کی ابتدا اس مصرع سے ہوتی ہے۔

ع والدهر لا يبقى على حدثانه — یعنی زمانہ کے حوادث سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

پہلے حصہ میں شاعر ایک طاقتور جنگلی گدھے کا بیان کرتا ہے جو جنگل میں آزادی سے گھومتا تھا، لیکن اچانک ایک شکاری نے اس کو تیر مارا اور وہ اسی وقت ہلاک ہو گیا۔

دوسرے حصہ میں ایک جنگلی بیل کا ذکر ہے، جو رات بھر بارش سے بچنے کے لیے ایک درخت کے نیچے کھڑا رہا، صبح ہوتے ہی کچھ شکاری کتوں نے اس پر حملہ کیا، اس نے ان کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر کتوں کے مالک کے تیر سے وہ بھی ہلاک ہو گیا۔

تیسرے حصہ میں ایک بہادر آدمی کا حال بیان کیا ہے جس کا مقابلہ ایک دوسرے بہادر سے ہوا، اس نے اپنی بہادری کا کمال دکھایا لیکن آخر کار زخمی ہو کر گر پڑا اور ہلاک ہو گیا۔

اس طرح شاعر نے عجیب و غریب انداز میں موت و ہلاکت کا نقشہ کھینچا ہے اور اس حقیقت کو بڑی خوبصورتی سے واضح کیا ہے کہ موت ہر حال میں غالب ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔

(باقی)

شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز

۲- ضلع بریلی (۳)

از جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری لکچرار لکھنؤ یونیورسٹی

(۸)

متذکرۂ بالا شعراء (جن میں سے زیادہ تر گذشتہ صدی کے آخری زمانے یا موجودہ صدی کے ابتدائی سالوں میں گزرے ہیں) کے علاوہ دورِ جدید میں بھی بریلی میں کئی خوش فکر شعراء تھے، اور چند اب بھی موجود ہیں۔ مولانا سید عبدالودود مرحوم یہاں کے ممتاز شاعر اور اہلِ قلم تھے، جن کا ۱۹۳۳ء میں انتقال ہوا، ان کا مجموعۂ کلام منتخبِ محمودی مولانا عبدالشکور صاحب کے مقدمہ کے ساتھ نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے، مرحوم نہایت مذہبی بزرگ تھے، عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں پر قدرتِ کامل حاصل تھی، برجستہ شعر کہتے تھے، اور قلم برداشتہ نثر لکھتے تھے، بریلی کے ممتاز قومی رہنما اور اسلامیہ کالج بریلی کے بانی تھے، ولی محمد خاں عزیز بریلوی، مشتاق حسین صاحب عبدالودود صاحب کی صحبت میں فیض اٹھانے والوں میں تھے، معمولی [illegible] تھے مگر بہت ہی گوشہ نشین بزرگ تھے، بہت کم شعر کہتے تھے لیکن جو کچھ کہتے تھے، خوب کہتے تھے، ان کا کلام نہایت پُر اثر ہوتا تھا، ۱۹۶۲ء میں ان کا انتقال ہوا، مشتاق صاحب نے عین جوانی میں وفات پائی، بڑے طباع نوجوان تھے، کچھ [illegible] بھی رہے تھے، صاحب بریلوی حافظ رحمت خاں کی اولاد میں تھے، عین جوانی میں وفات پا گئے۔ بسمل (؟) صابری

اگر زندہ رہتا تو رشکِ عرفی اور فخرِ غالب ہوتا۔[1] ساجد نقاش افزا نامی ایک کتاب کے مصنف بھی ہیں،

کیفی بریلوی بھی موجودہ زمانے کے شاعر ہیں، محکمۂ ریلوے میں ملازم ہیں، مشاعروں کی جان سمجھے جاتے ہیں۔[2]

شیام موہن لال جگر بریلوی کنھیا لال دل مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے ہیں، ۱۸۹۰ء میں بریلی میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۶ء میں بریلی کالج سے بی اے پاس کیا اور ۱۹۱۸ء میں نائب تحصیلدار ہو گئے، مولانا ہادی عزیز لکھنوی کے ارشد تلامذہ میں ہیں اور بریلی کے اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں، ۱۹۵۲ء میں اپنے صاحبزادے کے پاس جو میرٹھ کالج میرٹھ میں لکچرر ہیں، میرٹھ چلے گئے اور اب تک وہیں مقیم ہیں، ان کی نثر و نظم میں متعدد تصانیف ہیں جو شائع بھی ہو چکی ہیں، ان میں شعری مجموعے درج ذیل ہیں،[3] پپیہا اور پی کہاں، رنگ و بو، گلدستہ درپن، پیام ساوتری، انتخاب غزلیات، اور رس (رباعیات کا مجموعہ)۔ جگر کے چند اشعار بطور نمونۂ کلام درج ذیل ہیں:-

کبھی جھنکے سے ہیں وہ با جگر کہ تھا محو خواب میں رات بھر ۔۔۔ ہوئیں کیا بشارتیں صبح دم کہ اٹھا تو زمزمہ خواں اٹھا

کیا بجگر کہوں زباں سے تو مہرباں نہیں ۔۔۔ لیکن مرا نصیب کہ میں شادماں نہیں

ناوکِ غم سے مجھے سینہ سپر ہونے دو ۔۔۔ اشک کی نذر دل و جان و جگر ہونے دو

دل نے ازل میں کہہ کے یہ ویرانے لیا ۔۔۔ کس سے اٹھیں گے ناز چمن میں بہار کے

تیری رحمت سے نا امید نہیں ۔۔۔ اپنی محرومیوں سے ڈرتا ہوں

لا رہا ہوں انھیں تصور میں ۔۔۔ اپنے خاکہ میں رنگ بھرتا ہوں

بے خبر حیات تھا غم نے جگا دیا ۔۔۔ زیست کا دل نکل موت کا آسرا دیا

حیف کہ بیکسی کی شرم آج جگر زندگی ۔۔۔ ابھرے ہوئے سر [illegible]

---

[1] وہ جنھیں کوئی نہیں جانتا۔ مصنف الہ رضا بدر، مکتبہ دینیات

[2] یادِ رفتگاں (پیش نظر)

رباعی

جب رنج سے دل نڈھال ہو جاتا ہے　　جب حد سے سوا ملال ہو جاتا ہے

محویت غم سے دل کی گہرائی میں　　محسوس ترا وصال ہو جاتا [illegible]

رباعی

یا زیست کو اک دردِ مبہم سمجھیں　　یا بانیٔ بیداد تجھے ہم سمجھیں

غم کی یورشیں اور اتنی یورش یارب　　تیری قدرت کو کس طرح کم سمجھیں

زمانہ حال کے ایک دوسرے شاعر حضرت وسیم بریلوی ہیں، وہ بریلی کالج بریلی میں اردو کے لکچرار ہیں، اور موجودہ زمانے کے بریلی کے ممتاز شعرا میں ان کا شمار ہے۔ اچھا کہتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں، جہاں تک راقم الحروف کو علم ہے، ان کا ایک مجموعۂ کلام زیر طبع ہے۔

موجودہ صدی میں بریلی میں شاعروں کے علاوہ کچھ شاعرات بھی ایسی گذری ہیں جن کے ذکر کے بغیر بریلی کے اردو ادب کے متعلق مضمون نامکمل رہتا ہے، ان میں زینت بیگم عبرت ڈاکٹر محبوب داد خاں کی بیٹی تھیں غالباً [illegible]ء میں بریلی میں پیدا ہوئی تھیں، کلام ڈپٹی اضغر کا ہے، نمونہ درج ذیل شعر ہے[1]:-

نہ ہوتا دل تو کوئی کیوں کسی پر مبتلا ہوتا　　حسیں ہوتے تو کیا تھا دلربا ہوتے تو کیا ہوتا

شہزادی تیمور جہاں حجاب، دہلی کے تیموری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، وہ اپنے شوہر کے ساتھ عرصہ تک بریلی میں مقیم رہیں، مغلیہ سلطنت کی بربادی اور مسلمانوں کی تباہی ان کے پسندیدہ مضمون ہیں، انگریزی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں دستگاہ رکھتی تھیں، اقبال کے رنگ کی شیدائی تھیں[2]، ان کی دو رباعیاں درج ذیل ہیں:-

---

[1] تذکرۂ شاعرات اردو، ص ۱۰۵ [2] ایضاً ص ۲۲۵

حیرت کہ ذرہ دہر کے والی ہم ہیں ــــ افسوس کہ وقف پائمالی ہم ہیں
تیمور کے ہاتھوں نے لگایا تھا جسے ــــ اس نخل کی سوکھی ہوئی ڈالی ہم ہیں

تھے کبھی سلطنت ہند کے ہم بھی حقدار ــــ رشک اسکندر و قیصر تھا ہمارا معیار
پلٹی قسمت نہ رہا عہد حکومت تیمور ــــ وہی ہم آج ہیں رنجور و اسیر افکار

آمنہ خاتون عفت بریلی کے ایک ذی علم خاندان کی فرد ہیں، ۱۹۰۳ء میں سہارنپور میں پیدا ہوئیں، لیکن اپنے والد کی ملازمت کی وجہ سے الہ آباد میں پرورش ہوئی۔ نمونۂ کلام حسب ذیل ہے:

میں ہر ذرے میں تجھکو پا رہا ہوں ــــ مجھے دیر و حرم سے واسطا کیا
مرے اعمال نے کشتی ڈبو دی ــــ خدا یا تھا ئے دست ناخدا کیا
ہر اک آنسو ہے روح عشق عفت ــــ ذر و گوہر سے اس کو واسطا کیا

آمنہ خاتون عفت کی چھوٹی بہن سپہر آرا خاتون پنہاں کا ذکر فارسی گو شعراء کے ساتھ کیا جا چکا ہے، اردو میں وہ طالب الہ آبادی سے مشورۂ سخن کرتی تھیں، ان کی عمر کا زیادہ حصہ الہ آباد میں بسر ہوا، جہاں وہ اپنے والد کے زمانۂ حیات میں مقیم تھیں اور ۱۹۲۵ء میں اپنی شادی کے بعد مستقلاً رہنے لگیں، ۱۹۲۹ء میں ایک مجموعہ نظم اشک خونی اپنے والد کی یاد میں شائع کیا، نظموں اور افسانوں کے مجموعے بھی مرتب کیے تھے، اردو شاعری سے زیادہ فارسی شاعری سے لگاؤ تھا، اردو شاعری کا نمونہ حسب ذیل اشعار ہیں:

تجلیوں نے نقاب اٹھا لیوں پہ آیا حسین تبسم ــــ تو دیدۂ آئینہ جمال تجھے وہ خود بتا رہے ہیں
پیچ و تاب زلف پیچاں غم بہ غم ــــ کون کہتا ہے جنون ناکام ہے

بلقیس جمال مالک عفت اور پنہاں کی چھوٹی بہن ہیں، ان کا ذکر بھی فارسی گو شعراء کے

۱؎ تذکرہ شاعرات اردو، ص ۲۶۵ ۲؎ ایضاً ص ۲۰۵

سلسلہ میں کیا جا چکا ہے۔ یہ سنہ [illegible] میں بریلی میں پیدا ہوئیں۔ الٰہ آباد میں زندگی کا ابتدائی دور گزرا۔ انکے تین شعر بطور نمونۂ کلام پیش ہیں :-

عدم سے جوشش وحشت میں تا وجود آئی — کہاں سے کھینچ کے مجھکو قضا کہاں لائی
جمالِ زاد کے جانب نگاہ کیوں اٹھے — نظر کو ان کے ہے اندیشۂ مسیحائی
چاند ہو ماند چاندنی پھیکی — غیرتِ ماہتاب آ تو سہی

حسن آرا غزالہ عفت، پنہاں اور بلقیس جمال کی سب سے چھوٹی بہن ہیں، سنہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئیں اور سنہ ۱۹۲۷ء میں ازدواجی زندگی میں منسلک ہوئیں، غزلوں کا ایک مجموعہ بعنوان غزل شائع ہو چکا ہے نظمیں اور غزلیں خوب کہتی ہیں[1]، چند شعر پیش ہیں :

اے ظلمتِ شامِ جنوں وجہ پریشانی نہ پوچھ — اے پرتوِ سوزِ دروں تمہید حیرانی نہ پوچھ
میں اک حجابِ درد ہوں کیا پوچھنا [illegible] غم — ہوں خوگرِ مشقِ الم اشکوں کی ارزانی نہ پوچھ
عارض ہیں برقِ خندہ زن اک اس طرف اک اس طرف — آنکھیں ہیں دو نرگس چمن اک اس طرف اک اس طرف
پلکوں کی جنبش اک طرف آنکھوں کی شوخی اک طرف — دو ساحری ہیں خندہ زن اک اس طرف اک اس طرف

لوٹ لے میرا متاعِ زندگی — اے نگاہِ ناز یہ پیغام ہے

زہرہ خاتون زرین خان بہادر خوب داد خاں کی نواسی ہیں، اگرچہ خود ان کا قیام زیادہ تر گوالیار میں رہا، شاعری میں اپنی بڑی بہن بلقیس فاطمہ بیگم کی شاگرد ہیں[2]، ان کا ایک شعر پیش ہے :

یہ زخمِ دل ابھی ابھی [illegible] — کہ ایک چوٹ پڑی اور شیشۂ دل پہ

مہ جبیں جو نازش کے والد سید ریاض الحسن سیرم انسٹی ٹیوٹ انبٹ نگر میں ڈپٹی ڈائرکٹر تھے، نازش سنہ [illegible] میں پیدا ہوئیں اور نہایت کم عمری سے شاعری کی طرف متوجہ ہوئیں، قصیدہ،

---

[1] تذکرہ شاعرات اردو، ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۸۴

نعت، منقبت وغیرہ سب ہی کچھ کہتی تھیں مگر شاعرہ موصوفہ [illegible]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عمر وفا کرتی تو ایک عظیم شاعرہ ہوتیں، افسوس ہے کہ ان کا کلام

بھی تلف ہو گیا[1]، یہاں ان کا صرف ایک شعر پیش ہے،

کہیں گریہ ہو رہا ہے کہیں رقص شادمانی   ہے عجیب حیرت افزا یہ طلسم زندگانی

دوسری جگہوں کی طرح بریلی میں بھی نثر نگاروں کی تعداد شعراء کی بہ نسبت بہت کم ہے یہاں کے نثر نگار دو گروہوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں، ایک گروہ ان حضرات کا ہے جنہوں نے اپنی علمی و ادبی سرگرمیاں صرف مذہب تک محدود رکھیں، دوسرا گروہ ان نثاروں کا ہے جنہوں نے مذہبی علوم کے علاوہ دوسرے مباحث پر تصانیف کیں، مذہبی لٹریچر میں پہلی تصنیف غالباً مفتی عنایت احمد کا بریلوی کا فرائض سے متعلق ایک رسالہ علم الفرائض و ملخصات الحساب ہے جو ۱۲۶۲ھ (مطابق ۱۸۴۶ء) میں تصنیف کیا گیا، اسی زمانہ میں بریلی میں علماء کا ایک خاندان ابھر رہا تھا جس کے بانی مولوی رضا علی خاں صاحب (پیدائش ۱۲۲۴ھ مطابق ۱۸۰۹ء وفات ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۸۶۵ء) خلف مولوی کاظم علی خاں صاحب بن محمد اعظم شاہ ابن محمد سعادت یار خاں [illegible] تھے[2]، اس خاندان سے تعلق رکھنے والے علماء کی زیادہ تصانیف مناظرہ پر مشتمل ہیں، مولوی رضا علی خاں صاحب کے صاحبزادے مولانا نقی علی خاں صاحب (پیدائش ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۰ء وفات ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۸۰ء) ایک خاص مکتب فکر کے بانی تھے، انھوں نے اپنی تمام عمر تصنیف اور رد بدعت میں صرف کر دی، عربی، فارسی اور اردو میں بہت سی کتابوں اور رسائل کے مصنف ہیں، جن میں چند یہ ہیں[3] الکلام الاوضح فی تفسیر الم نشرح یہ ایک ضخیم تصنیف ہے اور علوم کثیرہ پر مشتمل ہے، وسیلۃ النجاۃ (یہ رسول مقبول کی سوانح حیات ہے)

---

۱ تذکرہ شاعرات اردو ص ۲۲۰ ۲ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۴ - حیات اعلیٰ حضرت [illegible]

۳ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۴۰

سرور القلوب بذکر المحبوب، جواہر البیان فی اسرار الارکان، اصول الرشاد، ہدایۃ البریہ
الی الشریعۃ الاحمدیہ، ازالۃ الاوہام، تزکیۃ الایقان فی رد تقویۃ الایمان، فضل العلم
والعلماء، الکواکب الزہرا فی فضائل العلم وآداب العلماء، ہدایۃ المشتاق الی سیر الانفس
والآفاق، اجمل الفکر فی مباحث الذکر، عین المشاہدہ، ہدایۃ السعادت، ترویح الارواح
جمیل حسین بریلوی بھی مولوی نقی علی خان صاحب کے ہم عصر تھے، انھوں نے ۱۲۸۳ھ میں
سراج الحرمین تصنیف کی۔ مولوی احمد رضا خاں صاحب خلف مولوی نقی علی خاں صاحب
۱۰ شوال ۱۲۷۲ھ (مطابق ۱۸۵۶ء) کو بریلی میں پیدا ہوئے، علوم درسیہ اپنے والد سے
حاصل کیے، ۱۲۹۵ھ میں ان ہی کے ساتھ زیارت حرمین سے مشرف ہوئے، اور وہاں کے
برگزیدہ علماء سے فیض حاصل کیا، انھوں نے ۱۳۴۰ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) میں بریلی میں
وفات پائی، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں: تجلی الیقین، اقامت القیامہ،
سلطنت مصطفےٰ، القیام المسعود، السماع الاربعین، منتہی التفضیل، مبحث التفضیل،
مطلع القمرین، الکلام البہی فی تشبیہ الصدیق بالنبی، احیاء القلب لمیت بنشر مناقب
اہل البیت، الاحادیث الراویہ لمناقب الصحابی معاویہ، الاہلال بفیض الاولیاء بعد از
وصال، [illegible] الانوار، [illegible] الانوار، [illegible] فی حکم السراج علی القبور، تجیر معظم،
حیات الموات فی بیان سماع الاموات، [illegible] المشارکہ، النجوم
الثواقب فی تخریج احادیث الکواکب، [illegible] فی آداب التحریر، [illegible]
[illegible] العطایا النبویہ فی الفتاوی الرضویہ، [illegible]
[illegible] حسام الحرمین، الدولۃ المکیہ، [illegible] عربی میں ہیں،
جن کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔[1] احمد رضا خاں صاحب کے چند معاصرین نے بھی

[1] تذکرۂ علمائے ہند، ص ۱۹

مناظرہ پر کتب و رسائل تصنیف کیے، مولانا سلطان احمد خاں نے [illegible] (مطابق [illegible]) میں مشرق اقدس لکھی، حافظ یقین الدین قادری نے ۱۳۱۴ھ (مطابق ۱۸۹۶ء) میں قوارع الہدام سماک الندوہ نامی رسالہ لکھا، مولوی عبدالحمید بریلوی نے ۱۳۱۶ھ میں ایک رسالہ سہم الغیب تصنیف کیا، مولوی مصطفےٰ خاں قادری نے ۱۳۳۱ھ (مطابق ۱۹۱۳ء) میں الرمح الدیانی علی راس الوسواس الشیطانی تصنیف کی، مولوی محمد حامد رضا خاں صاحب نے ۱۳۳۲ھ (مطابق ۱۹۱۴ء) میں فقہ پر ایک کتاب سلامت اللہ لاہل السنۃ لکھی، محمد ہدایت علی (متوفی ۱۹۰۴ء) الکلام الاحسن کے مصنف ہیں، محمد لیاقت علی بن ذاکر علی بریلوی نے ۱۳۲۶ھ (مطابق ۱۹۰۸ء) میں منطق پر ایک رسالہ مختصر المیزان تصنیف کیا اور عرفان علی بریلوی نے شیخ عبدالحق دہلوی کی تصنیف جذب القلوب فی دیار المحبوب کا راحت القلوب کے نام سے ترجمہ کیا۔

بریلی کے غیر مذہبی اردو نثر نگاروں میں اولین نثار جن کا پتہ چلتا ہے، محمد حسن رضا خاں ابن کامگار خاں، ابن محمد الیار خاں خلعت حافظ رحمت خاں ہیں، انھوں نے نواب احمد علی خاں والئ رامپور کے عہد میں توفلی مالو کی فرمائش پر ۱۲۴۰ھ (مطابق ۱۸۲۵ء) میں اخبار حسن تصنیف کی جو روہیلکھنڈ کی ایک عام اور اردو زبان میں دہاں کی پہلی تاریخ ہے[1]۔ اس کے علاوہ فن تاریخ میں انیسویں صدی میں ایک اور تصنیف ہوئی، یہ کتاب نیاز احمد خاں ہوش کی تاریخ روہیلکھنڈ ہے جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد لکھی گئی۔ اس تاریخی ادب کے علاوہ موجودہ صدی میں بھی کچھ بریلوی اہل قلم نے عام ادب میں قیمتی اضافے کیے، پرنسپل عبدالشکور صاحب جو رضا کالج رامپور سے ریٹائر ہوئے

---

[1] اخبار حسن (مخطوطہ رامپور)

کے بعد اب تصنیف و تالیف کی پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔ اردو کے چند ہندو شعراء، اردو ادب کا تنقیدی سرمایہ حسرت موہانی، غمگین دہلوی۔ ان کی تمام تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک اور کتاب تاریخ ادب اردو ابھی زیر طبع ہے۔ الطاف بریلوی صاحب حیات حافظ رحمت خاں اور چند دوسری کتابوں کے مصنف ہیں۔ جمیل احمد صاحب کی ایک تصنیف اردو شاعری کی مختصر تاریخ ۱۹۴۱ء میں اور ایک دوسری تصنیف تذکرہ شاعرات اردو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب کا تحقیقی مقالہ سرشار، ایک مطالعہ انجمن ترقی اردو پاکستان کی طرف سے شائع ہو چکا ہے۔ شیام موہن لال جگر جن کا ذکر اردو شعراء کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ نثر میں یادِ رفتگاں، صحت زبان، حدیث خودی اور جدید تغزل کے مصنف ہیں۔ عبادت یار خاں صاحب بریلوی دورِ جدید کے مشہور نقاد اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں سے چند اردو ادب کا ارتقاء، روایت کی اہمیت، مطالعۂ مومن، تنقیدی زاویے، جدید اردو شاعری ہیں۔ عبادت صاحب کا بچپن اور عنفوان شباب لکھنؤ میں گزرا۔ جہاں وہ گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج اور لکھنؤ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے۔ اس کے بعد دہلی یونیورسٹی میں ملازمت کی۔ اور پاکستان بننے کے بعد ترک وطن کر گئے۔ کئی سال تک لندن یونیورسٹی میں اردو کے استاد رہ کر اب لاہور واپس آ گئے ہیں۔ اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ وہ اگرچہ بریلی میں بہت کم رہے، پھر بھی ان کا تعلق اسی زمین سے ہے۔

استاذیکا مخدومی شاہ صاحب السلام علیکم

آپ کی خدمت میں "شمالی ہند کے چند علمی و ادبی مراکز" کی دوسری قسط بریلی سے متعلق روانہ کر چکا ہوں، امید ہے کہ آپ کو یہ مضمون پسند آیا ہوگا۔ اس مضمون میں کچھ اضافہ کرنا چاہتا ہوں، اس لیے براہ کرم ذیل کے دو پیراگراف آپ اس میں مناسب مقامات پر اضافہ کر دیں۔ اس سلسلے میں دو Foot note بھی دے رہا ہوں، انکو بھی مناسب جگہ پر جوڑ دیجیے گا۔

فارسی شعراء کا ذکر جہاں ختم ہوتا ہے وہ پیراگراف مندرجہ ذیل جملے سے شروع ہوتا ہے:

"گذشتہ صدی کے اختتام سے قبل ہی ہندوستان میں فارسی زبان اور شاعری پر زوال آنا شروع ہو گیا تھا........"

اس پیراگراف سے پہلے عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی کے حالات اضافہ ہوں گے جو حسب ذیل ہیں:

"عبدالعزیز خاں عزیز بریلوی ابن محمد سعادت یار خاں ابن محمد دیدار خاں خلف حافظ رحمت خاں عبدالملک ممتاز خواہرزادہ ضیاء الدین حسن شائق کے شاگرد اور بریلی کے انیسویں صدی کے آخری دور کے ممتاز فارسی و اردو گو شاعر تھے، ۱۳۰۸ھ (مطابق ۱۸۹۱ء) میں ان کا بریلی میں انتقال ہوا، نمونۂ کلام درج ذیل ہے:[۵]

پے گذشتن از تکسارئی کہاں نعمۂ تمہشتہ	پا اُٹھالی اور چو سنگ آستاں خواہم نشست
ستم چہ باکند گر ستم کشے نبود	جفائے تو ہمہ اے ظالم از وفائے من است
چہ پرسی از من دلدادہ مطلب مقصود	کہ ہم آرزوئے قسمت [illegible] است
عیاں اگر نہ بے اختیار من شدہ راز	اگر چو شمع بسوز کاہ مرد [illegible]

[۵] شمع انجمن ص ۳۲۷

عزیزیکے شنود بحن عندلیب آملی   کہ مو نغز ہملبے سخن سرے سخن است

مذکورہ پیراگراف کے آگے فارسی نثر نگاروں کا ذکر ہے، اس کے بعد کے پیراگراف کے آخر میں نواب صدیق حسن کا درج ذیل حال اضافہ فرما دیجیے۔

"فارسی زبان کے آخری اہم فارسی نثر نویس جن کا بریلی سے تعلق ہے، نواب صدیق حسن خان ہیں۔ ان کے اجداد کا وطن قنوج تھا لیکن ان کا ننھال بریلی میں تھا، جہاں وہ ۱۹ جمادی الاول ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تعلیم پانے کے بعد بھوپال چلے گئے، جہاں مختلف عہدوں پر فائز رہنے کے بعد انھوں نے ۱۸۷۱ء میں نواب شاہجہاں بیگم سے شادی کی۔ اس کے بعد بھوپال کے انتظام میں ان کا اثر روز بروز بڑھتا گیا۔ اس بڑھتے ہوئے اثر کو کم کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے انھیں ۱۸۸۵ء میں ان کے تمام عہدوں سے ہٹا دیا، اور اس واقعہ کے پانچ سال کے بعد ۱۸۹۰ء میں ان کا انتقال بھوپال ہی میں ہو گیا۔ نواب صدیق حسن خان اردو فارسی اور عربی کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، جن کی کل تعداد دو سو سے زیادہ بتائی جاتی ہے۔ ان میں فارسی شعرا کا ایک اہم تذکرہ شمع انجمن کے علاوہ علوم مذہبی سے متعلق متعدد عربی و فارسی تصانیف ہیں جن میں سے اہم کا ذکر مولوی رحمٰن علی صاحب نے تذکرۂ علمائے ہند میں کیا ہے۔"

امید ہے کہ آپ اس تکلیف کو معاف فرمائیں گے اور جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

نیازمند

محمد ولی الحق انصاری

Encyclopaedia of Islam vol IV [illegible]

Persian Literature (by C. A. Storey) P.29, 913, 1137

تصانیف حضرت شاہ نیاز بریلوی

از جناب مسعود حسین صاحب نظامی ریسرچ اسکالر شعبۂ فارسی مسلم یونیورسٹی

حضرت شاہ نیاز احمد صاحبؒ بریلوی کی ذات تعارف کی محتاج نہیں، آپ کی تصانیف کی ایک طویل فہرست ہے، لیکن ابھی تک مجھے صرف سترہ کتابوں کا پتہ چل سکا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت شیخ تلامذہ اور مریدین کو حسب استعداد مختلف مضامین پر رسائل املا کرا دیتے تھے، یہ رسائل ان ہی کی تعلیم و تربیت سے متعلق ہوتے تھے، اس لیے وہ ان کو اپنے ہمراہ دور دور دراز مقامات پر لیجاتے تھے، اسلیے آپ کی تصانیف ملک کے مختلف حصوں میں منتشر ہو گئیں، راقم کو ان کی جن کتابوں کا پتہ چلا ہے وہ حسب ذیل ہیں:-

۱- شمس العین (۲) کشف العین (۳) نور العین (۴) مجموعہ قصائد عربیہ (۵) شرح قصائد عربیہ (۶) دیوان نیاز (۷) رسالہ راز و نیاز (۸) تحفۂ نیاز (۹) رسالہ تسمیۃ المراتب (۱۰) لیعبدون لیعرفون (۱۲) حاشیہ شرح چغمینی (۱۳) حاشیہ ملا جلال (۱۴) رسالہ منطق (۱۵) مجموعۂ رسائل بر علوم مختلفہ (۱۶) بیاض (۱۷) ملفوظات

<u>حضرت شاہ نیاز بحیثیت شاعر</u> فطرت نے حضرت شاہ نیاز کو دردمند دل عطا کیا تھا، طبیعت میں فطری سوز و گداز تھا، مکتب عشق میں ایک عشق فروش[1] کی شاگردی نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا، چنانچہ اوائل عمری سے شعرگوئی کی جانب آپ کی طبیعت راغب ہو گئی، شاعری میں آپ کو کسی

---

[1] "عشق فروش" سے حضرت مولانا فخرالدین محمد دہلوی قدس سرہٗ العزیز مراد ہیں

تلمذ حاصل نہیں تھا۔

تعلیم اور تعلّم سب ہے نیاز اپنا
شاگرد ہیں تو ہم استاد ہیں تو ہم ہیں

مفتی غلام سرور مؤلف خزینۃ الاصفیاء کا بیان ہے،

حضرت شاہ دل آگاہ بطبع رغبت تمام
حضرت شاہ دل آگاہ کو شعر گوئی سے بڑی

میداشت و اشعار آبدار متضمن حقائق و
رغبت تھی، آپ کے آبدار اشعار حقائق و معارف

معارف گفتہ (خزینۃ الاصفیاء ص ۲۱۰)
سے پُر ہوتے تھے۔

آپ کا کلام عربی، فارسی، اردو اور ہندی چار زبانوں میں ہے، جس کا معتد بہ حصہ راقم کی نظر سے گذرا ہے، چاروں زبانوں میں قادر الکلامی نمایاں ہے ہر جگہ عشق کی کار فرمائی ہے "سلطان عشق" کے غلبے کا یہ عالم ہے کہ رگ و پے جسم کے ہر تار سے "آہنگ عشق" پیدا ہے، یہاں تک کہ ان کا کفر و ایمان سب کچھ عشق ہی بن جاتا ہے ؎

کافر عشقم مپرس از دین من اے ہمنشیں
عشق اسلام است و دین در ملکِ کفرستانِ عشق

اس لیے آپ کا پورا کلام صحیفۂ عشق بن گیا ہے۔

فارسی، اردو اور ہندی میں "نیاز" اور عربی میں "آگہی" تخلص فرماتے تھے، متعین طور پر یہ بتانا دشوار ہے کہ آپ نے پہلے کس زبان میں طبع آزمائی فرمائی حضرت مرزا مظہر جان جاناں ؒ کی خدمت میں جو غزل پیش کی تھی اس کی پختگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں شعر سخن شروع ہو گئی تھی۔

(۱) شمس العین۔ یہ تصوف کا معرکۃ الآراء رسالہ ہے، ۱۲۱۱ھ سے قبل مکمل ہو کر قبول عام کی سند حاصل کر چکا تھا، نظر ثانی میں چاہا کہ اس کے بعض اشعار میں ترمیم کر دیں مگر اس کی مقبولیت کے پیش نظر جنبش نہ دیا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ازبسکہ ایں رسالہ در اکثر اکناف و اطراف	چونکہ یہ رسالہ شمس العین اکثر اطراف و جوانب
منتشر گشتہ و از نظر بسیارے بزرگان حقانی	عالم میں پھیل گیا اور بہت سے صاحب حال بزرگوں
گذشتہ و قبولیت یافتہ و تحریف اصلاح	کی نظر سے گذر کر قبولیت حاصل کر چکا ہے (اس لئے)
صلاح کار ندیدہ برحال خود داشت ...	ترمیم و اصلاح کو مناسب نہ سمجھ کر اسے بجنسہ چھوڑ دیا۔

یہ پچانوے (۹۵) بند پر مشتمل مخمسہ ہے۔ اس کے ابتدائی چار پانچ بند عربی کے ہیں، ورنہ عام طور سے چار مصرعے فارسی کے اور پانچواں مصرعہ عربی کا ہوتا ہے، ابتدائی بندوں میں عقائد بیان کیے ہیں اور اس کے بعد تصوف کے مضامین شروع ہو جاتے ہیں، اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ حضرت نے خود ہر بند کی تشریح تحریر اور شمس العین کی کئی شرحیں قلم بند فرمائی ہیں، جن میں سے تین میرے علم میں ہیں، ایک شرح مفصل ہے جس کو عرف عام میں شمس العین ہی کہتے ہیں، اس کی زبان فارسی ہے، اس کی دو شرحیں اور ہیں۔

(۲) کشف الغین:۔ یہ شمس العین کی عربی شرح ہے۔ جسے کسی قدر اختصار کے ساتھ لکھا گیا ہے، اس کا سنہ تصنیف دریافت نہیں ہو سکا، میرے پیش نظر مخطوطہ عبدالہادی مقیم سعد آباد ضلع متھرا کے قلم کا لکھا ہوا ہے، مخطوطہ کی تاریخ کتابت تاریخ بست و ششم ماہ صفر ۱۲۹۲ھ درج ہے۔ یہ رسالہ اچھے روشن قلم کے تقریباً سو صفحات پر مشتمل ہے، کاتب رسالہ حضرت شاہ نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرید ہیں، اس لیے اپنی معلومات کے مطابق رسالہ پر حاشیے بھی لکھتے گئے ہیں۔

(۳) نور العین:۔ یہ رسالہ بھی شمس العین کی شرح کہا جاتا ہے لیکن صرف چھ سات صفحات پر مشتمل ہے، اس لیے اس کو شرح کے بجائے شرح کا تتمہ کہنا چاہیے، نواب مولوی محمد جان صاحب نے راقم سے فرمایا تھا کہ اس کا ایک نسخہ ان کے پاس بھی محفوظ ہے۔

(۴) مجموعہ قصائد عربیہ:۔ اس مجموعہ میں تین مخمسے ہیں، پہلا مخمسہ پنجتن پاک کی شان میں ہے،

اس میں گیارہ بند ہیں، اس کے مقطع کا بند یہ ہے:

جاء اُمّی الی جنابکمو — لیس ملجاہ غیر بابکمو

ان تعدّہ من کلابکمو — او تشیروہ فی خطابکمو

لا یخف من مخافۃ الدارین

دوسرا خمسہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے، اس میں بتیس[۳۲] بند ہیں، بندوں کی ترتیب حروف تہجی کے لحاظ سے ہے، اس کا آخری بند یہ ہے:

انّ امّی احمدی اوّلاً — قادری ثانیاً یا مرتضیٰ

ثم مسکین فقیر ثالثاً — یا علی للّٰہ عونا یا علی

یا لتفات منک ھمی ینجلی

یہ خمسہ حضرت کے نبیرہ وجانشین حضرت سراج السالکین شاہ محی الدین احمد صاحب کے اردو ترجمے کے ساتھ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب الہ آبادی سجادہ نشین دائرہ حضرت ملا محمدی شاہ صاحب کی ایما سے شائع ہو چکا ہے۔ تیسرا خمسہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مشہور مناجات کی تخمیس ہے، یہ گیارہ بندوں پر مشتمل ہے۔ اس خمسہ کا پہلا اور آخری بند ملاحظہ ہو:

سابغ ھم قلبی واکشف لی الثقیل — انت لی فی الدین والدنیا وکیلی والکفیل

انت تواب رؤف لیس مثلک عدیل — خذ بلطفک یا الٰہی من لہ زاد قلیل

مفلس بالصدق یاتی عند بابک یا جلیل

ان توب اللّٰہ مفتاح لابواب الفتوح — انت یا امّی غریب تب الیہ کالنصوح

کل من قد جاء فی الدنیا الی المنتہی — این موسیٰ این عیسیٰ این عیسیٰ این نوح

انت یا صدیق عاصی تب الی المولی الجلیل

۱۔ اس کا پہلا ایڈیشن باہتمام سید احمد در مطبع رزاقی کانپور طبع ہوا ۱۳۲۹ھ

ان خمسوں کے علاوہ ایک اور خمسہ راقم کے پاس محفوظ ہے، اس میں تین بند ہیں، اس کے پہلے تین مصرعے فارسی کے اور دو عربی کے ہیں۔

منکہ ہستم قرین بد عملی — از تباہ کاری خفی و جلی
بر درت آمدم بجستہ دلی — اعتصامی سو لجا بالشئ

لیس یا سیدی الی احدی

یا رسول خدا شہ ثقلین — اے بخیر النساء جد حسنین
از دل و زبان ونہ شفتین — صلواتی علیک فی الملوین

کان متجاوز اعن الحد دی

(۵) شرح قصائد عربیہ:۔ اس شرح میں حضرت نے اپنے قصائد کی تشریح فرمائی ہے، اس کی زبان شرح شمس العین کی طرح عربی آمیز فارسی ہے، اکثر و بیشتر آیات قرآنی، احادیث اور عقائد سے متعلق صوفیائے متقدمین کے عربی جملے بے تکلف نقل کیے ہیں، جس سے کسی قدر مشکل ہوگئی ہے،

(۶) دیوان نیاز:۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس کا پہلا اڈیشن ۱۲۹۹ھ میں مطبع قادری آگرہ سے شائع ہوا تھا، اسوقت پانچسو کی تعداد میں چھپا تھا اور اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔

(۷) دیوان نیاز فارسی واردو :۔ ۱۳۰۲ھ میں سید جعفر علی صاحب اکبر آبادی کا تعلیم سے اکبر آباد کی طرف یہ اطلاع شائع ہوئی ہے کہ "نیاز کا دیوان مطبع قطب الاخبار میں بخط شیخ احمد آزاد خوشنویس کامل شاعر شیریں زبان، باہتمام منشی محمد امیر خاں چھپنا شروع ہو گیا ہے، ربیع الاول کے آخر تک قیمت ایک روپیہ، ربیع الآخر تک سوا روپیہ اور اس کے بعد ڈیڑھ روپیہ مقرر کی گئی ہے۔"

[illegible] ہماری زبان ص ۷، بابت ۲۲ [illegible] ۔ [illegible] شاید یہ وہی امیر خاں ہیں جن کے [illegible] صفحات پر مشتمل دیوان نیاز اردو ... [illegible] امیر خاں [illegible] اس کا سنہ کتابت [illegible] ہے، موصوف بریلی شہر کے [illegible]

[illegible] الاخبار آگرہ ص ۸، بحوالہ معاصر [illegible]

اس وقت میرے زیر مطالعہ دیوان حضرت صدر الکل نیاز صاحب مسعودی کا چھپا ہوا نسخہ ہے۔
یہ ۱۳۳۵ھ میں آگرہ اخبار پریس آگرہ میں علامہ مسکین صاحب اکبرآبادی کی معرفت شائع ہوا تھا[1]۔ یہ دیوان نیاز
کا چوبیسواں اڈیشن ہے یہ چار زبانوں کا مختصر مجموعۂ کلام ہے جس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلا حصہ
فارسی کلام پر مشتمل ہے، اس میں سب سے پہلے بانوے (۹۲) اشعار کی پُر اثر مناجات ہے، جو خال خال عربی کے
مصرعوں اور اشعار کی وجہ سے ملمع بھی ہوگئی ہے، فارسی کی ایکسو ایک (۱۰۱) غزلوں کے علاوہ ایک غزل
ذولسانین میں (یعنی جس کا مصرعہ اولیٰ فارسی کا اور مصرعہ ثانی عربی کا ہے) اور ایک غزل عربی میں ہے
جس میں امّی تخلص نظم کیا ہے، جس کا مقطع یہ ہے

جلاء العشق یا اُمّی بلاءٌ   والآف المصائب فیہ مشحون

پچاس اشعار کی دو مثنویاں اور چالیس (۴۰) اشعار پر مشتمل پانچ مستزاد ہیں، اس طرح فارسی حصہ
میں ایک ہزار اٹھانوے اشعار ہیں،

دوسرے حصہ میں اردو کلام ہے، اس میں اردو کی پینسٹھ (۶۵) غزلیں اور چار سو سرسٹھ (۴۶۷) اشعار
ہیں۔ تیسرے حصے میں ہندی کلام ہے، اس کی زبان اور مضامین پڑھ کر ہندی کلاسیکی دور کے نامور
شاعر ملک محمد جائسی کی پدماوت کے بارہ ماسہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اس حصہ میں چھبیس (۲۶) پہیلیاں اور ایک پھاگ ہے،

مجھے ایک کابلی دوست نے بتایا تھا کہ دیوان نیاز بے نیاز کا ماضی قریب میں ایک اڈیشن لاہور سے طبع
ہوا ہے، اس کا ایک نسخہ ان کے پاس بھی ہے، بعد میں دوسرے ذرائع سے پتہ چلا کہ دیوان کا یہ اڈیشن حضرت
کے سلسلے کے خلیفہ حضرت صاحبزادہ شاہ فتح محمد صاحب مقیم سندھ کے زیر اہتمام زیور طبع سے آراستہ
ہوا ہے، گویا دیوان کا پچیسواں اڈیشن ہے،

آپ کے اشعار کی مقبولیت کا اندازہ اڈیشنوں سے لگایا جاسکتا ہے، آپ کے معاصر ہوتے ہوئے بھی
ابتک بہت سے صاحبان قلم نے آپ کے اشعار سے اپنے مضامین کو مزین کیا ہے، اتنا زمانہ بیت جانے کے

---

[1] مرسولہ حضرت مسکین صاحب [illegible]

باوجود آج بھی حضرت کے نغموں کے سر دھم نہیں پڑے، اس بیسویں صدی میں مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ بقول حضرت مسکین آج بھی کوئی عرس و قوالی کی محفل ایسی نہیں ہوتی جہاں حضرت کی غزلیں قوال نہ گاتے ہوں[1]، بیسویں صدی کے مصنفین میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے لیکر عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی تک ہر مذاق کے لوگ اپنی تقریروں اور تحریروں میں نقل کرتے چلے آرہے ہیں،

اس شہرت و مقبولیت کے باوجود ڈاکٹر قمر رئیس صاحب نے تاشقند میں حضرت نیاز کے دیوان کا ایک غلط سلط نسخہ دیکھ کر استعجاب فرمایا تھا اور لکھا تھا کہ "اگر شاہ نیاز سرہندی کا اردو کلام ابتک شائع نہیں ہوا ہے تو پھر جس طرح بھی ہوگا میں اسے مرتب کرکے پیش کرنے کی کوشش کروں گا، مجھے حیرت ہے کہ جس دیوان کے کم از کم بیسیوں[2] اڈیشن نکل چکے ہوں، اس سے ڈاکٹر صاحب بالکل بے خبر ہوں، فاضل محقق کو "آب حیات اور دوسرے مستند تذکروں میں حضرت کا ذکر نہیں ملا"، کہ مکتوب کی عبارت میں سہو ہوا ہے، ورنہ اصل عبارت تو یوں ہونی چاہیے تھی کہ "آبحیات" اور اسی جیسے دوسرے مستند تذکروں میں مجھے حضرت کا ذکر نہیں ملا، تو یہ بات قابل یقین بھی تھی، اگر جناب محقق ذرا زحمت گوارا فرماتے تو خود تاشقند اور اس کے اطراف و جوانب میں قوقند، سمرقند، بلخ و بخارا میں حضرت کی بعض شاہکار تصانیف دستیاب ہو جاتیں، ان مقامات پر آپکے اجل خلفاء تھے جہاں ان کی بڑی بڑی خانقاہیں ہیں، حضرت کے وصال کے مدتوں بعد تک خانقاہ نیازیہ بریلی میں ان خلفاء کے خلفاء و متوسلین کی آمد و رفت رہی ہے، حضرت مسکین اپنے اسی مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہاں کے بعض اہل سلسلہ اور مشائخ کو میں نے خود دیکھا اور انکی صحبت سے لطف اندوز ہوا ہوں،

(۵) رسالہ راز و نیاز: یہ دس بارہ صفحے کا رسالہ ہے، اس کا موضوع تصوف ہے زبان عربی آمیز فارسی ہے، اس کے پہلے جز میں مراتب کلیہ ہیں، اور دوسرے جز میں فخریہ سلسلے کے مروجہ

1۔ ہماری زبان ص ۹ بابت ۸ جولائی ... رسالہ مسکین ... [illegible]

اشغال بیان فرمائے ہیں، اور آخر میں اپنی مثنوی کے اشعار پر رسالہ ختم کیا ہے جس کا مطلع یہ ہے:

ذکر بے کام و بے زبان او راست — او ولی است رمز وسر خداست

(۸) تحفۂ نیاز بہ حضرت بے نیاز۔ اس کا موضوع بھی تصوف ہے اور زبان فارسی ہے، یہ رسالہ منتہی طلبہ کے لیے لکھا گیا تھا۔

(۹) رسالہ تسمیۃ المراتب: یہ رسالہ بھی تصوف پر ہے۔

(۱۰) لیعبدون
(۱۱) لیعرفون
} یہ دونوں رسالے مختصر ہیں، لیکن ان میں نہایت مؤثر انداز سے عبدیت و معرفت پر بحث کی گئی ہے۔

(۱۲) حاشیہ شرح چغمنی: طلبہ کے لیے لکھا گیا تھا، مگر اب نایاب ہے۔

(۱۳) حاشیہ ملا جلال: اس کی زبان عربی ہے حضرت مولوی محمد فائق صاحب فرماتے ہیں کہ "ملا جلال وغیرہ پر آپ کے حواشی آپ کے فاضل ہونے کی دلیل ہیں[1]"۔

(۱۴) رسالہ منطق: یہ رسالہ حضرت شاہ آل رسول صاحب مارہروی کے لیے املا کرایا تھا، شاہ صاحب نے آپ سے تعلیم کی تکمیل کی تھی، مؤلف نازو نیاز نے لکھا ہے کہ "یہ رسالہ کتب خانہ مارہرہ میں سنتا ہوں ابتک موجود ہے[2]"۔

(۱۵) مجموعۂ رسائل بر علوم مختلفہ:۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مجموعہ بھی حضرت شاہ آل رسول صاحب کے لیے اپنے دست خاص سے تحریر فرمایا تھا اور اب بھی خانقاہ نیازیہ کی کتابوں میں موجود ہے۔

(۱۶) بیاض: اس کی زبان فارسی ہے، مؤلف کرامات نظامیہ نے اس کی ایک عبارت نقل کی ہے جس میں حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادی کی تاریخ [illegible]

---

[1] کرامات نظامیہ ص ۱۳ [2] نازو نیاز ص ۱۱

حضرت مولانا فخر صاحب کے اسفار، دہلی میں قیام اور ان کا سنہ رحلت درج ہے۔

(۱۷) **ملفوظات نیاز بے نیاز**: اس کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ ایکبار دیوان نیاز کے مختلف اڈیشن دیکھ رہا تھا، اسی دوران میں حبیب گنج کلکشن میں مجھے دیوان نیاز کا ایک مطبوعہ نسخہ ملا، جس کے ابتدائی صفحات پھٹے ہوئے تھے، ان اوراق کے بجائے ایک دیوان نے دوسرے سادہ اوراق لگا کر ان پر اپنے قلم سے غزلیں نقل کر دی ہیں، صفحہ اول پر اسی قلم سے یہ عبارت تحریر ہے، "تاریخ وفات این بزرگان از ملفوظات شاہ نیاز احمد قدس سرہ" اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ متوسلین میں سے کسی شخص نے حضرت کے ملفوظات جمع کیے تھے، اس عنوان کے تحت گیارہ تاریخہائے وفات درج ہیں، سب سے آخری تاریخ حضرت حکیم الٰہی حاجی محمد رحمۃ اللہ "کہ پدر بزرگوار این فقیر بودہ ۵ رجادی الاول" ہے، اس عبارت کے بعد ایک طرف حضرت مجدد الف ثانی کے مکتوبات میں سے ایک عبارت نقل کی ہے، اور آخر میں یہ عبارت درج ہے:

"کتبہ الراجی الی رحمۃ الالہ المدعو بامیر شاہ[1] سامحہ عما شانہ"

---

[1] کرامات نظامیہ ص ۲۳۲ [2] امیر شاہ کے بارے میں میں نے ہرچند غور کیا لیکن امیر شاہ صاحب بخش فتی کے سوا اور کوئی صاحب اس نام کے یاد نہیں، یہ امیر شاہ صاحب حضرت مجذوب شاہ مکان دہلی (خلیفہ حضرت تاج الاولیاء شاہ نظام الدین حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ) کے مرید اور حضرت شاہ محی الدین احمد صاحب سے اجازت یافتہ تھے، حضرت موصوف بڑے صاحب تصرف بزرگ تھے، آپ کے دم سے اوقات میں سلسلۂ نیازیہ کی بڑی اشاعت ہوئی، آجکل ان کے دوسرے صاحبزادے آغا غلام علی شاہ صاحب حنابکی بخشان اشاعت سلسلہ میں مشغول ہیں۔

باب التقریظ والانتقاد

معاشرتی و علمی تاریخ

مصنفہ

ڈاکٹر سید معین الحق صاحب (کراچی)

از

جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی

تاریخ اب سے پہلے واقعات کی روداد اور وہ واقعات جن لوگوں کے ذریعہ ظہور میں آئے اُن کے حالات کا نام تھا، اس کے بعد سائنس نے تاریخ میں دخل پایا اور تاریخ نے سائنس کے معاشرتی و عمرانی شعبے کی صورت اختیار کر لی، اور واقعات کی تحقیق اور جانچ میں اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی مدد سے شروع ہوئی، اور استنباط نتائج پر زور دیا گیا، یہ عمل بھی زیادہ تر واقعات کی ترتیب و تدوین ہی تک محدود رہا، لیکن آجکل تاریخ کا مطالعہ جس نقطۂ نظر سے کیا جا رہا ہے وہ پہلے سے بالکل مختلف ہے، اب تاریخ محض مختلف ملکوں اور قوموں کی باہمی جنگوں کے حالات اور بادشاہوں اور حکمرانوں کے شاندار کارناموں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ زور اس امر پر دیا جاتا ہے کہ مختلف ملکوں اور قوموں کے واقعات و سانحات کا تمام عالم پر من حیث المجموع کیا اثر پڑا ہے، اور مختلف ملکوں اور قوموں کو ایک دوسرے کے قریب آنے میں چند مخصوص واقعات نے کس طرح مدد کی ہے، دنیا کے تمام ملکوں میں تاریخی واقعات

کی ایک بڑی حد تک یکسانیت نے تاریخ نویسی کا رخ انسان کے اخلاقی اور روحانی ارتقاء کی طرف پھیر دیا ہے۔ اسلام نے دنیا میں پہلی مرتبہ سارے عالم کے اتحاد و اتفاق کی دعوت دی اور تمام انسانوں کی مساوات کا نعرہ بلند کیا، رنگ و نسل کے فرق کو مٹایا، آقا اور غلام کو ایک سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور ساری دنیا کے باشندوں کو پائیدار اتحاد و یکجہتی کا راستہ دکھایا، اسلام دنیا کے کسی مخصوص حصے یا کسی مخصوص قوم کی نجات اور رہنمائی کے لیے نہیں بلکہ سارے عالم کی نجات اور رہنمائی کے لیے رونما ہوا، اور اس نے قریب قریب دنیا کے تمام ملکوں میں اخلاقی اور روحانی اصلاح کی بنیاد ڈالی، اور نسل انسانی کو پستی اور ضلالت سے نکال کر راہ راست پر ڈالا، اور اسلامی کلچر سے مالا مال کیا، انسان دوستی اور مسلک انسانیت اور انسانی فلاح و بہبود کا عام جذبہ پیدا کرنے میں اسلام نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کو دنیا کبھی فراموش نہیں کر سکتی،

تاریخ نویسی ہمیشہ مسلمانوں کا خاص مشغلہ رہا، انھوں نے تاریخ نویسی کے فن کو اتنی ترقی دی کہ ترقی یافتہ دنیا کے جدید ترین مورخ بھی اس پر آج تک کوئی قابل لحاظ اضافہ نہیں کر سکے، اس میں شک نہیں کہ عموماً مسلم مورخوں نے حکمرانوں کے کارناموں اور سیاسی اور جنگی سرگرمیوں اور فتوحات پر زیادہ زور دیا ہے، اس لیے کہ وہ شخصی حکومتوں کا دور تھا، اور اس زمانے میں ان ہی چیزوں کو اہمیت حاصل تھی لیکن جدید دور میں تاریخ نویسی کے متعلق جس نقطۂ نظر کو اہمیت دی جا رہی ہے وہ بھی مسلمان مورخوں سے پوشیدہ نہ تھا، البتہ ان کی تاریخوں میں معاشرتی، معاشی اور ثقافتی پہلوؤں پر صرف ہلکے ہلکے اشارے ملتے ہیں اور کچھ نہیں ملتا۔ لیکن اس کی تلافی ہوا سے صوفیائے کرام نے کر دی، جو ہمیشہ روحانی تربیت اور دینی اور اخلاقی زندگی کی اصلاح میں مصروف رہتے تھے، ان کے ملفوظات ...

محفوظ ہیں، قریب قریب ہر دور کے اخلاقی اور روحانی اور معاشرتی حالات دستیاب ہوسکتے ہیں، ان ماخذوں سے حالات فراہم کرنے کی خدمت انجام دینے کے لیے بڑی محنت اور تلاش و جستجو کی ضرورت ہے، اسی موضوع پر حال ہی میں ایک کتاب "معاشرتی و علمی تاریخ" کے نام سے شائع ہوئی ہے، جس میں ہندوستان کی ۱۲۰۶ء سے ۱۵۲۶ء تک کی معاشرتی، علمی، ثقافتی اور اقتصادی زندگی کے حالات اور واقعات بہت تحقیق و تدقیق کے بعد پیش کیے گئے ہیں،

ڈاکٹر سید معین الحق جنھوں نے یہ نہایت اہم اور مشکل کام انجام دیا ہے اور ہماری تاریخ کو تاریخ کے جدید ترین تصورات کے مطابق بنا دیا ہے، طالب علمی کے زمانہ ہی سے تاریخی و علمی ذوق کے لیے ممتاز رہے ہیں، ان کی اس تازہ ترین کتاب میں ان کے عمیق مطالعے اور ان کی تحقیق و تدقیق کا قدم قدم پر ثبوت ملتا ہے، اسلامی ہند میں تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے معاشرتی، معاشی، علمی اور ثقافتی پہلوؤں پر نہایت مفید معلومات "معاشرتی و علمی تاریخ" کے ہر صفحہ پر موجود ہے، اعلیٰ معیاری اور ایسے ہم عصر ماخذوں کا تجزیاتی مطالعہ جن میں پرانے اعتقاد غلط اور ناقابل اعتبار روایتیں کثرت سے شامل ہو گئی ہیں، نہایت ہی دشوار کام تھا، اس کے لیے ڈاکٹر صاحب موصوف کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں ہماری مستند معاشرتی، علمی اور ثقافتی تاریخ مرتب ہو گئی، جس کے اجزا سیکڑوں کتابوں کے اوراق پر بکھرے پڑے تھے، یہ ایک دقیق و نازک کام تھا، ہو سکتا ہے کہ کسی دور کے دو چار علماء کے نام اس کتاب میں نہ لیے گئے ہوں، بعض مشائخ کے متعلق چند روایتیں اس میں جگہ نہ پا سکی ہوں، کتاب کے حدود و حجم کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ معمولی فروگذاشتیں قابل اعتنا نہیں ہیں،

اس کتاب کے مطالعے سے علماء و صوفیائے کرام کی تبلیغی سرگرمیوں کا بھی اندازہ

ہو جاتا ہے، لیکن تاریخ نویسی کے جدید رجحانات اور تصورات کا تقاضا تھا کہ ڈاکٹر صاحب یہ واضح کرتے کہ اسلامی نظریات کا اثر غیر اسلامی زندگی پر کیا پڑا اور اسلام اور مسلمانوں نے غیر مسلموں کی ثقافت اور معاشرت اور فنون لطیفہ اور تعمیرات اور طرز زندگی پر کیا اثرات چھوڑے اور اس ملک کے باشندوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے اور چھوت چھات کو مٹانے اور مساوات پیدا کرنے میں کہاں تک یہ اثرات کارگر ہوئے، اور روحانی و اخلاقی اتحاد پیدا کرنے میں ان اثرات نے کیا مدد دی، مجھے امید ہے کہ کتاب کے اگلے اڈیشن میں ڈاکٹر صاحب اس کمی کو پورا کر دینگے،

کتاب کی زبان اور طرز بیان بہت واضح شگفتہ اور دلکش ہے، اور واقعات اور حالات کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، تحریر کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کو متاثر کرے، خاص طور پر تاریخی واقعات کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ مورخ پر اعتماد و یقین پیدا کر سکے، ڈاکٹر صاحب کے اسلوب بیان میں یہ بات بدرجۂ اتم موجود ہے، انھیں دوسروں کے لیے سوچنے کی مہارت ہے، ایک بات مجھے اور عرض کرنی ہے، ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس دور کے ہندوستان کے لیے "ہند پاکستان" کا ایک نیا نام وضع کیا ہے، میرے نزدیک تاریخی نقطۂ نظر سے یہ نام اچھی خاصی الجھن پیدا کر سکتا ہے، تاریخ تو یہ کہتی ہے کہ اس کتاب میں جو واقعات و حالات بیان کیے گئے ہیں وہ ہندوستان کے واقعات و حالات ہیں، ۱۹۴۷ء سے پہلے کے ہندوستان کے، جب پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا، اس لیے وہ حالات "ہند پاکستان" کے نہیں بلکہ متحدہ ہندوستان کے ہیں،

ادبیات

غزل

ازجناب تسکین قریشی

میرے عشقِ کامل میں حسن بھی ادا بھی ہے — میں نے دل دیا بھی ہے، میں نے دل لیا بھی ہے
عاشقی و محرومی، جبر بھی جزا بھی ہے — زخم ہی نہیں دل میں، زخم میں مزا بھی ہے
اہلِ دل بھی کہتے ہیں، اور یہ واقعہ بھی ہے — کفر، کفر ہے لیکن، عشق میں روا بھی ہے
حسن ہو اگر برہم، اور چھیڑ دیجئے پیہم — برہمی کے عالم میں لطفِ التجا بھی ہے
شکر کیا، شکایت کیا، خیر ہو محبت کی — وہ جو دشمنِ جاں ہے، جانِ مدعا بھی ہے
بیخودی کا پیمانہ، میکشی نہیں اے دوست — بیخودی اسی کی ہے، جو خود آشنا بھی ہے
عقل و آگہی بھی گم، ہوش و بیخودی بھی گم — تیری یاد کی اے دوست کوئی انتہا بھی ہے

توبہ بارہا ٹوٹی، دل نہ ٹوٹنے پائے
جتنا رند ہے تسکیں اتنا پارسا بھی ہے

غزل

ازجناب امتیاز احمد صاحب فرخ دھولیاوی ایم اے، ایم بی کالج جلگاؤں

کیا کرم فرما تھا وہ باغباں ہونے لگی — برق سے شاخِ نشیمن بے نشاں ہونے لگی
شامِ غم جب تبسم، گو ہر نشاں ہٹنے لگی — وہ ہم و برہم لبِ ساقی کہکشاں ہونے لگی

جب محبت ان کی آنکھوں سے عیاں ہونے لگی
بات بڑھتے بڑھتے زیبِ داستاں ہونے لگی

کچھ توجہ تیری اے نامہرباں ہونے لگی
زندگی اب زندگی کی ترجماں ہونے لگی

یوں جبینِ شوق جذبِ آستاں ہونے لگی
ہیچ نظروں میں متاعِ دو جہاں ہونے لگی

ہو گئی ہیں انکے دل کی دھڑکنیں بھی تیز تیز
داستانِ غم جب آنکھوں سے بیاں ہونے لگی

رہگذارِ عشق میں ایسا بھی اک آیا مقام
بیخودی ہی اپنی جب خود منزل نشاں ہونے لگی

گل گریباں گیر ہیں خارِ چمن دامن کشاں
تیرے دیوانے کی ہر شے قدرداں ہونے لگی

پا گئی کیا نکتۂ "لولاک" کو عقلِ رسا
زندگی جو غیرتِ نازِ "کن فکاں" ہونے لگی

کون مجبورِ الم ہے اے فخرؔ تڑپا شامِ غم
پست و بالا ہستیٔ کون و مکاں ہونے لگی

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

حسن وہ جلوہ جو دیکھے وہی حیراں ہو جائے
عشق وہ رنگ جو رگ رگ سے نمایاں ہو جائے

وہ گنہگارِ محبت ہوں کہ زاہد پہ اگر
میرا سایہ بھی جو پڑ جائے تو انساں ہو جائے

جب میں سمجھوں ترا اعجاز کرے دستِ جنوں
آج دامن کا ہر اک تار گریباں ہو جائے

واعظا تفرقہ پرور سے تو مل جائے نجات
کفر ہی کاش مرا حاصلِ ایماں ہو جائے

آہ وہ خار جو پھولوں کی نظر میں کھٹکے
ہائے وہ سبزہ کہ جو صرفِ بہاراں ہو جائے

عمر بھر کے لیے کافی ہے اگر اے جوہرؔ
ایک سجدہ بھی قبولِ مہرباں ہو جائے

مطبوعات جدیدہ

عقلیات ابن تیمیہ ۔ مرتبہ مولانا محمد حنیف ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، صفحات [illegible] مجلد مع گرد پوش، قیمت اخباری کاغذ [illegible]، سفید کاغذ [illegible]

پتہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ کا ایک اہم اصلاحی و تجدیدی کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے منطق، فلسفہ اور علم کلام کی تنقید و احتساب کرکے کتاب و سنت کے طرز و اسلوب کی عظمت و دلنشینی ثابت کی ہے۔ اس کتاب میں ابن تیمیہ کی بعض کتابوں کی روشنی میں ان کے اسی کارنامہ کی ترجمانی اور تشریح کی گئی ہے۔ پہلی فصل میں منطق کے مسائل مثلاً حدود و تعریفات، مقولات عشرہ، تصور و تصدیق، صغریٰ کبریٰ اور حد اوسط وغیرہ کے متعلق ارسطو کے خیالات پر تنقید کرکے منطق کی عدم افادیت، عقلی علوم میں قطعی و یقینی نتائج تک اس کی نارسائی اور دینی و الٰہی حقائق کے بارہ میں اس کا عجز علمی و عقلی انداز میں ثابت کیا گیا ہے۔ شارح نے حدود و تعریفات کے مسئلہ میں ابن تیمیہ کے تصور پر حکمائے مغرب کا نقطۂ نظر نقل کرکے دکھایا ہے کہ یہ علامہ ہی کے اعتراضات کی صدائے بازگشت ہے۔ شروع میں انہوں نے منطق کی ابتدا اور ارتقاء، عہد عباسی میں علوم کے ترجمہ و اشاعت اور اسلامی علوم اور مسلمان حکماء و متکلمین پر اس کے اثرات وغیرہ کی مختصر وضاحت کرکے ابن تیمیہ کے اصلاحی کارناموں کی عظمت ظاہر کی ہے۔ دوسری فصل میں مصنف نے اہم اسلامی فرقوں کے متعلق مختصر معلومات تحریر کی ہیں۔ تیسری فصل میں مسئلہ

اور چوتھی میں صفات باری کے متعلق فلاسفۂ یونان و اسلام اور مسلمان متکلمین کے طرز استدلال کی خامیوں کو واضح کرکے سمعیات پر عقلیات کو ترجیح دینے کے رجحان کی مذمت، کتاب و سنت کا قابل ترجیح اور موافق عقل ہونا اور قرآن کے طرز استدلال کی دلنشینی اور اس کے بعض دلائل کی تشریح کی گئی ہے، پانچویں، چھٹی اور ساتویں فصلوں میں رویت باری، خلق قرآن اور عقیدہ کے مسائل میں علامہ ابن تیمیہ نے جمہور اہل سنت کے نقطۂ نظر کی اپنے خاص اسلوب میں جس وضاحت کی ہے اس کا ذکر ہے، آخری فصل میں تصوف پر ان کے عقلی و مذہبی اعتراضات کا ذکر ہے، اور اس سلسلے میں ابن عربی کے نظریۂ وحدت الوجود اور ولایت کی نبوت پر فوقیت کو غیر اسلامی اور وحی و نبوت کے مقابلہ میں کشف کو علم و ادراک کا یقینی ذریعہ قرار دینے کی تردید کی گئی ہے، ابن تیمیہ کی تنقیدوں کا لب و لہجہ بہت سخت ہے، مرتب نے اس کی توجیہ کی ہے، اور ان کے حریفوں کی جانب سے بھی ایک حد تک معذرت خواہی کی ہے، علامہ کے اعتراض و جواب میں جو تکرار و اعادہ ہے اس کی بھی توجیہ کی گئی ہے مگر خود زیر تبصرہ کتاب میں بھی کہیں کہیں یہی چیز پائی جاتی ہے، بعض مسائل میں شارح نے ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف اور کہیں کہیں ان کی تشریح و تعبیر میں اضافہ بھی کیا ہے، اس کتاب میں اہم اور دقیق مسائل پر مباحث ہیں لیکن مرتب کے شگفتہ قلم اور سلیس طرز تحریر نے ان میں شگفتگی و سلاست پیدا کردی ہے، تاہم اس کے بعض مسائل عوام کی دسترس سے باہر ہیں، اس کتاب سے علامہ ابن تیمیہ کے اصلاحی و تجدیدی کارناموں کی وضاحت بڑی حد تک ہو جاتی ہے۔

دیوان شعر بشار بن برد

مرتبہ مولانا سید بدر الدین علوی مرحوم [illegible]

[illegible] طباعت عمدہ، صفحات [illegible]، قیمت [illegible]، پتہ دار المصنفین [illegible]

بشار عباسی دور کا ایک مشہور صاحب دیوان شاعر تھا، لیکن اس کا مکمل دیوان ناپید

ٹائپ عمدہ ہے، مولانا عبدالعزیز میمنی مرحوم سابق پروفیسر عربی مسلم یونیورسٹی نے اس کے انتخاب کو جو خالدیان کے نام سے مشہور ہے ۱۹۳۴ء میں المختار من شعر بشار کے نام سے تصحیح و تعلیق کے بعد شائع کیا تھا، اور اسی زمانے سے انھوں نے مختلف کتابوں سے اس کے اشعار جمع کرکے مستقل دیوان کی جمع و ترتیب کا کام شروع کر دیا تھا، اور اس کو اپنی زندگی میں ترتیب و تحشیہ کے جملہ لوازم کے ساتھ مرتب کر چکے تھے جو ان کی وفات کے بعد اب شائع ہوا ہے، اس درمیان میں تیونس وغیرہ کے بعض فضلا نے بھی دیوان بشار شائع کیا ہے، لیکن زیر تبصرہ دیوان جو اگرچہ بشار بن برد کے کلام کا مکمل مجموعہ نہیں ہے، تاہم کلام بشار کے اب تک جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، ان میں یہ مجموعہ اس لحاظ سے سب سے جامع و مکمل ہے کہ وہ ہمزہ و الف سے لیکر یا تک پر مشتمل ہے، فاضل مرتب نے اس دیوان میں سالہا سال کی محنت و تلاش کے بعد بشار کے تمام اشعار کو جو ادب و محاضرات کی مختلف کتابوں میں بکھرے ہوئے تھے یکجا جمع کر دیا ہے، اور حاشیہ میں ان کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے، جہاں سے وہ لیے گئے ہیں، مختلف ماخذ میں روایات کے اختلافات اور الفاظ وغیرہ کا فرق بھی دکھایا گیا ہے،

دیوان بشار کے مختلف اصناف کلام یعنی مدح و ہجو، تشبیب و غزل، پند و نصائح اور مرثیوں وغیرہ پر مشتمل ہے، کتاب کے آخر میں کئی فہرستیں ہیں، سب سے آخر میں زیادات و استدراکات کے عنوان سے بشار کے کچھ مزید اشعار، دو مختصر نثری تحریریں اور بعض حوالجات درج ہیں جو محمد جعفری یونس کے قلم سے ہیں، اس دیوان کی اشاعت سے عربی ادب کی مفید خدمت انجام پائی ہے، امید ہے کہ عربی شعر و ادب کا ذوق رکھنے والے اس کی پوری قدر کریں گے۔

آثار الصنادید - از سر سید احمد خاں مرحوم، مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق [illegible] کلاں،

[illegible] صفحات [illegible] مجلد [illegible] قیمت [illegible] پتہ [illegible] پاکستان

ہسٹاریکل سوسائٹی، ۳۰ نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی ۵

سرسید احمد خاں مرحوم کی مشہور کتاب آثار الصنادید جو دلی کے آثار قدیمہ کی نہایت مستند اور جامع تاریخ ہے، مدتوں سے نایاب تھی، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کے سکریٹری اور العصر کے مدیر ڈاکٹر معین الحق نے بڑے اہتمام اور مفید حواشی کے ساتھ اس کو مرتب کیا ہے، اس کے شروع میں ان کے قلم سے ایک پرمغز معلومات مقدمہ اور آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل ہے، مقدمہ میں سلاطین دہلی اور مغل حکمرانوں کے زمانہ میں فن تعمیر کی ترقیاں اس کی خصوصیات اور اس سے ان کی دلچسپی وغیرہ کا ذکر ہے، ضمیمہ مشہور عمارتوں کے کتبوں پر مشتمل ہے جو محکمۂ آثار قدیمہ ہند کے ڈپٹی ڈائرکٹر مولوی ظفر حسن صاحب کی فہرست سے ماخوذ ہیں، اصل کتاب میں عمارتوں کے جو نقشے تھے ان کے بجائے اس میں صرف اہم عمارتوں کے فوٹو دیے ہیں، اس طرح ڈاکٹر صاحب نے اس کو اور زیادہ مفید اور دیدہ زیب بنا دیا ہے۔

اٹھارہ سو ستاون اخبار اور دستاویزیں مرتبہ جناب عتیق صدیقی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۴۴۲، مجلد قیمت عہ، پتہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار، دہلی۔

ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ۱۸۵۷ء ایک اہم اور یادگار تاریخی سال ہے، اس سال ہندوستانیوں کی جنگ آزادی اور انگریزوں کی غلامی کے خلاف ملک گیر احتجاج میں اس زمانہ کے ہندوستانی اخبارات کا بھی بڑا حصہ تھا جس سے اس زمانہ کی تاریخ کی ترتیب میں بڑی مدد مل سکتی ہے، لیکن ان کی اکثر فائلیں اب موجود نہیں ہیں، جناب عتیق احمد صدیقی صاحب جن کی کئی کتابیں قدیم اخبارات پر شائع ہو چکی ہیں، بڑی محنت و جانفشانی سے اس کتاب کے پہلے حصہ میں ۱۸۵۷ء کے [illegible] اخبار [illegible] صادق الاخبار اور اخبار الظفر وغیرہ کے

اقتباسات پوری تاریخ پیش کرکے، ایک ایسی غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کے جذبات ابھارنے میں [illegible] کا کتنا حصہ رہا ہے، دوسرے حصہ میں اس فساد کی مختلف دستاویزوں کو جن میں پہلی جنگ آزادی کے مجاہدوں کی تحریریں، خطوط، اشتہارات اور بعض سرکاری مراسلے وغیرہ شامل ہیں جمع کیا گیا ہے، بعض اقتباسات اور دستاویزوں کے عکس بھی دیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب بہت ہی پر از معلومات ہوگئی ہے، جو مورخین ہند کے لیے مفید اور مستند ماخذ ہو جائیگی۔

مطالعہ مثنوی گلزار نسیم۔ مرتبہ جناب مظفر احمد صدیقی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت متوسط، صفحات ۱۲۴، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۲ روپیہ، پتہ آل انڈیا میر اکیڈمی ۸۰، حامد روڈ، لکھنؤ۔

اس کتاب میں اردو کی مشہور مثنوی گلزار نسیم کا تجزیہ کرکے اس کے کردار، مکالمہ، منظر نگاری، ایجاز و اختصار اور زبان و بیان وغیرہ کی خوبیاں اور پلاٹ کے بعض نقائص مثالوں کے ذریعہ دکھائے گئے ہیں، مثنوی کے اندر جو چیزیں مافوق العادت ہیں، ان پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے، شروع میں پنڈت دیا شنکر کول نسیم کے مختصر حالات، قصہ کا خلاصہ، اس کے ماخذ اور مثنوی پر مولانا حالی مرحوم کے اعتراضات اور چکبست کے جوابات درج ہیں، یہ کتاب نہ صرف طلبہ کے لیے مفید ہے، بلکہ عام مطالعہ کے لیے بھی دلچسپ ہے۔

[illegible] از جناب ڈاکٹر غلام [illegible] صاحب نظامی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳، پتہ ادارہ اشاعت اسلامیہ [illegible]

یہ ڈاکٹر غلام [illegible] نظامی کی نظموں کا پہلا مجموعہ ہے، اس میں چند غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں، ان کی اکثر نظمیں [illegible] اور پرسوز [illegible]، قومیات اور موجودہ دور کے

دوسرے تاپیدا اور ابتر معاشرتی و سیاسی حالات کی اصلاح و تعمیر کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، ان کی نظمیں ان کے قابل قدر مذہبی و اخلاقی جذبات و خیالات کی آئینہ دار ہیں، ان سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی اور اخلاقی مریضوں کے بھی نبض شناس ہیں، انداز بیان سادہ ہے لیکن مصنف کے خلوص و صداقت کی وجہ سے ان کی نظموں میں اثر پیدا ہو گیا ہے۔

(۱) چین میں اسلام کا ماضی و حال ⎫ از ڈیو ڈ ڈبلیو فورسٹ کا رنا ڈ، مترجمہ جناب
(۲) ببول کے پیڑ ⎭ گوپال متل صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت

و طباعت عمدہ، صفحات ۶۴، ۷۲، قیمت ۴۰ و ۵۰ پیسے، نیشنل اکیڈمی ۹ انصاری مارکیٹ دریا گنج دہلی ۶

پہلے کتابچہ میں اسلام کی چین میں آمد، وہاں کی تہذیب و ثقافت کی تعمیر و تشکیل میں اس کے اثرات، مختلف حکومتوں کے زمانہ میں مسلمانوں کے حالات اور موجودہ کمیونسٹ حکومت میں ان پر کمیونسٹوں کے مظالم وغیرہ بیان کیے گئے ہیں، یہ کتابچہ ایک مسلمان چینی کے قلم سے ہے اسلیے مختصر ہونے کے باوجود قابل مطالعہ ہے۔

دوسرے کتابچے میں ایک چینی کسان کی آپ بیتی ہے جس نے کمیونسٹ حکومتوں کے زمانہ میں اپنے خاندان اور گاؤں کے معاشرتی اور مذہبی حالات ذکر کرنے کے بعد اپنے ترک وطن کا ذکر کیا ہے، یہ آپ بیتی عبرت انگیز اور کمیونسٹوں کے ظلم، تشدد، جبر اور شخصی ملکیتوں کے خاتمہ وغیرہ پر ایک پُر مغز تبصرہ بھی ہے، دونوں کتابچوں سے کمیونزم کے اصل خد و خال اور اس کے امن پسندی کے جھوٹے دعوے کی حقیقت پوری طرح ظاہر ہو جاتی ہے، ترجمہ کی سلاست و شگفتگی کے لیے لائق مترجم کا نام ہی ضامن ہے۔

جلد ۹۹ ماہ صفر المظفر ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۶۷ء عدد ۶

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

جمہوریہ ہند کی صدارت کے لیے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کا انتخاب حق بحقدار رسید کا مصداق ہے، ہندوستان میں اس عہدہ کیلئے ان سے زیادہ موزوں شخص مشکل سے مل سکتا تھا، وہ اپنے اوصاف و کمالات کے لحاظ سے بھی اس عہدہ کے مستحق تھے، اور روایۃً بھی نائب صدر ہی کو صدر ہونا چاہئے تھا، ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور صدارت کا عہدہ دونوں ایک دوسرے کیلئے باعثِ زینت ہیں، انکا انتخاب اس کا ثبوت ہے کہ ابھی کانگریس زندہ ہے، لیکن ان کی صدارت سے مسلمانوں کو کوئی غلط توقع قائم نہ کرنا چاہیے، ڈاکٹر صاحب حکومت کے سب سے بڑے نمائندہ ہیں، اسلیے اسکی پالیسی کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، البتہ بحیثیت سربراہ حکومت ان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے دور صدارت میں جمہوریت اور سیکولرزم کو صحیح معنوں میں زندہ کرنے کی کوشش کریں گے جس میں اقلیتوں کے حقوق بھی ہیں، ان کے ساتھ ایسا سلوک ہونا چاہیے کہ وہ بھی اپنے کو ہندوستان کا معزز شہری سمجھیں اور اکثریت کے مقابلہ میں اپنے کو فروتر محسوس نہ کریں۔

ڈاکٹر صاحب پکے نیشنلسٹ ہونے کے ساتھ راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہیں جس کا وہ علی الاعلان اظہار بھی کرتے رہتے ہیں، بلکہ ان کو اسلامی تہذیبی روایات کا نمائندہ کہنا صحیح ہوگا، مگر مسلمانوں کو حکومت کا رکن بننے کی کچھ نہ کچھ قیمت ضرور ادا کرنا پڑتی ہے، اس لیے اگر ڈاکٹر صاحب سے اس راہ میں بعض لغزشیں ہو گئیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے، البتہ ڈاکٹر صاحب جیسے ہوشمند مسلمان سے اسکی توقع نہیں تھی، مولانا ابو الکلام بھی حکومت کے رکن رکین تھے، لیکن انھوں نے اپنی کسی وضع میں فرق نہیں آنے دیا، ڈاکٹر صاحب سے امید رکھنا چاہیے کہ یہ لغزش اتفاقی ہے، اس سے ان کے اصلی مزاج میں فرق نہ آئے گا اور ہم کو امید ہے کہ وہ اس کو قائم رکھیں گے اور ہماری دعا ہے کہ ان کا دورِ صدارت ملک و ملت دونوں کیلئے مفید ثابت ہو۔

اردو کے معاملہ میں صوبائی حکومتوں سے کسی قسم کی کوئی توقع رکھنا بالکل بے سود ہے، ڈاکٹر ذاکر صاحب کی صدارت سے اس کا موقع پیدا ہو گیا ہے کہ اردو کا مسئلہ ان کے سامنے پیش کیا جائے، وہ برسوں انجمن ترقی اردو کے صدر رہ چکے ہیں، لکھنؤ کا اردو کنونشن ان ہی کی صدارت میں ہوا تھا، اور صدر جمہوریہ کی خدمت میں بیس لاکھ دستخطوں کا میمورنڈم بھی ان ہی کی قیادت میں پیش ہوا تھا، اس لیے اردو کے سب سے بڑے وکیل وہی ہیں، اس لیے انجمن ترقی اردو ہند کا ایک وفد ان کی خدمت میں جانا چاہیے کہ وہ جن مطالبات کو حق سمجھتے تھے اور جن کی قیادت انھوں نے خود کی تھی، اب وہ اس کے بارہ میں کوئی فیصلہ کریں، ان کی حق پرستی سے یہ امید نہیں ہے کہ جن مطالبات کو وہ صدارت سے پہلے صحیح سمجھتے تھے اب ان کو غلط سمجھنے لگیں۔

سرکاری پرائمری اسکولوں کا نصاب تمام تر ہندو مذہب اور اس کی تہذیب و روایات کا ترجمان ہے، جس کو مسلمان بچے بھی پڑھتے تھے اور مسلمانوں کی مسلسل شکایت کے باوجود وہ نہیں بدلا گیا، اسلیے انھوں نے خود اپنے آزاد مکاتب قائم کیے، جن میں حکومت کے معیار تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی ہوتی تھی، حکومت ہند نے جو تعلیمی کمیشن مقرر کیا تھا، اس نے اپنی رپورٹ پیش کر دی ہے، اس نے جو سفارشیں کی ہیں، ان میں بعض سفارشوں کی زد اسلامی مکاتب اور دوسرے آزاد مدارس پر بھی پڑتی ہے، اگر یہ سفارشیں منظور ہو گئیں تو ان مدارس اور مکاتب کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا جو اقلیتوں کے دستوری حقوق کے سراسر خلاف ہے، اور اس بارہ میں بمبئی ہائیکورٹ کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے، مگر ابھی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ سفارش کی منزل میں ہے، اس لیے مسلمانوں کو اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ جو سفارشیں کی زد اسلامی مکاتب اور آزاد مدارس پر پڑتی ہے، ان کو حکومت منظور نہ کرے، ورنہ ان سب کا وجود خطرہ میں پڑ جائے گا۔

ان سطروں کی تحریر کے وقت جب مرکزی کابینہ بن چکی ہے مگر ابھی نہیں کہا جا سکتا کہ آئندہ

واقعات کیا شکل اختیار کریں گے اور دونوں کے معاملات طے ہونے کی کیا صورت ہوگی، اندیشہ یہی ہو کہ مغربی طاقتیں اس معاملہ کو الجھا دینگی اور عربوں کو اپنے شرائط کا پابند بنانے کی کوشش کرینگی، یہ سارا فتنہ ان ہی کا کھڑا کیا ہوا ہے ورنہ تنہا اسرائیل میں عربوں کے مقابلہ کا کیا دم تھا، اس جنگ سے عرب حکومتوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے کہ وہ سب مل کر بھی اسرائیل کو زیر نہ کرسکیں بلکہ خود انکو پسپا ہونا پڑا، اگر اس سے ان حکومتوں کے مستقل اتحاد کا فائدہ حاصل ہوجائے تو بھی بڑی کامیابی ہو جس کی امید بہت کم ہے۔ اس جنگ میں ناصر کو بھی اپنی طاقت اور پوزیشن کا صحیح اندازہ ہوگیا ہوگا، شاید اس سے ان کو کچھ سبق حاصل ہو، اسکا بھی تجربہ ہوگیا کہ ایسے نازک موقع پر اسلامی اخوت ہی کام آتی ہے، اسلامی حکومتوں کے دلوں میں عربوں کے لیے جو تڑپ ہوگی وہ دوسروں میں ہو ہی نہیں سکتی، اگر کوئی دوسری حکومت سیاسی مصالح یا حق پسندی کی بنا پر ان کی زبانی حمایت بھی کرتی ہے تو ملک اس کا ساتھ نہیں دیتا، دونوں کی آواز مختلف ہوجاتی ہے، اور حکومت کو ملک و قوم کا ہدف بننا پڑتا ہے، اسلیے جو غیر مسلم حکومتیں عربوں کا ساتھ دے اس کا شکر گذار ضرور ہونا چاہیے لیکن پورا بھروسہ اسلامی حکومتوں ہی پر کرنا چاہیے، انکے ساتھ پورے ملک کی آواز ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ ۱۷ جون کو نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے انتقال کیا، وہ اس دور کے استاذ فن شاعر اور اردو زبان وادب کے نامور محقق تھے، اس کے جملہ متعلقات پر ان کی نظر بڑی گہری اور محققانہ تھی، اور اس میں ان کا قول سند کی حیثیت رکھتا تھا، ان کی ذات لکھنؤ کی تہذیب و شائستگی اور قدیم شرافت و وضعداری کا نمونہ تھی، ان کی زندگی کا بڑا حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا، کلکٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے لیکن تصنیف و تالیف و تلاش و تحقیق کا مشغلہ ہمیشہ جاری رہا، انھوں نے اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں پر محققانہ مضامین اور مستقل کتابیں لکھیں، ان کا سب سے بڑا کارنامہ فرہنگ اثر ہے جس کی پہلی جلد شائع ہوچکی ہے، ان کی وفات سے اردو زبان کا ایک بڑا محقق اور لکھنؤ کی قدیم تہذیب کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مقالات

تاریخ سائنس کا ایک ادھورا باب

از

جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اُن اصحاب علم میں ہیں جو سیکولر ذہن کے ساتھ اسلامی احساس بھی رکھتے ہیں، اور جدید علوم و افکار کے ساتھ اسلامی افکار و تصورات اور اسلامی تاریخ و ثقافت پر بھی ان کی پوری نظر ہے، ان کی تحریروں میں بھی وہ اعتدال و توازن ہوتا ہے جو سیکولر ذہن کے لوگوں میں نظر آتا ہے، یہ مقالہ بھی اسی شان کا ہے، یہ مقالہ انھوں نے دارالمصنفین کی جوبلی کے موقع پر پڑھا تھا مگر اس کے ساتھ دوسرے مقالات جو شامل نہ کیے گئے کہ اب تک شائع نہ ہو سکا، اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر اب اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔ "م"

دارالمصنفین اعظم گڑھ کا جشن طلائی گذرے ہوئے زمانے کی خوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ آنے والے زمانے کے لیے خوش آئند امیدیں لیے ہوئے آیا ہے۔ علم و حکمت کے خادم جناب شبلی اکیڈمی کے اہل قلم کو ان کی پچاس برس کی گراں قدر علمی خدمات پر صدق دل سے مبارکباد پیش کرتے ہیں

وہاں خدا سے یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ انھیں اس کی توفیق دے اور ان کے لیے اس کا سامان فراہم کردے کہ وہ اپنے تحقیق و اشاعت کے کام کو اس مشکل زمانے میں بھی اسی خوبی و خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے رہیں۔

اس مبارک موقع پر [redacted] اپنے پچھلے کاموں کا جائزہ لے رہے ہونگے اور اگلے کاموں کا منصوبہ بنا رہے ہونگے، میں انھیں ایک ایسے کام کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جسے وہ اپنے منصوبے میں شامل کرسکیں تو ایک عظیم الشان علمی خدمت انجام دیں گے۔

پہلے میں یہ عرض کردوں کہ وہ کام کیا ہے، پھر اس کی اہمیت اور ضرورت پر بحث کروں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ مختلف سائنسوں یعنی علوم حکمیہ کی تاریخیں یورپ اور امریکہ میں مدت سے لکھی جارہی ہیں، لیکن مجموعی طور پر سائنس کی ہمہ گیر تاریخ لکھنے کا خیال ابھی چوتھائی صدی سے پیدا ہوا ہے۔ ابتک جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں ان میں جارج سارٹن کی کتاب Introduction to The history of Science اور آلڈو میلی کی کتاب پینوراما جنرال دو ہستوریا دہ لا سینسیا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جدید ترین تاریخ سائنس موسیو رینے تاتون کی نگرانی میں چار جلدوں میں لکھی جارہی ہے۔ ان میں سے پہلی جلد میں ابتدائے تہذیب انسانی سے ۱۴۵۰ء تک علوم حکمیہ کے ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں پیرس میں چھپی اور اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۶۳ء میں لندن میں شائع ہوا۔ تینوں کتابوں کے مصنفین منصف مزاج اور [illegible] ہیں اس بات کا [illegible] اعتراف کرتے ہیں کہ قرون وسطیٰ میں عالم اسلامی کو علوم و فنون کا سب سے بڑا اور سب سے ترقی یافتہ مرکز ہونے کی حیثیت سے جو اہمیت اور عزت حاصل تھی اس کا اب تک سائنس کی دنیا کو کوئی اندازہ نہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کی علمی خدمات کے بارے میں ابھی تک بہت ناکافی مطبوعہ مواد فراہم ہو سکا ہے۔ [illegible] اور کچھ زیادہ افسوس ناک نتیجہ یہ ہے کہ [illegible]

تحریر تو جو ابھی تک جاری ہے اس کی کڑیاں تو کئی نہیں مل سکی ہیں اور تاریخ سائنس دھندلی ہو گئی ہے ظاہر ہے کہ جو ادارہ عرب ملک مورخوں اور سائنس دانوں کے اشتراکِ عمل سے اس کی تکمیل میں مدد کر سکے گا اس کا دنیائے سائنس پر بڑا احسان ہوگا،

اب یہ بھی سن لیجیے کہ قرونِ وسطیٰ میں عالمِ اسلام کی علمی کاوشیں نہ صرف علوم و فنون کی تاریخ میں بلکہ عام طور پر تہذیب و تمدن کی تاریخ میں کیا اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اصل مطلب کو بیان کرنے سے پہلے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے،

اب تک تاریخ سائنس کا جو مواد حاصل ہوا ہے اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ولادتِ مسیح سے تین ہزار سال قبل تہذیب انسانی اور اسی کے ساتھ علم انسانی نے دنیا کے چار خطوں میں خاصی ترقی کر لی تھی ـــــ ہندوستان، چین، مصر اور عراق عرب۔ ان میں سے چین اور ہندوستان کے اس عہد کے علمی سرمائے کے بارے میں کچھ مبہم اشارے ملتے ہیں مگر کوئی واضح معلومات حاصل نہیں ہوتیں۔ البتہ عراق عرب اور اس سے زیادہ مصر کے لیے کسی قدر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں اس زمانے میں تحریر کا فن ایجاد ہو چکا تھا اور ریاضی، ہیئت اور طب کی اچھی خاصی معلومات فراہم ہو گئی تھیں۔ مصری تہذیب کے عروج کا دور دو ہزار سال قبل مسیح سے لیکر ایک ہزار سال قبل مسیح تک تھا۔ اس دور کی اونچی عمارتیں یعنی اہرامِ مصر کی تعمیر قدیم اہلِ مصر کی علمی اور تہذیبی ترقیوں کا کافی ثبوت ہے،

ایک ہزار سال قبل مسیح کے لگ بھگ جب ہندوستان اور چین میں علوم و فنون راہِ ترقی پر گامزن تھے، مصر اور عراق عرب میں علمی انحطاط کا دور شروع ہو گیا تھا مگر قدرت جس طرح صفحاتِ دہر کے ایک دور کو بھی مٹائے بغیر نہیں رہنے دیتی، اسی طرح اپنے اشرف مخلوق کا کوئی وراثت بھی برباد ہونے سے محفوظ رکھتی ہے اور اس میں کسی قدر کا اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے،

البتہ اس کے حامل اور حافظ بدل جاتے ہیں، جب اہل مصر اور اہل عراق میں اپنے بزرگوں کے علمی ترکے کا بوجھ اٹھانے کی طاقت نہیں رہی تو اہل یونان نے بڑھ کر اسے اپنے مضبوط کندھوں پر اٹھا لیا، اور سنہ [illegible] قبل مسیح تک مصر و عراق کی علمی میراث یونان کو منتقل ہوتی رہی، اس وقت سے [illegible] بعد مسیح تک تیرہ سو سال کا زمانہ تاریخ سائنس میں یونانی علم و حکمت کا دور ہے، اس میں سے پہلے آٹھ سو سال میں یعنی طالیس اور بقراط سے لیکر جالینوس تک اہل یونان نے نہ صرف طبیعیات، ریاضی اور طب کی ان معلومات میں جو انھیں اہل مصر و اہل عراق سے پہنچی تھیں، بہت بڑا اور بہت بیش بہا اضافہ کیا، بلکہ اسے منطقی اساس پر قائم کر کے باضابطہ علم کی شکل دیدی، اس کے علاوہ انھوں نے منطق، اخلاقیات اور مابعد الطبیعیات کے نئے علوم کی بنیاد ڈالی، اہل یونان کو مبدأ فیاض نے حیرت انگیز ذہانت اور علمی بصیرت بخشی تھی، وہ معروضیت، دقت نظر اور صحت فکر جسے ہم scientific attitude of mind یعنی علمی انداز نظر کہتے ہیں، (صاحب طبقات الامم ابن صاعد الاندلسی نے الاعتناء بالعلم کے نام سے موسوم کیا ہے) اپنی ابتدائی شکل میں اہل یونان ہی نے دنیا کو دیا تھا، حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد دو سو سال کے عرصے میں عیسائیوں کے تعصب اور تقشف کی بادسموم نے یونان میں علم و حکمت کے باغ کو جھلسا دیا، اہل روما جو اس کی پود اپنے ساتھ لے گئے تھے، وہ تین سو سال تک جیسے تیسے اس کی آبیاری کرتے رہے، مگر اس کی تازگی اور شادابی کو قائم نہ رکھ سکے،

مگر قدرت کی کارسازی اپنے کام سے غافل نہ تھی، چنانچہ [illegible] سو سال کے عرصے میں جب جنوب مغربی یورپ میں یونانی ذہن حکمت طبیعی کی تخلیق میں مصروف تھا، جزیرۃ العرب میں سامی ذہن حکمت الٰہی کی تفسیر و تعبیر میں مصروف تھا، اُدھر حکمت و صنعت کا امانت کے [illegible] تسلیم و [illegible]

اور ذہنی تربیت کا اہتمام ہو رہا تھا، جو عربوں کے اخلاقی اور روحانی ضبط کا انتظام کیا جا رہا تھا،

دنیا کے یہ دو خطے جن میں علم و حکمت کے یہ دو دھارے بہ رہے تھے، ایک دوسرے سے بقدر قریب تھے کہ ان کا ایک نہ ایک دن ملنا ضروری تھا، ان کا پہلا سنگم دوسری صدی عیسوی میں شام میں نظر آتا ہے، جہاں یونانیوں کی نوآبادیاں تھیں، مگر اس زمانے کی عیسائیت کے آب شور کی لہروں کا یونانیت کے آب شیریں سے ملنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا دریا ایک [illegible] بن گیا، آب شیریں کے سوتے سوکھ گئے، یونانی ذہن کی زمین بنجر ہو گئی، شام و فلسطین کے نوآباد یونانیوں میں جنہوں نے عیسائی ہونے سے انکو خود اپنی تہذیبی میراث سے اس قدر تعصب پیدا ہو گیا تھا کہ ططیان نام یونانی الاصل شامی عیسائی جو جالینوس کا ہم عصر تھا، کہتا ہے "یونانی ذہن نے کوئی اختراع اور کوئی ایجاد نہیں کی، اس کا سارا علم مانگے کا تھا، سب اہل بابل، [illegible]، فنیقیوں اور مصریوں سے لیا تھا، صرف دو فن ہیں جن میں انہیں فوقیت حاصل تھی، "فن تحریر اور دروغ گوئی میں""

ظاہر ہے کہ اس فضا میں جو شام کے بعد خود یونان میں بھی پیدا ہو گئی، علم و حکمت کا پنپنا کسی طرح ممکن نہ تھا،

مگر پانچ سو سال بعد یونان کی حکمت طبیعی اور جزیرۃ العرب کی حکمت الٰہی کے دھاروں کا ایک اور سنگم ہوا، جو "مرج البحرین یلتقیٰن" کا مصداق تھا، اس قید کے ساتھ کہ دونوں دھارے ساتھ ساتھ بہنے لگے، مگر پھر بھی ان میں ایک غیر مرئی فصل باقی رہا، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ساتویں صدی عیسوی میں عرب میں اسلام کا ظہور ہوا اور اس نے انسان کے عقل و ادراک کو ان زنجیروں سے جن میں جامد مسیحیت نے اسے جکڑ رکھا تھا، رہا کر دیا، [illegible] وسط ایشیا سے مغرب اقصیٰ اور اندلس تک عرب مسلمانوں نے نہ صرف تین اقلیموں میں اپنی حکومت کا جھنڈا گاڑ دیا بلکہ تین تمدنوں یعنی قدیم مشرقی، بابلی اور یونانی

تہذیبوں کی بہترین علمی میراث کو اپنے قبضہ تصرف میں لے آئے، اگرچہ اہل عرب یا مسلمانوں کے علم و حکمت میں غالب رنگ وہی تھے ـــ اسلامیت کا مذہبی اور اخلاقی رنگ اور یونانیت کا فکری اور علمی رنگ ـــ انھوں نے کم و بیش سات سو سال تک یونانی علم و حکمت کی جس میں اب ہند و ایران کی علمی دولت بھی شامل ہو گئی تھی، نہ صرف حفاظت کی بلکہ اس میں اپنی طرف سے قابل قدر اضافہ بھی کیا، آٹھویں صدی کے وسط سے گیارہویں صدی تک یعنی جابر ابن حیان کے زمانے سے عمر خیام اور ماوردی کے زمانے تک عالم اسلام میں سیاسی وحدت اور علوم و فنون کی ترقی کا دور تھا، اس کے بعد کے ساڑھے تین سو سال میں سیاسی انتشار کے ساتھ ساتھ مجموعی طور پر ذہنی انحطاط کا عمل جاری رہا، اگرچہ اکا دکا جید عالم و مفکر جیسے ابن خلدون اور ابن رشد آئندہ صدیوں میں بھی پیدا ہوتے رہے، بارہویں صدی کے شروع سے پندرہویں صدی کے وسط تک وہ عبوری دور رہے جن میں علم و حکمت کے خزانے عربی سے لاطینی اور عبرانی میں ترجمہ ہو کر یورپ میں پہنچ گئے، اس عرصے میں مشرقی ذہن میں علم و حکمت کے سوتے ہلکے ہوتے ہوتے بالکل خشک ہو گئے، اور مغربی ذہن میں دھیرے دھیرے نئے سوتے کھل کر زور شور سے ابلنے لگے، علم و حکمت کا عربی اسلامی دور ختم ہوا اور مغربی دور شروع ہوا۔

تاریخ سائنس کے عربی اسلامی دور کا اس ناقص و ناتمام جائزے سے جو ابتک مغربی محققوں نے لیا ہے، اتنا تو ثابت ہو گیا کہ اس زمانے میں نہ صرف یونانی علم و حکمت کے خزانے کی حفاظت اور اس میں اضافہ کیا گیا بلکہ ایک معاملے میں مسلمانوں کی علمی فکر یونانی فکر سے کہیں آگے بڑھ گئی تھی، اور جدید دور کی سائنس کے قریب پہنچ گئی تھی، یعنی تجربی طریقوں کی دریافت اور نظری علم کا عملی استعمال، سرجیا ان نے اپنی کتاب [illegible] The science [illegible] میں عربی اسلامی دور کے کارناموں کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے

"عربوں کی سائنس کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ
یہ بات کہ وہ صرف قدما کے افکار کو جانشینوں تک منتقل کرنے والے تھے، حقیقت سے بہت دور ہے۔
انھوں نے دنیا میں علمی ذوق کو نئے سرے سے پیدا کیا اور یونانیوں کے نظریات کو عملی تجربے
کی کسوٹی پر پرکھا۔ اسی لگن کا جو انھوں نے سائنس کے عملی استعمال میں دکھائی، یہ نتیجہ تھا کہ وہ
محض بے حقیقت علم کیمیا کے حیرت انگیز آلات کے موجد ہوئے۔ انھوں نے تاریخ میں پہلی بار
اسپتال قائم کیے جن میں وہ نہ صرف مریضوں کا علاج کرتے تھے بلکہ طبیبوں کی ٹریننگ
اور علمی تحقیقات کا کام بھی انجام دیتے تھے۔"

"وہ علم و حکمت کی شمع کو جسے مغرب عہد وحشت و جہالت میں گل کر دیا تھا، بحر روم کے کنارے
بسنے والی ایک قوم نے روشن رکھا، جس کے فرزند شب و روز اسی دھن میں رہتے تھے
کہ وہ فطرت کے جلوے پریشاں اور ہر رنگ میں دیکھیں اور اس کی عظمت و قدرت کے
گن گائیں۔"

مگر جیسا کہ ہم پہلے اشارۃً کہہ چکے ہیں موسیو تالین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اب
مسلمانوں کی علمی جد و جہد کے بارے میں ہماری تاریخی معلومات اب تک جس مرحلے پر پہنچی ہیں، اس
پر اعتماد مشکل ہے کہ ہم اس کی وسعت و عظمت کا اور ان اثرات کا جو اس نے باقی دنیا پر ڈالے ہیں
صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں جو دقتیں پیش آتی ہیں وہ موسیو تالین کے نزدیک یہ ہیں کہ گو ایسی کتابیں
جن سے اخذ کا کام لیا جا سکتا ہے، کافی تعداد میں موجود ہیں لیکن ان کتابوں میں جو اصلی
مصنفوں کی عبارتیں نقل کی گئی ہیں، ان میں بعض غائب ہو گئی ہیں، بعض کے مصنف کے نام
نہیں دیے گئے ہیں، اس لیے ان کا پتہ لگانا دشوار ہے۔ بعض مخطوطات کی شکل میں موجود ہیں جو ناقص

سے دستیاب نہیں ہوتے، پھر جو کتابیں مل بھی جاتی ہیں، ان کی عبارتوں کو سمجھنے، پچھلی اور اگلی زبان کے سیاق و سباق اور ماخذوں کے بارے میں بہت کچھ تحقیقات کی ضرورت ہے۔"

ان دقتوں کے علاوہ ایک دقت اور بھی ہے جس کی طرف فاضل مورخ کا ذہن منتقل نہیں ہوا۔ میں نے کہا تھا کہ حکمت اسلامی اور حکمت یونانی کے دھاروں کا ملنا کلام مجید کی آیۂ مبارکہ "مرج البحرین یلتقیٰن" کا مصداق تھا، آیت کے دوسرے ٹکڑے "بینہما برزخ لا یبغیٰن" کی طرف محض اشارہ کر کے چھوڑ دیا تھا۔ میرے خیال میں یونانی ذہن اور اسلامی ذہن کے درمیان وہ فصل جو کسی طرح دور نہیں ہو سکتا یہ تھا کہ یونانی حکمت تمام تر دنیوی یا سیکولر تھی اور اسلامی حکما میں سیکولر طرز خیال کی تہ میں مذہب کا اثر خفی یا جلی صورت میں ضرور موجود ہوتا تھا۔ جدید ذہنوں کے ان ذہنوں کے لیے جنھوں نے قدیم یونانی سیکولرزم اور جدید مغربی سیکولرزم کی فضا میں تربیت پائی ہے، عربی اسلامی حکمت کی گہرائی میں اتر کر اس کی تہ تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ کام جیسا چاہیے صرف مشرق کے وہ مسلمان علما انجام دے سکتے ہیں، جو عرب اسلامی فکر کی گود میں پلے اور بڑھے ہیں اور جدید علم و حکمت سے بھی بخوبی واقف ہیں۔"

کام نہایت اہم اور ضروری ہے، نہ صرف اس وجہ سے کہ اس پر تاریخ سائنس کے ایک دوسرے باب کا پورا ہونا اور عالمی علم و حکمت کے سلسلے کی کڑی سے کڑی ملنا منحصر ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اس کے ذریعے سے وہ جمود جو مسلمانوں کے ذہن پر مسلط ہے اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں سے فیضان حاصل کر کے دور ہو سکتا ہے، اور اس میں وہ حرکت اور تازگی پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ دنیا کی علمی ترقیوں میں حصہ لینے کے قابل ہو جائے۔

وہ مردان کار جن میں اس کام کو سر کرنے کی صلاحیت موجود ہے آگے بڑھیں اور تاریخ سائنس کی تکمیل اور مسلمانوں کے ذہن کی نشاۃ ثانیہ کی خاطر اسے ترتیب عمل میں لائیں:

[illegible]

فارسی لغات کی تدوین میں ہندوستان کا حصہ

از جناب امام مرتضیٰ صاحب نقوی ایم اے، پی ایچ ڈی (دہلی) ایسوسی ایٹ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف
اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی

پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے اپنی مشہور تصنیف "تاریخ ادبیات ایران" میں فارسی کی صرف دو لغتوں کا ذکر کیا ہے، ایک مجمع الفرس دوسرا فرہنگ انجمن آرائے ناصری۔ مجمع الفرس محمد قاسم کاشانی نے لکھی تھی، جو طوس کے رہنے والے تھے، ان کے باپ ابو نصر احمد بن منصور الاسدی فردوسی کے دوست اور ہمعصر تھے، اس لغت کا خود مصنف کے قلم کا لکھا ہوا ایک نسخہ مرقومہ ۱۰۵۵ء ویانا میں اب بھی موجود ہے،

فرہنگ انجمن آرائے ناصری جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، رضا قلی خاں ہدایت نے شاہ نصیر الدین قاچار کے عہد میں لکھی، اس کے مطبوعہ نسخے ہندوستان میں اب بھی ملتے ہیں، ایرانیوں کے لکھے ہوئے بعض اور لغات بھی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے چند ہی لغت تیار کیے،

فارسی لغت کا سب سے زیادہ کام ہندوستان میں ہوا، اس کو ہم دو دوروں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی پہلا دور سنہ ۱۳۱۲ء سے ۱۶۵۵ء تک، دوسرا ۱۶۵۲ء سے ۱۸۲۳ء تک، پہلے دور میں لغت کی مدد کے لیے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا گیا، اس دور میں فرہنگ قواس، زفان گویا، ادات الفضلا، شرفنامہ ابراہیمی، مدار الافاضل، فرہنگ جہانگیری اور برہان قاطع لکھی گئیں، دوسرے دور میں فرہنگ رشیدی، مصطلحات الشعراء، سراج اللغات، بہار عجم اور

غیاث اللغات معرض وجود میں آئیں۔

ہندوستان میں جو فارسی لغتیں تیار ہوئیں ان کی تاریخ وار ترتیب حسب ذیل ہے۔

فرہنگ نامۂ قواس (۱۲۹۹ء سے ۱۳۲۰ء کے درمیان) زفان گویا (۱۳۵۲ء کے لگ بھگ) اداۃ الفضلاء (۱۴۱۹ء) شرفنامۂ ابراہیمی (۱۴۳۴ء کے بعد اور ۱۴۷۳ء سے قبل) موید الفضلاء (۱۵۱۹ء) مدار الافاضل (۱۵۹۳ء) فرہنگ جہانگیری (۱۶۰۸ء) برہان قاطع (۱۶۵۲ء) فرہنگ رشیدی (۱۶۵۳ء) سراج اللغات (۱۷۳۹ء) بہار عجم (۱۷۳۹ء اور ۱۷۶۸ء کے درمیان) مرآت الاصطلاح (۱۷۵۹ء) مصطلحات الشعراء (۱۷۸۲ء) غیاث اللغات (۱۸۲۳ء)

ہندوستان کے قریب قریب ہر صوبے میں فارسی کے ایک یا دو لغت تیار ہوئے، مثلاً بنگال میں شرفنامۂ ابراہیمی۔ بہار میں کشف اللغات، دکن میں برہان قاطع، اتر پردیش میں اداۃ الفضلاء، موید الفضلاء اور غیاث اللغات، دہلی میں سراج اللغات، مرآت الاصطلاح اور بہار عجم، پنجاب میں مدار الافاضل، فرہنگ جہانگیری اور مصطلحات الشعراء، سندھ میں فرہنگ رشیدی اور کشمیر میں آئینہ عطا۔

ایران کو بھی جس نے امیر خسرو اور فیضی کے علاوہ کسی بھی ہندوستانی کو فارسی داں تسلیم نہیں کیا، ہندوستانیوں کے اس کارنامے کا اعتراف کرنا پڑا۔

پہلے دور میں ہر امکانی ذرائع سے مواد فراہم اور استفادہ کیا گیا۔ ۱۲۹۹ء سے ۱۳۲۰ء کے درمیان علاء الدین خلجی کے عہد میں قواس نے فرہنگ نامۂ قواس مرتب کی جو ہمارے زمانے کے بعد تک ... پائے جاتے ہیں ... فیروز شاہی اور تاریخ فرشتہ میں اس کا ذکر ہے فرہنگ نامہ ہندوستان میں فارسی ...

جہانگیری بنیادی طور پر اس کی بہت مرہون ہے اسی بنا پر ہے کہ مصنف نے فارسی الفاظ کی تشریح کرتے وقت بعض موقعوں پر ہندی الفاظ لکھ دیے ہیں۔ پروفیسر محمود شیرانی نے اپنی کتاب پنجاب میں اردو میں اس کی مثالیں پیش کی ہیں۔

فرہنگ نامہ کے بعد اس کی تقلید میں ۸۳۵ھ کے لگ بھگ بدر ابراہیم نے زفان گویا وجہان پویا کے نام سے ایک فرہنگ مرتب کی۔ فرہنگ جہانگیری کے مولف نے صرف بدرالدین لکھا ہے۔ لیکن پروفیسر سید حسن[1] کا خیال ہے کہ مولف کا پورا نام بدرالدین ابراہیم ہوگا۔ فرہنگ جہانگیری کے مولف نے جن چالیس فرہنگوں کو اپنا ماخذ بنایا ہے ان میں زفان گویا بھی ہے۔ اس کا صرف ایک نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ہے۔ باقی کسی لائبریری میں کسی دوسرے نسخے کی اطلاع نہیں ملی۔

اس نسخہ کی حالت بہت خستہ ہے۔ بیشتر الفاظ ناقابل قرأت ہو گئے ہیں۔ کتاب میں پہلے تقریباً چار صفحوں کو کاٹ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد بعض مقامات مسخ شدہ ہیں جس کی وجہ سے عبارت ناقص ہو گئی ہے۔ اس کے بعد مولف نے کتاب کے ابواب اور فصول مقرر کر کے ان کے تحت الفاظ کے معنی لکھے ہیں۔ تمام تشریحات سات حصوں (بابوں) میں تقسیم کیے گئے ہیں اور ہر حصہ میں فصلیں بھی مقرر کی گئی ہیں۔

مولف نے زفان گویا کی ترتیب میں حسب ذیل فرہنگوں سے مدد لی ہے۔ لغت فرس اسدی، فرہنگ قواس، مثلاً نصیر، فرہنگ زوزنی، اور ... ہے کہ جو کچھ ... کیا ... ان سب کو درست کر کے ... کے ساتھ لکھا ہے۔

۱؎ فارسی کی ایک قدیم فرہنگ زفان گویا ... ۱۹۶۲ء

فرہنگ جہانگیری جمال الدین انجو نے اکبر و جہانگیر کے عہد میں لکھی اور اس کو شہنشاہ جہانگیر کے نام معنون کیا ہے، اور اسی سے اس کی تاریخ تصنیف نکالی ہے۔

مرتب گشت این فرہنگ نامی — باسم شاہ جمجاہ جہانگیر
چو جستم سال تاریخش خرد گفت — زہے فرہنگ نورالدین جہانگیر

فرہنگ جہانگیری میں وہ تمام الفاظ شامل ہیں، جو اس وقت تک مل سکے، فرہنگ سے پہلے مقدمہ بارہ آئین پر مشتمل ہے، ہر آئین میں مختلف چیزوں پر بحث کی گئی ہے، مثلاً پہلے آئین میں ملک فارس کی وجہ تسمیہ بتائی گئی ہے، دوسرے میں فارسی زبان پر بحث کی گئی ہے، تیسرے میں حروف تہجی کا بیان ہے، چوتھے میں لغت کی ترتیب کا ذکر ہے، پانچویں، چھٹے، ساتویں، آٹھویں نویں، دسویں، گیارہویں اور بارہویں میں حروف تہجی، علامات، ضمائر، کلمات، اسماء، و افعال اور اسلے وغیرہ کا تفصیل سے بیان ہے، اگرچہ فرہنگ جہانگیری میں الفاظ پر ناقدانہ نظر نہیں ڈالی گئی ہے، پھر بھی اسے ایک جامع لغت تسلیم کیا جاتا ہے، فرہنگ جہانگیری نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں کافی مقبولیت حاصل کی، قدیم ایرانی ادب میں جو الفاظ پائے جاتے ہیں، مصنف نے مثالوں سے وضاحت کے ساتھ ان کو بیان کیا ہے، رشیدی اور خان آرزو نے اپنے زمانہ میں اس پر تنقید کی اور اس میں حذف و اضافے کیے۔

محمد حسین تبریزی نے برہان قاطع کے نام سے ایک لغت مرتب کی، یہ بھی فرہنگ جہانگیری کی طرح جامع لغت ہے، لیکن اس میں حوالوں کی کمی ہے، برہان قاطع کی تصنیف نے ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا، سب سے پہلے خان آرزو نے سراج اللغات میں اس کی خامیوں کا اظہار کیا، پھر ایک صدی کے بعد مرزا غالب نے اس کی رد میں ایک کتاب قاطع برہان لکھی جس پر بڑی لے دے ہوئی جس کا ذکر حالی نے یادگار غالب میں کیا ہے، غالب کی

کتاب کے نکلنے پر اس کی تردید میں رحیم بیگ نے ساطع برہان لکھی، سعادت علی نے محرق قاطع برہان۔ امین الدین کی قاطع القاطع۔ احمد علی کی مؤید برہان۔ پھر غالب نے تیغ تیز اور اس کے جواب میں احمد علی نے شمشیر تیز تر لکھیں۔ ڈاکٹر عبدالودود کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علاوہ اور بھی چند کتابیں تھیں جو شائع نہیں ہو سکیں لیکن برہان قاطع کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ ان میں سے کسی اور کو نہ ہو سکی۔

برہان قاطع کا ایک نیا ایڈیشن حال ہی میں تہران سے شائع ہوا ہے جس کو ڈاکٹر محمد معین نے ایڈٹ کیا ہے، اس کے شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں ہندوستان کے لغت نویسوں کے کام کو سراہا گیا ہے۔

عبدالرشید نے ایک لغت فرہنگ رشیدی تیار کی جس میں ان تمام اغلاط کی تصحیح کی جو فرہنگ جہانگیری میں تھیں، اس میں مرتب نے بڑی تحقیق سے کام لیا ہے، مقدمہ میں حروف تہجی پر تفصیل سے بحث کی گئی ہے کہ کونسے حروف عربی کے ہیں اور کون سے فارسی کے۔ بلاک مین کی رائے ہے کہ عبدالرشید نے بہت احتیاط سے کام لیا ہے، دوسرے لغات سے مشتبہ الفاظ نہیں لیے ہیں، اگر اتفاقاً ایسا کوئی لفظ آ گیا ہے، وہاں صاف لکھ دیا ہے کہ یہ لفظ مشتبہ ہے یا خدا بہتر جانتا ہے۔

خان آرزو کی سراج اللغات دوسری لغتوں کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے، خان آرزو نہایت ذہین اور بڑے زبان داں تھے، فارسی کے ساتھ سنسکرت سے بھی شوق تھا، جب مصنف نے یہ کام شروع کیا اس وقت ملک کے حالات ناخوشگوار تھے، اس لیے کسی اس کام میں بہت کم مدد کی، لیکن مصنف نے جس تحقیق اور محنت سے کام کیا ہے وہ انھیں کا حصہ تھا۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ جہاں تک الفاظ کی صحت اور اسلوب بیان کی وضاحت کا تعلق ہے

فرہنگ رشیدی میں انفرادی حیثیت رکھتی ہو، اور جامعیت کے لحاظ سے برہان قاطع کی بے مثل کتاب ہے
اس کے باوجود ان دونوں میں کچھ خامیاں ہیں، مثلاً برہان قاطع میں صحت الفاظ کی طرف توجہ
ان خامیوں کو دور کرنے کے لیے میں نے یہ کتاب لکھی ہے، اس لیے جن الفاظ کی تشریح فرہنگ رشیدی
اور فرہنگ جہانگیری میں موجود ہے میں نے ان کو دہرانے سے احتراز کیا ہے۔

سراج اللغات اگرچہ آزادانہ تحقیق ہے، پھر بھی خان آرزو نے مجمع الفرس، فرہنگ رشیدی، مؤید الفضلاء، [illegible]، برہان قاطع، فرہنگ جہانگیری، کشف اللغات، گلستان اور مثنوی مولوی کی شرحوں سے استفادہ کیا ہے، ان کے علاوہ ایک ایرانی کی قلمی فرہنگ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

سراج اللغات کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فرہنگ رشیدی اور برہان قاطع کی وضاحت ہے، خان آرزو نے مجمع النفائس میں لکھا ہے کہ ٹیک چند بہار نے اپنی بہار عجم اور علاوہ [illegible] خان ندرت نے [illegible] میں اسی کو بنیاد بنایا ہے۔

حیرت ہے کہ مستشرقین نے خان آرزو کے اس کارنامے کو نہیں سراہا، حالانکہ لسانیاتی نقطۂ نظر سے ان کی تحقیق بڑی اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ اس میں سنسکرت اور فارسی زبان کا تقابلی جائزہ بھی لیا گیا ہے، اور اس سے ہند ایرانی تعلقات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

سراج اللغات کے قلمی نسخے صرف چند ہیں، ایک رضا لائبریری رام پور میں، ایک ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں، اور ایک انڈیا آفس لائبریری لندن میں ہے۔

خان آرزو کے شاگرد وارستہ نے [illegible] مصطلحات [illegible] کے نام سے ایک فرہنگ تیار کی، اس میں وہ تمام الفاظ ہیں جو اہل عجم کے محاورات [illegible] استعمال کیے ہیں، مگر مصنف نے دیباچے میں اپنے استاد کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف اتنا لکھا ہے [illegible] «والفاظ معتبر با تحقیق رسیدہ»

عہد میر عبدالغنی کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ چنانچہ میر واضح اور قبول وغیرہ مشہور شعرا
شفائی، علی نقی کمرہ ای، شرف الدین پیام، علی حزیں، صائب، میرزا نجات وغیرہ کے شعر بطور
سند پیش کیے ہیں۔ مخلص خود دیباچے میں لکھتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس طریقہ پر اعتراض ہے کہ

"صاحبان این فن بر اقسام حروف خورده گیرند کہ اینہمہ قسم اسناد است کہ گاہ از متأخرین
بر نویسد و گاہ از عنایت خان"

مخلص نے اس کا جواب یہ دیا ہے

"معلوم باد کہ ایشان اہل ایران اند و زبان دان ہستند و در زمانِ [illegible] مثل
میرزا صائب و طالب و کلیم و قدسی و سلیم رفیق شان بودند"

مخلص نے چراغ ہدایت، سراج اللغات، بہجت سالک، تحفۃ السامی، فرہنگ جہانگیری
واقعات بابری کا ذکر جا بجا کیا ہے۔

لغت کو حروف تہجی کی ترتیب پر مرتب کیا ہے اور صرف محاورات اور استعارات
وغیرہ کا اندراج کیا گیا ہے۔ ہر ردیف کے آخر میں مثالیں دی گئی ہیں۔ بعض جگہ مخلص راستے
سے بھٹک بھی گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ لفظ "نیلگر" کے تحت میں خوش نویسوں کا ذکر آگیا ہے اور
وابستہ تذکرہ شعر نویس کا بھی تذکرہ ہے۔ یا لفظ "حزیں" کے تحت میں فارسی شاعر شیخ محمد علی حزیں
کا بھی ذکر کر دیا ہے، جو اس وقت دلی میں مقیم تھے۔ کہیں کہیں اپنے تجربات بھی بیان کیے
ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبداللہ "مرآت جہاں ایک لغت کی کتاب ہے، اور اس کا ایک بڑا حصہ بھی ہے
جو محاورات کے ادب کے لیے جاذب توجہ ہے"[1]

اس کتاب سے بعض تاریخی واقعات اور معاشرتی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے [illegible]

---

[1] [illegible] ڈاکٹر عبداللہ

سلطنت ہندوستان کے رسم و رواج بہت اور مختلف شہروں کی خصوصیات کا بھی جگہ جگہ ذکر ہے، انتظام سلطنت میں حکومت کے دستور العمل، منصب کی تفصیل، وزیروں کے تقرر کا طریقہ، سرکاری خط و کتابت کے متعلق مختلف ضوابط، درباروں میں لباس کی تخصیص وغیرہ کا بیان بھی آگیا ہے۔

ہندوستان کی شادی کے ذکر میں اس کی رسوم کو بھی بیان کیا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی مختلف قسم کے معلومات ہیں، مثلاً فیتے کے آلات پٹنہ میں نہایت عمدہ بنتے ہیں، عطر گلاب پٹیالہ میں بکثرت ہوتا ہے، زربفت احمد آباد میں تیار ہوتا ہے، وغیرہ۔

اس فرہنگ کے صرف دو نسخے ملتے ہیں، ایک لاہور میں اور ایک پٹنہ میں۔ ٹیک چند بہار نے بہار عجم مرتب کی۔ اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ ۱۱۴۳ھ سے ۱۲۸۰ھ تک سات مرتبہ شائع ہوئی[1]، اور ہر اشاعت میں اس میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ بہار نے اپنی فرہنگ میں خان آرزو کی تنبیہ الغافلین بھی شامل کی ہے، یہ ایک تنقید ہے جو خان آرزو نے شیخ علی حزیں پر لکھی ہے۔ اس کے علاوہ محمد افضل ثابت الہ آبادی کا ایک رسالہ "رسالۂ مخلص کاشی" بھی شامل ہے۔ جس میں متقدمین اور متاخرین دونوں کے اشعار بطور سند پیش کیے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ کی رائے ہے کہ "بہار عجم مصطلحات و محاورات کی ایک جامع لغت ہے جو قدماء و متوسطین و متاخرین کے مختلف مجموعوں کو سامنے رکھ کر ترتیب کی گئی ہے"۔ خان آرزو بہار عجم کے متعلق لکھتے ہیں:

صاحب بہار عجم کہ از یاران فقیر آرزو است و مثل او در عجم [illegible] صاحب [illegible]
کتاب او بسبب تتبع [illegible] [illegible] است۔

۱؎ اس سے مراد جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا کہ مصنف نے اس کو سات مرتبہ مرتب کیا۔

جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو جیسا استاد بھی ٹیک چند بہار کی عظمت کا قائل ہے۔
بہار عجم کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی جامعیت ہے۔ بہار نے تیس سال کی تحقیق و تنقید کے بعد اس لغت کو مرتب کیا ہے۔

بہار عجم کے سات ایڈیشن لکھنے کے بعد سنہ ۱۱۷۶ء میں مولف کے ایک شاگرد اندرمن نے آٹھواں ایڈیشن پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس اشاعت کا ایک نسخہ جو اندرمن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے بانکی پور پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔

اندرمن کے ایڈیشن سے الگ بھی مولف کے ساتویں نسخے سے ایک اور متن تیار کیا گیا۔ اس کا مرتب دھرم چند بن منشی دیپ چند ابن برج لال تھا۔ اس متن کے ترقیمے کی بعض اہم باتیں یہ ہیں:[1]

"بہار نے اپنی کتاب کو اصلاح و ترمیم کے بعد بخط نستعلیق سات بار لکھا، آٹھواں ایڈیشن ضعف پیری کی وجہ سے مرتب نہ ہو سکا تو اندرمن نے جو دستور الحسنات کا مصنف اور بہار کا خاص شاگرد تھا، آخری نسخہ مع قواعد و مصادر اور چند اور کتب جو مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں، حاصل کیں اور بہار عجم کا انتخاب کیا اور اس میں ایک خاتمے کا اضافہ کر کے اس کو اپنا مال بنا کر اشاعت و پیرزیادتی کی۔ اندرمن ہی کے شاگرد برج لال نے بہار کا اصلی نسخہ اپنے استاد سے حاصل کر کے کسی کی امداد و اعانت کے بغیر اس کی مدد سے تیمن جلد از سر نو اس کو مرتب کیا، اور اصل کے مطابق بنا کر رائج کیا جس سے اندرمن کا نسخہ غیر مقبول ہو گیا۔"

مگر یہ کہنا سراسر غلط اور خلاف انصاف ہے کہ اندرمن نے بہار کے کارنامے کو اپنی کوشش کا

---

[1] اسٹوری فارسی لٹریچر، آف ... مجلہ پنجاب یونیورسٹی لاہور جلد ۲ ص ۹۹۹

نمونہ جا بجا ہے۔ اس نے دیباچہ میں متقدمین کے ساتھ بحث و تکرار کی ہے، بظاہر زمانہ ... اور ... کے متون کا مرکب معلوم ہوتے ہیں۔

سیالکوٹی مل وارستہ نے جو ایک شاعر اور نقاد ہے، جس کی دستیاب "مطلع ..." اور صفات کائنات مشہور ہیں "مصطلحات الشعرا" مرتب کی، یہ لغت محمد شاہ کے عہد میں ۱۱۸۰ھ میں مکمل ہوئی۔ یہ جدید محاورات اور مصطلحات کا مجموعہ ہے۔ مؤلف دیباچہ میں لکھتا ہے کہ "میں عہدِ طفلی سے فصحا اور شعرا کے دواوین کا مطالعہ کرتا رہا، اس سلسلے میں فارسی کے نادر اور غریب الاستعمال محاورات کا علم ہوا، مجھکو ان کے حل کرنے کا خیال پیدا ہوا، اس کے لیے میں نے لغت کی کتابوں کا مطالعہ کیا، لیکن ان سے کوئی خاص مدد نہ ملی، اس لیے اہلِ زبان وارد کی طرف توجہ کرنی پڑی، اس کام میں پندرہ برس گزر گئے۔ اس کے بعد یہ مجموعہ تیار ہوا۔ بعض محاورے اگرچہ پہلی لغتوں میں موجود تھے لیکن اس خیال سے کہ اس کا فائدہ عام ہو ان کو بھی شامل کر لیا گیا۔ وہ الفاظ جنھیں جدید محاورے میں متروک قرار دیا گیا ہے، شامل نہیں کیے گئے۔"

وارستہ نے فرہنگ جہانگیری، کشف اللغات، مؤید الفضلا، مدار الافاضل، قاموس، تاج المصادر، شرح دیوان خاقانی شادی آبادی، شرح قصائد انوری، فرہنگ لطائف مثنوی معنوی، صراح، منتخب اللغات وغیرہ سے مدد لی ہے۔ ترکی تحقیق کی ایک کتاب سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ بہار عجم اور سراج اللغات کا ذکر بھی کتاب میں جا بجا ملتا ہے۔

وارستہ کی نظر ناقدانہ ہے۔ وہ ہر محاورے اور مصطلح کو تنقیدی نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کا تجزیہ کرتا ہے، اس کے بعد اپنی کتاب میں شامل کرتا ہے، چنانچہ اس نے سراج اللغات کے مختلف بیانات کی تردید کی ہے۔

وارستہ نے مختلف پیشہ وروں کی اصطلاحات بھی مصطلحات الشعرا میں شامل کی ہیں۔

چاپا ہے۔ اس میں قدیم پہلوانی، بازی گروں کے خاص الفاظ اور اصطلاحات ملتے ہیں، ہندستانی شعرا کے اشعار بہت کم درج کیے ہیں، ہندی الاصل محاورات کو بھی اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا ہے، الفاظ کی تشریح میں ہندی مترادفات استعمال کیے ہیں۔ مثلاً "تفتان" پراٹھا۔ "جامہ ناشوئی" کورا۔ "چراغ ہندو افروختن" دوالی ہونا وغیرہ۔

محمد غیاث الدین رامپوری نے ۱۸۲۶ء میں غیاث اللغات کے نام سے ایک فرہنگ مرتب کی۔ اس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس لغت کی تصنیف میں اس نے منتخب اللغات، کشف اللغات، مدار الافاضل، مؤید الفضلاء، قاموس اللغات، برہان قاطع، فرہنگ جہانگیری، چراغ ہدایت، سراج اللغات، مصطلحات الشعراء، بہار عجم، فرہنگ سروری، معربات عبدالرشید، اور بعض تفاسیر مثلاً تفسیر حسینی اور بیضاوی اور آئین اکبری وغیرہ سے مدد لی ہے۔ ان میں بہار عجم اور دوسری لغات سے اکثر مطالب بھی لیا گیا ہے۔ سند میں اساتذہ کے اشعار پیش کیے ہیں۔

عطاء اللہ دانشمند خان ندرت کشمیری نے آئین عطا لکھی جس کو خان آرزو نے اپنی سراج اللغات کا سرقہ کہا ہے۔ ندرت نے لکھا ہے کہ اس کام میں بیس سال صرف ہوئے اور اس کی بنیاد سراج اللغات اور بہار عجم پر ہے۔ اس بیان سے خان آرزو کے ماخذ کردہ الزام کو تقویت پہنچتی ہے۔

ضخامت کے اعتبار سے آئین عطا بہار عجم جیسی ہے۔ خان آرزو نے تنبیہ الغافلین میں حزیں پر سخت تنقید کی ہے، ندرت نے اس کی تعریف میں غلو سے کام لیا ہے، اور اسے شیخ المحققین کا لقب دیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لائبریری میں ہے، جو خود ندرت کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

جمہوری دور کا ترکی ادب

از جناب ڈاکٹر اکمل ایوبی صاحب استاد ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ترکی ایک سیدھی سادھی اور جامع زبان ہے، اس کا تعلق نہ تو عبرانی اور عربی جیسی سامی زبانوں سے ہے اور نہ سنسکرت اور فارسی جیسی آریائی زبانوں سے، بلکہ یہ خود ایک مستقل زبان ہے، اور یورال الطائی لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے، جس کو تورانی خاندان بھی کہتے ہیں، اس وقت ترکی زبان تقریباً پچیس ملکوں میں بولی جاتی ہے اور دس ملکوں میں اسے قومی زبان کا درجہ بھی حاصل ہے، اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اس وقت تقریباً بارہ کروڑ ہے جو ولاڈی واسٹک سے لیکر یوگوسلاویہ تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود اس زبان کا قدیم ادبی سرمایہ ماضی کے پردے میں چھپا ہوا ہے، اب تک کی تمام دریافت شدہ قدیم تحریروں اور آثار قدیمہ کی دوسری شہادتوں سے صرف چھٹی صدی عیسوی کے ترکی ادب کے چند نمونے منظر عام پر آسکے ہیں، ترکوں[1] نے ان ہی نمونوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی ہے کہ ان کا ابتدائی ادب خارجی اثرات سے پاک تھا، اور یہ ان کے مخصوص رسم الخط میں تحریر کیا جاتا تھا، رفتہ رفتہ ترکی زبان کے ذخیرے میں یونان کے خانہ بدوشوں کی بولیوں سے لیکر چین کے شمالی علاقوں کی زبان تک کے الفاظ شامل ہوتے گئے، اور بعد میں اسلام کے حلقہ بگوش ہو کر مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کے بعد ترکوں نے اپنی زبان میں نہ صرف عربی و فارسی زبانوں کے صرف الفاظ

---

[1] ترکوں سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے راقم کا مضمون دیکھیے جو [illegible] میں شائع ہو چکا ہے۔

مثال کے لیے مغربی زبانوں کا طرز تحریر بھی اپنا لیا اور ایک وقت ایسا آیا کہ ترکی زبان کی قدیم فطری خصوصیات ختم ہوگئیں، اس وقت سے ترکی تحریروں میں دوسری زبانوں کے الفاظ کی بھرمار ہوگئی تھی، ان کے معنی اور تصریف کے قاعدے بھی اصل زبانوں کے مطابق ہوگئے اور ان کے اسماء اور افعال بجنسہ استعمال ہونے لگے اور اس کثرت سے کہ عبارت میں تکلف اور اجنبیت پیدا ہوگئی اور زبان بوجھل بن گئی، ان اجنبی الفاظ، خیالات اور تصورات کے علاوہ ترکوں نے بڑی حد تک اپنے بہت سے اصل اور عام فہم الفاظ کو بھی عربی و فارسی لفظوں سے اس غرض سے بدل دیا کہ ان کی تحریر شستہ اور اسلوب بیان پرشکوہ بن جائے[1]۔ اس رجحان نے یہاں تک ترقی کی کہ دولت عثمانیہ کے عہد زریں کی زبان پر غیر ترکی، خاص کر عربی و فارسی عناصر اس طرح مسلط ہوگئے جس سے یہ غیر متعارف اور ادق طرز تحریر ترکی کے کسانوں اور عام قصباتی عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوگیا، اسی طرح ترکی شعراء نے بھی اپنی نظموں کی بحروں اور اسلوب بیان کو عربوں اور ایرانیوں کے مذاق کے مطابق ڈھال لیا تھا، اس لیے یہ ادب زبان اور خیالات دونوں اعتبار سے مذاق جمہور سے الگ ہوگیا، اس پر تصنع اور نمائش کا شدید غلبہ تھا، اور عبارت آرائی ہی کو خوبی سمجھا جاتا تھا، اسی طرح اسلوب بیان فن پر زور تھا، موضوع کی کوئی اہمیت نہ تھی، یہ ادب فطری احساسات اور آمد سے عاری اور روایتی ہیئت کا سخت پابند تھا[2] اور اس کی بنیاد فقط لفظی صنعتوں پر تھی، اس کے موضوع عشق و عاشقی، حسن و جمال، بہار و گلشن، گل و بلبل کے افسانے، وصل کی لذت

---

[1] ان مثالوں کے لیے [illegible] کا مقالہ "ترکی شاعری" دیکھئے مجلہ "علوم اسلامیہ" علی گڑھ (ج ۲ نمبر ۲)

[illegible] شائع ہوئی ہے [2] [illegible] تفصیلات کے لیے

[illegible] ترکی زبان کے [illegible] کی [illegible] سرگذشت" دیکھئے ماہنامہ [illegible] اردو" لکھنؤ دسمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا۔

وہ میرا ہے، وہ صرف میری قوم کا ہے۔"

ترکی ادب کے دورِ جدید کے بلند پایہ شاعروں میں ناظم حکمت اشتراکی ہونے کے باوجود اپنے زورِ کلام کی بنا پر بہت ممتاز ہیں۔ ان کی نظمیں ہیئت اور اندازِ بیان کے لحاظ سے بڑی جاندار ہیں۔ مذہب پر کھلم کھلا حملے کی بنا پر ان کی آواز ترکی ادب میں ایک الگ تھلگ حیثیت رکھتی ہے۔ ان کو ترکی جمہوریہ کی حکومت نے ترکی سے جلاوطن کر دیا تھا، اور ۱۹۵۱ء میں انھوں نے ماسکو میں سکونت اختیار کر لی تھی، ترکی میں ان کی تصانیف کی اشاعت بھی ممنوع قرار دے دی گئی تھی۔ اس کے باوجود ان کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی، اور آج بھی ان کی شاعری قابلِ تقلید سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے سرمایہ داروں اور ان ادیبوں کے خلاف آواز اٹھائی جو سرمایہ داروں کے حامی ہیں۔ انھوں نے قدیم ادبی روایات میں تجدد پیدا کرنے کے لیے نظمِ معریٰ اور بحرِ ہجائی کا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کی بعض نظموں کی بحریں اتنی چھوٹی ہیں کہ ایک پورے مصرعے میں صرف ایک ہی لفظ ہوتا ہے، مگر ان میں ایسی دلکش موسیقی ہے جو دلنشین بھی ہے اور زندگی بخش بھی۔ ناظم حکمت نے ترکی کے اس سماج کی بھی مصوری کی ہے جس سے خود ان کا واسطہ تھا، اس لیے ان کی کھینچی ہوئی تصویروں سے وہ لوگ زیادہ لطف اٹھا سکتے ہیں جو ابھی تک ناظم حکمت کے زمانے کو نہیں بھولے ہیں۔ انھوں نے روزمرہ، محاورے، ضرب الامثال اور تشبیہات کے استعمال سے زبان کو مالا مال کر دیا۔

ناظم حکمت کو برصغیر ہند و پاک آنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا، لیکن یہاں کے باشندوں سے ان کا بہت لگاؤ تھا۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنی متعدد نظموں میں کیا ہے۔ ان کی ایک بڑی اچھی رزمیہ نظم ایک بنگالی انقلابی سے متعلق ہے۔ اس نظم میں جو پہلی بار [illegible]ء میں شائع ہوئی تھی ناظم حکمت نے انگریزی حکومت کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے لیکن میرے خیال میں

ان کی سب سے اچھی نظم وہ ہے جس میں دشمنوں نے مغربی اقوام کو یہ بتایا ہے کہ مشرق کیا ہے اور جو اس طرح شروع ہوتی ہے:-

"رازہائے سربستہ
قناعت
قسمت
سرائے
کارواں
چاندی کے تھال میں ایک شہزادی ناچتی ہوئی۔
مہاراجہ
بادشاہ
ہزاروں برس کا بوڑھا درویش
ایک عورت ناک پر مہندی لگائے ہرے کپڑے پہنتی ہوئی۔
سبز داڑھی کا امام، منارہ پر اذان دیتا ہوا
یہ مشرق!
نہ ہمارا تھا نہ اب ہے، نہ کبھی ہوگا۔
مشرق وہ ملک ہے جہاں ننگے مزدور محنت کا پسینہ بہاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔
مشرق وہ سرزمین ہے جو ہر قوم کی ملکیت ہے سوائے خود اہل مشرق کے۔"

ناظم حکمت کے بعد ترکی کے جدید شاعروں میں یحییٰ کمال بیاتلی کا نمبر ہے، جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہے۔ ان کی حقیقت نگاری، فطرت اور جذبات و تاثرات کی مصوری میں کمال

حاصل تھا۔ اس سے ان کی غزلوں اور رباعیوں میں ایک سادگی اور ترنم و لطافت کی ایسی گھل مل گئی ہیں، جیسے چراغ میں روشنی و گرمی۔ انھوں نے "فن برائے فن" کے اصول کو بدستور قائم رکھا اور کلاسیکی شاعری کی تقلید میں وزن اور قافیہ کا احترام بھی کیا، لیکن نئے خیالات کے اظہار کے لیے نئی تشبیہوں اور نئے استعاروں کا بھی سہارا لیا ہے۔ انھوں نے وزن کی تقسیم اور قافیوں کی ترتیب میں البتہ اختراع سے کام لیا ہے، جس کو دوسرے اچھے شعرا نے بھی قبول کر لیا جن میں فاروق نافذ چاملی بیل، احمد حمدی تانپینار، نجیب فاضل کیساکورک اور احمد محیط درانا س کے نام سرفہرست ہیں۔

یحییٰ کمال بیاتلی پاکستان میں ترکی کے پہلے سفیر مقرر ہوئے تھے، یہاں ان کا قیام ایک سال سے زیادہ رہا، اس لیے وہ پاکستان کے ادبی حلقے میں کافی مقبول ہو گئے تھے۔ غالباً اسی مقبولیت کا اثر ہے کہ سابق پاکستانی سفیر متعینہ ترکی جمہوریہ میاں بشیر احمد نے ان کی ایک نظم بعنوان "سیس سز گیمی" کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے، جو درج ذیل ہے، اس سے یحییٰ کمال بیاتلی کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہو جائے گا:

خاموش جہاز

دنیا سے جب جاتا ہے رخصت کا زمانہ ۔۔۔ ہوتا ہے جہاز ایک کنارے سے روانہ
جاتا ہے کدھر کو یہ کسی کو نہیں معلوم ۔۔۔ حیران ہے نظر جتنی [illegible] محروم
خاموش ہے گو ایک مسافر نہیں کوئی ۔۔۔ [illegible] نہیں کوئی
رخصت کے لیے ہاتھ اٹھایا ہے کسی نے ۔۔۔ [illegible] کسی نے
[illegible]
[illegible]

زرقت سے غضب شاکی تقدیر دیکھو بھلا || خوشیوں سے جاتے ہیں دکھ کیوں بھلا

اس جا سے گئے جو کبھی واپس نہیں آئے || سلسلے کتنے ہی کاش کوئی ان کو بتائے

جن جگہ پہ وہاں غلیچے ہونگے وہ آخر || واپس نہیں آتے کبھی برسوں سے مسافر

یہ دو اور ترکی شاعر جن کا ابھی چند سال پہلے انتقال ہوا ہے، ایسا کلام چھوڑ گئے ہیں، جو مدتوں تک عوام میں مقبول رہے گا۔ ایک جاہد صدقی ترنجی جن کی زبان اتنی سادہ اور خوبصورت ہے جس میں زور بھی ہے اور تاثیر بھی، دوسرے احمد خان ولی کانک، جنہوں نے اپنی شاعری میں تعمیری اور معاشرتی رجحانات کی بھی ترجمانی کی ہے، اور زبان کی سادگی و مکالمانہ انداز بیان سے بھی خوبصورت شاعرانہ حسن پیدا کیا ہے۔ ان کے علاوہ ترکی کے جمہوری دور کے ممتاز شعراء میں نجیب فاضل، یکیف، ابیخان، یاشر نبی ناییر، بہجت، ملیح جیودت، فاضل حسنو داغ لیجا، بیدری رحمی ایوب اوغلو، اوکتائے رفعت، کمال الدین کامو، آصف خالد چلبی، اوکتائے اکبال، صباح الدین وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

آج کل جدید ترکی شعراء الفاظ کا رشتہ حقیقت سے جوڑنے اور زندگی کے سماجی، معاشی اور معنوی پہلوؤں کو واقعیت پسندانہ اور متکلمانہ طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خیالی فلسفے کے قدیم شاعروں کی طرح وہ سیاسی، سماجی اور معاشی قدروں کے ذکر سے بھی نہیں گھبراتے، اور حقیقت سے دور طلسمی وادیوں میں نہیں گھومتے۔ وہ جمہوریت کے دور کی حقیقت پسند ہیں، اس لیے اپنے کلام میں جگہ جگہ خیالات میں تنقید کی قوت اور اجتماعی فکر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی شاعری کے رجحانات اور موضوعات بھی اب بدل گئے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

پھر بھی کئی حیثیتوں سے یہ قدیم شعر و شاعری ہی کا ایک تسلسل ہے، لیکن ناول اور افسانہ طلبہ کے لیے بالکل نئی چیزیں ہیں، اس کے باوجود ان کے بعض شاہکاروں کی شہرت بیرونی دنیا تک پہنچ گئی ہے، اور ترکی کے باہر ان کی صدائے بازگشت سنائی دینے لگی ہے۔

جمہوریہ ترکیہ کے ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں میں خانم خالدہ ادیب اودیوار[1] کا شمار صف اول کے ادیبوں میں ہوتا ہے، ان کے تین ناول "ینی توران"، "آتش تی گومکہ" اور "خاندان" اپنی مثالی سیرت نگاری اور طرز ادا کی وجہ سے کلاسیکی ادب میں شمار ہوتے ہیں، ان میں ترکوں کی جنگ آزادی کی روداد بیان کی گئی ہے، ترک ان ناولوں کو بہت پسند کرتے ہیں، لیکن انسانی جذبات کی دھوپ چھاؤں دکھانے کی صلاحیت کا مظاہرہ یعقوب قادری قرہ عثمان اوغلو نے کیا ہے۔ ان کے ناول خالدہ ادیب اودیوار کی طرح صرف انگریزی زبان ہی میں نہیں بلکہ روسی، فرانسیسی، جرمنی اور اطالوی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں جو اپنی زبان، پلاٹ، کردار نگاری اور حقیقت نگاری کی وجہ سے بہت مقبول ہیں، ان کا ایک ناول "نور بابا" نے ترکی میں اچھا خاصہ ہنگامہ برپا کر دیا تھا، اس میں انھوں نے بکتاشی سلسلے کی اندرونی زندگی کو بے نقاب کیا ہے، اور ان کی ابہام پسند رسومات پر سخت حملے کیے ہیں، ان کے دوسرے مشہور ناول کا عنوان "یابانجی" ہے، جس میں ترکی کے گاؤں کی ستم رسیدہ زندگی کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

خالدہ ادیب اودیوار اور یعقوب قادری قرہ عثمان اوغلو کو ترکی کے باہر بھی مقبولیت حاصل ہے، ترکی میں جس شخص نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ رشاد نوری گونتکن ہیں،

---

[1] مزید معلومات کے لیے ماہنامہ "المعارف" لاہور کا مضمون "خالدہ ادیب خانم" دیکھیے جو ماہ جون کے شمارہ ۳ جلد ۱۹ ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا ہے۔

پچیس ناولوں اور ڈراموں، چار مختصر افسانوں کے مجموعوں، سات تراجم اور چند علمی تصانیف کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ڈرامے کے نقاد کی حیثیت سے کیا اور یورپ کے ڈراموں کی وسیع معلومات حاصل کرنے کے بعد خود کامیاب ڈرامے لکھے۔ اور بعض مغربی ڈراموں کو اس طرح اپنایا کہ ان کے ہیروؤں کو ترکی بساط پر بٹھا دیا۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے ناول اور افسانے لکھنا شروع کیے اور جلد ہی مقبول عام ہو گئے۔ ان کے دو ناولوں کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے، جو ہر حیثیت سے دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے ناولوں کی ٹکر کے ہیں۔ ان کا سب سے زیادہ مشہور ناول "چالی قوشو" ہے، جس میں اس عہد کے سماج کی مکمل تصویر ملتی ہے۔ اس ناول میں گونتکن نے مفصلات کی ایک ایسی خود سر معلمہ کی سیرت بیان کی ہے جو عین شادی کے دن اپنے منگیتر سے عقد کرنے سے انکار کر دیتی ہے، یہ خود سر لڑکی اناطولیہ میں ادھر ادھر گھومتی رہتی ہے، جہاں اسے کئی حادثات پیش آتے ہیں، بالآخر وہ واپس آکر اپنے اسی منگیتر سے شادی کر لیتی ہے۔ اس ناول کا موضوع، جو تقریباً چار سو صفحات میں بیان کیا گیا ہے، سیدھا سادھا ہے، اور فن کی حیثیت سے اس میں کچھ خامیاں بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ ناول سرتاپا ترکی ہے۔ اس میں اناطولیہ کے دیہات کے متوسط اور اونچے طبقے کے حالات و کوائف، بہار کی رنگینیوں اور موسم خزاں میں وہاں کے باشندوں کی سرمستیوں اور مختلف انسانی جذبات کو ایسے حقیقی اور دلکش انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھنے والا اس کو ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ارجمند اکرم تالو بھی اپنی موثر حقیقت نگاری کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ان کے بعض افسانے اور چند ناول پڑھنے کے قابل ہیں۔ موجودہ دور کے ناول نگاروں میں یوں تو آقا گندوز، پیامی صفا، جلال الدین، صدری ادھم، محمود یساری، کریمہ نادر،

شیشنی یقصاد، کمال طاہر، اور خاتون کمال، جہ الحق حضد، اقبال الفات [illegible]

میں صباح الدین علی، اقبال حسین کمال، تتبید ناملک، عزیز نادہ خلدون تور [illegible]

قابل ذکر ہیں۔ لیکن میرے خیال سے ارجمند اکرم تلو کی شخصیت اپنی فنی صلاحیت زبان کی خوبی اور شعور کی بلندی کی وجہ سے ان سب سے علیحدہ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے ناول "کالان وایان" میں ان ترک خواتین کی جانبازی اور قربانی دکھائی ہے، جنھوں نے اپنے بہادر شوہروں کے دوش بدوش اتاترک کے پرچم کے نیچے لڑ کر حق رفاقت ادا کیا ہے۔ ان کا دوسرا ناول "گرگش باز کن" ایک معاشرتی افسانہ ہے، جس میں حقیقت، فن اور اخلاقی درس باہم سمو دئے گئے ہیں۔ ان کی ایک اور کتاب "ینی اولیا" بھی قابل ذکر ہے، جو سترہویں صدی کے مشہور مورخ و سیاح اولیا چلبی کے "سیاحت نامہ" کی مزاحیہ نقل ہے۔ اس کا منظر استنبول ہے۔ اس میں نئی نئی اختراعات اور موجودہ باشی کے نئے نئے طریقوں کا بہت کامیابی کے ساتھ خاکہ اڑایا گیا ہے، لیکن اس کامیابی کے باوجود ان کو ترکی مزاحیہ نگاری کا نمائندہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس فن کے ممتاز نمائندے رفیق خالد کرائے ہیں۔

رفیق خالد کرائے کو طنز و مزاح میں غیر معمولی کمال حاصل ہے۔ وہ مستعمل [?] روز مرہ کے استعمال کی زبان میں ہر قسم کے خیالات ادا کرتے ہیں جو سادہ چھوٹے چھوٹے [?] جملوں اور محاوروں سے مالا مال ہے۔ انھوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے اور [?] مختصر [?] افسانوں [?] [illegible] [illegible]

انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ترکوں کی زندگی کے خدوخال کی مصوری حقیقت نگاری کے موئے قلم سے کی ہے، جن کے رنگوں میں باسفورس میں غروب آفتاب کا منظر نظر آتا ہے۔ ان کے اس وصف نے ان کو ظرافت کا استاد بنادیا ہے۔ ترکی کے قدیم مورخ نعیمہ کی عبارت کی مزاحیہ نقل کرتے ہوئے انھوں نے دستوری حکومت* کے خاص خاص افراد اور واقعات کا بھی خوب خوب خاکہ اڑایا ہے، ان کی مشہور کتاب "مملکت حکایہ لری" کا موضوع زیادہ تر زندگی کے وہ پہلو ہیں جو کمتر اور حقیر خیال کیے جاتے ہیں، لیکن ان کے ظریفانہ استعارے اور چلتے ہوئے فقرے ان میں جان پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ فن اس وقت ترکی جمہوریہ میں تیزی سے ترقی کر رہا ہے اور ترکی کے ظریفانہ رسالوں اور اخباروں میں یوسف ضیا، فضل احمد آئے کاپ، خلیل نہاد بوزتپہ، ابراہیم علاء الدین، عشاق جلال، جلال نادر وغیرہ کی ظرافت کے نمونے نظر آتے رہتے ہیں۔

ایک اور بڑی اہمیت کا نوجوان ادیب محمود مکال ہے جو پانچ کتابوں اور متعدد مقالوں کا مصنف ہے، یہ ترکی کے ایک چھوٹے سے گاؤں کا رہنے والا ہے، اس کی کتابوں کے آئینہ میں کاشتکاروں کے مصائب آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں، جو ترکی جمہوریہ کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ہیں، اور پھر بھی مظلوم ہیں،

اس وقت سب سے زیادہ ترقی کے آثار علمی میدان میں نظر آتے ہیں۔ آج سے ساٹھ سال پہلے ترکی میں کوئی تاریخ کی کتاب یا سوانح عمری علمی اصولوں پر نہیں لکھی گئی تھی۔ تاریخ کی کتابیں صرف روایات ہوا کرتی تھیں جن میں تحقیق بہت کم ہوتی تھی، لیکن

---

* [illegible] کی کتاب [illegible] کا ترجمہ [illegible] مسلم یونیورسٹی کے [illegible] نے شائع کی ہے۔

ابن نجیب عاصم، احمد رفیق، ذکی ولیدی طوغان، آق ضیا کارال، فارق قرتایا، عثمان توران، جمال ترکین وغیرہ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس فن میں ترکوں نے کس قدر ترقی کرلی ہے، ترکی زبان و ادب پر تحقیق و تنقید کا کام کرنے والوں میں حسن علی یوجل، حسین جاہد یالچن، محمد طاہر، احمد آتش، رہنا و تیمہ نیرلی، اسمٰعیل حبیب سیوک، نوراللہ آتش، احمد یمین بلمان، احمد حمدی تانپنار، شناسی حصار، فواد کوپرولو، مصطفیٰ نہاد اور محمد قاپلان کی تصانیف قابلِ ذکر ہیں، ان سے یہ بھی امید ہوتی ہے کہ ان کے نکھرے ہوئے تحقیقی و تنقیدی شعور سے ترکی جمہوریہ میں اور اچھا ادب پیدا ہوگا۔

جاہلی شاعری میں زہدیہ رجحانات

از

جناب حافظ غلام مصطفیٰ صاحب ایم اے استاذ شعبۂ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲)

ابھی تک جاہلیت کے صرف ان شعراء کے کلام پر گفتگو تھی جو کسی مذہب کے قائل نہیں تھے یا مشرک و بت پرست تھے، اب ہم ان شعراء پر بھی ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جو شرک و بت پرستی سے متنفر اور کسی توحیدی مذہب سے وابستہ تھے، یعنی یہودی یا نصرانی یا حنیف تھے انکا کلام نسبۃً کم ملتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہے وہ معانی و مطالب، الفاظ و محاورات اور انداز بیان کے لحاظ سے بت پرست بدوی شعراء کے کلام سے بہت کچھ مختلف ہے، ان کے اشعار میں زہدیہ خیالات بھی زیادہ اور وضاحت کے ساتھ پائے جاتے ہیں، بت پرست شعراء کے یہاں تو یہ خیالات ضمنی طور پر کسی اور موضوع کے تحت آگئے ہیں لیکن ان شعراء نے مستقل نظمیں صرف پند و موعظت اور اخلاق و حکمت ہی کے موضوع پر کہی ہیں، جنکے (مطالعہ سے) زمانہ و اہل دنیا اور بے ثباتی عالم کی تصویر ملتی ہے اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کہ ان امور کے بیان سے ان کا مقصد خوف آخرت، اصلاح عمل، تادیب نفس، تقویٰ و طہارت اور قناعت کی ترغیب ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بت پرست شعراء کے ذہن پر جب انقلابات زمانہ کے واقعات

دیا تھا، وہ موت ان کے سامنے مجسم کھڑی ہو جاتی تھی تو ان کا دل بھی بے چین ہو جاتا تھا لیکن زندگی کا جو تصور ان کے ذہن میں واضح نہیں تھا اور موت کے بعد کی دنیا ان کی نگاہوں میں تاریک تھی، وہ عموماً موت ہی کو زندگی کی آخری حد سمجھتے تھے، اس کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصور ان میں نہیں تھا، اس لیے وہ یا تو مایوس ہو کر تقدیر کے آگے سپر ڈال دیتے تھے یا شجاعت و بہادری یا عفو و سخاوت و فیاضی کی ترغیب دیتے تھے، تاکہ موت کے بعد ان کے کارنامے یادگار کے طور پر باقی رہیں، اور اس طرح ان کا نام زندہ رہے یا لذت پرستی اور عیش کوشی کی تلقین کرنے لگتے تھے کہ جب تک زندگی ہے دنیا کی لذتوں سے پوری طرح لطف اندوز ہو لیں، ایک دن بالآخر مٹی میں ملنا ہی ہے۔

اس کے برعکس حنیفی، نصرانی اور یہودی شعرا موت کو زندگی کی آخری منزل نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کے بعد ایک دوسری زندگی کے بھی قائل تھے جس کا تصور ان کے ذہن میں پوری طرح واضح تھا، اسی کے ساتھ وہ جزا و سزا اور جنت و جہنم کا تصور بھی رکھتے تھے، چنانچہ ان کے اشعار میں موت و حیات کے ذکر کے ساتھ کہیں کہیں ان امور کا بیان بھی ملتا ہے اور سیاق و سباق سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان بیانات سے ان کا مقصد فکر آخرت اور تزکیۂ نفس کی طرف لوگوں کو مائل کرنا تھا۔

ان شعرا کے کلام میں زہدیہ اشعار کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں، اس موقع پر ان میں سے صرف چند نمونے پیش کر دینے کافی ہیں۔

سب سے پہلے ہم امیہ بن ابی الصلت کو لیتے ہیں جو ثقیف کا شاعر تھا، زمانہ جاہلیت میں عرب کے مختلف قبیلوں میں ایسے افراد کے وجود کا ثبوت ملتا ہے جو [illegible] بت پرستی سے منحرف ہو چکے تھے، بلکہ اس کی مذمت بھی کرتے تھے، اور وہ لوگ یہودیت یا نصرانیت کے پیرو بھی نہیں تھے، وہ اپنے آپ کو حنیف یعنی ملت ابراہیمی کا پیرو سمجھتے تھے، ان میں بعض کا

[illegible] شعراء النصرانیۃ [illegible]

رہنے کا شوق بھی تھا جس بنا پر ان کے بعض اشعار وہابی شعر ہی کہا جاتا ہے۔ شعراء میں سے بعض

ابو قیس صرمہ بن ابی انس اور زید بن عمرو بن نفیل وغیرہ امیہ اور ابو قیس کے متعلق یہی کہا جاتا ہے کہ وہ

زاہد انہ زندگی بسر کرتے تھے اور اون کا موٹا لباس پہنتے تھے لیکن جن شعراء میں سب زیادہ

اشعار امیہ ہی کے پائے جاتے ہیں، اس کے متعلق بعض روایتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا

بھی جانتا تھا اور اس نے مختلف مذاہب کی قدیم کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا موت کے موضوع پر امیہ

کے یہ دو شعر بہت پسند کیے جاتے ہیں:

يوشك من فرّ من منيته ... في بعض غراته يوافقها[1]

من لم يمت عبطة يمت هرما ... للموت كأس والمرء ذائقها

(آہ جو شخص موت کے حملے سے بچ گیا وہ جلد ہی کہیں غفلت میں پھر موت سے دوچار ہوگا۔

جو جوانی میں نہیں مرا وہ بڑھاپے میں مرے گا۔ موت کا پیالہ تو ایک ہے جو ہر انسان کو پینا ہے)

ایک موقع پر دنیا کے زوال اور زمانہ کی ہلاکت خیزی کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح متنبہ کرتا ہے:

كل عيش وإن تطاول دهرا ... منتهى أمره إلى أن يزولا[2]

فاجعل الموت نصب عينيك واحذر ... غولة الدهر إن للدهر غولا

(ہر زندگی کا انجام خواہ وہ کتنی ہی طویل ہو یہی ہے کہ وہ ختم ہو جائے۔ موت کو اپنی نگاہوں کے سامنے

رکھو اور زمانہ کی ہلاکت خیزی سے ڈرتے رہو۔ یقیناً زمانہ بہت ہی ہلاکت خیز ہے)

ایک طویل نظم میں اس نے خدا کی ذات و صفات اور ملائکہ وغیرہ کا بیان تفصیل کے ساتھ

کیا ہے ...

...

انداز میں کہا ہے اور شاعر بھی ساتھ حق پرستی، راست بازی، خوفِ موت اور فکرِ آخرت کی تلقین بھی کی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ألا أيها القلب المقيم على الهوى — إلى أيّ حين منك هذا التصدّدُ[1]
عن الحق كالأعمى المميط عن الهدى — وليس يردّ الحق إلا مفنّدُ

(اے دل جو ہوا و ہوس میں مبتلا ہے تو کب تک اس طرح حق سے اعراض کرتا رہے گا جیسے اندھا راہِ راست سے بھٹک جائے، حق سے وہی اعراض کرتا ہے جو ضعیف العقل ہوتا ہے۔)

وحالات دنيا لا تدوم لأهلها — وبينا الفتى فيها مهيبٌ مسوَّدُ
إذا انقلبت عنه وزال نعيمها — وأصبح من ترب القبور يوسَّدُ
وفارق روحًا كان بين جنانه — وجاور موتى ما لهم متردَّدُ

(دنیا کے حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، انسان شوکت و سطوت اور سیادت و امارت کی حالت میں ہوتا ہے، اسی اثنا میں ناگاہ دنیا پلٹ جاتی ہے، اس کی ساری نعمت زائل ہو جاتی ہے اور قبر کی خاک اس کا تکیہ بن جاتی ہے، اس کی روح جو اس کے سینے کے اندر ہوتی ہے اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور وہ ان مُردوں کا پڑوسی بن جاتا ہے جو کبھی واپس نہیں آسکتے۔)

فأيّ فتًى قبلي رأيت مخلّدًا — له في قديم الدهر ما يتردّدُ
ومن يبتليه الدهر منه بعثرةٍ — سيكبو لها والنائبات تردّدُ
فلم تسلم الدنيا وإن ظن أهلها — بصحتها والدهر قد يتجرّدُ

(تم نے مجھ سے پہلے کس جوان کو دیکھا ہے جو ہمیشہ [illegible] جس کو زمانہ کسی لغزش میں مبتلا کر دیتا ہے [illegible] دنیا کبھی سلامت نہیں رہے گی اگرچہ دنیا والے ایسا ہی سمجھتے ہیں [illegible]۔)

---

[1] شعراء النصرانية، ص ۲۲۰۔

أليس ترى فيما مضى لك عبرة ... فمه لا تكن يا قلب أعمى يلدّدُ

فكن خائفاً للموت والبعث بعده ... ولا تك ممن غرّه اليوم أو غدُ

فإنك في دنيا غرور لأهلها ... وفيها عدو كاشح الصدر يوقدُ

کیا ماضی کے واقعات میں تیرے لیے درسِ عبرت نہیں ہے۔ بس اے دل تو سنبھل جا اور اندھا بن کر ادھر ادھر بھٹکتا رہتا ہے، موت اور اس کے بعد کی زندگی سے ڈرتا رہ اور ان لوگوں میں مت ہو جا جو آج یا کل کی زندگی سے دھوکا کھا گئے، کیونکہ تو ایسی دنیا کے اندر ہے جو لوگوں کو بہت سخت دھوکا دیتی ہے، یہ دنیا ایک ایسے دشمن کے مانند ہے جس کے سینہ میں بغض و عداوت کی آگ بھڑک رہی ہے۔

عیسائی شعراء میں عدی بن زید[1] سب سے زیادہ ممتاز ہے، اس کے اشعار بھی نسبتاً زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔ عدی کی زندگی کا بڑا حصہ حیرہ کے دربار میں گذرا، جہاں اس کو بڑی عزت حاصل تھی، اس کے آباء و اجداد بھی ملوکِ حیرہ کے مقربین میں اور اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، اس کو شہنشاہ ایران کے دربار میں بھی خاص تقرب حاصل تھا، چنانچہ ایک بار کسریٰ نے اس کو سفیر کی حیثیت سے شاہ روم کے پاس بھیجا تھا، اگر عدی چاہتا تو خود حیرہ کا بادشاہ ہو جاتا، لیکن شاہانہ زندگی پر اس نے سیر و شکار اور لہو و لعب کی زندگی کو ترجیح دی، چنانچہ اس کے اشعار میں عیش و نشاط اور بادہ و خمر کا ذکر کافی ملتا ہے، اس کے ساتھ مذہبی جذبات کی بھی کمی نہیں ہے، یہ صحیح ہے کہ اس نے راہبانہ زندگی نہیں گذاری، مگر اس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو بے فکری اور استغنا کی زندگی پسند تھی اور شروع ہی سے اس کی طبیعت عبرت و نصیحت کی طرف مائل تھی، چنانچہ اس کی ابتدائی زندگی کے جو اشعار ملتے ہیں ان میں بھی زوال و فنا کا ذکر پایا جاتا ہے۔

---

[1] عدی کے حالات کے لیے دیکھئے شعراء النصرانیہ ص [illegible]

ایک روایت بیان کی جاتی ہے کہ عدی جب کہ وہ جوان تھا ایک مرتبہ حیرہ کے بادشاہ کے ساتھ شکار کے لیے نکلا۔ بادشاہ نے ایک سرسبز و شاداب درخت کے سایہ میں قیام کیا۔ عدی نے بادشاہ سے پوچھا کہ آپ کو معلوم ہے کہ یہ درخت کیا کہہ رہا ہے؟ پھر بادشاہ کے استفسار پر اس نے خود جواب دیا کہ درخت یہ کہہ رہا ہے:

من سرّنا فلیحدث نفسه ۔۔۔ انه موفٍ علی قرن زوال[1]
فصروف الدهر لا تبقی لها ۔۔۔ ولما تأتی به صم الجبال
رب رکب قد اناخوا حولنا ۔۔۔ یشربون الخمر بالماء الزلال
عمروا الدهر بعیش حسن ۔۔۔ قطعوا دهرهم غیر عجال
عصف الدهر بهم فانقرضوا ۔۔۔ وکذلک الدهر حالا بعد حال

جو شخص ہم کو دیکھے وہ اپنے نفس کو بتا دے کہ وہ زوال کی چوٹی پر کھڑا ہے۔ کیونکہ زمانہ کے انقلابات اور اس کے حوادث کے آگے سخت چٹانیں بھی نہیں ٹھہر سکتیں۔ بہت سے قافلے یہاں سے گزرے قیام کر چکے ہیں جو صاف شیریں پانی کے ساتھ شراب پیتے تھے۔ مدت مدید تک وہ عیش و عشرت کے ساتھ رہے اور [illegible] کے ساتھ [illegible] گزاری بالآخر زمانہ کا ایک جھونکا آیا اور وہ سب ختم ہو گئے اور زمانہ اسی طرح بدلتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ایک مرتبہ پھر عدی بادشاہ حیرہ کے ساتھ جب ایک قبر پر جو [illegible] گزرا تو عدی نے جواب دیا کہ اس قبر نے یہ کہا ہے:

ایها الرکب المخبون ۔۔۔ علی الارض مجدون[2]
کما انتم کنا وکما ۔۔۔ نحن [illegible] تکونون

---

[1] شعر والشعراء ص [illegible]

(زمانہ اور حوادثِ زمانہ کی باتیں چاہے بہت سی باتیں ہیں مگر وہ ڈراتے ہیں۔ جیسے تم ہو

ایسے ہی ہم بھی تھے، اور جیسے ہم ہیں ایسے ہی تم ہو جاؤ گے۔)

عدی بن زید کے وہ اشعار خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہیں جو اس نے اپنی قید کے زمانہ میں کہے تھے، حیرہ کے آخری بادشاہ نعمان بن منذر، ابو قابوس نے اس کو مقید کر دیا تھا، حالانکہ عدی ہی کی تدبیروں اور کوششوں سے نعمان کو حیرہ کی بادشاہت ملی تھی اور اس سے قبل نعمان نے اپنی لڑکی "ہند" کی شادی بھی عدی کے ساتھ کر دی تھی لیکن آخر کار عدی حاسدوں کی سازش کا شکار ہو گیا اور نعمان نے اس کو قید خانہ میں ڈال دیا جہاں اس صحرا نورد قلندر اور سیرو شکار کے دلدادہ کو بڑی بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں زندگی کے آخری ایام گذارنے پڑے، اس زمانہ میں اس نے بہت سی نظمیں کہیں جن میں اس نے اپنی صفائی پیش کی اور نعمان کو اپنے احسانات یاد دلائے، اور انقلاباتِ عالم و حوادثِ روزگار کا ذکر بھی بڑے مؤثر انداز میں کیا، یہ اشعار اس کی زندگی کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں، ایک زمانہ وہ تھا جب وہ بڑے عیش و عشرت اور عزت و رفعت کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا، اور ایک وقت یہ ہے جب قید خانہ کی کوٹھری میں ذلت و نکبت کے دن گذار رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں کبھی شراب و ساقی اور نغمہ و طرب کا ذکر کرکے اپنی گذشتہ پرمسرت زندگی کی عکاسی کرتا ہے، اور کبھی زوالِ نعمت و لذت اور موت و فنا کا بیان کرکے عبرت و افسوس کا اظہار کرتا ہے، اس طرح وہ نعمان کو نصیحت بھی کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنی موجودہ شان و شوکت اور دولت و ثروت پر مغرور ہو کر حوادثِ ایام سے غافل نہ رہے۔

چنانچہ وہ گذشتہ بادشاہوں کے رعب و جلال، شان و شوکت اور ان کے محلوں اور قصروں کی عظمت و جلالت کا ذکر کرکے ان کی تباہی و بربادی کا نقشہ کھینچتا ہے اور ان کے

ذریعہ خود اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی کے ساتھ نعمان کے دل کو بھی موم کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اس پر مہربان ہو کر اسے قید سے رہا کر دے لیکن بدنصیب شاعر کو کسی طرح رہائی نہ مل سکی اور کچھ ایسے اسباب رونما ہوئے کہ نعمان نے بالآخر اسے قتل کرا دیا۔

ان حالات و واقعات کی متعدد مثالیں عدی کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے ہم صرف ایک قصیدہ پر سرسری نظر ڈالتے ہیں، جس کا مطلع یہ ہے:-

أرواح مودع أم بكور ⁂ لك فاعمد لأي حال تصير[1]

(کیا کوئی شام تجھ کو الوداع کہنے والی ہے یا صبح۔ تو دیکھ کہ تیرا کیا انجام ہونے والا ہے)

اس کے بعد شاعر زندگی کی لذتوں اور مسرتوں کا ذکر کرتا ہے، پھر اپنے قید و بند کو یاد کر کے کہتا ہے:

أيها الشامت المعير بالدهر ⁂ أأنت المبرأ الموفور

أم لديك العهد الوثيق من ⁂ الأيام بل أنت جاهل مغرور

(اے حوادثِ دھر پر دوسروں کو عار دلانے والے اور خوشی منانے والے، کیا تو ہمیشہ حوادث سے اسی طرح محفوظ رہے گا اور نعمت و مسرت سے برابر محظوظ ہوتا رہے گا؟ کیا زمانہ کی طرف سے حفاظت کا کوئی معاہدہ تجھ کو مل چکا ہے؟ ایسا نہیں ہے بلکہ تو جہل و غفلت اور فریب میں مبتلا ہے۔)

اس کے بعد چند اشعار میں حوادثِ روزگار کا ذکر کرنے کے بعد کئی بادشاہوں کا نام لے کر سوال کرتا ہے کہ وہ سب کہاں گئے جن کا آج کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ گردشِ ایام کے کہ دبخشا، ان کی حکومت فنا ہو گئی، اور ان کا دیار ویران ہو گیا، آخر میں ... کے ایک ...

---

[1] شعراء النصرانیۃ، ص ۴۵۵

بادشاہ نعمان کی شان و شوکت، سدیر کے عظیم الشان قصر خورنق کا ذکر کرکے، قصیدہ کو اس طرح ختم کرتا ہے:

ثم بعد الفلاح والملك والأمة ... وارتهم هناك القبور[1]

ثم صاروا كأنهم ورق جف ... فألوت به الصبا والدبور

(سلطنت، خوشحالی اور حکومت کے بعد آخر قبروں نے ان کو چھپا لیا۔ پھر وہ خشک پتوں کے مانند ہوگئے جن کو مشرقی و مغربی ہوا نے اڑا دیا۔)

عدی کے بعد عیسائی شعراء میں قس بن ساعدہ[2] کا نام قابل ذکر ہے۔ ان کا شمار جاہلیت کے مشہور خطباء میں ہوتا ہے۔ ان کے اشعار اگرچہ بہت قلیل تعداد میں پائے جاتے ہیں، صرف دو تین نظمیں، چند قطعات اور کچھ متفرق اشعار ہی دستبرد زمانہ سے بچ سکے ہیں لیکن جو کچھ بھی موجود ہے اس میں پند و حکمت اور زہد و تقویٰ کا رجحان غالب ہے جو ان کی زندگی کے بالکل مطابق ہے۔ ان کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ نجران کا اسقف تھا اور عیسائی مبلغوں اور راہبوں کی طرح سیاحانہ زندگی گذارتا تھا۔ وہ عرب کے میلوں اور بازاروں میں بھی شریک ہوتا تھا اور وہاں موت و فنا، حشر و نشر اور جنت و جہنم کی یاد دلا کر وعظ و نصیحت کیا کرتا تھا۔ مثال کے طور پر چند اشعار کا یہ ایک قطعہ ملاحظہ ہو:

في الذاهبين الأولين ... من القرون لنا بصائر[3]

لما رأيت مواردا ... للموت ليس لها مصادر

ورأيت قومي نحوها ... تمضي الأصاغر والأكابر

لا يرجع الماضي ولا ... يبقى من الباقين غابر

---

[1] شعراء النصرانیہ، ص ۴۵۳ [2] قس بن ساعدہ کے لیے دیکھیے شعراء النصرانیہ، ص ۲۱۱ و مابعد [3] ایضاً ص ۲۱۳

[illegible]

ایقنت انی لامحالۃ ... حیث صار القوم صائر

(صدیوں سے اگلے لوگ جو یہاں سے برابر گزرتے رہے ہیں ان کے اندر ہمارے لیے عبرت و بصیرت کی بہت سی باتیں ہیں۔ جب میں نے دیکھا کہ موت کا گھاٹ ایسا ہے جہاں پہنچنے کے بعد واپسی نہیں ہوتی۔ اور میں نے اپنی قوم کو دیکھا کہ چھوٹے بڑے سب اسی گھاٹ کی طرف چلے جاتے ہیں، نہ کوئی جانے والا واپس آتا ہے اور نہ کوئی رہ جانے والا باقی بچتا ہے، تو مجھے یقین ہو گیا کہ جہاں سب لوگ جا رہے ہیں مجھے بھی لامحالہ وہیں جانا ہے۔)

قس کی ایک اور نظم بیس اشعار پر مشتمل ہے، اس میں اس نے عدی کی طرح گذشتہ زمانہ کے متعدد بادشاہوں اور سرداروں کا ذکر کر کے ان کی موت و ہلاکت کا نقشہ کھینچا ہے، اس کے صرف ابتدائی دو شعر پیش کیے جاتے ہیں:-

قد کنت اسمع بالزمان ولا اری ... ان الزمان یطیق نتف جناحی[1]

فاساء أسرع فی حتی اجتثت ... بیضاً متون عوارضی وصفاحی

(میں زمانہ کے متعلق سنا کرتا تھا لیکن یہ نہیں سمجھتا تھا کہ وہ میرے بازو بھی نوچ سکتا ہے۔ پس میں نے دیکھا کہ وہ تیزی سے میری طرف لپکا یہاں تک کہ میرے رخسارے اور پیشانی کے ارد گرد سارے بال سفید ہو گئے۔)

جہاں تک یہودی شعراء کا تعلق ہے ان کی کل تعداد چار پانچ سے زیادہ نہیں ہے، اور جو اشعار ان سے منسوب ہیں، وہ بھی نہایت قلیل ہیں، ان میں صرف سموئل بن عادیا کا ذکر مختصر طور پر کیا جا سکتا ہے، اس کی بعض نظموں میں پند و حکمت اور زہد و قناعت کا عکس ملتا ہے، چنانچہ اس کی ایک نظم اس طرح شروع ہوتی ہے:-

---

[1] شعراء النصرانیہ ص ۲۱۰ [2] دیوان السموأل بیروت ۱۹۵۱ء ص ۴۶

نطفة ما منيت يوم منيت — أمرت أمرها وفيها بريت[1]

ميت دهر قد كنت ثم حييت — وحياتي رهن بأن سأموت

(جس دن میری تقدیر بنائی گئی مجھے ایک قطرہ کی شکل میں مقدر کیا گیا اسے حکم دیا گیا اور اسی میں میری تخلیق کی گئی، میں بالکل معدوم تھا پھر وجود میں آیا، اور میرا وجود میری موت کے ہاتھوں میں رہن ہے)

اس کے بعد اس نظم میں شاعر نے حشر و نشر، حساب و کتاب، روز جزا و سزا کا بیان اور متعدد پیغمبروں کا ذکر کیا ہے، اور قناعت اور کسب حلال کی تلقین بھی کی ہے، نظم کے آخری دو شعر یہ ہیں:

ليس يعطى القوي فضلا من الرزق — ولا يحرم الضعيف الشخيت

بل لكل من رزقه ما قضى الله — وإن حز أنفه المستميت

(طاقتور کو مقسوم سے زیادہ رزق نہیں مل سکتا اور نہ کمزور کو اس کے رزق سے محروم کیا جا سکتا ہے، ہر ایک کو اتنا ہی رزق ملتا ہے جتنا اللہ اس کے لیے مقدر کر دیتا ہے، اگرچہ طلب رزق میں کوئی کتنا ہی ناک رگڑے اور جان کی بازی لگا دے۔)

موت و فنا کے موضوع پر سموئل کی ایک دوسری نظم کے یہ چند اشعار بھی قابل ملاحظہ ہیں:

أسلم سلمت ولا سليم على البلى — فني الرجال ذوو القوى فنيت[2]

كيف السلامة إن أردت سلامة — والموت يطلبني ولست أفوت

وأقيل حيث أردت غلا أخفى له — ويرى ملا يحيا بحيث أبيت

(سلامتی روی اختیار کرو تو سالم رہوگے اور فنا سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا، بڑے بڑے طاقتور لوگ فنا ہو چکے ہیں، پس مجھے بھی فنا سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اگر میں اپنی محفوظ

---

[1] دیوان السموئل بیروت ۱۹۰۹ء ص ۵ و [2] ایضاً ص ۱۹

مجھ کو کشش کرنے والی ... سکتا ہوں جب کہ حیثیت ... [illegible]

اس سے بچ نہیں سکتا ہوں، وہ بیوی جہاں آرام کرتا ہوں وہاں ملامت مجھے [illegible] لیتی ہے

آمیں اس سے چھپ نہیں سکتا اور جیا ... رات گزارتا ہوں (ان میں) اس کی نظر کے

سامنے ہوتا ہوں، بس موت کسی طرح [illegible] ہو سکتی۔)

اس مختصر تجزیہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جاہلی شاعری میں بھی مذہبی رجحانات کافی پائے جاتے ہیں، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ عہد جاہلیت میں یہ رجحان عام نہیں تھا تاہم جاہلی شعراء کا کلام اس سے بالکل خالی نہیں ہے، اور بہت ممکن ہے کہ جاہلیت کے اسی کلام نے بعد میں اسلامی دور کے ان شعراء کے لیے نمونہ کا کام دیا ہو، جنہوں نے زہد و تقوی کو اپنی شاعری کا مستقل موضوع بنایا یا دیگر موضوعات کے ساتھ ساتھ کم از کم اس موضوع پر بھی نظمیں لکھیں جیسا کہ اسلامی عہد کی عربی شاعری کے بیشتر موضوعات کا ماخذ جاہلی شاعری ہی ہے۔

ارمغان سلیمان

حضرت سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا اصل میدان تو [illegible] تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے جو شاندار کارنامے انجام دیے ہیں وہ ایک ایک کر کے منظر عام پر آ چکے ہیں اور اہل علم سے [illegible] ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ ان تمام کمالات کے ساتھ حق تعالیٰ نے ان کو [illegible] شعر و سخن کا بھی بہت اچھا ذوق [illegible] تھے [illegible] جیسے [illegible] کلام کا مجموعہ ارمغان سلیمان کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا [illegible] کا کلام [illegible] گیا ہے۔

قیمت: [illegible] روپے

پتہ: [illegible] عالمگیری روڈ، [illegible] آباد، کراچی۔

نوعی خبوشانی

از جناب ڈاکٹر سید امیر حسن صاحب عابدی، دہلی یونیورسٹی

ملا نوعی خبوشان کے رہنے والے تھے جو مشہد کے پاس ہے۔ امین احمد رازی لکھتے ہیں:-

"خبوشان از جاہای نیک خراسان است۔ ہلاکو خان تجدید در عمارت و آبادانی آن گردیده و دیوارش از خشت نیز به آب عمارات افزوده۔ حضرت منسوب آمده کہ خبوشان باعث زبان پاستان دستور می خوانندش"

مؤلف عرفات العاشقین نے نوعی کا پورا نام محمد صفائی اور مؤلف مخزن الغرائب نے محمد رضا بتایا ہے۔ نیز مؤخر الذکر نے ان کو حاجی محمد خبوشانی کا بیٹا لکھا ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ میں نوعی ہندوستان آکر پہلے مرزا محمد یوسف خان مشہدی کے پاس رہے، اگرچہ دنوں کے بعد وہ شاہزادہ سلطان دانیال سے وابستہ ہوگئے، اور ان کے انتقال کے بعد مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے پاس رہنے لگے۔ خانخاناں نے ان کی بڑی قدر و منزلت کی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ جائزہ میں ان کو دس ہزار یا ایک ہزار نقد، خلعت، ہاتھی اور گھوڑے عنایت کیے۔ ملا نوعی اس انعام کے متعلق کہتے ہیں:-

الحمد کہ نوعی سپاہان ایم　　کز لطف میر معزی ز دولت سنجر

گلچین ... گل ...　　شگفته کہ ... زبان ...

[illegible]

کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ ان کو سونے سے بھی تولا گیا،

نوعی نے کبھی کبھی اپنے طالع بد کی شکایت بھی کی ہے :-

فسردہ طبعی طالع بروں نشد ہر چند ‎‏ بشمع سوختہ پروانہ بال و پر دادیم

اور انھیں ہندوستان میں رہ کر ایران خاص کر خراسان برابر یاد آتا رہا ہے :-

اشکم بخاک شوئی ایران کہ می برد ‎‏ در ہند تخم گل بخراسان کہ می برد

ایک جگہ وہ دکن کی ویرانی کا رونا روتے ہیں :-

ز دست بوالعجبیہای آسمان نوعی ‎‏ بطاق کسری و ویرانۂ دکن گریم

نوعی ہندوستان کے مندروں اور برہمنوں سے بیحد متاثر تھے :-

نوعی من و دریوزۂ بتخانہ کہ معشوق ‎‏ افواہ حقیقت بدل برہمنان ریخت

انھوں نے ۱۰۱۹ھ میں برہان پور میں انتقال کیا، صاحب نشتر عشق نے ان کی تاریخ وفات کہی ہے،

ابوالفضل کہتے ہیں :-

"شائستگی دارد۔ اگرچند بزرگوئی بی ملدا پایہ بیشی گراید"[1] (ص ۸۱۰)

مولف عرفات عاشقین کہتے ہیں :-

"نوباوہ نہال گلشن نزاکت و جوانی، نخل حدیقۂ لطافت و نکتہ دانی، صدر آرای ایوان فصیح و وسیع بلاغت معانی، ملک الزمان مولانا محمد رضای نوعی خبوشانی، الحق جوانی بود در غایت نزاکت طبیعت و خوبی صورت و صفائی ذہن خاطر و نہایت و لطف تخیل، بشعر و اگرچہ تازہ تازہ تراست و صیت التفات تاذن عشق بلند آوازہ ترہ با اقسام سخن تو ہاد و آفرین خا دانا شدہ طبعی بہ نہاد علوم دینی بہ غایت ...... داشت۔" (ص ۷۰۰)

امین احمد رازی لکھتے ہیں :-

"مرد نازی بلطف طبع وحدت فہم اتصاف داشتہ۔ ہموارہ چہرۂ معانی را بجلگونۂ عبارات تازہ سرخروئی میداده، اشعارش از آوردی بمنصۂ ظہور میرسانیده." (ہفت اقلیم ج ۲، ص ۳۰۶)

مولف ریاض الشعراء لکھتے ہیں :-

"از شعرای زمان و سخنوران جوان است۔" (ف۔ ی)

صاحب مخزن الغرائب لکھتے ہیں :-

" اشعارش خوش قماش و نازک واقع شده، خالی از لطافت و شیرینی نیست۔" (ص ۵۰۹)

صاحب شمع انجمن لکھتے :

"عندلیب خوش آواز گلفروش گلشن راز است، نواہای نوع بنوع بگوش یاران می رساند و گلہای رنگارنگ بدامن خریداران می افشاند۔" (ص ۴۵۲)

مؤلف نشتر عشق لکھتے ہیں :-

"مرد فاضل و مذاق بود و در علوم و خوش طبعی شہرۂ آفاق، نوع بنوع جواہر.....

از کان طبع خود بکنار مشتاقان سخن می افشاند و گلہای رنگ برنگ در جیب و دامان

..... می رساند۔" (ص ۵۸۴)

مؤلف سرو آزاد لکھتے ہیں :

"نوع کلامش جنس عالی است و در رشتۂ اتلامش لآلی۔" (ص ۲۲)

نتائج الافکار میں لکھا ہے :-

"آشنای محیط نکتہ دانی ملا نوعی خبوشانی گنجینۂ انواع فنون بوده و خزینۂ کلام فصاحت مشحون۔" (ص ۱۴ - ۱۳)

اور تذکرہ بیضا میں ہے کہ

"شاعری خوب و نوع کلامش عجیب است" (ج ۲ ص ۲۳۳)

مگر بداؤنی ان سے خوش نہ تھے اس لیے کہ وہ لکھتے ہیں:

"اگرچہ وہ اپنے کو شیخ حاجی محمد خبوشانی کی اولاد سے بتاتے ہیں مگر ان کے طرز زندگی سے اس کی تردید ہوتی ہے" (ج ۳ ص ۲۸۵)

نوعی کا یہ شعر تذکرہ نویسوں نے انتخاب کیا ہے:

زاں پیش کہ صبح از غضب امید آید ۔۔۔ یکبارہ چو شیشہ کہ خورشید برآید

مرزا صائب[1] نے ان کے مصرع پر مصرع لگایا ہے

ایں جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد ۔۔۔ سایۂ ابر بہاری کشت را سیراب کرد

نوعی کو فخر ہے کہ انھوں نے گل و بلبل کے مضامین کو زیادہ رواج دیا ہے۔

از سخن بسکہ رواج گل و بلبل دادم ۔۔۔ ہند را غیرت شیراز و خراسان کردم

نوعی اپنے کو حافظ شیرازی[2] کا پیرو بتاتے ہیں:

ہر ناقصی نہ اہل کمالے نمودہ است ۔۔۔ نوعی مرید حافظ سحر کلام شد

چنانچہ حافظ کی طرح انھوں نے لفظ "شرط" کا استعمال کیا ہے۔

بخت نکو چہ کار کند با سرشت بد ۔۔۔ کز بادہ شرط کشتی ما بر قفا رود

مؤلف عرفات عاشقین نے دیوان نوعی میں دو ہزار شعر بتائے ہیں، دیوان نوعی کا ایک ناقص نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے[3] جو اس مطلع سے شروع ہوتا ہے:

سایۂ گل تا بود فال رضا بستان ما ۔۔۔ نقد نام تو بود افتتاحیۂ دیوان ما

---

۱ متوفی بسال ۱۰۸۱ھ ۲ متوفی بسال ۷۹۱ھ ۳ نمبر ۳۳۲۶

انکی غزلوں سے کچھ اچھے اشعار نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں،

بزعم محتسب آن کیست کز میخانہ می آید   سبو بر دوش و سر برکف چو انگور دانہ می آید

غم رہبر محرمای گم شدہ کاندر رہ عشق   ہر سر خار سراغ کف پائی دارد

صد حلقہ خوناب جگر در قدحم ریخت   این حوصلہ دشمن زکجا ساقی ما شد

تو ہمی ورق نگاری ہمہ من جگر خراشم   ز شمار عمر پرسی غم بے شمار گویم

بی دیدہ ز نظارۂ دیدار بہ قسم   بی بادہ ز کیفیت دیدار بہ قسم

یہ غزل کتنی مرصع اور رواں ہے:۔

آمد شبی بہ بالیں سرمست و لاابالی   دستار نگار پر گل چشمم ز خواب خالی

از موکشودہ عنبر وز خوا فشاندہ گوہر   چون باد نو بہاری چون ابر برشگالی

من مست و محو بیخود کز شاخ سرو مرغی   ناگہ لحن داؤدی این بیت خواند خالی

خوش دولتیست یاد دوستانے سحر نمودن   با شیشہ ہای پری در خانہ ہای خالی

مگر عام طور سے نوعی کی غزلیں متوسط درجہ کی ہیں، اور انکے بیان آورد اور دور از کار خیالات پائے جاتے ہیں، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے واضح ہوگا،

با وصیریم و صفا منکشف سینۂ ما   کحل یعقوب غبار دہ گنجینۂ ما

بوالعجمیائی دل بباد بائی خیر باد   دست نظلم تا خدا در پائی لنگری نہ

چشم رہ دل بہ بہ مصر چمن افتاد   ہر خار چو گل یوسف بازار نظر بود

بعض جگہ تو بالکل نثر کا انداز ہو جاتا ہے، اور روح شعر بالکل غائب ہو جاتی ہے،

سودای ہمہ زنا دگر غواصان وست   من چو خس ہمہ کش شبنم عمل باشم

چیم گل شکستم در تو بہ ہای مستانہ   فقہای جا مذہب ہمہ با صلاحی مستی

معلوم ہوتا ہے کہ رامپور والے نسخہ کے آخر میں رباعیات بھی تھیں جو ضائع ہو گئیں اور صرف ایک رباعی محفوظ رہی۔

قصائد نوعی کے نام سے ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں ہے، جس میں بارہ قصیدے ہیں جو حضرت علیؓ، امام رضا، شہنشاہ اکبر، شاہزادہ دانیال کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ اکبر کی تعریف میں کہتے ہیں :-

اے شاہزادہ مدح ترا مہر آفتاب — شوقت شراب معرفت و ساغر آفتاب
بخت طراز لوای ترا مسند آفتاب — فرق ستارہ سائی ترا افسر آفتاب
چشم نظارہ مست ترا در صبوح شوق — مجذوب حسن یوسف و ہم بستر آفتاب
بلبل نوای خطبۂ اللہ اکبر است — بر شاخسار گلبن و منبر آفتاب

شاہزادہ دانیال کی مدح میں کہتے ہیں :-

دانیال شہ آنکہ بر در او — چون سایۂ بی نشان فتادم
صد چہرہ بگرد سجدہ بشستم — در کوثر عاشقان فتادم
صد کعبہ متاع سجدہ در سر — در پای خدایگان فتادم
بر سنبل سایۂ قد وسش — چون شبنم اختران فتادم
بر گلبن پای عطرسایش — چون نالۂ بلبلان فتادم
چون ناتمیان بخون نشستم — در مشہد کشتگان فتادم

تعجب ہے کہ اس مجموعہ میں کوئی قصیدہ خانخاناں کی مدح میں نہیں [illegible] ایک قصیدہ کے متعلق سراج الدین آرزو لکھتے ہیں: قصیدہ منقبت گفتہ کہ [illegible]

نسخہ نمبر ۳۰۴۴ ہے قصیدہ اس کے کل اشعار کی تعداد ۲۰۵ ہے۔

[illegible] در ابیات خود فی آمده می تواند [illegible]

[illegible] قصائد کے بعد پانچ ترکیب بند اور ترجیع بند ہیں۔ ایک ترجیع بند میں ہر بند کے بعد یہ شعر

دہرایا گیا ہے۔

بنشینم و در کشم نفس را — بی نغمہ گذارم این قفس را

ترکیب بندوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، حکیم ہمام اور شاہزادہ پرویز کی مدح

کی گئی ہے، ایک ترکیب بند میں شاہزادہ دانیال کا مرثیہ ہے جو بہت پر درد ہے،

زمین رستخیز فتنہ کہ در ملک جان فتاد — سیماب وار زلزلہ بر آسمان فتاد

دود دیگر [illegible] ستارہ نہان بود سالہا — برقی شدہ بخرمن آخر زمان فتاد

بتہا شکست و شد ہمہ بتخانہ ہا خراب — زین ترکتاز غم کہ بہندوستان فتاد

[illegible] مہر و کوکب ہفت آسمان بریخت — مانند برگ گل کہ زباد خزان فتاد

ہر گلبنی کہ داشت گلی بر زمین فگند — ہر جا کہ بود بلبلی از آشیان فتاد

طاق نگار خانۂ کسری شکست یافت — بر خاک پرچم علم کاویان فتاد

گیسو بریدہ زہرہ و بربست چنگ — تا این نوا بمحفل روحانیان فتاد

[illegible] گزین عالم روحانیان چو شد — مسند نشین سایۂ پروردگار کو

[illegible] باغبان سریر سلیمان گل چو شد — وان باد صبح یوسف مصر بہار کو

[illegible] سرو چمن زیب من کجاست — وان زشگفتہ غنچۂ نادیدہ خار کو

[illegible] بیلو گرانی کے مؤلفین نے لکھا ہے کہ نوعی نے ملک قمی کا بھی مرثیہ لکھا تھا، گرچہ خود [illegible]

[illegible] ملک قمی کی وفات عام طور سے ۱۰۲۴ھ میں بتائی جاتی ہے " اس بزرگ [illegible]

[illegible] ترکیب بند اور ترجیع بند کے تمام اشعار کی تعداد [illegible] ہے [illegible]

[illegible]

بنا دیا ہے اور یہ واقعہ صحیح نہیں ہے اور اب تک مجھے نوعی کی موت پر نوعی کا کوئی مرثیہ نہیں ملا۔

اس قلمی نسخہ میں تین مثنویاں بھی ہیں جن میں سے ایک ساقی نامہ[1] ہے جو خانخاناں کی مدح میں کہا گیا ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے :۔

تو ئی اولیں پیر میخانہ ہا
بیا د تو شبگیر پیمانہ ہا

اسی مثنوی کے دو شعروں کو تذکرہ نویسوں نے خاص طور سے پسند اور انتخاب کیا ہے :

بدہ ساقی آں ارغوانی نبیذ
کہ دور خراباں بپایاں رسید

بگرداں زدہ عمر برگشتہ را
چو شاہ نجف روز خیبر گشتہ را

اسی ساقی نامہ کے جائزہ میں نوعی کو وہ گرانبہا عطیہ ملا تھا جس کا ذکر تذکرہ نویسوں نے اور ملا رستی نے کیا ہے۔ سراج الدین آرزو اس مثنوی کے متعلق لکھتے ہیں : "ساقی نامہ مختصری دارد خیلی رنگین و دردناک۔ شعرا درا مزۂ خاص است"[2] دوسری دونوں مثنویاں ان ابیات سے شروع ہوتی ہیں :۔

بہار آمد باستقبال نوروز
چو عہد بلبل از دنبال نوروز

بماہی طعنہ زد در وزی سمندر
کہ تو محبوب آبی من ز آذر

نوعی کی منظومات میں سب سے زیادہ اہم مثنوی سوز و گداز ہے[3] جس کے متعلق مؤلف کلمات الشعراء نے لکھا ہے۔ "مثنوی سوز و گداز بسیار بسوز و گداز گفتہ" اور اس کا یہ شعر انتخاب کیا ہے :

چناں مستانہ بر آتش نظر کرد
کہ از بد مستیش آتش ہم خندہ کرد

آرزو کہتے ہیں "بسیار بمزہ گفتہ"[4] یہ مثنوی اس بیت سے شروع ہوتی ہے :

الٰہی خندہ ام ما تا بگی دہ
بہر شکلم رہ جگر پرکالگی دہ

---

[1] مثنویوں کے کل ابیات کی تعداد ۴۴۴ ہے ساقی نامہ کا ایک اور نسخہ بھی رضا لائبریری میں ہے (نمبر ۲۲۳۲) [illegible]
[2] [illegible]
[3] اس مثنوی میں تقریباً ۵۰۰ شعر ہیں [4] ص ۱۳۳ [illegible] مجمع النفائس [illegible]

مثنوی سوز و گداز میں شاعر نے بتایا ہے کہ شہنشاہ اکبر نے اسکو خصوصیت سے بھیجکر بلوایا:-

ہمانا از درم ہدہد سپہر ششتی   چہ ہدہد بلکہ طاؤس بہشتی

تو خدمت ناصبوری شاہ مشتاق   باین نسبت رسد یاری بہ آفاق

ہنوز آن مژدہ آور در سخن بود   کہ شوقم بر در شہ بوسہ زن بود

قضا فرمان شہنشاہ جوان بخت   فلک خرگاہ ماہ آسمان تخت

چو دید افتادہ من خود را برافراشت   بدست خود سرم از سجدۂ داشت

نسیم خندہ بر خاموشیم زد   گلاب مژدہ بر بیہوشیم زد

اس کے بعد کہتے ہیں کہ گل و بلبل، شمع و پروانہ، فرہاد و شیریں، لیلیٰ و مجنوں جیسے پرانے قصوں سے طبیعت گھبرا گئی ہے۔

بگفت ای برہمن زاد محبت   کہن شاگرد استاد محبت

نواہای کہن خاطر تراشید   بصد ناخن جگر را در تراشید

حدیث بلبل و پروانہ تا چند   ہوس در خواب این افسانہ تا چند

کہن افسانہ با شنیدہ اولیٰ   سخن از ہر چہ گوئی دیدہ اولیٰ

نوای تازہ برکش ز منقار   کہ گل در گل گذارد خار در خار

کہن شد قصۂ فرہاد و شیرین   چو عیسی رفتہ در تقویم پارین

بجز نامی ز لیلیٰ در جہان نیست   بجز حرفی ز مجنون در میان نیست

اس لیے ہم کو نئے اور تازہ افسانوں سے آشنا ہونا چاہیے اور ہندوستانی ماحول میں رہ کر نئی نئی داستانوں کو تلاش کرنا چاہیے، اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کس طرح یہاں کے جانباز محبوب اپنے کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں۔

یکی بدرات آتش خانہ و بتکدہ ہمانجا بت و بتکدہ و چنگ

بچین رونق کدہ آتش پرستی گل افشاں خس و خاشاک ہستی

گروہی از تعلقہای جان سوز کباب شعلۂ آتش زدہ سوز

پس از مردن ز ہم رو پر نتابند بہم در بستر آتش بخوابند

پھر ایک تازہ اور سچی داستان نظم کرنے کی فرمایش کرتے ہیں:-

بحرف تازہ عزم کنم گوش کہ تاریخ کہن گردد فراموش

ترقی پسند ادیب آج روایتی شاعری کے خلاف آواز بلند کر رہے ہیں مگر غنیمت کو صدیوں پہلے اس کا احساس تھا۔

داستان

عہد اکبری میں لاہور میں دو ہندو عاشق و معشوق ایک دوسرے پر فریفتہ تھے،

دو ہندو زادۂ مشرب سرشتہ بشر خلقت ولی قدسی سرشتہ

جب دس برس عالم مہجوری میں گزر گئے:-

چو سال انتظار از دہ فزون شد نوائی طاقت از ہر سو نگون شد

تو لڑکے نے باپ کو مجبور کیا کہ وہ اس کی شادی کر دے، باپ نے لڑکی والوں کو پیغام بھیجا کہ وہ بھی شادی کی تیاری کریں:

شما ہم جشن سور آمادہ سازید جہان خرم بسان بادہ سازید

دونوں طرف لوگ خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے:

سماع از شوق سر زد پا نمی یافت ز شادی غنچۂ لب جا نمی یافت

ایک ہفتہ تک شادی کی تیاریاں ہوتی رہیں۔

چو شد ایں جملہ ترتیب عروسی　　　زمیں را داد آسماں خاک بوسی

اس کے بعد دولہا کی بارات بڑے دھوم دھام سے روانہ ہوئی۔

قدم در آرزوی سور و دمی رفت　　　نگاہش بر قفای بود و می رفت

لیکن انھیں کیا خبر تھی کہ تھوڑی ہی دیر میں یہ خوشی غم میں تبدیل ہو جائے گی۔

دل داماد از طرب بیگاہ می رفت　　　تو میگفتی بہ ماتم خانہ می رفت

بارات چلی جا رہی تھی کہ اچانک ایک کہنہ مکان گر پڑا اور دولہا دب کر مر گیا، اس حادثہ سے ایک کہرام بپا ہو گیا۔

خروش از چرخ نیلی پوش برخاست　　　ز ہر دل صد قیامت جوش برخاست

دلہن کو اس حادثہ کی خبر ملی تو فوراً ستی ہونے کے لیے تیار ہو گئی:

چرا تا زندہ ام شرمندہ باشم　　　کہ سوزد دلبر و من زندہ باشم

شہنشاہ اکبر کو خبر ملی تو وہ رونے لگا:

چو شاہ ایں ماجرا بشنید بگریست　　　کہ عشق ایں ہمہ کافر دلی چیست

اور غمزدہ لڑکی کو بلا کر امتحان کے لیے اپنے تخت پر جگہ دی، اس کو اپنی فرزندی میں لیکر رانی کا خطاب دیا اور دنیا کی ہر ممکن نعمت اس کے لیے فراہم کر دی کہ وہ اس ارادہ سے باز آ جائے:

شکوہش باز گرم آشنا شد　　　بحکم امتحاں فرماں رواں شد
شہ از لطفش بپائی تخت بنشاند　　　جواہر ہائے لب بر فرقش افشاند
بفرزندی خود داد اختصاصش　　　بخلعت گاہ خلوت کرد خاصش
بہر کشور خطاب رانیش داد　　　بملک ہند فرمان رانیش داد

زہر جنبش از مہ تا بماہی کرامت کرد خیرانداز پادشاہی

لیکن لڑکی کسی صورت سے اپنے مستحکم ارادہ سے باز نہ آئی۔

لبش جز گوہر آتش نمی سفت بغیر سوختن چیزی نمی گفت

بشہ گفت مرا بد نام کردی بافسوں روز عیشم شام کردی

خیالت را دریں رہ خضر دل کن مرا آمرد و آتش را خجل کن

آخرکار شہنشاہ نے مجبور ہو کر شاہزادہ دانیال کو حکم دیا کہ وہ اس کے ساتھ جائے اور شاہانہ انداز سے اس کو ستی کرائے:

اجازت گونہ دادش از تہ دل زشادی بر پرید آں مرغ بسمل

اشارت کرد با پور جواں بخت کہ ای چشم و چراغ افسر و تخت

ببر ایں شعلہ را تا کان آتش در انگن آتشی در جان آتش

بخرمن عود و صندل بر فروزاں بہ رسم و خت را با نش بسوزاں

چنانچہ شاہزادہ دانیال اس غمزدہ کے ساتھ روانہ ہوا، شہنشاہ اکبر بھی مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا:

گل بخت و بہارستان اقبال مراد دانش و جان شہزادہ دنیال

بحکم شاہ و فرمان تماشا رواں شد همره آں ناشکیبا

جہانی کردہ وقف از ہر کنارہ متاع جان بہا را ج نظارہ

شہنشہ ہر نظر کردی بپاسی ہر گامی رواں کردیش کامی

اپنے محبوب کی لاش پر پہنچ کر اس کو بوسہ دیا، بغلگیر ہوئی اور اسکے ساتھ جل کر خاکستر ہو گئی

سر شوریدہ بر زانو نہادش لبش بوسید و جان دید و نهادش

کشیدش تنگ تر از جان در آغوش — چو جانان یافت کرد از جان فراموش

اس دردناک منظر کو دیکھکر شہزادہ روتے روتے بیہوش ہو گیا اور شہنشاہ اکبر کی آواز سنکر ہوش میں آیا اور اس سے اس دردناک منظر کو رو کر، رو کر بیان کیا

چو نقش حال او شہزادہ بر خواند — گلاب از گلبن مژگان برافشاند

ہوس خلد محبت باد بر تو — خود آتش ابر رحمت باد بر تو

ہمیں کاوازش آمد بگوشش — باستقبال آں برخاست ہوشش

ہوس از عشق من شرمندہ بہتر — بمرگ من محبت زندہ بہتر

لبش با دشاہ در گفت و شنو بود — ولی ہر ذرہ اش آتش در دو بود

سرو آزاد و مغل بیلوگرافی کے مولفین کا بیان ہے کہ نوعی نے یہ مثنوی شہزادہ دانیال کی فرمائش پر لکھی تھی، جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ مثنوی کے شروع میں خود شاعر نے شہنشاہ اکبر کا ذکر کیا ہے، جس کی فرمائش پر اس نے یہ داستان نظم کی تھی۔ مغل بیلوگرافی میں یہ بھی لکھا ہے کہ یہ مثنوی [illegible] میں نظم کی گئی، جو قطعاً غلط ہے اس لیے یہ واقعہ اکبر کی زندگی کا ہے۔ اور ۱۶۰۵ء میں اکبر نے انتقال کیا ہے،

مثنوی سوز و گداز ۱۲۸۴ھ / ۱۹۶۷-۶۸ء میں لکھنؤ میں اکبر نامہ کے ساتھ شائع ہوئی تھی، اور ایران کے مرزا، ص۔ داؤد اور لنکا کے انند۔ ک۔ کمارسوامی (Anand K. Coomaraswamy) نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، جو ۱۹۱۲ء میں لندن سے شائع ہوا، اس انگریزی ترجمہ میں برٹش میوزیم کے قلمی مصور نسخے سے تصویریں بھی شامل کی گئی ہیں۔

نمبر ۲۸۳۶

ماخذ

۱۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی :۔	آثر الکرام موسوم بسرو آزاد، مطبع رفاہ عام [illegible]
۲۔ محمد افضل سرخوش :۔	کلمات الشعراء، دین محمدی پریس، لاہور۔
۳۔ محمد قدرت اللہ گوپاموی :۔	نتائج الافکار، چاپخانہ سلطانی، بمبئی
۴۔ غلام علی آزاد بلگرامی :۔	خزانۂ عامرہ، مطبع نولکشور، کانپور
۵۔ سید محمد صدیق حسن خان :۔	شمع انجمن، رئیس المطابع شاہجہانی
۶۔ سراج الدین علی خان آرزو :۔	مجمع النفائس، نسخۂ خطی شمارہ ۶۹۶، خدا بخش لائبریری بانکی پور
۷۔ تقی الدین محمد اوحدی :۔	عرفات عاشقین، نسخۂ خطی شمارہ ۶۰۶ " " " "
۸۔ احمد علی ہاشمی سندیلوی :۔	مخزن الغرائب، نسخۂ خطی شمارہ ۳۴۰ " " " "
۹۔ غلام علی آزاد بلگرامی :۔	ید بیضا، نسخۂ خطی شمارہ ۴۴۴ " " " "
۱۰۔ امین احمد رازی :۔	ہفت اقلیم، کتابفروشی علی اکبر علمی و کتابفروشی ادبیہ [illegible]
۱۱۔ علی قلی خان والہ داغستانی :۔	ریاض الشعراء، نسخۂ خطی شمارہ ۳۸۳، نیشنل میوزیم [illegible]
۱۲۔ ابو الفضل :۔	آئین اکبری، نولکشور
۱۳۔ حسین قلی خان عظیم آبادی :۔	نشتر عشق، نسخۂ خطی ۲۰۳۲، نیشنل آرکائیوز [illegible] دہلی

[illegible] T. W. Beale : Oriental Bibliographical Dictionary 1894

[illegible] D. N. Tarapurwala and D. N. Marshall. Mughal Bibliography. 1962.

[illegible] Abul Fazl : Ain-i-Akbari, Translated into English by H. Blochman Calcutta 1927

17. Herman Ethe: Catalogue of Persian Manuscripts in The Library of India office Oxford, [illegible]

18. Mulla Abdul Qadir Badaoni: Muntakhabut-Tawarikh, vol III Translated by Wolsley Haig, Calcutta, 1925.

میر غلام ...

سیاست میں اسلام

مترجمہ محمد آفاق صاحب صدیقی ایم اے

مشہور انگریزی رسالہ مسلم ورلڈ نے "سیاست میں اسلام" کے عنوان سے ایک سمپوزیم منعقد کیا تھا، اور اس پر مختلف ماہرین سے مضمون لکھوائے تھے، ان مضامین کو اس نے ایک خاص نمبر میں شائع کر دیا ہے، ان میں یہ دکھایا گیا ہے کہ اسلامی ملکوں اور جن ملکوں میں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ ان میں ان کے سیاسی و مذہبی رجحانات کیا ہیں اور اس بارہ میں حکومت کا رویہ کیا ہے، مضمون نگار قریب قریب کل امریکی ہیں، اس لیے ان کے بعض خیالات اسلامی نقطۂ نظر سے قابل قبول نہیں ہیں، لیکن ان مضامین سے مختلف ملکوں کے مسلمانوں کے مذہبی و سیاسی رجحانات پر روشنی پڑتی ہے، اس لیے ان کو شائع کیا جاتا ہے۔

م

ترکی

دوسری جنگ عظیم کے بعد ترکی میں احیائے دین کا نعرہ بے معنی ہو کر رہ گیا ہے کیونکہ وہاں مذہبی احساسات برابر باقی رہے، آج کل عام طور پر جمعہ کی نماز میں مسجدوں میں ... لوگ نظر آتے ہیں، عازمین حج کی لمبی قطاریں انقرہ کے ایئرپورٹ کے ... دیکھی ... ترکی میں مذہب قطعی طور پر کبھی نابود نہیں ہوا ... حکومت ... اجازت دینے کا فیصلہ کیا، اس وقت ترکی کے سیاستدانوں کو کا ...

ووٹ کی اہمیت کا احساس ہوا، اس فیصلہ کے جو نتیجے نکلے ان کا اندازہ ٹائمز (لندن) کے نمایندہ مقیم انقرہ کے مضمون مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۶۲ء سے کیا جا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے

"ترکی کی تمام سیاسی جماعتوں کے لیے مذہب ووٹ حاصل کرنے کا ایک پوشیدہ آلہ ہے، جسے بآسانی استعمال کیا جا سکتا ہے، الکشن کے زمانہ میں لفظ "اللہ" کے ریاکارانہ استعمال اور صوم وصلوٰۃ کی پابندی سے ہزاروں ووٹ حاصل کیے جا سکتے ہیں، اس گناہ میں عام طور سے جسٹس پارٹی اپنی پیش رو جماعت یعنی ڈیموکریٹک پارٹی کی طرح ملوث خیال کی جاتی ہے۔"

ڈیموکریٹک پارٹی نے اپنے دورِ حکومت میں پندرہ سو مسجدیں ہر سال تعمیر کیں، ۱۹۵۰ تا ۱۹۶۰ء میں اس اوسط سے پندرہ ہزار مسجدیں تعمیر ہوئیں،

جسٹس پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے سے قبل بھی یہ اوسط قائم رہا، ۱۹۶۲ء میں چھ ہزار مسجدیں تعمیر کی گئیں،

مصطفےٰ کمال کی وفات کے بعد سے ہر حکومت نے مذہبی جذبات کو سیاسی اور ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا، یہاں تک کہ قومی مجلس مشاورت نے بھی جس نے ڈیموکریٹک پارٹی کو اقتدار سے محروم کیا تھا، ۳ لاکھ ترکی میرا قونیہ کے دو مذہبی تربیتی درسوں کو دیے، یہ رقم اس قلم اور تصویروں کی نمایش سے حاصل کی گئی تھی جو گذشتہ حکومت کے اراکین کے عدالتی مقدمے کے زمانہ میں لگائی گئی تھیں، لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ مذہبی جذبات و تصورات کا واحد مصرف ووٹ حاصل کرنا تھا، ۱۹۶۵ء میں ریپبلکن پارٹی نے مسجدوں کے اماموں اور خطیبوں کے لیے ایک تربیتی نصاب مرتب کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، اس کا مقصد انتخابی حلقوں کے مذہبی جذبات سے سیاسی فائدہ حاصل کرنا نہ تھا، مگر مخالف جماعتوں نے تعصب کی بنا پر یہی سمجھانے کی کوشش کی

اس کا مقصد سیاسی تھا۔

۱۹۲۴ء میں جب خلافت کو ہمیشہ کے لیے ختم کیا گیا تو تمام دینی مدارس کو وزارت تعلیم کے سپرد کر دیا گیا، جس نے ان کو فوراً بند کر دیا اور مستقبل کے اماموں اور خطیبوں کے لیے نئے مدرسے کھولے گئے، استنبول یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات قائم کیا گیا، لیکن اتاترک کا یہ فیصلہ تھا کہ مذہب کو سیاست سے بالکل علیحدہ رکھنا چاہیے، اس کے علاوہ مذہب اعلیٰ طبقوں میں معتوب ہو چکا تھا، اور نئی نسل مغربی تہذیب کی گرویدہ تھی، اس لیے شعبۂ دینیات مقبول نہ ہو سکا، ۱۹۳۳ء میں اس کے طلبہ کی تعداد صفر کے برابر ہو گئی، اور ۱۹۲۰ء تک دین کی رہنمائی جاہلوں اور نیم ملاؤں کے ہاتھوں میں چلی گئی، کوئی قوم اس خطرناک صورت حال کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی، اس لیے ۱۹۳۰ء میں تیجانی فرقہ نمودار ہوا، جس نے جنگ عظیم کے بعد بڑی نمایاں حیثیت اختیار کر لی، اس نے علانیہ اتاترک کی اصلاحات کی مخالفت شروع کر دی اور اراکین نے اتاترک کے مجسموں کو جو شاہراہوں پر نصب تھے، توڑ پھوڑ کر عوام کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔

۱۹۵۰ء میں تحریک ترکلوق کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ اس جماعت کا زوال شروع ہو گیا، اس تحریک کا بانی سعید نورسی تھا، جو سعید کردی اور بدیع الزمان کے نام سے بھی مشہور تھا، نورسی سب سے پہلے ۱۳ مارچ ۱۹۰۹ء کے واقعہ کے سلسلہ میں لیڈر کی حیثیت سے عوامی حلقہ میں داخل ہوا، یہ واقعہ ترکی کے گذشتہ انقلاب کے اثرات کو زائل کرنے کی ایک کوشش تھی، یہ تحریک مغربی تہذیب کی دشمن اور [illegible] تحریک کی مخالف تھی، سعید نورسی کو اس کے ساتھیوں اور معتقدوں نے اس کی [illegible] مطابق الفطرت قوتوں کا مظہر قرار دیا تھا، اور اس کی تصنیفات کے مجموعہ کو [illegible] کے نام سے مشہور ہے، قرآن مجید کے بعد مذہبی [illegible] سمجھا جاتا ہے

[illegible] میں ۸۵ سال کی عمر میں وفات پائی۔

یہ بات قطعی ہے کہ ایک صحت مند اسلامی سوسائٹی میں اس طرح کی تحریکات کا ابھرنا اور مقبول ہونا ناممکن ہے۔ ۱۹۶۲ء میں وزارت داخلہ نے اماموں اور خطیبوں کی تعلیمی منصوبہ بندی کے سلسلہ میں جو اعداد و شمار پیش کیے تھے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ ساٹھ ہزار میں سے کل ۱۰۱ مذہبی پیش واؤں کو صرف ابتدائی تعلیم حاصل تھی۔ ملک ترکی کے علماء بھی تعلیمی پستی کے ثبوت فراہم کرنا زیادہ دشوار نہیں، مثلاً علماء کا یہ خیال کہ لاطینی حروف عربی حروف کی آوازوں سے محروم ہیں، اس لیے قرآن مجید کا ترجمہ ترکی زبان میں ناممکن ہے، حالانکہ ترجمہ سے حروف کی آواز کا کوئی تعلق نہیں۔ اب کوئی بھی آدمی حنفی اصول کے مطابق قرات کرنے کا تصور بھی نہیں کرتا۔ آجکل جو ترجمہ رائج ہے اس پر شدید تنقیدیں جاری ہیں اور ترجمہ کی خامیوں کے سلسلہ میں جو مباحث اور دلائل پیش کیے جا رہے ہیں، ان کی بنیاد اس غلط تصور پر ہے کہ اس سے قبل ترکی زبان میں قرآن کا کوئی ترجمہ ہوا ہی نہیں، اس کا ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے، جو خود مصنف کے ساتھ استنبول یونیورسٹی میں ایک لکچر کے سلسلہ میں پیش آیا۔ لکچر کے بعد ایک طالب علم نے برہم ہو کر سوال کیا "کیا آپ نے اپنے لکچر میں یہ نہیں کہا کہ ہم لوگ حنفی ہیں؟" مجھے یہ جملہ میں نے بیان کرنا مہم کیا ہے۔ میں نے تسلیم کیا کہ میں نے کہا تھا۔ اس طالب علم نے پھر پوچھا "جناب! آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

علماء سے متعلق اس طرح کی باتیں تعجب انگیز نہیں ہیں، کیونکہ ترک ایک مدت سے دینی تعلیم سے محروم رہے ہیں۔ ترکی کے موجودہ مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے ایک [illegible] لکھتا ہے کہ "[illegible] نے جنوری کے بجائے ماہ [illegible] کہنے لگے، ایک بار رمضان

میں بیدلی نامی گاؤں کے کچھ لوگ اپنے ہمسایہ گاؤں میں ایک اراضی کے معاملے میں فوجداری کرنے کے لیے گئے، لیکن پولیس کی بروقت مداخلت سے ان کو واپس لوٹنا پڑا، اتفاق سے اسی دن شدید بارش ہوئی، گاؤں میں چاروں طرف پانی ہی پانی ہوگیا۔ گاؤں کے مکھیا کو ارضی مصیبت کا سامنا بھی تھا، اب آسمانی مصیبت بھی آگئی، اس نے جھنجھلا کر ایک قہوہ خانے میں جاکر اپنا روزہ توڑ دیا، اس کی تقلید میں گاؤں کے دوسرے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا، ابھی حال ہی میں ایک سادہ لوح مدرس پر لوگوں نے اس لیے حملہ کر دیا کہ اس نے یہ کہا تھا کہ گاؤں کے لوگ تعلیم سے زیادہ مذہب کا خیال کرتے ہیں۔ بعض اخبارات آج بھی اس طرح کی خبریں شائع کرتے ہیں زیادہ دلچسپی لیتے ہیں، مثلاً ایک خبطی نے یہ اعلان کیا ہے کہ دندان سازی معصیت ہے، یا ایک موذن کو اس لیے چاقو مار دیا گیا کہ اس نے عربی کے بجائے ترکی زبان میں اذان دی تھی، ایک شخص نے اپنے بچہ کی موت کو علاج پر اس لیے ترجیح دی کہ وہ رمضان المبارک میں بیمار تھا۔

شفیق اتان نے (نائب برائے خنقیل)، ۲۲ اپریل ۱۹۶۳ء کے روزنامہ "ملیت" میں "۵۰۰ لاکھ ڈالر" کے عنوان سے ایک مضمون میں اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ترکیہ نے حج پر جو ڈالر صرف کیا وہ حاصل شدہ زرمبادلہ سے کہیں زیادہ تھا، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر اتنے لوگ حج نہ کرتے تو اس رقم سے پندرہ سو گاؤں میں سے جہاں کوئی مدرسہ نہیں ہے ۲۷۵۰ مدرسے تعمیر ہو سکتے تھے، مگر یہ حیرت انگیز ہے کہ ایسی رائے ظاہر کرنے کے بعد شفیق اتان کو اپنے منتخب حلقۂ انتخاب میں دوبارہ کامیابی حاصل ہوئی۔

ترکی میں اسلام کی حیثیت اس منتزہ کلیسا کی جیسی نہیں ہے جسے سرکاری تحفظ سے محروم کر دیا گیا ہو، آج بھی خطیبوں اور اماموں کا تقرر دینی امور کی مجلس اعلیٰ ہی کرتی

اور ان لوگوں کو قومی بجٹ سے تنخواہیں دی جاتی ہیں، لیکن یہ معاملہ صرف سنی مسلمانوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ گو قانون کی نظر میں تمام مذاہب برابر ہیں، لیکن جارج آرول کے قول کے مطابق "سنی اسلام دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ برابر ہے"۔ دستور میں ہر فرقہ کو تقریر اور عبادت کی پوری آزادی حاصل ہے، بلکہ اپنے مذہب کی تبلیغ کی بھی اجازت ہے، لیکن عملاً یہ آزادی صرف سنیوں ہی کے حق میں پائی جاتی ہے۔ عیسائی مذہب کی تبلیغ کے سلسلہ میں اکثر گرفتاری کی خبریں اخبارات میں دیکھی جاتی ہیں، اس طرح یہ بھی واضح رہے کہ کوئی غیر مسلم فرقہ مسلمانوں [illegible] کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ارباب حکومت اپنے کو لاکھوں وہ بے تا ئی مسلمانوں کے مذہبی احساسات اور جذبات کا محافظ سمجھتے ہیں، لیکن وہ بھی لاکھوں غیر سنی مسلمانوں کے صحیح مذہبی تحفظ میں ناکام رہے ہیں، حکومت کے خزانہ کی رقم کا کوئی حصہ بھی شیعی آبادی کی مذہبی ضروریات پر صرف نہیں ہوتا، حالانکہ ان کی تعداد ایک کروڑ ۲۰ لاکھ بتائی جاتی ہے، گو یہ تعداد انتہائی مبالغہ آمیز ہے، لیکن سرکاری اعداد و شمار کے نہ ہونے کی وجہ سے اس کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔

ترکی کی موجودہ تاریخ کو جدید ترکی کے بانی کے نظریات اور عوام کی خواہشات کے درمیان صلح کی جد و جہد کہا جا سکتا ہے، ڈیموکریٹک پارٹی نے جو کچھ کیا وہ سرگرم کمالیوں کی نظر میں ناقابلِ معافی جرم تھا، مثلاً مسجدوں کی تعمیر، ریڈیو پر قرأتِ قرآن، کثرت از دواج کی در پردہ اجازت، صوم و صلوٰۃ کا احترام وغیرہ، یہی نہیں بلکہ مغربی معاشرہ و تعیش کے سامانوں کی فراہمی کے ساتھ ہی ساتھ عوام کے اندر یہ احساس پیدا کر دیا گیا کہ اب یورپی تہذیب کی تقلید کیلئے کوئی جبر نہیں ہے، یہ وہ شکایت محسوس کرنے لگے کہ وہ اپنے ملک کا بانی و قائد فراموش ہو گیا ہے'

اور وہ مزید اصلاحات کا محتاج نہیں ہے۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک ڈیموکریٹک پارٹی کی انتخابی کامیابی اور اس کے بعد جسٹس پارٹی کی فتح کو ہم صرف عوام کے مذہبی احساسات و جذبات کی تسکین پر ہی محمول نہیں کر سکتے۔ اس کی ایک معقول وجہ تو یہ تھی کہ پہلے حکومت میں عوام بطور عام شہری کے ساتھ ہی عملاً مسلمان بھی رہ سکتے تھے، لیکن جسٹس پارٹی کی کامیابی کی وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نے ریپبلکن پارٹی پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ وہ کمیونسٹ نواز ہے، اور اس کا قیام کمیونزم کے لیے راہ ہموار کرے گا، ترکی میں کمیونسٹ لفظ "کافر" کا مترادف سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ چند ہی لوگوں کو کمیونزم کا صحیح مفہوم معلوم ہوگا، بیشتر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ تحریک مذہب کی دشمن ہے اور اس نے روس میں جنم لیا ہے، روس، ترکی کی مالی امداد اور دوستانہ گفت و شنید کے باوجود آج بھی روایتی طور پر ترکی کا دشمن ہے۔ اس دشمنی کی وجہ نظریۂ حیات کا اختلاف نہیں بلکہ وہ جغرافیائی حالات ہیں جو سیاسی طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔

بیشتر لوگوں نے جسٹس پارٹی کی حمایت اس لیے کی کہ اس کے قیام سے ملک و قوم کو وقار حاصل ہوگا، کچھ لوگوں نے صرف اس لیے بھی اس پارٹی کو ووٹ دیے کہ وہ ذاتی صنعتی اداروں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ریپبلکن پارٹی جو جسٹس پارٹی کی حریف تھی، اس کی شکست کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کے نزدیک ترقی کرنے کے لیے عوام کا مغربی تہذیب میں ضم ہونا ناگزیر تھا، اور مذہب توہم پرستی کا دوسرا نام تھا، عوام یہ سنتے سنتے عاجز آچکے تھے کہ ان کی آبائی قدریں ناقابل عمل اور فرسودہ ہو چکی ہیں اور وہ اپنے ملک میں خوف و ہراس، ذلت و حقارت کی زندگی

بسر کرنے کو تیار نہ تھے۔

اس لیے انھوں نے امن اسلام کے حق میں ووٹ دیے جو ان کے آبا و اجداد کی زندگی کا نصب العین تھا، جناح پارٹی کی کامیابی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ عوام کو یہ یقین تھا کہ یہ پارٹی ان کو وہ سب کچھ فراہم کر سکے گی جس کا ڈیموکریٹک پارٹی نے وعدہ کیا تھا۔ انھیں یہ بھی امید تھی کہ یہ پارٹی انفرادی امن و آزادی کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہوگی۔

(ڈاکٹر جیافری لیوس استاد ترکی آکسفورڈ یونیورسٹی)

اسلام کا سیاسی نظام

اس کتاب میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اٹھارہ ابواب میں جن میں نظریہ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی حقوق رعایا، بیت المال، احتساب، حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ قریب قریب اسلامی دستور کے سب اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، آخری باب سیاست کے غیر اسلامی نظریات سے متعلق ہے، جس میں موجودہ سیاسی نظریات، شخصیت، آمریت جمہوریت پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے۔

(مؤلفہ مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

ضخامت ۳۲۰ صفحے قیمت :- [illegible]

منیجر

ادبیات

غزل

از جناب حبیب احمد صدیقی، ممبر پبلک سروس کمیشن

یہ جو مبہم سا اک اشارہ ہے — سو سہاروں کا اک سہارا ہے
اب نہ پوچھو جو حال ہے اپنا — بارہا غیر کو پکارا ہے
با دو طوفاں سے لڑتی گذری عمر — ڈر پھر بھی بہت کنارا ہے
خوبیٔ وقت یہ بھی ہے ورنہ — ایسا جینا کسے گوارا ہے
ایک اپنوں کی کج ادائی کیا — اب تو سب کچھ ہمیں گوارا ہے
ان سے چھٹ کر ہوا ہمیں معلوم — زندگی کتنی بے سہارا ہے
کرتے ہیں یوں گلہ بہاروں کا — جیسے اپنا کوئی اجارا ہے
کیا کسی کا گلہ کریں کہ یہ دل — اپنی خوش فہمیوں کا مارا ہے
مدتوں بعد سمجھی ہے دنیا — بے سہاروں کا بھی سہارا ہے
ہے کسے مہلتِ سکون و قیام — تیز رو زندگی کا دھارا ہے

حال اچھا ہے ان سے کہہ تو دیا
چھپ نہ پایا جو آشکارا ہے

غزل

از جناب افقر موہانی

کہیں کیا پوچھنے والے کہ یہ غم کہہ نہیں سکتے
مزاجِ یار ہم سے کیوں ہے برہم کہہ نہیں سکتے

ہر اک جلوہ میں اک پردہ، ہر اک پردہ میں اک جلوہ
جمالِ یار کے جلووں کا عالم کہہ نہیں سکتے

تری چارہ گری خود بیکسی ہے مردِ ناصح
یہ باتیں زہر ہیں ہم ان کو مرہم کہہ نہیں سکتے

کبھی اہلِ جنوں کا راز افشا ہو نہیں سکتا
خرد والے ہمارا قصۂ غم کہہ نہیں سکتے

سیہ بختی پر اپنی ہم کو کیا کیا ناز تھا لیکن
کسی کے گیسوئے پُر خم کا عالم کہہ نہیں سکتے

کہاں جلووں کی تابانی، کہاں اشکوں کی بارانی
تجھے اے چشمِ حیراں چشمِ پُرنم کہہ نہیں سکتے

ستم کیا اُمنڈتے آ رہے ہیں خود بخود آنسو
نوازش ہائے غم کو جو بہ ہیم کہہ نہیں سکتے

محبت کرنے والوں کی کوئی مجبوریاں دیکھے
ہم اپنی زیست کے ماتم کو ماتم کہہ نہیں سکتے

مدد کر یہ مدد کا وقت ہے اے دامنِ جاناں
دمِ آخر جو عالم ہے وہ عالم کہہ نہیں سکتے

عجب ہے داستانِ حسنِ جاناں بھی کہ اے افقر
زبانِ خلق کہتی ہے مگر ہم کہہ نہیں سکتے

غزل

از جناب محمد حنیف صاحب تمنا اعظمی

آندھیاں آتی رہیں اُٹھ کر اڑانے کیلئے
چند تنکے جو چنے تھے آشیانے کے لیے

کوششِ ضبطِ تبسم میں ہے لب لرزش میں
مضطرب ہوں جیسے کلیاں مسکرانے کیلیے

کچھ ہے اندازِ تغافل کچھ نگاہِ التفات — دیدۂ مشتاق کو حیراں بنانے کے لیے

اب تمناؤں سے خالی ہے دلِ حسرت نصیب — ایک انکی یاد ہے اسکو بسانے کے لیے

دل سے آہیں اٹھ کے آتی ہیں مژہ تک نکلے اشک — یہ ابھرتے ہیں ستارے ڈوب جانے کے لیے

عشق کی خودداریوں کی اب منزل ہو چکی — حسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے

بے زباں قاصر پیامِ دل سنانے سے تو ہو — خود نگاہِ شوق کیا کم ہے سنانے کے لیے

شہر کی رنگینیاں آئیں نہ میرے دل کو راس — وحشتِ دل لے چل صحرا بسانے کے لیے

اب خلوص اس دور میں ہے لفظِ بے معنی سنیت
میری ہستی درسِ عبرت ہے زمانے کے لیے

غزل

از جناب سید خورشید افسر بسوانی

کبھی پسِ مہر و ماہ دیکھا کبھی سرِ رہگذر ملی ہے — کہیں تو آکر ترے ہی تجلی تیرے سے بیخبر ملی ہے

شکارِ درد و الم ہوں میں بھی مگر نہ اپنی بتا زمانے — مجھے بھی دیکھا ہے تو نے ہنستے کبھی مری آنکھ تر ملی ہے

ہمارے حالات کی طرح سے ہوا ہے دن رات کا سفر بھی — نہ شام ہی کا پتہ چلا ہے نہ صبح ہی کی خبر ملی ہے

زمیں کرتی ایک خوف خالی ہے نیز اس میں ثمر اٹھا لیا — حیات کیسی ہی بے وفا ہو مگر بڑی کارگر ملی ہے

بہار اب کے چمن میں آئی تو کس قدر اہتمام دیکھا — مگر یہی فصلِ لالہ و گل کبھی کبھی در بدر ملی ہے

متاعِ غم ہے عطائے جاناں متاعِ غم ہو نصیب کس کو — وہ ہے بڑا خوش نصیب جس کو یہ دولتِ معتبر ملی ہے

حیات ہی کی حیات ہوتی حیات کو بھی سنوار دیتا — تمام رعنائیاں [illegible] ملی ہے

ابھی [illegible] غم ابھرا تو کہہ اٹھے لوگ [illegible]
زمین جو روئی تو لوگ سمجھے کہ فصلِ گل کی خبر ملی ہے

غزل

از جناب عظیم حیدرآبادی بی اے بی ایڈ عثمانیہ

اپنی نواؤں میں اب لاؤں کہاں سے اثر — چھین لیا عقل نے میرا کمالِ ہنر

ان کی نوازش ہے یہ یا تب و تابِ نظر — تیز ہوا ہے مرا سوزِ درونِ جگر

آئے تصور میں وہ آج بہ طرزِ دگر — سینہ میں رقصاں ہے جو طورِ کے برق و شرر

جب سے ہوا ہے مرا جوشِ جنوں تیز تر — حسن سے بھی ماورا ہو گیا ذوقِ نظر

اٹھ نہیں سکتے قدم ہٹ نہیں سکتی نظر — اب ہے ٹھکانہ مرا، ان کی حسیں رہگذر

دہر میں جینے کا حق اس کو یقیناً نہیں — منزلِ مقصود سے اپنی جو ہے بے خبر

سینۂ صد چاک کو حاجتِ سوزن نہیں — اس میں ہیں بکھرے ہوئے عشق کے لعل و گہر

بربطِ ناہید کی کوئی ضرورت نہیں — تیری نواؤں میں ہے لذتِ سوزِ جگر

دور میں ہوتا ہے جب ان کی نگاہوں کا جام — پھر نہیں رہتی مجھے شام و سحر کی خبر

جب کہ تصادم ہوا عقل و جنوں میں عظیم

خود بخود اٹھنے لگا پردۂ شام و سحر

کلیاتِ شبلی اردو

مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبحِ امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ترکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی پچھلی سالہ جدوجہد کی ایک مکمل تاریخ ہیں۔ ۱۲۴ صفحے - قیمت ۲ روپے ۲۸ پیسے

منیجر

مطبوعات جدیدہ

حج کا سفر۔ از مولانا محمد رضا انصاری فرنگی محلی، تقطیع اوسط ضخامت ۲۴۳ صفحات مجلد پتہ: فرنگی محل کتاب گھر نمبر ۹، فرنگی محل لکھنؤ۔ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے۔

اردو میں حج کے اتنے سفرنامے لکھے جا چکے ہیں اور ان میں حج اور سفرِ حج سے متعلق اتنے معلومات ہیں کہ اب کسی نئے سفرنامے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی تھی، لیکن مذکورۂ بالا سفرنامہ دیکھنے کے بعد اندازہ ہوا کہ اگر لکھنے والا ہو تو اس پرانی روش میں بھی نئے نئے گل بوٹے کھلا سکتا ہے، لائق مصنف کو اللہ تعالیٰ نے علم و قلم کی دولت کے ساتھ چشم بینا اور دل بیدار بھی عطا کیا ہے، وہ عالم بھی ہیں، ادیب بھی اور صاحب دل بھی، اس لیے یہ سفرنامہ، روداد سفرِ حج سے متعلق مفید معلومات و تجربات، مناسک حج کے مسائل، حرمین کے آثار و مشاہد کی تاریخ، قلبی واردات و تاثرات کا جامع و دلکش مجموعہ ہے، تحریر کی دلآویزی، پرکیف اشعار کے برمحل استعمال، اس سے بڑھ کر مصنف کے حسن عقیدت و ادب شناسی، خصوصاً خانہ کعبہ کی حاضری اور بارگاہ نبوی کی حضوری کے کوائف نے ایسی کیفیت اور تاثیر پیدا کر دی ہے کہ پڑھنے والا اس کے لطف و لذت میں گم ہو جاتا ہے، ایسی تحریروں میں عموماً آورد زیادہ ہوتی ہے لیکن مصنف کی تحریر بالکل بے ساختہ اور سراسر آمد ہے، جو ان کے سچے جذبات کا نتیجہ ہے، ان خوبیوں کے ساتھ اس شراب طہور میں ایک دو مقاموں پر سیاست کی کدورت کی آمیزش ذوق سلیم پر گراں گذرتی ہے،

مجموعہ وصایا اربعہ ۔ مرتبہ جناب محمد ایوب صاحب قادری، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، ضخامت ۲۰۰ صفحات، قیمت تین روپے ۵۰ پیسے، پتہ: شاہ ولی اللہ اکیڈمی، صدر حیدرآباد پاکستان

اس مجموعہ میں شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے سلسلۂ تعلق کے تین بزرگوں کے رسالے شامل ہیں، پہلا رسالہ خود شاہ صاحب کا مشہور وصیت نامہ "المقالۃ الوضیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ" ہے، اس میں انھوں نے اپنی اولاد اور عزیزوں کو آٹھ نصیحتیں کی ہیں، دوسرا رسالہ تصنیف "رنگین" ان کے ایک نادر و نایاب فارسی رسالہ کا منظوم اردو ترجمہ ہے، جس کو ان کے عقیدت کیش اور مشہور شاعر سعادت یار خاں رنگین نے نظم کیا ہے، تیسرے میں شاہ صاحب کے مشہور شاگرد اور نامور عالم قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی اپنی اولاد اور دوستوں کو نصیحتیں ہیں، اور چوتھے میں ان کے چھوٹے بھائی شاہ اہل اللہ کی کتاب چہار باب کی ۴۲ نصیحتیں شامل ہیں، آخری رسالہ کے علاوہ سب مطبوعہ اور متداول ہیں، لائق مرتب نے ان کے متن مختلف قلمی اور مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد حواشی اور اردو ترجمے کے ساتھ شائع کیا ہے، شاہ صاحب کے وصیت نامہ کے بعض مبہم اور دقیق امور کی قاضی ثناء اللہ نے توضیحی تعلیق لکھی ہے، اس کا متن بھی مع ترجمہ درج ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں شاہ صاحب کے دور کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی حالات کی ابتری کا ذکر کرکے ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی اہمیت، تصانیف کی مکمل فہرست اور ان کی طرف منسوب بعض کتابوں کے الحاقی ہونے پر محققانہ بحث کی گئی ہے، ان سب رسالوں میں کتاب و سنت کے اتباع، اسلامی و دینی زندگی کو اختیار اور مشرکانہ اعمال و رسوم اور بدعتوں سے پرہیز کرنے کی تلقین، اور دوسرے بیش قیمت مواعظ اور نصائح کا ذکر ہے، اس لیے ان کا مطالعہ ہر مسلمان کے لیے مفید اور ہم خرما و ہم ثواب ہے۔

مولانا محمد احسن نانوتوی ۔ مترجمہ جناب محمد ایوب صاحب قادری، تقطیع خورد،

کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت للعہ۔ پتہ: دو تیل کنندہ شیریں سوسائٹی

بی ۱۰ دس، ایریا ۵، لیاقت آباد، کراچی نمبر ۱۹۔ ہندوستان میں: مکتبہ تجلی دیوبند۔ (یو۔پی)

مولانا محمد احسن نانوتوی ایک جید و فاضل عالم اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے ہمعصر اور عزیز تھے، ان کی عمر کا بیشتر حصہ مختلف کالجوں کی ملازمت میں بسر ہوا، تصنیف و ترجمہ کا بھی اچھا ذوق تھا، اور متعدد کتابوں کی تالیف و ترجمہ کے علاوہ بریلی میں ایک مطبع صدیقی بھی قائم کیا جس نے نہایت مفید علمی و دینی خدمات کے علاوہ شاہ ولی اللہ صاحب کی متعدد اہم کتابوں کے متن اور ترجمے پہلی بار شائع کیے، فاضل مرتب نے اس کتاب میں نہایت تلاش و تفحص کے بعد مولانا کے ان تعلیمی و تصنیفی خدمات اور خاندانی حالات کا مفصل مرقع اور ان کی تصنیفات و تراجم کے علاوہ مطبع صدیقی سے شائع ہونے والی تمام کتابوں کا تعارف کرایا ہے، آخر میں نانوتہ کے اسی خانوادہ کے تین اہم بزرگوں مولانا مملوک العلی، مولانا محمد یعقوب اور مولانا محمد قاسم اور مولانا احسن کے ربیب مولوی عبد الاحد مالک مطبع مجتبائی کے حالات کسی قدر تفصیل سے اور حواشی میں ان کے دوسرے اعزہ و متوسلین، اساتذہ اور احباب جن کے نام کتاب میں آئے ہیں مختصر تذکرے تحریر کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب انیسویں صدی کے متعدد مشہور و غیر مشہور اشخاص کے حالات کا مرقع اور نہایت پر از معلومات ہے۔

چین کا بدلتا سماج۔ از چو چانگ من برگ جانگ، مترجمین محمد سلیم خان ایم اے، گوپال متل

محمد سلیمان صابر صاحبان۔ تقطیع خورد، کتابت و کاغذ، طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، قیمت صر

پتہ: نیشنل اکاڈمی ۲۰۱۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

نیشنل اکاڈمی دہلی نے چین پر کتابوں کی اشاعت کا جو مفید سلسلہ شروع کیا ہے، زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اور ۲۰ ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے دو ابواب میں چین کا جغرافی پس منظر

عوام، بنیادی تصورات، حکومت، قانون، معاشرت، خاندان، ثقافت، زبان، ادب اور آرٹ وغیرہ کے متعلق معلومات ہیں، اس کے بعد چار ابواب میں اصلاح و انقلاب، قبائلی حکومت کے خاتمہ، مانچو خاندان کی شکست، قوم پرست پارٹی اور سن یات سین کے عروج، پھر ماؤزے تنگ اور کمیونسٹوں کے تسلط کے حالات ہیں، آخر میں دکھایا گیا ہے کہ گذشتہ چار پانچ ہزار سالوں سے کوئی تبدیلی نہ قبول کرنے والا چین اب اپنی قابل احترام روایات سے بھی دستبردار ہو رہا ہے، یہ کتاب جغرافی، نسلی، سیاسی، تہذیبی، مذہبی اور ادبی پہلو سے گذشتہ اور موجودہ چین کی ایسی مفصل اور جامع تاریخ ہے جس میں مستقبل کی پرچھائیاں بھی نظر آ رہی ہیں، نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہے، اور ترجمہ بھی سلیس اور شگفتہ ہے۔

اردو ادب میں تنقید کی اہمیت۔ از جناب قیوم صادق احمد پوری، متوسط تقطیع کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۹۲، قیمت عہ پتہ مرہٹواڑہ ادبی سرکل، احمد پور، ضلع عثمان آباد، مہاراشٹر۔

قیوم صادق احمد پوری ایک ہونہار نوجوان ادیب ہیں، یہ مجموعہ ان کے سات ادبی و تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے جن میں بعض قابل توجہ بھی ہیں، لیکن ان پر اتنا کہا جا چکا ہے کہ مصنف کے خیالات میں کوئی جدت و تازگی نہیں پائی جاتی جس کا انکو خود اعتراف ہے کہ اس کتاب میں ان کے غور و فکر کے نتائج کم اور دوسرے ناقدین و مبصرین کے افکار و خیالات زیادہ ہیں، اس لیے ناہمواری پیدا ہو گئی ہے، اگر وہ ناقدین کے ناموں کی تصریح اور کتابوں کے حوالے بھی دے دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا، ابھی ان کے خیالات میں فکر کی گہرائی اور دقت نظر کی کمی ہے، لیکن ان میں اعتدال و توازن ہے جس سے موصوف کی ادبی و تنقیدی دلچسپی اور صلاحیت کا پتہ چلتا ہے۔

عظمت نما۔ از جناب عبد العزیز صاحب خالد، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ

صفحات ۲۲۳ مجلد قیمت ۲۰ روپیہ، پتہ بک لینڈ ۲۔ محمد بلاک سندھ روڈ کراچی ۵

عبدالعزیز خالد صاحب ایک خوش فکر اور پرگو شاعر ہیں، اس مجموعہ میں ان کی ایک طویل اور مسلسل مخفیہ نظم جو پانچ حصوں میں منقسم ہے، شامل ہے، ان کا انداز بیان عام شعراء سے مختلف بلکہ بڑی حد تک نرالا ہے، فکر و خیال کی جودت، الفاظ و زبان کی ندرت، تشبیہات و استعارات کی جدت اور تلمیحات کی کثرت کے لحاظ سے یہ مجموعہ شاعر کی قادر الکلامی کا نمونہ ہے، لیکن عام فہم نہیں ہے، الفاظ، تشبیہات اور تلمیحات اتنی غریب، نامانوس اور نادر ہیں کہ خواص کے لیے بھی لغت کی مدد کے بغیر ان کا سمجھنا مشکل ہے، خود مجموعہ کا نام ایک چیستان ہے، لیکن انداز بیان مؤثر اور پرسوز ہے، جس سے کلام میں جذب و کشش پیدا ہو گئی ہے،

قادیانیت - از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۲۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت للعہ، مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

قادیانیت کے رد میں اردو میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن اب اس کے اثرات عرب ممالک میں بھی پھیل رہے ہیں، اس لیے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے چند سال پہلے اپنے مرشد مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ایماء سے اس موضوع پر عربی میں ایک کتاب لکھی تھی، اور اسی زمانہ میں افادۂ عام کے خیال سے اس کا اردو ترجمہ بھی مزید اضافہ و ترمیم کے بعد شائع کیا تھا، اب اردو کتاب کا دوسرا اڈیشن مزید اہتمام سے شائع ہوا ہے۔

قرآن کا مطالعہ کیسے - از جناب مولانا محمد اویس صاحب نگرامی ندوی، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے، پتہ مکتبہ طیبہ سی ۱۲۳ ڈی ڈی امامیہ لکھنؤ۔

مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی شیخ التفسیر دارالعلوم ندوہ قرآن مجید سے متعلق علوم کے ممتاز عالم ہیں، یہ مفید رسالہ انھوں نے صبح صادق روزنامہ کے قرآن نمبر کے لیے لکھا تھا، اب بعض احباب کے اصرار سے اسکو اضافہ و ترمیم کے بعد رسالہ کی صورت میں شائع کیا ہے، اس میں مطالعۂ قرآن کے اہم اصول اختصار سے تحریر کئے گئے ہیں، رسالہ مختصر ہے مگر جامع، پرمغز اور مفید، مولانا عبدالماجد دریابادی کے قول کے مطابق طلبۂ قرآن کے لیے ایک ہدایت نامہ ہے۔

جلد ۱۰۰ ماہ ربیع الاول ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۶۷ء عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کی شکست کتنا ہی دردناک واقعہ ہو مگر تعجب انگیز ہرگز نہیں بلکہ عین سنت الٰہی کے مطابق اور خود عربوں کے اعمال کا نتیجہ ہے، اللہ تعالیٰ نے دشمن کے مقابلہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے جو شرائط مقرر کیے ہیں وہ صرف دینی بلکہ خالص دنیاوی اور مادی حیثیت سے بھی ضروری ہیں، ان میں سب سے مقدم قوت ایمانی ہے، وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ خدا کی نصرت کے وہی مسلمان مستحق ہیں جو اسکے دین کی مدد کرتے ہیں إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَكُمْ۔ اتحاد باہمی وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔ آپس کی پھوٹ مہلک ہے وَلَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ۔ مادی سروسامان وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ حالتِ جنگ میں احتیاط اور بچاؤ کی تدبیر يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا خُذُوا حِذْرَكُمْ۔ [illegible] متحدہ مقابلہ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ۔ ثابت قدمی اور خدا کی یاد إِذَا لَقِيتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوا وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

ان احکام کے مقابلہ میں عربوں کا عمل یہ ہے کہ قریب قریب پوری عرب دنیا مغربی تہذیب میں غرق ہے، مصر جمہوریہ میں جس کے ہاتھ میں عربوں کی قیادت کی باگ ہے اسلام ایک قصۂ پارینہ بن گیا ہے اور اس کی حیثیت ایک سیاسی آلہ کار سے زیادہ نہیں ہے، ان کا اصل مذہب عربی قومیت، کمیونزم اور مغربی تہذیب ہے، عرب ملکوں میں باہم اور اقتدار کی جنگ برپا ہے، اور ان کی توپیں دشمن کے مقابلہ کے بجائے ایک دوسرے کے خلاف صرف ہو رہی ہیں، [illegible] برسوں سے یمن میں [illegible] عرب [illegible] کی سازش مستقل جاری ہے [illegible] یہودیوں کا یہ حال ہے کہ اسرائیل [illegible] اتنی قوت کے باوجود [illegible] جمہوریہ [illegible] اس کی قوت اور [illegible] کا اندازہ [illegible] اسرائیل کے مقابلہ میں شکست کی ایک بڑی وجہ یہی [illegible]

وہ اتنے ضعیف و کمزور ہو چکے تھے کہ مستقل کوئی جنگ نہ لڑ سکی،

میرے خیال میں حکومت ترکی کے سیاسی اسباب سے بحث نہیں، وہ حق پر ہوں یا ناحق، لیکن اس واقعہ سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی ترقی میں انتہائی [illegible] کی خانماں خرابی کے باوجود اپنے مذہب یہودیوں نے اپنی مذہبی روایات کو سینے سے لگائے رکھا، چار ہزار برس دور میں واپسی کا جذبہ ان کے دل میں برابر قائم پایا اور جیسے ہی ان کو موقع ملا اپنے مقصد پورا کرنے کے لیے سرسبز و شاداب وطنوں اور عیش و آرام کو چھوڑ کر جوق در جوق فلسطین کے صحرا اور عرب حکومتوں کے نرغے میں آکر آباد ہوگئے، اور اپنی دولت اپنے علم و فن اور دل و دماغ کی ساری قوتیں اپنے استحکام پر صرف کر دیں اور پوری یہودی دنیا ان کی حمایت و امداد کے لیے کمربستہ ہوگئی، جبکہ عربوں کی زبان پر عرب قومیت کی "جے" تھی، یہودیوں نے دین کو دوبارہ زندہ کیا اور توراۃ کی تلاوت اور بارگاہ الٰہی میں رو رو کر دعائیں کیں، ایسی حالت میں اگر ان کو عربوں پر فتح حاصل ہوئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے،

سنت اللہ ہر قوم و ملت کے لیے یکساں ہے، خاتم المرسلین ﷺ کا فرمان ہے: وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللَّهِ تَبْدِيلًا قوموں کے عروج و زوال کے کچھ فطری قوانین مقرر ہیں جو قوم بھی ان پر عمل کرے گی وہ کامیاب اور سربلند ہوگی، اور جو ان سے اعراض کرے گی وہ ناکام اور ذلیل ہوگی۔ "مسلم ہونا کافی نہیں مقصود" مسلمان خدا کے ایسے چہیتے نہیں ہیں کہ وہ ان کے احکام سے سرتابی اور دنیاوی تدبیروں سے غفلت کے باوجود ان کی نصرت کے مستحق ہوں، کلام مجید میں صاف الفاظ میں تنبیہ ہے: وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ "اگر تم احکام الٰہی سے روگردانی کرو گے تو اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو دے دیگا" جب مسلمان نصرت الٰہی کے مستحق تھے [illegible] جہاں [illegible] اس کی حیثیت [illegible] نہیں [illegible] یہودیوں کی [illegible]

[illegible]

میں عرب حکومتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا، ان کی مخالفت اس کا مستقل شیوہ رہا، وہ محض بھڑکیلے نعرے لگاتی رہی، اس نے وہی کردار دکھایا جو حیدرآباد میں قاسم رضوی نے دکھایا تھا، وقت آنے پر ان نعروں کی حقیقت ظاہر ہو گئی، اسرائیل نے ایک حملہ میں سارا ہوائی قلعہ مسمار کر دیا، اس کے مقابلہ میں مصر کی فوجیں اتنا بھی نہ ٹک سکیں کہ دوسرے عرب ملکوں کی فوجیں مدد کے لیے پہنچ سکتیں، سب سے زیادہ بہادری تو اردن نے دکھائی جو متحدہ عرب جمہوریہ کی نگاہ میں سب سے زیادہ معتوب تھا، اس شکست کی ذمہ داری کسی دوسرے پر ڈالنا صحیح نہیں ہے، جب اپنے میں دم ہو تو دوسرے کی مدد بھی کام آتی ہے، تنہا کسی کے سہارے جنگ نہیں لڑی جاتی، عرب جمہوریہ کو جن دوستوں پر بھروسہ تھا ان کی حقیقت بھی ظاہر ہو گئی اور ناصر کی کمیونزم نوازی کچھ بھی کام نہ آئی، انھوں نے اپنی انانیت اور خود سری میں نہ صرف عربوں بلکہ پوری دنیائے اسلام کو رسوا کیا، مگر اب ان کو بھی سبق مل گیا ہوگا، یقین ہے کہ اس تجربہ کے بعد ان کی آنکھیں کھل جائیں گی،

بہر حال جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا، اس شکست کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ سمجھ کر عربوں کو سبق لینا چاہیے، اگر اب بھی وہ خدا کی طرف رجوع کریں اور آپس میں اتحاد و اتفاق سے کام لیں تو اس کی تلافی ہو سکتی ہے، عرب حکومتوں کے مقابلہ میں اسرائیل کی کوئی بساط نہیں ہے، امریکہ اور برطانیہ اس کو کب تک بچائیں گے، اگر عرب اس کا متحدہ مقابلہ کریں تو اس کو پیس کر رکھ دیں، جب تک اپنے میں قوت نہ ہو کسی دوسرے سے انصاف کی توقع رکھنا بیکار ہے، اقوام متحدہ تو اینگلو امریکن بلاک کا محض آلۂ کار ہے [illegible] عرب اسی وقت سرفراز ہو سکتے ہیں جب متحد ہوں گے [illegible] میں قوت ہوگی، مگر وہ اس کے لئے آمادہ ہو جائیں تو دوسرے ملکوں کی ہمدردی [illegible] کی بنیاد پڑ جائے گی، مسئلہ فلسطین کا مسئلہ تنہا عربوں کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا ہے، اور اپنے قبلۂ اول کا [illegible] ساری دنیا کے تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔

مقالات

حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبالؒ

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب

یہ مضمون اخبار چٹان لاہور کے اقبال نمبر میں شائع ہوا تھا اور ہندوستان میں بہت کم لوگوں کی نظر سے گذرا تھا اس لیے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے عقیدتمندوں کی جن میں ناظرین معارف بھی ہیں، خواہش تھی کہ اس کو معارف میں بھی شائع کیا جائے۔ یہ مضمون بہت سے علمی و دینی فوائد پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی اشاعت مفید معلوم ہوئی۔ م

مجھ کو دار المصنفین کے احاطہ میں اسی مکان میں رہنے کا فخر حاصل ہے جس میں استاذی المحترم حضرت سید سلیمان ندوی اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہا کرتے تھے، اس لیے وہ میری نگاہوں میں ہر لمحہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور ہنستے بولتے نظر آتے ہیں، اس مکان سے جب دار المصنفین کے کتب خانہ میں آتا ہوں تو ان کی وہ میز رکھی ہوئی نظر آتی ہے جس پر وہ بیٹھ کر تصنیف و تالیف میں مشغول رہتے تھے، اس میز کے سامنے کھڑا ہوتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ معلوم نہیں اس میز پر سے اسلامی علوم و فنون کے کتنے سرچشمے جاری ہوتے رہے، اور پھر یکایک ڈاکٹر اقبالؒ نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں جنھوں نے حضرت سید صاحب کو علوم اسلامی کی جوئے شیر کا فرہاد کہا تھا، ان کی اکثر و بیشتر

حضرت سید صاحب اور ڈاکٹر اقبال دونوں ایک ساتھ نظروں کے سامنے آجاتے ہیں، دونوں اپنے اپنے فن کے لحاظ سے یگانۂ روزگار تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے میں لذت محسوس کرتے رہے، جو دونوں کی پاک طینت اور بلند سرشت کی دلیل ہے، اسی کی جھلکیاں اس مضمون میں نظر آئیں گی، اس میں بہت سے اقتباسات ہیں لیکن ان کو نقل کرتے وقت مجھ کو بڑی لذت محسوس ہوئی، امید ہے کہ یہی لذت ناظرین کو بھی ہوگی۔

ڈاکٹر اقبال کو حضرت سید صاحبؒ سے شروع ہی سے قلبی لگاؤ ہوا، اس لیے ۱۹۱۶ء میں اورینٹل کالج لاہور میں فارسی کی ایک اسامی کی جگہ خالی ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا کہ اگر وہ اس جگہ کو پسند فرمائیں تو قبول کرلیں، کیونکہ ان کا لاہور میں رہنا پنجاب والوں کے لیے مفید ہوگا، لیکن حضرت سید صاحبؒ نے دارالمصنفین سے علیحدہ ہونا پسند نہیں فرمایا، اور جب انھوں نے ڈاکٹر صاحب کو یہ لکھ بھیجا تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو دعائیں دیں کہ اللہ تعالیٰ دارالمصنفین کے کام میں برکت دے، اور ان کا وجود مسلمانوں کے لیے مفید ثابت کرے (۱۰ر نومبر ۱۹۱۶ء) پھر ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ جو کام وہ کررہے ہیں، جہاد فی سبیل اللہ ہے، انشاء اللہ اللہ اور اس کے رسول ان کو اس کا اجر عطا فرمائیں گے (۱۳ر نومبر ۱۹۱۶ء)

۱۹۱۵ء میں ڈاکٹر صاحب کی مشہور کتاب اسرارِ خودی شائع ہوئی تو انھوں نے حضرت سید صاحب کو اس کا ایک نسخہ بھیجا، جس کو پڑھ کر حضرت سید صاحبؒ بہت متاثر ہوئے [illegible] تاثرات کا اظہار اپریل ۱۹۱۶ء کے معارف میں ایک طویل ریویو لکھ کر کیا، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا کہ مولوی روم کی مثنوی [illegible] سات سو برس [illegible] اہل معنی میں اس کی بے انتہا مقبولیت ہوئی [illegible] روم کا ایک دوسرا نسخہ [illegible]

اس حقیقت کو بھی پہچان لیا، انھوں نے اس مقصد کو پیش نظر رکھ کر دو مثنویاں لکھیں اسرار خودی اور رموز بیخودی، ان دونوں مثنویوں کا موازنہ کرتے ہوئے حضرت سید صاحب نے لکھا کہ رموز بیخودی کا میرے خیال میں زبان کے لحاظ سے اسرار خودی سے بہتر ہے، اور اصل معنی کے لحاظ سے دونوں میں یہ فرق ہے کہ اس میں مظاہر سیاست بیشتر اور اس میں مذہب کے عناصر زیادہ ہیں، لیکن منزل مقصود ایک ہے، اسی سلسلہ میں سید صاحب رقمطراز ہیں کہ اس وقت مسلمانوں میں دوبارہ زندگی پیدا کرنے کی جو تدبیریں اختیار کی جارہی ہیں، ان میں حکمائے ملت مسلمانوں کے مزاج قومی کی تشخیص نہیں کرتے، مسلمانوں کے قومی مزاج کو جن لوگوں نے پہچانا ہے، وہ صرف تین شخص ہیں، مولانا شبلی نے آخری تین سال کے کلام میں، مولانا ابوالکلام نے مجلدات الہلال میں اور ڈاکٹر اقبال نے اپنی دو مثنویوں میں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ یہ راستے اوروں پر بھی مکشوف ہو رہے ہیں" حضرت سید صاحب رموز بیخودی کی جابجا تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس مثنوی کے اکثر ابواب میں مذہبی حقائق فلسفیانہ تشریح کے ساتھ صوفیانہ رنگ میں شعر بنتے چلے گئے ہیں، علاوہ ازیں ڈاکٹر اقبال نے اس میں جو اسرار و نکات حل کیے ہیں، ان کی بنیاد پر یہ مثنوی نہ صرف شاعری اور فن توحیات کا ایک رسالہ ہے بلکہ ہمارے خیال میں جدید کلام کی ایک بہترین کتاب ہے، اس کے اندر توحید کا ثبوت، رسالت کی ضرورت، قرآن پر ایمان رکھنے کا سبب، قبلہ کی حاجت وغیرہ اعتقادی مسائل پر نہایت پُر اثر دلنشین حقیقی دلائل موجود ہیں۔

حضرت سید صاحب نے اس مثنوی کی زبان پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، دیباچہ کے آغاز میں انھوں نے لکھا کہ ابتدا سے ڈاکٹر اقبال کی زبان اشکال پسند اور ترکیب آفرین واقع ہوئی ہے، کبھی کبھی سہل پسندی کے قدرت کے لیے انھوں نے نہایت رواں اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں، لیکن پھر ڈاکٹر اقبال کے اشعار رہے، بلکہ ان کی حیثیت ایک عام اردو شاعر

کے خیالات موزوں کی رنگینی۔" آگے چل کر سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ "زبان کے لحاظ سے میں ڈاکٹر اقبال کو ان شعرا میں گنتا ہوں جو معنوی محاسن اور باطنی خوبیوں کے مقابلے میں الفاظ اور محاوروں کی ظاہری صحت کی پروا نہیں کرتے، لیکن حق یہ ہے کہ اس کی ایک لغزش مستانہ پر ہزاروں سنجیدہ اور متین رفتاریں قربان ہیں، مصرعوں کے دروبست اور فصل و وصل میں قصور ممکن ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ جو مصرعہ ڈاکٹر اقبال کی زبان سے نکل جائے وہ تیر ونشتر بن کر سننے والوں کے دل وجگر میں نہ اتر جائے شاید اس کا سبب یہی ہے کہ ڈاکٹر اقبال اپنے مخاطب کے احساسات پر مذہب، فلسفہ، تصوف اور شاعری ہر راہ سے حملہ کرتے ہیں، اس لیے اختلاف مذاق کے باوجود ان مختلف راہوں میں سے کسی ایک سے بھی بچ کر نکل نہیں سکتا۔" آخر میں حضرت سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں "ایک بالغ نظر اس مثنوی میں الفاظ کی صحت یا صحیح فارسی معنی میں ان کے استعمال میں شک اور بعض فارسی محاوروں کی گرفت کر سکتا ہے لیکن اصل یہ ہے کہ اقبال کے شاعرانہ خیالات میں اتنی تیز روانی ہے کہ خس و خاشاک اس کی خوبی و لطافت میں مزاحم نہیں ہو سکتے، اس لیے اس تقریظ میں ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی، نکتہ چینی اور حرف گیری بہت ہو چکی، اب کچھ سوچنا اور سمجھنا بھی چاہیے، اور یہی اس مثنوی کا اہم المطالب ہے۔"

معارف کا یہ ریویو ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذرا تو اپنی فراخدلی، سیر چشمی اور بلند نظری کی بنا پر حضرت سید صاحبؒ کو لکھا کہ "آپ کا ریویو نظر سے گذرا ہے جس کے لیے سراپا سپاس ہوں، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ میرے لیے سرمایۂ افتخار ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔" اور پھر حضرت سید صاحبؒ نے ان کی زبان کے متعلق جو کچھ اشارہ کیا تھا اس سے اختلاف یا کبیدگی کا اظہار کرنے کے بجائے یہ تحریر کیا کہ "صحت الفاظ و محاورات کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے ضرور صحیح ہوگا، لیکن اگر آپ ان لغزشوں کی طرف بھی توجہ فرماتے تو میرے لیے آپ کا ریویو زیادہ مفید ہوتا،

اگر آپ نے غلط الفاظ و محاورات نوٹ کر رکھے ہیں تو مہربانی کر کے مجھے ان سے آگاہ کیجیے تاکہ دوسرے ایڈیشن میں ان کی اصلاح ہو جائے۔ غالباً آپ نے رموزِ بیخودی کے صفحات پر ہی نوٹ لکھے ہوں گے، اگر ایسا ہو تو وہ کاپی ارسال فرما دیجیے، میں دوسری کاپی اس کے عوض بھجوا دوں گا۔ اس تکلیف کو میں احسان تصور کروں گا۔" (مورخہ ۱۰/ مئی ۱۹۱۸ء)

ان سطروں میں کتنی خاکساری اور فروتنی تھی، حضرت سید صاحبؒ کئی مہینے تک ڈاکٹر اقبال کے تسامحات کی نشاندہی کرنے سے گریز کرتے رہے لیکن ڈاکٹر اقبال کا اصرار بڑھا تو انھوں نے ان فروگذاشتوں کی طرف توجہ دلائی۔ افسوس ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کے وہ مکاتیب سامنے نہیں ہیں جو انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو لکھے، لیکن اقبال نامہ میں ڈاکٹر صاحبؒ کے جو خطوط ہیں ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحبؒ نے جن تسامحات کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں سے اکثر و بیشتر سے ڈاکٹر اقبال کو اتفاق نہ تھا، اور انھوں نے بہت سے اساتذہ کی سند پیش کر کے سید صاحب کو مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے، اور غالباً سید صاحبؒ بھی مطمئن ہو گئے تھے لیکن ڈاکٹر اقبال اپنی عالی ظرفی سے ان کو برابر لکھتے رہے کہ "میری خامیوں سے ضرور ضرور آگاہ کیا کیجیے، آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن مجھے فائدہ ہوگا۔" (مورخہ ۱۳/ اپریل ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی شاعری کے مطمحِ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت سید صاحبؒ کو لکھتے ہیں کہ "شاعری میں لٹریچر بحیثیت لٹریچر کے کبھی میرا مطمحِ نظر نہیں رہا کہ فن کی باریکیوں کی طرف توجہ کرنے کے لیے وقت نہیں، مقصود صرف یہ ہے کہ خیالات میں انقلاب پیدا ہو اور بس، اس بات کو مدِنظر رکھ کر جن خیالات کو مفید سمجھتا ہوں ان کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، کیا عجب کہ آئندہ نسلیں مجھے شاعر تصور نہ کریں" (۱۰/ اکتوبر ۱۹۱۹ء) اور پھر اپنی عالی ظرفی اور خاکساری کا ثبوت یہ لکھ کر دیتے ہیں کہ "میرا کہنا اس قابل نہیں کہ اس کی تنقید کے لیے سید سلیمان کا دماغ صرف ہو لیکن اگر احباب تبصرہ پر مصر ہیں

تو یہی بہتر ہے کہ مجموعہ کا انتظار کیا جائے، اس کے علاوہ میں اپنے دل و دماغ کی سرگذشت مختصراً لکھنا چاہتا ہوں، اور یہ سرگذشت کلام پر روشنی ڈالنے کے لیے نہایت ضروری ہے، مجھے یقین ہے کہ جو خیالات اس وقت میرے کلام اور افکار کے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں ہیں، اس تحریر سے ان میں بہت انقلاب پیدا ہوگا۔ (۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء) غالباً ایسی کوئی تحریر ڈاکٹر اقبال کے قلم سے نکلنے نہ پائی۔

حضرت سید صاحبؒ اور ڈاکٹر اقبال کی یگانگت و موانست بڑھتی گئی، اور دونوں باہمی علمی لگاؤ رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے علمی قدر دان بھی ہوتے گئے، حضرت سید صاحبؒ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت سے سفر یورپ سے واپس آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ان کو لکھا "آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گزاری کی صورت میں مل رہا ہے، اور دربار نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا" (۱۰ اکتوبر ۱۹۲۰ء) پھر حضرت سید صاحبؒ نے اسی سال ان کو اپنی کتاب سیرۃ عائشہؓ بھیجی، تو ڈاکٹر صاحب نے ایک مکتوب میں لکھا: "سیرۃ عائشہ کے لیے سراپا سپاس ہوں، یہ ہدیہ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے، اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت مفید اضافہ ہوا، خدائے تعالیٰ جزائے خیر دے" (۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

۱۹۲۰ء میں ڈاکٹر اقبال کی اسرار خودی کا انگریزی ترجمہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر نکلسن نے کیا تو اس ترجمہ پر سید صاحبؒ نے ایک تقریظ مارچ ۱۹۲۱ء کے معارف میں شائع کی، جس میں وہ لکھتے ہیں: "اقبال کی زبان غالباً تیس برس سے ہندوستان میں زمزمہ پرداز ہے، ہمارے نوجوان کے کان اس کی ساحرانہ نوازی سے بہت کچھ لذت گیر ہوئے ہیں، لیکن اب تک اس کی قدر دانی کا کافی صلہ مصنف کو ہم نے ادا نہیں کیا" اسی زمانہ میں سید صاحبؒ یورپ کے سفر سے واپس ہوئے تھے، وہ یہ لکھتے ہیں کہ پیرس میں جب ہماری ملاقات وہاں کے ایک سابق وزیر تعلیمات ایران اور علامہ محمد عبدالوہاب قزوینی (مشہور ایرانی عالم اور صاحب قلم) سے ہوئی [illegible]

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ کا ذکر کیا، اور محترم محمد علی نے رموز بیخودی اور اسرار خودی کا ایک نسخہ ان کے مطالعہ کو عنایت کیا، وہ یہ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے۔ اس وقت مجھے نظر آیا کہ ان کی فارسی ابیات نے ان کے دل و دماغ پر اثر کو کتنا بڑھا دیا ہے۔" پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کی نظم کا ترجمہ نظم کے بجائے نثر میں کر دیا ہے، سید صاحب نے اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ اس سے ڈر ہے کہ شاعری کی لطافت جو رہے مگر یہ مثنوی دوسری زبانوں میں فلسفہ کی کوئی بڑی علمی کتاب بن جائے۔

۱۹۲۲ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ جلسہ میں ڈاکٹر اقبال نے اپنی مشہور نظم خضر راہ پڑھ کر سنائی تو یہ نظم چھپ کر عام نہیں ہونے پائی تھی کہ حضرت سید صاحب نے اس کے کچھ بند مئی ۱۹۲۲ء کے معارف میں شائع کیے، اور اس پر شروع میں جو تحریر لکھی اس کے کچھ حصے یہ ہیں

"ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم گو جوش بیان میں ان کی پچھلی نظموں سے کم ہے لیکن سیاسی حیثیت سے تنقید اور فکر میں بڑھی ہوئی ہے، ان کی شاعری کا اصل جوہر فلسفہ اور تخیل کی مصالحانہ آمیزش ہے اور انکی یہ خصوصیت اس نظم میں بھی نمایاں ہے، دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے جب یہ نظم جلسہ میں پڑھنا شروع کی تو مجلس پر ایک سماں بندھ گیا، اکثر مصرعوں پر سامعین کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن نظم کے دو مصرعوں نے خود شاعر کی آنکھوں کو اشکبار کر دیا۔

ع۔ بیچتا ہے ہاشمی ناموس دین مصطفیٰ

ع۔ ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو

اور پھر سید صاحب نے لکھا کہ ہم کو اس نظم کے جس شعر نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ ہے:

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل　　　خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

ڈاکٹر اقبال کی یہ نظم ایسی ہے کہ اس کی شرح لکھنی چاہیے"

اور جب یہ تحریر ڈاکٹر اقبال کی نظر سے گذری تو انھوں نے حضرت سید صاحب کو لکھا کہ

خضرِ راہ کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا اس کا شکریہ قبول فرمائیے، جوشِ بیان کے متعلق آپ نے جو نوٹ لکھا ہے وہ صحیح ہے مگر یہ نقص اس نظم کے لیے ضروری تھا کم از کم میرے خیال میں جناب خضر کی پیرانہ سالی ان کا تجربہ اور واقعات و حوادثِ عالم پر ان کی نظر، ان سب باتوں کے علاوہ ان کا اندازِ طبیعت جو سورۂ کہف سے معلوم ہوتا ہے، اس بات کا مقتضی تھا کہ جوش اور تخیل کو ان کے ارشادات میں کم دخل ہو، اس نظم کے بعض بند میں نے خود نکال دیے اور محض اس وجہ سے کہ ان کا جوشِ بیان بہت بڑھا ہوا تھا، اور جناب خضر کے اندازِ طبیعت سے موافقت نہ رکھتا تھا، یہ بند اب کسی اور نظم کا حصہ بنجائیں گے۔" (۲۹ مئی ۱۹۲۲ء)۔ ان سطروں سے ڈاکٹر اقبال کی بالغ نظری اور باریک بینی کا صحیح اندازہ ہوگا۔

پھر معارف کی اسی اشاعت میں حضرت سید صاحب نے ڈاکٹر اقبال کی "پیام مشرق" کی ترتیب کی خبر یہ لکھ کر دی کہ "ہم ناظرین کو ایک اور خوشخبری سنانا چاہتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال ملک کے ان پرشور ایام میں خاموش نہیں رہے ہیں، جرمنی کے ایک شاعر گوئٹے نے اپنے جس مجموعۂ اشعار کا نام مشرقی دیوان رکھا ہے، مغرب کا مشرق پر اب تک یہ قرض چلا آتا تھا، ہمارا مشرقی شاعر اب اس قرض کے بارے سے مشرق کو سبکدوش کرنا چاہتا ہے، جب ڈاکٹر صاحب کے والا نامہ سے معلوم ہوا کہ انھوں نے گوئٹے کے جواب میں فارسی اشعار کا ایک مجموعہ لکھا ہے جو عنقریب شائع ہوگا، اس کے دیباچہ میں ڈاکٹر اقبال یہ دکھائیں گے کہ فارسی لٹریچر نے جرمن لٹریچر پر کیا اثر ڈالا ہے۔ ابھی گذشتہ اورینٹل کانفرنس کلکتہ میں ڈاکٹر جیون جی جمشید نے تقریباً اس موضوع پر ایک مضمون پڑھا تھا، امید ہے کہ ڈاکٹر اقبال کا قلم اس سے زیادہ سیراب کن ہوگا"۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریر پڑھی تو حضرت سید صاحب کو لکھا کہ پیام مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں، پروفیسر نکلسن کا خط آیا ہے انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے...... مگر یہ تعجب کی بات ہے پروفیسر

مجلس کا انشاء ... وہ ناقابل اعتبار ہے۔" (۵ جولائی ۱۹۲۲ء)

اقبال نامہ میں حضرت سید صاحب کے نام سے ڈاکٹر صاحب کے جو خطوط ہیں ان کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ گویا ڈاکٹر صاحب علم و فلسفہ کے پہاڑ اور سمندر بنتے چلے جا رہے تھے لیکن کسی حال میں بھی اپنے علم کی بلندی اور گہرائی کا اظہار پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ جب ضرورت ہوتی تو اپنی عالمگیر شہرت اور عظمت کا خیال کیے بغیر حضرت سید صاحب سے علمی و مذہبی استفسارات کرنے میں مطلق نہیں ہچکچاتے تھے۔ انھوں نے جو جو سوالات کیے ان کو سنہ وار مرتب کر دیا جائے تو ان سے ان کے ذہنی تجسس اور تفحص کے ساتھ ان کے ذہنی ارتقا کا بھی اندازہ ہوگا۔ اسی غرض سے یہ تمام استفسارات یہاں پر درج کیے جا رہے ہیں:۔

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین وکلا کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل، پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیے لے آتے ہیں، یہ ہدایا فیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں، کیا یہ مال مسلمانوں کے لیے حلال ہے؟" (۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء)

"یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ حمیرا والی سب احادیث موضوعات میں ہیں، کیا کلینی یا حمیرا بھی موضوع ہے، کمال کا شعر کیا مزے کا ہے۔

این تصرف ہاے من در شعر من ... کلینی یا حمیرائے من است (۲۳ دسمبر ۱۹۲۰ء)

"کیا حکمائے صوفیہ اسلام میں کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بحث کی ہے؟" (۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء)

"دو باتیں دریافت طلب ہیں: (۱) متکلمین میں سے بعض نے علم مناظرہ مرایا کے رو سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رؤیت ممکن ہے، یہ بحث کہاں ملے گی، میں اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں۔

(۲) مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک کیا ہے:

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود ... رحمۃ للعالمینے ہم بود

حال کے ہیئت دان کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر مخلوق کی آبادی

تصورات کے متعلق آپ نے جو رحمۃ للعالمین میں ظہور دجال بھی فرض کی ہے، اس عقیدت سے یا کم از کم جو بحث ہے وہ میرے نزدیک لازم آتا ہے۔ شیخ اشراق تناسخ کی ایک شکل کے قائل تھے، ان کے اس عقیدہ کی ان کا تجربہ؟ (۲۰ اپریل ۱۹۲۲ء)

مردان خدا خدا نباشند — لیکن ز خدا جدا نباشند

کس کا شعر ہے؟ ایک امر کے لیے اس کی تحقیق ضروری ہے، ممکن ہے آپ کی نظر سے کسی تذکرہ میں یہ شعر گذرا ہو" (۳ اگست ۱۹۲۲ء)

"مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریۃً ملے گا۔ عین القضاۃ، مولانا شاہ اسمٰعیل کی عبقات، قاضی محب اللہ کی جوہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی۔ .... جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامہ میں ذکر فرمایا ہے کیا آپ کے کتب خانہ دار المصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے وہیں حاضر ہو جاؤں اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں ......
حضرت ابن عربی کے بحث زمان کا خلاصہ اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی......... (۲۳ اگست ۱۹۲۲ء)

آپ حضرت اویس اور ان تمام صوفی روایات کے متعلق جو ان سے منسوب ہیں، کیا خیال رکھتے ہیں؟ اگر امام مالک کی تحقیق زیر نظر ہو تو ازراہ عنایت حوالے سے آگاہ فرمائیے گا۔ (۲۳ جنوری ۱۹۲۳ء)

مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو اضافے حضرت مسلمانوں نے منطق میں کیے ہیں اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں، جہاں تک ممکن ہو [illegible] سے مجھے مستفیض فرمائیں، کم از کم ان مقالات کے نام ضرور تحریر فرمائیں [illegible] (۱۹۲۳ء)

کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کے عقائد کی اشاعت ہوئی ہے؟
اس کے متعلق کی بھی کچھ ضرورت ہے [illegible]

[illegible] تحریک تھی یا اس کا مقصد ایک مذہبی انقلاب بھی تھا [illegible]
کے لیے معافی چاہتا ہوں اور یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ اس عریضہ کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دیجئے۔"
(یکم مئی ۱۹۲۳ء)

"حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام "مسلمانوں کے نظریہ متعلقہ مالیات" ہے۔ اس کتاب میں لکھا ہے اجماع امت نص قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے ...... اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے۔" (۱۰ر اگست ۱۹۲۳ء)

"آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہاء نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز رکھی ہے۔ ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہے تو اس سے آگاہ فرمایئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماع صحابہ ہی کر سکتا ہے یا علمائے مجتہدین امت بھی کر سکتے ہیں ...... کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کونسا حکم ہے" ...... (۲۷ر اگست ۱۹۲۳ء)

"آپ نے کسی گزشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرور کائنات سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے، مگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآنی شریعت کی کسی آیت سے استدلال فرماتے ...... اس کا حوالہ کونسی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے؟" (۲ر اکتوبر ۱۹۲۳ء)

"آیا توریث میں خمس کی ارث ابدی ہیں یا قاعدہ توریث میں جو اصول مضمر ہے صرف وہی ناقابل تبدیل ہے اور حصص حسب حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔ آیۂ وصیت ہو گیا جو منشا ہے ابھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں جب فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمایئے۔ اس احسان کے لیے بہت شکر گزار ہوں گا۔" (۱۸ر مارچ ۱۹۲۴ء)

"قائم ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے۔ ہر اسلامی ملک کا

اپنا امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو۔ موخرالذکر صورت میں وہ قرشی ہی ہو یا غیر قرشی بھی ہو سکتا ہے، نیز حکومت میں کیونکر جمہوریت کار آسکتی ہے؟ مہربانی کرکے ان سوالات پر روشنی ڈالیے۔" ...... (۲۰ اپریل ۱۹۳۶ء)

"اجتہاد کی بنا محض عقل بشر اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے؟ اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں ...... وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟ کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں چلتا ہے یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں؟"

"حضور نے اذان کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا۔ کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت میں آتا ہے یا امامت کے تحت میں؟ ...... امام ابوحنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا جا سکتا۔ اس مسئلہ کی اساس کیا ہے؟" (۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء)

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں، ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے۔ بخاری میں ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے ...... کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟" ...... (۷ مارچ ۱۹۲۸ء)

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلمبند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں۔ میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا، صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضائع نہ ہوگا۔" (۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء)

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ٹکڑا جو ترجمہ کیا ہے ...... اس میں شعار تعزیرات ...... ہے۔ مہربانی کرکے یہ فرمایئے کہ لفظ شعار سے کیا مراد ہے؟ نیز اس کے تحت میں کون کون سے امور آتے ہیں؟ اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے۔ جواب کا سخت انتظار رہے گا۔" (۲۲ ستمبر ۱۹۲۹ء)

"حضرت محی الدین ابن عربی کے فتوحات یا کسی اور کتاب میں حقیقت زمان کی بحث

بھی کہیں بحث ہے؟ ...... حضرات صوفیہ میں اگر کسی بزرگ نے بھی اس مضمون پر بحث کی ہو تو اس کے حوالے سے بھی آگاہ فرمائیے۔ متکلمین کے نقطۂ خیال سے حقیقتِ زمان یا آنِ سیال پر مختصر اور مدلل بحث کون سی کتاب میں ملے گی؟" (۸؍ اگست ۱۹۳۳ء)

نور الاسلام کا عربی رسالہ ابعاد مکان ... قلمی یا مطبوعہ ہے؟ نور الاسلام کا زمانہ کونسا ہے۔ (۹؍ ستمبر ۱۹۳۳ء)

ملا محب اللہ بہاری کی کتاب جوہر الفرد کہاں ملے گی۔ (۱۰؍ ستمبر ۱۹۳۳ء)

"اگر دہر ممتد اور مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے، اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے، یا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے۔ کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات میں ہی ملے۔ مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمائیے اور دیکھیے کہ کیا انھوں نے مکان پر بھی کچھ بحث کی ہے، اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے۔ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں۔" (۱۲؍ دسمبر ۱۹۳۳ء)

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے...... نظام عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے۔ اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمائیے۔" (۵؍ جنوری ۱۹۳۴ء)

"احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمائیے۔ زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ ...... اگر کوئی اسلامی ملک روس کی طرح زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا یہ بات شرع اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اجتماع معاشرت

حکومت کا تعلق ہو کیا زکوٰۃ بھی بیت المال کے سپرد ہوگی، صدقات کی کتنی قسمیں ہیں، صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے۔" (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

"قرآن شریف میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان میں کون سے نبی صاحب معجزہ ہیں اور کون سے بغیر معجزہ؟ یا سب کے سب بغیر معجزہ ہیں۔ لفظ نار کا روٹ عربی زبان میں کیا ہے۔ لفظ نجات کا روٹ کیا ہے، اور روٹ کے لحاظ سے اس کے معنی کیا ہیں۔" (۹ ستمبر ۱۹۳۴ء)

ان استفسارات کے جوابات حضرت سید صاحب برابر دیتے رہے، افسوس ہے کہ وہ محفوظ نہیں ہیں، شاید ڈاکٹر اقبالؒ کے کاغذات میں ہوں، اگر وہ بھی شائع کر دیے جاتے تو بہت سے مفید مذہبی، فقہی، تاریخی اور علمی معلومات حاصل ہو جاتے، سید صاحبؒ نے اقبال نامہ کے مرتب کو ڈاکٹر صاحب کے خطوط بھیجتے وقت کچھ حواشی ضرور لکھ دیے تھے، مگر وہ سب ہی مختصر اور ناکافی ہیں، لیکن خود ڈاکٹر صاحب کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت سید صاحب جو جوابات دیتے ان سے ڈاکٹر صاحب کو پوری تشفی ہو جاتی، اسی لیے وہ اپنے خطوط میں لکھتے رہے:۔

"آپ کا نوازش نامہ قوت روح اور اطمینان قلب کا باعث ہے" (۱۳ نومبر ۱۹۱۹ء)

"نوازش نامہ ابھی ملا ہے، جس کے لیے بہت شکرگزار ہوں، جتنی آگاہی آپ نے دی ہے، وہ اگر نماز فرصت دے تو باقی عمر کے لیے کافی ہے" (۲۳ اگست ۱۹۲۲ء)

"نوازش نامہ معلومات سے لبریز ہے، نہایت شکرگزار ہوں۔" (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

"آپ نے نوازش نامہ کے ذریعہ [illegible] خوب ہی لکھے ہیں، گو میرے لیے یہ [illegible] باعث خیر و برکت ہے، انشاء اللہ آپ کو [illegible] گزشتہ [illegible] اور اب بھی [illegible]

کچھ خدمت کر سکتا ہے۔ (۲۰ فروری ۱۹۲۲ء)

ڈاکٹر اقبال کے اس آخری اقتباس میں ان کے عجز و انکسار کے ساتھ ان کی شرافت اخلاق اور شرافت طبع بھی نمایاں ہے، جو ان کی طبیعت کا سب سے بڑا جوہر تھا، اور جو خود ان کا اسلامی کا ہمالیہ بنا ہوا تھا، اس نے یہ لکھنے میں بالکل تامل نہیں کیا کہ علوم اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے۔ (۲۸ ستمبر ۱۹۲۳ء)

ڈاکٹر صاحب حضرت سید صاحب کو مفید مشورے بھی دیتے رہے، ایک بار سید صاحب نے ان کو اپنی ایک غزل بھیجی تو انھوں نے لکھ بھیجا کہ آپ کی غزل لاجواب ہے، بالخصوص مجھے یہ شعر بہت پسند آیا

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں   وہ ایک قطرۂ خوں جو رگ گلو میں ہے

لیکن ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو یہ بھی مشورہ دیا کہ مولانا شبلی کی طرح تاریخی نظمیں لکھیں، سید صاحب کو شاعری سے صرف اسی حد تک لگاؤ رہا کہ جب ان پر کوئی خاص کیفیت طاری ہوتی تو کوئی نظم یا کوئی غزل کہہ دیتے، ورنہ ان کا زیادہ وقت تصنیف و تالیف ہی میں صرف ہوتا،

ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے یہ فرمائش کی تھی کہ وہ یاجوج ماجوج پر کوئی مضمون لکھیں، کیونکہ یہ امر تحقیق کا محتاج ہے۔ (یکم اکتوبر ۱۹۱۹ء)۔ جہاں تک مجھ کو علم ہے سید صاحب اس پر کوئی مضمون قلمبند نہ کر سکے، پھر اپنے ایک خط (مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۲۶ء) میں ڈاکٹر صاحب سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے، مگر مولانا شبلی مرحوم زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا، موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا، لیکن یہ کام سید صاحب خود تو نہ کر سکے، لیکن یہ مضمون اپنے رفیق کار مولانا عبدالسلام ندوی سے مرتب کرایا کہ تاریخ فقہ اسلامی کے نام سے چھپ گیا، جس کے کئی ایڈیشن اب تک دار المصنفین سے شائع ہو چکے ہیں، پھر ایک اور خط میں لکھتے ہیں، دار المصنفین کی طرف سے ہندوستان کے علمائے اسلام

پر ایک کتاب لکھنی چاہیے، اس کی سخت ضرورت ہے۔ عام طور پر یورپ میں سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کوئی فلسفیانہ روایات نہیں ہیں۔ (۴ر ستمبر ۱۹۳۳ء)

سید صاحب نے مولانا عبد السلام ندوی سے حکمائے اسلام دو جلدوں میں لکھوائی ہے، جس میں ہندوستان کے حکماء کا بھی ذکر آگیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو زمان و مکان کے فلسفہ سے بڑی دلچسپی رہی، اس لیے وہ اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں کہ میں نے زمان و مکان کے متعلق تھوڑا سا مطالعہ کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے بڑے بڑے مسائل پر غور و فکر کیا ہے اور اس غور و فکر کی تاریخ لکھی جا سکتی ہے، یہ کام صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، میرے خیال میں آپ کو چاہیے کہ اس کام کو اپنی زندگی کے اہم مقاصد میں شمار کریں۔ (۱۵ر دسمبر ۱۹۳۳ء) لیکن حضرت سید صاحب اس کام کو انجام دینے کی فرصت نہ ملی۔

علم و فن کے ان دو سیاروں کا قران السعدین بھی ہوتا رہا، ڈاکٹر صاحب تو کبھی اعظم گڑھ تشریف نہیں لائے، لیکن حضرت سید صاحب کو لاہور جانے کا بارہا اتفاق ہوا، جہاں وہ ڈاکٹر صاحب سے ملتے رہے، ڈاکٹر صاحب کو جب سید صاحب کے لاہور آنے کی خبر ملتی تو ان کو اپنے ہی یہاں مہمان ٹھہرانا پسند کرتے تھے۔ (دیکھو اقبال نامہ مکتوب مورخہ ۵ر جولائی ۱۹۳۳ء) لیکن دونوں کو ۱۹۳۳ء کے سفر افغانستان میں ایک ساتھ رہنے کا زیادہ موقع ملا، اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے ڈاکٹر صاحب، علامہ سر راس مسعود اور سید صاحب کو افغانستان کی بعض علمی اور تعلیمی اصلاحات کے سلسلہ میں افغانستان مدعو کیا تھا، سید صاحب نے اس سفر کے دلچسپ کوائف ۱۹۳۳ء اور ۱۹۳۴ء کے معارف کی کئی اشاعتوں میں قلمبند کیے ہیں، ان میں ڈاکٹر صاحب کی جن جن باتوں سے متاثر ہوئے ان کو بھی اپنے احاطۂ تحریر میں لائے ہیں۔

ایک موقع پر چینی ترکستان کا ذکر آیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ یورپ نے پہلے اپنی سائنسی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے ان ہی جہازوں کے ذریعے مشرق کو مغرب سے ملا دیا، لیکن اب یہ نظر آتا ہے کہ ان بحری راستوں کی یہ جنت جلد فنا ہو جائیگی، اب آئندہ مشرق وسطیٰ کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا، اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کریگا، تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئے جائیں گے اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گذرے گا، اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا، ڈاکٹر صاحب کی پیشین گوئی بڑی حد تک صحیح تھی آج مشرق وسطیٰ میں جو سیاست کھیلی جا رہی ہے اور وہاں آئے دن جو انقلاب ہوتے نظر آ رہے ہیں، ان کا مطالعہ کرکے ڈاکٹر صاحب کی سیاسی فراست اور دور بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

افغانستان میں ہندوستانی مہمانوں کے اعزاز میں انجمن ادبی کابل نے ایک دعوت دی، تو اس میں تقریریں بھی ہوئیں، سید صاحبؒ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کی تقریر فلسفیانہ انداز میں بہت ہی پُراثر تھی، اس پوری تقریر کو سید صاحبؒ نے معارف (مارچ ۱۹۳۴ء) میں نقل کیا ہے جس کے کچھ ٹکڑے یہ ہیں:-

"میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی یا معماری ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمت گار ہے، اور اسی بنا پر آرٹ کو میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے، اس وقت جب حکومت کوشش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوانوں کے لیے سچے رہنما بنیں۔ زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر دکھائیں، کیونکہ شاعر جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اسکو

بٹھا کر دکھاتا ہے، اس وقت وہ سخت خوفناک اور ہلاکت آفریں ہو جاتا ہے، اور جو حسن قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیام موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادوگری است دلبری با قاہری پیغمبری است

اس موقع پر ڈاکٹر صاحب نے شاعری اور شاعر سے متعلق ایک عجیب نکتہ پیدا کیا، جو غور کرنے کے لائق ہے، انھوں نے فرمایا

" ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقت میں قوم کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے، قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور اہل سیاست کی پامردی سے نشو و نما پاکر مر جاتی ہیں، جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے اس کی انانیت خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے، مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے۔"

آخر میں انھوں نے تمام افغانوں سے مخاطب ہو کر فرمایا:

" افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کر دے۔"

یہ ہندوستانی مہمان غزنی پہنچے تو حکیم سنائی کے مزار کی بھی زیارت کی، سید صاحبؒ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

" حکیم و شاعر اقبال کو حکیم و شاعر سنائی کے مزار کے دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا۔۔۔ جب ہم وہاں پہنچے تو مزار کے اندر بطریق مسنون دعا پڑھی، حکیم سنائی کی جلالت شان سے کون واقف نہیں، ہم سب اس منظر سے متاثر تھے مگر ہم میں سب سے زیادہ متاثر ڈاکٹر اقبال

پر تھا، وہ حکیم مشرق کے سرہانے کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے، اور دیر تک زار زار روتے رہے،

اللھمّ اغفر لہ وارحمہ۔

واپسی میں چمن سے کوئٹہ تک سید صاحبؒ اور ڈاکٹر صاحبؒ دونوں نے ایک موٹر میں سفر کیا، سید صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ راستہ میں ڈاکٹر صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات اور تجربے اور سچے پیر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی، مختلف شیوخ اور بزرگان سلاسل کا تذکرہ رہا، گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد کا بھی ذکر کیا تو اس سلسلہ میں سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"اس ضمن میں معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیات خفتہ کے تاروں میں جس مضراب نے حرکت پیدا کی، وہ خود ان کے والد ماجد کی ذات بابرکات تھی، گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقرہ سنایا جس نے میرے دل پر بیحد اثر کیا، فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا، ایک صبح کو نماز کے بعد حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والد صاحب مرحوم ادھر آئے، اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں، فرمایا جب تک تم یہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا، تلاوت کا مزہ نہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کیسے ہو سکتا ہے، فرمایا جب بی اے پاس ہو جاؤ گے تو بتاؤں گا، کچھ دنوں کے بعد جب انھوں نے بی اے کر لیا تو اس دن کی گفتگو کا حوالہ دیکر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی، مرحوم نے ان کو کچھ طریقے اور دعائیں بتائیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان وقلم سے ملت محمدی کی خدمت بجا لاتا رہیگا، ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم انکے نغمہ سے سرشار و مست تھا، اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا۔

باپ اپنے بیٹے کی اس عالی نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا،

حضرت سید صاحب افغانستان کے سفر سے لوٹے تو ڈاکٹر اقبال کی عالی ظرفی اور اخلاق کی پاکیزگی کے علاوہ ان کی فکر و نظر کی بلندی سے اور بھی زیادہ متاثر تھے، اور دارالمصنفین کی نجی مجلسوں میں بارہا کہا کہ اسلام میں صدیوں کے بعد ڈاکٹر اقبال جیسا مفکر پیدا ہوا ہے، ایک موقع پر یہ بھی فرمایا کہ کابل ہی کے سفر میں انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کی شاعری ہندوستان میں باقی رہے گی، ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، یہ سنکر ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب سے فرمایا کہ نہیں، جب تک دارالمصنفین کا لٹریچر ہندوستان میں رہیگا اُس وقت تک ہندوستان میں اسلام بھی باقی رہے گا، سر راس مسعود بھی اس موقع پر موجود تھے، انہوں نے کہا بس یوں کہیے جب تک ہندوستان میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری اور دارالمصنفین کا لٹریچر باقی رہیگا ہندوستان میں اسلام باقی رہے گا،

۱۹۳۵ء میں ڈاکٹر اقبال کا مجموعۂ کلام بالِ جبریل شائع ہوا تو اس کا ایک نسخہ ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو بھی بھیجا، جب یہ نسخہ دارالمصنفین پہنچا تو سید صاحب نے بہت ذوق و شوق سے اس کا مطالعہ کیا، بار بار پڑھا، اپنے رفقائے کار کو پڑھ کر سنایا، ان سے پڑھوا کر سنا اور پھر جون ۱۹۳۵ کے معارف میں اس پر ایک لمبی تقریظ بھی لکھی، جس کے شروع میں لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری کا آغاز اردو شاعر کی حیثیت سے کیا، مگر کم و کم بیس برس سے وہ اپنے سامعین کی وسعت اور دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ تک اسکو پہنچانے کی خاطر اپنے حکیمانہ اسلامی خیالات کو مناسب پیرایۂ بیان میں ادا کرنے کے لیے فارسی میں اظہار خیال کرنے لگے اور مولانا روم کی رہنمائی میں آسمانوں کی سیر فرماتے رہے، اب بالِ جبریل کی مدد سے وہ پھر زمین پر اتر آئے ہیں مگر اس زمین پر بھی وہ آسمانوں ہی کے لیے آمادۂ پرواز ہیں،

پھر یہ بتا کر اس مجموعہ کے مختلف حصوں میں کیا کیا ہے، لکھتے ہیں کہ نظم میں شاعر نے طرح طرح سے مذہب و ملت کی خفتہ خودی کو حرکت میں لانے کی کوشش کی ہے، کہیں وہ دعا ہے، کہیں زمزمہ ہے، کہیں سجدہ ہے

گڑگڑاتا ہے، کبھی شکر تقدیر کی مسرت سے اپنی بندگی و عبودیت پر اتراتا ہے اور پھر خود آپ ہی اپنی حاضری و درماندگی کی ساری بساط کو اس بارگاہ بے نیاز میں نذر لاتا ہے..... کبھی غزنی میں سنائی کے مزار پر، کبھی قرطبہ کی مسجد میں، کبھی فلسطین کے بیت المقدس میں اور کبھی یورپ کے تماشا گاہوں میں شاعر کو مسلمانوں کی ناخودشناسی پر رونا آتا ہے، کبھی وہ ان کو سمجھاتا ہے، کبھی شرماتا ہے، کبھی دھمکاتا ہے، کبھی رلاتا ہے اور ہر طرح کی کوشش کرتا ہے کہ مسلمان اپنی حقیقت کو سمجھیں اور اسلام کا پیغام لے کر وہ پھر بسیط ارض کے گوشہ گوشہ میں دوڑ جائیں۔

سید صاحب شروع میں تو ڈاکٹر اقبال کی زبان کے کچھ ناقد ضرور تھے لیکن اس مجموعہ کا مطالعہ کرکے ڈاکٹر اقبال کی زبان سے متعلق ان کی رائے بدل گئی، اسی لیے بڑی فراخدلی کے ساتھ لکھتے ہیں کہ بال جبریل کی نسبت سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں شاعر نے بانگ درا سے بڑھ کر اپنی شاعرانہ صفت، سلاست، روانی، بے تکلفی اور زبان کی صحت میں حیرت انگیز کامیابی کا ثبوت دیا ہے، اور عجب نہیں کہ بال جبریل کو دیکھ کر لکھنؤ اور دہلی کے صنعت گر سخنور بھی پنجاب کے سخندان کا لوہا مان لیں، زبان میں غزل کی سی شیرینی تو نہیں مگر قصائد کی سی جزالت اور متانت پوری طرح موجود ہے۔

۱۹۳۵ء میں سید صاحب اور ڈاکٹر صاحب دونوں کی صحت بہت خراب رہی، سید صاحب دیسنہ جا کر مقیم ہو گئے تھے، اور ڈاکٹر صاحب بھوپال میں علاج کرا رہے تھے، پھر بھی اگست ۱۹۳۶ء میں وہ سید صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ وہ قوانین اسلام پر ایک کتاب لکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس وقت اسی کی زیادہ ضرورت ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے سید صاحب سے مشورے بھی طلب کئے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی صحت کی خرابی کی وجہ سے یہ کتاب مکمل نہ ہو سکی، لیکن اسی سال ان کا مجموعۂ کلام ضرب کلیم شائع ہوا، انھوں نے سید صاحب کو یہ بھیجا تو سید صاحب نے اکتوبر ۱۹۳۶ء کے معارف کے شذرات میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"ہمارے حکیم شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کا ایک نیا ادبی مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا ہے، اس میں موصوف کی وہ تازہ اردو نظمیں ہیں جن میں اسلام کے نقطۂ نظر سے زمانۂ موجودہ کے خیالات پر تبصرہ کیا گیا ہے، لیکن معلوم نہیں کہ یہ حضرت کلیم کی وہ ضرب ہے جو بحر احمر پر پڑی تھی جس سے دریا پھٹ گیا تھا اور اس سے ایک قوم آزاد اور دوسری برباد ہوئی تھی یا وہ ضرب ہے جو وادی تیہ کی ایک چٹان پر پڑی تھی جس سے پانی کی بارہ دھاریں بنی اسرائیل کے پیاسوں کے لیے پھوٹی تھیں، بہرحال ان دو میں سے جو ہو وہ ہمارے لیے فال نیک ہی ہے۔"

آگے چل کر سید صاحب لکھتے ہیں:-

"حضرت اقبال کی شاعری اب شاعری کی حدود سے نکل کر خالص حکمت کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ چکی ہے، ان من الشعر الحکمۃ کے خلعت نبوی سے سرفراز ہو چکی ہے، اب ان کی شاعری میں جذبات کا سراب نہیں بلکہ عقل و حکمت کا چشمۂ حیات ہے، اب وہ لطف و لذت نہیں بلکہ بصیرت و موعظت ہے، وہ مسلمانوں کو اب ان کے بزرگوں کا تدریجی پیام سنانے کیلئے نہیں بلکہ ان قوموں کے عروج اور زوال کا فلسفہ سمجھانے کے لیے ہے، اب وہ میدان جنگ کا رجز یا مسافران راہ کے لیے بانگ درا نہیں بلکہ غور و فکر کے غار حرا سے ناموس اکبر کی آواز اور جبریل امین کا پیام ہے۔"

اور جب اپریل ۱۹۳۸ء میں سید صاحب کو ڈاکٹر اقبال کی وفات کی خبر ملی تو وہ نہایت رنج و غم میں اٹھ اٹھ کر ٹہلتے تھے، ان کو یاد کرتے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتیں، جیسے ان کے کسی عزیز خاص کی الم ناک موت ہو گئی ہو، بھرائی ہوئی آواز سے ان کی زندگی کے مختلف واقعات سناتے اور اپنے رفقائے کار سے کئی روز تک ان ہی کا ذکر سننا پسند فرماتے، پھر اسی رنج و غم میں ماتم اقبال کی سرخی قائم کر کے ڈاکٹر اقبال پر ایک تحریر لکھنے بیٹھ گئے اور جب یہ ختم ہوئی تو اس کے ہر جملہ سے ان کے رنج و الم

اور سوزِ جگر کا اندازہ ہوتا ہے، خود پیکرِ غم بنکر انھوں نے یہ تحریر لکھی ہے، اور شاید ان کے قلم سے اس سے بہتر کوئی اور تحریر نہ نکلی، اس کا آغاز وہ اس طرح کرتے ہیں:

"وقت الواقعہ" "موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی انیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور علم کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی۔ ایسا عارف، فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اسکے ذہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اس کی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کی ہر پرواز بالِ جبریل تھا، اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اسکی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بنکر ان شاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب شاعرِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہونگے، خداوندا اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر۔"

پھر سیرۃ النبی کے مصنف کی یہ رائے پڑھنے کے لائق ہے کہ مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کے لیے ایک نیا پیام ملتا تھا، وہ توحیدِ خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علم بردار، تجدیدِ ملت کا طلب گار تھا، اس کے رونگٹے رونگٹے میں رسولِ انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا، اور اس کی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشک بار رہتی تھیں، اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب کی تعبیر میں اس کی ساری عمر ختم ہوگئی۔

آج کل اقبال کی شاعری اور ان کے فلسفہ کے اندر دور دور طرح طرح کی خیال انگیزیاں اور نکتہ آفرینیاں کی جا رہی ہیں، لیکن سید صاحب نے چند فقروں میں ان کی شاعری کے جو چند نکات بتائے ہیں وہی در اصل حقیقت ہے، سید صاحب رقمطراز ہیں:

"اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرار قدرت کا محرم اور رموز فطرت کا آشنا تھا، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے رازوں کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا، یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا۔"

پھر آخر میں لکھتے ہیں:

"اقبال! ہندوستان کا فخر اقبال! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبال! حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروان ملت کا رہنما اقبال! رخصت رخصت، الوداع، الوداع، سلام اللہ علیک و رحمتہ الی یوم التلاق۔"

اقبال کامل

ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ و شاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئیں لیکن ان سے ان کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایاں نہ ہو سکی، یہ کتاب اس کمی کو پورا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل لکھی گئی ہے، اور سوانح حیات کے بعد ان کی اردو شاعری پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھائی گئی ہیں۔ (مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم)، صفحات ۴۰۰، قیمت صہ

منیجر

وجودِ باری

از جناب ڈاکٹر مقتدر علی بیگ صاحب ایم اے پی ایچ ڈی استاد شعبۂ اردو عثمانیہ یونیورسٹی

آج سے کچھ عرصہ پہلے سائنسدانوں نے مادے کی تقسیم اور تجزیہ کرنا چاہا اور خوردبین آلات کے ذریعے سب سے چھوٹے اور باریک جز تک مادے کی تقسیم کی اور اس جز کو مالیکیول (Molecule) کا نام دیا گیا، کچھ عرصہ بعد مالیکیول کی بھی تقسیم ہوئی اور ایٹم (Atom) یعنی جوہر دریافت کیا گیا، عجیب و غریب آلات نے اس کے بھی ٹکڑے کر دیے اور اسکے اندر الکٹرونس (Electrons)، پروٹانس (Protons) اور نیوٹرانس (Neutrons) چکر کاٹتے نظر آئے، کچھ عرصہ بعد ان کا بھی تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ان کے اندر صرف توانائی یا انرجی (Energy) موجود ہے، اور یہی توانائی تمام مادی اشکال و صور اختیار کرتی ہے، عالم وجود کی ہر شے میں بلکہ موجودہ تحقیقات کی رو سے عدم جس کی ایتھر (Ether) اور ویکیوم (Vacuum) دو صورتیں ہیں، ان کے اندر بھی موجود ہے، غرض کوئی چیز توانائی سے خالی نہیں ہے چاہے وجود ہو یا عدم۔

اب ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ توانائی بے جان ہے یا ذی حیات ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک کسی کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ نباتات میں بھی جان ہوتی ہے، ہندوستان کے ایک ماہر حیاتیات سر جگدیش چندر بوس نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کر دیا کہ نباتات بھی ذی حیات ہیں، بلکہ سائنسی تحقیقات نے یہ راز بھی فاش کر دیا ہے کہ پتھر میں بھی

جان ہوتی ہے، چنانچہ یورپ کے اکابر حکماء کے نزدیک جمود بے جان کا کہیں وجود نہیں، خواہ وہ شجر و حجر ہوں یا حیوان و بشر، سب کے اندر کسی نہ کسی قسم کی زندگی موجود ہے، انگلستان کے دور حاضر کے سب سے بڑے فلسفی وائٹ ہیڈ کے نزدیک روح اور مادہ یا حیات و مادہ کی دوئی محض فریب ادراک ہے، اس نے پرزور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ہستی میں مادہ اور روح کی تقسیم جو عملی اغراض کے لیے کی گئی تھی، حقیقت میں بے معنی ہے، عموماً انسان جسے قالب سمجھتا ہے اس کی اصلیت بھی روح ہی ہے، مادہ در اصل ذی حیات ہے، قالب اور جان یا روح اور مادے کو دو الگ الگ اور متضاد چیزیں تصور کرنا علم کی ادنیٰ سطح پر تو ممکن ہے لیکن ماہیت وجود کو سمجھنے میں اس دوئی سے کوئی مدد نہیں ملتی، طبیعی حکماء نے ذرے کے متعلق اب جو انکشافات کیے ہیں ان سے مادے کی ماہیت کے تصورات میں زبردست انقلاب آ گیا ہے، اس انقلاب سے بہت جدید حکماء کا رجحان اس ہو گیا ہے کہ مادہ اور نفس کے جواہر میں اس قسم کی دوئی نہیں، جیسی گذشتہ صدی تک مادیین نے فرض کر رکھی تھی، مادے کی حقیقت روز بروز نفس کی حقیقت کی ہم ذات ہوتی جاتی ہے۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جاندار شے میں کسی نہ کسی قسم کا احساس موجود ہوتا ہے، عارفوں اور حکیموں کا خیال ہے کہ احساس ہی نہیں بلکہ ادراک اور شعور بھی ہوتا ہے، بے شعور جمادات کا کہیں وجود نہیں، جدید حکماء اثالک تصوری کے پیش نظر شعوری جوہر کو تمام اشیاء کا سرچشمہ سمجھتے ہیں، مغرب کے بلند فکر فلسفی لائبنیز کا خیال تھا کہ کائنات بے جان و بے شعور نہیں بلکہ ارواح پر مشتمل ہے، اس نے اپنی مابعد الطبیعیات کی بنیاد اس عقیدے پر رکھی تھی کہ کائنات مختلف المدارج ارواح پر مشتمل ہے جنہیں وہ موناڈس (جواہر فرد) کہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ ان مونادات کی قوت شعور میں بے انتہا تفاوت ہے، لیکن کوئی مونادِ مطلقاً بے شعور نہیں، وائٹ ہیڈ کہتا ہے کہ ہستی کے ہر پہلو میں احساس اور دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ربط و

موجود ہے جس میں زندگی ہی زندگی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (۱، ۶۱) — جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں وہ سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں،

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (بنی اسرائیل) — ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے کہ اس کی حمد کی تسبیح نہ پڑھتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم بھی یہی ہے کہ کائنات میں کہیں جامد بے جان اور بے شعور ہستی نہیں ہے، کیونکہ بے جان اور بے شعور ہستی کا ذکر و تسبیح کرنا عقلاً ممکن نہیں، اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا کسی شے کے شعور کو سمجھنے اور معلوم کرنے کے لیے کچھ مادی ذرائع یعنی آلات سے مدد لی جا سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نہ تو ایسے آلات اس وقت موجود ہیں اور نہ شاید آئندہ پیدا کیے جا سکیں گے، انسانوں اور حیوانوں کے شعور کو اس طرح نہیں معلوم کیا جا سکتا بلکہ عقل سلیم کے ذریعے سمجھا جاتا ہے، اس لیے نباتات اور جمادات کے شعور و احساس کو آلات کے ذریعے سمجھنے کا کوئی امکان نہیں ہے، البتہ عقل سلیم کے ذریعے سمجھا جا سکتا ہے، مثلاً نباتات کے شعور کو چند باتوں پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے، پودوں کا جڑیں پیدا کرنا، اور ان کے ذریعے غذا فراہم کرنا، اس کا ادراک رکھنا کہ اگر غذا قریب میں موجود نہیں تو زمین میں کہیں نہ کہیں موجود ہے اور اپنی جڑوں کو دور دور تک پہنچانا، بعض درخت اپنی بقا کے لیے کانٹے پیدا کر لیتے ہیں، بعض پھلوں اور پتوں کی حفاظت کے لیے ان میں کڑواہٹ پیدا کر دیتے ہیں، اور یہ علم رکھتے ہیں کہ وہ اس طرح سے جانداروں سے محفوظ رہیں گے، پھر جانداروں میں بقائے نسل اور افزائش نسل کی خواہش ہوتی ہے یہی خواہش مکمل طور پر نباتات میں بھی پائی جاتی ہے، اپنی نسل پھیلانے کے لیے درختوں نے بیجوں کے انتشار

کے جو مختلف طریقے اختیار کیے ہیں ان سے عقل حیران رہ جاتی ہے، بعض درخت بیجوں میں پر پیدا کر دیتے ہیں اور ان کو میٹھا اور لذیذ بنا دیتے ہیں تاکہ انسان انھیں کھائیں اور جہاں بیج پھینک دیں وہاں ان بیجوں سے درخت اگ آئیں، بعض پھلوں کے بیجوں میں سختی پیدا ہوتی ہے تاکہ انھیں کھایا نہ جا سکے، ان کے کیمیائی اجزاء ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کو نگل جائے تو وہ ہضم نہیں ہوتے اور فضلے کے ذریعے نکل جاتے ہیں اور جس جگہ وہ گرتے ہیں وہاں درخت پیدا ہو جاتے ہیں، بعض درخت اپنے بیجوں میں نرم کانٹے پیدا کر دیتے ہیں جو (گزرنے والے) جانوروں کی دم میں لپٹ جاتے ہیں اور جہاں گرتے ہیں وہاں درخت پیدا ہو جاتے ہیں بعض درختوں کے پھل سوکھ کر زور سے پھٹتے ہیں اور بیج منتشر ہو جاتے ہیں، بعض کے بیج اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں کہ ہواؤں سے اڑتے ہیں اور جہاں گرتے ہیں درخت پیدا کر دیتے ہیں غرض درختوں نے بیجوں کے انتشار کے بے شمار طریقے اختیار کیے ہیں، یہ سب بغیر شعور کے کیسے ممکن ہے؟ پھر نباتات میں [illegible] ان میں کیسے پیدا ہو گئی، آج کل ماہرین نباتات کا خیال ہے کہ بعض قسم کی موسیقی سے پودوں کی نشوونما بڑھ جاتی ہے، اگر شعور نہیں تو موسیقی کیسے اثر کرتی ہے؟

اگر کائنات کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بیشتر چیزیں رنگوں اور نقوش کی تصویریں اور مرقعہ فطرت کا جمال کسی مصور کی قدرت کاملہ کا آئینہ دار ہے، ان سے بڑھ کر عمل تخلیق کا تسلسل اور صناعی کا کمال کسی حکیم مصور کے ذہن یا فن کارانہ دماغ کو ظاہر کرتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ ایک مصور کو اعلیٰ درجہ کی تصویر بنانے میں کس قدر دماغ سوزی اور کد و کاوش کرنی پڑتی ہے، جب فن کار دماغ کے بغیر منقوش قرطاس پر خوبصورت نقش نہیں بن سکتے تو مصور ہستی کے پاس (اس) قدر خوشنما نقوش کے نمونے رنگین و دلکش پھولوں، مرغزاروں، خوشنما پھلوں، جسموں اور پتھروں [illegible]

حیوانوں کی ہیئت اور پرندوں کے رنگ برنگ خوشنما نقوش دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے) جانوروں اور انسانوں کا یہ جاذب نظر روپ ایک فن کار دماغ کے بغیر کیسے ممکن ہے۔ اور بغیر کسی غور و فکر کے اس قدر باقاعدگی، تناسب و توازن اور تہذیب و تنظیم کا خود بخود پیدا ہو جانا خلاف عقل ہے۔ اگر یہ سب کچھ غیر شعوری طور پر ہو رہا ہے تو اس کا بے ربط و نظام ہونا ضروری تھا۔

ستاروں کا نظام دیکھئے جن کی باقاعدگی اور تنظیم کے فہم و ادراک سے ماہرین فلکیات کا ذہن رسا بھی عاجز ہے۔ آسمان تو ایک بحر بے پایاں ہے خود انسان کی چھوٹی سی ہستی ایک چیستان ہے۔ زمین و آسمان کے قلابے ملانے والی اور ستاروں پر کمند ڈالنے والی عقل و نظر اس میں کیسے پیدا ہو گئی؟ اس کی عقل و دانش سے قطع نظر اگر جسم ہی کو دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ تمام اعضاء و جوارح کی ساخت، ان کے تناسب اور ان کے اعمال و وظائف کی تخصیص کس نے کی؟ غیر شعوری طور پر تقسیم کار کس طرح ممکن ہے؟ اس قسم کی سب شواہد باتوں پر غور کیا جائے تو کسی چھپے ہوئے غور و فکر کرنے والے ذہن و دماغ کا وجود ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اسی لیے حکمائے مشرق و مغرب کا خیال ہے کہ پردۂ وجود کے اندر کوئی کار فرما ذہن ضرور موجود ہے، جو وجود و عدم دونوں حالتوں میں کار فرما ہے۔

اوپر یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ توانائی عالم وجود اور کتم عدم دونوں میں موجود اور کار فرما ہے۔ پھر یہ سوال اٹھا کہ وہ بے جان ہے یا ذی حیات؟ دور جدید کے حکما کا خیال ہے کہ بے جان و بے شعور مادہ سے جانداروں کا وجود ممکن نہیں۔ اس لیے توانائی کا بھی بے جان و بے شعور ہونا ناممکن ہے۔ کسی ذی حیات کے بارے میں یہ تصور کہ وہ چلتی پھرتی ہے، غذا اور سانس لیتی ہے، اور اولاد پیدا کرتی ہے بہت محدود تصور ہے۔ قرآن حکیم نے خدا کو "حی" یعنی زندہ بتایا ہے، لیکن ان معنوں میں اور زندگی کی ان صفات کے ساتھ خدا کو زندہ کہنا انتہائی لغو اور مہمل بات ہوگی۔ خدا زندگی کی خصوصیات

کے بغیر بھی ہے، اس لیے اگر توانائی بھی ان خصوصیات کی حامل نہ ہو تو اس کے زندہ ہونے پہ کیوں شک کیا جائے۔ توانائی اگرچہ مادی اشکال و صور اختیار کرتی ہے مگر خود مادے کی تعریف میں نہیں آتی، وہ نظر آتی ہے اور نہ محسوس ہوتی ہے، اور جس طرح انسان کے بھیجے میں دماغ (مائنڈ) موجود رہتا اور انسانی جسم اور اعضا کو حرکت میں لاتا ہے اور مادے کی تعریف میں نہیں آتا، اسی طرح وہ مائنڈ جو عالم وجود میں موجود اور عمل پیرا ہے، مادے کی تعریف میں نہیں آتا، اسی کو خدا کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

چنانچہ مشرق و مغرب کے بیشتر حکما اور صوفیائے کرام نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وجود خداوندی ہر شے کی اصل، ہر شے پر محیط اور ہر شے میں ساری ہے، وہ تمام کائنات کے اندر اور اس کے باہر ہر جگہ موجود ہے۔ تمام مظاہر میں اسی کا ظہور ہے، وہی کائنات کی تمام اشکال میں جلوہ گر ہے، کلام مجید کی آیات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ — اللہ ہی اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے،
وَالْبَاطِنُ (۳ : ۵۷) — باطن ہے۔
فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (۲:۱۱۵) — جہاں کہیں رخ کرلو وہیں خدا کا سامنا ہے۔
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا (۴:۱۲۶) — خدا ہی سب چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

پہلی آیت میں "هو الظاهر" سے صوفیہ مراد لیتے ہیں کہ جو کچھ ظاہر ہے یعنی عالم وجود کی صورت میں ہے، وہ خدا ہی کے وجود کی نمائش ہے۔ دوسری آیت کو اس خیال کی تائید میں پیش کرتے ہیں کہ کائنات مادی میں اللہ تعالیٰ ہر طرف بالذات موجود ہے، تیسری آیت سے اللہ تعالیٰ کی احاطت ذاتی مراد لیتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے قرب ذاتی کی طرف بھی چند آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ		جب میرے بندے میرا حال تم سے پوچھیں
فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (۲ : ۱۸۶)		تو کہہ دو کہ میں ان کے قریب ہی ہوں۔
وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ		ہم تو اس کی (انسان کی) شہ رگ سے
الْوَرِیْدِ (۱۶ : ۵۰)		بھی زیادہ قریب ہیں۔

ان آیات سے صوفیہ حق تعالیٰ کا قرب ذاتی مراد لیتے ہیں، علم کے ذریعہ نہیں کیونکہ کسی شے کا محض کمل علم رکھنا اس سے قربت نہیں کہلا سکتا،

صوفیہ کا خیال ہے کہ حق تعالیٰ نے جب اپنے آپ کو ظاہر کرنا چاہا تو کائنات نمودار ہوئی یعنی اسی کی "وحدت" نے اپنے آپ کو عالم کثرت کی صورت میں ظاہر کیا، "وحدت" حق تعالیٰ کی اور "کثرت" کائنات کی صفت ہے، لیکن وحدت ہی کثرت کی شیرازہ بند ہے، کثرت عیاں اور وحدت نہاں ہے، وحدت حقیقت اور کثرت اس کے شیون ہیں، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی نگاہ میں یہ عالم کثرت کیوں نمایاں ہے؟ اس کی نظر امتیازات اور عقل تعینات میں کیوں گم ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ نظر محدود اور عقل محصور ہے، دراصل کثرت اعتبار نظر ہے اور تعینات عقل کے حدود کا نتیجہ ہیں، اس لیے عقل اور نظر کثرت کو دیکھتی اور وحدت تک نہیں پہنچتی، اس کے لیے ظاہر تو بے نقاب ہے لیکن باطن پر حجاب ہے جس طرح ہر شے میں توانائی موجود ہونے کے باوجود نظر نہیں آتی، کیونکہ ہر شے ظاہر میں مادہ اور حقیقت میں توانائی ہے، اسی طرح عالم کثرت کی حقیقت وحدت اور وحدت کا ظاہری روپ کثرت ہے، کثرت میں وحدت کو سمجھاتے ہوئے امام غزالی کہتے ہیں کہ بعض چیزیں کسی خاص مشاہدے سے دیکھو تو بہت ہیں اور کسی اور اعتبار سے دیکھو تو واحد ہیں، مثلاً انسان کے اعضاء تو بہت ہیں مگر انسان واحد ہے، انسان کی مثال اگرچہ بالکل مطابق نہیں ہے مگر

اس سے عقیدہ سے میں کثرت کے واحد ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

عقل اور نظر دونوں زمان و مکان میں اسیر ہیں، اور ماسوائے زمان و مکان نہ نظر دیکھتی نہ عقل سوچتی ہے، زمان و مکان کا تصور دراصل عقل و نظر کے حدود کا نتیجہ ہے، قرآن حکیم کی آیت هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ اس محدود عقل و نظر پر ایک ضرب ہے، کیونکہ حقیقتاً جو اول ہے وہ آخر نہیں ہو سکتا اور جو آخر ہے وہ اول نہیں ہو سکتا، اسی طرح نہ ظاہر باطن ہو سکتا ہے، نہ باطن ظاہر کہلا سکتا ہے، کیونکہ جو سفید ہے وہ سیاہ، جو سیاہ ہے وہ سفید، جو بلند ہے وہ پست اور جو پست ہے وہ بلند نہیں کہلا سکتا، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنا وصف اول، آخر، باطن، ظاہر کیوں بیان کیا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل محدود کو اس کے حدود کے لحاظ سے ہی خدا کی لا محدودیت سمجھانا تھا، اور ان تعینات میں تضاد ہونے کے باوجود ان میں ایک وحدت ظاہر کرنا تھا، جس طرح اس تضاد میں ایک وحدت ماننا پڑتی ہے، اسی طرح اس عالم کثرت میں بھی اگرچہ مختلف اور متضاد اشیاء موجود ہیں، پھر بھی ان میں ایک وحدت ماننا پڑے گی اور یہ وحدت حق تعالیٰ ہی کی ہوگی،

لیکن صوفیہ کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ کائنات ہستی کی حقیقت و حیثیت خدا سے الگ اور غیر حق ہے، اس کو خدا کی ذات میں شریک کرنا شرک ہے، جو محض غلط فہمی ہے، کیونکہ کائنات کو الگ حقیقت اور علحدہ وجود مان کر اس کو خدا کی ذات میں شریک نہیں کیا جاتا، بلکہ اسکے الگ وجود ہی کو تسلیم نہیں کیا جاتا، یعنی وجود صرف ذات حق کا ہے، اس سے ہٹ کر اور کوئی وجود نہیں، ایسی صورت میں شرک کا سوال نہیں پیدا ہوتا،

شرک کو سمجھاتے ہوئے چوتھی صدی ہجری کے مشہور صوفی شیخ ابو الحسن علی ہجویری کہتے ہیں کہ توحید خدا کی طرف سے بندے پر اسرار ہے، اور توحید کے اثبات میں کسی دوسرے وجود کو

ثابت کرنا خود شرک ہے" یعنی کائنات کا وجود حق تعالیٰ کا غیر نہیں ہے، اگر اس کو غیر حق اور مستقل وجود ثابت کیا جائے تو دو الگ الگ مستقل وجود ثابت ہوں گے اور کائنات اپنے مستقل اور حقیقی وجود میں اللہ تعالیٰ کی شریک ہو جائے گی، جو سراسر شرک ہے، اس لیے امام غزالی نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو شے قائم بالذات نہیں بلکہ قائم بالغیر ہو اس کا وجود حقیقی نہیں کیونکہ اس کا وجود دوسرے پر منحصر ہے، اس سے ثابت ہوا کہ حقیقت میں سوائے ذات حی قیوم بے ہمتا کے اور کسی کا وجود حقیقی نہیں، وہی اپنی ذات سے قائم ہے، اس کے علاوہ سارے وجود اسی سے قائم ہیں، اسی لیے جن کی بصیرت قوی ہے وہ سوائے خدائے تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں دیکھتے، ان کے نزدیک جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے کو بھی موجود ثابت کرتے ہیں، وہ مشرک ہیں، حضرت بایزید بسطامیؒ کے ایک مرید نے کہا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ صرف خدا کا وجود تھا، اس کے سوا کوئی موجود نہ تھا، یہ سنکر بایزید بسطامیؒ نے فرمایا کہ "اب بھی صرف خدا ہی موجود ہے" یعنی کسی اور کا وجود ثابت نہیں۔

…سان کی نعتیہ شاعری

از جناب سید منظور الحسن صاحب برکاتی فاضل دار العلوم خلیلیہ ٹونک

اصناف شاعری میں "صنفِ نعت گوئی" ایک سخت اور دشوار ترین صنفِ سخن تسلیم کی گئی ہے، اس صنف پر طبع آزمائی کرنے والے شعراء نے ہمیشہ اس راہ کی مشکلات کا اعتراف کیا ہے اور اس کے حق سے عہدہ برآ ہونے میں اپنی دماغی و قلمی تمام توانائیوں کے صرف کرنے کے بعد بھی یہی کہا ہے ؎

لایمکن الثناء کما کان حقہٗ   بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

عرفی جیسے بلند خیال، قادر الکلام شاعر نے جب اس راہ میں قدم رکھا اور اس راہ کی دشواریوں کو مشاہدہ کیا تو بے ساختہ اس کی زبان و قلم سے نکلا ؎

عرفی مشتاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا ست   آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

مطلب یہ ہے کہ دنیا کی کسی معزز و اہم شخصیت کی تعریف و توصیف میں شاعرانہ محاسن کے ساتھ اشعار کا موزوں کر لینا اور مبالغہ آمیز قصائد کہہ دینا تو کوئی مشکل اور دشوار کام نہیں ہے لیکن نعتِ سرورِ کائنات لکھنا ممدوحِ خدا، محبوب رب العلمین، خاتم النبیین، افضل البشر اور صاحب لولاک لما صلی اللہ علیہ وسلم کی ارفع و اعلیٰ شان میں لب کشائی کرنے اور زبان و قلم کو حرکت میں لانے کے لیے شاعرانہ مہارت و کمال کے ساتھ ادب و احترام، خلوص و عقیدت، احساسِ عظمت و رفعت حدود شناسی و مرتبہ دانی کی بھی بڑی شدید ضرورت ہے،

کیونکہ یہ وہ مقدس بارگاہ ہے جہاں جلیل القدر ملائکہ بھی لرزہ براندام نظر آتے ہیں۔

حضور سرور کائنات، فخر موجودات صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع کمال وصفات، برگزیدہ ومقدس ہستی کے اوصاف ومحامد کا بیان، آپ کے اخلاق حمیدہ، شمائل ومحاسن کا تذکرہ نبوت کے حقیقی کمالات کی تصویر کشی، پھر خدا کے ساتھ آپ کا قرب خاص اور مراتب عالیہ کا ذکر، اور اس ذکر میں الوہیت ونبوت کے حدود کا لحاظ، خدا اور اس کے پیارے رسول وحبیب کے مدارج میں فرق وامتیاز، ان سب باتوں کے لیے قدرت بیان اور شاعرانہ کمال کے ساتھ فطرت صالحہ، صحیح اسلامی تصورات سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی دینی ومذہبی معلومات وبصیرت درکار ہے، یہاں بغیر احساس عظمت ورفعت اور بلا واقفیت حدود شریعت، محبت وعقیدت کا اظہار کرنا، ایک قسم کی جرأت رندانہ ودیوانگی ہے، اور بارگاہ سید کونین میں ایسی دیوانگی ناقابل معافی ہے۔

وہی شاعر اس وادی کو کامیابی اور سلامتی سے طے کر جاتا ہے، جو شاعرانہ نزاکتوں پر قدرت رکھتے ہوئے

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

کے اصول کو ملحوظ رکھے اور اپنے جذبات محبت وعقیدت کو بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرنے میں منزل ادب شناسی سے سرمو تجاوز نہ کرے۔

بابائے اردو مولانا عبدالحق، مولانا حالی کی نعت نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"نعت میں وہی ذکر ہونا چاہیے جو خدا کے نبی کے لیے شایان ہے اور جس کے پڑھنے اور سننے سے لوگوں پر روحانی اور اخلاقی اثر پڑے اور معلوم ہو کہ "کمال بشریت" اسے کہتے ہیں"۔

حضرت والی آسی مقدمہ ارمغان نعت میں رقم طراز ہیں کہ

"محبت نبوی اور عشق محمدی کا پاک ولولہ اور مقصد زندگی کا جذبہ ایمان کی شرط ہے اور اسی متاع کی حفاظت جان زندگی اور اس کے اظہار کے لیے ادب کی شرط اولین شرط، کیونکہ آپ کا ادب ہی ایمان و اسلام ہے اور اس سے محرومی کفر، اس ادب کی حقیقت کو سمجھنے کیلیے قرآن پاک پر نظر ڈالنا ضروری ہے، قرآن حکیم میں تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ذکر جہاں کہیں کیا ہے، وہاں ان سب کو ناموں سے پکارا گیا ہے اور ان کے واقعات کا ذکر بھی ان کے ناموں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن ذات مقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں کہیں صرف "عبدہ" اور کہیں صرف "عبداللہ"۔ اور اسی طرح جب رب کائنات نے آپ کو پکارا تو "یا آدم، یا زکریا، یا یحییٰ، یا موسیٰ، یا عیسیٰ یا الیاس کی طرح یا محمد نہیں پکارا، بلکہ کبھی صدائے عزت "یا ایہا الرسل"، اور کبھی طرز محبت "یا ایہا المزمل، یا ایہا المدثر" سے پکارا ہے، اور اپنے بندوں کو "تعزروہ وتوقروہ" (اس کی عزت کرو اس کی توقیر بجا لاؤ) کا حکم دے کر آپ کی عظمتوں کی انتہا بتلا دی، اور یہ معلوم ہوتے ہی عرفی شیرازی کی زبان میں کہنا پڑا ؎

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است (ص ۱۰۰ و ۱۰۱)

اس معیار اور کسوٹی پر اگر شعرائے نعت گو کے کلام کو کسا اور پرکھا جائے تو صرف چند نعت نگار ایسے ملیں گے جو اس معیار پر پورے اتریں گے۔

یہاں ہم ایک ایسے نعت گو، مداح رسول، عاشق نبی اور غلام غلامان آل محمد کی نسبت پر فخر کرنے والے شاعر کے نعتیہ کلام پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جن کی نعتیں اپنے تمام محاسن و لوازم کے ساتھ مثالی ہیں، اور جو خود ایک ریاست کا تاجدار اور حکمران رہا ہے، لیکن

بہت داد عشق شدی شکستہ سب کی جاتی   کہ دیں راہِ فلاں بن فلاں چیزے نیست

وہ تاجداروں کے تاجدار اور شاہنشاہوں کے شاہنشاہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ادنیٰ نوبابری اور خادم ہونے میں دین و دنیا کی سعادت و فلاح سمجھتا ہے۔ اور اس ادنیٰ خدمت پر اس قدر نازاں، آشنا مسرور اور اس درجہ بے نیاز ہے کہ سلطنتِ قیصر و جم بھی اس کے نزدیک بے حقیقت چیز بن گئی ہے۔ چنانچہ وہ خود کہتا ہے ؎

اپنی ٹھوکر میں ہے اب سلطنتِ قیصر و جم   مل گئی خدمتِ دربارِ رسالت ہم کو

اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب   تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا
الیہ من والدہ وولدہ والناس   جب تک کہ اسکا ماں باپ سے اور
اجمعین (رواہ بخاری و مسلم)   سب لوگوں سے زیادہ میری محبت نہ ہو

کے تقاضا اور مطالبہ کی تکمیل و تعمیل میں سرکارِ دو عالم، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ والا صفات کو جان و مال، عزت و آبرو، وقار و تمکنت، اعزا و اقارب، حتیٰ کہ ماں باپ تک سے زیادہ محبوب رکھتا ہے، اور عشقِ نبی و محبتِ رسول کو اپنے ہی لیے نہیں، ہر قلبِ حزیں کے لیے باعثِ تسکین و راحت اور موجبِ طمانیت سمجھتا ہے ؎

آپ کا عشق تسلی دہِ ہر قلبِ حزیں   نور بخشِ نظرِ دیدۂ مشتاق ہیں آپ

وہ انجمِ عشق کے شایاں ہی نہیں ہے   جو دل سے نہ ہو شیفتۂ ذاتِ محمدؐ

میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ماہِ مبارک جب طلوع ہوتا ہے تو اس کے لیے ابدیت میں جشن و مسرت کا پیغام لیکر آتا ہے اور اس کے دل و دماغ پر سرور و کیف کا عالم طاری ہو جاتا ہے

اس بابرکت اور فضل و برکت کے مہینہ میں خصوصیت کے ساتھ ذکرِ رسول

اور وہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متبرک محافل و مقدس مجالس کا بڑی عقیدت و محبت اور احترام سے اہتمام و انصرام کرتا ہے، اور اسی جذبہ کی سرشاری و مستی میں بے اختیارانہ یہ

مری دولت مری جاں محفلِ میلاد پر قرباں   یہ وہ محفل ہے جس کی رونق محفلِ محمد

اس سے میری مراد ٹونک کے ساتویں اور آخری فرمانروا اعلیٰ حضرت نواب اسمٰعیل آج بالقابہ کی ذاتِ گرامی ہے،

حضرت آج رئیس ابن رئیس ہونے کے ساتھ شاعر ابن شاعر بھی ہیں اور ناعت بھی، ریاست و امارت کے ساتھ شاعری اور بالخصوص مدحتِ رسول اکرم صلی اللہ کا ذوق و جذبہ آپ کو وراثت میں ملا ہے،

آپ کے پدر بزرگوار خلد آشیاں امین الدولہ نواب ابراہیم علی خاں بہادر خلیل با رئیس و حکمراں ہونے کے ساتھ اعلیٰ پایہ کے نغز گو شاعر اور مداحِ رسول بھی تھے، حمد کا ایک وافر ذخیرہ آپ کی یادگار ہے، جو اپنے زورِ بیان، شوکتِ الفاظ اور پر عظمت کے اعتبار سے ادب العالیہ کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے ہر ہر لفظ سے عشقِ نبی اور شیفتگی کا جذبہ نمایاں ہے،

حضرت خلیل کا جذبۂ حبِ رسول ان کی اولاد اور ان کے صاحبزادگان میں ہے، ان میں جناب آج سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں ہیں،

آپ چونکہ خود بھی ایک مایۂ ناز اور قادر الکلام شاعر ہیں، اس لیے اپنے عشق و محبتِ رسول کے پرخلوص و پرسوز جذبہ کو نظم و شعر کے قالب میں ایسے مؤثر انداز سے کہ سننے والا اور پڑھنے والا بھی بغیر متاثر ہوئے نہیں رہ سکتا،

آپ کے نعتیہ کلام میں عقیدت و احترام کا جو جوش و جذبہ پایا جاتا ہے وہ آپ کا دل

حضور سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی ذاتِ ستودہ صفات سے آپ کو جو خلوص، جتنی حسن عقیدت اور جو عشق ہے، اس کا اندازہ اور مشاہدہ آپ کی منعقد کردہ محافلِ میلاد اور مجالسِ ذکرِ رسول میں ہوتا ہے۔ ان گنہگار آنکھوں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ ذکرِ رسول کے وقت حضرت تاجؒ کی آنکھیں اشکبار رہتی ہیں، اور جب تک یہ مقدس مجالس جاری رہتی ہیں حضرت تاجؒ آنسوؤں کے دُرِ شہوار بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کرتے رہتے ہیں، ان کا دامن اور رومال آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے، وہ انتہائی ادب و احترام سے دو زانو نشست فرما ہوتے ہیں، اور سراپا عجز، سراپا انکسار، سراپا نیاز، سراپا ذوق، سراپا شوق، ہمہ تن گوش، ہمہ تن سوز، پیکرِ تہذیب، مرقعِ تادیب اور مجسمۂ اخلاص و عقیدت کی صورت میں سیرتِ مقدسہ کا بیان سماعت فرماتے ہیں،

قاضی عیاضؒ "شفا" میں فرماتے ہیں کہ جب آپ کا ذکر شریف کسی موقع پر ہو تو اہلِ ایمان پر اس ذکرِ پاک کی تعظیم و تکریم اسی طرح واجب ہے، جیسے خود آپ کی تعظیم و تکریم حالتِ حیاتِ مبارکہ میں کیجاتی تھی۔

یہ ہمارا عقیدہ و ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثمرہ دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں بھی۔ آخرت میں جو ثمرہ ملے گا وہ اتنا ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس سے بڑھ کر کونین میں اور کوئی ثمرہ ہو ہی نہیں سکتا۔

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو حضور انورؐ اپنے روبرو منبر پر کھڑا کرتے، اور ان کیلئے دعا فرماتے کہ اللھم ایدہ بروح القدس، وہ تو خیر جلیل القدر صحابی تھے، کعب بن زہیر جو ایک شاعر اور گستاخیوں کے جرم میں واجب القتل قرار دیے جا چکے تھے، جب دربارِ نبویؐ میں دفعۃً معذرت خواہ ہو کر حاضر ہوئے، اور اپنا مشہور قصیدہ "بانت سعاد" شروع کیا اور

یہ شعر پڑھا ۔

ان الرسول لنور یستضاء بہ   مہند من سیوف اللہ مسلول

بے شک اللہ کے نبی ایک ایسا نور ہیں کہ جن کی ذات سے کائنات روشنی حاصل کرتی ہے، اور وہ خدا کی ایک برہنہ تلوار ہیں جس نے بدینی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک دیا ہے۔

تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش ہو کر اپنی ردائے مبارک اتار کر ان کو مرحمت فرمادی،

صاحب قصیدۂ بردہ نے فالج میں مبتلا ہونے کے بعد جب قصیدہ تحریر کیا، تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں ان کے پاس تشریف لائے اور اپنا دست مبارک ان کے بدن پر پھیرا، اس کی برکت سے ان کو شفا ہو گئی،

حضرت تاج کو اس دنیا میں جو اعزاز و وقار حاصل ہے، وہ بھی اسی محبت کا ثمرہ ہے جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

تاج پر جب آپ کے الطاف کا سایہ پڑا   زور دوراں کا نہ کچھ بھی اس کے آگے چل سکا
آپ کے صدقے میں تاج و تخت کا مالک بنا   یہ سعادت بھی میسر ہو سکے بہر دوام
حاضر دربار ہو یہ تاج با شوق تمام   اور پڑھے باچشم پرنم الصلوٰۃ والسلام

اور آخرت کے لیے ان کو امید وار رہنا چاہیے کہ انشاء اللہ معیت رحمۃ للعالمین اور رفاقت شفیع المذنبین جیسا گرانقدر اور اعلیٰ ثمرہ انھیں حاصل ہو گا جس کی بشارت حضرت انس ابن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت سے ملتی ہے جس کو امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نقل کیا ہے:

حضرت انس ابن مالک سے روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے لیے بھلا تو نے کیا سامان تیار کیا ہے؟

"اس نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے نہ بہت سی نمازوں کا توشہ ہے نہ روزوں کا، نہ صدقہ کا، ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبت میرے دل میں ہے، یہ سنکر آپ نے فرمایا

انت مع من احببت — پھر قیامت میں تو ان ہی کے ساتھ ہوگا جن سے تجھے محبت ہے

صاحب ترجمان السنۃ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ آخری جملہ (انت مع من احببت) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی موقعوں پر ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ جب صحابہ نے ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا تھا جو کسی جماعت سے محبت تو رکھتا ہے، مگر اس کے جیسے عمل نہیں کر سکا، آپ نے ان کے جواب میں بھی فرمایا المرء مع من احبّ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں محبت کا صلہ معیت ہے، اور ایک عاشق کی منتہائے تمنا اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، اسی لیے بعض روایات میں حدیث مذکور کے آخر میں ہے، "قال انس فما رأیت المسلمین فرحوا بشیء بعد الاسلام فرحہم بہا" انس فرماتے ہیں کہ میں نے اسلام کے بعد صحابہ کو اتنا خوش ہوتے ہوئے کسی بات پر نہیں دیکھا جتنا کہ اس خوشخبری پر۔

یہ خوشخبری ہر محب رسول، عاشق نبی اور مداح محبوب رب العالمین کے لیے آج بھی بہت بڑی خوشخبری ہے بقیامت کے دن معیت رسول اور رفاقت شفیع المذنبین سے بڑھ کر اور کونسی نعمت ہو سکتی ہے۔ اس انعام خداوندی پر جس قدر بھی ایک مداح رسول اور ثناخوان مصطفےٰ جس قدر بھی فخر کرے بجا ہے۔

اور یہی حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک روایت میں اس کی تصریح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "من احبنی کان معی فی الجنۃ" جو کوئی مجھ سے محبت رکھتا ہے وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

حضرت تاج کی نعت رسالت مآب سے محبت و عقیدت اور ذکر رسول اکرم سے شیفتگی ان کی نعتیہ شاعری کا سرمایہ ہے انشاء اللہ ان کے لیے بخشش کا ذریعہ ہوگا۔

قیامت کے دن جب وہ بارگاہ رسالت مآب میں اپنی بشری کمزوریوں، خطاؤں اور لغزشوں پر ندامت کے آنسو بہاتے ہوئے عرض کریں گے ؎

یہ حاضر ہوا ہے بصد انکساری ۔۔۔ ذرا کیجئے اس کی کچھ پردہ داری

نہ ہو حشر میں اس کی کچھ بے وقاری ۔۔۔ ہے تاج آپ کا امتی یا محمدؐ

ز سرتا بپا رحمتی یا محمدؐ

نظر جانب ہر گنہگار داری

تو انشاء اللہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی رأفت و محبت اپنے آغوش میں لے لیگی، اور جب وہ محبوب رب العالمین کے ظلِ شفاعت میں کھڑے ہو کر بارگاہ رب جلیل میں بزبانِ حال عرض رسا ہوں گے ؎

کوئی ہے زہد پہ نازاں کوئی عبادت پر ۔۔۔ یہاں توسلے مرے آموزگار کچھ بھی نہیں

ترے کرم کا الٰہی مرے گناہوں کا ۔۔۔ حساب کچھ بھی نہیں، شمار کچھ بھی نہیں

خدا کا رحم ہے بخشش کے واسطے درکار ۔۔۔ سوائے فضل خداوندگار کچھ بھی نہیں

تو اس کی رحمت و مغفرت کی بارش سارے گناہوں کو دھو دے گی۔

حضرت تاج کی نعت گوئی کے اس پس منظر، ذکر رسول سے آپ کی شیفتگی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی سچی اور پرخلوص عقیدت و محبت اور اس کے نکتے کے تذکرے کے بعد احادیث نبوی کی روشنی میں ان کے نعتیہ کلام کا جائزہ لیا جائے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے ابن آدم جب تک تو مجھ سے گناہوں کی بخشش مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا، میں تجھ کو بخشوں گا، تو نے جو بھی برا کام کیا ہوگا مجھے اس کی پروا نہیں ہوگی، یعنی تو چاہے کتنا ہی بڑا گنہگار ہو، تجھے بخشنا میرے نزدیک کوئی بڑی بات نہیں ہے ——— اے ابن آدم! اگر تیرے گناہ آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائیں اور تو مجھ سے بخشش چاہو تو میں تجھ کو بخش دوں گا، اور مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں ہوگی۔ اے ابن آدم! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے ساتھ گناہوں سے بھری ہوئی زمین ہو تو میں تیرے پاس بخشش و مغفرت سے بھری ہوئی زمین لیکر آؤں گا، بشرطیکہ تو نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا ہو۔ یعنی شرک میں مبتلا نہ ہوا ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس شخص نے یہ جانا کہ میں گناہوں کو بخشنے پر قادر ہوں تو میں سے بخش دوں گا اور مجھے اس کی کوئی پرواہ نہ ہوگی۔ بشرطیکہ وہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ بندہ کا اس بات کو جاننا کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی مغفرت پر قادر ہے، اس کی مغفرت و بخشش کا سبب ہے، کیونکہ جو شخص یہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ گناہوں کی بخشش پر قدرت رکھتا ہے، وہ اس سے امید رکھتا ہے اور جو شخص کریم سے امید رکھتا ہے، کریم اسے محروم نہیں رکھتا، ایک اور حدیث قدسی ہے کہ

انا عند ظن عبدی بی — میں اپنے بندہ کے گمان کے قریب ہوں جو وہ میرے بارے میں رکھتا ہے۔

مذکورہ بالا احادیث کو پڑھیے اور پھر حضرت تاج کی مناجات کے یہ بند پڑھیے:

اے خدا تو ہی مرا معبود ہے | اے خدا تو ہی مرا مطلوب ہے
اے خدا تو ہی مرا مقصود ہے | میں ہی عابد تو مرا محمود ہے

بادشاہا جرم ما را درگزار
ما گنہگاریم تو آمرزگار

دافعِ امراض روحانی ہے تو | دافعِ حزن و پریشانی ہے تو
دافعِ رنج و گرانجانی ہے تو | واقفِ اسرارِ پنہانی ہے تو

بادشاہا جرم ما را درگزار
ما گنہگاریم تو آمرزگار

باوجود اس کے کہ ہے تو بے نیاز | اپنے بندوں کا ہے تو ہی چارہ ساز
جانتا ہے تو مرے سربستہ راز | ہے تو ہی میرا کفیل و کارساز

بادشاہا جرم ما را درگزار
ما گنہگاریم تو آمرزگار

قیامت کے ہولناک دن محشر میں پیش آنے والے جو واقعات کی اطلاع احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں وضاحت کے ساتھ دی گئی ہے اور جن پر ایک مومن کو ایمان لانا اور یقین کرنا ضروری ہے ان میں سے ایک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت بھی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کئی قسم کی ہوگی اور ایسا ہوگا سب سے پہلے جبکہ سارے اہلِ محشر خداوند ذوالجلال کے جلال سے سراسیمہ اور خوفزدہ ہو رہے ہوں گے اور کسی کو لب کشائی کی جرأت و ہمت نہ ہوگی اور حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک تمام جلیل القدر اولوالعزم پیغمبر بھی نفسی نفسی کے عالم میں ہوں گے اور کسی کو کہنے

شفاعت کی جرأت نہ کر سکیں گے، تو اس وقت تمام اہل محشر کی درخواست پر اور ان کی پریشانی دیکھ کر متاثر ہو کر شفیع المذنبین محبوب رب العالمین صلی اللہ علیہ وسلم ہمت کر کے اللہ کے لطف و کرم پر اعتماد کر کے آگے بڑھیں گے اور پوری نیازمندی اور حسن ادب کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں اہل محشر کے لیے شفاعت فرمائیں گے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق یہ آیت تلاوت فرمائی:

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ	یعنی اے میرے پروردگار ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے میں ذریعہ بنے آدمی گمراہ ہو چکے ہیں جو لوگ میری پیروی کریں وہی میرے ہیں۔ پس الٰہی تو میں تجھ سے عرض کرتا ہوں کہ تو انکو بخش دے

اور عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا جو قرآن پاک میں ہے

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ	اے اللہ اگر آپ میری امت کے ان لوگوں کو عذاب دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں یعنی عذاب (سزا کا آپ کو پورا حق ہے)

یہ دونوں آیتیں تلاوت فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو یاد کیا اور دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے اور کہا اے میرے رب میری امت، میری امت، اور آپ رو پڑے، اللہ تعالیٰ نے جبرئیل علیہ السلام کو فرمایا تم محمد کے پاس جاؤ، اور اگرچہ تمہارا رب سب کچھ خوب جانتا ہے مگر تم جا کر ان سے دریافت کرو کہ ان کے اس رونے کا کیا سبب ہے۔ پس جبرئیل

۔۔۔ سے پوچھا، آپ نے جبرئیل کو وہ بتلا دیا، جو حضرت عرض کیا تھا

۔۔۔ کا سبب امت کی فکر ہے، جبرئیل نے جاکر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا

۔۔۔ جبرئیل کو فرمایا کہ محمد کے پاس جاؤ اور ان کو ہماری طرف سے کہو کہ تمہاری امت

کے بارے میں ہم تمہیں راضی اور خوش کر دیں گے اور تمہیں رنجیدہ و غمگین نہیں کریں گے۔" (مسلم)

مذکورہ بالا حدیث کو سامنے رکھکر حضرت تاج کے حسب ذیل اشعار پڑھیے ؎

صرف امت کی شفاعت کا ہے جذبہ دل میں اللہ اللہ رے اذعانِ رسولِ عربی
مظہرِ ربِ غفور، تاج کے پیارے رسول شافعِ یومِ النشور تاج کے پیارے رسول
ایک گنہگار بھی مایوس وہراساں نہ تھا عرصۂ حشر میں ہونگے نگراں میرے نبی
اے راحتِ نشیع رواں، اے دارُوئے دردِ نہاں اے حامیٔ دل خستگاں، اے شافعِ کل مذنبیں

ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ میں ہے کہ "حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری شفاعت میری امت کے ان لوگوں کے حق میں ہوگی جو کبیرہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے۔"

یہ حدیث بھی خطاکارانِ امت اور اہلِ معاصی کے لیے اپنے اندر بڑی زبردست بشارت رکھتی ہے، اور حضرت تاج کے حسب ذیل اشعار کی تائید کرتی ہے ؎

ہر گنہگار یہ کہتا ہے کہ تریاق ہیں آپ زہرِ عصیاں کا اثر آپ شفاعت سے کیا
جب طبیبِ شفا ہے ذاتِ رسولؐ رنج سے کیوں رہیں رنجور
علاجِ زخمِ عاصیاں ہیں محمدؐ دوائے دلِ بیکساں ہیں محمدؐ
طبیبِ دردِ روحانی محمدؐ محمدؐ ہیں شفیعِ روزِ محشر

مذکورہ بالا سطور میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں حضرت تاج کے نعتیہ

کی وضاحت و صراحت کی گئی ہے، اس سے جہاں ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی نعتیہ شاعری کس درجہ احادیث نبوی سے مناسبت رکھتی ہے، اور آپ نے نعت کہتے وقت کس حد تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی کے مفہوم کو پیش نظر رکھا ہے، وہاں دوسری طرف یہ بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے تاجدار مدینہ، شافع روز جزا، محبوب رب العٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم کے برگزیدہ محامد و محاسن، کمالات نبوت، اخلاق حمیدہ اور گنہگاران امت کے ساتھ آپ کی رحمت و شفقت کے تعلق کو بیان اور اپنے جذبات عقیدت و محبت کا اظہار کرتے ہیں کس قدر پاس ادب، تعلیمات شرعی، تصورات اسلامی، عقائد مذہبی، حدود شناسی اور آداب نعت گوئی کا لحاظ رکھا ہے، اور پھر اس سب کے باوجود آخر میں یہ کہہ کر ؎

کون جانے کہ کیا ہے ذات رسول	عالم الغیب کے سوا اے تاج

اپنے انتہائی عجز و انکسار کا اعتراف و اقرار کیا ہے۔

آخر میں حضرت تاج کے متفرق نعتیہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

سارے عالم پر گھٹائیں رحمتوں کی چھا گئیں	جب جہاں میں رحمۃ للعالمیں پیدا ہوئے
عام تھا دنیا میں معبودان باطل کا اثر	تک رہے تھے آگ پانی خاک پتھر اور شجر
کوہ و دریا، برق و باراں، انجم و شمس و قمر	الغرض کفر و ضلالت جب ہوئے تھے جلوہ گر
آپ نے لہرا دیا ارض عرب میں یہ اکلام	وحدت خالق کا پرچم الصلوٰۃ والسلام
جو رضواں نے دیکھی بہار مدینہ	تو سب جنتیں کیں نثار مدینہ
جدھر تاج اٹھ جائیں میری نگاہیں	مرے سامنے ہو دیار مدینہ
جدھر دیکھئے جلوہ آرا محمدؐ	جدھر دیکھئے آشکارا محمدؐ
نہ پرہیزگاری نہ زہد و عبادت	ہے بخشش کا میری سہارا محمدؐ

اور مغفرت اور رحمت خدا کی — جب مدح آپ کا ہو اشارہ محمد

سب بند خزاں ہو گئے دنیا کے گلستاں — سر سبز گلستانِ رسولِ عربی ہے
اس ہاتھ میں کوئی نہیں سکتا ہے اٹھانے — جس ہاتھ میں دامانِ رسولِ عربی ہے
لے آج یہ سب حسن حسینانِ جہاں کا — اک پرتوِ رخسارِ رسولِ عربی ہے

جس سے حاصل ہو نجاتِ آخری — بالیقیں وہ اقتدائے مصطفےٰ
آج اس کا رتبۂ عالی نہ پوچھ — ہو گیا جو خاکِ پائے مصطفےٰ

یہی میرا ایمان یہی میرا مذہب — تلاشِ خدا جستجوئے محمد
جھکے تاجداروں کے سر جن کے آگے — وہ دنیا میں ہے صرف کوئے محمد

یہ سارا جہاں فیضِ تجلائے نبی ہے — ہر ذرہ نقابِ رخِ زیبائے نبی ہے
واعظ تجھے جنت کے نظارے ہوں مبارک — نظروں میں مری گنبدِ خضرائے نبی ہے
مانا کہ عبادات ہیں بخشش کا ذریعہ — کافی مری بخشش کو تولائے نبی ہے
ممکن ہی نہیں حشر میں نہ ہو اس کی شفاعت — اب آج تہِ دل سے جو شیدائے نبی ہے

جامعِ ہر کمالِ آفاق — قابلِ ہر ثنا ہے ذاتِ رسول
عالم الغیب کے ہوا مشتاق — کون جانے کہ کیا ہوا ہے وصول

جلوۂ شمعِ بہر جلوہ رسولِ عربی — جس کا سایہ نہیں وہ نور رسولِ عربی
کر دیا جس نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو — سوئے توحید محمد رسولِ عربی

تجلیِ روئے محمد کا صدقہ — یہ سب رونقیں محفلِ دوسرا کی
حمایت پہ جب خواجۂ دوسرا ہے — تجھے فکر کیا آج روزِ جزا کی

عراق میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از

جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے پی ایچ ڈی لکچرر شعبۂ عربی [illegible] یونیورسٹی [illegible]

عراق نے جدید عربی شاعری کو پروان چڑھانے میں غیر معمولی حصہ لیا ہے، اس سرزمین سے جدید شاعری کے ایسے عظیم شعراء شاعری کی بساط پر رونق افروز ہوئے جنھوں نے فکر و فن کو نئے پیمانے عطا کئے اور عربوں کے سامنے نئے اسلوب و خیالات پیش کیے، ان میں جمیل زہاوی، معروف رصافی اور کاظمی نے اپنی شاعری سے پیامبری کا کام لیا ہے، ان کے یہاں اسلامیت، وطنیت اور عربیت کے جذبات کا ایسا متوازن امتزاج ہے جیسے گلاب کی پنکھڑی کا رنگ جس میں یہ امتیاز دشوار ہوتا ہے کہ کہاں رنگ ہلکا ہے اور کہاں سے شوخی شروع ہوتی ہے، اس بنا پر یہ فیصلہ دشوار ہے کہ ان کے کلام پر اسلامیت غالب ہے یا قومیت، رصافی اور کاظمی کے کلام میں زہاوی کے کلام کے مقابلے میں اسلامی رنگ زیادہ نمایاں ہے، زہاوی آزاد خیال شاعر ہے، عراقی شعراء کے یہاں مذہبیت زیادہ نظر آتی ہے، امت اسلامیہ کے زوال کی داستان، اصلاح کی کوشش، تعلیمی و تمدنی میدان میں آگے بڑھنے کے حوصلا اور معاشرتی و سیاسی زندگی میں بلندی کے خیالات سے عراقی شعراء کا کلام مملو ہے،

دور جدید کی شاعری کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ شاعری پوری طرح زندگی کی ترجمان بن گئی ہے جس میں مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی مسائل شامل ہیں، جن سے

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی پوری تاریخ مرتب کیا سکتی ہے۔ عراقی شاعری میں رومانیت کے بجائے حقیقت پسندی غالب نظر آتی ہے۔ رومانیت کے اثرات لبنانی اور مصری شعرا میں زیادہ ہیں۔ عراقی شعرا نے تلخ حقیقت کی ترجمانی کا بھی حق ادا کیا ہے۔

تاریخی پس منظر | دور جدید سے قبل عرب کا پورا ملک ترکی خلافت میں شامل تھا۔ عراق بھی شام اور لبنان کی طرح ترکوں کی حکومت میں تھا، اور عرب ترکوں کی حکومت کو غلامی سمجھ کر اس سے آزاد ہونے کے متمنی تھے، اس کے لیے انھوں نے ترکوں سے بغاوت کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصر، عراق اور شام وغیرہ تمام عرب ملکوں کو ترکوں کے بجائے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی غلامی سے سابقہ پڑا، عراق میں بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ یہاں جنگ عظیم میں ترکوں اور انگریزوں میں بڑے معرکے ہوئے۔ ان میں عراقیوں نے ترکوں کا ساتھ دیا، انگریزوں کو ترکی کی جنگی تیاریوں کا علم ہو چکا تھا، اس لیے انھوں نے ۱۹۱۵ء میں اپنی فوجیں بصرہ میں اتار کر اس پر قبضہ کر لیا۔ عراق کے علماء نے جہاد کا فتویٰ دیا۔ جمیل زہاوی نے بھی ترکوں کو سامراجیوں سے ٹکر لینے پر ابھارا، ان الفاظ میں ان کو جوش دلایا۔

الا ایها الجیش الهمام العسکر … تقدم فانت المستطیع المظفر

اے زبردست لشکر آگے بڑھ، تو ہی فتح مند ہوگا۔

[illegible] … [illegible]

جرمن آجکل تمام قوموں سے [illegible]

[illegible] … [illegible]

[illegible] کامیاب ہوگی [illegible]

یہ ایک دردمند شاعر ہے جو اعلان کرتا ہے کہ غلامی عربوں کی عظمت کے منافی ہے اسی لیے آگے بڑھ کر اقدام کرنا چاہیے:

بنی العراق قد حل الخصم ساحتکم — وفی ساحتکم له مرعی ومقتسم

اے اہل عراق! دشمن تمہارے صحن میں آگیا اور مزے اڑا رہا ہے۔

قد جاء من وراء البحر معتزماً — وذاك عار علیکم لیس ینحسم

وہ سمندر کے پیچھے سے آیا ہے اور تمہارے لیے ایسا عار ہے جو مٹ نہیں سکتا۔

اجدادکم تحت طی التراب تندبکم — این الجلالة این الباس والهمم

تمہارے آباء واجداد مٹی کے نیچے تم پر نوحہ کرتے ہیں کہ وہ شان، وہ بہادری اور ہمت کہاں گئی؟

عراقیوں سے مخاطب ہو کر پوچھتا ہے:

فکیف یهناء لکم عیش بارضکم — والانکلیز بها رسی لهم قدم

تمہارے وطن میں تمہاری زندگی کیسے خوشگوار ہو سکتی ہے جبکہ یہاں انگریزوں کے قدم جم گئے ہیں

وہ یہ سبق دیتا ہے کہ موت سے کسی کو رستگاری نہیں، اور جو راہ خدا میں ملک وملت سے دفاع کرتے ہوئے مارا جائیگا اس کو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا:

کل نفس مصیرها الموت لکن — من یمت بالدفاع مات شهیدا

ہر انسان کا انجام موت ہے لیکن جو مدافعت کرتے ہوئے مرے گا وہ شہید ہوگا۔

جنگ عظیم کے دوران میں کئی معرکوں میں ترکوں نے عراق میں اتحادیوں کو شکست دی، انکی کامیابی پر عراقی شعراء نے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا، واقعہ "الدردنیل" میں ترکوں کی کامیابی پر کاظم آل نوح کہتا ہے:

حصن تحصنت الدردنیل — بکماة غلب وآساد غیل

قلعے درہ دنیل کی حفاظت فرمائی غالب ہونے والے شیروں اور سورماؤں سے

طهر الله ان تجنس منها　　　بالاحتلال الاعادى بعض التلول

اللہ نے اس کے ٹیلوں کو دشمنوں کے تسلط کی نجاست سے پاک کیا

جعلت للاسلام حصنا منيعا　　　عادت بدهشة للذهول

دشمنوں نے اسلام کے سنگین قلعے سے ناواقفیت کا ثبوت دیا، اسلیے وہ ناکام ونامراد ہوئے

بنّا، اس واقعہ کا ذکر اس طرح کرتا ہے۔

يا بنفسى من حافظوا الدردنيل　　　وعلى الائتلاف سدوا السبيلا

اے دردنیل کے محافظو، تم پر مری جان فدا ہو، تم نے جان پر کھیل کر دشمن کی راہ روکی۔

حافظوا مركز الخلافة حتى　　　عاد ما حاول العدى مستحيلا

انھوں نے مرکز خلافت کی حفاظت کی یہاں تک کہ دشمنوں کی کوشش کو ناکام کردیا۔

"معرکۂ کوت" پر ابو المحاسن کہتا ہے:

سرت نفحة الظفر العاطرة　　　بأرجاء اوطاننا الناضرة

ہمارے پررونق وطن کے تمام گوشوں میں کامیابی کی خوشبودار ہوا چلی

یہی شاعر "معرکہ سلمان پاشا" کی فتح پر کہتا ہے۔

فيا يوم سلمان انت الذى　　　جعلت وجوه الهدى ناضره

اے یوم سلمان! تونے ہدایت کے چہرہ کو ظفر مند بنادیا۔

وقد ادركت ثارها المسلمون　　　بيوم من الفئة الغادرة

اس جنگ میں مسلمانوں نے بدبخت جماعت سے بدلے لیا

۱۱ر مارچ ۱۹۱۷ء کو جب انگریزوں کی فوجیں بغداد میں داخل ہوگئیں اس وقت بغداد میں ترکی سپہ سالار خلیل پاشا شہر چھوڑ کر بھاگ گیا، رصافی اس کے فرار کی شکایت ان الفاظ میں

کرتا ہے:

دین اهل الخنا اذا هل ترکونی نهبة فی ید العدو وراحو

غافلین کہ حو گئے، انھوں نے دشمنوں کے ہاتھ میں شکار بنا کر خود راہ فرار اختیار کی

مگر اس کے دل میں ترک قوم کی محبت بدستور قائم ہے

انا باق علی الوفاء وان کانت لقلبی ممن احب جراح[1]

میں وفا پر قائم ہوں اگرچہ محبوب نے میرے دل کو مجروح کر دیا ہے۔

جنگ عظیم کے بعد عراق میں انگریزوں کی حکومت قائم ہو گئی مگر مصر و شام کی طرح عراق کبھی اس غلامی پر رضامند نہ ہوئے اور اندر اندر بغاوت کی آگ بھڑکتی رہی، عراق کے علماء و شیوخ نے جہاد کا فتویٰ دیا اور اسلام کے نام پر عراق کے عوام کے جذبات ابھارے، فوج بھی بغاوت کے نشہ سے سرشار ہو گئی، عوام نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا، اس کا عکس عراقی شاعری کے آئینہ میں پوری طرح نظر آتا ہے، اس دور کی شاعری میں ایک گہرا مذہبی شعور پیدا ہو گیا، جو کبھی اسلامیت کے رنگ میں کبھی وطنیت کے پردہ میں، کبھی قومیت کے لباس میں اور کبھی سامراجیت سے نفرت کی شکل میں ظاہر ہوتا تھا، ان شعراء نے پہلے ترکوں کے تسلط کے خلاف جدوجہد کی، پھر جب عراق پر انگریز قابض ہو گئے تو وہ ان کے خلاف پوری قوت سے میدان میں اتر آئے، ترکوں سے تو ان کا مذہبی رشتہ تھا، مگر انگریز تو ان کے لیے بالکل ہی اجنبی تھے، اس لیے اہل عراق نے اس ذلت کو گوارا نہ کیا اور مسلمان عرب شعراء نے دین کو اس سے آزادی کا وسیلہ بنایا، اس طرح دینی تحریک نے ان کو آزادی کی شمع دکھائی[2]

له الشعر العراقی الحدیث مصنفہ ڈاکٹر [illegible] بغداد [illegible] ص ۳۰ که ایضاً ص ۱۰

ایک عراقی شاعر عربوں کو مخاطب کرکے کہتا ہے

خذ الحقوق جمیعها ... او مت عزیزاً واسترح

اپنے تمام حقوق حاصل کرلے یا عزت سے جا اور پھر ابدی سکون حاصل کرلے

نباء کہتا ہے:

نحاربها والحرب خیر مجرّب ... وان کرہ الاغرار مرّ مذاقها

ہم دشمنوں سے لڑیں گے اور جنگیں بہترین آزادی دلانے والی ہیں اگرچہ اسکے تلخ مزے کو ناواقف ناپسند کریں۔

انگریزوں کے خلاف عراقیوں کی بغاوت کا خاص سبب شیخ شعلان ابو الجون کی گرفتاری تھی، اس سے ان میں اتنا اشتعال پیدا ہوا کہ انھوں نے جیل توڑ کر شیخ کو چھڑا لیا، اس کے انتقام میں فوج نے مظالم شروع کردیے، اس سے تمام قبائل میں بغاوت پھیل گئی، بعض فوجی افسر بھی اس میں شریک ہوگئے اور "الرارنجیہ" کا مشہور معرکہ پیش آیا، مذہبی علماء کے اعلان جہاد نے میدان کا رنگ بدل دیا، جواہری کہتا ہے:

وطفت انت نهضة ... مشهودة لا تجحد

فرات (عراق) میں ایسا زبردست انقلاب جس کا انکار ممکن نہیں

واقعہ "عوجہ" میں انگریزوں کو سخت شکست ہوئی، انھوں نے غصہ میں ریل کی پٹریاں تک اکھاڑ دیں جس سے ٹرین الٹ گئی، جواہری کہتا ہے:

وللقطار وقعة ... منها تخر الکبد

ٹرین کا واقعہ ایسا سخت ہے جس سے جگر شق ہو جاتا ہے

ما ترکوا حتی الحدید ... سلسلوا وقیدوا

انھوں نے لوہے تک کو نہ چھوڑا اور سب کو گرفتار کرلیا۔

مگر آخر میں یہ بغاوت ناکام ہوگئی۔ انگریزوں نے ہوائی حملے کیے جن میں بہت سے عراقی کام آگئے اور بہت سی عورتیں اور بچے دوسرے ملکوں خصوصاً ترکی چلے گئے۔ ایک شاعر کہتا ہے

منیت العیش فی وطن   یضام بذل یضطهد

میں ایسے وطن میں جینے سے گھبرا گیا ہوں جہاں انسان ذلیل کیا جاتا ہے اور اس پر ظلم ٹوٹتے ہیں

محته ید القضاء فراح   بلا روح ولا جسد

قضا کے ہاتھ نے سب کچھ مٹا دیا ہے۔ نہ اس میں روح باقی ہے اور نہ جسم

عراقی شعراء نے عراق کے حالات پر اتنا کہا ہے کہ ان کے اشعار سے عراق کی سیاسی و سماجی تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ حافظ ابراہیم کے علاوہ عراق کی سیاسی اور سماجی شاعری میں اور بہت سے شعراء کا حصہ ہے۔ انھوں نے ہر واقعہ کی تصویر کشی کی ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کا نقشہ ایک شاعر نے ان الفاظ میں دکھایا ہے:

لیل المسعود بات بالنحس طالعه   تضاد مستقبله بالاھوال اھوال

بغداد کے مسعود کی رات کا ستارہ نحوست کے ساتھ طلوع ہوا جس میں وحشت ہی وحشت ہے

انگریز دستور اور حقوق کا جو ڈھونگ رچاتے ہیں ان کی حقیقت رصافی نے ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

علم و دستور و مجلس امة   کل عن المعنی الصحیح محرف

علم، دستور اور مجلس سب اصل سے تحریف شدہ ہیں

اسماء لیس لنا سوی الفاظ   اما معانیها فلیست تعرف

یہ صرف نام ہیں جن میں الفاظ کے سوا کچھ نہیں اور جن کے معنی لاپتہ ہیں

زہاوی کہتا ہے:

نحن فی معجم السیاسة احرار ــ ولکن قاصرین یتامیٰ

ہم سیاست کی لغت میں آزاد ہیں مگر حقیقۃً بے بس یتیم ہیں

اثقلت کاھلا وادمت قلوبا ــ واذلت من النفوس کراما

تم نے کاندھوں کو بوجھل، دلوں کو زخمی اور معزز لوگوں کو ذلیل کر دیا

انگریزوں کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

کلما فکر العراقی فیھا ــ لعن الدار والحمی والمقاما

جب عراقی عراق کے بارے میں سوچتا ہے تو ملک، وطن اور مقام پر لعنت بھیجتا ہے (جہاں انگریزوں کی لعنت مسلط ہے)

انگریزوں نے عراق کو نام کی آزادی دیکر ایک مجلس مشاورت بنائی، عراقی وزیر بھی مقرر کیے، لیکن سب نام کے تھے۔ محمد باقر شبیبی کہتا ہے:

احکومة والاستشارة ربھا ــ وحکومة فیھا المشاور یعبد

وہ بھی کوئی حکومت ہے جس میں مشیر کا درجہ رب کا ہو اور اس کی پوجا کی جائے۔

الحکم حکمھم بغیر منازع ــ والامر مصدرہ لھم والمورد

سارے اختیارات انگریزوں کو حاصل ہیں وہی سیاہ و سپید کے مالک ہیں

رصافی ان الفاظ میں کہتا ہے:

فوزیر القوم لا یعمل ــ من عندہ اشارة

قوم کا وزیر بغیر اشارے کے حرکت نہیں کر سکتا۔

وھو لا یملک عملاً ــ غیر کرسی الوزارة

وہ وزارت کی کرسی کے علاوہ عملاً کسی شے کا مالک نہیں۔

۱۹۲۲ء میں اہل عراق اور انگریزوں کے درمیان مزید حقوق و آزادی کا معاہدہ ہوا،
اس کا ذکر رصافی نے اس طرح کیا ہے

العهد بين الانجليز وبيننا كالعهد بين الشاة والرئبال

ہمارے اور انگریزوں کے درمیان معاہدہ ایسا ہے جیسے کبری اور شیر کے درمیان عہد ہو

صالح جعفری اس کو سراسر غلامی قرار دیتا ہے۔

اسراهم قيدوا الرائ فلم سموه لى حرا

انگریزوں نے آزادی رائے کو قید کر لیا ہے، پھر اسکو آزادی کا نام کیوں دیتے ہیں

وما فائدة الرائ اذا لم ابده جهرا

اگر علانیہ رائے کا اظہار نہ کیا جا سکے پھر آزادی رائے کیا ہوئی۔

اس بغاوت کی ناکامی نے اہل عراق میں اور زیادہ جوش پیدا کر دیا اور شام و حجاز کی مکمل آزادی نے ان کے حوصلے اور بڑھا دیے، اس لیے انگریز رفتہ رفتہ ان کو حقوق دینے پر مجبور ہو گئے، چنانچہ ۱۹۲۷ء کے معاہدہ کے مطابق انگریزوں کی سرپرستی میں وزارت قائم ہوئی جو پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ تھی، اور ۱۹۳۲ء میں عراق کو مکمل آزادی مل گئی۔[1]

سیاسی معاملات کے علاوہ عراقی شعراء نے معاشرتی اور سماجی مسائل پر بھی کہا ہے اور اپنے نقطۂ نظر سے معاشرتی اصلاح کی کوشش کی ہے، زہاوی آزاد خیال شاعر ہے اس نے پردہ کی مخالفت میں اخبار "المؤید" میں "المرأة والدفاع عنها" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا، مگر مسلم معاشرہ اس کے لیے تیار نہ تھا، اس لیے ایک طوفان برپا ہو گیا،

[1] الشعر العراقی الحدیث ص ۱۸۷

اسنادی نے دورِ گزشتہ میں اختیار کرلیا۔ زہاوی کہتا ہے

کیف یسمو الی الحضارة شعب نصفه من نصفه مستور

وہ قوم تہذیب میں کیسے ترقی کرسکتی ہے جس کا نصف حصہ مستور ہو

بسیم الدویب کہتا ہے

ظلمتک بجوزک زوجک شر زوج فی الوجود

تیرا شوہر نہایت برا ہے، اس نے تجھ کو قید کرکے تجھ پر بڑا ظلم کیا،

قائلا انه وجی لا تخرج الا یوم تدعوها اللحود

جس کا قول ہے کہ میری بیوی لحد ہی کے لیے گھر سے نکلے گی۔

لیکن بنا بے پردگی کی شدید مخالفت کرتا ہے؛

ایها القوم اصلحوا انفسکم خاب من رام سفور الوجه خابا

اے قوم اپنے نفس کی اصلاح کر، جس نے بے پردگی کا ارادہ کیا وہ ناکام رہا۔

وجوه الغانیات بلا نقاب تصید الصید فی شرک العیون

عورتوں کے بے نقاب چہرے آنکھوں کے جال سے شکار کرتے ہیں۔

دورِ جدید کے دلپسند موضوع غربت اور سرمایہ داری کے متعلق بھی اپنے جذبات واحساسات ظاہر کیے ہیں، احمد الصافی کسانوں کی ہمدردی میں کہتا ہے؛

رفقاً بنفسك ایها الفلاح تشقی وسعیك لیس فیه فلاح

اے کسان اپنی حالت دیکھ تو محنت کرتا ہے مگر تیری محنت کا صلہ تجھ کو نہیں ملتا۔

فی اللیل بیتك مثل دهرك مظلم ما فیه شمع ولا مصباح

تیرے زمانہ کی طرح تیرا گھر رات کو تاریک رہتا ہے اس میں شمع ہوتی ہے اور نہ چراغ۔

لہ الشعر العراقی الحدیث ص ۲۵۰

فیخی سقفات ان همت سیل سلسلہ ویطیر کوخک ان تھب ریاح

اگر پانی برسے تو تیری چھت گر پڑے اور اگر ہوا چلے تو تیرا جھونپڑا اڑ جائے

عرق الحیا تسیل منہ لآلئا فنیزان منہا للفتی وشاح

تیری پیشانی کا پسینہ چمکتا ہوا بہتا ہے جس سے نوجوان کی چادر پر نقش و نگار بن جاتے ہیں

کسانوں کی بدحالی کا نقشہ مختلف شاعروں نے بڑے دردانگیز انداز میں کھینچا ہے

مثلاً صالح بحر العلوم کہتا ہے:

تقبل ایہا الفلاح منی عواطف یستبین بہا شعوری

اے کسان! میرے جذبات کو جو میرے شعور پر منعکس ہوئے ہیں قبول کر۔

ولا تحزن اذا لم تلق ثوباً یقیک وثوب غیرک من حریر

تو اس پر غمزدہ نہ ہو کہ تیرے پاس ستر پوشی کے لیے بھی کپڑا نہ ہو اور دوسرے حریر میں

ملبوس ہوں۔

فشان الدہر لم یعرف ضعیفا ولم یألف مجاورۃ الفقیر

زمانہ کی حالت یہ ہے کہ وہ کمزور کو نہیں پہچانتا اور غریب کے پڑوس سے مانوس نہیں ہوتا،

ایک دوسرا شاعر محمد مہدی جواہری جاگیرداری کے خلاف آواز اٹھاتا ہے:

الا قوۃ تستطیع دفع المظالم وانعاش مخلوق علی الذل نائم

کیا کوئی ایسی قوت ہے جو ظلم و ستم کو دور اور ذلت میں سونے والی مخلوق کو اٹھا دے

تعالت ید الاقطاع حتی تسلطت عن البت فی احکامہا یسحاکم

جاگیرداری کا اقتدار اتنا بڑھ گیا کہ ان کے احکام کے روکنے سے حکومت کا اقتدار بھی قاصر ہو گیا

ھی الارض لم تغمس اصابعا یسمہ فیما مستقر آبا بجرائم

۱۔ وہ جس کا ہاتھ زمین کے کسی خاص حصہ کو ناکشتہ سمیت ایک جاگیردار یا شخص اور جو اس پر ہی صرف کرتا ہے۔

ان اشعار سے یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ عراقی شاعری زندگی کے خزانوں سے بھرپور، قدیم روایات کی تقلید سے دور اور سیاسی، وطنی اور سماجی مسائل سے اس کا دامن معمور ہے، اس سے یہ بھی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عراقی شعرا حقیقت پسند ہیں، جدید مسائل پر انکی پوری نگاہ ہے، ان میں بعض آزاد خیال اور مغرب زدہ ہیں، لیکن ان کی اکثریت کے جذبات اسلامی ہیں، زہاوی میں آزاد خیالی زیادہ ہے، لیکن رصافی اور کاظمی کا کلام اسلامی جذبات سے معمور ہے۔

عبدالمحسن کاظمی ابو المکارم عبدالمحسن کاظمی نجفی ۱۲۸۲ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے اور وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، ان کے والد تاجر تھے، اس لیے شروع میں وہ بھی تجارت کی طرف مائل ہوئے، پھر اس کو چھوڑ کر کھیتی کی طرف گئے، مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ان کا رجحان ادب کی طرف ہوا، اور اس کا شوق اتنا بڑھا کہ قدیم شعراء کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور ان کے بارہ ہزار اشعار حفظ کر ڈالے اور ۲۰ سال کی عمر میں ان کی ادبیت کا شہرہ عام ہو گیا۔

کاظمی کو مسلمانوں کے انحطاط کا شدید احساس تھا، وہ اس پر برابر غور و فکر کرتے رہتے تھے، اسی زمانہ میں سید جمال الدین افغانی ایران سے جلاوطن ہو کر بغداد پہنچے، اسلیے کاظمی کو ان سے کسب فیض کا موقع مل گیا اور انھوں نے ان کے اعلیٰ اسلامی افکار کو شمع راہ بنایا، لیکن جب جمال الدین افغانی عراق سے نکالے گئے تو اس کی زد کاظمی پر بھی پڑی، انھوں نے ایرانی سفارت خانہ میں پناہ لی، پھر خفیہ طور پر ... بھر چلے گئے، چند مہینہ ... میں قیام کرکے وہاں سے مصر کی راہ لی، وہ بغداد واپس آنا چاہتے تھے، مگر سیاسی حالات قطع نظر امراض نے ان کو سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا، آنکھوں کی بصارت جاتی رہی، گردل کی

دمشق اور تیز ہوگئی، مصر میں انھوں نے شیخ محمد عبدہؒ سے کسب فیض کیا، اس لیے ان کے فکرو خیال پر اسلامی رنگ بہت گہرا ہے، جو ان کی نظم ونثر دونوں میں نمایاں ہے۔ مندرجۂ ذیل تصانیف ان کی یادگار ہیں۔

۱۔ البیان الصادق فی کشف الحقائق۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کے نفاق واختلاف پر بحث کی ہے۔

۲۔ تنبیہ الغافلین۔ اس میں امت کے امراض کی نشاندہی کرکے اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا صحیح علاج تجویز کیا ہے۔

۳۔ دیوان شعر۔

شاعری — کاظمی کا شمار طبقۂ اول کے شعراء میں ہوتا ہے، وہ عراق کے تین اساطین شعراء میں سے ایک اہم شاعر ہیں، یعنی زہاوی، رصافی اور کاظمی، ان تینوں کے کلام میں فنکارانہ عظمت ہے، لیکن وطن کی محبت اور اسلام کا درد کاظمی کا خاص حصہ ہے۔ وہ شاعر استقلال ہے جس نے پوری عمر آزادی کے گیت گائے، اور دلوں میں شوق و محبت کی آگ لگائی، اس نے اپنے پرسوز نغموں میں اہل عراق کے دلوں میں اسلام کا درد پیدا کیا، اس کے کلام میں زہاوی کے کلام کی طرح فلسفیانہ عمق نہیں ہے، اس کی عظمت کا راز، کلام کی جودت، متانت، حسن بیان اور قافیہ کی روانی میں پوشیدہ ہے، یہی چیزیں حافظ ابراہیم کا بھی سرمایۂ شاعری ہیں، اس لیے، رفائیل بطی کا خیال ہے کہ حافظ نے روانی، موسیقیت اور حسن قافیہ کاظمی سے اپنایا ہے۔

کاظمی کو بدیہہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل تھا، اکثر وہ ایک ہی مجلس میں کئی کئی سو اشعار کا قصیدہ موزوں کر لیتے تھے۔ ایک بار ابراہیم شد دی نے ان کی شان میں ایک قصیدہ

پڑھا تو انھوں نے اس کے جواب میں اسی بحر و قافیہ میں اسی مجلس میں اس کا جواب لکھ کر پیش کیا، اس بدیہہ گوئی پر لوگ متحیر رہ گئے،

کاظمی کی شاعری میں دو عناصر اور نظر آتے ہیں، ایک قدیم صحت مند عناصر، قدامت کوئی نقص کوئی بری چیز نہیں، بغیر ماضی سے تعلق قائم کیے ہوئے مستقبل کی بنیاد مضبوط نہیں ہو سکتی، کاظمی نے ان صحت مند عناصر کو جدید عناصر سے ملا کر بڑی خوبی سے پیش کیا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جن شعرائے زبان و ادب کی غیر معمولی خدمت انجام دی ہے، ان سب کے یہاں دو چیزیں مشترک ہیں، ایک قدامت کے صحت مند عناصر سے قوی رشتہ، دوسرے اسلامی اقدار حیات کی عظمت، یہی چیزیں حافظ، شوقی، رصافی اور زہاوی کے یہاں بھی نظر آتی ہیں، بلکہ یہ کہنا صحیح ہے کہ عالم اسلامی میں قوم و ملت کے احیاء کی جتنی تحریکیں چلیں وہ سب چٹائی پر بیٹھکر پڑھنے والے قدیم علوم کے علماء نے چلائیں، ہندوستان میں سر سید اور علامہ شبلی، مصر میں سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ وغیرہ اسی طبقہ سے تھے، انھوں نے اپنے دور کے ادباء و شعراء سے بھی اصلاح کا کام لیا، ہندوستان میں اس کی مثال مولانا حالی ہیں، کاظمی پر سید جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ کا اثر تھا،

سیاست میں اسلام

(۲)

مترجمہ محمد آفاق صاحب ایم اے علیگ

سویت وسط ایشیا

وسط ایشیا کی سویت حکومت میں رہنے والے مسلمانوں اور اسلام سے متعلق متضاد خبریں ملتی رہتی ہیں، کبھی سننے میں آتا ہے کہ مسلمانوں کو پوری آزادی حاصل ہے، انکی اقتصادی حالت بہت اچھی ہے، ان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی ہے، وہ اپنے مذہب اور تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کی کوشش میں بالکل آزاد ہیں، اور کبھی سنا جاتا ہے کہ وہ ایک طرح کی نوآبادیاتی حکومت کے ماتحت نسلی امتیاز کا شکار ہیں، اور اسلام کی صورت بالکل مسخ کر دی گئی ہے، کبھی یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ اسلامی ثقافت کو سویت نظام میں اس طرح ختم کر دیا گیا ہے کہ وہ آخری سانس لے رہی ہے،

سویت روس کے ڈھائی کروڑ مسلمانوں میں تقریباً نصف سے زیادہ سویت ایشیا میں آباد ہیں، ۱۸۶۰ء کے بعد ان مسلمانوں کی سرزمین برابر روسیوں کی فتوحات میں شامل ہوتی رہیں یہاں تک کہ انیسویں صدی کے اواخر میں پورا علاقہ جو اب سویت ایشیا اور ترکستان کے نام سے مشہور ہے، براہ راست روسیوں کے زیر حکومت ہو گیا صرف بخارا

اور خطاکے علاقے کو نیم آزاد ریاست کی حیثیت سے کچھ دنوں کے لیے چھوڑ دیا گیا، لیکن روس کے انقلاب کے بعد ہی ان کو بھی سویت حکومت میں شامل کرلیا گیا اور پورے مسلم علاقہ کو ان کی قومیت کے اعتبار سے پانچ حصوں میں تقسیم کردیا گیا، ان قوموں کے نام یہ ہیں؛ قازخ، ازبک، ترکمان، کرغیز اور تازخ۔ سنہ ۱۹۱۹ء اور سنہ ۱۹۲۴ء کے درمیان نئے نظام حکومت کے خلاف مسلح جنگ جاری رہی، آخر میں سنہ ۱۹۳۰ء میں سویت نظام کو غلبہ حاصل ہوگیا، جو اب تک برقرار ہے،

سویت حکومت نے ابتدا ہی سے اسلام دشمنی کا مظاہرہ کیا، اس کی مخالفت صرف اسی لئے نہیں کی گئی کہ وہ ایک مذہب ہے، بلکہ ایک ایسا نظام حیات اور طرز زندگی ہے جو اشتراکیت کی ترقی میں رکاوٹ ڈالتا ہے، اور جدید طرز زندگی کو اپنے اندر ضم کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس کے علاوہ سویت نظام یہ بھی محسوس کرتا رہا کہ اسلام کے اثرات قومیت کے حدود سے بہت آگے ہیں، اس لیے اس کو اندیشہ تھا کہ اسلام کے حلقۂ اثر سے نہ نکل سکیں گے، دوسرا خیال یہ بھی تھا کہ اسلامی ثقافت روس کی ثقافت کے بالکل ضد اور روسی قوم وملک دونوں کے لیے مضر ہے، اس کے مقابلہ میں وہاں کے عیسائی کلیسا کو روسی ثقافت کا جزو لازم تصور کیا جاتا ہے،

سویت کی مسلمان ریاستوں کی سیاسی حیثیت اور ان کا اصول نظم ونسق سویت روس کی دوسری ریاستوں کے برابر ہے، سرکاری طور پر ان ریاستوں کو مکمل خودمختار ریاست کہا جاتا ہے، لیکن ان کی خارجہ پالیسی، قومی دفاع، داخلی تحفظ، ذرائع آمد ورفت اور بعض دوسرے امور براہ راست سویت حکومت کے قبضہ میں ہیں، ان ریاستوں کا [illegible]، افغانستان، ایران جیسے ہمسایہ ملکوں سے کوئی سفارتی، ثقافتی یا کاروباری رشتہ نہیں ہے۔

ہر ریاست کی اپنی کمیونسٹ پارٹی ہے، جو سوویت یونین کی مرکزی پارٹی کے تحت کام کرتی ہے، ان سب ریاستوں کے باشندے بلا امتیاز قومیت بنیادی طور پر سوویت یونین کے شہری خیال کیے جاتے ہیں، اور ان کا جذبۂ حب الوطنی ان کی ریاست کے بجائے سوویت یونین سے وابستہ سمجھا جاتا ہے۔

سوویت ایشیا کی تشکیل کے بعد چالیس سال کی مدت میں بلا شبہ ان ریاستوں کی مادی حالت بہت بہتر ہو گئی ہے، خاص طور سے صحت عامہ، صنعتی پیداوار، روئی کی کاشت، آمد و رفت کے ذرائع اور معیار زندگی میں نمایاں ترقی ہوئی ہے، ان تمام امور میں یہاں کے مسلمان جاپان اور اسرائیل کے علاوہ تمام ایشیائی ممالک سے بہتر حالت میں ہیں، اس کی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ مرکزی حکومت ان کے معاملات میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے، بلکہ یہاں کے مسلمانوں نے بڑی تیزی سے اپنی صلاحیتوں کو سنوارا اور ان سے کام لیا ہے، اگرچہ ان کو اپنے معاشی اور مالی معاملات میں پوری آزادی حاصل نہیں ہے، پھر بھی وہ تجربہ اور صلاحیت کی بنا پر اپنے کو روسیوں سے کسی درجہ میں بھی کم تصور نہیں کرتے، اور یہ کہنا مبالغہ سے خالی نہیں ہے کہ روس میں نسلی امتیاز نہیں برتا جاتا، لیکن یہ تاثر ضرور ہے کہ مدد گار ملکوں کے مقابلہ میں یہاں مساوات زیادہ ہے،

مجموعی طور پر مسلمان اپنی معاشی حالت سے مطمئن نظر آتے ہیں، اور بظاہر اس کے اسباب بھی فراہم کر دیے گئے ہیں، لیکن تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ وہ ایک غیر مانوس نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور ہیں، مسلمانوں کے دانشمند طبقہ میں ایسی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ وہ موجودہ سیاسی حیثیت سے قطعی مطمئن نہیں ہیں، اس میں شک نہیں کہ اس نظام نے معاشی، اقتصادی معاملات، صنعتی و زراعتی ترقی، آب پاشی اور دوسرے تکنیکی امور میں یہاں کے لوگوں کی بہتری کیلئے دوسرے ایشیائی نظام کے مقابلہ میں بہت کچھ کیا ہے، لیکن روحانی اور ثقافتی میدان میں

اس نظام نے جو تبدیلیاں کی ہیں وہ سخت تعارض پر موقوف ہیں، مثلاً تعلیم کو غیر مذہبی بنا دیا گیا، اسلام کو
پرانے دور کی یادگار بنا دیا گیا، [illegible] کے مشاغل پر پابندی عائد کر دی گئی اور اسلام دشمن نظریات
کی تبلیغ شروع کر دی گئی۔ عظیم انقلاب کے بعد ہی سے تمام مذاہب کے خلاف عام مہم شروع کر دی گئی تھی، اس سے
اسلام دشمن تحریک کی شکل بہت ملتی جلتی ہے، دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اسلام کو اس مہم
سے زیادہ نقصان پہنچا کیونکہ مسلمانوں کی تمام ابتدائی اور اعلیٰ درسگاہیں دینی علما کی نگرانی
میں کام کرتی تھیں، ان کی عبادت گاہوں کی تعداد دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت کے مقابلہ میں
کہیں زیادہ تھی، مسلمانوں میں کمیونزم کا تصور ناقابل فہم تھا، وہ محکوم ہونے کے باوجود اسلامی
شریعت پر عامل تھے، ان کی خانگی زندگی کا تانا بانا بھی اسلامی تھا، عورتوں کا سماجی مقام بھی وہی
تھا جو اسلام نے متعین کر دیا تھا، یہاں تک کہ فنون لطیفہ، زبان و ادب میں بھی اسلامی تصورات پائے جاتے ہیں،

اس لیے ابتدا ہی سے سوویت نظام نے اسلامی ثقافت کی تمام شکلوں کو خواہ وہ
روحانی ہوں یا مادی ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا اور اس کی جگہ ایک ایسی ثقافت کے پیدا کرنے کا فیصلہ کیا جو قومی
جسم اور اشتراکی روح کی حامل ہو، اس منصوبہ کی تکمیل کے لیے جو سرکاری اقدامات کیے گئے وہ اگرچہ
بہت وسیع تھے لیکن اتنے مؤثر ثابت نہ ہو سکے جتنی [illegible] کی امید تھی، سنہ [illegible]
کی ابتدا ہی میں تمام مکاتب اور مدرسے ختم کر دیے گئے، مگر [illegible] اور [illegible] میں چند
دوبارہ سے کھول دیے گئے، مثلاً [illegible] میں [illegible] ایک مدرسہ [illegible]
مسجدیں کھلی ہیں [illegible] خطیبوں کی تعداد کم کر دی گئی ہے [illegible] شرعی
معطل کر دیا گیا ہے [illegible] لوگوں کو [illegible]
پیشہ [illegible] کی [illegible] ہوتا [illegible]
چیزیں جو [illegible] شامل ہو گئی ہیں [illegible] ختم [illegible] اسلام [illegible]

دشمنی میں بھی سلسلہ ختم یا نرم ہے بلکہ بعض موقعوں پر ان کی شدت میں کمی کر دی جاتی ہے، مثلاً جب جرمنی نے روس پر ۱۹۴۱ء میں حملہ کیا تو روس نے مذہب کی حمایت کے ساتھ اسلام کی حمایت بھی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی، ایسے موقعوں پر معاندانہ رویہ کی شدت مصلحتاً کم کر دی جاتی ہے۔

ان منفی اقدامات سے قطع نظر سویت ارباب اختیار نے ایک نئی تہذیب و ثقافت کی تشکیل کی غرض سے بہت سے مثبت اقدامات بھی کیے ہیں، ان میں سب سے اہم تعلیم ہے جس کو سیکولر بنا دیا گیا ہے، ۱۹۱۷ء میں اس علاقہ کے مسلمانوں میں تعلیم یافتہ لوگوں کا اوسط تین فیصدی سے زیادہ نہ تھا، اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ نہ تھا، مگر اب جہالت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے، متعدد صنعتی تربیتی اداروں کے ساتھ ہی اس علاقہ میں چھ یونیورسٹیاں قائم ہو چکی ہیں، سویت لسانی پالیسی کا تعلق تعلیم سے بہت گہرا ہے اس لیے سب سے پہلے عربی رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا گیا، پھر ۱۹۴۰ء میں روسی حروف کی ایک ترمیم شدہ شکل کو علاقائی زبانوں کی تعلیم کے لیے جاری کیا گیا، ان علاقوں کی زبانیں مستقل ادبی حیثیت نہیں رکھتی تھیں لیکن اب اس قابل ہو گئی ہیں، قدیم عربی اور فارسی الفاظ سے اخذ و استفادہ کا طریقہ ختم کر دیا گیا ہے لیکن موجودہ عربی و فارسی عناصر کو ختم کرنے کی کوشش بڑی حد تک ناکام رہی، اس لیے کہ وہ علاقائی زبان و ادب میں اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کو جدا نہیں کیا جا سکتا، تاہم بھی ادب کی تعبیر میں لسانی اصطلاحات اس طرح کی گئی ہیں کہ اسلام کا ذکر بالکل ختم ہو گیا ہے یا پھر اس کا حقارت آمیز ذکر ہوتا ہے، روس کی اس لسانی پالیسی کا دوسرا مقصد روسی زبان کی توسیع بھی ہے۔

سویت حکومت نے روسی زبان کو ان علاقوں کے باشندوں کی دوسری سرکاری زبان بنا دیا ہے جو روسی زبان جانتے ہیں، ان کا یہ سمجھنا ہے کہ روسی زبان کے معقول علم کے بغیر

عملی طور پر ترقی کی راہیں بند ہیں، ابتدائی اور ثانوی درجات میں تعلیم علاقائی زبانوں کے ذریعہ دی جاتی ہے، لیکن اعلیٰ تعلیم اور فنی تعلیم کے لیے صرف روسی زبان استعمال کی جاتی ہے۔

مسجدوں کی قفل بندی، مذہبی درسگاہوں کے خاتمے اور مذہبی تہواروں کی چھٹیاں ختم کر دینے کی وجہ سے تمام ظاہری دینی رسوم کی حیثیت عوامی زندگی میں بالکل ختم ہوگئی ہے، یہی صورت حال ان اسلامی ملکوں میں بھی ہے جہاں مغربی تہذیب کی ترقی میں اسلام معاون ثابت نہ ہو سکا ہے یا جہاں اسلام کو ایک سیاسی تحریک سے زیادہ حیثیت حاصل نہیں ہے، لیکن اسلام کی بقا مذہبی تقریبات اور اماموں کے وجود پر منحصر نہیں ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ ترکی، ایران اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مسلمانوں کی طرح سوویت مرکزی ایشیا کے مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسلامیت جاگزیں نہیں ہے، چنانچہ کفر و الحاد کی تبلیغ کے خلاف شروع میں جو نفرت پائی جاتی تھی وہ اب باقی نہیں ہے، مگر اسلام کی جو حالت تیس سال پہلے تھی اب اس سے بہتر ہے، ۱۹۴۳ء میں سوویت یونین میں چار روحانی محکمے قائم کیے گئے تھے، جن میں ایک تاشقند میں ہے، مگر اس کے اختیارات برائے نام ہیں، یہ محکمہ سرکاری نگرانی میں کام کرتا ہے، اور ظاہری طور پر اسلام کی بقا کی ایک علامت ہے، پرانی مسجدوں کی مرمت ہو رہی ہے، اور ایک نئی مسجد زیر تعمیر ہے۔

کمسنی کی شادی اور دلہن کی خریداری کو مذہبی آثار میں شمار کیا جاتا ہے، اور اس سلسلہ میں سوویت روس کا حوالہ دیا جاتا ہے، اور سوویت کے ادیب بھی

اس کو اسلام کی لادینی خصوصیات شمار کرتے ہیں، حالانکہ روس کے انقلاب سے پہلے مسلمان مصلحین اور جدید طبقہ ان چیزوں کا شدید مخالف تھا، جن کا اسلامی آثار سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بنگساں (Bennigsen) نامی مشہور فرانسیسی محقق نے جو سوویت یونین کے اسلام کے بارہ میں سند کی حیثیت رکھتا ہے، کمیونزم اور اسلام کی ہم وجودیت پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اسلام اور کمیونزم دونوں کو ایک مقام پر رکھا جائے، لیکن یہ صورت نہ تو سوویت روس ہی میں ہے جہاں اسلام کو سماجی ڈھانچے سے خارج تصور کیا جاتا ہے، نہ مشرق وسطی کے ان اسلامی ملکوں ہی میں ہے جہاں زندگی کے تمام شعبوں پر اسلام غالب ہو"۔ اصولی طور پر اسلام اور کمیونزم ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، لیکن سوویت ایشیا کے دانشمند مسلمان اسلام اور کمیونزم کے درمیان صلح کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ اس معاملہ میں حکومت کا جبر ختم ہو جائے۔

ایک تاتاری کمیونسٹ میر سلطان علی اوگلو نے انقلاب کے بعد ہی ایک ایسی تحریک شروع کی تھی جس کا مقصد ایک طرح کی "بین الاقوامی مسلم نو آبادی" کو وجود میں لانا تھا، روس نے یورپ کے صنعتی ملکوں کے لیے جو کمیونزم وضع کیا تھا، اس میں سلطان علی اوگلو ایسی تبدیلی چاہتا تھا جس سے وہ ایشیا کے زراعتی ملکوں کے لیے قابل قبول ہو سکے، مگر اس کی اس کوشش کو انقلاب دشمن تحریک سمجھ کر بڑھنے نہیں دیا گیا۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سلطان علی اوگلو نے جس طرح کی قوم کا تصور پیش کیا تھا اس کا نشان تو اب بلند ذہن رکھنے والے مسلمانوں میں بالکل نہیں ہے، جو بظاہر مغربی تہذیب سے متاثر ہیں، کمیونزم سے مطمئن ہونے کے باوجود ایمانی حیثیت سے مسلمان رہ سکتے ہیں۔

(جیاز می وہیلر مرکز ادارہ وسط ایشیائی تحقیقات لندن)

ادبیات

انسانیت

از

جناب طالب بے پورں

کرم کیا کیا کیے ہیں گلشنِ ایجاد پر میں نے — دیا ہے آبیاری کے لیے خونِ جگر میں نے
جبینِ چرخ پر افشاں چنی ہے چاند تاروں کی — شبِ تاریک کو بخشا ہے نورِ سحر میں نے
بنا ڈالی گئی جب قصرِ تہذیب و تمدن کی — دیا اس کے لیے دل کھول کر خونِ جگر میں نے
کیا ہے تجربہ تجزیۂ اضدادِ عالم کا — سکھایا ہے زمانے کو شعورِ خیر و شر میں نے
عطا کی ہے دلِ افسردہ کو گرمی محبت کی — لٹایا ہے متاعِ لذتِ سوزِ جگر میں نے
بڑھایا ہے زندگی کا رنگ انسانیت کے خاکے میں — [illegible] میں نے
مٹا کر اختلافِ باہمی اقوامِ عالم کا — [illegible] شیر و شکر میں نے
کہیں بکھری [illegible] — [illegible] میں نے
بسایا [illegible] فکر و نظر — [illegible] میں نے
ملایا ہے [illegible] — [illegible] میں نے
اندھیرے میں بھی پائے گی تجلی نورِ عرفاں کی — نگاہِ شوق کو بخشا ہے وہ حسنِ نظر میں نے

کسی کو پا کے اپنے آپ میں کھویا ہے [illegible] | کسی کی دی ہے اپنے آپ کو پا کر خبر میں نے
رہو بستی میں [illegible] نقشِ قدم میرا | کیا ہے راہ رو کو بے نیازِ راہبر میں نے
سنوارے ہیں [illegible] کے کاکل و عارض | دیے ہیں اہلِ بینش کو نئے شام و سحر میں نے
بڑھا کر دسترس [illegible] عنانِ کمال کی | زمانے کو دکھا دی حدِ معراجِ بشر میں نے
چمن میں اپنی بے نوری پہ نرگس اشک [illegible] گی | کیے ہیں [illegible] رنگ و بو میں پیدا دیدہ ور میں نے
نہ ہونے پائے گی تاراجِ صرصر رونقِ گلشن | تبسم گل کو بخشا ہے بہ اندازِ دگر میں نے

رہے گا گلشنِ ایجاد مرہونِ کرم میرا
کیا ہے اس کو اپنے خون سے بارور میں نے

غزل

از جناب حبیب احمد صاحب صدیقی [illegible]

[illegible] لاکھ چاہا مگر کبھی نہ گئی | اپنی خوئے صنم گری نہ گئی
[illegible] کی تابشِ تسلیم | [illegible] نہ گئی
[illegible] | [illegible] نہ گئی
[illegible] | [illegible] نہ گئی
[illegible] | [illegible] نہ گئی
[illegible] زندگی [illegible] | پھر بھی [illegible] زندگی نہ گئی
[illegible] کی محبت نے | [illegible] نہ گئی
کتنی محدود تھی [illegible] | تیرہ بختوں کی تیرگی نہ گئی

بدلے رسم و رواج دہر بہت ایک رسمِ شکر ہی نہ گئی

آدمیت گئی تو اے ناداں پلکے سب کچھ بھی پھر کی گئی

ایسے جینا کو کیا کہیں جس کی آنکھ کے پار روشنی نہ گئی

جو کہانی لہو سے لکھی تھی ہم سے وہ بھی کبھی کہی نہ گئی

اے ستارو تم اپنی راہ لگو
یہ شبِ ہجر ہے، گئی نہ گئی

غزل

از

جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری

خورشید و ماہ میں بھی کسی انجمن میں ہے وہ روشنی جو حسن کی پہلی کرن میں ہے

اللہ رے کمالِ جنوں کی نوازشیں اک ذوقِ آگہی مرے دیوانہ پن میں ہے

جو برق بے اماں کو بھی شے اس کی نذر ہے ایسا اک آشیانہ بھی صحنِ چمن میں ہے

منصور نے دیا ہے زمانے کو یہ پیام لطفِ حیات سایۂ دار و رسن میں ہے

تنہائی فراق سے ہیں جاں بلب سہی لیکن مرا خیال ابھی انجمن میں ہے

کس نے نظر سے جوہر پیاسا حسن و عشق اک زندگی کی لہر ابھی نشتر زنی میں ہے

جوہر وطن کی شان پہ آنے نہ دیں گے آنچ
جب تک لہو رگوں میں ہمارا بدن میں ہے

مطبوعات جدیدہ

کمال اور زوال } از طوسی دیدیس، مترجمہ جناب میر حسن صاحب متوسط تقطیع، کاغذ،
تاریخ جنگ یونان قدیم } کتابت و طباعت اوسط صفحات ۴۹۰ مجلد مع گرد پوش

قیمت ۲۰ روپئے پتہ: ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی۔

یونان کی تاریخ پر انگریزی میں متعدد مفصل اور ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بعض کے اردو ترجمے بھی جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہو چکے ہیں، مذکورہ بالا کتاب قدیم یونان کی دو عظیم الشان ریاستوں ایتھنز اور اسپارٹا کی طویل جنگ کی تاریخ ہے، اس کا مصنف طوسی دیدیس اسی جنگ کے زمانہ یعنی پانچویں صدی قبل مسیح کا مشہور مورخ اور ایتھنز کا فوجی سپہ سالار تھا، اس لیے وہ ان لڑائیوں کے حالات کا عینی شاہد ہے اور اس کی یہ کتاب اس کی سب سے مستند دستاویز ہے، گو مصنف پر جانبداری اور غلط بیانی کا بھی الزام لگایا گیا ہے، لیکن عام طور پر اس تاریخ کو دنیا کی مشہور اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے، یہ ضخیم کتاب آٹھ حصوں اور ۴۹ ابواب پر مشتمل ہے، اس میں ابتدا سے اکیسویں سال تک کے جنگی واقعات تحریر کیے گئے ہیں، شروع کے پانچ ابواب میں جنگ پر پہنچنے سے پہلے تک یونان کی سرگذشت، جنگ کے اسباب، سلطنت ایتھنز کے عروج و اقتدار کا بھی اجمالی ذکر ہے، اس کے بعد سالہائے جنگ کے حالات اور ضمناً اس سلسلہ کی دوسری باتیں مثلاً معاہدات اور کانفرنسوں کی روداد، سپہ سالاروں اور نمایندوں کی تقریریں وغیرہ بھی نقل کی گئی ہیں، مصنف نے صرف واقعات ہی

لیے بلکہ ان کے اسباب بھی بیان کیے ہیں اور اس سے بعض ایسے نکتے بھی
معلومات بہم پہنچتی ہیں کہ تذکرے میں مصنف کا مرقع اور اس کے دور کا ادبی
مصنف نے صفات کے بعض ایسے ذخیرے نہیں لکھی ہیں جس سے
... نہیں ہوتا، ضرورت تھی کہ فاضل مترجم مقدمہ میں مصنف کے متعلق
ضروری معلومات اور کتاب میں تذکرۂ اشخاص و مقامات اور دوسرے مبہم اندراجات سے متعلق
ذیلی حواشی لکھتے، اس کے بغیر اس کتاب سے پورا استفادہ عام لوگوں کے لیے بہت دشوار ہے،

فن اور تنقید — مرتبہ جناب انتظار حسینی صاحب، تقطیع خورد، کتابت و طباعت
عمدہ، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت لکھ، ادارۂ فروغ پبلشرز، حوض قاضی، دہلی
یہ مجموعہ اردو کے نامور ادیبوں اور ناقدوں کے مضامین کا مجموعہ ہے جس میں مختلف
اردو ادب کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کیا ہے، پروفیسر احتشام حسین نے تنقید کی ضرورت
اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے اس کی حقیقت و غایت بیان کی ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ نے
اردو کی ادبی صلاحیتوں یعنی ہمہ گیری، اقتباس اور دوسری زبانوں کے خیالات سے اخذ و استفادہ اور
ارتقائی صلاحیت، اس کے فلسفہ پامال، ادب اور اس کی موجودہ ماضی و مستقبل
پر بحث کی ہے، ڈاکٹر اعجاز حسین نے اردو ادب میں قومی عناصر کی نشاندہی کی ہے، فراق
گورکھپوری نے غزل کی اہمیت و حیثیت، ڈاکٹر ... نے غزل کے نئے رنگ
اور پروفیسر کاظم نے اکبر کی غزلیہ شاعری پر بحث کی ہے ... موضوعات کے ... ڈاکٹر
خواجہ احمد فاروقی کا مضمون "اشتراکی ..." ... حضرت اقبال کے کلام کا
متصوفانہ لب و لہجہ" قابل ذکر ہیں، چند مضامین میں تصورات ... اور
اردو کے مزاحیہ و طنزیہ ادب کا مختصر جائزہ، اور ان کی صد جہت خوبیوں کا ذکر ہے، اس مجموعے میں

مقدمہ کے علاوہ ۲۰ مضامین ہیں، ان مضامین میں رطب و یابس، غیر معتدل خیالات اور بعض متضاد باتوں کا پایا جانا عجیب نہیں ہے، تاہم یہ مجموعہ اردو کی سنجیدہ علمی و مذہبی خدمات کے ذکر سے خالی ہونا ایک بڑی کمی ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے یہ انتخاب مختلف النوع مضامین کا ایک حسین گلدستہ اور مرتب کی خوش ذوقی کا نمونہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

انوار الصفا ۔ مرتبہ مولوی خصلت حسین صابری صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۳۰۲ مجلد، قیمت للعہ پتہ: مولوی شمس الدین تاجر کتب مسلم مسجد انارکلی چوک لاہور۔ ہندوستان میں: مکتبہ تجلی دیوبند، کتب خانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد دہلی ۶ وغیرہ۔

اس کتاب میں صحابہ، تابعین اور اولیائے کرام کے مختصر حالات و مناقب اور ان کے بعض حکیمانہ اور سبق آموز اقوال جمع کیے گئے ہیں، پہلے حصہ میں چالیس احادیث نبوی اور خطبہ حجۃ الوداع کے بعض اہم حصے، خلفائے راشدین اور ۵۵ دوسرے جلیل القدر صحابہ، ۲۶ تابعین اور تبع تابعین کے جن میں ائمہ اربعہ بھی شامل ہیں، فضائل و مناقب اور زریں اقوال نقل کیے ہیں، دوسرے حصہ میں بیرون ہند کے ۹ اور ہندوپاک کے ۲۰ بزرگان دین اور اکابر صوفیہ کا تذکرہ اور ان کے سبق آموز ملفوظات ہیں، اس طرح یہ کتاب صلحاء و اخیار امت کا مختصر تذکرہ بھی ہے اور ان کے ملفوظات، مواعظ اور تعلیمات کا گنجینہ بھی۔ کتاب کے مندرجات اگرچہ مستند نہیں لیکن زیادہ تر اردو کتابوں اور ترجموں سے لیے گئے ہیں،

مذہب اور لا مذہبیت کی کشمکش (پانچ مقالے) از جناب ... تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۰۲، قیمت ۶/

پتہ: کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶

صوفی نذیر احمد صاحب موجودہ حالات اور بالخصوص مسلمانوں کے مسائل و معاملات پر مبصرانہ اور گہری نظر رکھتے ہیں، اور ان کے حل کی مفید تجویزیں اور مشورے بھی پیش کرتے رہتے ہیں، اس رسالہ میں پانچ مقالوں پر مشتمل اور صوفی صاحب کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ ہے، موجودہ مذاہب اور نظاموں بالخصوص مارکسزم کا جائزہ لیا گیا ہے، اور اس کے خطرناک پہلوؤں سے اسلامی ملکوں کو متنبہ کیا گیا ہے، اور موجودہ دینی و لادینی کشمکش میں مسلمانوں کی بے برکتی و بے حرکتی کے اسباب اور اسلام کے نظام امن و فلاح اور ملت کی تنظیم وغیرہ پر بحث کرکے دکھایا گیا ہے کہ تمام مخلوقات کی طرح انسان کا آئین فلاح و بقا بھی اس کے اخلاقی و روحانی شعور و کردار کی شکل میں موجود ہے، گو صوفی صاحب کی تحریروں میں ظاہری جاذبیت اور دلکشی نہیں ہوتی اور ان کے بعض افکار و خیالات پیچیدہ اور گنجلک ہوتے ہیں لیکن ان میں بہت گہری اور کام کی باتیں ہوتی ہیں، یہ مقالے بھی اس سے خالی نہیں ہیں اور مسلمانوں کے غور و فکر کے لائق ہیں۔

موضح القرأت فی السبع المتواترات - مرتبہ مولانا حافظ محمد یحییٰ خاں صاحب

بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات تقریباً ۲۲۰، قیمت ... پتہ: مدرسہ تجوید القرآن فاروقی مسجد، ... کراچی ۱۸ (پاکستان)

اس کتاب میں قرآن مجید کی سات مشہور و متواتر قراءتوں کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جس سے ان کا فرق و اختلاف بالکل واضح ہو جاتا ہے، شروع میں قراءت و تجوید کے ضروری اصطلاحات، جائز و ناجائز وجوہ کی تفصیل اور ساتوں مشہور ائمہ قراءت کے علاوہ ان کے دو دو مشہور رواۃ کے مختصر حالات و سوانح بھی بیان کیے گئے ہیں، ان حالات کو موضح القرآن کے نام سے الگ بھی شائع کیا گیا ہے، یہ کتاب پہلا جزو ہے جو پارہ الم کے اختلاف قراءت پر مشتمل ہے، قراءت کا دار و مدار مشق و مہارت پر ہے اور اس کی تحصیل محض فن و استاد کے بغیر کتابوں سے ممکن نہیں ہے اس لیے اس رسالہ سے قراءت و تجوید کے طلبہ و اساتذہ ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۰۰ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۷ء عدد ۲

مضامین

شذرات

ہندستان کے مسلمانوں کی یہ بڑی بدبختی ہے کہ متفقہ مسائل میں بھی وہ اختلاف کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ چنانچہ اسرائیل اور عربوں کی جنگ میں ناصر کی دینداری اور بیدینی اختلافی مسئلہ بنگئی ہے اور ناصر کی دینی صفائی میں متعدد بیانات نکل چکے ہیں، لیکن اس قسم کے اختلافی مسائل میں عرب جمہوریہ کے سفیر یا ان لوگوں کے بیانات معتبر نہیں ہوسکتے جو محض سیاح کی حیثیت یا حکومت کی دعوت پر مصر گئے اور گھوم پھر کر دو چار دن میں لوٹ آئے، کسی حکومت کا سفیر اپنی حکومت کے مفاد کے خلاف کوئی بیان نہیں دے سکتا، عام سیاح سرسری مشاہدے میں حالات کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے، اور حکومتیں اپنے مفید مطلب تماشے دکھاتی ہیں اور ان کے ظاہر سے بظاہر بھی متاثر ہو جاتے ہیں لیکن اہل نظر اس کو واقعہ نہیں سمجھتے اور نہ ایسے لوگوں کے بیانوں کی کوئی وقعت ہوتی ہے، اس قسم کے مسائل میں صرف ان لوگوں کا بیان معتبر مانا جا سکتا ہے جن کے عرب ملکوں سے تعلقات حکومت کے واسطے کے بغیر وابستہ ہوں، انکو وہاں طویل قیام یا بار بار کے مشاہدے اور مختلف طبقوں سے ربط و ضبط اور میل جول کا موقع ملا ہو، اس اعتبار سے عرب جمہوریہ اور ناصر کے بارہ میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیان سے زیادہ معتبر کس کا بیان ہو سکتا ہے جس سے ناصر کی دینداری کی حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، اور یہ بیان اتنا مدلل ہے کہ اس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

ناصر کے عقیدتمندوں کو اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جب عالم متحدہ یعنی اسرائیل کے مقابلہ میں عرب ممالک کی پوری حمایت پر جس میں ناصر اور عرب جمہوریہ بھی شامل ہے سب کا اتفاق ہے اور اس میں اصلاً اختلاف ہی نہیں تو ناصر کی دینداری کی سند مہیا کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس کے بغیر [illegible] بحث کی بھی ضرورت نہیں ہے [illegible] سلسلہ میں [illegible]

کی ہمت کے لیے نہ صرف ان کی بھی ضرورت ہے جو انہی مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے جو خدا کے دین کی ذکر کرتا
یہاں حیثیت سے قطع نظر، ناصر نے خالص دنیاوی اور جنگی حیثیت سے جس قابلیت کا ثبوت دیا ہے وہ جنگ
کے نتیجہ سے ظاہر ہے، اس کی جو تاویل بھی کی جائے اس سے ناصر کی پوزیشن صاف نہیں ہو سکتی، اس کے
باوجود ناصر کے ناقدین جمہوریہ عربیہ کے پندرہ ملکی اور حکومت ہند کی پالیسی سے بالکل متفق ہیں، اور عرب
کی حمایت میں ان کی عملی جد و جہد جاری ہے، ناصر کی دینداری اور بے دینی کا اس پر کوئی اثر نہیں
پڑ سکتا، البتہ یہ ضروری نہیں کہ وہ ناصر کی ثنا خوانی میں بھی حکومت کی ہمنوائی کریں اور اس حد تک شاید ان کا علاحدہ [illegible]

اسرائیل کا مسئلہ ناصر کی ذات یا جمہوریہ عربیہ کا نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کا ہے، اس لیے ناصر
کی دینداری اور بے دینی سے قطع نظر، ہر حال میں مسلمانوں کو جمہوریہ عربیہ کی حمایت کرنا ہے لیکن جب تک خود عرب
میں اتفاق اور اتحاد نہ ہوگا، ان کو کسی کی امداد و حمایت فائدہ نہیں پہنچا سکتی، اگر اسرائیل کے مقابلہ میں بھی متحد
نہ ہو سکے تو پھر کبھی ان میں اتحاد نہ ہوگا، اس وقت دنیائے اسلام بلکہ پوری دنیا کی نظریں چوٹی کی کانفرنس پر لگی
ہوئی ہیں، یہ کانفرنس عربوں کے تدبر کا بہت بڑا امتحان ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وہ کہاں تک اس امتحان میں
پورے اترتے ہیں، مغربی طاقتوں نے ان کو ایسے دلدل میں پھنسا دیا ہے کہ اس سے صحیح سلامت نکلنا
بہت مشکل نظر آتا ہے۔

اردو کا مسئلہ دو برس سے ٹھنڈا تھا، مگر اب پھر اس میں گرمی پیدا ہوئی ہے، گذشتہ الیکشن میں کانگریس
اور جن سنگھ کے علاوہ تمام پارٹیوں نے مجلس مشاورت کے منشور کو مانا تھا، اس میں اردو کا مسئلہ بھی تھا، اس لیے
غیر کانگریسی حکومتوں کے قیام کے بعد سے اردو والوں کو امید ہوئی تھی، اس کے لیے مختلف جماعتیں میدان عمل میں
نکلیں، بہار کی غیر کانگریسی حکومت کے بعض وزراء نے بھی موقع کو غنیمت سمجھا، اردو کی حمایت شروع کر دی
چنانچہ بہار کی حکومت اس کی طرف توجہ کرنے پر مجبور ہو گئی ہے، اردو والوں کا اصل مطالبہ اردو کو
اس صوبہ کی دوسری سرکاری زبان بنانے کا ہے، لیکن جن سنگھ اس کے مخالف ہیں اور حکومت اسی کے متعلق [illegible]

ابھی یہ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتی، کمیونسٹوں کے علاوہ دوسری پارٹیاں بھی جنھوں نے شاہ کمیشن کے فیصلہ کو تسلیم کیا تھا، اردو کے معاملے میں حکومت کی کرسی خطرہ میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن اردو کو بنیادی حقوق دینے کی سب حامی ہیں حتیٰ کہ جن سنگھ کو بھی شری شرما ایک حد تک اس کا اعتراف کرنا پڑا، وزیر اعلیٰ بھی ان حقوق کو دینے پر آمادہ ہیں، لیکن ان کو قانونی شکل دینے کے لیے تیار نہیں ہیں، اور اس کے لیے انھوں نے ایک جن سنگھی وزیر کے ماتحت ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم کر دی ہے، ان دونوں باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب حیلہ سازی ہے جن حقوق کو وہ تسلیم کرتے ہیں ان کو قانونی شکل دینے میں کیا قباحت ہے اور اس کے لیے تحقیقاتی کمیٹی کے قیام کی کیا ضرورت ہے، وہ بھی ایک جن سنگھی کی ماتحتی میں، اس کی جیسی سفارش ہوگی ظاہر ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے، قانونی شکل دیے بغیر محض زبانی وعدے اور تحریری احکام کا کوئی اعتبار نہیں، یہ بھی ضروری ہے کہ جو حقوق ملیں وہ پورے صوبے کے لیے ہوں، محض چند مغربی اضلاع کے لیے نہیں۔

گزشتہ الیکشن میں کانگریس کی شکست نے اس کو بھی مسلمانوں کی شکایتوں کی تحقیقات کی طرف متوجہ کر دیا ہے لیکن مسلمانوں کی نمائندہ مختلف جماعتیں بارہا ان شکایتوں کو پیش کر چکی ہیں، خود مرکزی وزیر فخرالدین علی احمد صاحب مسلمانوں سے مل کر ان کی شکایتیں اور مطالبات معلوم کر چکے ہیں، اس کے بعد تحقیقات کی کیا ضرورت ہے، یہ شکایتیں بالکل کھلی ہوئی ہیں، مسلم یونیورسٹی کے اسلامی کردار، اردو زبان اور ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ، سیکولرزم، مسلم پرسنل لا میں عدم مداخلت، فسادات اور فرقہ پرستوں کی مسلم دشمنی کا تدارک، یہ چند بنیادی مطالبات ہیں، اگر کانگریس واقعی مسلمانوں کی شکایتوں کو دور کرنا چاہتی ہے تو اس کو ان سب چیزوں کی طرف توجہ کرنا چاہیے، اردو والوں کے لیے یہی موقع ہے، وہ صوبے میں جدوجہد جاری رکھنے کے ساتھ کانگریس ہائی کمان اور صدر جمہوریہ کے سامنے بھی اس مسئلہ کو پیش کریں۔

مقالات

ابو عبید قاسم بن سلام

از جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

نام و نسب | ابو عبید کنیت، قاسم نام اور باپ کا نام سلام تھا، ابن ندیم نے اتنا اور اضافہ کیا ہے، قیل سلام بن مسکین بن زید۔[1]

ولادت، خاندان اور وطن | ۱۵۰ھ میں ہرات میں پیدا ہوئے، ابو بکر زبیدی نے ۱۵۴ھ سنہ ولادت بتایا ہے، ان کے والد رومی النسل اور ہرات کے کسی شخص کے غلام تھے، ابو عبید کا مشہور قبیلہ ازد سے ولاء کا تعلق تھا، وہ عرصۂ دراز تک بغداد میں مقیم رہے، اس بنا پر ازدی اور بغدادی کی نسبتوں سے مشہور ہیں،[2]

اساتذہ | ابو عبید نے نحو، لغت، قرأت اور حدیث کی تکمیل و تحصیل جن ائمۂ فن اور اکابر فضلا سے کی تھی، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں: ابن اعرابی، ابو بکر بن عیاش، ابو زکریا کلابی، ابو زیاد کلبی، ابو زید انصاری، ابو عمرو شیبانی، ابو محمد یزیدی، ابو معاویہ ضریر، احمر، اسحٰق ازرق، اسمٰعیل بن جعفر، اسمٰعیل بن علیہ، اسمٰعیل بن عیاش، اصمعی، جریر بن عبد الحمید، حفص بن غیاث، حماد بن مسعدہ، سفیان بن عیینہ، شجاع بن نصر، شریک بن عبد اللہ، صفوان بن عیسیٰ،

---

[1] الفہرست ص ۱۰۶ [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۳ و ۴۰۴، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۶، خلاصہ تذہیب ص ۳۱۲، بغیۃ الوعاۃ و طبقات النحاۃ ص ۳۷۶ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۲۴

دے کے علاوہ ہشیم، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عمر بن یونس یمامی، قرّادہ کسار، مروان بن معاویہ، ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ، ہشام بن عمار، ہشیم بن بشیر، وکیع، یحییٰ بن سعید اموی، یحییٰ بن سعید القطان، یحییٰ بن صالح، یزید بن ہارون وغیرہ، اس زمانہ میں کوفہ اور بصرہ نحو و لغت کے مرکز تھے، ابو عبید کو دونوں مرکزوں کے محققین سے کسب فیض کا موقع ملا،[1]

تلامذہ: ان کے کچھ شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:-

ابوبکر بن ابی الدنیا، احمد بن یحییٰ بلاذری، احمد بن یوسف تغلبی، حارث بن ابی اسامہ، حسن بن مکرم، سعید بن ابی مریم مصری، عباس دوری، عباس عنبری، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، علی بن عبدالعزیز بغوی، محمد بن اسحٰق صاغانی، محمد بن یحییٰ مروزی، نصر بن داؤد،[2]

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان کی روایتیں کتب حدیث میں میری نظر سے نہیں گزریں، البتہ ان کے اقوال اکثر کتابوں میں نقل کیے گئے ہیں،[3] امام بخاری نے کتاب الادب، باب افعال العباد، دتعاق اور بعض دوسرے ابواب وکتب میں، امام ابوداؤد نے کتاب الزکوٰۃ میں اسنان ابل کی تشریح و تفسیر میں اور امام ترمذی نے قرأت وغیرہ کے متعدد ابواب میں ان کے اقوال نقل کیے ہیں،[4] مقدمہ فتح الباری کی فصل فی تسمیۃ من اشتہر بالکنیۃ ترکہ اسمہ غالبًا میں قاسم بن سلام کا نام بھی لیا ہے،[5]

رحلت وسفر: انھوں نے علم کی تلاش و جستجو میں متعدد مقامات کے سفر بھی کیے تھے، علامہ ابن سعد کا بیان ہے "طلب الحدیث والفقہ" یعنی حدیث و فقہ کی تلاش و جستجو کی، بغداد میں مدت

---

[1] [illegible] طبقات الشافعیہ [illegible] تہذیب التہذیب [illegible]

[2] [illegible] ابو عبید [illegible] تہذیب [illegible]

[3] تقریب التہذیب [illegible] تہذیب [illegible]

فتح الباری [illegible]

قیام کیا، ابن سعد میں ابن معین کے ہمراہ سفر کرنے، بصرہ، مکہ، اور مدینہ جانے کا ذکر بھی ملتا ہے،[1]

جامعیت | وہ مختلف علوم و فنون کے جامع اور گوناگوں اوصاف و کمالات سے متصف تھے، قاضی احمد بن کامل فرماتے ہیں: "ابو عبید اپنے زمانہ میں ہر فن کے امام، جملہ اسلامی علوم قرأت، تفسیر قرآن، فقہ، حدیث اور عربیت کے ماہر و متبحر عالم اور روایات و اخبار کے صحیح ناقل و راوی کی حیثیت سے مشہور و ممتاز تھے۔" ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ میں نے تین ایسے عدیم المثال آدمیوں کو دیکھا ہے جن کو جننے سے عورتیں قاصر ہیں، ان میں ایک ابو عبید بھی تھے، یہ اپنے علم و تبحر کے لحاظ سے ایسا پہاڑ معلوم ہوتے تھے جس میں روح پھونک دی گئی ہو، وہ ہر علمی مسئلہ پر بحث و گفتگو کر سکتے تھے اور انکی ہر چیز پر اچھی نظر تھی۔" عبد اللہ بن جعفر درستویہ کا بیان ہے کہ "ابو عبید بغداد کے ان مشہور علماء میں تھے جو کوفیوں کے نحوی مذہب کے قائل اور کوفیوں اور بصریوں سے نحو، لغت اور غریب الفاظ کے راوی، جملہ علوم میں یکتا و جامع، قرأت کے عالم اور علم و ادب کے تمام فنون میں کثیر التصانیف تھے۔"[2] علامہ ابن کثیر ان کی جامعیت کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں:۔

احد أئمة اللغة والفقه والحديث	وہ لغت، فقہ، حدیث، قرآن اور اخبار و
والقرآن والاخبار وايام الناس	وقائع کے ماہرین اور ائمۂ فن میں تھے۔

ذیل میں ان کے ان کمالات کا جدا جدا اختصار کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

حدیث | ابو عبید کو جن علوم سے خاص تعلق اور اشتغال تھا، ان میں ایک فن حدیث بھی ہے، اس کی طلب میں ان کے شوق و دلچسپی کا مورخین اور علمائے سیر نے خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، ابن حبان نے ان کو صاحب حدیث اور ازہری نے صاحب سنت لکھا ہے، اور دوسرے اصحاب فن نے بھی المحدث اور عالم بالحدیث کے الفاظ سے ان کا تذکرہ کیا ہے، اس فن میں انھوں نے کئی کتابیں بھی

---

[1] طبقات ابن سعد [illegible] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۳ و تہذیب التہذیب ج ۷ ص [illegible] [2] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص [illegible] و تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۱۴ و ۳۱۶، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۴۳، [3] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۲

یادگار چھوڑیں جو ان کے بعد علماء کی توجہ کا مرکز رہیں، ان کے ضبط و ثقاہت اور حفظ و عدالت میں بھی کسی نے کلام نہیں کیا ہے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ جو ابو عبید کی کتابوں کا دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کرے گا اس کو ان کی معرفت و حفظ حدیث کا پوری طرح علم ہو جائے گا، وہ حدیثوں کے حافظ اور اس کی دقیق علتوں سے پوری طرح باخبر تھے، امام ابو داؤد نے انھیں ثقہ و مامون، دار قطنی، یحییٰ بن معین اور ابن ناصر الدین نے ثقہ، حافظ ابن حجر نے ثقہ فاضل اور علامہ سیوطی نے ثقہ لا باس بہ لکھا ہے[1]۔

ابن حبان نے ان کا ثقات میں شمار کیا ہے، ابو حاتم نے گو ان سے کوئی روایت نہیں کی ہے مگر ان کو صدوق کہتے تھے، ابو عبید سے سماع اور کتابت حدیث کے متعلق حمدان بن سہل نے ابن معین سے دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ہم لوگ بھی ان سے پوچھتے ہیں۔

ابو عبید کی خدمت حدیث کا دائرہ بہت وسیع ہے، انھوں نے نقل و روایت، مشکلات و غریب حدیث کی تشریح و تفسیر کے علاوہ حمایت و نصرت حدیث کا فرض بھی انجام دیا، ابن حبان کا بیان ہے:-

وذب عن الحدیث ونصرہ و قمع من خالفہ[2] — حدیث کی مدافعت و نصرت سے مخالفین حدیث کا قلع قمع کر دیا۔

فقہ ابو عبید کا دوسرا خاص فن فقہ ہے، اس موضوع پر بھی ان کی متعدد تصانیف ہیں، خطیب وغیرہ کا بیان ہے کہ فقہ میں ابو عبید کی نظر بڑی دقیق تھی واقع ہوئی تھی، ازہری نے ان کو فقیہ، ابن حبان نے صاحب فقہ اور علامہ ذہبی نے فقیہ و مجتہد اور عارفا بالفقہ والاختلاف لکھا ہے، ان کا عہد ائمہ مجتہدین[…]

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۱۸، و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۱۶ و ۴۱۷ و طبقات الشافعیۃ ج ۱ ص ۲۷۲ و شذرات الذہب ج ۲ ص ۵۴ و تقریب التہذیب ص ۴۰۷ و بغیۃ الوعاۃ ص ۳۷۶ [2] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۳۱۷، تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۱۲ و طبقات الشافعیۃ ج ۱ ص ۲۷۱

خدا تعالیٰ حق و انصاف کو پسند کرتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ابو عبید محمد سے بڑے فقیہ تھے،[1] تفقہ و اجتہاد میں ان کی عظمت کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ امام شافعی سے جو اس فن کے مسلّم امام تھے انھوں نے نہ صرف مناظرہ کیا بلکہ اپنے دلائل و شواہد سے ان کو اپنا ہمنوا بھی بنالیا، "قرء" کے متعلق امام شافعی کا خیال تھا کہ اس سے حیض اور ابو عبید کے خیال میں طہر مراد ہے، اپنے اپنے خیال کو دونوں بزرگوں نے اس قدر مدلل اور پر زور طریقہ پر پیش کیا کہ بعد میں دونوں نے ایک دوسرے کے دلائل سے متاثر ہو کر ایک دوسرے کی رائے کو قبول کر لیا، علامہ ابن سبکی کو اس واقعہ کی صحت پر انشراح نہیں ہے، لیکن انھوں نے اس کی تردید بھی نہیں کی اور یہ لکھا ہے کہ اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو اس میں ابو عبید کی عظمت کی دو دلیلیں ہیں، پہلی چیز ان کی امام شافعی سے مناظرہ کی جرأت ہی حیرت انگیز ہے، اور اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ ہے کہ امام نے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا، حالانکہ میری معلومات کے مطابق اور کسی شخص سے مناظرہ کے بعد انھوں نے اپنے مسلک سے رجوع نہیں کیا ہے۔[2]

فقہی مسلک | ابو عبید خود فقیہ و مجتہد تھے، اور اس وقت کے مذاہب فقہ میں سے کسی مذہب کے مقلد نہ تھے، البتہ امام ابو حنیفہ کے مقابلہ میں امام مالک اور امام شافعی کے مذہب سے زیادہ قریب تھے، چنانچہ اپنی کتابوں میں ان بزرگوں کے مسالک کے شواہد، احادیث و روایات سے ان کی تطبیق اور نحوی و لغوی استدلال سے انکو قوی اور اقرب ثابت کیا ہے جس سے ان مذاہب کی جانب ان کے رجحان کا پتہ چلتا ہے۔[3] لیکن درحقیقت وہ کسی مذہب کے پابند نہ تھے، اس لیے علامہ ابن سبکی کا یہ بیان محل نظر ہے کہ "ابو عبید کے ہمارے اصحاب میں ہونے میں کوئی شک نہیں ہے" دوسرے علما کے اقوال سے بھی اس کی تائید نہیں ہوتی، ابن عبد البر نے بغداد کے ان لوگوں میں ان کا ذکر کیا ہے جنھوں نے امام شافعی کی صحبت میں رہ کر ان سے اخذ و استفادہ اور فقہ کی تحصیل کی اور لکھا ہے کہ

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ و ۶ [2] طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۷۳، ۲۷۴
[3] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴

وہ امام شافعی کے ساتھ رہے، ان کی کتابیں لکھیں، لیکن ان کے خود اپنے ممتاز اجتہادات ہیں اور وہ شافعی مذہب کی تقلید سے آزاد تھے، حقیقت یہ ہے کہ جس طرح امام احمد بن حنبل، اسحٰق بن راہویہ اور ابو ثور وغیرہ صاحب فقہ اور مجتہد ہونے کے باوجود امام شافعی کے دامن فیض سے وابستہ تھے، ٹھیک اسی قسم کا تعلق ابو عبید کا بھی تھا، ابن حبان نے بھی ان کے اختیار کا ذکر کیا ہے[1]۔

قرأت و تفسیر | قرآن مجید اور اس کے متعلقہ علوم پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، اور فن قرأت میں تو امام وقت تھے، ابو عبید کی کتاب القرأت کا ذکر کرتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ لوگوں نے ابو عبید کو ممتاز قاری قرار دیا ہے[2]، دوسرے قرآنی علوم پر بھی ان کی نظر تھی، مورخین نے ان کو احد ائمۃ القرآن اور صاحب قرآن وغیرہ لکھا ہے۔

ادب و عربیت | ابو عبید کو سب سے زیادہ لگاؤ ادب، لغت، نحو اور عربیت سے تھا، ان فنون میں ان کی کئی بلند پایہ کتابیں ہیں، قرآن و احادیث کی خدمت بھی انھوں نے ادبی و نحوی پہلوؤں سے زیادہ کی ہے، علامہ ابن سعد نے ان کو ادیب، صاحب نحو و عربیت لکھا ہے[3] اور حافظ ابن عبد البر اور ابن حبان نے ان کی معرفت ادب کا ذکر کیا ہے، ابن سبکی نے الادیب اور ذہبی نے اللغوی اور امام فی اللغۃ کے الفاظ کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے[4]، یاقوت نے معجم الادبا میں، ابو البرکات انباری نے طبقات الادباء میں اور علامہ سیوطی نے طبقات النحاۃ میں ان ہی حیثیتوں سے ان کا تذکرہ کیا ہے، ایک دفعہ کسی شخص نے ان سے لفظ "رباب" کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے اس کے مختلف معنوں کی وضاحت کی اور اس کی شرح میں متعدد اشعار پیش کیے[5]، علامہ ابن سبکی نے لغت و عربیت سے ان کی واقفیت و مہارت کی متعدد مثالیں دی ہیں[6]

---

[1] [illegible] تہذیب التہذیب [illegible] [2] کشف الظنون [illegible] [3] طبقات ابن سعد جلد ہفتم قسم دوم ص [illegible] [4] [illegible] تہذیب التہذیب [illegible] طبقات الشافعیہ [illegible] [5] معجم الادباء [illegible] [6] طبقات الشافعیہ [illegible]

علم تاریخ و انساب | وہ ایام و انساب کے بھی ماہر تھے، ان فنون میں ان کی مستقل کتابیں ہیں اور ان کی دوسری تصانیف میں بھی ان کے متعلق بہت سے معلومات ہیں۔

تلاش و تحقیق | ان کی تلاش و تحقیق کا یہ حال تھا کہ اپنی کتاب غریب الحدیث کی تکمیل میں ۴۰ سال تک مصروف رہے، ان کا بیان ہے کہ اس کے متعلق جب اصحاب علم سے کوئی نکتہ اور مفید بات سنتا تو اس کے مقام پر درج کر لیتا، ان کا قول تھا کہ مجھ کو کسی چیز کا علم حاصل کر کے اتنی خوشی ہوتی تھی کہ رات بھر نیند نہیں آتی تھی، اور تم لوگوں کا حال یہ ہے کہ چار پانچ مہینے میرے یہاں قیام کر کے گھبرا جاتے ہو، اس ذوق و شوق کی بنا پر اپنے معاصرین بلکہ اپنے سے کمتر درجہ کے لوگوں سے بھی استفادہ میں کوئی عار نہیں تھا۔[1]

اہل دولت سے گریز اور اہل علم کی عظمت | اصحاب دولت سے اپنا دامن بچاتے تھے، اور اہل علم کی عظمت کرتے تھے، ایک مرتبہ امیر طاہر نے جس سے ان کے بڑے تعلقات تھے، اپنے گھر بلا کر ان کی کتاب غریب الحدیث سننا چاہا تو انکار کر دیا، لیکن علی بن مدینی اور عباس عنبری نے اس کے سماع کی خواہش ظاہر کی تو وہ روز آنہ خود ان کے گھر جا کر سنا آتے تھے۔[2]

عہدۂ قضا | ثابت بن نصر جب طرسوس کا گورنر ہوا تو ابو عبید کو وہاں کا قاضی مقرر کیا، اس منصب پر وہ ۱۸ سال تک فائز رہے۔[3]

اہل علم کا اعتراف | ان کے علم و فضل اور کمال کے متعلق بیشمار اقوال کتابوں میں مذکور ہیں، ان کے اساتذہ، تلامذہ، معاصرین اور سوانح نگار سب ان کے کمالات کے مداح و معترف ہیں، اسحٰق ابن راہویہ فرماتے تھے کہ "ابو عبید مجھ سے اور امام احمد اور امام شافعی سے زیادہ صاحب علم اور علوم و ادب اور حدیث اور کمال میں ہم سب سے زیادہ جامع اور فائق تھے، ہم لوگ ان تک نہ پہنچ سکتے تھے"

---

[1] [illegible] [2] [illegible] تاریخ بغداد ج ۱۲
[3] [illegible] ابن خلکان ج ۱ ص ۱۶۳

مگر وہ ہم سے مستغنی ہیں"۔ امام احمد فرماتے ہیں کہ "وہ ہمارے شیخ اور ان بزرگوں میں تھے جن کے خیر و برکت میں برابر اضافہ ہوتا ہے"۔ ابو العباس ثعلب کا بیان ہے کہ "وہ بنی اسرائیل میں ہوتے تو ایک عجیب چیز سمجھے جاتے"۔ عبد اللہ بن طاہر فرماتے ہیں کہ "چار آدمی اپنے اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے، عبد اللہ ابن عباس، عامر شعبی، قاسم بن معن اور قاسم بن سلام"۔ حاکم صاحب مستدرک اور ابن سبکی نے الامام الجلیل، دار قطنی نے امام اور جبل العلم، ابن عماد اور خزرجی نے احد اعلام الائمہ، ابن حبان اور ابن کثیر نے احد ائمۃ الدنیا، حافظ ابن حجر نے الامام المشہور، ازہری اور احمد بن کامل نے عالم فاضل اور یافعی و ذہبی نے العلامۃ العالم اور ذہبی نے الامام البحر جیسے القاب کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔

تدین و تقویٰ علمی فضیلت کے ساتھ وہ تدین و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، قاضی احمد بن کامل کا بیان ہے کہ "وہ علم و دین دونوں میں فاضل اور علمائے ربانیین میں تھے"، مورخین اور ارباب سیر ان کو "وکان ذا فضل و دین" لکھتے ہیں، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ "وہ نہایت متدین و متورع تھے میں نے کسی شخص کو ان کے علم، دینداری یا اور کسی معاملہ میں طعن کرنے والا نہیں پایا"۔ ازہری نے بھی متدین اور ابن حبان نے صاحب دین و ورع لکھا ہے۔ ابن معین فرماتے ہیں کہ ایک روز میں اصمعی کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ابو عبید آتے ہوئے نظر آئے، اصمعی نے بہت غور سے ان پر نگاہ ڈالی اور جب وہ قریب آگئے تو لوگوں سے کہا جانتے ہو آنے والا کون ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں! اصمعی نے کہا یہ آنے والا جب تک زندہ رہے گا دنیا اور اہل دنیا تباہ نہیں ہو سکتے"۔

عبادت و ریاضت رات کا تہائی حصہ عبادت و ریاضت میں گذارتے، حج بیت اللہ سے دو دفعہ مشرف ہوئے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں :-

---

تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۱۳، [illegible] طبقات ابن سعد [illegible] ص [illegible] و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص [illegible] و طبقات الشافعیہ [illegible]

[illegible] تہذیب ص ۲۱۲ و شذرات الذہب ج ۲ ص [illegible] و تہذیب ج ۸ ص [illegible] و تقریب ص [illegible] العبر [illegible]

[illegible] ص [illegible] و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص [illegible] [illegible] ابن خلکان ج ۲ ص [illegible] و تہذیب [illegible]

وذکر لہ من العبادۃ والاجتہاد فی العبادۃ شیئاً کثیراً[1] — یعنی ان کی عبادت و ریاضت کے بہت سے واقعات ہیں۔

دنیا سے بے رغبتی ابو عبید کو امیر طاہر۔۔۔ سے کے دربار میں بڑا رسوخ اور تقرب حاصل تھا اور وہ ان کے ساتھ بڑا سلوک کرتا تھا، لیکن ان کو خود دنیاوی مال و متاع سے کوئی رغبت نہ تھی، اور وہ بقدر کفاف ہی پر اکتفا کرتے تھے اور زائد رقم خیرات کے کاموں میں صرف کر دیتے تھے، ایک دفعہ ابو دلف نے امیر طاہر۔۔۔ سے خواہش کی کہ ابو عبید کو اس کے یہاں دو مہینے قیام کی اجازت دیں، امیر نے منظور کر لیا، جب ابو عبید دو مہینے قیام کے بعد ابو دلف کے یہاں سے واپس ہونے لگے تو اس نے تیس ہزار درہم نذر میں پیش کیے لیکن ابو عبید نے قبول نہیں کیا اور کہا کہ میں ایسے شخص سے وابستہ ہوں جس کی فیاضیوں نے دوسروں کے صلہ و انعام سے بے نیاز کر دیا ہے۔ واپسی کے بعد امیر نے ۳۰ ہزار دینار پیش کیے تو فرمایا کہ آپ کے [illegible] نے مجھے غنی بنا دیا ہے، مگر اس کو قبول کر لوں گا اور اس کے اسلحہ، گھوڑے اور دوسرے سامان جنگ خرید کر سرحد پر بھیجوں گا، اس کا ثواب آپ کو بھی ملے گا۔[2]

اتباع سنت اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا۔ اس کے خلاف کوئی بات دیکھنا سخت ناپسند کرتے تھے۔ تبع سنت لوگوں کی تحسین فرماتے تھے۔ اور خلاف سنت باتوں کو دیکھ کر کبیدہ خاطر ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ اتباع سنت کی مثال ہاتھ میں چنگاری لینے کی ہے اور اس زمانہ میں وہ جہاد سے افضل ہے۔[3]

سیرت اخلاق و سیرت کے بارہ میں سوانح نگاروں نے لکھا ہے وکان ذا سیرۃ جمیلۃ۔[4]

صبر و حلم مخالفین کی دلآزار باتوں کو صبر سے برداشت کرتے تھے، اپنے معترضین کے خلاف ان میں کوئی انتقامی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا، لوگوں نے ان سے کہا کہ اسحٰق موصلی آپ کی کتاب الغریب المصنف

۱؎ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، ۶ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۳۵ و البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۱ ۲؎ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۶ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۷۰ ۳؎ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۱۳ ۴؎ ایضاً ص ۴۰۹ ۵؎ تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۹۳

میں ایک ہزار غلطیاں بتاتے ہیں، انھوں نے اس کا نہایت متانت کے ساتھ جواب دیا اور کسی قسم کی ناگواری ظاہر نہیں کی اور نہ اس کے جواب میں اسحٰق موصلی پر کسی طرح کی نکتہ چینی اور عیب جوئی کی،[۱]

خودداری | طبعاً نہایت خوددار تھے، طاہر بن عبداللہ بن طاہر سے ان کے بڑے تعلقات تھے اور وہ ان کو بڑے بڑے انعام و اکرام سے نوازتا رہتا تھا، مگر اس کے باوجود بھی انھوں نے خودداری کو ہاتھ سے جانے نہ دیا، امیر نوجوانی میں جب اس کے والد زندہ تھے حج کے ارادہ سے نکلا اور خراسان میں امیر اسحٰق بن ابراہیم کے یہاں قیام کیا، اسحٰق نے اکابر علماء کے پاس کہلا بھیجا کہ وہ طاہر کے پاس آکر اس کو استفادہ کا موقع دیں، اس حکم پر اکثر محدثین اور فقہاء اس کے پاس گئے مگر ابو عبید نے جانے سے انکار کر دیا، اور کہلا بھیجا کہ علم کسی کے پاس نہیں جاتا بلکہ اس کے پاس جایا جاتا ہے، اس جواب پر اسحٰق نے برہم ہو کر ان کا دو ہزار ماہانہ وظیفہ بند کرا دیا، اور امیر عبداللہ کو اس کی اطلاع دے دی، لیکن عبداللہ پر ابو عبید کے اس کردار کا یہ اثر ہوا کہ اس نے اسحٰق کو لکھا کہ ابو عبید نے بالکل صحیح کہا ہے، اس لیے میں ان کا وظیفہ دوچند کرتا ہوں، اب تک تم نے جو رقم وضع کی ہے اس کو مع اضافہ کے ادا کر دو۔[۲]

مرجعیت و مقبولیت | اپنے علمی، دینی اور اخلاقی کمالات کی وجہ سے عوام و خواص ہر طبقہ میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے، علماء اور اصحاب قلم کی طرح امراء و رؤساء بھی ان کے مداح اور قدرداں تھے، حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے کہ ابن قتیبہ کو مختلف علوم میں فضیلت و تقدم کا دعویٰ ہے لیکن اہل علم نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے[۳] ہر طبقہ و جماعت کے لوگوں میں مقبولیت اور شہرت ابو عبید کا حصہ ہے، ابن سبکی اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے "ہو الامام المقبول عند الکل"۔[۴]

وفات | معتصم باللہ کے عہد خلافت ۲۲۴ھ میں مکہ معظمہ میں انتقال کیا، ۲۲۲ھ، ۲۲۳ھ بھی بتائے گئے ہیں۔

۱؎ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۶، ۲؎ ایضاً ص ۴۰۵، ۳؎ معجم الادباء ج ۶ ص ۱۶۵، ۴؎ تہذیب ج ۷ ص ۳۱۶ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۷۰

کی روایتیں بھی ہیں، پہلی روایت زیادہ صحیح اور مشہور ہے، عام روایتوں کے مطابق وفات کے وقت زیادہ سے زیادہ ۶۷ سال کی عمر تھی، لیکن ابن کثیر کا بیان ہے کہ ۸۰ سال سے متجاوز ہو چکے تھے، ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ ۷۳ سال کی عمر میں انتقال کیا اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے، اس لیے کہ مشہور روایت کے مطابق سنہ ولادت ۱۵۰ھ اور سنہ وفات ۲۲۴ھ ہے، اس لحاظ سے انتقال کے وقت ان کی عمر یقیناً ۷۳، ۷۴ سال کی رہی ہوگی، عبد اللہ بن طاہر نے ان کی وفات پر ان اشعار میں اپنے جذبات و تاثرات کا اظہار کیا۔

یا طالب العلم قد مات ابن سلام	وکان فارس علم غیر محجام
مات الذی کان فینا رابع أربعة	لم یلق مثلهم اسناد احکام
خیر البریة عبد الله اولهم	وعامر ولنعم التالویا عم
هما اللذان انافا فوق غیرهما	والقاسمان ابن معن وابن سلام

(ترجمہ) اے علم کے عاشقو! ابن سلام کی وفات ہو گئی، بلاشبہ وہ شہسوار علم تھا، اس شخص کی موت ہوئی ہے جو بے نظیر اور ان چار آدمیوں میں سے چوتھا تھا جن کے مانند معتبر و مستند لوگ مفقود ہیں، ان میں پہلے شخص جو مخلوقات میں افضل ترین تھے، عبد اللہ بن عباس اور دوسرے عامر شعبی ہیں اور اے عامر آپ کتنے عمدہ تابعی تھے، یہ دونوں اور قاسم بن معن اور قاسم بن سلام تمام لوگوں میں فائق و برتر تھے۔

وفات کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے جو ان کی زندگی کی دلیل ہے، ابوبکر زبیدی کا بیان ہے کہ حج سے فراغت کے بعد جب ابو عبید نے واپسی کا ارادہ کیا تو خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف دیدار نصیب ہوا، ابو عبید کا بیان ہے کہ میں نے دیکھا کہ آپ جلوہ افروز ہیں، اور کچھ خدام جاں نثار بھی خدمت و حفاظت کے لیے موجود ہیں، زائرین آکر سلام عرض کرتے اور

مصافحہ کرتے ہیں لیکن مجھے باریابی کی اجازت نہیں تھی، میں نے دربانوں سے کہا کہ تم لوگ مجھے ان کی خدمت میں پہنچنے کا موقع کیوں نہیں دیتے، انھوں نے کہا تم کل عراق جا رہے ہو تم کو کیسے اجازت مل سکتی ہے، میں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، اس دولت کو چھوڑ کر میں عراق نہیں جا سکتا، ان لوگوں نے مجھ سے عہد و پیمان لینے کے بعد مجھے حاضری کا موقع دیا اور سلام و مصافحہ کی سعادت میسر آئی، اس کے بعد انھوں نے روانگی کا ارادہ فسخ کر کے مکہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اور یہیں انتقال کیا اور جعفر کے گھر میں دفن کیے گئے، بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ مدینہ میں خواب دیکھا تھا اور وہیں انتقال کیا[1]

حلیہ | نہایت وجیہ و شکیل اور پر رعب و باوقار تھے، حنا کا خضاب لگاتے تھے،[2]

تصنیفات | علمی کمالات کے ساتھ وہ مسلم مصنف اور اہل قلم بھی تھے، ان کی تصنیفات کی خوبی کا جاحظ جیسے بلند پایہ ادیب و انشا پرداز کو بھی اعتراف ہے کہ لم یکتب الناس اصح من کتبه ولا اکثر فائدۃ۔ ان سے زیادہ صحیح، عمدہ اور مفید کتابیں لوگوں نے نہیں لکھیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان کی تصنیفات مشہور و مقبول اور لوگوں میں شائع و ذائع تھیں خطیب اور علامہ ابن حجر لکھتے ہیں، ان کی تمام کتابیں ہر خطہ میں مستحسن اور مقبول سمجھی جاتی تھیں، اور انکے رواۃ بڑے ثقہ، معتبر اور اہم لوگ تھے، ابن مستویہ فارسی کا بیان ہے کہ انھوں نے قرآن، فقہ، حدیث، امثال، معانی، ادب، اور شعر وغیرہ کے متعلق بڑی مفید کتابیں لکھیں جو روایت کے حسن اور نقل کی صحت کے لحاظ سے بڑی عمدہ ہیں، انھوں نے مختلف فنون پر کتابیں لکھیں، مورخین اور علمائے سیر نے ان کو کثیر التصانیف اور صاحب المصنفات الکثیرۃ لکھا ہے، ابن ندیم وغیرہ نے ان کی بہت سی کتابوں کے نام لکھے ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے علاوہ بھی بکثرت کتابیں انھوں نے لکھیں،[3] ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور

---

[1] [illegible]
[2] [illegible]
[3] [illegible]

بعض کتابوں کے متعلق مختصر معلومات پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) کتاب الاحداث، (۲) کتاب الحجر والتسلیم (۳) کتاب الحیض (۴) کتاب ادب القاضی (۵) کتاب الناسخ والمنسوخ (۶) کتاب الایمان والنذور (یہ غالباً فقہی کتابیں ہیں) (۷) کتاب جمع القرآن (۸) کتاب فضائل القرآن (۹) کتاب المقصور والممدود (قرأت وقرآن کے موضوع پر) (۱۰) کتاب النسب (۱۱) کتاب الشعراء (۱۲) کتاب المذکر والمؤنث (یہ سب انساب، شعر اور نحو وغیرہ کے متعلق ہیں) (۱۳) کتاب الطہارۃ یا کتاب الطہور۔ اس کا ان کتب حدیث میں شمار ہوتا ہے جو کسی خاص باب کی حدیثوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔[۱] حافظ عبد الغنی بن سعید کا بیان ہے کہ اس کی دو حدیثوں کو کسی اور نے ذکر نہیں کیا ہے۔[۲] (۱۴) کتاب القرأت۔ یہ فن قرأت کی اہم کتاب ہے، بعض لوگوں نے اس کو اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب بتایا ہے، خواہ یہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اتنا مسلم ہے کہ کوئی اس طرز کی کوئی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھی۔[۳] (۱۵) کتاب الامثال یا کتاب الامثال السائرۃ ابو عبید سے پہلے اصمعی، ابوزید، ابو عبیدہ، نضر بن شمیل، مفضل ضبی اور ابن اعرابی وغیرہ نے اس موضوع پر جو کتابیں لکھی تھیں، یہ کتاب ان سب کی جامع ہے، علاوہ ازیں اس میں روایات و اقوال کو ابواب کے اندر جمع کیا گیا ہے، ابو عبید عبد اللہ بن عبد العزیز اندلسی متوفی ۴۸۷ھ نے فصل المقال کے نام سے اس کی شرح لکھی جس میں اس کے مشکلات کی تشریح و وضاحت کے علاوہ بعض اضافے بھی ہیں، ابو المظفر محمد بن آدم ۴۱۴ھ نے اس کی شرح لکھی تھی۔[۴] (۱۶) کتاب معانی القرآن اس موضوع پر اس سے پہلے ابو عبیدہ، قطرب، مستنیر، اخفش اور کوفیوں میں کسائی اور فراء نے کتابیں لکھی تھیں، یہ کتاب ان سب کی جامع ہونے کے علاوہ آثار و اسانید اور صحابہ، تابعین اور

---

[۱] الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۰ [۲] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۳ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۷۱ [۳] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۳ و خلاصہ ج ۲ ص ۳۱۱ و کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۰۱ [۴] تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴ و کشف الظنون ج ۱ ص ۱۵۰

مختلف تفسیروں کا مجموعہ ہے، لیکن اس کا نصف حصہ ہی شاگردوں کو سنا سکے تھے کہ انتقال کر گئے۔[1]
(۱۷) غریب القرآن۔ اس کے متعلق کوئی وضاحت نہیں ملتی، غالباً یہ غریب الحدیث کے انداز کی کتاب ہے، جس کا آگے ذکر کیا جائے گا۔ (۱۸) غریب المصنف یا المصنف الغریب۔ یہ ابو عبید کی اہم کتابوں میں ہے، بعض اصحاب سیر کے نزدیک ان کی سب سے اہم اور بے نظیر کتاب یہی ہے۔ اس کو نضر بن شمیل کی کتاب الصفات کے انداز پر مرتب کیا ہے۔ اس میں پہلے انسان، پھر عرش اور اس کے بعد گھوڑوں اور اونٹوں اور دوسرے انواع و اصناف کی خلقت کا یکے بعد دیگرے ذکر ہے۔[2] اس کتاب کو مصنف خود بھی بہت پسند کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ یہ میرے نزدیک دس ہزار دینار سے بھی بہتر ہے۔[3] ابو نعیم احمد بن عبد اللہ اصفہانی اور علی بن حمزہ بصری متوفی ۳۷۵ھ نے اس کا رد لکھا تھا، اس کے باوجود ابو عبید کی کتاب کی شہرت و مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا، اور وہ عرصہ دراز تک علمائے فن میں مشہور و متداول رہی۔ ابو العباس احمد بن محمد مرسی متوفی ۶۵۵ھ اور یوسف بن حسن بن سیرا متوفی ۳۸۵ھ نے اس کی شرح لکھی، آخری شرح منظوم تھی۔[4] (۱۹) غریب الحدیث۔ اس کتاب میں حدیثوں کے دقیق مسائل و مباحث اور مشکل الفاظ و لغات کی تشریح کی گئی ہے، ہلال بن العلاء الرقی فرماتے ہیں کہ اس امت پر اللہ نے چار بندوں کے ذریعہ احسان عظیم کیا ہے، ان میں ایک ابو عبید بھی ہیں، انھوں نے غریب حدیثوں کی تشریح و تفسیر کر کے لوگوں کو غلطی میں پڑنے سے بچا لیا، اس کتاب کو بڑی مقبولیت اور شہرت حاصل ہوئی، اور تمام علمائے فن نے اس کو مستند، اہم اور لائق اقتدا تصنیف قرار دیا، امام احمد کو جب ان کے صاحبزادے عبد اللہ نے یہ کتاب دکھائی تو انھوں نے اس کی بڑی تحسین کی اور کہا اللہ ابو عبید کو جزائے خیر عطا فرمائے، ایک روایت کے مطابق امام صاحب نے خود اس کو اپنے ہاتھ سے نقل کیا تھا،[5] محدثین میں امام بخاری،

---

۱ معجم الادباء ج ۱۶ ص [illegible] و کشف الظنون ج ۲ ص [illegible] ۲ ایضاً ۳ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص [illegible]

۴ فہرست ابن ندیم ص [illegible] بغیۃ الوعاۃ [illegible] طبقات النحاۃ [illegible] ۵ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۵۹

مسلم، ابو داؤد اور ترمذی نے اس کی تشریحات اپنی کتابوں میں درج کی ہیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس موضوع پر سب سے قدیم اور پہلی تصنیف یہی ہے لیکن یہ صحیح نہیں، البتہ یہ درست ہے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان کو اتنی شہرت، اہمیت اور اعتبار نصیب نہیں ہوا، خطیب کا بیان ہے کہ اس سے پہلے ابو عبیدہ، قطرب، اخفش اور نضر وغیرہ نے اس فن پر جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں سندوں کا ذکر نہیں ہے، ابو عدنان نحوی بصری کی کتاب میں سندوں کا ذکر ہے لیکن وہ بہت مختصر ہے، اور اس کی ترتیب و تبویب ابواب سنن پر کی گئی ہے، ابو عبید نے متقدمین کی کتابوں کا اکثر حصہ تشریح و وضاحت کے بعد جمع کر دیا ہے، اور روایات کی سندیں بھی ذکر کی ہیں، اور ترتیب و تبویب مسانید پر کی ہے یعنی ہر ہر صحابی اور تابعی کی روایات کو الگ الگ بیان کیا ہے، اس کو مصنف نے بڑی محنت و کاوش سے ۴۰ سال میں مکمل کیا تھا، اس کی تکمیل کے بعد مصنف نے جب اس کو امیر طاہر کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اسے بہت پسند کیا اور کہا کہ جس شخص نے ایسی بلند پایہ کتاب لکھی ہے وہ یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس کو فکر معاش سے بے نیاز کر دیا جائے اور اس نے دس ہزار درہم ابو عبید کا وظیفہ مقرر کر دیا۔[1]

گو ابو عبید کی اس موضوع پر پہلی کتاب نہیں ہے مگر اس نے بعد کے لوگوں کے لیے ایک نئی راہ ضرور نکال دی، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں" دوسری صدی ہجری کے بعد ابو عبید قاسم بن سلام نے اپنی کتاب اس طرح مرتب کی کہ وہی قدوہ اور نمونہ بن گئی، یہ کتاب انکی عمر کا حاصل ہے، اس میں انھوں نے اپنی عمر کھپا دی تھی، ابو عبید کے بعد ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے ان کے نقش قدم کا تتبع کیا، ان کی کتاب بھی اسی پایہ کی یا اس سے کچھ بہتر سمجھی جاتی ہے، اور ان کو خوبی و شہرت مسلم کہ ان دونوں کتابوں کے بعد حدیث میں کوئی ایسی غریب چیز نہیں رہ جاتی

---

[1] تاریخ بغداد [illegible] و تاریخ ابن خلکان [illegible] و تذکرۃ [illegible]

معانی تفسیروں کا مجموعہ ہے، اسی زمانہ میں ابراہیم بن اسحٰق حربی نے بھی ایک ضخیم کتاب پانچ جلدوں میں
(۱۹) غریب الحدیث، روایات کے اسناد و متون کی کثرت و تفصیل کی وجہ سے وہ بڑی ضخیم ہو گئی۔
اور بے شمار فوائد پر مشتمل ہونے کے باوجود متروک ہے، یہ کتاب ہر طبقہ و فن کے لوگوں میں عرصہ تک
مشہور و متداول اور غریب الفاظ کے سلسلہ میں بحث و تحقیق میں لوگوں کا مرکز رہ چکی ہے، اور وہ مشکلات
میں اس کی جانب رجوع اور اس کی تحقیقات پر اعتماد کرتے رہا[1] ہے، خطیب کا بیان ہے کہ یہ نہایت
عمدہ اور محدثین، فقہا اور اہل سنت کی پسندیدہ کتاب ہے، اس میں ان سب کے ذوق اور
ضرورت کا سامان موجود ہے۔ بھی بہتر

محب الدین احمد بن عبد اللہ طبری متوفی ۶۹۴ھ نے تقریب لقاسم بن سلام
کے نام سے اس کا مختصر لکھا تھا جس کی ترتیب حروف پر کی گئی ہے،[1] اس کا ایک قلمی
نسخہ رامپور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔[2]

(۲۰) کتاب الاموال۔ ابو عبید کی مذکورۂ بالا تمام کتابوں میں غیر مطبوعہ ... چھپ چکی ہے،
اور بہت سے اجزا و ابواب پر مشتمل ہے، ہر جز کے شروع میں مصنف نے اپنی سند کا بھی
ذکر کیا ہے، یہ کتاب اسلامی حکومتوں کے مالیاتی نظام سے متعلق مسائل پر جامع اور
حاوی ہے،

طریقۂ تصنیف | اس کتاب میں پہلے موضوع زیر بحث کی تشریح و وضاحت اور
اس کے متعلق احادیث و روایات، خلفائے راشدین، عمر بن عبد العزیز کے فیصلے، صحابہ کرام
و تابعین کے فتاوی اور ائمہ کے اقوال و آراء بیان کر کے توضیح کی گئی ہے جس کی حدیث سے تطبیق ہے، پھر
اختصار کے ساتھ پوری بحث کا خلاصہ کر دیا گیا ہے، مثلاً خمس کے متعلق لکھتے ہیں:

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۰۳ و تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۴۰۴ [2] فہرست کتب خانہ رامپور ج ۱ ص ۱۲۹

اس سلسلہ میں ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تین سنتیں معلوم ہیں (۱) انھیں احسان کرکے چھوڑ دینا (۲) فدیہ لینا (۳) قتل کر دینا، قرآن مجید میں بھی ان امور ثلاثہ کا ذکر ہے

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد) — پھر یا احسان کیجیو اور یا معاوضہ لیجیو، جب تک کہ لڑائی رکھ دے اپنے اوزار۔

نیز فرمایا:

فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ (توبہ) — تو مارو مشرکوں کو جہاں پاؤ

ان میں سے ہر ایک پر نبی اکرمؐ کا عمل رہا ہے، احسان کرکے چھوڑ دینے کی مثال فتح مکہ میں ملتی ہے، اس کے متعلق احادیث اوپر نقل کیا جا چکا ہے اور ہم بتا چکے ہیں کہ فتح مکہ میں آپ نے کسی کے جان و مال سے تعارض نہیں کیا تھا بلکہ یہ اعلان عام کر دیا تھا کہ الا لا یجهزن علی جریح ولا یتبعن مدبر ولا یقتلن اسیر ومن اغلق بابه فهو آمن۔ یعنی نہ تو کسی مجروح پر ہتھیار اٹھایا جائے نہ بھاگنے والے کا تعاقب کیا جائے اور نہ کوئی قیدی قتل کیا جائے، جو شخص اپنا دروازہ بند کر لے گا وہ مامون ہے۔ اس مفہوم کی دوسری روایات نقل کرکے اہل مکہ کے ساتھ آپ کے احسان کی وضاحت کی ہے، پھر بتایا ہے کہ خیبر اگرچہ بزور شمشیر فتح ہوا تھا لیکن آپ نے اہل خیبر کے ساتھ بھی احسان کا معاملہ کیا تھا، اس قسم کی بعض اور مثالیں نقل کرکے لکھا ہے کہ من و احسان کے متعلق رسول اللہؐ کا یہ مسنون عمل تھا، اسی کے مطابق خلفاء نے بھی عمل کیا، اس سلسلہ میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے طرز عمل کا ذکر کیا ہے۔[1]

روایات کی حیثیت روایات و احادیث کی قوت و استناد کے لحاظ سے کتاب الاموال کو زیادہ مستند نہیں سمجھا جاتا، اس میں زیادہ تر اعمال و سنن نبوی اور صحابہ و تابعین کے طرز عمل اور مسلک کا ذکر ہے جن کی تائید حدیث کی دوسری مستند کتابوں کی روایتوں سے ہو جاتی ہے، ابن حجر جیسے ائمہ فن کا بیان ہے کہ وہی روایتیں ضعیف ہیں جو ابو عبید نے عمر بن عثمان کے واسطے سے ہیں[2] اس لئے کتاب کے استناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔

---

[1] کتاب الاموال ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ [2] تہذیب التہذیب ج ۸ ص ۲۱۶

بعض خصوصیات | حدیث کی طرح فقہی اور اجتہادی حیثیت سے بھی اس کتاب کا پایہ نہایت بلند ہے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ یہ فقہ کی بہترین کتاب ہے۔[1] مصنف نے اس میں صحابہ، تابعین اور ائمہ فقہ و حدیث کے اقوال و فتاوی اور ان کے دلائل کا ذکر کر کے ان پر تنقید و محاکمہ کیا ہے، اور اپنی ترجیح کو دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

۲۔ آیات کے مفہوم، شانِ نزول، علمائے تفسیر کے اختلافات، آیت قرآنی سے احادیث کے نسخ وغیرہ کے تفسیری مباحث بھی ہیں۔

۳۔ مغازی، ایام و وقائع، انساب، لغت و عربیت، اشعارِ عرب اور فارسی زبان وغیرہ سے بھی مصنف کی واقفیت و معرفت کا اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے۔

علمی و تحقیقی معیار | مصنف نے اکثر مسائل و مباحث پر بڑی عالمانہ اور محققانہ بحث کی ہے جس سے ان کی وسعتِ نظر اور قوتِ استدلال کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی ایک مثال یہاں درج کی جاتی ہے۔

خراج اور عشر سے متعلق حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے واسطے بعض روایتیں نقل کر کے لکھتے ہیں:

"ان روایتوں کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جو مسلمان خراج ادا کرتا ہو اس پر عشر نہیں عائد ہوگا کیونکہ حضرت عمرؓ و علیؓ نے دہقانی لوگوں کے اسلام لانے پر عشر کی کوئی شرط نہیں لگائی تھی، اسی کے مطابق امام ابو حنیفہ بھی فتویٰ دیتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ و علیؓ کا عشر کا ذکر نہ کرنا اس کے سقوط کی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کی اراضی میں عشر مستحق مسلمانوں کا لازمی حق ہے جس کے لیے کسی شرط کی ضرورت نہیں ہے، رسول اللہ صلعم نے فرمایا ہے کہ من احیا ارضا میتۃ فھی لہ یعنی جس نے افتادہ زمین کو کھیتی کر کے آباد کیا وہ اس کی ملکیت ہوگی، اس میں آپ نے عشر یا خراج کا تذکرہ نہیں فرمایا ہے، مگر کیا اس کی وجہ سے کسی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ اس قسم کی زمین کی پیداوار پر عشر نہیں ہوگا، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد خلفاء نے لوگوں میں جو اراضی تقسیم کیں، ان میں عشر کی شرط نہیں لگائی، کیونکہ یہ تو ہر مسلمان کے ذمہ لازمی حق ہے، اور اس کا [illegible]

---

[1] [illegible] ج ۱۳ ص ۳۰۵

کیا جائے گا، غلاموں کا ذکر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ خراجی زمینوں کی حیثیت بالکل ویسی ہی ہے جیسے کسی مسلمان کی کسی زمین کو اس کے مالک سے کرایہ پر لیکر اس میں زراعت کرے تو کرایہ اس کرایہ دار پر ایک ساتھ ہی ادا ہو گا اور عشر بھی واجب ہوگا جبکہ وہ بقدر نصاب پیداوار ہو اور یہی افاضل علماء اور محدثین کا مسلک ہے۔۔۔۔ بعض لوگوں نے پیداوار میں ابو عیاض کی روایت ما احب ان یجتمع علی المسلم صدقۃ المسلم وجزیۃ الکافر یعنی کسی مسلمان کے لیے یہ پسند نہیں کرتا کہ اس پر مسلمانوں کا صدقہ (عشر) اور کافروں کا جزیہ (خراج) دونوں واجب ہوں، سے استدلال کیا ہے کہ عشر و خراج بیک وقت ایک ہی زمین پر واجب نہیں ہو سکتے حالانکہ اس کا اس سے یہ منشا ہی نہیں ہے بلکہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کا مسلک یہ تھا کہ وہ ایک مسلمان کے لیے خراجی زمین کا لینا پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ اس طرح اس پر دو حقوق واجب ہو جائیں گے، یہی ان کا مشہور مسلک ہے، کسی صحابی کے بارے میں ہم کو معلوم نہیں جس نے یہ کہا ہو کہ لا یجتمع علیہ العشر والخراج یعنی مسلمانوں پر عشر و خراج دونوں واجب نہیں ہو سکتے اور نہ تابعین میں کسی کا یہ مسلک ہے، صرف ایک روایت عکرمہ سے مرفوعاً مروی ہے مگر وہ تنہا ایک خراسانی شخص کی روایت ہے۔[1]

مصنف کی تحقیق و تدقیق کا ان مقامات پر خاص طور سے اندازہ ہوتا ہے جہاں انھوں نے حضرت عمرؓ کے بعض فتاویٰ اور فیصلوں کی جن سے بعض متجددین یہ استدلال کرتے ہیں کہ کتاب و سنت کے صریح احکام کی موجودگی میں بھی قیاس و اجتہاد سے کام لیا جا سکتا ہے، توجیہ و تاویل کر کے ثابت کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا منشا عین شریعت کے احکام و مصالح کے مطابق تھا اور ان کو اپنے اجتہاد کو حدیث پر مقدم کرنے کا کوئی ادنیٰ خیال بھی نہ تھا۔

... صاحب شرح سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ احادیث کے معنی کا مفہوم متعین کرنے میں بھی صحابہ کے بیان کردہ مفہوم و مطلب ہی کو مستند و معتبر قرار دیتے ہیں۔

---

[1] کتاب الاموال ص ۸۷۔

وہ احادیث کو اولین اہمیت دیتے ہیں، پھر خلفائے اربعہ، صحابہ، تابعین اور سلف صالحین کے اقوال کو اپنا ماخذ و استدلال قرار دیتے ہیں، اپنے رجحان کا ذکر بھی ان بزرگوں کے اقوال و اعمال کی روشنی میں کرتے ہیں، ان کے نزدیک احادیث قرآن کے اجمال کی مفسر و مبین ہیں، اور آیات قرآنی کا وہی مفہوم معتبر ہے جس کی تعیین سنت نے کر دی ہے، ایسے مواقع پر احادیث و قرآن میں تناقض ثابت کرنے کے رجحان کی انھوں نے مذمت کی ہے۔

۱۳۵۳ھ میں محمد حامد الفقی نے پہلی مرتبہ کتاب الاموال کو ۶۱۴ صفحات میں مصر سے کئی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد شائع کیا ہے، شروع میں ایک مقدمہ بھی ہے، اس میں ابو عبید کے سوانح، تصنیفات اور کتاب الاموال کے مخطوطہ نسخوں اور طباعت و اشاعت کی روداد کا تذکرہ ہے۔ حواشی میں اختلاف نسخ کے علاوہ الفاظ و لغات، اسماء و اعلام اور بلاد و اماکن کی تشریح و تحقیق، واقعات و سنین کی تعیین اور کتاب کی روایتوں اور مصنف کے اقوال کی تائید میں دوسری کتب حدیث و فقہ کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

تبع تابعین (جلد اول)

علم و عمل اور تہذیب اخلاق میں جس طرح صحابہ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی ملت اسلامیہ کیلئے نمونۂ عمل ہے، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے جانشین اور ان کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے۔ سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین، تابعین کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے، اب اس نے ان کے بعد کے مقدس تابع بزرگوں کا مرقع تیار کرایا ہے جس کے اس حصہ میں سب سے پہلے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور ان کے فقہی مسلک کے علمبردار امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام [illegible] ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور مجتہدات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ (مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی) قیمت [illegible]

بریلی کے خاندانِ مفتیان

کی

شاعری کا مختصر جائزہ

از جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین صاحب ادیبؔ

انیسویں صدی عیسوی میں بریلی میں اردو شاعری کو فروغ بعض علمی خاندانوں میں بھی ہوا، ان خاندانوں کا تعلق سماج کے طبقۂ بالا سے تھا، ان میں دولت وثروت کے سرمایہ تھے، فارغ البالی موروثی تھی، سروجہ اعلیٰ تعلیم و تربیت نے ادبی ذوق کو نکھار دیا تھا، سخن فہمی کے ساتھ سخن پرستی بھی جاری تھی، خاندان رُہیلہ میں نواب سید حسین خاں حیدرؔ، نواب حسن خاں جوشؔ، نواب سلیمان خاں اسدؔ، نواب ظفریاب خاں راسخؔ، نواب نیاز احمد خاں ہوشؔ اور نواب عبدالعزیز خاں عزیزؔ جیسے منفرد شعراء پیدا ہوئے جنھوں نے متوسط طبقے کے شعراء کی سرپرستی کی، نواب عطا محمد خاں عطاؔ جن کا تعلق خاندان کمبوہ سے تھا، نہ صرف اردو فارسی کے نغز گو شاعر بلکہ مربی سخن بھی، کرامت علی خاں شہیدیؔ، امیر الدین آزادؔ اور محسن علی خاں جوشؔ ان کے دامنِ دولت سے وابستہ رہے، خاندان مفتیان بھی مفتیان میں آباد تھا، دولت، ثروت، شہرت اور عزت ان کے قدم چومتی تھی، شعر و شاعری کا شوق ان کی فطرت میں تھا، انھوں نے بریلی میں شاعری کی قندیلیں روشن کیں، اس وقت وہی ہمارے مضمون کا موضوع ہیں۔

مفتیان بریلی کا ابتدائی تعلق قطر مضافات مصر سے تھا، اور وہ براہ بدایوں بریلی پہنچے تھے،

اس سلسلے میں مفتی صاحب حسن عتیق عثمانی فرماتے ہیں:

"خاندانی حیثیت سے میرے آباؤ اجداد علم و فضل کے اعتبار سے یگانۂ روزگار تھے، دولت و ثروت میں بھی امتیازی حیثیتوں کے مالک تھے، مغلیہ شہنشاہی دور میں "قطر" مضافات مصر سے دہلی آئے، قدیم رسم و رواج کے مطابق شرفاء اہل و عیال کو دارالسلطنت میں رکھنا معیوب جانتے تھے، اس لیے ان کو سکونت کے لیے ایسے مقام کی تلاش تھی جس کو شرفاء کی بستی کی حیثیت حاصل ہو، چنانچہ میرے بزرگوں نے اس غرض کے لیے بدایوں کو موزوں سمجھا، اور وہیں سکونت اختیار کر لی، ان ہی بزرگوں کے قیام کی وجہ سے یہ محلہ مولوی ٹولہ کے نام سے موسوم ہوا اور آج تک اسی نام سے معروف ہے، برطانیہ کے دور حکومت میں بھی اعزاز و مناصب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔"

مفتی شاہ ابوالحسن المتخلص بہ چشتی | آپ صدر الصدور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہو کر بدایوں تشریف لائے جس محلے میں قیام کیا وہ محلہ مفتیان کے نام سے معروف ہوا۔ آپ خاندان مفتیان کے پہلے فرد ہیں جو بدایوں وارد ہوئے اور مستقل سکونت اختیار کی، آپ زیور علم و فضل سے آراستہ تھے، عربی و فارسی میں کامل دستگاہ حاصل تھی، سلسلۂ قادریہ میں حضرت شاہ آل رسول معروف بہ اچھے میاں مارہروی سے بیعت تھے، طبیعت شعر کی طرف مائل تھی، اپنے پیر و مرشد سے بھی فیضیاب ہونے کا موقع ملا، شعر گوئی سے فطری مناسبت تھی، افسوس کہ ان کا کلام ضائع ہو گیا، چند فارسی اشعار جناب [illegible] بدایونی تلمیذ [illegible] کی بیاض میں محفوظ رہ گئے جو ہدیۂ ناظرین ہیں:

مژدہ یار آمد کہ بیگانہ دل ما ہم شد — غنچہ صد [illegible] شد
[illegible] نغمہ [illegible] — [illegible] شد
[illegible] — [illegible] شد
بطفیل [illegible] سوئے خاصان خدا — [illegible] شد
[illegible] — [illegible] شد
[illegible] — [illegible] شد

حضرت شاہ ابوالحسن کے دو صاحبزادے معروف ہوئے مفتی احمد حسن خان اور مفتی محمد حسن خاں۔

مفتی احمد حسن خان | یہ وہی مولوی احمد حسن ہیں جنہیں غالب نے اپنے مکتوب بنام قاضی عبدالجلیل میں سلام کہا تھا۔ آپ بھی مشہور و معروف شخص تھے اگرچہ مرادآباد میں صدر الصدور کے عہدہ پر فائز تھے،
آپ کے متعلق مفتی صاحب حسن شیوا اعتراف فرماتے ہیں:-

"ان کے فکر سخن کے سلسلے میں میری معلومات بالکل صفر ہے۔ صاحب تصانیف کثیرہ ہیں جن کا
تفصیل پیش کرنے سے معذور رہا ہے"

مفتی محمد حسن خاں اسیر | آپ مفتی احمد حسن خان کے برادر خورد اور مرادآباد میں صدر الصدور رہتے۔ پہلے مرادآبادی بھی مشہور ہوئے۔ آپ بھی صاحب تصانیف کثیرہ تھے، مندرجہ ذیل مطبوعہ کتب یادگار ہیں:

(۱) منہاج المعراج شرح معارج العلوم عربی درفن منطق
(۲) صلوٰۃ محمدیہ مع کلمات ذکیہ " درفن اوراد
(۳) چمنستان سخن دیوان کلام فارسی و اردو
(۴) زدیق القاضب فی نجر المذاہب فارسی درفن علم کلام

چمنستان سخن نایاب ہے۔ تذکرہ نادر (۱۲۹۵ھ) میں ایک غزل نقل کی گئی تھی جو مندرجہ ذیل ہے:-

آ اے جگر بہم کریں ہم تم تو عرضِ دل | تو وائے دل پکار رہی ہم تو ہائے ہائے دل
تجھ سے وعدوں زباں سے نہ کیوں باتیں | چنگاری رکھ دی سینے میں شاید بجھائے دل
ہوش و حواس تاب و تواں سب ہوا جائے | کس سے ہزار جان چھوڑ کے نہ آئے دل
ہر دم نگاہ تیز سے وہ دیکھتا ہے غیر | تب کا کس طرح کوئی اپنا بچائے دل
[illegible] کا کس لیے تحسیر | ظالموں میں کیوں چھپاتا ہیں [illegible] دل

آپ کا انتقال ۱۲۹۵ھ میں ہوا۔ آپ کے دو صاحبزادے مشہور ہوئے مفتی عزیز الحسن خان

اور مفتی بدر الحسن نکہت جنھیں مفتی عزیز الحسن خان بے مثل طبیب تھے، انھوں نے مرض ذیابیطس پر عربی میں ایک رسالہ البطرمی فی احوال السفیرہ لکھا تھا جو اردو ترجمے کے ساتھ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں مطبع رفاہ عام گرکھپور سے شائع ہوا۔ ہم نے آپ کے والد مفتی محمد حسین خاں کی کتابوں کی فہرست بھی اس رسالے کے آخری صفحے سے اخذ کر کے پیش کی ہے۔ شاید مفتی عزیز الحسن خاں کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی، کیونکہ ان کے کلام کے متعلق معلومات دستیاب نہ ہو سکیں،

مفتی بدر الحسن نکہت | آپ صاحب دیوان شاعر تھے۔ آپ کا غیر مطبوعہ دیوان آپکے اعزا کے پاس مراد آباد میں محفوظ ہے۔ فن شاعری میں غلام بسم اللہ بسمل تلمیذ غالب کے شاگرد ہوئے۔ وہ مشق کا کلام مشکل زمینوں میں مشکل لغات پر مشتمل تھا، بعد کو داغ کے آفتاب شہرت کی تمازت میں پگھل گئے، دہلی ماحول سے زیادہ متاثر ہوئے، جو خاندانی روایات شاعری کے منافی تھا، بانیہ بحیثیت مجموعی انھوں نے ایک ایسا طرز بیان اختیار کیا جس میں کلام غالب کی چستی بندش اور داغ کی نمکینی کا امتزاج تھا،

بطور نمونہ چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں :-

جگر صد پارہ ٹکڑے ٹکڑے دل ہو بیخودی طاری — کسی کے تیغ ابرو کو ہے شوق امتحاں پھر بھی

ساتھ خلوت میں اداؤں کے چلے آئے ہیں — آپ آئے بھی تو آرائش محفل ہو کر

تنہا نام ہی کا ہو دگرنہ ایک ہیں دونوں — جو شوخی ہے جوانی میں شرارت تھی لڑکپن میں

گلے کب تک شکستہ پا کے آشفتہ دل میں ہیں — نگاہ شوق میں فرزندگی سی پائی جاتی ہے

تن کو ڈھانپا تھا زخم ہائے سینہ نے — قد کے قابل ہے عریانی مری

بیکسی ہیں کبھی ہم زمرہ احباب ترے بازو ہے — فقیر بیکسی بنیا صحبت کامل میں رہتے ہیں

آپ کے صاحبزادگان مفتی مہدی حسن خفی اور مفتی آل حسن متمدد اور مفتی آل حسین شفیق بھی شاعر تھے

آپ کا انتقال ۱۹۲۳ء میں ہوا۔

مفتی محمد حسن خاں کے دو لڑکے معروف ہوئے مفتی محمد بشیر حسن خاں اور مفتی سلطان حسن خاں متخلص بہ وحشت۔

مفتی محمد بشیر حسن خاں | آپ سخن فہم تھے، شعر گوئی کا شوق نہیں تھا۔ آپ کا حوالہ غالب کے مکتوب بنام قاضی عبد الجمیل میں ملتا ہے۔

"اس زمین میں کہ جس کا قافیہ آپ نے مردود لکھا ہے، میں نے کبھی غزل نہیں لکھی، خدا جانے مولوی محمد بشیر حسن خاں نے کس سے اس زمین کا شعر لیکر میرا کلام گمان کیا ہے۔"

آپ کے بھائی مفتی سلطان حسن خاں نے بڑی منزلت حاصل کی۔

مفتی سلطان حسن خاں وحشت | آپ عربی و فارسی کے عالم تھے، علوم دینیہ میں مولانا فضل حق خیرآبادی سے استفادہ کیا، ابتدا میں صدر اعلیٰ تھے، بعد کو ترقی کرکے صدر الصدور ہو گئے، شاعری میں غالب کے شاگرد تھے۔ غالب نے اپنے مکتوب بنام غلام بسم اللہ بسمل میں لکھا تھا:

"آپ کے مصنف صاحب کی بھی غزل میں اصلاح کم ہوئی ہے۔"

یہاں مصنف صاحب سے مراد مفتی سلطان حسن خاں ہیں۔ مفتی صاحب پر شیدا عثمانی فرماتے ہیں:

"عرصہ دراز ملازمت آگرہ میں گزرا، وہیں سے مرض موت میں مبتلا ہوکر وطن آنے کیلئے رخصت لی اور اثنائے سفر حضرت خواجہ باقی باللہ صاحب علیہ الرحمہ نے خواب میں دہلی آنے کا حکم دیا چنانچہ بجائے وطن آنے کے دہلی کا سفر کیا اور بقول میرے والد صاحب دس سال تک برابر دہلی میں [illegible] اور خواجہ صاحب کے جوار میں دائمی سکونت اختیار فرمائی، حضرت مولانا غلام رسول دیوانہ نے جو آپ کی تاریخ وفات لکھی تھی جو میں نے ۱۹۲۳ء میں خود ان کے مزار پر کندہ دیکھی تھی اگرچہ مدت دراز [illegible] شکستہ ہو جانے کے سبب سے پورا شعر باقی نہیں رہا تھا۔

[illegible]   چوں سفر کرد زدار دنیا سوئے دار النعیم
[illegible]   [illegible] ۱۲۹۱ھ [illegible]

افسوس کہ آپ کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ مفتی صاحب حسن خیر اللہ خاں نے ایک شعر غزل کا اور دو شعر نعت کے نقل کیے ہیں جو درج ذیل ہیں :-

بت ہی پتھر کا کیوں نہ ہو اے حسن — اچھی صورت پہ پیار آتا ہے

تمہارے فضل میں سب سے مرا یہ حق فائق ہے — نہیں امت میں بدکردار مجھ سا یا رسول اللہ
مدینہ کی گدائی ہو کہیں سلطان کو حاصل — ملے جو حسن اس کو یہ صلا یا رسول اللہ

نعتیہ اشعار ایک قصیدہ سے لیے گئے ہیں جو حج بیت اللہ شریف کے موقع پر لکھا تھا۔

غلام بسم اللہ بسمل مدت العمر آپ کے ملازم رہے۔ یادگار رفتگاں میں سالک برنی نے لکھا ہے کہ آپ اور بسمل ایک تاریخ میں ہی غالب کے شاگرد ہوئے۔ افسوس کہ آتش زدگی سے بسمل کا کتب خانہ تباہ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی مفتیان کے متعلق معلومات کا ایک ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔ مفتی سلطان حسن خاں کے انتقال کے بعد غلام بسم اللہ بسمل نے اہل خاندان کی ادبی دستگیری کی اور حسب بسمل کے سامنے ہی زانوئے شاگردی تہ کیا۔

مفتی سید احمد خاں المتخلص بہ سید | مفتی احسن کے خاندان میں یہ روایت سننے میں آئی کہ ان کے ایک بزرگ نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف روہیلہ حریت پسندوں کا ساتھ دیا اور بغاوت کے جرم میں سزایاب ہو کر انڈمان بھیج دیے گئے۔ جہاں سے وہ ہندوستان واپس نہیں آئے۔

ہمارے خیال میں یہ روایت مفتی سید احمد خاں سے تعلق رکھتی ہے۔ ان کے والد کا نام سید کرامت علی تھا اور وہ بدایوں میں مقیم تھے۔ مفتی سید احمد خاں بریلی میں رہے۔ آپ وجیہ و شکیل انسان تھے۔ آپ کی حقیقی بھانجی قاضی عبد الجمیل جنوں بریلوی تلمیذ غالب سے منسوب تھیں۔ غالب نے اپنے مکتوب بنام قاضی عبد الجمیل بریلوی میں لکھا تھا :

"صاحب وہ خط جس میں اشعار سید مظلوم کے تھے مجھ کو پہنچا اور اس کا جواب تم کو بھیجا۔"

یہاں سید مظلوم سے مراد مفتی سید احمد خاں ہیں۔ ابرار علی صدیقی بدایونی آئینۂ ملت میں رقمطراز ہیں۔

"غدر کے زمانے میں روہیلوں کا ساتھ دینے کی بنا پر آپ کو دیاے شور بھیجا گیا، بالآخر رہائی کے بعد

ساحل ہندوستان تک آنے میں چند روز باقی تھے کہ [illegible] مطابق [illegible] میں جہاز ہی میں انتقال ہوا۔

اولاد نہیں تھی، حسرت تخلص تھا۔"

آئینۂ دلدار میں صفحہ ۱۰۹ پر مفتی سید احمد خاں کے نام غالب کا فارسی مکتوب مورخہ ۲۰ اکتوبر ۱۸۵۸ء بھی چھپا ہے، اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب غالب کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے، ایک مناجات اور چند اشعار جو آپ نے زمانۂ اسیری میں لکھے تھے، ابرار علی صدیقی کے پاس محفوظ ہیں۔

مفتی سلطان حسن خاں کی ایک صاحبزادی قاضی محمد خلیل حیران ابن قاضی عبد الجمیل جنون بریلوی کو منسوب ہوئیں، دو صاحبزادگان یعنی مفتی حبیب الحسن احسن اور مفتی عماد الحسن محو نے شہرت پائی،

مفتی حبیب الحسن احسن | آپ مروجہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بندوبست کے دفتر میں ملازم ہو گئے اور بسلسلۂ ملازمت اجین اور مالوہ میں رہے، برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے اور وہیں وفات پائی، علامہ بسم اللہ بسمل کے شاگرد تھے، شیریں بیانی میں شہرت حاصل کی، ان کے چند اشعار مندرجۂ ذیل ہیں:

ہاتھ ان کے ناز سے کچھ پیار سے — ہو گئے میرے گلے میں ہار سے
تجھ کو کیا معلوم کیفِ بیخودی — پوچھ نا زاہد کسی میخوار سے
ایک ہی یا دیر ہو یا ہو رہیں — سبحہ کا رشتہ ہے زنار سے
آبلہ پائی کی احسن دشت میں — داد ملتی ہے زبانِ خار سے

مانگنے والے سے کچھ بھی نہیں کہتا کوئی — دل کے دینے میں سب کرتے ہیں تامل مجھکو
کیا زوالی ہے مجھے موت میں زندہ کیوں ہوں — عدم آباد ہے اک طے شدہ منزل مجھکو
میں بتاؤں ابھی چل بیٹھے تنہائی میں — یاد کثرت سے ہیں وحدت کے مسائل مجھکو

آپ نے [illegible] میں بانا پرشاد زیب سے شہرت حاصل کی۔ آپکے صاحبزادے مفتی ساجد حسن بھی شاعر ہیں۔

شعری تعلق ہے اور پاکستان میں قیام ہے۔

مفتی عبدالمحسن تنویر | آپ کے متعلق سالک بریلی یادگار رضوی میں رقمطراز ہیں:-

"آپ بریلی کے مشہور مفتیوں کے خاندان سے ہیں۔ یہ خاندان بہ اعتبار اپنے فضل و کمال،
خلق و تکریم، تواضع، سخاوت و مروت معروف خلائق رہا ہے۔ آپ کی شرافت و نجابت
نا صفیہ اظہر من الشمس ہے۔ اگرچہ آپ نے وعظ و خدمت کی طرف توجہ نہ فرمائی اور خانہ نشینی کی زندگی
بسر کی تاہم رفاہ عام سے غفلت نہ برتی اور ہمیشہ اپنے اعزہ و اقربا، دوست احباب اور دوسرے
عام لوگوں کی طبابت سے خدمت فرماتے رہے۔ آپ کی ولادت ۲ ربیع الثانی [illegible]
[illegible] یوم یکشنبہ وقت ۱۰ بجے دن بریلی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم عربی و فارسی مولوی
سید ہدایت علی صاحب سے حاصل کی اور تکمیل اپنے والد بزرگوار سے کی جو ایک جید عالم و فاضل تھے۔
فن طب میں عالی جناب مستند الاطبا حکیم سید آل حسین مرحوم [illegible] صاحب رئیس کے یہاں ممتاز
شاگرد رشید ہوئے۔ شاعری کی طرف توجہ آپ نے چند سال کی عمر سے کی تھی۔ آپ کو فن شاعری
کے استاد کامل مولوی حاجی نظام بسم اللہ صاحب بسمل [illegible] حضرت غالب دہلوی سے فیض
حاصل ہوا۔ آپ قادر الکلام، ہر صنف شعر کے ماہر کامل [illegible] شاعری کے [illegible]
و جذبات تھے۔ آپ کا ابتدائی کلام جو آپ کے استاد کی نظر سے گزرا تھا اور بہت زیادہ سخت
زمینوں میں تھا اتفاقی وجوہات سے موجود نہیں تلف ہو گیا۔ اب ایک مختصر مجموعہ [illegible]
آپ کے بھائی صادق حسن صادق اور صابر حسن صابر اور [illegible] صاحب [illegible]
جا بجا سے جمع کیا تھا ہے۔ آپ کا حسن اخلاق، آپ کی خوش مزاجی [illegible]
آپ کا عجز و انکسار، آپ کا تبحر فضل و کمال مستغنی عن التعریف ہے [illegible]
[illegible] احباب میں [illegible] ہو گیا۔ آپ [illegible]

۱۸ اگست ۱۹۱۸ء کو واپس ہوئے، ۱۸ اگست ۱۹۱۸ء کی شب کو بریلی پہنچے، صرف آٹھ دن تک صحت سے جو بار رہے معمولی تپ ولرزہ آیا اور تین دن شدید بخار میں مبتلا رہ کر ۲ ربیع الاول ۱۳۳۷ھ مطابق ۱۰ دسمبر ۱۹۱۸ء بروز شنبہ دس بجے رات کو اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ جناب مولوی محمد طاہر صاحب عیش بدایونی کی حسب ذیل تاریخ میرے خیال میں واقعہ کے لحاظ سے حالی تاریخ ہے۔ ملاحظہ ہو:

مبارک تھا سفر اے مفتی عالی گہر تیرا — جو حج سے واپس آیا ہے جہاں میں جا کے ٹھہرا ہے

کہا ہاتف اس نے حوروں سے چلو اٹھو زیارت کو — لب کوثر مدینہ کا مسافر آ کے ٹھہرا ہے

دراصل مفتی حامد الحسن قمر کی عظمت کا راز اس میں بھی پوشیدہ ہے کہ وہ مربی سخن تھے، وہ لوگ تو بڑے ہوتے ہی ہیں جو بڑے کام انجام دیتے ہیں، مگر ان سے زیادہ بڑے وہ لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں کو بڑا کام انجام دینے کے لیے تیار کرتے ہیں، قمر خود بھی نغز گو شاعر تھے اور انھوں نے کئی عمدہ شاعر بریلی کو عطا کیے، انھوں نے ۱۹۱۲ء میں "بزم ادب" کی تشکیل کی، اس کے باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے جن کی محفلیں مشرقی روایات تہذیب کا نمونہ تھیں، ان میں شہر کے اساتذہ اور ان کے تلامذہ شریک ہوتے تھے، اور ان میں شرکت باعث فخر سمجھی جاتی تھی، بزم ادب ۱۹۲۶ء تک قائم رہی، جہاں مرزا ضیاء الدین احمد جوش جن کو افلاس نے جوانی میں پیوند خاک کیا اور جن کی شاعری ان کی وقت جوانی کا المیہ بن گئی، قمر کے تربیت یافتہ تھے نمونۂ کلام یہ ہے:-

لمحہ لمحہ فراغ ہے جوانی میری — رنگینئ داغ ہے جوانی میری

اے خندۂ گل میں بھی ہم آہنگ ہوں — مفلس کا چراغ ہے جوانی میری

اے ساکن شب اندھیرا ہولیں ہم بھی — جی کھول کے ایک بار رو لیں ہم بھی

ساقی وہ اٹھی جو تیری شہ زور — بہتے دریا میں ہاتھ دھو لیں ہم بھی

اسی بزم ادب کے پروردہ سردار احمد خاں ناظم تھے، جن کی حسن بینی نے ان کی غزل کو ایک صاحب باطن کے تخیل کی پاکیزگی اور جن کے غمزدہ دل کے لہو نے اسکے اشعار کو رنگینی عطا کی تھی کلام

محبت کی حقیقت کھول دی حسن تخیل نے — فضائے دل فضائے لامکاں معلوم ہوتی ہے

دیکھکر تیری تمنا سے فضا کو معمور — غنچہ غنچہ کو یہ حسرت ہے کہ میں دل نہوا

ہوگا نہ ہم سا کوئی ممنون نامرادی — دیکھا تو رنج دیکھا انجام ہر خوشی کا

یہ نظام عالم امکان کی گردش کے خلاف — اسقدر تاریک کیوں ہے میری صبح زندگی

جب حکیم فصیح الزماں آثر نے اخبار فصیح بریلی کے ساتھ گلدستہ نہال سخن جنوری ۱۹۱۱ء میں جاری کیا تو محو نے معاون اور سرپرست کی حیثیت سے اس گلدستے کی ترقی و اشاعت میں حصہ لیا، اور فروری ۱۹۱۲ء سے مارچ ۱۹۱۳ء تک وہ خود اس کے مدیر رہے، چنانچہ فروری ۱۹۱۲ء ہی سے گلدستے کی ظاہری و معنوی شکل میں ترقی اور اس کا معیار بلند ہوا۔ حکیم فصیح الزماں آثر محو کے معترف تھے۔ وہ جب تک بریلی میں رہے وقتاً فوقتاً بزم ادب کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔

مفتی عماد الحسن محو کا دور بریلی میں ذہنی کشمکش کا دور تھا۔ انیسویں صدی کی پہلی دہائیوں میں بھی اس قسم کی کشمکش کا سراغ ملتا ہے۔ لکھنؤ میں جرأت و ناسخ ابھر چکے تھے اور شعرائے بریلی جن کا تعلق اس وقت لکھنؤ سے قریب کا تھا، اپنی فطری سادگی ترک کر کے شعر کی خارجی ترقی کو اپنانا چاہتے تھے جس کی بنیاد میر غلام علی عشرت (المتوفی [illegible]) نے رکھی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں خاندانِ روہیلہ کے شعرا اساتذۂ لکھنؤ سے وابستہ تھے۔ اور مفتی خاندان کے شعرا کو غالب سے نسبت تھی۔ جس وقت رضا خاں حسن تلمیذ داغ کے ذریعہ داغ کے رنگ کی اشاعت بریلی میں ہو رہی تھی، اور عام مقبولیت داغ کے رنگ تغزل کو ہی حاصل تھی تو محو بھی سے

متاثر ہوئے، چنانچہ گلدستہ نہال سخن (۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۲ء) میں تمو کی مطبوعہ غزلیات میں یہ اشعار بھی ملتے ہیں:

ڈھلا دے رحم بھی اس شوخ کے جی میں یا رب
تو نے بخشا ہے جو ارمان بھرا دل مجھکو

کبھی گبڑے کبھی بکھرے کبھی الجھے کبھی سلجھے
ترے گیسو مرا حال پریشاں ہو کے جاتے ہیں

ادھر کو دیکھئے ہو آپ ہی سے روئے سخن
کچھ عرض کرنا مجھے آپ کی جناب میں ہو

سوا میرے وہ کوئی دوسرا ہے یہ تو فرماؤ
قسم جھوٹی ہمیشہ جس کے سر کی کھائی جاتی ہے

نگاہ شوخ سے ہے جھینپی ہوئی کس کی تمنا سے
حیا کس کی نگاہ شوق سے شرمائی جاتی ہے

چلے ہیں میکدہ واعظ پئے نصیحت و پند
اد بچھ پڑا جو کوئی مست تو مزا ہوگا

تیوریاں بدلیں نگار امنہ دکھائی چشم قہر
اس نے میرا قصد اظہار تمنا دیکھکر

ہیں نیچی نگاہیں دم رفتار جوانی کی
وہ اپنی اداؤں کی ادا دیکھ رہے ہیں

الزام ملا آج یہ شکوہ پہ جفا کے
کہتے ہو ستمگار ہو طالب بھی وفا کے

پھر اور بھی کچھ لطف ہو و لغزش کیا بات
دو گھونٹ بھی پی لیں جو نے ہوش ربا کے

دامن نہ کہیں کانٹوں میں کہیں ہاتھ نہ تھا ہو
چلتے ہوئے چپکے سے ذرا آنکھ بچا کے

بیتابی دل تو نے بنا کھیل بگاڑا
لائے تھے انھیں راہ پہ کس مشکل سے منا کے

یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ مندرجہ بالا اشعار تمو کے اس دور کی یادگار ہیں جب ان کی شاعری پختگی کے کمال کو پہنچ چکی تھی۔

تمو کو غالب سے بھی نسبت تھی ؎

بہت خوش تھے حضرت غالب کے نغمے سے
وہ وہی ہو جس کو کہتے غزل وہ جواب میں

جب سے نظر میں ہے بے حجابی کا کل
جناب غالب رنگیل کی یادگار ہوں میں

ان کے اس زمانے کے کلام میں اس رنگ کے شعر بھی ہیں

شرمندہ ہوں کہ کیوں نہیں چھیڑا عتاب میں
سستی پڑے گی جو وہ کہیں گے جواب میں

ہے سنج کو نجات مسرت سے ہے شباب
سو رہا ہوں جاگتے میں تو پٹ بچھونے پر

ہوں زیست سے یہ تنگ کہ ناکی ہی سی کہوں
مجھ سے سلوک لیں وہ اگر میرے باب میں

ہوں فرد محو حضرت غالب کے فیض سے
دعویٰ ہو جس کو لکھے غزل وہ جواب میں

اٹھتے ہیں خاک ہو کے تری رہگذر سے ہم
دبتے ہیں اب کہیں فلک فتنہ گر سے ہم

مجبور پھر ہیں ملنے پہ اس فتنہ گر سے ہم
اترے ہیں جب سے کہ اس کے گھر سے ہیں نکلے ہم

دل کیا گیا کہ روز کے غم سے ملی نجات
سر کیا گیا کہ چھوٹ گئے درد سر سے ہم

اے سیل گریہ تو نے وہ آرام کھو دیا
سر پھوڑتے جنوں میں جو دیوار و در سے ہم

مثل غبار صورت فتنہ برنگ حشر
اٹھتے ہیں بیٹھ کر کہیں اس رہگذر سے ہم

انجام کار خلق میں بدنام ہو گئے
کاوش سے غیر ظلم سے تم چشم تر سے ہم

اے بیکسی چلیں گے جو دشت میں سوئے دشت
رونق بھی لیتے جائیں گے ساتھ اپنے گھر سے ہم

دل ہی کچھ کاوش پیہم کے مزے لیتا ہو
لذت تیر قضا لائق تقریر نہیں

تم وہ عالم آشنا سارا زمانہ جس طرف
ہم وہ ترک خلائق ہوں جدھر کوئی نہیں

چھٹ جائیں ہم کشاکش امید و بیم سے
ہو جائیں مطمئن جو غم جانستاں ملے

نظارہ سوز وہ ترا جلوہ کہ کچھ نہ پوچھ
حاجت [illegible]

کر شکوے دل بیتاب کہ اب بازو ہے
[illegible]

کچھ پاس سے بہ جاتی ہے تسکین کی امید
[illegible]

وہ وقت ہے کہ تو اشک کرو ہم آزمائش
[illegible]

محتاط شاعرانہ مقلد ہوتے ہیں اور نہ غیر مقلد، وہ روایت کے گرویدہ نہیں، اکتسابِ فیض کرتے ہیں، وہ اپنے ماحول سے بے نیاز نہیں رہتے، اس کی اچھائیوں کو اپنا لیتے ہیں، وہ مستقبل سے ناامید نہیں ہوتے بلکہ نشاطِ امید کے ذریعہ مستقبل پر نظر رکھتے ہیں، اس لیے وہ غزل گو شعراء جنھیں انفرادیت کا حامل کہا جا سکتا ہے، اپنے خاندانِ شاعری سے بھی مستفید ہوتے ہیں، اور ماحول کے اثرات بھی قبول کرتے ہیں، مگر روایت میں پیوست نہیں ہوتے اور نہ اپنے ماحول کے سیلاب میں بہ جاتے ہیں، ان دونوں سے مناسب استفادہ کرتے ہیں، ان کی ذہانت اور شخصیت جو شمع روشن کرتی ہے، اس کی روشنی میں ماضی کے نقوش بھی دکھائی دیتے ہیں اور حال کے نشانات بھی۔

قمر کا ماضی تو غالب نوازی سے عبارت تھا لیکن ان کا ماحول داغ کے قبضہ میں تھا، اسلیے ان کی غزل ان دونوں اثرات کا مظہر تھی، اس میں ان کے ذاتی میلانات اور رجحانات بھی تھے، ان سب نے مل کر قمر کے تغزل میں جو رنگ پیدا کیا وہی انکا امتیازی رنگ اور میرے خیال میں بریلی کی تاریخ شاعری میں ان کا خاص اضافہ ہے۔ اس کا نمونہ یہ ہے ؎

مجھے اور تم سے ملال ہو مجھے اور تم سے ملال ہو یہ تمہارا صرف گمان ہے یہ تمہارا محض خیال ہے
کسے ہجر دی کا خدا بھلا کہ امید و بیم سے چھٹ گیا نہ کسی کے ہجر کا غم رہا نہ کسی کا شوقِ وصال ہے
جو صفائی دونوں میں ہو گئی تو بنے گا صیقل آئینہ وہ جو میری سمت سے کینہ ہو جو تیرے لیے گرد ملال ہو
وہ سناؤ باتیں قریب کر جسے نہ کوئی بھی سن سکے تیری طبع کو نہ ملال ہو مجھے صرف اسکا خیال ہے
یہ [illegible] کرم وہی جسے سوال ہو کوئی گھات ہے کوئی بات ہے کوئی بھید ہے کوئی چال ہے
ہے طریقِ حب جدا مرا ہے گواہ اس پہ خدا مرا نہیں کچھ کسی سے گلا مرا نہ مجھے کسی سے ملال ہے
کبھی [illegible] نہ کہیں یا وہم کہ [illegible] دل سے اٹھ گئے پس مرگ یاروں سے قمر کا لب گور یہ سوال ہے
[illegible] پتہ نہیں تو عرض حال کریں وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

[illegible] — [illegible] جو آئے

کہ ہم جن کا بھی نکل جائے یہ قسمت [illegible] — قیس ہیں ہم سے زیادہ کوئی [illegible]

تمھارا نام یہ پھر سب کو لطف آ جائے — [illegible] کی گردشوں سے جو ملا کرو

ہر ایک کو نہیں ملتی یہ ودیعت خاص — ہر ایک کو دل درد آشنا نہیں ملتا

مفتی عماد الحسن تحو نے پانچ لڑکے یادگار چھوڑے، ان میں مفتی انوار حسین اختر کا انتقال عین جوانی میں ہو گیا، عنیزا عثمانی فرماتے ہیں کہ وہ "نغز و حسنہ شاعر" تھے۔

مفتی طیب حسن شاد | آپ تحو کے سب سے بڑے صاحبزادے اور ابھی تک بقید حیات ہیں، عمر نوے سال سے تجاوز کر چکی ہے، بوجہ کبر سنی ہوش پر قابو نہیں ہے، فن شعر گوئی میں اپنے والد سے استفادہ کیا، ان کا جو اتنا کلام میری نظر سے گذرا ہے، جو صاف ستھرا ہے، کسی مخصوص رجحان کا پتہ نہیں چلتا، دو اشعار بطور نمونہ ذیل میں ہیں؎

فغاں فریاد نالہ آہ گریہ دل کی بیتابی — کلیجہ سے لگا لیتے ہیں دل کو پیار کرتے ہیں

دل ناداں یہ [illegible] پر پوچھتا کیا — وہ جب [illegible] کو سر چڑھاتے ہیں اس کو خوار کرتے ہیں

مفتی صدیق حسن درد | آپ کو بھی اپنے والد سے تلمذ حاصل تھا، ترک وطن کر کے مراد آباد چلے گئے تھے اور وہیں [illegible] میں وفات پائی، صاحب دیوان شاعر تھے، غیر مطبوعہ دیوان ان کے صاحبزادے کے پاس مراد آباد میں محفوظ ہے، انھیں زبان پر زبردست قدرت حاصل تھی، اردو گو تھے اور بے حد انکسار [illegible] تھے مفتی بدر الحسن [illegible] کی طرح [illegible] حالات سے زیادہ متاثر ہوئے، ان کے تین اشعار بطور نمونہ درج ہیں؎

[illegible] کر — بڑی آنکھیاں [illegible] سے چھلکیں

[illegible] نے [illegible] — خواہش جو [illegible] کر دیا

آپ کیوں [illegible] تمہاری طرح آپ کیوں روٹھ گئے مجھ سے جدا ہو کر

سخن گوئی میں اپنے والد سے استفادہ کیا۔ نیست باغ، بہار خان کی نہیں بریلی سے باہر رہے، زیادہ وقت اجین وغیرہ میں گذرا، جہاں شعر و شاعری کا ماحول نہیں تھا، اس لیے جو روایات پہلے سے لگا کر لے گئے تھے ان سے سر مو تجاوز نہیں کیا، مجموعے تمام صاحبزادگان میں یہ تنہا شاعر ہیں جو غالب نوازی کی خاندانی روایت پر آج تک قائم ہیں، خود فرماتے ہیں ؎

اے حال ہے فیضِ معنوی سرکارِ غالب سے | کریگا ہمسری کیا کوئی صادق سے سخنور سے

دو غزلیات مندرجۂ ذیل ہیں ؎

تنگ جنوں ہے جیب و گریباں مرے لیے | کافی ہے ایک تارِ رگِ جاں مرے لیے
جیتا ہوں انتظار میں فردائے شوق کے | دشواریِ حیات ہے آساں مرے لیے

رحم و کرم کا اس کے سزاوار کر دیا | وجہِ نجات بن گئے عصیاں مرے لیے
دنیائے دل سکون کی خاطر اجڑ گئی | کس سے کہوں کہ گھر ہے بیاباں مرے لیے

لذت کشِ ستم ہوں رہینِ کرم نہیں | غم چاہئے بقدرِ فراواں مرے لیے
یا رب عجب ہے نہیں تابِ دید کی | ہے صبحِ طور اب بھی فروزاں مرے لیے
صادق دورِ کشمکشِ غم نہ پوچھئے | ہے اک عذابِ شوقِ فراواں مرے لیے

یوں آئے دیدۂ [illegible] کا دل جگر پر | یعنی حصولِ لطف کا ساماں نظر میں ہو
وہ کیفیت وہ لطف وہ انداز دلبری | سیدھی نظر میں [illegible] تیر ہی ہے
شب [illegible] جتنا احوال ہے | ہوتی جو [illegible] زخم جگر میں ہے
دنیا ملے خاک ہماری نگاہ میں | ہے قصہ یہ کہ اس کی حقیقت نظر میں ہے

مشہور ہے وعدہ لقا اگر سے دیکھئے — پوشیدہ میری موت کا سامان اگر میں ہے
ملتا نہیں ہے منزل مقصود کا پتہ — روز ازل سے رُخ ہماری سفر میں ہے
انجام درد عشق کا ہوتا ہے جو بھی کچھ — صادق وہ اپنی چشم حقیقت نظر میں ہے

مفتی صابر حسن شیدا | آپ اس وقت اس خاندان شاعری کی آبرو ہیں، فاضل مشرقیات ہیں، ۱۰ سال بریلی کے ایک ہائی اسکول میں فارسی و اردو کے مدرس رہے، برصغیر کی تقسیم کے بعد پاکستان چلے گئے، وہاں اردو لغت کی تدوین کے سلسلے میں ترقی اردو بورڈ کراچی کے رکن ہیں، فن شاعری میں اپنے والد سے فیضیاب ہوئے، آٹھ سال کی عمر میں پہلا شعر موزوں کیا، چودہ سال کی عمر میں فارغ الاصلاح ہوئے، سولہ سال کی عمر میں دوسروں کی غزلیات پر اصلاح دینے لگے، اٹھارہ سال کی عمر میں والد بزرگوار کے انتقال کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے، ہر صنف سخن پر قادر ہیں، اپنی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں:

"جس کی پشت در پشت شاعرانہ ذوق منتقل ہوتا رہا ہو اور جس نے صحیح شاعرانہ ماحول میں آنکھ کھولی ہو اور آغوش شعر و ادب میں نشو و نما پائی ہو اس میں اگر ذوق سلیم کی صلاحیتیں استعداد موزونیت کو اجاگر کر دیں تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے، مجھے بخلوص دل اعتراف ہے کہ حضرت نواب مصطفٰے خاں شیفتہ، حکیم مومن خاں مومن اور رئیس المتغزلین حضرت مولانا حسرت موہانی کے مطالعۂ کلام سے بیش از بیش کسب فیض کیا ہے، اور میں ان حضرات کو اپنا استاد معنوی تصور کرتا ہوں، ان کے علاوہ دوسرے اساتذۂ متقدمین کے کلام سے بھی بہت کچھ مستفید ہوا۔"

یہ تبصرہ اتنا صحیح اور مکمل ہے کہ اس پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں، ان کے کلام کا مختصر انتخاب مندرجۂ ذیل ہے:

نظر میں تاب تماشائے راز رہنے دے — حقیقتوں کو بہ طرز مجاز رہنے دے
ابھی شعور نشیب و فراز رہنے دے — ابھی سے ختم نہ کر امتیاز رہنے دے
جنونِ عشق کی مختاریوں کا ذکر نہ چھیڑ — نوائے شوق کو ہنگامہ ساز رہنے دے
حضورِ دوست نہ کر طرفہ آستیں کا گلہ — وفورِ گریۂ غم کا جواز رہنے دے
جنم دیا اسی کاوش نے خود نمائی کو — غرور کاوش آئینہ ساز رہنے دے
کچھ آزمائش ظرف نظر کی راہ نکال — تجلیوں سے ابھی ساز باز رہنے دے

یہاں تو چین سے گذرے نہ چار دن شیوا
خضر کا قصۂ عمر دراز رہنے دے

بے محل پرسشِ حالات پہ رونا آیا — اس رہ و رسم ملاقات پہ رونا آیا
دیکھ کر رند کے ماتھے پہ ندامت کا عرق — شیخ کے زعم کرامات پہ رونا آیا
دل نے جب عشرت ماضی کا فسانہ چھیڑا — اپنے گذرے ہوئے لمحات پہ رونا آیا
انکی پرسش پہ یہ نوبت تو نہ آئی تھی کبھی — آج کیا تھا مجھے ہر بات پہ رونا آیا
جام منہ دیکھ کے دیکھی یہاں رسم رہ گئی — بدعت پیر خرافات پہ رونا آیا

کچھ ہنسی آئی زمانہ کی روش پہ شیوا
کچھ بدلتے ہوئے حالات پہ رونا آیا

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مفتی خاندان بریلی کی شاعرانہ عظمت شیوا پر ختم ہو رہی ہے، کیونکہ بدلتے ہوئے حالات میں نئی نسل کی دلچسپیاں نئے تقاضوں کے مطابق ہیں، لہذا اس سے اپنے اسلاف کے علم و فضل کی توقع بے سود سی ہے۔

ضمیمہ مکتوب گرامی جناب صابر حسن شیوا مشتاقی مورخہ ۵ مئی ۱۹۶۲ء بنام جناب

صدیق احمد سالک بریلی،

مکتوب گرامی جناب صابر حسن شیو اعثمانی، مورخہ ۲۲ر فروری ۱۹۶۶ء بنام ڈاکٹر لطیف حسین ادیب

(مضمون میں جتنے حوالجات شیو ا صاحب سے منسوب ہیں ان کا ماخذ یہ مکاتیب ہیں)

یادگار محو مرتبہ سالک بریلی (مطبوعہ حسن پریس ٹاؤن ہال بریلی ۱۹۶۶ء)

آئینۂ دلدار مرتبہ محمد ابرار علی صدیقی (مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۵۶ء)

عروس ہندی مرتبہ چودھری عبدالغفور سرور مع تصحیح امیر حسن نورانی (مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۶۰ء)

تذکرہ نادرہ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی ادیب (مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۵۷ء)

تلامذۂ غالب مالک رام (مطبوعہ کوہ نور پریس دہلی ۱۹۵۷ء)

حیات حافظ رحمت خاں مولفہ سید الطاف علی بریلوی (مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۳۳ء)

گلدستۂ نہال سخن بریلی منیجر فصیح الزماں آزاد رضوی جنوری ۱۹۱۱ء تا اکتوبر ۱۹۱۵ء (مطبع منتخب العلوم بریلی)

شعر الہند حصۂ اول

اس میں قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ ومقابلہ کیا گیا ہے۔

(مؤلفہ مولانا عبد السلام ندوی مرحوم) ضخامت ۴۹۲ صفحے، قیمت عـہ

شعر الہند حصۂ دوم

اس میں اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی وادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے۔

ضخامت ۴۶۲ صفحے۔ قیمت۔ للعہ

منیجر

عراق میں جدید عربی شاعری کا ارتقاء

از جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی لکچرر شعبۂ عربی [illegible] یونیورسٹی [illegible]

(۲)

محمد سماوی | محمد بن شیخ طاہر سماوی سماوہ میں ۱۲۹۲ھ میں پیدا ہوئے جب ان کی عمر دس برس کی ہوئی تو ان کے والد نے ان کو علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کے لیے نجف اشرف بھیجدیا حصول تعلیم کے بعد وہ بغداد واپس آئے۔ "انجمن ولایت" میں چار سال تک کام کیا جب بغداد انگریزوں کی طاقت سے مغلوب ہو گیا تو وہ نجف چلے گئے۔ اور وہاں کے قاضی مقرر ہو گئے،

زمانۂ شباب میں غزل اور اخوانیات کے موضوع پر بہت کچھ کہا تھا، مگر پھر ان کو چھوڑ کر صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت و ائمہ اثنا عشر کی منقبت کے لیے اپنی شاعری کو مخصوص کر لیا۔ ان کے غیر مطبوعہ اشعار کی تعداد دس ہزار سے کم نہ ہوگی،

ان کی تصانیف مندرجہ ذیل ہیں :-

۱- الكواكب السماوية في شرح القصيدة الفرزدقية -

۲- إبصار العين في أنصار الحسين -

۳- ظرافة الأحلام فيما نظم في المنام -

۴- الطليعة في شعراء الشيعة (غیر مطبوعہ)

۵- الجزيرة الرياض في مدائح النبي الفياض (مجموعۂ قصائد)

۲۔ ثمرة الشجرة فی مدح العترة المطہرۃ۔ (مجموعۂ نظم)

شاعری | اگرچہ سماوی نے تغزل میں بھی اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا ہے، مگر حق یہ ہے کہ انکی شاعرانہ عظمت کا صحیح اندازہ ان کی نعتوں یا ان اشعار سے ہوتا ہے جن میں انھوں نے اپنے عجز و ندامت و شرمساری کا اظہار کیا ہے۔

حضورؐ کی مدح میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زين وجه الدهر ميلاده وزاده روحاً وفضل ارتياح

اسکی ولادت نے عالم کا چہرہ منور اور اسکی روحانیت و اطمینان میں اضافہ کردیا۔

كف اكف السوء عن يثرب ووطد الامن بكل النواح

ہر برائی کو یثرب سے دور کردیا اور اس کے گوشہ گوشہ میں امن کی عملداری ہوگئی۔

وانتشر النور وبان الهدىٰ فلاح للعالم منه فلاح

روشنی پھیل گئی، ہدایت جلوہ فگن ہوگئی جس سے ایک عالم کو فلاح نصیب ہوئی۔

سماوی نے مدح کے علاوہ زندگی کے نشیب و فراز کی بھی بڑی خوبی سے تصویر کشی کی ہے، اس نے ایک نظم "عہد الصبا" لکھی ہے، اس میں وہ کہتا ہے:

خفض عليك فالمشيب قد اتى يطلع منك كاشراً اضراسه

اپنے کو دنیا کے بوجھ سے ہلکا کرو اس لیے کہ بڑھاپا آگیا جو دانت نکالے ہوئے تمہارا مذاق اڑا رہا ہے

لم تدع الخمسون منك جانباً الا هدم مرها اساسه

پچاس برس کی عمر نے کوئی ایسا گوشہ نہیں چھوڑا جسکی بنیاد کو عمر کی تلخیوں نے ڈھا نہ دیا ہو۔

جوانی کے نشہ کو یاد کرکے کہتا ہے۔

ايام الغيد ومرحاً والتقى جذلاً يحتسي الغرام كاسه

یاد ایامیکہ میں سرور و نشے سے جھوم کر اور شراب کا جام پینے کو بڑھتا تھا۔

پھر وہ اللہ کی درگاہ میں توبہ کرتا ہے،

یا ویح نفسی ھل اری توبۃ ۔۔۔ اخص عن ثوبی ادناسہ

افسوس ہے اپنے نفس پر، کیا میں کبھی توبہ کرکے اپنے کپڑے کو گناہوں کے میل سے پاک کرسکونگا۔

پھر وہ امید کے دھوکے کا ذکر کرتا ہے:

حتی متی اسرح اطرادی ۔۔۔ وکیف لما اخشی بہ انکاسہ

کہاں تک امید کو خیرباد نہ کہوں، اور کیسے نہ ڈروں کہ وہ ناامیدی کی شکل کرلیگی۔

عبدالحسین ازدی | عبدالحسین ازدی ۱۲۹۵ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، ۱۵ برس کی عمر سے شاعری کرنے لگے، ۱۹۱۱ء میں جریدہ "المصباح" جاری کیا، فرانسیسی زبان سے بھی پوری طرح واقف تھے، پہلی عالمگیر جنگ کے دوران میں جلاوطن کردیے گئے، بطل الحریۃ اور تاریخ العرق قدیماً وحدیثاً ان کی مقبول کتابیں ہیں۔

ان کی شاعری وطن پرستی کے جذبات سے معمور ہے، وطن کے غم میں انکو اپنی مطمئن زندگی بھی غیر مطمئن معلوم ہوتی ہے اور وہ کہتے ہیں:

وطنی لاجلک قد عدمت قراری ۔۔۔ وسئمت فیک حیاۃ ھذہ الدار

اے میرے وطن! تیری وجہ سے میں اپنا سکون کھو بیٹھا اور میں اس وطن کی زندگی سے گھبرا اٹھا

انی اللیالی والعیون ھواجع ۔۔۔ وھواجس فی جنحھا سماری

میں تنہا راتوں کو جاگتا ہوں اس حال میں کہ آنکھیں خواب آلود ہوتی ہیں، خیالات و اوہام داستان سرا رہتے ہیں۔

شاعر صرف وطن کی غلامی پر نوحہ خواں نظر آتا ہے بلکہ وہ اہل وطن کے انحطاط اور سماج کے مختلف طبقات میں تفاوت دیکھ کر جو مناظر اپنے دل میں چبھن اور تنفر و درد کی کیفیت محسوس کرتا ہے، وہ یتیم کی تصویر کشی ان الفاظ میں کرتا ہے:

طال السقام علیه حتی اضطره   فبیع الادوم بالشعیر

اس کا مرض بڑھ گیا حتی کہ اس کو مجبور کر دیا کہ وہ ادام کو جو کے بدلے بیچ دے۔

لم یبق منه غیر طرف ناظر   کبصیص ذبالة الظلام منیر

ایک بھٹی نگاہ کے علاوہ اس کے پاس کچھ باقی نہیں رہا جیسے اندھیرے میں مدھم روشنی کی چمک

شیخ کاظم دجیلی

شیخ کاظم دجیلی جمادی الاول ۱۳۰۱ھ میں دجیل نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد حسین بن عبدان ان کی ولادت کے بعد بغداد آ گئے، معمولی تعلیم کے بعد ہی ان کو شعر کا ذوق پیدا ہو گیا، پہلی جنگ عظیم میں ان کے ایک مضمون پر ترکی حکومت نے ان کو قید کی سزا دی جس سے جنگ کے بعد رہائی ملی، اور وہ قانون کے کالج میں داخل ہو گئے۔ مستشرقین کو عربی پڑھانے کے لیے ان کو برلن بلایا گیا، انھوں نے جرمنی کے سفر کا سفرنامہ [لکھا] مگر وہ ضائع ہو گیا۔

ان کی متعدد تصانیف ہیں مگر سب غیر مطبوعہ ہیں، ان کے نام یہ ہیں: رحلة الغر[illegible]، تاریخ النجف، تاریخ الکوفة، تاریخ الکربلاء، تاریخ الکاظمیة اور ال[illegible] والادب فی العراق وغیرہ

دجیلی کی شاعری میں سیاسی اصلاحات اور آزادی کے جذبات کے ساتھ ہی [illegible] شراب کی مذمت میں کہتے ہیں:

وجدت الخمر اولها عوار   وآخرها لشاربها انتحار

شراب کا آغاز ذلت ہے اور انجام موت

تعیش بما تقول [illegible]   واعلم [illegible]

اس سے بھی [illegible]

وتذهب صحة جسمهم — وتسلب الجلالة والوقار

صحت رخصت ہو جاتی ہے، بیماری لگ جاتی ہے اور جلالت و وقار رخصت ہو جاتا ہے

ذہنی غلامی اور آزادی کے سلسلے میں کہتے ہیں:

أيها الحاكمون ظلماً على الناس — سويداً فإن الله بالمرصاد

اے ظلم سے حکومت کرنے والو! ذرا صبر کرو، اللہ تمہاری گھات میں ہے۔

اپنی قوم سے خطاب کرتے ہیں:

يا سواد العراق أهملك القو — م وقد كنت روضة المرتاد

اے عراق، قوم نے تجھکو ویران کر دیا، حالانکہ تو تلاش کرنے والوں کی جنت تھا

قوم کی بدحالی کا ماتم ان الفاظ میں کرتا ہے:

ساءت معيشة كل حياة — نفس معذبة وطرف ساهر

زندگی خراب و خستہ ہو گئی ہے، سانس معذب اور آنکھ بے خواب ہے۔

کاظم دجیلی کی شاعری میں عشق و محبت کے نغمے بھی ہیں:

قلبي بكل هواك لا محالة ذاكر — هل أنت شاعرة فإني شاعر

میرا دل جذبہ محبت کا سرشار ہے کہ تمہارا عشق تیرے نام کا ورد کرتا ہو، میں شاعر ہوں کیا تو بھی شاعرہ ہے۔

ينتاح قلبي منك طيب كلما — وافاه طيف من خيالك زائر

جب تیرے خیال کی لہر دل میں آتی ہے تو قلب لذت محسوس کرتا ہے:

لم يبق منه الشوق إلا صورة — يأسى لها لما رآها الناظر

محبت نے جسم کو بس ایک ڈھانچہ کے علاوہ کچھ نہیں چھوڑا ہے جس پر دیکھنے والا ترس کھاتا ہے۔

والحب فلسفة تدق رموزها — وعن الحقيقة كل فهم قاصر

محبت ایک فلسفہ ہے جس کو بیان نہیں کیا جا سکتا، فہم اس کی حقیقت سمجھنے سے قاصر ہے۔

انی لاحوی فی الفؤاد محبة　　لم تحوها للعاشقین ضمائر

میرے دل میں ایسی محبت ہے جس سے دوسرے عاشقوں کے دل خالی ہیں

شاعری کے بارہ میں دجیلی کا نقطۂ نظر ان اشعار سے معلوم ہوگا ۔

ان خیر القریض ما کان منه　　یطرب السامعین بالانشاد

بہترین شعر وہ ہے جن کو سنکر لوگ وجد میں آجائیں۔

والذی نظمه یفیض علی القا　　رئ وعظاً یذیب قلب الجماد

اور جو ایسا نصیحت آموز ہو جس سے پتھر کے دل پگھل جائیں ۔

سلس اللفظ والعبارة جزله　　معجز باهر کشعر زیاد

زیاد کے اشعار کی طرح جس کے الفاظ آسان، عبارت سہل، ممتنع اور دلکش ہو

عبدالعزیز جواہری | عبدالعزیز جواہری کا شمار عراق کے بنیادی شعراء میں ہے، اس کی شاعری زندگی اور حقیقت کی ترجمان ہے، اس نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کا گہرا مطالعہ کیا ہے، اور کائنات کے ذرہ ذرہ کو موضوع شاعری سمجھتا ہے، چنانچہ کہتا ہے:

خلیلی ما معنی الشعر فانی　　اری کل شیء شاعراً مترنما

دوستو! شعر کے معنی کیا ہیں، میری نگاہ میں ہر چیز ایک مترنم شاعر ہے۔

هل النجم الا روضة نرجسية　　اری البدر فیها شاعراً متبسما

ستارے نرگس کا چمن ہیں اور اس میں چاند ایک متبسم شاعر ہے۔

وہ نوجوانوں کو جدوجہد پر ابھارتا اور مشکلات پر قابو پانے کی ترغیب دیتا ہے

تطلب فی شبابک الصعاب　　فما عمر الفتی غیر الشباب

مشکل مراحل جوانی میں طے کرو، کیونکہ اصل عمر شباب ہے

ومن طلب العزّ ليس يبلغه   فانه لعبد احدب بالطلب

دولت، ریتی کو اس کے متلاشی کے لیے چھوڑ دے، تلاش کی اصل چیز مجد و شرف ہے۔

فافیقوا من رقدة الجهل لوکا   ن یثیر الاموات قولی افیقوا

جہالت کی نیند سے بیدار ہو، کاش میری شاعری مردوں کو بیدار کر سکتی۔

ابغیر الکمال تصفوا وتحلو   هو رد رائق وعیش انیق

کیا بغیر کمال کے زندگی شیریں اور پاکیزہ ہو سکتی ہے۔

فالکمال الکمال فالنقص عار   بالفتی و اتساعه الحال ضیق

کمال حاصل کرو کمال جوانوں کے لیے نقص عار اور حالات کی وسعت بھی تنگی ہے۔

جواہری کی شاعری میں سیاسی حالات کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ خلیفہ عبد الحمید

کا معزولی پر اپنے جذبات ان الفاظ میں ظاہر کیے ہیں:

اراك اسیر احزان وقید   وقد کنت اراك ترسف فی سرور

میں تجھکو غم و قید میں گرفتار دیکھتا ہوں حالانکہ تو نشاط و سرور میں مست تھا۔

وکنت الامیر علی الامراء   فکیف سغت فی قید الاسیر

تو فوجوں کا سپہ سالار تھا اب قید میں کیسے چلتا ہے۔

لقد ادغرت صدر الجند حقا   اراك الدهر عاقبة الغرور

تو نے فوج کو برہم کر دیا اور زمانے نے تجھکو تیرے غرور کا انجام دکھایا۔

شیخ محمد رضا الشبیبی | محمد رضا شبیبی نجف اشرف میں ۲۰ رمضان ۱۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے

اور وہیں نشو و نما پائی، علم و عمل کی دولت ان کو وراثت میں ملی، انھوں نے عرب و عجم

کے نامور علماء سے استفادہ کیا اور آگے چلکر سیاسی امور سے کافی دلچسپی لی، ۲۰ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ کو

کہ منظر عام پر ان کی حرکات کو سمجھانے کے لیے کہ پھر یہاں سے مستعفی ہو گئے۔ وہ حربوں کی سیاست کو سدھارنے کی تدبیریں کرتے رہے۔ جب عراق میں بغاوت ہوئی تو ۱۹۳۳ء میں بغداد آگئے، اس زمانے سے اب تک وہیں مقیم اور علم و ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔

انھوں نے فلسفہ کا بڑا گہرا مطالعہ کیا، اور اشعار کے علاوہ اپنی تصانیف اور مقالات میں فلسفیانہ افکار پیش کیے، ان کی تصانیف میں فکر و نظر کی گہرائی، علم کی وسعت اور ادب کی رعنائی ملتی ہے۔

مندرجہ ذیل کتابیں ان کی یادگار ہیں:

(۱) تاریخ الفلسفۃ (عہد قدیم سے دور جدید تک) (۲) متذکرات۔

(۳) فلاسفۃ الیہود فی الاسلام (۴) تاریخ النجف۔ (۵) المغانوس من لغۃ القاموس (۶) دیوان الشبیبی۔

شبیبی کو عراقی شعراء میں امتیازی مقام حاصل ہے اور اس کی شاعری افکار عالیہ سے معمور ہے، اس نے اپنی شاعری میں فکر و فن دونوں کے جلوے دکھائے ہیں، اس نے فکر و تخیل کی بلندی کے ساتھ خون جگر اور سوز دروں سے فن میں لالہ کاری کی ہے، وہ خود کہتا ہے

لیس هذا الشعر ما تروونه ان هذی قطع من کبدی

یہ شعر نہیں ہیں جن کو تم روایت کرتے ہو بلکہ یہ میرے جگر کے ٹکڑے ہیں۔

اس کی شاعری قومی آزادی کے جذبات سے معمور ہے، اس نے عراق کی جنگ آزادی کے متوالوں کو گرمایا، عزائم کو بیدار کیا ہے اور حریت فکر کو جلا بخشی۔

اس کی ایک نظم "دمشق و بغداد" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سلا جلق بغداد عن بیان بلادی فقد شید دمشق و تبلها

پھر اس کا کیا باقی رہا ہے اور اہل دیار سے کیا مراد ہے؟ اپنے دمشق کو ویسا ہی بغداد کی طرح بنا رکھا ہے۔

الممالك مضطرب نظامها كانه — جسد ودمشق الشام منه فؤاد

ملک کا انتظام مضطرب ہے، گویا وہ جسم ہے اور شام کا شہر دمشق دل کی حیثیت رکھتا ہے

لولا التفكر في مصير بلادكم — تالله ما ضاقت علي بلاد

اگر تمہارے ملک کے انجام کی فکر مجھے دامن گیر نہ ہوتی تو میرے لیے دنیا تنگ نہ تھی۔

اني ابيت لاجلها متململا — قلق الوساد وما لدي وساد

میں ملک کی حالت پر تڑپ اور بے قراری کے ساتھ راتیں بسر کرتا ہوں، بستر پر مضطرب رہتا ہوں اور میرے پاس بستر بھی نہیں ہوتا (سوا اضطراب کے بستر کے۔)

عربوں کو اختلاف کے نتائج سے آگاہ کر کے اتحاد کی دعوت دیتا ہے۔

اعداؤكم متساندون تساندوا — ثم ارتقوا وانتم اضداد

تمہارے دشمنوں نے اپنے اتحاد و اتفاق سے اس کا ثمر حاصل کر لیا اور تم آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہو۔

اس کی شاعری میں عشق و محبت کے بھی مرقع ملتے ہیں۔

تقاسمتا عيني حبيبة لحظة — وادركت ان القلوب شواهد

جب ہماری نگاہیں ایک نظر میں ایک دوسرے سے ملیں تو پہچان لیا جب ہم دل شاہد ہیں۔

سعت نظرتي منها بنظرة عجبي — من القلب حتى لو لحق القلب ارتد

میرے اور تمہارے درمیان ایک نگاہ سے محبت کی بات دل سے دل تک بالکل پہنچ گئی۔

تحدثنا الحاظنا والفم صامت — ويعجز والالفاظ اللسان نواطق

ہماری آنکھیں باتیں کرتی ہیں اور زبان سے ادا نہیں ہوتیں، دل کی گفتگو مختصر ہوتی ہے اور زبان کے الفاظ ختم ہو جاتے ہیں۔

خیری الہنداوی | خیری الہنداوی کا باپ ترک اور ماں عرب تھی۔ ۱۳۰۳ھ میں عراق کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ پانچ سال کی عمر میں ان کے والدین بغداد آگئے، والد نے ان کو فوجی مدرسہ میں داخل کرنا پسند نہ کیا، اور غیر فوجی مدرسے اس وقت بغداد میں نہ تھے، اور خود ہی ان کو تعلیم دیتے رہے، "شافیہ" میں ان کی ملاقات شیخ محمد سماوی سے ہوئی، انھوں نے خیری کو شاعری کا شوق دلایا، خوش قسمتی سے ان کے مراسم دو مشہور عراقی شعرا، رصافی اور زہاوی سے ہو گئے، اس سے ان کو بڑا فائدہ پہنچا۔

ترکی میں جب انجمن اتحاد و ترقی قائم ہوئی، تو خیری اس کی حمایت میں قلم کے جوہر دکھائے اور عربوں کی جد و جہد آزادی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا، ترکوں نے ان کو گرفتار کر کے قید کر دیا، لیکن وہ جیل سے مفرور ہو گئے اور ایک دوست کے گھر چھپے رہے، جب بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہوا تو ۱۹۱۷ء میں ان کو مالی مشیر کا عہدہ ملا، مگر پھر بغاوت کے جرم میں ان کو جلا وطن کر دیا گیا، عراق کی آزادی کے بعد ۲۲ء میں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے،

خیری کی نظم "زینت و خالد" ان کی بہترین نظموں میں ہے۔

ان کا کلام بلند خیالات کا حامل ہے، ایک طالب علم سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں

ع

الی المجد قد سعا همی المجد فاتقز   فقف طالبا ما ترجو وما تتوقع

اپنے نفس کو عظمت و بزرگی کی طرف لے جا اس لیے کہ نفس بلندی ہی چاہتا ہے جس چیز کا تجھکو [illegible] اس پر طویل مدت گذر چکی ہے۔

اما لک من نفس تمنا صل برحبها   فهل انت یا ابن الکرام [illegible] موسع

[illegible] زندگی کے مجموعہ تنگ ہو گئی ہو [illegible] وسعت پیدا کر سکتا ہو

آگے چل کر کہتا ہے۔

ولست امرأ یبغی حیاة ذلیلة　　　یذل بها الشانئین ویخنع

میں طویل زندگی کے متلاشی کو ذلیل سمجھتا ہوں اس لیے کہ وہ کمینوں کے سامنے جھکتا ہے

ولکن ابغی حیاة شریفة　　　بها عشت فی اضوائها اتمتع

لیکن میں ایک زندگی چاہتا ہوں جس کے اجالے میں عمر بسر کرسکوں۔

اپنے وطن پر فخر کرکے کہتا ہے:۔

ان ارضنا قد انبتت مثل قومی　　　هی الارض اجدر بها ان تشوقا

وہ سرزمین جس نے میری جیسی قوم کو جنم دیا اس لائق ہے کہ لوگ اس کی زیارت کا شوق کریں

معروف الرصافی | رصافی عصر جدید کے عراقی شعراء میں ممتاز حیثیت کا مالک ہے، اس نے اپنی شاعری سے جدید عراقی شاعری میں زندگی اور تابندگی پیدا کی ہے، اسکی شاعری اعلیٰ مشرقی اور صحت مند مغربی اقدار کا مجموعہ ہے، رصافی کی پوری زندگی ملک و قوم کی خدمت میں گذری،

رصافی ۱۸۸۵ء میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کے بعد ایک فوجی مدرسہ میں داخل ہوئے، مگر ترکی زبان اور غیر ادبی ماحول سے گھبرا کر اس کو چھوڑ دیا، اور ایک دینی مدرسہ میں علوم دینیہ و عربیہ کی تکمیل کی اور ایک مدرسہ میں مدرس ہوگئے، ۱۹۰۸ء میں جب دستور کا اعلان ہوا تو رصافی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوکر ترکی چلے گئے، ۱۹۲۱ء میں نائب رئیس "لجنة الترجمة والتالیف" مقرر ہوئے۔ پھر تعلیمات کے انسپکٹر مقرر ہوگئے، آٹھ برس پارلیمنٹ کے ممبر رہے۔ ۱۹۴۵ء میں بغداد میں وفات پائی اور ستره تصانیف یادگار چھوڑیں۔

رصافی امت اسلامیہ کے زوال سے بہت متاثر تھے، انھوں نے اپنی شاعری

کے ذریعہ ان میں روح پھونکنے کی کوشش کی، مسلمانوں کی بے حسی پہ کہتے ہیں

فما انتبھوا ولا نفع الملام — کان القوم المثال منیام

نہ وہ بیدار ہوئے اور نہ ملامت نے ان کو نفع پہنچایا، گویا قوم سوتا ہوا بچہ ہے۔

ایک نظم میں کہتا ہے کہ ہم نے عرب اور اندلس میں شاندار تہذیب پیدا کی تھی، اور پوری دنیا کو نئی راہ دکھائی تھی، مگر اب ہم ترقی کی راہوں سے ہٹ گئے ہیں، اس کا ایک شعر ہے،

عجبی یا قوم کل العجب — ھذہ الآثار لم لا نقتفی

مجھے بڑا تعجب ہے کہ جب ایسے ایسے آثار موجود ہیں تو ہم ان کے نقش قدم پر کیوں نہیں چلتے

اسلام ترقی کا مانع نہیں ہے

یقولون فی الاسلام ظلما بانہ — یصدّ ذویہ عن طریق التقدم

وہ لوگ ظلم کرتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام ترقی کی راہ سے روکتا ہے

فان کان ذا حقا فکیف تقدمت — اوائلہ فی عھدھا المتقدم

اگر یہ صحیح ہوتا تو اسلام کے علمبرداروں نے پچھلے زمانہ میں کس طرح ترقی کی تھی۔

جو لوگ دین کے نام پر مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتے ہیں وہ دین پر بہتان باندھتے ہیں

فمن قام باسم الدین بین مفرقا — فقد عاب فی اصل الدین بھتا

عورتوں کی تعلیم و اصلاح کی جانب بھی وہ توجہ دلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ معاشرہ کبھی ترقی یافتہ نہیں بن سکتا، جب تک کہ عورتیں بھی علم کی راہوں پر گامزن نہ ہوں،

من این ینھض قائما من نصفہ — یشکو السقام بفالج متوصبا؟

وہ شخص کیسے کھڑا ہو سکتا ہے جس کا ایک حصہ مفلوج ہو۔

جمیل زہاوی

زہاوی ایک عالم اور فلسفی شاعر ہیں، ان کی شاعری الفاظ و بجور کے لحاظ سے تو کوئی امتیازی حیثیت نہیں رکھتی، لیکن خیالات کی بلندی کے لحاظ سے اس کا رتبہ بہت بڑا ہے،

زہاوی نے طویل عمر پائی، ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوا، اور ۱۹۳۶ء میں انتقال کیا، اپنی زندگی میں بہت سے انقلابات دیکھے، اس لیے سیاسی نظریات میں ان کے یہاں تضاد نظر آتا ہے، مگر فلسفہ و تغزل میں ان کی شاعری بڑی جاندار ہے، عہد عثمانی میں وہ مجلس معارف بغداد کے رکن تھے، سرکاری رسالہ کے مدیر بھی رہے، عراق میں پارلیمنٹ قائم ہونے کے بعد اس کے رکن بنائے گئے، مصر، طہران اور شام وغیرہ کے سفر کیے جس سے ان کے فکر و خیال میں وسعت پیدا ہوئی، مطالعہ کی وسعت اور فکر کی بلندی میں وہ اپنے معاصرین پر سبقت رکھتے ہیں،

زہاوی تجدد پسند شاعر تھے، ان کی دو نمایاں خصوصیات ہیں، حکومت کے مظالم پر تنقید اور اہل دین کی مخالفت، ان کی تجدد پسندی کی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ بھی لگایا گیا

وہ ہر قدیم سے بیزار اور ہر جدید کے پرستار تھے،

سئمت کل قدیم عرفته فی حیاتی

میں ہر قدیم سے اکتا گیا ہوں،

ان کان عندک شیء من الجدید فهات

اگر تمہارے پاس کوئی نئی چیز ہو تو لاؤ۔

وہ اپنے خیالات میں تنہا آگے اور سب سے الگ تھے کہ اپنے کو تنہا محسوس کرتے تھے۔

انا المقیت فی بغداد ضنکا ای ضنک

میں بغداد میں سخت تنگی میں مبتلا ہوا۔

طالما كنت بالعتز　　ل الناس وابكي

اکثر لوگوں سے الگ ہو کر رویا کرتا تھا؛

انني اليوم في بلادي اسير　　ليت شعري متى يكون فكاكي

آج میں اپنے ملک میں قیدی ہوں، کاش میں جانتا کہ میری رہائی کب ہوگی!

زہاوی نے ایک طربیہ المیہ لکھی، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر مرجاتا ہے، قبر میں منکر نکیر سوالات کے جوابات غلط پاکر اس کو عذاب میں مبتلا کردیتے ہیں، پھر اسکو جنت لے جاکر اس کی نعمتوں کا مشاہدہ کراتے ہیں کہ اس کو ان کی حسرت پیدا ہو، زہاوی دیکھتا ہے کہ جہنم میں بہت سے شاعر اور فلسفی فرزدق، امرأ القیس، معری، عمر خیام، دانتے، سقراط، افلاطون، نیوٹن، روسو، شکسپیر اور ابن سینا وغیرہ جمع ہیں، زہاوی اہل جنت کے خلاف دوزخ والوں کو بھڑکاتا ہے، اور کہتا ہے کہ وہ نعمتوں سے محظوظ ہوتے ہیں اور تم لوگ ان سے محروم ہو، شمکر انقلاب کردو۔ ابوالعلاء معری مجمع کو مخاطب کرکے اس کو بغاوت پر ابھارتا ہے،

غضبوا حقكم فيا قوم ثوروا　　ان غصب الحقوق ظلم كبير

اے لوگو! تمھارا حق اہل جنت نے چھین لیا ہے، اس لیے بغاوت کرو، حقوق کا غصب کرلینا بڑا ظلم ہے۔

غضبوا حقنا ولم ينصفونا　　انما نحن بالحقوق نثور

انھوں نے ہمارے حقوق چھین لیے اور انصاف نہیں کیا، اس لیے ہم حق کے لیے بغاوت و انقلاب کرتے ہیں۔

اتنے میں فرشتے آتے ہیں، اور مجمع کو منتشر کرنا چاہتے ہیں، باہم تصادم ہوتا ہے

بالآخر اہلِ جہنم جنت پر قبضہ کر لیتے ہیں، اور جشن فتح مناتے ہیں،

زہاوی کی زندگی اور شاعری دونوں انقلابی تھی، اس نے بادشاہ کے سامنے اپنے اس رزمیہ کے بارے میں کہا تھا کہ اگر میں زمین پر انقلاب برپا کرنے سے قاصر رہا تو آسمان پر انقلاب کرنے کی مجھے اجازت ہونی چاہیے،

اس مقالہ میں مندرجۂ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے:-

۱- الشعر العراقی الحدیث — مصنفہ ڈاکٹر عز الدین مطبع اسعد بغداد ۱۹۶۰ء

۲- الشعر العصری فی العراق العربی (حصۂ نظم) — مصنفہ ریفائیل بطی

۳- محاضرات عن جمیل الزہاوی — مصنفہ ناصر الحانی،

۴- محاضرات عن معروف الرصافی — مصنفہ مصطفی علی ۱۹۵۳ء

آثار تاریخیہ

مولانا شبلی کی ایک تقریر

(یہ تقریر مولانا نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے چوبیسویں سالانہ جلسہ اپریل ۱۹۰۹ء میں کی تھی، محمد اقبال صاحب لاہور نے اس کو اس جلسہ کی رُوداد سے نقل کر کے بھیجا ہے، اس کو ایک تاریخی یادگار کی حیثیت سے شائع کیا جاتا ہے۔)

"م"

مولوی احمد بابا صاحب نے مولانا شبلی نعمانی صاحب کو حاضرین جلسہ سے انٹروڈیوس کرتے ہوئے فرمایا کہ صاحبان! اب وقت مولانا مولوی شمس العلماء شبلی ابن خلدون ثانی فاضل لوذعی و عالم لمعی جامع فروع و اصول اسم با مسمی شبلی نعمانی کا ہے، جن کے دیدار فیض آثار کے لیے ہماری آنکھیں ترستی اور ان کے کلام معجز نظام سننے کے لیے کان اس طرح منتظر شنیدہ ہیں جیسے وارسا گوش لرزہ دار یرانی"

صاحب صدر[1] و دیگر حضرات انجمن! آپ لوگوں میں سے شاید بعض صاحبوں کو

---

[1] مولانا صاحب کی تقریر کے وقت جلدی میں جو نوٹ لیے گئے تھے، اس سے یہ تقریر مرتب کی گئی تھی، خاکسار آنریری ایڈیٹر نے مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر چاہا کہ حضور ان نوٹوں سے تیار کی ہوئی تقریر کی اصلاح فرما کر یا لکھ کر تقریر عنایت فرما دیں، لیکن خاکسار کی یہ درخواست شرف قبولیت حاصل نہ کر سکی

(باقی حاشیہ ص ۱۳۹ پر)

معلوم ہوگا کہ جیسے ہندوستان میں بعض مصلح یا لیڈر پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح مصر میں بھی ایک نامور مصلح پیدا ہوئے (راقم کو ان کا نام نہیں یاد رہ گیا) وہ پرانے طرز کے عالم تھے، جبہ و عمامہ اور پاؤں میں چپل پہنا کرتے تھے، لیکن باوجود اس تقدس اور سادگی کے ایک دفعہ مزید فرانس یا جرمنی کا سفر کیا کرتے تھے، جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ یورپ کیوں جاتے ہیں؟ تو جواب دیا کہ یہاں رہ کر بوسیدہ ہو جاتا ہوں، وہاں جا کر پھر تازہ ہو جاتا ہوں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا میں افسردگی چھا جاتی ہے اور یورپ میں تازگی اور جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرات! جب سے میں نے اپنے تعلقات ملازمت چھوڑے ہیں اور ندوہ کی خدمت کو مقصد زندگی قرار دیا ہے، مجھے بھی تازگی اور جوش کی حرارت محسوس ہوئی ہے، لیکن میں یورپ تو نہیں جاتا، پنجاب کا سفر کرتا ہوں، تاکہ اپنی افسردگی کو تازگی اور جوش سے بدل سکوں۔ ہمارے ملک میں جو سستی اور کاہلی پائی جاتی ہے وہ یہاں (پنجاب میں) نہیں ہے آپ کا ملک ہمہ تن جنبش اور حرکت میں ہے، میں نہیں جانتا کہ آپ اس کا صحیح استعمال کیوں نہیں کرتے، اگر صحیح استعمال کرتے تو ضرور بڑھ جاتے، لیکن یہ سٹیم اور بھاپ بیکار رہا جاتا ہے۔ میں نے بمبئی کے میمنوں کو دیکھا ہے، کلکتہ کے معززین کو دیکھا ہے جن لوگوں نے ہندوستان میں بڑا کام کیا ہے، ان کا درجہ اور اقتدار ان کے کام میں بڑا معاون و مددگار ہوا ہے، بمبئی میں ہائی اسکول ہے، جو بدرالدین طیب جی کا قائم کردہ ہے، اور

(بقیہ حاشیہ ص ۱۴۸) چونکہ تقریر از بس مفید ہے، اس لیے نوٹوں سے جو دوران تقریر میں لیے گئے تھے تیار کی گئی۔ جہاں تک ممکن ہوا مولانا کے فقرات و الفاظ ہی (اور بیشتر اکثر ہی) نقل کر دیے ہیں لیکن جہاں یہ التزام نہیں ہو سکا اور اصل عبارت کو ہم تک نہ لا سکے ہیں وہاں پر مولوی صاحب کے مفہوم تقریر کے ادا کر سکنے کی کوشش کی گئی ہے۔

خاکسار: عبدالکریم آنریری ایڈیٹر

اس کی ذاتی وجاہت سے چل رہا ہو لیکن ایسی کوئی مثال موجود نہیں، کراچی میں صرف ایک [illegible]
ہے پنجاب میں اسلامیہ کالج ہے جس کی عمارت مجھے سامنے سے کچھ چھوٹی سی لگی ہے لیکن
لوگوں نے قائم کیا، کسی خطاب یافتہ نے قائم کیا ہے یا لکھ پتی یا کروڑ پتی نے ہرگز نہیں
باوجود اس کے کہ اس کے قائم کرنے والے نہ تو لکھ پتی تھے نہ کروڑ پتی اور نہ خطاب یافتہ
پھر بھی اس کو شروع کر کے یہاں تک پہنچا دیا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جوش
زیادہ ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جو لوگ حدیث پڑھتے ہیں، یعنی ہمارے علماء کیا وجہ ہے کہ
ان میں وہ اخلاق اور عمدہ صفات پیدا نہیں ہوتیں جو اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین
میں پائی جاتی تھیں۔ مانا کہ ویسے نہیں ہو سکتے لیکن کچھ تو ہونا چاہیے۔ یہ خیال کر لیا جاتا ہے
کہ ان کی طاقتیں فوق البشر تھیں، چڑیا اڑتی ہے تم کیوں نہیں اڑتے، اس لیے کہ اڑا
نہیں جاتا۔ میں بدر الدین حسن علی نہیں ہوں اس لیے ایسا کام نہیں کر سکتا، مگر یہ ضروری نہیں
کہ بڑے بڑے لوگ ہی بڑے کام کریں، اگر خیال کیا جاوے تو ہر ایک آدمی بڑا کام
کر سکتا ہے۔

اس کالج یا انجمن کا نام اس پر منحصر ہے کہ آپ جلسہ کرتے ہیں، چندہ ہوتا ہے،
جو اس کی بقا کا باعث ہے، مگر یہ کوئی مستقل اور پائدار طریقہ نہیں ہے، اگرچہ جب تک
اور صحیح طریقہ نہ نکلے اسی پر چلنا چاہیے۔ آپ کو چاہیے کہ ایک دفعہ کوشش کر کے چند لاکھ
روپیہ جمع کر لیں تاکہ روزانہ کی گداگری سے نجات ہو، یہ تو آپ کا مسلک ہے کہ اس طرح کام
چل جاتا ہے۔ لہٰذا آپ کی انجمن کے مدرسہ کی مقامی حالت کے بارے میں کہتا یا تعلیم انگریزی
کے متعلق بتاتا جس سے اس کا تعلق ہو لیکن میں پاتا ہوں کہ مسلمانوں میں [illegible]

ایک علماء اور ان کے پیرووں کا گروہ، دوسرا انگریزی خواں اور ان کے ہم خیالوں کا گروہ۔ ایک گروہ میں دوسرے گروہ کے لوگ کم شریک ہوتے ہیں۔ اس بنا پر میں نے مناسب سمجھا ہے کہ جہاں علماء کا مجمع ہو وہاں انگریزی خواں آئیں اور ان کو مولوی صاحبان اپنا وعظ سنائیں۔ انگریزی خوانوں کے سامنے جلسے جیسے مولوی کیونکر جائیں اور ان سے کچھ سنیں، اسلام کے متعلق میں کچھ کہنا چاہتا ہوں جس کے سننے کا انگریزی خوانوں کو کم موقع ملتا ہے۔

آپ اتنا تو ضرور جانتے ہیں کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف لائے اور ایک مذہب اور ایک کتاب پیش کی۔ اور اس کی نسبت دلیری سے کہا کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہے اور یہ اس کا وحی اور الہام ہے۔ خدا کا جو یہ دعوی ہے

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ	خدا تعالیٰ فرماتا ہے: آج کے دن میں نے پورا کر دیا
وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ	تمہارے لیے تمہارے دین و مذہب کو
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔	اور تم پر اپنی نعمت کامل کر دی اور تمہارے
(مائدہ-۱)	لیے دین اسلام پسند کیا۔

غور کرنے کی بات ہے کہ مذہب اسلام کامل ہو گیا۔ اب مذہب میں ترقی کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ دوسری آیت میں پھر ارشاد فرمایا: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ رسول اللہ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں تھے، بلکہ وہ پیغمبر خاتم الانبیاء ہیں۔ ان کے بعد اور کوئی نبی نہیں آئیگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی ترقی کے واسطے اللہ تعالیٰ کے علم میں ایک حد مقرر تھی جہاں جو یہ ترقی اس حد کے قریب ہوتی گئی، شریعت، قانون اور اخلاق بھی ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قانون، اخلاق اور شریعت کامل ہو گئی۔

اسی معنی میں نتیجہ یہ ہوا کہ اب کسی نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی، محمد صلی اللہ
علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں [illegible]

تعجب ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن مجید میں یہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی نعمت آج تم پر تمام کر دی
اور نبوت ختم ہو چکی، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اور کوئی نبی نہیں آئے گا۔
یعنی ہر قسم کے اخلاق حسنہ، مذہبی اعمال، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو کامل اور پوری
تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا گیا، لیکن ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمان علی العموم انتہائی
بے پروائی کے ساتھ محض انگریزی اخلاق، انگریزی تمدن اور انگریزی وضع کی تقلید کرنا ہی
اپنا فخر سمجھتے ہیں۔ ہر آدمی انگریزی تہذیب کو اپنا مقتدا اور امام بناتا ہے، یہاں تک کہ
جب کوئی ذکر آتا ہے تو تمام صفات حسنہ کا مخزن اسی کو سمجھتے ہیں، ہر ایک بات میں مشاہیر
یورپ ہی کو بطور نمونہ اور مثال پیش کرتے ہیں، حالانکہ مسلمانوں کی تاریخ میں ہر قسم اور ہر فن
کے ایسے لائق بزرگوار گذرے ہیں جو اس دنیا میں آسمان شہرت کے سورج بن کر چمکے ہیں،
اس لیے ہمیں اپنی تاریخ پر نظر ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ اس اسلامی خزانے میں کس قدر
بیش بہا جواہر درخشندہ موجود ہیں جن کے مقابل مشاہیر یورپ بالکل ہیچ ہیں، یہ اسی
صورت میں ہو سکتا ہے کہ انگریزی خواں مسلمان اسلامی تاریخ کے پڑھنے اور سمجھنے کی
تکلیف گوارا فرمائیں، اور یہ ساری باتیں اس لیے ہیں کہ ہمارے نوجوان اپنی مذہبی
کتابوں خصوصاً کتاب اللہ اور حدیث شریف کی طرف قطعاً توجہ نہیں کرتے، اگر وہ
[illegible] کے مقابلہ کا دسواں حصہ بھی اس کام میں لگا دیں تو [illegible] ان کو اسلامی
اخلاق اور اسلامی تہذیب کی خوبی معلوم ہو جائے اور [illegible] طرح [illegible] ہو جائے کہ
حقیقت [illegible]

اولوالعزم، قوم کی قومیت کو قائم رکھنے والے اور سیاح کس قوم میں پائے جاتے ہیں۔[1]

---

[1] اس تقریر کے بعد خان بہادر میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لا نے فرمایا کہ جو سنہری اصول اور قابل قدر ہدایات مولانا شبلی صاحب نے نوجوان مسلمانوں کے لیے فرمائی ہیں، میں اس کا صدق دل سے نوجوان مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نوجوانوں میں مذہب کی طرف سے یہ غفلت شرم کے ساتھ تسلیم کرنی پڑتی ہے، اس کی وجہ موجودہ طرز تعلیم کی خرابی ہے جس کے باعث مذہبی واقفیت کا بالکل موقع نہیں ملتا، یہ ہمارا قصور نہیں ہے، اگر ہمارا قصور ہوتا تو اس کا بھی میں اقبال کر لیتا، اس زمانے میں اسی قسم کی طرز تعلیم کا رواج ہے، جس پر ہمارے بزرگوں کی مجبوری تھی کہ ہم کو ایسے مدرسہ میں بھیجتے ہیں جہاں ہمارے اخلاق پر اس قسم کے اثر پڑتے ہیں، جن طلباء کو کچھ کچھ دینی معلومات حاصل ہیں وہ اپنی خانگی تعلیم کے ذریعے سے اس سے مستفید ہیں، مدرسوں میں تو اس تعلیم کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اور اس کا اب قریباً خاتمہ ہوتا جاتا ہے، کیونکہ وہ معلومات بظاہر ہمارے بزرگوں ہی تک محدود نظر آتے ہیں، اگلی نسل کی نسبت اس قدر واقفیت کی بھی امید نہیں پڑتی۔

میں آپ کو صدق دل سے بتاتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے مذہب کا ہمارے دلوں سے جوش جاتا رہا تو ہماری قوم (خدا نخواستہ) یقیناً تباہ ہو جائے گی، اس جوش کے قائم رکھنے کا ذمہ اس شخص یا اشخاص کے ہاتھ میں ہے جن کے ہاتھ میں حسن انتظام کالج ہے، درحقیقت لازم تو یہ ہے کہ طلباء کی تعلیم و تربیت کے لیے ایسے استاد رکھے جاویں جو نہ صرف قرآن و حدیث پڑھنے کی ہدایت کریں بلکہ مذہب پر چل کر مثال پیش کریں تاکہ کالج کے طالب علم نہ صرف تعلیم یافتہ مسلمان ہوں بلکہ واقعی مولوی بھی بنیں، اور یہ طریق عمل تمام اسلامی درسگاہوں کے واسطے ایک قابل تقلید نمونہ ہے تاکہ آیندہ نسلیں دنیاوی ترقی کے ساتھ دینی ترقی بھی کر کے دکھا دیں۔

ادبیات

غزل

از جناب محمد منشاء الرحمٰن خاں صاحب منشاؔ لکچرار ناگپور یونیورسٹی

برتری پہ نازاں تھے ماہ و کہکشاں والے
بن گئے حریف ان کے آج خاکداں والے

رہ گئے ہیں سب راہی راہ میں تھکے ہارے
منزلوں کو چھوڑ آئے ہمتِ جواں والے

حادثاتِ عالم کا انقلابِ دوراں کا
غم کبھی نہیں کرتے عزمِ بیکراں والے

پُر خطر مراحل سے بے خطر گزرتے ہیں
جرأتِ یقیں والے جذبۂ گراں والے

لذتِ زندگانی تو اصل میں اٹھاتے ہیں
دردِ بے اماں والے سوزِ جاوداں والے

موسمِ بہاراں کی آب و تاب ہے ہم سے
جانِ گلستاں ہیں ہم خاطرِ تپاں والے

خامشی میں جب اپنا حال ہم سناتے ہیں
منہ ہمارا تکتے ہیں قوتِ بیاں والے

عظمتِ قلم کی جب کھا کے ہم قسم اٹھے
دل شکستہ ہو بیٹھے خنجر و سناں والے

حق تو یہ ہی منشاؔ ایسے ہستی ہیں
چشمِ خونفشاں والے قلبِ خونچکاں والے

سازِ دل

از جناب پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری ایم اے

ہائے کیا رنگیں ادا ہے سازِ دل
کوئی سنتا ہے مگر آوازِ دل

ناز کے قابل ہے یہ اندازِ دل
اللہ اللہ وہ اٹھائیں نازِ دل

کیا غرض دیر و حرم سے کیا غرض — فرش سے تا عرش ہے آوازِ دل
عشق و الفت کے سوا کچھ بھی نہیں — کوئی سمجھے یا نہ سمجھے رازِ دل
اللہ اللہ نغمۂ سازِ زندگی — جیسے کوئی سن رہا ہو سازِ دل
ذرہ ذرہ اک جہانِ حسن ہے — کس کے جلوے ہیں مگر ہمرازِ دل
آئیے اور جانِ جاں بن جائیے — کیا ہی دلکش ہے حریمِ نازِ دل
ہاں وہی جو ہیں رگِ جاں سے قریب — اب نہ وہ مجھ سے چھپائیں رازِ دل
چھوڑیے بھی قصۂ دیر و حرم — چھیڑیے بھی نغمہ ہائے سازِ دل
اب کہاں نکہت کہاں سیرِ چمن — لالہ و گل تھے کبھی دمسازِ دل

غزل

از جناب سید حرمت الاکرام صاحب

اس جام میں کیفِ مئے گلفام غزل ہو — یہ نرگسِ مخمور ہے یا جامِ غزل ہے
مکھڑے کا اجالا ہے کہ تفسیرِ معانی — پلکوں کی یہ لرزش ہے کہ ابہامِ غزل ہے
کہتی ہے انھیں دیکھ کے ہر صبحِ تمنا — زلفوں کی گھنی چھاؤں ہے یا شامِ غزل ہے
ہر نشترِ پنہاں میں ہے اک کیفِ دل افروز — شاید کہ محبت مری انجامِ غزل ہے
مضرابِ نفس اور یہ سازِ دلِ مجروح — ہر ضرب باندازۂ پیغامِ غزل ہے
نالاں ہے بہت اپنی فغانِ سحری پہ — میرا دلِ برباد کہ خوش کامِ غزل ہے
وہ دل میں سما سکتے محبت نے صدا دی — یہ پیکرِ زیبا نہیں، اتمامِ غزل ہے
شانوں پہ یونہی رہنے دو زلفوں کو پریشاں — یہ ایک عجب سلسلۂ دامِ غزل ہے
[illegible] جھلمل — شاعر کے لیے جلوۂ الہامِ غزل ہے
حرمت کو بتا دو کہ یہ ہے فیصلۂ شوق — ان ہونٹوں کی جنبش نہیں انعامِ غزل ہے

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے خاص نمبر

معارف پابندی کے ساتھ ہر شمارہ میں نئے رسالوں اور خاص نمبروں پر ریویو کرتا تھا مگر ادھر عرصہ سے اس کا التزام نہیں ہو سکا ہے اور بہت سے نئے رسالے اور خاص نمبر جمع ہو گئے تھے جن کا ہم کو افسوس ہے، اب انشاء اللہ پابندی سے ان پر ریویو ہوا کرے گا۔

'م'

البصائر مرتبہ ڈاکٹر سید معین الحق صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۴۴،

ٹیپو سلطان شہید نمبر قیمت سنہ: پتہ پاکستان ... نیو کراچی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی ۵

دسمبر ۱۹۶۳ء میں اردو اکیڈمی کراچی نے ہندوستان کی جنگ آزادی کے پہلے ہیرو سلطان ٹیپو کی یادگار میں ایک اجتماع کیا تھا، اس میں سلطان شہید پر مقالات پڑھے گئے تھے، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی اور البصائر کے فاضل مدیر ڈاکٹر سید معین الحق نے ان مقالات کو البصائر کے ایک خاص نمبر میں شائع کر دیا ہے، اس میں سلطان کے حالات، فتوحات، کارنامون، نظم حکومت، عدل و انصاف، رواداری و بے تعصبی، علم و ادب نوازی، شجاعت و بہادری، انگریزی استعمار کے خلاف سرفروشانہ جد و جہد اور ان کی حکومت کے زوال و شکست کے اسباب، ہر پہلوؤں پر نہایت مفید معلومات ہیں، ایک مضمون میں اس عہد میں اردو کی ترقی و اشاعت کا ذکر ہے، ایک اور مختصر مضمون میں دکھایا گیا ہے کہ اردو کا سب سے پہلا اخبار "فوجی اخبار" کے نام سے ۱۷۹۴ء میں سلطان ٹیپو کی ذاتی نگرانی و سرپرستی میں نکلا تھا ... [illegible] ... اس کی ... [illegible]

[illegible]

اور ان کی تخلیقات میں بعض دوسرے ہندوستانی سلاطین کو بھی ہیں ان کو بدنام کرنے کی جو کوششیں کی گئیں، اس نمبر میں اس کا جواب بھی دیا گیا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر سلطان کی تاریخ کا بہت دلچسپ اور جامع مرقع ہے۔

اردو ادب (نہرو نمبر) - مرتبہ جناب آل احمد سرور صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۰۰، قیمت تحریر نہیں: انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

انجمن ترقی اردو کے ترجمان سہ ماہی رسالے اردو ادب کا یہ نمبر پنڈت جواہر لال نہرو کی یادگار میں نکالا گیا ہے، اس میں پنڈت جی کی شخصیت، ان کے کمالات اور کارناموں پر بہت سے اچھے مضامین ہیں بعض مضامین میں ان کی شرافت اور حسن کردار کی تصویر کھینچی گئی ہے، ان کی تصنیفات "میری کہانی"، "باپ کے خط بیٹی کے نام" اور "تلاش ہند" کی روشنی میں ان کو ایک ادیب، کامیاب مصنف اور منصف مزاج مورخ بھی ثابت کیا گیا ہے، سیکولرزم اور زبان کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت بھی کی گئی ہے،

مولانا آزاد اور گاندھی جی سے ان کے خوشگوار تعلقات اور بعض مسائل میں اختلافات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جس سے پنڈت جی کے کمالات، ان کے خدمات اور کارناموں کی تصویر سامنے آجاتی ہے، آخر میں مختلف شعراء کا ہدیۂ عقیدت ہے۔

اردو کے علمی و تعلیمی نمبر - مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد صاحب فاروقی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، قیمت ضرر نہیں: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردوئے معلیٰ دہلی یونیورسٹی کا رسالہ اردوئے معلیٰ اردو کا بلند پایہ رسالہ ہے، اس کا سالانہ نمبر بھی اردو کی کسی اہم شخصیت یا اہم موضوع پر خاص نمبر ہوتا ہے جو بہت

چکا ہے۔ اس قسم کے کئی نمبر نکل چکے ہیں۔ زیر نظر نمبر میں قائم چاند پوری کا دیوان انڈیا آفس لائبریری لندن اور رضا لائبریری کے قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا گیا ہے۔ حواشی میں اختلاف نسخ کو ظاہر کیا گیا ہے۔ دیوان کے شروع میں قائم چاند پوری کا مختصر تعارف اور جناب عتیق احمد صدیقی صاحب کا ایک فاضلانہ مقالہ "دیوان قائم کا لسانیاتی مطالعہ" شامل ہے، اس میں قائم کی زبان کی خصوصیات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ایسے نمبروں سے اردو زبان و ادب میں بہت مفید اضافہ ہوتا ہے اور ان کی افادیت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

اردوئے معلی کے سابقہ نمبروں کی طرح یہ نمبر بھی نہایت مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

شیرازہ ثقافت نمبر۔ مرتبہ جناب یوسف ٹینگ صاحب۔ تقطیع بڑی، کاغذ، کتابت وطباعت نفیس، صفحات ۳۹۲، قیمت ۱۰، پتہ سکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹس کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر۔

کشمیر کا مشہور اردو رسالہ "شیرازہ" وقتاً فوقتاً مفید مسائل پر خاص نمبر نکالتا ہے، یہ نمبر کشمیر کی ثقافت پر ہے۔ اس میں کشمیر کے مختلف پہلوؤں، اس کی دستکاری، تہذیبی اداروں، سماجی یکجہتی، مخصوص روایات، لوک شاعری، ریشی مسلک اور بدھ مت کی تاریخ و ارتقاء اور اثرات وغیرہ پر مفید مضامین ہیں، پریم ناتھ بزاز نے کشمیر میں سوشلزم کی اہمیت دکھائی ہے۔ ہندوستان کے سیکولر دستور، سیاسی و اقتصادی قدروں اور سوشلسٹ سماج پر کئی مضامین ہیں۔ ادبی و تنقیدی مضامین میں اردو ادب کا سیکولر مزاج "جگن ناتھ آزاد"، غالب کی شاعری میں ہندوستانی عناصر [illegible] مفید اور قابل ذکر ہیں۔ "ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں" [illegible] "ہند ایرانی طرز تعمیر کا جائزہ اور خصوصیات" "[illegible]" "جنگ آزادی کا ایک اولوالعزم مجاہد نواب میر خاں" صاحبزادہ شوکت علی خاں، اس نمبر کے [illegible]

...مضامین ہیں، "ہندوستانی قومیت کے اجزائے ترکیبی" علی جواد زیدی، "اور "وطنیت اور مشترکہ قومیت کا تصور"، غلام رسول نازکی. گو اپنے موضوع پر بڑے مفصل اور سیر حاصل مضامین ہیں، لیکن ان میں اور بعض دوسرے مضامین میں اسلامی نقطۂ نظر سے مذہبی آزادی کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے. نظموں کا حصہ مختصر مگر دلکش ہے. کشمیر سے متعلق متعدد فوٹو بھی ہیں، یہ نمبر کشمیر سے متعلق مختلف قسم کے معلومات کا بہت اچھا مجموعہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

خاتون مشرق غوث اعظم نمبر ۔ مرتبہ جناب شفیق بریلوی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۳۲، قیمت ۱۲؍ ناشر شفیق بریلوی. مقام اشاعت رمہ گارڈن. کراچی۔

قرآن اور رسول نمبر کے بعد رسالہ خاتون پاکستان نے یہ خاص نمبر حضرت شیخ عبد القادر جیلانی کے حالات میں شائع کیا ہے۔ اس میں حضرت شیخ کے حالات، آپ کے اخلاق و سیرت پر مفید مضامین ہیں، بعض مضامین منقول بھی ہیں، مولانا سید ابو الحسن علی کا مضمون ان کی کتاب "تاریخ دعوت و عزیمت" جلد اول سے منقول ہے۔ دار المصنفین کے سابق رفیق مولانا ابو الجلال ندوی اور مولانا شاہ غلام حسنین پھلواروی کے مضامین ہیں، حضرت شیخ کے حالات و سوانح واقعۂ ترتیب، مرتبہ ولایت اور علمی و عملی کمالات کی تفصیل تحریر کی گئی ہے. مفتی انتظام اللہ شہابی کے مختصر مضمون میں شیخ کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے، مولانا جعفر شاہ پھلواروی کا رئیس احمد جعفری صاحب اور خلیق احمد نظامی صاحب کے مضامین گو مختصر ہیں لیکن فائدہ سے خالی نہیں، آخر میں مولانا عبد القدوس ہاشمی کے نظام خلفا ہی کے طریقۂ تربیت اور مولانا سید محمود شمسی ندوی کے تصوف و احسان کی حقیقت و فوائد پر مفید مضامین ہیں، آخر میں حضرت

شیخ کی بارگاہ میں خراج عقیدت ہے، اگر مرتب مختلف اہل قلم سے حضرت شیخ [illegible] کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھواتے تو ان میں تکرار نہ ہوتی، بزرگان دین کے ملفوظات میں رطب و یابس کا لحاظ بہت مشکل ہے، یہ نمبر بھی اس بے اعتدالی سے خالی نہیں ہے، اس قسم کی بعض فروگذاشتوں سے قطع نظر یہ نمبر حضرت شیخ کے حالات کا دلکش اور موثر مرقع ہے۔

شاعر کرشن چندر نمبر، مرتبہ جناب اعجاز احمد صدیقی و [illegible] صاحبان

بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۷۰، قیمت ۱۰ روپے، ماہنامہ شاعر

قصر الادب بمبئی ۸ بی، سی۔

رسالہ شاعر کا یہ نمبر اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کے حالات میں ہے، اس میں ان کی شخصیت اور ادبی و فنی کمالات کی تصویر کشی کی گئی ہے، "نقوش و لیری" کے عنوان سے کرشن چندر کے متعلق ان کے واقف کاروں اور بعض مخلص دوستوں کے تاثرات ہیں، "فکر و نظر" کے عنوان کے تحت مضامین میں ان کے فکر و فن کا جائزہ لیا گیا ہے، پھر ان کی افسانہ و ناول نگاری پر نقدانہ مضامین ہیں، "زہر خند" کے مزاحیہ مضامین میں ان کی شخصیت کا خاکہ ہے، ایک مضمون میں ان کی طنز و ظرافت نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے، دوسرے متفرق مضامین میں ان کے مذہب، فن اور شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے، اس طریقہ سے مختلف عنوانوں کے تحت ان کے ادبی خدمات و کمالات کو دکھایا گیا ہے، ان کے بعض منتخب افسانے، ناول اور خطوط بھی نقل کیے گئے ہیں، اور ان کی متعدد تصویریں بھی ہیں، نظم کا حصہ بھی ہے گو بہت مختصر ہے، چند شعراء اور ادیبوں کے پیغامات بھی [illegible] مضمون نگاروں میں [illegible] ملک کے نامور ادیب و اہل قلم ہیں، یہ نمبر اپنی ضخامت اور مضامین کی کثرت و تنوع کے اعتبار سے بڑی کتاب ہے۔

چٹان، اقبال نمبر ۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری، لمبی تقطیع، ماخبار کا کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت ۵۰ پیسے، پتہ مکتبہ چٹان ۸۵ میکلوڈ روڈ لاہور۔

چٹان لاہور نے یہ نمبر علامہ اقبال کی یادگار میں شائع کیا ہے، اس میں علامہ مرحوم کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت مفید مضامین ہیں، بعض مضامین میں ڈاکٹر صاحب کے بعض نامور معاصرین مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ سے ان کے روابط و تعلقات اور ایک دوسرے کے متعلق طرفین کے تاثرات پر روشنی ڈالی گئی ہے، حضرت سید صاحب سے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اور مولانا ابوالکلام کے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کے بڑے مفید اور دلچسپ مضامین ہیں، ایک اور مضمون میں مولانا ابوالکلام اور ڈاکٹر اقبال کے متعلق بعض اکابر اہل قلم کی تحریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں، ڈاکٹر صاحب پر خواجہ غلام السیدین، مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر محمد عزیر کے تاثراتی مضامین بھی دلچسپ اور بصیرت افروز ہیں، ادارہ کے مضامین اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے ایک مضمون میں اقبالیات کے نام نہاد شارحین اور ان سے نسبت رکھنے والے بعض اداروں کی تشریحات کی مذمت اور ان کی صحیح تشریح کی گئی ہے، مگر اس تنقید کا لہجہ تلخ اور ثقاہت سے گرا ہوا ہے، اس سے قطع نظر یہ نمبر اقبالیات کے متعلق بہت اچھا مجموعہ ہے۔

مجلہ سیفیہ ۔ مرتبہ جناب سید ساجد ندوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ سیفیہ کالج بھوپال۔

جنوری ۱۹۷۳ء بھوپال کے سیفیہ کالج کے اردو میگزین مجلہ سیفیہ نے اس سال بھی حسب معمول اپنا نمبر مولانا ابوالکلام آزاد کی یاد میں [illegible] اہل قلم کے مفید مضامین پر مشتمل ہے

اس میں شعبۂ اردو کے لائق صدر عبد القوی دسنوی صاحب کا مضمون "مولانا محمد علی" اس نمبر کا حاصل ہے۔ ادبی، تنقیدی مضامین کے علاوہ ہلکے پھلکے سیاسی مضامین بھی ہیں، ایک حصہ میں عربی ادب و شاعری کے متعلق بھی پانچ مضامین ہیں۔ نظموں، غزلوں اور افسانوں کا حصہ طلبہ کے معیار کے لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

رسالہ تحریک اقبال نمبر - مرتبہ گوپال متل وغیرہ، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰، قیمت ۳۷ پیسے، پتہ: ۱۹ انصاری مارکیٹ، دریا گنج دہلی ۶

دہلی کے رسالہ تحریک نے بھی اقبال نمبر شائع کیا ہے، جو مختصر و زوائد سے پاک اور مختصر ہونے کے باوجود مفید اور پُر مغز مضامین پر مشتمل ہے۔ "اقبال پر چند خیالات" نظیر صدیقی اور "تشامحات اقبال" ضیاء الدین شمسی طہرانی اس نمبر کے خاص مضامین ہیں، "تشامحات اقبال" میں اقبال کے فکر و خیال کی بعض فروگذاشتوں کا جائزہ لیا گیا ہے، کمیت سے قطع نظر کیفیت کے اعتبار سے یہ نمبر اچھا ہے۔

مندرجۂ ذیل خاص نمبروں پر بعد میں نظر پڑی اس لیے ان کا ذکر آخر میں کیا جا رہا ہے۔

نظام قرآن نمبر - مرتبہ مولوی قمر الدین مظاہری و عبد القیوم مظاہری صاحبان، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۴۴، قیمت: چار روپئے۔ پتہ:- دفتر ماہنامہ نظام، مدنی منزل، کرنیل گنج، کانپور۔

اس خاص نمبر میں قرآن مجید کے اعجاز و تاثیر، جمع و تدوین، فہم و تدبر کے اصول، تحقیق، ملکیت، سود، حرمت، جہاد اور اس کے احکام، موجودہ سائنسی اکتشافات سے قرآنی تعلیم کی مطابقت، نظم و ربط، اور تکرار وغیرہ مختلف اہم امور و مباحث پر متعدد اصحاب علم و قلم کے پچیس قابل قدر مضامین جمع کیے گئے ہیں، اور عربی زبان میں علما کی تفسیری خدمات ...

وغیرہ دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ "قرآن مجید کی کتاب" وحیدالدین خان، "دستور مملکت قرآن کی روشنی میں" مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، "تحفظ قرآن پر ایک نظر" قمرالدین مظاہری، "مرتب صحیفۂ الٰہی یا غیر مربوط کلام" انظر شاہ کشمیری، اور "قرآنی کلمات کی حکیمانہ ترتیب" افادات علامہ ابن قیم، اور فارسی، انگریزی اور اردو تراجم کے متعلق ابوسلمان شاہجہاں پوری، مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کے مضامین خاص طور پر اہم ہیں، استنبول اور تاشقند کے مصحف عثمانی کے علاوہ متعدد قدیم مخطوطہ مصاحف کے عکسی فوٹو سے بھی یہ نمبر مزین ہے، چند مضامین منقول بھی ہیں، لیکن افادیت سے خالی نہیں۔

خیابان، اردو زبان و ادب کا پاکستانی دور } مرتبہ محمد طاہر فاروقی صاحب و خاطر غزنوی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت قدرے بہتر،

ضخامت [illegible] صفحات، قیمت درج نہیں، پتہ: شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی۔

علمی و ادبی حیثیت سے پاکستان میں اردو کا دامن برابر وسیع ہو رہا ہے۔ شعبۂ اردو پشاور یونیورسٹی کے ادبی مجلہ خیابان کے اس نمبر میں پاکستان کے مختلف علاقوں مشرقی پاکستان، بلوچستان، سندھ، پنجاب، پوٹھوہار اور کشمیر وغیرہ میں گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں اردو ادب سے متعلق جو خدمات انجام پائی ہیں اور اس کی موجودہ رفتار ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے، پھر پاکستانی دور کے اردو زبان و ادب کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور اس دور کے ادبیات، غزل، نظم، طنز و مزاح، افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید، لسانیات، صحافت اور ترجمے وغیرہ مختلف اصناف ادب کی تفصیل ہے۔ ضمیمہ میں پاکستان کے لسانی مسائل پر اظہار خیال کیا گیا ہے، اور آخر میں پاکستان کے

اردو، یونیورسٹیوں اور کالجوں کے اردو شعبوں و مطبوعات اور انجمن ترقی اردو اور اشاعتی اداروں کی کتابوں اور مطبوعات کے متعلق نہایت معلومات افزا مضامین ہیں۔ لیکن بعض قابل ذکر اداروں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ مذہبی و علمی کتابوں کا جائزہ بھی ناقص ہے، مگر مجموعی حیثیت سے یہ نمبر مفید اور وسیع معلومات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔

پیکر تاجور نمبر۔ مرتبہ جناب نظر زیدی صاحب، بڑی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۳ روپے، پتہ: شباب کیرانوی ۴۲۵ سمن آباد، لاہور۔

یہ نمبر نامور صاحب علم و قلم شمس العلماء مولانا احسان اللہ خاں تاجور نجیب آبادی مرحوم کی یادگار میں نکالا گیا ہے۔ اس میں ان کے مضامین نظم و نثر اور شروع کے صفحات میں ان کے متعلق ان کے شاگردوں اور دوستوں کے تاثراتی مضامین درج ہیں، جو اگرچہ مختصر ہیں مگر ان سے مرحوم کی سیرت و شخصیت کا اجمالی خاکہ اور ادبی و فنی کمالات کی مختصر تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس حصہ میں جگن ناتھ آزاد کی ایک موثر اور دلکش طویل نظم خراج عقیدت بھی شامل ہے۔ دوسرے حصہ میں ان کے منتشر ادبی و تنقیدی، تاریخی و مزاحیہ مضامین، خطوط، مکالموں اور نظموں و غزلوں کو یکجا کر دیا گیا ہے، بزم تحقیق کے زیر عنوان سوالات و جوابات اور میر و سودا کا موازنہ بلند پایہ مضامین اور زبان و ادب کے طلبہ کے لیے خصوصیت سے قابل مطالعہ ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ نمبر مولانا تاجور کے حالات اور کمالات کا [illegible] مرقع ہے۔

[illegible]

مطبوعات جدید

کتاب الزہد والرقائق ۔ مرتبہ مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی، بڑی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۷۱۰، قیمت [illegible] پتہ: مجلس احیاء المعارف مشرقی، اقبال روڈ، مالیگاؤں ضلع ناسک (۲) مکتبہ مفتاحی اکیڈمی، مئو اعظم گڈھ۔

زہد ورقاق پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں اُن میں دوسری صدی ہجری کے نامور محدث حضرت عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد والرقائق سب سے قدیم اور اہم ہے، یہ ابتک غیر مطبوعہ تھی، اس کے قلمی نسخے دنیائے اسلام کے چند ہی کتب خانوں میں تھے، فاضل جلیل مولانا حبیب الرحمن اعظمی نے جو اس سے پہلے بھی حدیث کی بعض اہم کتابوں کو ایڈٹ کر چکے ہیں، اب اس کتاب کو مختلف نسخوں کی مدد سے مقابلہ وتصحیح اور تعلیق وتحشیہ کے بعد شائع کیا ہے، شروع میں ایک جامع مبسوط مقدمہ ہے، جس میں زہد کی حقیقت چھٹی صدی ہجری تک اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ، مصنف کتاب کے مفصل حالات، علمی ودینی کمالات کے علاوہ اس کتاب کی اہمیت اس کے قلمی مختلف نسخوں اور ان کے رواۃ کے مختصر ترجمے اور دوسرے مفید معلومات تحریر کیے گئے ہیں، حواشی وتعلیقات میں اختلاف نسخ، آیتوں کے حوالے، رجال واسناد کی تحقیق مشکل وغریب الفاظ اور مشکلات کی تشریح، دوسری مشہور ومتداول کتابوں کی حدیثوں کی تخریج، اس کے مرویات کی ان سے مطابقت واختلاف ظاہر کرکے ان کے صحت وخطا

کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ پوری کتاب گیارہ اجزا اور بروایت مروزی ۱۶۲۲ حدیثوں پر مشتمل ہے، فاضل مرتب نے دوسرے نسخے کے زیادات کو جن کی تعداد ۳۴۶ ہے اور جو نعیم بن حماد سے مروی ہیں، آخر میں شامل کر دیا ہے، شروع میں تینوں نسخوں کے عکسی فوٹو اور ۸۰ صفحات میں مختلف فہرستیں دیکر استفادہ و مراجعت کو آسان کر دیا گیا ہے، غرض یہ کتاب تہذیب تدوین، تہذیب و تحشیہ اور تحقیق و تعلیق کے جملہ لوازم سے آراستہ اور اہل علم کے لیے ایک نادر تحفہ اور موضوع و مطالب کے اعتبار سے اہل دل کی طمانیت و سکون کا سامان ہے۔

ترجمان القرآن جلد دوم۔ از مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ ٹائپ، صفحات ۸۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۲ے، پتہ ساہتیہ اکاڈمی، نئی دہلی۔

ساہتیہ اکاڈمی نے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کی تمام تحریروں کو خاص اہتمام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے، اس مفید سلسلہ کا آغاز مولانا کی مشہور و مقبول تصنیف ترجمان القرآن سے جو اب تقریباً نایاب تھی، کیا گیا ہے، پہلے اڈیشنوں میں یہ کتاب ۲ جلدوں میں شائع ہوئی تھی، ساہتیہ اکاڈمی اس کو ۴ جلدوں میں شائع کرے گی، پہلی جلد جو سورہ فاتحہ کی تفسیر و مہمات مطالب پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ پہلے شائع ہوئی تھی، اور اس کا تعارف معارف میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ یہ جلد سورۂ بقرہ تا انعام کے ترجمہ اور مختصر تفسیری اشارات اور نوٹ پر مشتمل ہے، اور پہلی جلد کی طرح تصحیح و تحشیہ اور ترتیب و تہذیب کے جملہ لوازم سے آراستہ ہے۔

تذکرہ صوفیائے سرحد۔ از مولانا اعجاز الحق قدوسی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی ٹائپ، ضخامت ۶۰۰ صفحات، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲ے، پتہ: مرکزی اردو بورڈ، لاہور۔

صوفیائے کرام نے ہندوستان میں تبلیغ اسلام اور رشد و ہدایت کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں، لیکن ان کے پرانے تذکرے زیادہ تر ان کے کشف و کرامات کے واقعات پر مشتمل ہیں، ان کے رشد و ہدایت اور ان کے پاکیزہ اخلاق و سیرت کا ذکر بہت کم ہوتا ہے، اس لیے مولانا اعجاز الحق قدوسی نے اسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے مختلف حصوں کے صوفیائے کرام کے حالات کا ایک مفید سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی اور ان بزرگوں کے حالات پر مشتمل ہے، جنھوں نے صوبہ سرحد کو اپنے علم و عرفان اور رشد و ہدایت کی شمع سے منور کیا تھا، اس میں ایسے ۴۰ صوفیائے کرام کے حالات، ان کی پاکیزہ سیرت و اخلاق اور تعلیمات و ہدایات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، جنھوں نے اس صوبے کو اپنے قیام سے نوازا تھا، یا یہاں سے ان کا کسی نوع کا تعلق رہا تھا، چنانچہ دوسرے صوفیہ کے ساتھ حضرت سید احمد شہید بریلوی اور مولانا شاہ اسماعیل شہید کے حالات اور مجاہدانہ کارناموں کا بھی ذکر ہے، کتاب میں جو اسماء و اعلام آئے ہیں حواشی میں ان کے متعلق ضروری معلومات درج ہیں، مقدمہ میں افغانوں کے قبول اسلام اور حسب و نسب کی تحقیق کے علاوہ ہندوستان میں تصوف کے مروجہ سلاسل اربعہ کی مختصر تاریخ بھی بیان کی گئی ہے، مرتب نے مواد کی فراہمی میں بڑی تلاش و جستجو سے کام لیا ہے، اور بیشتر بزرگوں کے تذکرے مفصل اور جامع بھی ہیں، لیکن متعدد بزرگوں کے متعلق معلومات نہ مہیا ہونے کی بنا پر ان کے تذکرے مختصر ہیں، تاہم یہ کتاب مفید اور معتنا ہے، مصنف خود ایک نامور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے سماع کے بارہ میں انھوں نے جو روایتیں کہیں کہیں نقل کی ہیں ان میں ان کا مشرب بھی صوفیانہ ہے، اردو میں پہلی بار صوبہ سرحد کے صوفیائے کرام کے متعلق ایک مستقل اور مستند تذکرہ کا اضافہ ہوا۔

تعلیمی مسائل ۔ مرتبہ سید الطاف علی صاحب بریلوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible] پتہ: اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی۔

سید الطاف علی صاحب بریلوی کی عمر کا بڑا حصہ علمی و تعلیمی سرگرمیوں میں گذرا ہے، تقسیم سے پہلے وہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل اور مجلس مصنفین علی گڑھ سے وابستہ اور مصنف کے اڈیٹر رہے، تقسیم کے بعد انھوں نے آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس اور سرسید گرلس کالج وغیرہ کی داغ بیل ڈالی اور رسالہ العلم جاری کیا، جو مصنف کا نقش ثانی ہے، وقتاً فوقتاً وہ مصنف، العلم اور دوسرے رسائل و اخبارات میں علمی و تعلیمی مسائل پر مضامین لکھتے رہے، یہ کتاب ان کے ۲۸ مفید مضامین کا مجموعہ ہے، جو مفید تعلیمی معلومات پر مشتمل ہیں، بیشتر مضامین علی گڑھ یونیورسٹی سے متعلق ہیں، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، مدرسۃ الاسلام کراچی، اور سرسید گرلس کالج وغیرہ کے متعلق بھی مفید مضامین ہیں، ایک مضمون میں جامعہ ملیہ کا دلچسپ اور لطیف انداز میں ذکر ہے، بعض مضامین میں تعلیمی انجمنوں، ان کے اجلاس اور تعلیمی سفروں وغیرہ کی دلچسپ روداد تحریر کی گئی ہے جس سے مسلمانوں کی گذشتہ تیس سالہ تعلیمی سرگذشت سامنے آجاتی ہے، اور اس سے متعلق اداروں اور نامور اشخاص کے حالات بھی معلوم ہو جاتے ہیں، جو لوگ مسلمانوں کی تعلیمی مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں، ان کے لیے اس کا مطالعہ مفید بھی ہے اور ضروری بھی، شروع میں محمود ایوب [illegible] کے قلم سے مصنف کے [illegible] تعلیمی خدمات کی تفصیل ہے۔

ادب منزل بمنزل ۔ از جناب سید انیس کاظم صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]

[illegible] صاحب بھی ایک خوش مذاق اہل قلم ہیں [illegible]

ندوی کا ادیب اور بعض نامور بالغ صاحب طرز ادیبوں کے متعلق بڑے اعتدال و توازن کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے، شروع کے چند مضامین میں اردو زبان و ادب کی مختلف منزلوں یعنی دلی میں اردو، لکھنؤ میں اردو، پنجاب میں اردو کا ذکر ہے، اور ہر منزل میں اردو کے ارتقاء کی مختصر داستان اور اس کے مشہور مصنفین اور اہل قلم کا اجمالی تذکرہ، اور ان کے ادبی و فنی خدمات و کمالات پر تبصرہ کیا گیا ہے، ایک باب میں علی گڑھ تحریک، سر سید احمد خاں اور ان کے دامن فیض سے وابستہ بعض نامور اشخاص کے علمی و ادبی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے، آخری ابواب میں ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، علامہ شبلی، اکبر الہ آبادی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابو الکلام آزاد اور علامہ اقبال وغیرہ کے ادبی کمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر اس فہرست میں مولانا طفیل احمد منگلوری کا نام کچھ بے جوڑ سا ہے، سب سے آخر میں ترقی پسند ادیبوں کی بے اعتدالیوں کا لطیف پیرایہ میں ذکر کیا گیا ہے، مصنف کے مقالات نہایت متوازن اور زبان شگفتہ و سلیس ہے، یہ کتاب مختلف حیثیتوں سے دلچسپ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

علامہ اقبال بھوپال میں۔ مرتبہ جناب عبد القوی صاحب دسنوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، ضخامت [illegible] صفحات، ناشر:- سیفیہ کالج بھوپال

ڈاکٹر اقبال پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مشکل ہی سے اس کا کوئی گوشہ خالی نکل سکتا ہے، لیکن مصنف کی ہمت ہے کہ ایک نیا گوشہ تلاش کیا ہے، سر راس مسعود مرحوم ناظم تعلیمات بھوپال سے ڈاکٹر اقبال کے گہرے تعلقات تھے، ان کے توسط سے نواب حمید اللہ خاں سے بھی تعلقات ہو گئے تھے، ڈاکٹر صاحب کبھی کبھی ان سے ملنے بھوپال جایا کرتے تھے، اس کتاب

میں ان کے سفر اور قیام بھوپال کے دلچسپ حالات تحریر کیے گئے ہیں، اس میں اور بھی مفید معلومات آگئے ہیں،

دیوان المعلم عبد الحمید الفراہی : مرتبہ مولانا بدر الدین اصلاحی، تقطیع خورد، عمدہ ٹائپ، صفحات ۳۲، قیمت ۸؍ پتہ: دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ شعر و ادب کا نہایت اعلیٰ اور ستھرا مذاق رکھتے تھے، اور اردو، فارسی و عربی تینوں زبانوں میں داد سخن بھی دیتے تھے، دائرہ حمیدیہ نے ان کا مختصر عربی دیوان شائع کیا ہے، جو زیادہ تر جنگ طرابلس، مزدۂ بلقان اور ترکوں پر عیسائیوں کے مظالم سے متعلق اشعار اور حکیمانہ کلام پر مشتمل ہے، مرتب نے مقدمہ میں مولانا کے کلام کی مختصر خصوصیات تحریر کی ہیں، امید ہے کہ عربی زبان و ادب کے شائقین کے حلقہ میں یہ مجموعہ مقبول ہوگا،

چند دن دیارِ غیر میں - مرتبہ مولانا عبد اللہ عباس ندوی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۰۰، قیمت ۲ روپیہ، پتہ: دار الاشاعت رحمانی، مونگیر۔

مولانا عبد اللہ عباس نے پہلی مرتبہ یورپ کے بعض ملکوں کا سفر کیا تھا، اس سفرنامہ میں انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اس سفر کے کوائف و تاثرات قلمبند کیے ہیں، اس سے یورپ کی تعلیم، معاشرت اور بعض تعلیمی اداروں اور دوسری متعدد چیزوں کے متعلق بڑے مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں، مولانا وسیع النظر عالم اور راسخ العقیدہ مسلمان بھی ہیں، اس لیے یورپ پر اس حیثیت سے بھی نظر ڈالی ہے، اس لیے اس سفرنامہ میں مغربی تہذیب کے روشن اور تاریک دونوں رخ سامنے آجاتے ہیں، جن سے بعض مفید نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

جلد ۱۰۰ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

کاروانِ شبلی کا آخری مسافر

دارالمصنفین کے تین معمار تھے، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی، اول الذکر دونوں بزرگ بہت پہلے اس دنیا سے اٹھ چکے تھے، اس قافلہ کے آخری مسافر مولانا مسعود علی صاحب ندوی نے بھی ۲۶ اگست کو جنت کی راہ لی، ان تینوں نے مل کر دارالمصنفین کو پروان چڑھایا تھا، حضرت سید صاحب اور مولانا عبدالسلام صاحب نے علمی حیثیت سے دارالمصنفین کا نام اونچا کیا اور اسکی شہرت کو عالمگیر بنایا اور مولانا مسعود علی صاحب نے انتظامی حیثیت سے اس کو ترقی دی اور اس کا مقامی وقار قائم کیا۔

مرحوم سراپا قوت و عمل تھے، انھوں نے اپنے دور میں بڑے بڑے عملی کام کیے اور مولانا شبلی سے نسبت رکھنے والے اداروں کو فائدہ پہنچایا، دارالمصنفین کی تمام عمارتیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عالیشان مسجد، شبلی کالج کا کانوکیشن ہال انہی کے ذوقِ تعمیر کی یادگار ہیں، جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں انکا نام زندہ رہے گا، ایک زمانہ میں سیاسی اور قومی کاموں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیا، خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کے زمانہ میں سید صاحب کی شخصیت اور مولانا مسعود علی صاحب کی عملی جدوجہد نے دارالمصنفین کو سیاسی کاموں کا مرکز بنا دیا تھا، اس زمانہ کا کوئی بڑا لیڈر ایسا نہیں ہے جس نے دارالمصنفین کا طواف نہ کیا ہو، ان سب سے مولانا کے دوستانہ تعلقات تھے، پورے ضلع میں انکا طوطی بولتا تھا، یہاں کے سارے کاموں کے روحِ رواں وہی تھے، انکے بغیر کسی تحریک میں جان نہیں پڑتی تھی، اب تو زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے، ایک زمانہ میں وہ اعظم گڈھ میں تہذیب کے بھی معلم سمجھے جاتے تھے، انھوں نے یہاں کا تہذیبی معیار بلند کیا، غرض ایک مدت تک وہ اعظم گڈھ کی پوری زندگی پر چھائے رہے، انکے یہاں ہر وقت ایک دربار لگا رہتا تھا۔

ان میں فطری دبدبہ تھا، عملی کاموں میں ان کی انتظامی قابلیت سے زیادہ انکا دبدبہ کام دیتا تھا، بہت خوش خلق، خوش مذاق اور خوش گفتار تھے، جب محفل میں بیٹھتے تھے اپنی باتوں سے چھا جاتے تھے، رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے اور نہ دبکے، ادھر دس بارہ سال سے انکی علالت کا سلسلہ چل رہا تھا اور وہ دارالمصنفین کے کاموں سے بھی معذور ہو گئے تھے، کئی سال سے بالکل صاحبِ فراش تھے، آخری چند مہینوں سے ہوش و حواس نے بھی جواب دے دیا تھا اور وہ زندگی کا محض سایہ رہ گئے تھے لیکن یہ سایہ بھی بہت غنیمت تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی ختم ہو گیا اور دارالمصنفین کے عہدِ اول کی آخری یادگار بھی مٹ گئی۔ والبقاء للہ۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمالِ حسنہ کے صلہ میں ان کی مغفرت فرمائے۔

خرطوم کانفرنس ختم ہو گئی، اس کو نہ کامیاب کہا جا سکتا ہے اور نہ ناکام، اس نے اسرائیل کو تو تسلیم نہیں کیا لیکن موجودہ حالات میں عربوں میں اسرائیل کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے، اس لیے بیشتر حکومتوں کا رجحان جنگ کے بجائے سیاسی حل کی طرف رہا، اس میں ناصر جو اسرائیل کے سب سے بڑے مخالف تھے، سب سے آگے تھے، بظاہر اسرائیل سے باعزت سمجھوتے کے سوا سیاسی حل کی اور کوئی شکل نہیں ہے، گو اب بھی عرب حکومتوں میں پائیدار اتحاد نہیں ہے لیکن اس کانفرنس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انھوں نے سردست اپنے اختلافات ختم کر دیے، اور سب نے مل کر حالات کا جائزہ لیا اور مناسب فیصلے کیے، شاہ فیصل اور ناصر میں صلح اور یمن کے بارہ میں معاہدہ ہو گیا، اس سے آئندہ پائیدار اتحاد کی راہ کھل آئی ہے۔

~~~

کاش ناصر نے پہلے حقیقت پسندی سے کام لیا ہوتا، اور جس نتیجہ پر اب وہ پہنچے ہیں پہلے پہنچ چکے ہوتے، اپنی اور اسرائیل کی قوت کا صحیح اندازہ کیا ہوتا، اس کی مخالفت کا اتنا ڈھول نہ پیٹا ہوتا، اپنی قیادت کے خبط میں عرب حکومتوں میں اختلاف نہ پیدا کیا ہوتا تو یہ روزِ بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا، آج ان کو وہ سب کچھ کرنا پڑا جس کا سننا بھی ان کو گوارا نہ تھا، انھوں نے اپنی غلطیوں کا اعلانیہ اعتراف کیا، اسرائیل سے جنگ کے بجائے مفاہمت کا راستہ اختیار کیا، شاہ فیصل سے صلح اور ان کی مالی امداد قبول کی، غرض ؎

آنچہ دانا کند کند ناداں   لیک بعد از خرابیٔ بسیار

سب سے بڑا کام انھوں نے یہ کیا کہ قیادت کے خبط سے دست بردار ہو گئے، مگر ان کے ہندی عقیدت مند اب بھی زبردستی ان کے سر پر قیادت کا تاج منڈھنا چاہتے ہیں جو ان کی غلطیوں کی سزا میں قدرت ان سے چھین چکی ہے، وہ قیادت کے بجائے اسلامی اخوت اور مخلص مشیر کی حیثیت سے عربوں کی زیادہ خدمت انجام دے سکتے ہیں۔
~~~

ہماری سیکولر حکومت میں مسلمانوں کے خون کی ارزانی کا ابتک وہی عالم ہے، ہر سال دو سال کے بعد ملک کے کسی نہ کسی حصہ کی زمین ان کے خون سے سیراب کیجاتی ہے، اس مرتبہ رانچی کی باری تھی جس نے کلکتہ اور راؤرکیلا کے واقعات کی یاد تازہ کردی، مقتولین کی تعداد کئی سو بتائی جاتی ہے، جن میں اکثریت مسلمانوں کی ہے، ان میں عورتیں، معصوم بچے اور میڈیکل کالج کے مسلمان طالب علم بھی ہیں، مالی تباہی و بربادی کا کچھ اندازہ نہیں کیا جاسکتا، یہ فساد اتنا سنگین تھا کہ وزیر داخلہ تک کو اس کی سنگینی اور فرقہ پروروں کی فتنہ انگیزی اور درندگی کا اعتراف کرنا پڑا، فرقہ پرور مدتوں سے اپنی سیاست کا کھیل مسلمانوں کے خون سے کھیل رہے ہیں، مگر مسلسل تجربہ کے بعد بھی حکومت کو سبق حاصل نہیں ہوتا، اصل یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کے خون کی کوئی قیمت نہیں رہ گئی ہے، ورنہ اس قسم کے فسادات کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔

زبان کے مسئلہ پر جنوبی ہند میں کتنا بڑا انقلاب ہو گیا، پنجابی کے لیے کیسے کیسے ہنگامے ہوئے، حکومت کو مجبور ہو کر پنجابی زبان کا مستقل صوبہ بنانا پڑا، مگر کسی جن سنگھی نے اسکے خلاف مورچہ نہیں قائم کیا، آئے دن بڑے بڑے مسلمان گھرانوں کی لڑکیاں ہندوؤں سے شادیاں کرتی رہتی ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہونے پاتی، کشمیر میں ایک ہندو لڑکی نے ایک مسلمان سے شادی کر لی کہ قیامت آگئی اور حکومت کو کشمیری پنڈتوں کے ناجائز مطالبہ کے سامنے جھکنا پڑا، اس واقعہ سے کشمیر کی حکومت کو بھی اپنے معیاری سیکولر حکومت ہونے کا پورا تجربہ ہو گیا ہوگا، ایک واقعہ ہو تو کہا جائے، سیکولر ہندوستان قدم قدم پر دو قومی نظریہ کا ثبوت دے رہا ہے، لیکن رانچی کے مسلمانوں کا خون رائیگاں نہ جائیگا، انشاء اللہ اس سے اردو کا چمن شاداب ہوگا، اصل قوت کا یہی وقت ہے، اس لیے پوری قوت سے اردو کی جد و جہد جاری رہنا چاہیے۔

مقالات

اسلام اور علم ہیئت کے نئے مسائل

از

جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

جون ۱۹۶۷ء میں رصدگاہ پارس کے قیام پر تین صدیاں گزریں، اس تقریب میں وہاں ایک نمایش ہوئی، اس علم سے اپنی ناواقفیت کے باوجود اس کی روزافزوں اہمیت مجھے وہاں کشاں کشاں لے گئی۔

نمایش میں پرانا سامان بھی تھا اور جدید ترین آلات بھی، مثلاً چاند ہی نہیں دیگر ستاروں کی سطح کے کس طرح فوٹو لیے جاتے اور ان کی مٹی کی تحلیل کی جاتی ہے (ان کی روشنی کے رنگ کی مدد سے)، اور وہاں کے پہاڑ اور غار ناپے اور گنے جاتے ہیں،

نمایش میں ایک عربی اصطرلاب (جس پر کوفی خط کی عبارت سے گمان ہوتا ہے کہ اندلس سے آیا ہوگا)، اور علم ہیئت کا ایک فارسی مخطوطہ بھی رکھے گئے تھے، جہالت تو نہ ہوگی تعصب ہی ہوگا کہ اور چیزوں کے برخلاف ان دونوں پر توضیحی چٹھیاں نہ تھیں، مگر بہرحال فرنگی سامان کو چھوڑ کر اگر کسی اچھی چیز نے وہاں جگہ پائی تو وہ مذکورہ اسلامی چیزیں ہی تھیں،

مجھے معلوم نہیں سب سے پہلی اسلامی رصدگاہ کب اور کہاں کھلی تھی، کہتے ہیں کہ ابن رشد نے

اندلس میں دوربین کے بغیر ہی سورج میں دھبوں کا پایا جانا معلوم کیا تھا، بیسیوں ستاروں کے نام آج بھی فرنگی زبانوں میں عربی ہی میں ہیں، برطانیہ سے رصدگاہ گرینچ کا ملاحوں کے لیے جو سالنامہ شائع ہوتا ہے اس کا آدھا نام آج بھی عربی میں ہوتا ہے: ناٹیکل المناک (المناخ عربی لفظ ہے) اس کا ایک نسخہ اتفاق سے میرے پاس ہے، اور اس میں دوران سال میں مشہور و ممتاز ستاروں کے نظر آنے کا زمانہ اور آسمان پر مقام ایک جدول میں درج ہیں، اس فہرست کے ستاون ناموں میں سے سینتالیس عربی ہی میں ہیں، مثلاً: *Achernar* (آخر النہر)، *Aldearan* (الدبران) *Alphard* (الفرد) *Alphecca* (الفکہ)، *Altair* (الطیر) *Betelgeuse* (ابط الجوزاء)، *Diphda* (ضفدع) *Famalhaut* (فم الحوت)، *Markab* (مرکب) *Minkar* (منقار) *Suhail* (سہیل)، *Vega* (النسر الواقع) ــــ ایسی ایک مکمل تر فہرست میں نے ابن قتیبہ کی کتاب الانواء کے ضمیمے میں شائع کی ہے ــــ اور ہمارے اجداد نے اس طرح آسمان پر اپنے کام سے اپنے انمٹ نام لکھ دیے تھے، اور اب؟ اب چاند کی بلدیہ اپنے ہاں کی گلیوں کے نام تجویز کر رہی ہے، لیکن ہیئت دانوں کی بستی میں ہمارا کوئی ہم مذہب گویا بستا ہی نہیں ہے۔

غالباً دو ہی چار سال میں آدمی چاند پر پہنچ جائے گا، ممکن ہے امریکی ہو یا روسی یا کوئی اور فرنگی، ممکن ہے کچھ عرصہ بعد سیاحوں میں کوئی مسلمان بھی آ جائے، چاہے وہ اسلامی ملکوں میں سے کسی کا باشندہ نہ ہو بلکہ روسی یا امریکی رعیت ہو، ہمارے ہیئت دانوں اور طیارہ سازوں کو اس میں حصہ لینے کی نوبت نہ بھی آئے تو ہمارے مفتیان کو ایک سوال کا جواب جلد دینا ہوگا۔ چاند پر نماز کس قبلے کی طرف رخ کر کے پڑھی جائے، زمین کا قبلہ تو معین ہے اور وقت میں وہاں کا نام

نہیں ہو سکتا۔ اَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰہِ : (جدھر بھی مڑو ادھر خدا کا چہرہ موجود ہے)
اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن توحید کے حامل مذہب میں چاند والوں کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مرکز یا قبلہ قرار
دینا پڑے گا، اس سوال کا جواب بعد میں بعید تر ستاروں میں پہنچیں بھی تو کام دے سکے گا، دو ایک
سوال ہوئے۔ جامعہ استانبول کے طلبہ نے دریافت کیا تو میں نے عرض کیا تھا کہ چاند کے ہرا
روشن ہونے والے حصے کے وسط میں ایک کعبہ قمری قرار دینا، پھر اسے وہاں بنانا مناسب ہوگا،
یہ کعبہ کم از کم کعبۂ ارضی کے محاذی تو ہو جائے گا۔

ہوائی مسافروں کا وقت نماز و افطار ایک اور عملی مسئلہ اب ہر روز پیش آرہا ہے، زمین کے گول ہونے
کے باعث آفتاب کے طلوع و غروب کا وقت ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا، خط استوا پر جہاں محیط ارضی
سب سے زیادہ طویل ہے، ہر ہزار میل پر ایک گھنٹے کا فرق ہو جاتا ہے، اس کے آگے قطب کی طرف
جتنا بڑھیں گے، وقت کا اتنا فرق اس سے بھی کم تر مسافت پر ہونے لگتا ہے، کلکتہ اور لندن میں
طلوع یا غروب آفتاب میں کوئی ساڑھے پانچ گھنٹے کا فرق ہے، ہوائی جہازوں کی تیز رفتاری کا اب
یہ عالم ہے کہ یہ مسافت سات آٹھ گھنٹوں میں طے ہو جاتی ہے، اور موجودہ زیر تعمیر طیارے آجائیں تو
شاید تین چار گھنٹے ہی کافی ہو جائیں گے (پاریس سے استانبول کو ایک گھنٹہ کافی ہونا بتایا جا رہا ہے)
اس کا نتیجہ؟ فرض کیجئے کہ لندن سے سحری کر کے صبح کے سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں
کی پرواز کے بعد لندن کے ۱۴ بجے لیکن کلکتہ کے ساڑھے انیس بجے (شام کے ساڑھے سات بجے)
کلکتہ میں اتریں تو افطار کس وقت پر کیا جائے؟ لندن کے حساب سے یا کلکتہ کے حساب سے؟
اس پرواز میں غالباً سورج راستے میں طیارہ والوں کو ڈوبتا ہوا نظر آچکا ہوگا، فرض کیجئے کہ غروب آفتاب
چھ بجے ڈوبا جب کہ لندنی مسافر نے مشکل سے پانچ چھ گھنٹے امساک کیا ہے، تو یہ روزہ بہت مختصر
ہوگا، کلکتہ پہنچنے کے بعد کے دوسرے دن سے یہاں بحث نہیں اور نہ یہ ملنے والا جواب کافی ہو کر

مغربی روزہ معاف ہے)، اس کے برعکس کلکتہ سے لندن جانے کے لیے صبح سات بجے اڑیں اور سات گھنٹوں کی پرواز کے بعد لندن پہنچیں تو کلکتہ میں تو ۲ بجیں گے لیکن لندن میں صبح کے ساڑھے آٹھ ہی بجے ہوں گے، اور اگر اس دن لندن میں موسم بہار کے باعث آفتاب شام کے چھ بجے بھی ڈوبتا ہو تو مزید ساڑھے نو گھنٹے انتظار کرنا ہوگا، اور سحری اگر صبح چار بجے کی تھی تو پرواز شروع ہونے تک کے تین گھنٹے، پرواز کے سات گھنٹے اور افطار تک کے مزید ساڑھے نو گھنٹے (۳ + ۷ + ۲/۱۹، جملہ ۲/۱۹ گھنٹے کا روزہ ہوگا، جو بہت زیادہ ہے، یہ تو آجکل پیش آرہا ہے اور وہ دن قریب ہے کہ کلکتہ سے صبح کے سات بجے اڑیں تو چھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جب مغربی ملک میں پہنچیں گے وہاں بھی صبح ہی کے سات بجے ہوں گے، (بات یہ ہے کہ محیط ارضی چوبیس ہزار میل ہے، اس لیے خط استوا پر فی گھنٹہ ہزار میل کی مسافت سے پرواز کریں تو زمین کی گردش محوری کی رفتار اور ہماری رفتار پرواز یکساں ہونے سے، مشرق سے مغرب کی طرف جانے والے کے لیے سورج اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا، کلکتہ اور لندن خط استوا سے دور ہیں اس لیے اس سے بھی سست تر رفتار طیارہ سے وہی نتیجہ نکلتا ہے، اور اگر طیارے کی رفتار زمین کی اپنی رفتار سے تیز تر ہو جائے، جیسا کہ فوجی طیاروں میں اب ہو بھی چلا ہے، تو مسافر کو راستے میں آفتاب "مشرق" (۱) میں ڈوبتا نظر آئے گا، اور مثلاً کلکتہ سے صبح کے سات بجے نکلیں تو سات گھنٹوں کی پرواز کے باوجود مغربی منزل مقصود میں "قبل از وقت" پہنچیں گے، یعنی صبح کے مثلاً چار بجے ہوں گے اور آفتاب ابھی نکلا بھی نہ ہوگا، اور اگر مغرب سے مشرق کو جائیں تو آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا مشاہدے میں آئے گا جس کا احادیث میں ذکر ہے)، فتبارک اللہ احسن الخالقین، اللہ ہی سب سے بہتر خالق ہے، بابرکت وہی ہے، بیچارہ انسان تو ناچیز ہی رہے گا۔

گزشتہ سال ایک صاحب رمضان میں شاید ڈھاکہ سے جنیوا گئے تھے، انھیں ایسا ہی

حادثہ پیش آیا، ان کی فتویٰ طلبی پر کیا جواب دیں؟ منزل روانگی کے وقت کے حساب سے وہ افطار کریں یا منزل ورود کے؟ اسی طرح سیلون سے روس کو، ارجنٹائن سے کنیڈا کو پرواز کریں تو وقت کا اتنا کثیر فرق ہوتا ہے کہ آدمی دم بخود ہو جاتا ہے، غالباً معقول جواب یہی سمجھا جائے گا کہ دوران پرواز میں منزل روانگی کا وقت ہی نماز اور روزہ کے لیے ملحوظ رکھا جائے، مقامی وقت نہیں یعنی دوران پرواز کے جگہ جگہ بدلنے والے وقت کا، نہ منزل ورود کا، اگر ایسا نہ کریں تو اسپوٹنیک کے مسافر کو جو زمین کے گرد گھومتا ہے، روزانہ آٹھ آٹھ مرتبہ سورج کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھنے کا موقع ملتا ہے، اور تین گھنٹے میں اس کے لیے چوبیس گھنٹوں کی نمازیں اور روزہ رکھنا معقول نہیں ہو سکے گا۔

ہجری عیسوی تقابلی جنتریاں جہاں ان حال و مستقبل کی چیزوں پر توجہ کی ضرورت ہے، وہیں ماضی کے تحقیقات کی نظر ثانی و تقسیم کے لیے بھی ہمیشہ تیار رہنا چاہیے، تاکہ اگر کوئی انسانی غلطی ہوئی تھی تو وہ برقرار نہ رہے بلکہ اس کی اصلاح ہو جائے، والعصمۃ للہ، غلطی سے بری تو صرف خدا کی ذات ہے، مثلاً:-

ان دنوں میں ہجری سنہ کی مطابق تاریخیں عیسوی سنہ میں معلوم کرنے کے مسئلے پر کام کر رہا ہوں، یورپ میں کم از کم ساڑھے تین سو برس سے اس کام کے لیے تقابلی جنتریاں بنائی جانی شروع ہوئی ہیں، گذشتہ چودہ سو برس سے، جب کہ ہجری سنہ شروع ہوا ہے، محرم، ربیع الاول، جمادی الاولیٰ رجب، رمضان، اور ذیقعدہ ہمیشہ اور ہر سال تیسے ہوتے ہیں، ذی حجہ کے سوا باقی دوسرے مہینے انتیسے، اور صرف ذی حجہ بعض قواعد کے تحت کبھی انتیسا کبھی تیسا ہوتا ہے، یہ ہے وہ فرنگی تحقیق (جس میں اور تو اور، خود رمضان بھی ہمیشہ تیسا ہوتا ہے)، میں نے انگریزی، فرانسیسی، جرمن، ہسپانی، اطالوی، روسی اور روسی (اور ان کے ترجموں) میں پڑھی ہے، اس طرح کا

اردو میں ایک پرانے رفیق پروفیسر خالدی نے انجمن ترقی اردو کے لیے شائع کیا تھا۔ وہ اس وقت یہاں نہیں ہے کہ تحقیق کرسکوں، مگر خوف ہے کہ انھوں نے بھی وہی کیا ہوگا جیسا کہ ایک ترکی "فاضل" نے کیا ہے۔

اس پر روئیں یا ہنسیں؟ ان مغربی محققوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ بعض وقت مسلسل تین تین مہینے تیسے، یا یا تین تین مہینے انتیسے بھی ہوتے ہیں، اور یہ علم ہیئت کے مسلمات میں سے ہے، اور مشاہدہ بھی، رصدگاہ استانبول کے رسالے میں لکھا ہے کہ ابھی چند سال قبل ترکی میں ایک مرتبہ مسلسل چار مہینے تیسے ہوئے۔

بہرحال مذکورہ تقابلی جنتریوں کی غلط نویسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا ہے کہ کسی پرانی اسلامی کتاب میں کسی واقعے کی تاریخ دن کی صراحت کے ساتھ ہو۔ اور ان فرنگی ملاؤں کی جنتری میں وہ دن مذکور نہ ہو تو اسلامی مورخ غلط بیان یا کم از کم سہل انگار قرار پاتا ہے، جنتری غلط نہیں سمجھی جاتی (مثلاً میرے سامنے اس وقت کاتنوزکی ایک ایسی فرانسیسی تقابلی جنتری ہے، حجۃ الوداع ۱۰ھ میں جمعہ کے دن ہوا تھا لیکن یہ جنتری کہتی ہے کہ اس سال جمعہ کے دن ذی حجہ کی آٹھویں تھی۔ یا یہ کہ امام حسینؑ کی شہادت ۱۰ محرم ۶۱ھ کو جمعہ کے دن ہوئی لیکن یہ جنتری اسے جمعہ نہیں بدھ کے دن قرار دیتی ہے۔

کیا یہ ضرورت نہیں کہ مسلمان ہیئت دان ایسی تقابلی جنتری خود بنائیں اور صحیح تر بنائیں؟ اسی مذکورہ علمی کام کے سلسلے میں محمود پاشا فلکی کی شہرہ آفاق کتاب "نتائج الافہام" اور اس کی فرانسیسی اصل کو بھی دیکھا، اس کتاب پر "سیرۃ النبیؐ" میں شبلی مرحوم اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے کافی اعتماد کیا، اور اس کی ثناخوانی کی ہے، گذشتہ صدی کے اس سب سے بڑے مسلمان ہیئت داں پر مجھ جیسے اس علم سے نابلد شخص کی طرف سے تنقید، ایک بے ادبی سمجھی جائے گی لیکن میں نے

تنقید کو تردید نہیں سوال کے طور پر ہیئت دانوں اور مورخوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں ۔

گاہ باشد کہ کودک ناداں الخ

وہ کہتے ہیں کہ (۱) ولادت نبوی ۲۰ اپریل ۵۷۱ء کو ہوئی، اور یہ کہ اسلام سے پچاس سال قبل سے شمسی (کبیسہ گری) کا مکہ میں رواج باقی نہ رہا تھا، بلکہ خالص قمری سال پایا جاتا تھا، (۲) ہجرت میں رسول اکرمؐ کا مدینہ میں ورود مبارک یوم عاشورا کو ہوا، جو محرم میں نہیں ربیع الاول میں پایا جاتا ہے، اور (۳) رسول اکرمؐ کے فرزند دلبند حضرت ابراہیمؑ کی وفات ۲۹ شوال ۱۰ھ کو ہوئی ۔

دلیلیں ؟ "ولادت نبوی کے متعلق چوتھی پانچویں صدی ہجری کے مسلمان ہیئت دانوں نے جو زائچے بنائے ہیں ان سے یہی ثابت ہوتا ہے"۔ ولادت مبارک کے دن غیر ستارے کے طلوع کا ذکر تو میں نے بعض حدیثوں میں پڑھا ہے (جس سے محمود فلکی نے بحث نہیں کی ہے) لیکن دوسرے ستاروں کے قران السعدین کا یا ان کے فلاں فلاں مقام پر ہونے کا ذکر نہ قرآن مجید میں ہے نہ کسی حدیث میں میری نظر سے گزرا ہے، گمان یہ ہوتا ہے کہ اولاً ہمارے ان پرانے مسلمان زائچہ نویسوں نے ایک مفروضے کی اساس پر ولادت نبوی کی تاریخ خود معین کی اور پھر اس تاریخ کا زائچہ بنا ڈالا، لیکن اگر ابتدائی مفروضہ ہی غلط رہا ہو تو اس کا نتیجہ کیسے صحیح ہو جائے گا؟ پہلا ہجری سال ۶۲۲ء سے ہونا معلوم و معین ہے، رسول اکرمؐ کی ولادت ربیع الاول کے مہینہ میں ہونی مروی ہے، اس مبارک واقعہ کے چالیس سال اور چھ ماہ بعد بعثت ماہ رمضان میں ہوئی، پھر مزید بارہ سال چھ ماہ بعد ہجرت نبوی ہوئی لیکن سنہ ہجری کا آغاز بعثت کے بارہ سال تین ماہ بعد ہی ہو گیا، غرض ۴۰ سال چھ ماہ + ۱۲ سال تین ماہ سے باون قمری سال فرما ہوتے ہیں، ۶۲۲ء میں سے باون سال ہی حذف کریں تو

۵۲۹ء ہونا چاہیے، ۵۳۲ء نہیں[1]، سب لوگ جانتے ہیں کہ کبیسہ گری (نسی) کو منسوخ کرنے کا حکم حجۃ الوداع میں دیا گیا، ولادت نبوی سے حجۃ الوداع تک نہ بھی لیں تو، ولادت سے ہجرت تک کے باون سالوں میں کم میں نسی ہوتی رہی، اور اس مدت کو خالص قمری شمار کرنا صحیح نہ ہوگا، کہ باون قمری سالوں کے اکاون شمسی سال قرار دیے جاسکیں، اگر زائچہ بنانے والوں نے کسی سہو سے باون کبیسہ والے سالوں کو باون قمری سال فرض کیا اور پھر اس مفروضے کی اساس اس کی معادل چیزیں ڈھونڈھ نکالیں کہ کسریٰ کا سنہ جلوس کونسا تھا، سنہ سکندری کی کیا تاریخ تھی، وغیرہ تو یہ ساری چیزیں ثبوت کی محتاج ہوں گی، تاریخی واقعے کی اساس نہیں، گھڑیاں توپ کے چلنے پر درست کی جاتی رہیں اور توپ بھی ان ہی گھڑیوں کی اساس پر چلتی رہے تو وقت کے صحیح ہونے کا کیا ثبوت؟

دوسرا مسئلہ: "مدینۂ منورہ میں ورود مبارک یوم عاشورا کو ہوا"، محمود فلکی نے لکھا ہے کہ سیرۂ حلبیہ میں کسی حافظ بن ناصر الدین کا بیان ہے کہ "قدم المدینۃ یوم عاشوراء" (عاشورے کے دن مدینہ تشریف لائے) اور اس کی صحت کا یہ ثبوت کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم میں ہے، فلکی پاشا نے اسی پر اکتفا کی اور بخاری و مسلم میں تحقیق نہ کی، ان ماخذوں میں باوجود تلاش کے مجھے یہ الفاظ نہ ملے (مفتاح کنوز السنۃ نامی حدیثوں کے انڈکس میں بھی اسکا ذکر نہ ملا) بخاری و مسلم میں ملے تو یہ الفاظ کہ "قدم النبی علیہ السلام فرأی الیہود تصوم یوم عاشوراء" (نبی علیہ السلام مدینہ آئے تو دیکھا کہ یہودی عاشورے کے دن روزہ رکھتے ہیں) یا یہ حدیث کہ "دخل المدینۃ واذا اناس من الیہود یعظمون عاشوراء ویصومونہ" (مدینہ تشریف لائے تو حال یہ تھا کہ وہاں کچھ یہودی عاشورے کا احترام کرتے اور اس دن روزہ

---

[1] میرے حساب سے تو یہ جولائی ۵۶۹ء کا واقعہ ہے۔

رکھا کرتے تھے، حافظ بن ناصر الدین صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور ان کی عبارت غلط فہمی کا باعث ہوئی ہے، ورنہ بخاری و مسلم کی روایتوں کا اطلاق محرم ۲ھ پر بھی بغیر کسی دشواری کے ہو سکتا ہے، اور غالباً ہونا بھی چاہیے، بخاری و مسلم کی ایک اور روایت سے بھی اسی خیال کی توثیق ہوتی ہے کہ "ارسل النبی علیہ السلام غداۃ عاشوراء الی قری الانصار من اصبح مفطرا فلیتم بقیۃ یومہ ومن اصبح صائما فلیصم" (عاشورہ کے دن نبی علیہ السلام نے چاشت کے وقت انصار کی بستیوں میں آدمی بھیجے کہ جو کوئی ناشتہ کر چکا ہو تو بھی وہ باقی دن روزہ رکھے اور جس نے ابھی کچھ نہ کھایا ہو تو سارا دن روزہ رکھے)۔ ہجرت کے دن ورود نبوی قبا میں دوپہر کے وقت ہوا، اسی دن سویرے روزے کا حکم بھیجنا ممکن نہیں، اور ساری غلطی حافظ بن ناصر الدین کے سہو پر مبنی معلوم ہوتی ہے، اس پر مزید بحث نیچے آتی ہے،

تیسرا مسئلہ: فرزند نبوی حضرت ابراہیمؑ کی وفات کے دن سورج گرہن ہوا تھا، فلکی پاشا نے اسے ۲۷ جنوری ۶۳۲ء مطابق ۲۹ شوال ۱۰ھ کو قرار دیا، اور اس پر بہت اصرار بھی کیا ہے، کستانو (اسکاوشنگ) کے زمانے میں علم ہیئت کی جو شُدبُد تعلیم حاصل کی تھی وہ اتنے بڑے علمی مسئلے میں کام نہیں دیتی، اس لیے خود حساب کر کے علم الیقین کے ساتھ بیان کرنے کی جگہ مجبور ہوں کہ غیروں کی خوشہ چینی کروں، ذمہ داری ان ہی پر ہے، بہرحال فرانسیسی میں گمنام پادریوں کی ایک پرانی متداول کتاب ہے "تعابلی تاریخیں معلوم کرنے کا فن" (L. Art de verifier les dates) اس کی جلد اول میں حضرت عیسیٰؑ کے زمانے سے اب تک سارے چاند گرہنوں اور سورج گرہنوں کی تاریخ و تفصیل دی گئی ہے۔ عہد نبویؐ کے مدنی دور کے گرہنوں کا ذکر اس کتاب میں جلد اول صفحہ (۶۴) پر ہے۔ فی الحال کوئی اور ماخذ معلوم نہیں جس کی مدد سے صحت کی جانچ کر سکوں، اس لیے اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔

محمود فلکی کا بیان کہ حضرت ابراہیمؑ بن رسول اللہؐ کی وفات ۲۹ر شوال سنہ ۱۰ھ کو ہونی چاہیے، اس کی کوئی سند اسلامی تاریخوں میں نہیں ملتی، اس واقعے کے متعلق جو اختلاف رائے ہے، اس کا خلاصہ بلاذری کی انساب الاشراف (ج ۱ ص ۴۴۹ تا ۴۵۲، طبع مصر) اور ابن عبدالبر کی الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ج ۱، سوانح نمبر ۱، طبع حیدرآباد دکن) میں ملتا ہے۔

ابن عبدالبر نے اور روایتوں کے ساتھ یہ ضعیف روایت بھی نقل کی ہے کہ یہ وفات ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ میں ہوئی۔ سورج گرہن چونکہ قمری مہینے کے آخر ہی میں ہو سکتا ہے، اس لیے مراد ذی الحجہ کی آخری تاریخ ہی ہوگی۔ اگر اس روایت میں مکہ والوں کی کبیسہ گری ملحوظ رکھی گئی ہے تو یہ ۲۱ یا ۲۲ مارچ سنہ ۶۳۲ء کو ہونا چاہیے، اور اگر کبیسہ گری کو ملحوظ نہیں رکھا گیا بلکہ خالص قمری سال کی تاریخ مراد ہے، تو یہ ۱۸ یا ۱۹ اپریل کو ہوا ہے، مگر مذکورہ فرانسیسی کتاب کی جدول میں اگست سنہ ۶۲۹ء اور اگست سنہ ۶۳۰ء کو تو سورج گرہن بتائے گئے ہیں، لیکن مارچ یا اپریل سنہ ۶۳۲ء میں کوئی نہیں۔ ابن عبدالبر کی دوسری روایت جس سے سارے ہی سیرت نگار متفق ہیں، یہ ہے کہ یہ ذی الحجہ سنہ ۸ھ اصل میں صاحبزادے کی ولادت کی تاریخ ہے۔ سورج گرہن بخاری وغیرہ سب کے مطابق ان کی وفات کے دن ہوا، یہ وفات بلاذری کی ایک روایت میں ۱۷ دن کی عمر میں ہوئی، یعنی صفر سنہ ۹ھ کے آخر میں، کبیسی حساب سے یہ ۱۹ر مئی سنہ ۶۳۰ء کو اور خالص قمری حساب سے تقریباً ۱۷ر جون سنہ ۶۳۰ء ہوگا، ان دونوں تاریخوں میں دنیا میں کوئی سورج گرہن نہیں ہوا، دوسری روایت جو مصعب اور ابن اسحٰق کی ہے، وفات کو اٹھارہ ماہ کی عمر میں بتاتی ہے، یعنی جمادی الآخرہ سنہ ۱۰ھ جو کبیسہ اور غیر کبیسہ دونوں حسابوں سے ایک ہی تاریخ یعنی ۳ر ستمبر سنہ ۶۳۱ء کو ہوتی ہے، اور اس تاریخ کو بھی کوئی سورج گرہن دنیا میں نہیں ہوا، تیسری اور آخری روایت سولہ ماہ کی عمر میں وفات کی ہے، اور بلاذری نے

صراحت بھی کی ہے کہ یہ ربیع الثانی کی آخری تاریخ کو پیش آئی، یہ تین اگست ۶۳۱ء کے معادل ہے، اور واقعی اس تاریخ کو ایک سورج گرہن ہوا بھی ہے، ابوداؤد کے مطابق سخت گرم دن کا واقعہ ہے، اور اگست میں گرمی ہی ہوتی ہے، پیش نظر فرانسیسی جدول کے مطابق یہ گرہن "اسپین کے جنوب اور وسطی افریقا" میں نظر آسکتا تھا، کتاب میں عرب کی صراحت نہیں ہے، لیکن غالباً اس میں کوئی مانع بھی نہیں۔ واحد پیچیدگی یہ ہے کہ بخاری کے مطابق یہ صبح چاشت کے وقت کا واقعہ ہے اور فرانسیسی جدول میں گرہن پاریس کے حساب سے بعد ظہر ڈھائی بجے شروع ہوا، یعنی مدینہ منورہ میں عصر کے وقت، میں نہیں جانتا فرانسیسی جدول میں کوئی سہو ہے یا نہیں، مگر فی الحال اسی کو قبول کرنا پڑتا ہے، محمود فلکی نے شوال ۱۰ھ مطابق ۲۷ جنوری ۶۳۲ء کو جو ذکر کیا ہے، وہ اس فرانسیسی جدول کے مطابق "جنوب مشرقی افریقا سے مشرقی ایشیا تک" دیکھا جا سکتا تھا، اور پاریس کے حساب سے صبح ساڑھے چھ بجے شروع ہوا تھا۔ یہ مدینہ منورہ میں کوئی نو بجے چاشت کا وقت ہوگا، لیکن جنوری سخت سردی کا زمانہ ہے، اور یہ ابوداؤد کی صراحت کے خلاف ہے، معلوم نہیں سہو قلم ہے یا کیا کہ اپنی فرانسیسی اور عربی دونوں کتابوں میں محمود فلکی نے لکھا ہے کہ "یہ سورج گرہن آدھی رات کے بعد تقریباً ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوا"، کیا سورج گرہن کبھی رات کو بھی ہوتا ہے؟ کیا آدھی رات کے بعد کبھی ساڑھے آٹھ بھی بجتے ہیں؟ فرانسیسی کتاب تو ان فرنگیوں ہی کے لیے لکھی اور فرانس اور بلجیم دو مقاموں کے علمی رسالوں میں بیک وقت شائع ہوئی، اس میں تو فرنگی حساب ہی ہونا چاہیے، عربی حساب نہیں کہ چھ بجے آدھی رات ہوتی ہو۔

۱؎ واقدی نے ۱۰ ربیع الاول ۱۰ھ لکھا ہے، قمری مہینہ کی دسویں تاریخ کو سورج گرہن ہو نہیں سکتا، مہینے کے آخر میں ہو سکتا ہے، غالباً "آخر ربیع الاول" کو مولف یا کاتب کے سہو قلم نے عاشر ربیع الاول کر دیا۔ (۱۰ ربیع الاول میں کوئی گرہن نہیں ہوا)

یہودی سنہ اوپر محمود فلکی کے اس بیان کا ذکر آیا کہ ہجرت نبوی میں ورود مبارک عاشورا کے دن ہوا جو یہودیوں کے یوم تشری نہیں بلکہ عید الفصح کے مترادف ہے، اور محرم میں نہیں، بلکہ ربیع الاول میں ہوتا ہے۔

نفس قصہ یہ معلوم ہوتا ہے بخاری و مسلم وغیرہ کی جن احادیث شریفہ میں عاشورے کے دن مسلمانوں کو روزہ رکھنے کے حکم کا ذکر ہے، وہاں نہ صرف اس کی صراحت ہے کہ اسلام سے پہلے قریش بھی (حتی کہ مسند احمد بن حنبل، ج ۶، ص ۱۶۲ کے مطابق خود رسول اکرم بھی) زمانۂ جاہلیت میں مکہ معظمہ میں اس دن روزہ رکھا کرتے تھے، بلکہ یہ بھی کہ یہ حضرت موسیٰؑ کے فرعون سے نجات پانے کے شکرانے میں ہے، اور ارشاد نبوی ہوا ہے کہ یہودیوں سے زیادہ مجھے سزاوار ہے کہ اس دن شکرانۂ باری تعالیٰ بجالاؤں۔

محمود فلکی نے فرنگی کتابوں سے بہ آسانی یہ معلوم کرلیا کہ یہودیوں کے ہاں دو بڑی عیدیں ہوتی ہیں، ایک یوم کپور (کفارہ) جس میں چوبیس گھنٹے کا طویل روزہ رکھنا فرض ہے، یہ تقریب ماہ تشری کی دس تاریخ کو ہوتی ہے، لیکن اس کا تعلق فرعون کے ڈوب مرنے سے نہیں ہے، بلکہ یہودیوں کے ہاں بحر احمر کو عبور کرنے کی تاریخ ۱۵ نیسان کو ہے، اسے عید الفصح کہتے ہیں، لیکن اس دن کوئی روزہ نہیں رکھا جاتا۔

ان حالات میں محمود فلکی نے احادیث میں بیان شدہ فرعون سے نجات کے عنصر کو اہمیت دی، روزہ رکھنے کو نظر انداز کرکے ہجرت نبوی میں مدینہ تشریف آوری کو (جو حافظ ابن ناصر الدین کے مطابق عاشورے کے دن ہوئی) یوم کپور کی جگہ عید الفصح کے مترادف قرار دیدیا، عید الفصح موسم بہار میں آتی ہے، ربیع الاول کے لفظی معنی بھی موسم بہار پر دلالت کرتے ہیں، لہذا یہ سب ٹھیک بیٹھتا ہے، اور چونکہ یکم محرم سنہ ۱ کا تقابل ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سے کیا جاتا ہے اسلئے [illegible]

تک (۲۹۷) دن ہوتے ہیں، اور اسے انھوں نے ۲۰ ستمبر ۶۲۲ء کے مطابق قرار دیدیا۔

مگر اس استدلال میں (غلطیاں تو کہنے کی مجھ جرأت نہیں)، کئی گتھیاں مجھے نظر آتی ہیں:

(۱) یہودی عید الفصح ماہ نیسان میں ہوتی ہے، اور نیسان کا مہینہ موسم بہار میں آتا ہے، اور اپنے معنے کے لحاظ سے ربیع الاول بھی موسم بہار پر دلالت کرتا ہے، لیکن خود محمود فلکی اسے ماہ ستمبر کا مہینہ قرار دیتے ہیں، ستمبر میں خزاں اور پت جھڑ کا موسم ہوتا ہے، بہار کا نہیں، بہار کا آغاز تو نوروز یعنی ماہ مارچ کے مہینہ میں ہوتا ہے، اگر فرض بھی کرلیں (جیسا کہ محمود فلکی کو اصرار ہے کہ اہل مکہ اسلام سے پچاس سال قبل ہی سے نسی کو ترک کر چکے تھے) کہ ربیع الاول کا زیر بحث زمانے میں موسم بہار میں آنا ضروری نہیں کیونکہ قمری مہینے جگہ بدلتے رہتے ہیں، تو بھی یہودی نیسان کا بہار میں آنا ضروری ہے، کیونکہ یہودی اپنے قمری سال میں لوند کا مہینہ بڑھاتے رہتے ہیں، لہذا ان کا ماہ نیسان ستمبر میں نہیں آسکتا، دوسرے الفاظ میں ان کی عید الفصح ربیع الاول سنہ ۱ھ میں یعنی ستمبر ۶۲۲ء میں ہو نہیں سکتی، یہاں یہ مکرر کہتے چلوں کہ ربیع الاول سنہ ۱ھ اگر تنسیخ نسی کے بعد سے حساب کرکے چلیں تو ۱۳ ستمبر سے شروع ہوتا ہے، لیکن اگر مکہ والوں کے نسی والے حساب پر باقی سمجھیں، کہ ابھی اسے رسول اللہؐ نے منسوخ نہ فرمایا تھا، تو یہ ربیع الاول ۲۰ مئی سے شروع ہوا تھا، مکی حساب کا محرم واقعی نیسان یعنی عید الفصح کے مطابق ہے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم محرم میں نہیں بلکہ ربیع الاول (مطابق یہودی ماہ سیوان) میں مدینہ تشریف لاتے ہیں۔

(۲) یہودی عید الفصح ماہ نیسان میں ہوتی ہے جو ان کے سال کا ساتواں مہینہ ہے: (تشری، ماشیوان، کسلیو، تیبت، شباط، آدار، نیسان، ایار، سیوان، تموز، آب، ایلول) ان کے یہاں بھی قمری سال رائج ہے، اور وہ بھی ہر تیسرے سال ایک تیرھواں لوند کا مہینہ بڑھا دیتے ہیں

یہ اضافہ ماہ آذار کے بعد ویادار کے نام سے ہوتا ہے لیکن چاند ہو کہ نہ ہو، سال کا آغاز کبھی کسی اتوار، بدھ یا جمعہ کے دن سے نہیں ہو سکتا، اگر رویت ہلال سے ایسا ہو بھی جائے تو نئے سال کی تاریخ ایک دن متاخر کر دیتے ہیں اور سال کبھی ۳۵۳، کبھی ۳۵۴ اور کبھی ۳۵۵ دن کا ہو جاتا ہے، چاہے علم ہیئت مانے یا نہ مانے، غرض ان کے سال کا آغاز، جو ماہ تشری سے ہوتا ہے، کبھی ستمبر اور کبھی اکتوبر میں واقع ہوتا ہے، ہجرت میں رسول اکرمؐ کی مدینہ تشریف آوری اگر واقعی ستمبر میں ہوئی تھی تو یہ ماہ تشری کے مطابق تو ہے، ماہ نیسان کے نہیں، ماہلر کی یہودی تقابلی جنتری کے مطابق جو جرمن میں ہے (E. Mahler, Vergleichungs-Tabellen, Wien 1888, P. 77) یکم تشری ۴۳۸۳ یہودی کے مطابق تاریخ ۱۱ ستمبر ۶۲۲ء ہے۔ بعد کے خالص قمری حساب سے یکم محرم ۱ھ کے مطابق تاریخ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سمجھی جاتی ہے۔

دوشنبہ کا دن لانے کے لیے محمود فلکی نے ورود مدینہ ۸ ربیع الاول کو قرار دیا ہے، یہ چونکہ یکم محرم سے (۶۶) دن بعد کا واقعہ ہے، اس لیے ۱۶ جولائی کے (۶۶) دن بعد ۲۰ ستمبر کو پیش آنا چاہیے، یعنی ماہ تشری میں، عید کپور کے دو دن پہلے، نہ کہ عبور دریا و غرق فرعون کی عید الفصح کے موقع پر، لیکن اگر مکہ کے کبیسہ والے حساب سے لیں تو ہجرت نبوی ماہ مئی میں ہوگی، ماہ ربیع الاول ۲۰ مئی ۶۲۲ء جمعرات کے دن شروع ہوا تھا، ۱۲ ربیع الاول مطابق ۳۱ مئی بھی پیر ہی کو ہے۔ لہٰذا اسلامی پرانی روایات کی توثیق ہوتی ہے، اور محمود فلکی کے بیانات غلط ثابت ہوتے ہیں، ماہ مئی مدینہ منورہ میں خاصی گرمی کا ہوتا ہے، اور کتب سیر میں صراحت ہے کہ رسول اکرمؐ کی آمد کے وقت خاصی گرمی تھی، اور انصار دن چڑھنے پر گرمی کے باعث مزید انتظار کیے بغیر گھروں میں واپس چلے گئے تھے، جبکہ حضورؐ کی آمد آمد ہوئی یعنی یہودی ماہ سیوان میں شروع ہوا تھا جس کو نہ تشری کے روزے سے اور نہ عید الفصح

کی تقریب سے کوئی تعلق ہے۔

(۳) یہ امر کہ عاشورا کو یوم کپور کے مترادف سمجھنا چاہیے، عید الفصح کے نہیں، اس کی تائید میں کئی باتیں ہیں:

(الف) یوم کپور ماہ تشری کی دسویں کو ہوتا ہے، اور "عاشورا" کے لغوی معنی بھی دسویں دن ہی کے ہیں، اور جہاں تک میں جانتا ہوں، اسلامی ادبیات و روایات میں اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ عاشورا محرم کی دسویں کو ہوتا ہے۔

(ب) یوم کپور کے موقع پر یہودیوں کے ہاں روزہ رکھنا فرض ہے، اور حدیث شریف میں صراحت ہے کہ یہودی عاشورا کے دن روزہ رکھتے تھے۔

(ج) یوم کپور کو فرعون سے نجات پانے سے قطعاً بے تعلق قرار دینا بھی صحیح نہیں معلوم ہوتا، مجھے عبرانی زبان اور یہودی ادبیات سے واقفیت کا مطلق دعوی نہیں، اب سے پینتیس سال پہلے (۱۹۳۳ء میں) جرمنی میں کچھ عبرانی سیکھی تھی، اب تو حروف تہجی بھی مشکل سے یاد ہیں، بہر حال میرے سامنے ۱۹۱۱ء میں پارلیس میں چھپی ہوئی ایک کتاب ہے، جس میں عبرانی دعائیں فرانسیسی ترجمے کے ساتھ دی گئی ہیں، اور کتاب کا نام ہے: "سال کے سارے دنوں میں پڑھی جانے والی دعاؤں کی کتاب" (Debre, Rituel de prieres pour Tous les jours de l'annee) اس میں ماہ تشری کی دسویں کو یوم کپور کے موقع پر جو دعا پڑھی جاتی ہے، اس کے آخری الفاظ (عبرانی میں صفحہ ۲۴۲ پر اور فرانسیسی میں صفحہ ۲۴۳ پر) یہ ہیں: مقراقدیس ذکر لیصیات مصریم (یعنی اے خدا تو نے اس عید کو "مقدس گردانا ہے کہ وہ مصر سے نجات کی یاد دلاتی ہے")۔ جب یہودیوں ہی کے مطابق یوم کپور کو مصر سے نجات کی یاد سے تعلق ہے تو پھر ہمیں تعجب کیوں ہو کہ حدیث شریف میں رسول اکرم

نے بھی اس کا ذکر فرمایا ہے، صلی اللہ علیہ وسلم

(د) مشرکین مکہ میں بھی اور یہودیوں کے ہاں بھی قمری مہینہ رائج تھا، اس لیے مہینوں کا آغاز مذکورہ بالا یہودی استثناؤں کے ساتھ ایک ہی زمانے میں ہوتا تھا، دونوں کے ہاں لوند مہینہ بڑھانے کا رواج تھا، لیکن عرب اسے ختم سال پر ذی الحجہ کے بعد اور محرم سے پہلے بڑھاتے تھے تو یہودی وسط سال میں چھٹے مہینے آدار کے بعد اور ساتویں مہینے نیسان سے پہلے، مزید برآں وہ لوند کا تیرھواں مہینہ انیس سال[1] میں چھ مرتبہ (تیسرے، چھٹے، آٹھویں، گیارہویں، چودہویں اور انیسویں سال) بڑھاتے ہیں جس کے بعد زمانہ اپنے پرانے حال پر واپس آجاتا سمجھا جاتا ہے، اسکے برخلاف مکہ والوں کی نسی میں یہ عمل کبھی تین برس میں ایک بار اور کبھی دو ہی برس میں ایک بار کرکے تینتیس سال میں بارہ[2] مرتبہ لوند کا مہینہ بڑھایا جاتا اور اس طرح خالص قمری اور لوند والے مہینے مکر اپنی اصلی حالت پر واپس آتے، (اور بظاہر یہ تیسرے، چھٹے، نویں، گیارہویں، چودہویں، سترہویں، بیسویں، بائیسویں، پچیسویں، اٹھائیسویں، تیسویں اور تینتیسویں سال کے اختتام پر بڑھائے جاتے، کم از کم فلکیاتی ریاضیات کے نقطۂ نظر سے اسی طرح بڑھانے کی ضرورت ہے، تاکہ قمری اور شمسی سال میں ایک قمری مہینہ کے اضافہ کے ذریعہ سے خود تطابق پیدا ہو جایا کرے، اور مزید انتظار کیے بغیر جیسے ہی ایک مہینہ کا فرق ہو اس کا اضافہ کر لیا جائے) ان فرقوں کے باعث اگر کسی زمانے میں عربی اور یہودی سالوں کا آغاز ایک ہی زمانے سے ہوا بھی تھا تو یہ ضروری نہیں رہتا کہ وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں، اور اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ مشرکین مکہ کا محرم اور یہودیوں کا تشری الگ الگ زمانے میں آئیں، ہم ابھی اوپر دیکھ چکے ہیں کہ ایک حساب (جو ہماری رائے میں غلط ہی ہے) ربیع الاول سنہ ھ میں تشری ہی کا مہینہ چل رہا تھا، اگر محمود فلکی کی اس توجیہ کو قبول کر لیا جائے جو ہماری رائے میں درست نہیں کہ رسول اکرم کا مدینہ میں ورود مسعود ۸ ربیع الاول ہی کو ہوا، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ تشری کی آٹھویں کو وہاں پہنچے تھے، لہٰذا یوم کپور کو ابھی دو دن باقی تھے،

[1] اصل میں تیس سال کا دور تھا اور اس میں گیارہ مرتبہ نسی ہوتی تھی، لیکن سال کے بارہ مہینوں کی کامل گردش کے لیے مصنف نے (۳۳) سال کا ذکر کیا ہے، تینتیسویں سال کی نسی نئے دور کا آغاز کرتی، اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ہر دور میں نسی کرنے کے سالوں کی ترتیب مقرر ہے، جیسا کہ آگے تفصیل ہے۔

حافظ بن ناصر الدین کی روایت پھر بھی غلط ہی رہے گی کہ رسول اکرمؐ کی آمد بھی عاشورا کے دن ہوئی، ساری مذکورہ دشواریوں کے غیر اہم ہونے کی اساس پر نظر انداز کرکے اگر یہ قرار بھی دے لیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے وقت مکہ والوں کا ربیع الاول چل رہا تھا اور یہودیوں کا ماہ تشری، تو اس کی توجیہ دشوار نہ ہوگی، آپ ماہ محرم میں مکہ معظمہ میں عاشورا مناکر مدینہ آئے تو دیکھا کہ حقیقی عاشورا ابھی شروع نہیں ہوا ہے تو اس اسلامی اصول کی بنا پر (جو بخاری و ترمذی وغیرہ میں صراحت کے ساتھ مروی ہے کہ براہ راست وحی نہ آتی تو رسول اکرمؐ اہل کتاب کے عمل کے مطابق عمل فرماتے)، یہ حکم دیا کہ عاشورے کا روزہ ۱۰ ربیع الاول سلہ کو یہودیوں کے یوم کپور کے موقع پر رکھا جائے، غرض یہ امکان تو ہے لیکن ہماری ناچیز رائے میں وہ قابل رد ہے، صحیح تربات یہی ہوگی کہ مدینہ آنے کے کچھ عرصہ (چند ماہ) بعد جب یوم کپور آیا تو رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی، اس کے بعد جلدی ہی رمضان سنہ میں رمضان کے روزے فرض ہو گئے اور عاشورا کا روزہ نوافل میں شامل ہو کر رہ گیا۔

خلاصہ | اس ساری نظر خراشی کا منشا ایسی مثالیں دینا ہے کہ کس طرح ہمارے علم ہیئت میں بھی ہماری میراث ماضی کی ہر وقت نظر ثانی اور جانچ پڑتال ہمیں کو کرتے رہنے کی ضرورت ہے، بے سوچے سمجھے دہراتے رہنا طوطا مینا کا تو کام ہو سکتا ہے مسلمان اہل علم کا نہیں۔

اگر اس مقالے کے ناظرین میں کوئی ہیئت داں ماہر فن بھی ہوں تو ان سے التماس ہو کہ میری غلطیوں پر متنبہ فرمائیں، علم کی خدمت بھی ہوگی اور میری شکر گذاری کا باعث بھی ہوگا۔

امام العصر علامہ سید محمد انور شاہ کشمیریؒ

از جناب مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

علامہ سید انور شاہ کے سوانح اور ان کے علمی کارناموں پر سب سے پہلے وقت کے نامور وسیع النظر عالم مولانا سید محمد یوسف بنوری زید مجدہم نے قلم اٹھایا اور عربی زبان میں علامہ موصوف کی سوانح عمری "نفحۃ العنبر فی ھدی الشیخ الانور" کے نام سے لکھی جسے مجلس علمی ڈابھیل (سورت) نے ۱۳۵۳ھ میں شائع کیا تھا، اب یہ کمیاب ہے، اس میں موصوف نے علامہ سید انور شاہ کی زندگی کے بہت سے گوشوں سے بحث کی ہے۔

دوسری کتاب جس کا نام حیات انور ہے، ۱۹۵۵ء میں دیوبند سے شائع ہوئی تھی، یہ اردو زبان میں علامۂ موصوف کے متعدد نامور تلامذہ کے گرانقدر مضامین کا مجموعہ ہے، جو اپنی افادیت، جامعیت اور تنوع کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، باایں ہمہ سید انور شاہؒ کی جامع حیثیات شخصیت پر ابھی بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے، اور اسی مقصد کے پیش نظر یہ مقالہ لکھا گیا تھا، جس کی اشاعت کی نوبت اب آرہی ہے۔

ہم نے اس مختصر مقالہ میں علامہ سید انور شاہ کے سوانح کے حصہ سے زیادہ تعرض نہیں کیا، یہ کام ان کے سعادت مند فرزندوں کے کرنے کا ہے، اور انھیں پہلی فرصت میں موصوف کی ایک جامع سوانح حیات مرتب کرنا چاہیے، اسی طرح ہم نے ان امور سے بھی زیادہ بحث نہیں کی ہے جن سے ان کے تلامذہ نے اعتنا کیا ہے، اس مختصر مقالہ میں ہم نے علامہ سید

انور شاہ کشمیری کی علمی زندگی کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن پر اس سے پہلے اس نوع پر بحث نہیں ہوسکی،

محمد انور نام اور انور شاہ عرف ہے، سلسلۂ نسب یہ ہے :۔

محمد انور بن محمد معظم بن عبد الکبیر بن عبد الخالق بن محمد عارف بن حیدر بن علی بن عبد اللہ ابن مسعود النروری الکشمیری الحنفی[1]

ولادت اور تعلیم و تربیت | موصوف بوقت سحر بروز شنبہ، ۲۷ شوال ۱۲۹۲ھ میں کشمیر جنت نظیر کی ایک چھوٹی سی بستی دودھوان (علاقہ لولاب) میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم و تربیت انکے والد ماجد محمد معظم شاہ نے کی، پانچ برس کی عمر میں موصوف کو قرآن مجید پڑھایا، پھر فارسی شروع کرائی، ۱۲۹۹ھ میں مولوی غلام محمد رسولی پورہ سے فارسی کے ساتھ عربی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھ لیں اور ضلع ہزارہ کے بعض علمائے تین برس تک درس نظامی کی کچھ درمیانی کتابیں پڑھیں۔

۱۳۱۰ھ میں مرکز علم دیوبند پہنچے، یہاں اساتذۂ وقت مولانا غلام رسول، حکیم محمد حسن وغیرہ سے درسی کتابیں جیسے حسامی، ہدایہ، تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، قاضی مبارک، حمد اللہ، تصریح، شرح چغمینی، نفیسی وغیرہ پڑھ کر ۱۳۱۱ھ میں مسند میں وقت مولانا عبد العلی[2]، مولانا خلیل احمد صاحب

---

[1] ملاحظہ ہو نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین، شائع کردہ مجلس علمی ڈابھیل سورت ۱۳۵۰ھ ص ۱۴۷

[2] مولانا عبد العلی بن نصیب علی شیخ پوری میرٹھی۔ موصوف، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور شیخ محسن سہارنپوری کے تلمیذ، جید عالم اور دار العلوم دیوبند کے صف اول کے مدرسین میں سے تھے، مولانا عبد العلی نہایت سادہ، متواضع منکسر، حماس نواز اور خوش حال بزرگ تھے، جن ارباب کمال کو ان سے تلمذ کا شرف حاصل ہے ان میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ سید انور شاہ کشمیری اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہم اللہ کا نام سرفہرست ہے (باقی حاشیہ ص ۱۶۴ پر)

محدث سہارنپوری اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے سند فراغ حاصل کی اور ۱۳۱۰ھ میں

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۳) افسوس ہے ان بزرگوں کی سوانحعمریوں میں مولانا کا نام بار بار آیا ہے، مگر کسی نے ان کے حالات سے تعرض نہیں کیا، ہمیں موصوف کے متعلق جو معلومات مل سکی ہیں وہ ہدیۂ ناظرین ہیں

مولانا عبد العلی کا آبائی وطن شیخ پور تھا، یہ میرٹھ سے چھ میل کی مسافت پر ایک چھوٹی سی بستی ہے جو ان ہی بزرگوں نے بسائی تھی۔

شیخ نصیب علی کے حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی سے بڑے گہرے تعلقات تھے، حضرت نانوتوی جس زمانہ (سنہ ۱۲۹۰ھ) میں مطبع ہاشمی میرٹھ میں کتابوں کی تصحیح کرتے تھے، جمعہ کا دن موصوف کا شیخ نصیب علی کے یہاں شیخ پور ہی میں گذرتا تھا، شیخ نصیب علی جمعرات کو شام میں بہلی میں بٹھا کر موصوف کو شیخ پور لاتے اور شب و روز حجۃ الاسلام کے فیوضات ظاہری و باطنی سے کسب فیض کرتے رہتے تھے، ان ہی ایام میں میرٹھ میں مولانا عبد العلی نے موصوف سے علوم و فنون کی تحصیل و تکمیل کی تھی، ان ہی نے حجۃ الاسلام سے یہ عرض کیا تھا کہ ان کی تقریر سے فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ کتاب پانی ہو جاتی ہے لیکن اثنائے درس میں جب موصوف اپنی تحقیقات عالیہ پیش کرتے ہیں تو ہم ان کے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں، لہٰذا تقریر کا دائرہ نفس کتاب تک محدود رہنا چاہیے، ورنہ اسباق میں ہماری حاضری سود مند نہیں، حجۃ الاسلام نے ان کی حق گوئی کو پسند کیا اور ان کی وجہ سے درس میں نفس کتاب کے درس پر اکتفا کیا، مولانا مناظر احسن گیلانی فرماتے ہیں: "مشہور ہے اور اپنے متعدد دیوبندی اساتذہ سے یہ روایت میں نے سنی ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ جس خداداد ذکاوت کے مالک تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ عام مصنفین خصوصاً منطق و فلسفہ کی کوئی کتاب اگر آپ کسی کو پڑھانا شروع کرتے تو وہ بیچارہ بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا، کہتے ہیں کہ مولوی عبد العلی رحمۃ اللہ علیہ (صدر و شیخ الحدیث مدرسہ عبد الرب دہلی بخشش) دہلی اثر جا شروع جب مولانا کے پاس پڑھنے کے لیے حاضر ہوئے تو شاید صدرا یا شمس بازغہ فلسفہ کی کوئی کتاب شروع ہوئی، مولوی عبد العلی نے سبق (باقی حاشیہ ص ۱۸۵ پر)

امام سنت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی روایت حدیث کی اجازت لی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۴) کی عبارت ختم کی اور مولانا جھنجھلاتے ہوئے فرماتے کہ بس بس ختم کرو، میاں اس مسئلہ میں قاسم کی سن لو، پھر ان کی سمجھنا، مولوی عبد العلی صاحب نے یہ انداز جو درس کا دیکھا تین چار دن بعد دبے پاؤں گھر روانہ ہوگئے، مولانا کو ان کے چلے جانے کا افسوس ہوا، شاید ان کے گھر پہنچے اور بھاگنے کی وجہ دریافت کی، مولوی صاحب نے کہا کہ حضرت میں تو آپ سے کتاب پڑھنے گیا تھا، لیکن آپ تو بجائے کتاب کے قاسم کی سناتے ہیں، مولانا نے معاہدہ فرمایا کہ آیندہ ایسا نہ ہوگا کتاب ہی پڑھاؤں گا، تب پھر واپس ہوئے۔ (ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، محبوب المطابع وجمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۳۶۳ھ ج ۱ ص ۲۲۲)

دار العلوم دیوبند میں ان کے درس کا آغاز غالباً ۱۲۹۵ھ سے ہوا اور یہ سلسلہ ۱۳۰۱ھ تک قائم رہا ۱۳۰۱ھ سے موصوف مدرسہ حسین بخش دہلی سے وابستہ ہوگئے، اور تادم مرگ اسی مدرسہ میں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم کرتے رہے، حکیم الامت نے ایک موقع پر موصوف سے اپنے تلمذ اور ان کے اخلاق و عادات کا تذکرہ حسن العزیز (جلد دوم حصہ سوم مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون بھارت ۱۳۸۹ھ ص ۲۹۰، ۹۹) میں اس طرح کیا ہے۔

میں نے مولانا سے مقامات حریری، سبعہ معلقہ اور کچھ نسائی پڑھی ہے، مگر برتاؤ سے مولانا کے پتہ نہیں چل سکتا کہ استاد ہیں، چنانچہ جب میں دہلی سے چلتا ہوں تو کچھ نہ کچھ ہدیہ ضرور ساتھ کر دیتے ہیں، بے لوث اور بے تعلق ہیں کسی سے کچھ مطلب نہیں، خود بھی مدرسہ میں چندہ دیتے ہیں، مقدار چندہ کی سب سے زیادہ ہوتی ہے، ۵۰۰ روپیہ یا زیادہ تک، مولانا سے جو کوئی ملنے جاتا ہے، بہت خاطر کرتے ہیں، چائے، شربت پلاتے ہیں، دیوبند میں جب تشریف رکھتے تھے تو طلبہ کی خوب تادیب فرماتے تھے،

ایک مرتبہ ایک طالب علم نے سبق پڑھتے میں لیٹ کر پاؤں پیچھے کو پھیلائے، بس مولانا چلائے بدتمیز، بے ادب! (باقی ص ۱۸۶ پر)

درس و تدریس کا مشغلہ | تحصیل علوم کے بعد موصوف نے درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کیا، چنانچہ ۱۳۱۵ھ میں جب مدرسہ امینیہ[1] کی دہلی میں بنیاد رکھی گئی تو صدر مدرس کے معزز عہدے پر موصوف ہی کا انتخاب عمل میں آیا، یہاں علامۂ موصوف نے کم و بیش ساڑھے چار سال تک علوم مروجہ کا درس دیا، اور ۱۳۲۰ھ میں جب ان کے بڑے بھائی کا وطن میں اچانک انتقال ہو گیا تو ان کے پدر بزرگوار مولانا محمد معظم شاہ نے خانقاہ میں جانشینی اور بعض خاندانی امور کی انجام دہی کے لیے وطن طلب کیا، اس حادثۂ جانکاہ کی وجہ سے موصوف کو وطن جانا پڑا اور پھر والدین نے کشمیر سے باہر رہنے کی اجازت نہ دی اور یوں چار و ناچار کچھ زمانہ وطن ہی میں گزرا۔

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۵) صرف اصلاح کی وجہ سے تنبیہ فرمائی، یہ نہیں کہ اپنا ادب کرایا۔ پھر فرمایا مولوی صاحب کے پاس بیٹھنے سے ایک خاص کیفیت معلوم ہوتی ہے، ہر شخص کے یہاں بیٹھنے سے جدا فرق معلوم ہوتا ہے کہ اسے تعبیر نہیں کر سکتے ؎

خوبی ہمہ کرشمہ و ناز و خرام نیست بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

مولانا عبد العلی کا انتقال دہلی میں ۱۳۴۴ھ کے بعد ہوا، اور مہندیوں کے قبرستان میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کے پائیں میں سپرد خاک کیے گئے،

مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی لکھنوی نے ۱۳۱۳ھ میں دہلی اور اس کے اطراف کا سفر کیا تھا، اس موقع پر وہ موصوف سے بھی ملے تھے، انھوں نے اپنی ملاقات کا حال اپنے "روزنامچہ" دہلی اور اس کے اطراف" (شائع کردہ کتب خانہ انجمن ترقی اردو، دہلی ۱۹۵۴ء ص ۷۵ تا ۱۰۰) میں تفصیل سے کیا ہے۔

(حاشیہ ص ہذا) [1] مدرسہ امینیہ کے لیے ملاحظہ ہو:۔ (۱) واقعات دہلی از بشیر الدین احمد دہلوی، شمسی مشین پریس آگرہ ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۴۰۰۔ (۲) مختصر تاریخ مدرسہ حنفیہ اسلامیہ شہر دہلی۔ شائع کردہ ادارۂ حنفیہ مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی ۱۳۷۴ھ

سفر حجاز اور واپسی کے بعد مدرسہ فیض عام کا قیام

۱۳۲۳ھ میں کشمیر سے حجاز گئے، فریضۂ حج ادا کیا، مصر و شام گئے نامور محدثین سے روایت حدیث کی اجازت لی، حجاز کے کتب خانوں سے استفادہ کیا،

سفر حج سے واپس آکر ۱۳۲۴ھ تک والدین کے پاس وطن میں رہے، پھر وطن سے باہر رہنے پر کسی نہ کسی طرح والدین کو راضی کر لیا اور ۱۳۲۴ھ میں خواجگان قصبۂ بارہ مولا میں ایک مدرسہ فیض عام کے نام سے قائم کیا۔ اور سال بھر یہاں درس دیا، مگر بعض لوگوں کی بدمعاملگی نے جلد ہی یہاں سے دل برداشتہ کر دیا جس کا اظہار موصوف نے اپنے ایک دیرینہ رفیق اور خواجہ تاش مولانا امین الدین بانی مدرسہ امینیہ المتوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء کے ایک مکتوب مورخہ ۲ جمادی الاولیٰ میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

"میں کوئی ایک مہینہ گزرا جاتا ہے کہ مکان سے بعزم ہندوستان رخصت لیکر آگیا ہوں ہر چند کہ والدین تو راضی نہ تھے، مگر میرے الحاح پر اجازت دیدی، یہاں بارہ مولہ پہنچکر کچھ توقف سا ہو گیا، حقیر کو یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں آکر خلق کی بدمعاملگی کا زیادہ احساس ہوتا رہا، اتنا احساس مجھے ہندوستان میں نہیں ہوا، پھر اگر مجھے خلق کی طرف احتیاج مخالطت ہوتی تو لا محالہ یہ احساس کم ہوتا، مگر تجرد کے باعث یہ احساس کم نہیں۔ (ملتقطاً ومختصراً)[1]

علامۂ موصوف یہاں سے خاطر برداشتہ ہوکر ربیع الاول ۱۳۲۸ھ میں اپنے استاد شیخ زمن مولانا محمود الحسن دیوبندی کی خدمت میں پہنچے۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ شیخ الہند نے اسی ماہ ربیع الثانی ۱۳۲۸ھ/۱۹۱۰ء میں دیوبند میں ایک تاریخی جلسہ کیا جس میں فضلائے دارالعلوم کی دستار بندی کی گئی اور علامۂ موصوف کو بھی

۱؎ ملاحظہ ہو مختصر تاریخ مدرسہ امینیہ اسلامیہ شہر دہلی، ص ۲۲۔

یہ سعادت حاصل ہوئی۔

دارالعلوم دیوبند میں تدریس کا آغاز — انہی ایام میں شیخ الہندؒ نے غالباً اس خیال سے کہ مدرسہ امینیہ عام میں طلبہ زیادہ نہیں اور نہ ان کی دلجمعی کا خاطر خواہ کوئی سامان ہے، ان کو مرکز علم دارالعلوم دیوبند میں (جہاں تشنگانِ علوم کا تانتا بندھا ہوا تھا، ہندوستان کے کسی صوبہ یا شہر سے طلب علم کے لیے کوئی نکلتا تھا، وہ ادھر ہی کا رخ کرتا تھا، اور اتنا کچھ پاتا تھا کہ پھر دوسری طرف اس کا خیال تک نہ جاتا تھا) درس و تدریس کے فرائض انجام دینے پر مامور کردیا، انکو استاذ الکل کے حکم کے آگے یارائے سخن نہ تھا، سرتسلیم خم کردیا، اس طرح دارالعلوم دیوبند میں سید انورشاہ کے درس کا آغاز ہوا، اور یہاں موصوف نے فن حدیث میں صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ابن ماجہ جیسی امہات الکتب کا درس دیا، اور عرصہ دراز تک کبھی اس خدمت کا معاوضہ نہیں لیا۔

ازدواجی زندگی کا آغاز — علامہ موصوف اپنے غیر معمولی علمی شغف کی وجہ سے تجرد کی زندگی کو زیادہ پسند کرتے تھے، شیخ الہند نے سنت رسول کی ترغیب دی اور دارالعلوم کے ارباب حل وعقد نے گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں شادی کرادی، جب اولاد ذرا بڑی ہوگئی اور اخراجات کا سلسلہ بڑھا تو ارباب حل وعقد نے معاوضہ قبول کرنے پر بہت زور دیا، ان کے اصرار پر موصوف نے نہایت قلیل بقدر کفاف مشاہرہ قبول فرمایا۔

شیخ الہند نے جب ۱۳۳۶ھ میں سفر حج کا ارادہ کیا تو اپنی جانشینی کے لیے اپنے نازش تلامذ میں سے جس جوہر قابل کا انتخاب کیا وہ سید انورشاہ ہی کی ذات ستودہ صفات تھی، جب علامۂ موصوف نے بحیثیت صدر مدرس جامع ترمذی اور صحیح بخاری کا درس دیا اور یہ سلسلہ ۱۳۴۵ھ تک جاری رہا، پھر بعض انتظامی امور میں اختلاف کی وجہ سے موصوف نے دارالعلوم

سے ترک تعلق کرلیا۔

دارالعلوم دیوبند میں شیخ الہند کے درس کا سلسلہ اگرچہ اس کے بام ترقی کا نیا پایہ تھا، لیکن علمی اعتبار سے سید انور شاہ کا زمانہ آخر المنازل تھا، اگر یہ اتفاقی واقعہ نہ پیش آجاتا تو دارالعلوم کو علامہ موصوف سے استفادہ کا کچھ اور موقع مل جاتا،

علامہ موصوف ذی الحجہ ۱۳۴۶ھ میں دیوبند سے ڈابھیل (سورت) تشریف لے گئے اور جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں حدیث کا درس دینا شروع کیا، ۱۳۵۱ھ تک یہاں قال اللہ اور قال الرسول کی مجلس گرم رہی، پھر طویل علالت کے بعد دیوبند میں ۲ صفر ۱۳۵۲ھ کو آخر شب میں جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

حافظہ حق تعالیٰ شانہ نے موصوف کو عجیب وغریب صفات کا حامل بنایا تھا۔ حافظہ بلا کا ملا تھا، جو بات کبھی کان میں پڑ گئی وہ قید حافظہ سے پھر کبھی نہیں نکلی، اس کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں :-

"میں نے اپنے وطن کشمیر میں سنا تھا اور اس وقت میں چار برس کا تھا کہ دو آدمی اس مسئلہ میں گفتگو کر رہے تھے کہ عذاب بدن کو ہوتا ہے یا روح کو، آخر ان کی رائے یہ قرار پائی کہ عذاب دونوں کو ہوتا ہے۔ انھوں نے اس کی ایک مثال بھی دی، ایک نے کہا جسم اور روح کا ساتھ ایسا ہے جیسے ایک مرتبہ اندھے اور لولے کا ہوا تھا کہ وہ ایک باغ میں پھل توڑنے کے لیے گئے۔ اندھا پھلوں کے دیکھنے سے عاجز اور لولا ان کے توڑنے سے معذور، آخر ان دونوں نے باہم مشورہ کیا اور لولا اندھے کے کاندھے پر چڑھ بیٹھا، اندھا اس کو لیکر درختوں کی طرف چلا۔ لولا پھلوں کو دیکھتا اور ان کو توڑ لیتا۔

بس یہی حالت بدن کی روح کے ساتھ ہے، بدن بغیر روح کے جامد محض ہے جس کو حرکت نہیں اور روح بغیر بدن کے کچھ کرنے سے عاجز ہے، لہٰذا یہ ایک دوسرے کے محتاج ہیں، جب یہ دونوں کسب میں شریک ہیں، تو اجر و ثواب میں بھی دونوں شریک ہوں گے اور سزا و عذاب میں بھی ایک دوسرے کے شریک رہیں گے، پینتیس برس کے بعد میں نے یہ واقعہ علامہ قرطبی کے یہاں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی دیکھا اور بالکل ویسا ہی جیسا کہ ان دونوں نے کہا تھا، دیکھو کیا اس قسم کی باتیں ارسطو سے بھی ممکن ہیں[۱]"

شاہ صاحب کو فطرت کی طرف سے ایسا زبردست حافظہ عطا کیا گیا لیکن نیرنگی قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ موصوف کو قرآن مجید یاد نہ تھا، مولانا مناظر احسن گیلانی کا بیان ہے:-

"ان (شاہ صاحب) کا حافظہ غیر معمولی طور پر قوی تھا، اتنا قوی کہ لاکھوں میں شاید کسی ایک کا ہو، کم از کم اب تک اس قسم کے قوی حافظہ کے آدمی سے میری ملاقات نہیں ہوئی ہزاروں ہزار اشعار عربی فارسی کے زبانی یاد تھے جس کتاب پر ایک نظر پڑ گئی گویا ان کے حافظہ کے الماری میں بند ہو جاتی تھی جب جی چاہتا اندر ہی اندر کھول کر پڑھ لیتے لیکن اسی کے ساتھ قرآن کی کسی آیت کی ضرورت، اس قسم کے مواقع میں جیسا کہ مخدوم نے فرمایا، درس میں پیش آتی تو طلبہ کی طرف رخ کرکے دریافت فرماتے پوری آیت کیا ہے،

فقیر نے ایک دن عرض بھی کیا کہ آپ کا حافظہ تو قرآن کو شاید چند دنوں میں یاد کر سکتا تھا، پھر یہ کیا بات ہے!

جواب میں فرمایا کہ قسمت یا بخت! واللہ اعلم کیا بات تھی[۲]"

---

[۱] ملفوظات [illegible] ص ۱۱۰ [illegible]
[۲] [illegible] ص ۱۶۲

وسعت معلومات وکثرت مطالعہ | تحصیل علوم سے فراغت کے بعد آغاز عمر ہی میں سید انور شاہؒ کا دائرہ معلومات اس قدر وسعت اختیار کر چکا تھا کہ اس عہد کے نامور علما جن کی وسعت معلومات اور کثرت مطالعہ پر ان کی تالیفات شاہد عدل ہیں، اپنی تحقیقات علامہ موصوفؒ کے حضور پیش کرتے اور موصوف ان پر بیش بہا علمی فوائد کا اضافہ فرماتے، چنانچہ اس عہد کے نامور محدث شوق نیموی نے ۱۳۱۳ھ میں جب آثار السنن کی کتاب الصلوٰۃ مکمل کرلی تو اس زمانہ کے جن ارباب نظر اور اکابر اہل علم کو یہ کتاب بھیجی گئی، ان میں ایک صغیر السن محدث علامہ سید انور شاہؒ بھی تھے، لیکن ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں اس پر بیش بہا اضافہ کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ صرف علامہ انور شاہ کی ذات ستودہ صفات تھی،

یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید انور شاہ کی تحقیقات اور اضافہ معلومات کا دائرہ محدث نیموی کے مذاق تک محدود رہا ہے، موصوف نے متون احادیث اسناد، رجال اور جرح وتعدیل سے متعلق وہی تحقیقات پیش کی ہیں جو محدث نیموی کے مذاق کے مطابق تھیں، فقہ حدیث کی بحثیں، حقائق، معارف، اسرار بلاغت اور توجیہات حدیث سے بہت ہی کم اعتنا کیا، پھر بھی یہ اضافہ اصل سے دوگنا تگنا ہو گیا ہے[۱]، اور اسی افادۂ علمی کی وجہ سے موصوف نے نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۵۶) میں یہ لکھا ہے "کنت مرافقاً فیہ" میں آثار السنن کی ترتیب وتدوین میں ان کا رفیق کار تھا، چنانچہ محدث نیموی کے فرزند کا بیان ہے:-

---

[۱] علامہ موصوف کے اس بیش بہا اضافہ کا نام "الاتحاف للاحناف" ہے، مجلس علمی جس کا قیام ہی علامہ سید انور شاہؒ کے علوم کی نشر واشاعت ہے، اس نے شاہ صاحبؒ کے اس نادرۂ روزگار شاہکار کے اصل نسخہ کا

(باقی ص ۱۹۲ پر)

" تو قابل کتاب ہے ناظرین یا تمکین معلوم فرمائیں کہ مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ تعالیٰ تیرہ سو بارہ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں، جیساکہ ان ہی کی شرح فیض الباری علی صحیح البخاری میں لکھا ہوا ہے، اور علامہ نیموی نے آثار السنن تیرہ سو چھ ہجری سے کچھ قبل ہی لکھنا شروع کیا اور تیرہ سو تیرہ ہجری میں آخر ابواب الصلوٰۃ تک تمام کر دیا، علامہ نیموی کا اوشحۃ الجید، حبل المتین رد السکین، تبیان تحقیق المعلی وغیرہ تالیف کرنا اور ان کا معجم طبرانی وغیرہ کا نشان و پتہ بتانا کہ فلاں فلاں کتب خانہ میں ہے، اور معرفۃ السنن بیہقی میرے کتب خانہ میں ہے، یہ سب مولانا انور شاہ کشمیری کے طالبعلمی کے زمانہ میں تھا، جبکہ وہ فارغ التحصیل بھی نہیں ہوئے تھے۔ لہذا مولانا انور شاہ صاحب نیل الفرقدین میں یہ لکھا ہے کہ انی کنت مواقفا فیہ اس سے مراد عہد تمام آثار السنن قبل الطباعت ہے، مولانا شوق نیموی اپنی تحقیقات عجیبہ و فوائد غریبہ نادرہ جدیدہ دکھانے اور معلوم کرانے کے لیے تسویدات آثار السنن قبل طباعت بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے، جس طرح کہ اور بعض علماء کے پاس آثار السنن کو بھیجا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری کو مولانا نیموی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کے شاگرد حکیم مولوی محمد عیسیٰ مرحوم ساکن موضع جانا ضلع پٹنہ نے بندہ سے بیان کیا تھا کہ مولانا انور شاہ مدرسہ امینیہ دہلی میں تھے کہ ہم مولانا شوق نیموی سے جو خاص جواہر کے ہیں، ملاقات کریں گے مگر چونکہ حضرت الاستاذ چند روز جیو ... شریک مولانا نیموی کا وصال ہو گیا، اس وجہ سے ملاقات نہ ہو سکی۔

خلاصہ یہ کہ آثار السنن جس کا آخر کتاب الصلوٰۃ ہے تیرہ سو تیرہ ہجری میں تمام ہو گیا

(بقیہ حاشیہ ص (۱۹۱) کا محمد ودود ... [illegible] ... علامہ ... [illegible]
... ماہنامہ ... معلوم نے اس کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے، اللہ تعالیٰ ... [illegible]

اور مولانا انور شاہ سنہ تیرہ سو بارہ ہجری میں کتب درسیہ مروجہ سے فارغ ہوئے، سنہ تیرہ سو بارہ ہجری کے بعد شوق نیموی ان کو بھی اپنی تحقیقات کہ جن سے کتب محدثین خالی ہیں دکھلانے کیلئے اجزاء آثار السنن بذریعہ ڈاک بھیجتے ہوں گے اور علامہ کشمیری کچھ حاشیے و مشورہ دیتے ہونگے واللہ اعلم۔ اس اعتبار سے ہی نوع مرافقت کہی جا سکتی ہے، جو کہ بعد اصل تالیف و اتمام ہے، نہ کہ وقت تالیف کیونکہ اس وقت تو مولانا انور شاہ محض طالب العلم[۱] تھے، رہا فہم ہے[۲]"

تبحر علمی | ضبط و اتقان، ذکاوت و ذہانت، فہم و فراست، دقت نظر، جدت فکر، وسعت مطالعہ کثرت معلومات، استحضار علوم اور تبحر میں اپنی نظیر آپ ہی تھے، صرف و نحو، معانی و بیان، شعر و ادب، منطق و فلسفہ، لغت، فقہ، اصول فقہ، کلام، تصوف، تاریخ، رجال، طبقات، تفسیر، حدیث اور اصول حدیث، غرض ہر فن میں مجتہدانہ بصیرت رکھتے تھے، اور عربی و فارسی نظم و نثر پر یکساں قادر تھے، ایسی جامعیت اور ہر فن میں ناقدانہ مہارت کی وجہ سے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی موصوف کو علوم میں ان کے اساتذہ سے بھی فائق سمجھتے تھے، وہ فرماتے تھے:-

"مولانا انور شاہ صاحب بہت بڑے متبحر عالم تھے، یہاں تک کہ ہے تو گستاخی لیکن سچی بات کو کیوں چھپاؤں، میرا یہ خیال ہے کہ وہ اپنے اکثر اساتذہ سے بھی علوم میں بڑھ گئے تھے"[۳]

حفظ حدیث | علامہ سید انور شاہ بلاشبہ حفاظ حدیث میں سے تھے، حفظ حدیث کی حقیقت سمجھنے

---

[۱] شاہ صاحب کو اپنے زمانہ طالب علمی ہی میں ہندوستان کے ایک نامور وسیع النظر محدث کے اہم علمی کاموں پر اضافہ کی سعادت اگر حاصل ہو گئی تھی تو یہ شاہ صاحب کی وسعت نظر کی اور بھی زیادہ قوی دلیل ہے۔

[۲] ملاحظہ ہو القول الحسن فی الرد علی ابکار المنن مع تائید آثار السنن از ابن نیموی اصح المطابع آرہ پٹنہ سنہ ۱۳۳۴ھ ص ۱۹ [۳] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) اشرف المطابع تھانہ بھون سنہ ۱۹۴۱ء ج ۱، ص ۱۱۱

کے لیے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محدثین کی اصطلاح میں حفظ حدیث سے مراد استحضار اور تذکر نہیں ہے یعنی احادیث کا نوک زبان پر ہونا بلکہ معرفت یعنی ملکۂ فن مراد ہے اور حقیقت میں یہی معیار حفظ ہے، اور متاخرین ائمۂ فن کے یہاں اسی کا اعتبار ہے، اسی معیار پر متاخرین حفاظ میں سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے اپنے اکابر شیوخ کو جانچا اور پرکھا ہے، موصوف انباء الغمر فی انباء العمر میں حافظ زین الدین عبدالرحیم عراقی المتوفی سنہ ۸۰۶ھ اور ان کے تلمیذ رشید حافظ نور الدین علی ہیثمی المتوفی سنہ ۸۰۷ھ میں موازنہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

لم نر فی هذا الفن أمتن منه وعليه [1] تخرج غالب أهل عصره ومن أخصهم صهره شيخنا نور الدين الهيثمي وهو الذي دربه وعلمه كيفية التخريج والتصنيف وهو الذي يعمل له خطب كتبه وينسبها له وصار الهيثمي لشدة ممارسته أكثر استحضارا للمتون من شيخه حتى يظن من لا خبرة له أنه أحفظ منه وليس كذلك لأن الحفظ المعرفة[1]

[illegible]

ہم نے فن حدیث میں حافظ عراقی سے زیادہ متقن و پختہ نہیں دیکھا، اس زمانہ کے اکثر اہل علم نے ان ہی سے کسب کمال کیا ہے، اور ان کے تلامذہ میں سب سے ممتاز ان کے داماد ہمارے شیخ نور الدین ہیثمی ہیں، شیخ عراقی نے انہیں پڑھایا، تصنیف اور تخریج احادیث کا ڈھنگ بتایا تھا، وہ ان کی کتابوں کے دیباچے لکھتے اور ان کی نسبت بھی حافظ ہیثمی کی طرف کرتے تھے۔ ہیثمی کو مزاولت اور کثرت مشق کی وجہ سے احادیث کے متون اپنے شیخ عراقی سے زیادہ یاد ہوگئے تھے یہاں تک کہ جو لوگ حقیقت حال

[1] ملاحظہ ہو انباء الغمر بانباء العمر [illegible] الکتانی المتوفی سنہ ۱۳۸۲ھ طبع فاس سنہ [illegible] ج ۲ ص ۱۹۱، ۱۹۲ و شذرات الذہب [illegible] مصر سنہ ۱۳۵۱ھ ج ۷ ص ۵۵ [illegible] دمشق ص ۲۲۳ [illegible] ص ۲۲۲

مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ حفظ حدیث کے لیے حافظ میں ملکۂ فن کا پایا جانا کافی ہے، استحضار و تذکر شرط نہیں ہے، چنانچہ شیخ ہیثمی صاحب مجمع الزوائد اور شیخ زین الدین عراقی صاحب الالفیہ کے بارے میں حافظ ابن حجر کا یہ کہنا کہ ہیثمی فی الفور حدیث کی تخریج کرتے اور بتا دیتے تھے، اس بنا پر پڑھے لکھے لوگ ان کو بڑا حافظ سمجھتے تھے۔ حالانکہ نور الدین ہیثمی نے شیخ عراقی ہی سے سب کچھ سیکھا تھا، اور شیخ عراقی کو فن کا ملکہ تھا، گو فی الفور حدیثوں کی تخریج سے قاصر تھے، یہ بات علامہ سید انور شاہ کو بھی حاصل تھی، اسی لیے ہم نے ان کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے، انکی متون احادیث پر نہایت غائر نظر تھی، وہ علل اسانید سے واقف تھے، مراتب رجال کا انھیں علم تھا، وہ صحیح و سقیم کو سمجھتے تھے، اور فن جرح و تعدیل اور وفیات کے ماہر تھے، راویوں کا تشابہ رفع کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے، اور ان فنون میں ان کو بڑا اتقان و رسوخ حاصل تھا، ان کے رسائل اور امالی آج بھی اس امر پر شاہد عدل ہیں،

فقہ و خلافیات کا حفظ علامہ سید انور شاہ حدیث ہی کے حافظ نہ تھے، بلکہ فقہ اور خلافیات کے بھی حافظ تھے، تذکرہ کی کتابوں میں بعض ارباب کمال فقہاء کے متعلق یہ فقرہ لکھا ہوا ملتا ہے کان حافظاً للفقہ والخلاف یا کان حافظاً للمذاھب، کہ وہ فقہ اور خلافیات کے حافظ تھے، مذاہب ائمہ ان کو یاد تھے، یہ بات علامہ سید انور شاہ کو بھی حاصل تھی، ان کو اصول و کلیات ہی نہیں جزئیات مسائل پر بھی عبور حاصل تھا، اور اختلافی مسائل میں ہر ایک امام کا مسلک بھی بر زبان تھا، ہر مسئلہ میں ائمہ اور مشائخ کے مختلف اقوال بھی از بر تھے، ائمہ اربعہ کے اختلافات کے منشا اور مبنیٰ پر بھی ان کی نظر پوری طرح تھی، فقہ پر ان کی نظر جیسی غائر تھی اور ائمہ کے اقوال جیسے کچھ انھیں مستحضر تھے، اس کا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جاسکتا ہے:-

لیس عندی فن اصعب من الفقہ میرے نزدیک فقہ سے مشکل تر کوئی فن نہیں

حتى افتى في الفنون كلها ذو رأى وخبرة
احكم بالرأي وانتخب من اقوالهم
ما اريد وافتح (اتفرج) الاسماء
من عندي لا احتاج الى تقليد
احد ولكني في الفقه مقلد بحت
ليس لي رأي سوى الرواية ولذا قد
يصعب على الافتاء فان الناس
لا يكون عندهم الا قول واحد
ويكون عندي فيه اقوال من
الامام او من المشائخ والتصحيح
قد يختلف، ولست من اصحاب
الترجيح وحينئذ افتي بما يتفق
بمذاهب الائمة وآثار السلف
والسنة[1]

کل فنون میں میری ایک رائے اور تجربہ ہے
کہ جس کی وجہ سے میں فیصلہ کرتا ہوں اور
ائمۂ فن کے اقوال میں سے جس کے قول کو
چاہتا ہوں انتخاب کرتا ہوں، میں اپنی
طرف سے ان کی رایوں پر تفریع کرتا ہوں
اور کسی کی تقلید کا محتاج نہیں ہوں لیکن
فقہ میں مقلد محض ہوں، بجز روایت کے
کوئی رائے نہیں رکھتا، اسی وجہ سے
مجھے فتویٰ دینے میں بڑی دشواری پیش آتی
ہے کیونکہ لوگوں کے سامنے ایک قول کے
سوا کچھ نہیں ہوتا اور میرے پیش نظر امام یا
مشائخ کے متعدد قول ہوتے ہیں پھر کبھی
تصحیح میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور میں
اصحاب ترجیح میں سے نہیں ہوں میں ایسے
وقت میں مذاہب ائمہ اور آثار سلف و سنت کے مطابق فتویٰ دیتا ہوں۔

طبقات فقہا پر نظر

طبقات فقہاء پر بھی ان کی نظر غیر معمولی وسیع تھی، اور اس فن میں بصیرت کا یہ حال تھا کہ کبار فقہاء کے متعلق ان کی اپنی خاص آرا تھیں کہ کون کس درجہ کا فقیہ ہے، اور نقل میں اس کی کیا حیثیت ہے، کون مجتہد النفس ہے اور کون نہیں، چنانچہ امام ابو جعفر احمد بن محمد طحاوی المتوفی ۳۲۱ھ کے متعلق فرماتے ہیں:-

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری ج ۴ ص ۱۹۸

"امام طحاوی مذہب امام اعظم ہی کے سب سے زیادہ عالم نہیں بلکہ دیگر مذاہب ائمہ کے بھی سب سے زیادہ واقف تھے، وہ امام شافعی کے بیک واسطہ شاگرد تھے اور امام مالک سے بدو واسطہ تلمذ رکھتے تھے، اور امام اعظم ابوحنیفہ سے ان کو بسہ واسطہ تلمذ کا فخر حاصل ہے، کتاب شرح معانی الآثار کے باب الحج میں موصوف نے تصریح کی ہے کہ امام احمد سے بھی ان کو بیک واسطہ اجازت حاصل ہے، طحاوی مجتہد و مجدد ہیں، جیسا کہ ابن الاثیر جزری نے لکھا ہے کہ وہ مجدد تھے،

میں کہتا ہوں کہ شرح حدیث ان کا خصوصی کارنامہ ہے، وہ شرح حدیث میں مجمل حدیث کو بتاتے ہیں، حدیث کے غوامض و دقائق بیان کرتے ہیں بحث و تحقیق کرتے ہیں اعتراضات کے جوابات دیتے ہیں اور وہ اس طرز خاص طریقہ کے امام ہیں کیونکہ متقدمین صرف احادیث کو بطور مسند و محض روایت کرنے پر اکتفا کرتے تھے[1] اور فیض الباری میں ہے کہ مالکیہ نے ان کی تصانیف سے حنفیہ کی نسبت زیادہ اعتنا کیا ہے۔"[2]

علامہ موصوف ملک العلماء ابوبکر بن مسعود کاسانی المتوفی ۵۸۷ھ کی کتاب البدائع والصنائع فی ترتیب الشرائع کی بہت تعریف کرتے تھے، اور اس کے متعلق فرماتے تھے:-

عراقی فقہاء حنفیہ کی تالیفات میں بخلاف اسلاف فقہاء حنفیہ کی تصانیف کی نسبت زیادہ عروج و اتقان پایا جاتا ہے لیکن کتاب البدائع باوجودیکہ اس کا مؤلف ملک العلماء ابوبکر کاسانی ماوراء النہری ہے مگر یہ کتاب اتقان و ترتیب میں فقہائے عراق کی مثل ہے مگر حسن ترتیب میں ہمارے فقہاء حنفیہ رحمہم اللہ کی تمام کتابوں سے فائق ہے، یہ نہایت نادر المثال کتاب ہے، اگر کوئی عالم مدت تک اسی اور دقت نظر سے اس کا مطالعہ کرے تو وہ

۱؎ العرف الشذی علی جامع الترمذی، مکتبہ رحیمیہ سہارنپور ص ۳۰ و معارف السنن از مولانا محمد یوسف بنوری ج ۱ ص ۱۸ [illegible] ص ۱۰۱ و ۱۵ ص ۲۰ ۲؎ ایضاً فیض الباری ج ۳ ص ۹۹

فقیہ النفس بنائے، یہ کتاب مدرس اور مولف کے لیے مفتی کی بنسبت زیادہ مفید ہے۔[1]"

مولف کے بارے میں ایسا بصیرت افروز تبصرہ فقہا میں سے کسی اور فقیہ سے منقول نہیں، اسی طرح علامہ موصوف کی فقیہ زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم حنفی المتوفی ۹۷۰ھ، محمد امین بن عمر عابدین دمشقی حنفی المتوفی ۱۲۵۲ھ، شاہ عبد العزیز محدث دہلوی المتوفی ۱۲۳۹ھ اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے متعلق جو رائے ہے وہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:-

ان ابن نجیم افقه عندی من الشامی	میرے نزدیک بلاشبہ ابن نجیم علامہ شامی
لما اری فیه ان امارات التفقه تلوح	سے زیادہ فقیہ ہیں، کیونکہ مجھے ان میں تفقہ
والشامی معاصر للشاه عبد العزیز	کے آثار بہت روشن نظر آتے ہیں، فقیہ شامی
رحمه الله تعالیٰ وهو افقه ایضاً	شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ تعالیٰ کے معاصر ہیں
عندی من الشامی رحمه الله تعالیٰ	اور میرے خیال میں شاہ صاحب شامی سے زیادہ
وکان الشیخ مشائخنا رشید احمد	فقیہ ہیں اور اسی طرح ہمارے شیخ الشیوخ
الگنگوهی قدس سره افقه عندی	رشید احمد گنگوہی قدس سرہ میرے نزدیک
من الشامی[2]	شامی سے بڑھکر فقیہ ہیں

بعض مشاہیر ائمہ فن کے متعلق رائے | اسی طرح دیگر ائمہ [illegible] علماء کے متعلق بھی ان کی خاص رائیں ہیں، چنانچہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی [illegible]، حافظ ابن تیمیہ المتوفی ۷۲۸ھ، شیخ تقی الدین بن دقیق العید المتوفی ۷۰۲ھ، حافظ ابن عبد البر المتوفی ۴۶۳ھ، جمال الدین زیلعی المتوفی ۷۶۲ھ اور حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کے متعلق علامہ موصوف فرماتے ہیں:

[1] ملاحظہ ہو نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور از مولانا محمد یوسف بنوری مجلس علمی ڈابھیل سورت ۱۳۵۵ھ ص ۸

[2] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعہ مجازیہ، قاہرہ ۱۳۵۷ھ ج ۱ ص ۱۲۰

"میرے نزدیک شیخ اکبر رحمہ اللہ تعالیٰ اس امت کی عظیم ترین شخصیتوں سے ہیں، وہ حقائق کی تہ تک پہنچے ہیں اور اہل فن میں وہ سب سے آگے ہیں اور اپنا نظیر نہیں رکھتے ہیں حافظ ابن تیمیہ بلاشبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک بحر بیکراں ہے، لیکن چند اصولی اور فروعی مسائل میں وہ جمہور امت سے منفرد ہیں، حالانکہ حق پر جمہور علماء ہیں، ابن تیمیہ کشف و کرامات کے بھی منکر ہیں، البتہ مصداق کشف کے قائل ہیں اور وہ اسکو فراست مومن سے تعبیر کرتے ہیں...... انکی طبیعت میں تیزی ہے جسے وہ اپنی تحقیق کو وحی آسمانی سمجھتے ہیں، اگرچہ وہ حقیقت کے خلاف کیوں نہ ہوں اور مخالف کی وہ پروا نہیں کرتے، اگرچہ وہ حق پر ہی کیوں نہ ہوں، یہ اہل علم کے وہ طبقات و مراتب ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، ان میں سے بعض میں بڑا اعتدال ہے اور وہ نہایت انصاف پسند ہیں جیسے شیخ تقی الدین ابن دقیق العید ابن عبد البر اور زیلعی، بعض میں اعتدال نہیں ہوتا، ان کی طبیعت میں شدت و حدت ہوتی ہے جیسے ابن تیمیہ ہیں، بعض میں شدت تعصب کے ساتھ بیدار مغزی بلا کی ہوتی ہے، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں[1]"

مصطلحات فن پر اضافے | علامہ سید انور شاہ نے مصطلحات فن پر بھی اضافے کئے ہیں، اصول فقہ جو ایک نہایت دقیق اور مشکل فن ہے اور ہمیشہ سے دقیقہ سنج اور دقیق النظر علماء کی بحث و نظر کی آماجگاہ بنا رہا ہے، اس اہم فن کی بعض مصطلحات پر علامہ موصوف کو اضافہ کا فخر حاصل ہے۔

ائمہ فن نے متواتر کی تعریف کی ہے، اور تواتر اسناد کو بیان کیا ہے لیکن نہ اس کے اقسام سے پورا اعتناء کیا اور نہ انھیں منضبط کیا اور نہ اس کے اقسام کو جدا گانہ ناموں سے

[1] ملاحظہ ہو فیض الباری علی صحیح البخاری، مطبعۃ حجازی، قاہرہ ج ۲ ص ۱۹۴

ممتاز و متعین کیا، تواتر کی بحث کلام اور اصول دونوں جگہ ہے، لیکن اصولیین اور متکلمین دونوں ہی اس باب میں خاموش ہیں، اسلامی دنیا میں علامہ سید انور شاہ نے پہلی مرتبہ تواتر کے اقسام سے اعتنا کیا اور اس کو اقسام اربعہ میں منحصر کیا، اس کی ہر قسم کو ایک خاص اور مستقل نام سے نامزد کیا، تواتر کے وہ اقسام اربعہ حسب ذیل ہیں :۔

(۱) تواتر الاسناد (۲) تواتر الطبقہ (۳) تواتر العمل والتوارث (۴) تواتر القدر المشترک۔

ان اقسام اربعہ کا تذکرہ علامہ موصوف نے اپنے رسالہ نیل الفرقدین فی مسئلۃ رفع الیدین (ص ۲۲) میں اور علامہ شبیر احمد عثمانی نے (مقدمہ) فتح الملہم بشرح صحیح مسلم (ص۶) میں ان کی خوب وضاحت کی ہے، اور اردو میں اس کی تشریح فیصلہ مقدمہ بھاولپور طبع لاہور ۱۹۳۵ء میں بھی مذکور ہے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس تقسیم کی داد ان الفاظ میں دی ہے :۔

وهذه الاقسام الاربعة للتواتر	یہ تواتر کی چار قسمیں ہیں، اگرچہ اس کی
وان كانت جزئياتها منتشرة	جزئیات اصولیین کی کتابوں میں منتشر
في كتبهم لكنهم لم يكونوا	طور پر پائی جاتی ہیں لیکن وہ تقسیم کے موقع
يذكرونها عند التقسيم	پر ان کا تذکرہ نہیں کرتے تھے، سب سے پہلے
واول من ربع القسمة وسمى	جس اصولی نے تواتر کو چار قسموں میں
كل قسم باسمه فيما نعلم الشيخ	منقسم کیا اور ہر ایک قسم کو ایک مخصوص
العلامة الانور اطال الله بقاءه	نام سے ممتاز و متعین کیا وہ ہمارے علم میں
وهو تقسيم حسن[1]	شیخ علامہ انور شاہ اطال اللہ بقاءہ ہیں

[1] الاخط ہو مقدمہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم مدینہ برقی پریس بجنور ۱۳۵۲ھ ص ۶

علامہ سید انور شاہ کی اس تقسیم کی خوبی، ندرت اور جامعیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ جن ماہران فن نے مصطلحات فنون پر مستقل اور جداگانہ کتابیں لکھی ہیں اور دوسری کتابوں کے حواشی سے بھی مفید مفید باتیں سمیٹ لی ہیں اور گوناگوں معلومات جمع کرنے میں خوب داد تحقیق دی ہے، ان کے یہاں بھی تواتر کے اقسام تواتر لفظی و معنوی سے زیادہ نہیں ہیں۔[1]

اسی طرح علامۂ موصوف نے حدیث صحیح کی بھی ایک جداگانہ تقسیم کی ہے، اور اس کو بھی اقسام اربعہ میں منحصر کیا ہے۔[2] اسی طرح طبقات کتب حدیث میں بھی علامۂ موصوف کی رائے جمہور علماء سے کچھ مختلف ہی ہے۔[3] (باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو کتاب التعریفات از سید شریف علی جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ طبع مصر ۱۳۵۷ھ ص ۱۴۸، کتاب الکلیات از ابو البقاء حسینی کفوی المتوفی ۱۰۹۴ھ طبع بولاق مصر ۱۲۵۳ھ ص ۱۲۶، دستور العلماء از عبد النبی احمد نگری طبع دکن ج ۲ ص ۸، کشاف اصطلاحات الفنون از محمد علی تھانوی طبع کلکتہ ۱۸۶۲ء ص ۱۴۶۳

[2] ملاحظہ ہو (مقدمہ) فیض الباری ج ۱ ص ۴۵ [3] ایضاً ج ۱ ص ۵۰ ۔

عہد مغلیہ

مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

حصہ اول

اس جلد میں شہنشاہ بابر کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی، تہذیبی کارناموں کو معاصر اور بعد کے دور کے مورخین کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔ قیمت للعہ

مرتبہ

سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے

منیجر

اسلامی ہندوستان کی علمی خودداری

الدرۃ الثمینہ ملا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ

اور

شاہ جہاں اور نواب سعد اللہ خاں

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی، سابق رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

اعتذار:- اس عنوان سے معارف (اکتوبر ۱۹۲۲ء) میں جناب حافظ احمد علی خاں شوق ناظم کتب خانہ ریاست رامپور نے رضا لائبریری کے مخطوطہ "الدرۃ الثمینہ" کو متعارف کرایا تھا اس مقالہ کی اشاعت کو پینتالیس سال ہو رہے ہیں، اس عرصہ میں نئے مصادر و مراجع منظر عام پر آچکے ہیں جن میں سب سے اہم امام الدین ریاضی (مصنف "التصریح فی الهیئة") کا تذکرہ "باغستان" ہے۔

یوں بھی پینتالیس سال کا عرصہ اچھا خاصہ طویل ہوتا ہے، بالخصوص اس زمانہ میں جبکہ ماضی کی شاندار روایتیں ہمارے لیے بڑی تیزی سے بھولی بسری داستانیں بنتی جا رہی ہیں اس لیے مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے اکتشافات کی جدید معلومات کے ساتھ تجدید کی جائے۔

گاہ گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

فاضل مقالہ نگار نے فرمایا تھا:-

"کتب خانہ ریاست رامپور میں مجموعہ نمبر ۳۴ فن کلام عربی میں یہ مختصر علیحدہ سالہ ہے، تقطیع

کتاب ۱۰ × ۶½ انچ ۔ سطر ۳ ½ انچ ، تعداد سطر فی ص ۱۱ ۔ خط مولویانہ شکست آمیز صفحات ۲۰ ہیں ۔ ۱۰۶۸ھ کا لکھا ہوا ہے (۱) اس رسالہ کو شاہجہاں بادشاہ کے نام پر معنون کیا گیا ہے ، ملا عبدالحکیم سیالکوٹی اس کے مصنف ہیں ۔ آغاز رسالہ ہے : "اللھم باسمک ابتدئ وبنورہ قدسک اھتدی" ۔ رسالہ میں علم باری تعالیٰ اور بحث قدم عالم کو نہایت خوبی سے لکھا ہے (۲) ملا صاحب کا انتقال ۱۰۶۰ھ یا ۱۰۶۷ھ میں ہوا ہے ۔ اس لیے یہ رسالہ ان کی زندگی ہی کا لکھا ہوا ہے (۳) ملا صاحب کے کمالات اور فضائل سے مدارس عربیہ کا ہر طالب علم واقف ہے (۴) ان کی شہرت آج نہیں بلکہ ان کی زندگی ہی میں ہندوستان سے نکل کر عرب و روم میں پہنچ چکی تھی ، چنانچہ آجکل ان کی جس قدر کتابیں ہندوستان میں نہیں چھپی ہیں ، اس سے زیادہ ترکی اور قسطنطنیہ میں چھپی ہیں ، ہندوستان سے ترکی ان کتابوں کے پہنچنے کی صورت یہ معلوم ہوئی کہ قدیم زمانہ میں جہاں سلاطین باہم اور تحفہ تحائف اپنے ملک کی مصنوعات کا بھیجا کرتے تھے ، وہاں اپنے دربار کے شعرا کی غزلیں ، قصائد ، دواوین اور علماء و فضلاء کی تصنیفات و تالیفات بھی بھیجا کرتے تھے (۵) چنانچہ شاہ جہاں اور سلطان محمد خاں سلطان روم کے درمیان اس قسم کے تعلقات قائم تھے ، اور اس طرح شاہی تحائف کے ضمن میں ہندوستان کے اس مایۂ ناز حکیم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کی تصنیفات ترکی پہنچی ہیں ، (۶) آج اس سلسلہ میں ہم ملا صاحب کے رسالہ الدرۃ الثمینہ کا تذکرہ کرتے ہیں ، عراق میں جان نثار خاں شاہجہاں کی طرف سے کسی خدمت پر مامور تھا (۷) محمد فاروق مشرف اور محب علی واقعہ نویس اس کے ہمراہ تھے ، سلاطین صفویہ کے خاندان کا ایک رکن رکین خلیفہ سلطان ایران سے نکل کر عراق میں آباد ہو گیا تھا (۸) پھر وہ ہندوستان چلا آیا تھا ۔ (۹) شاہجہانی تاریخوں میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر ہے (۱۰) یہ لائق اور صاحب علم

امیر تھا اور "وزیر دانشور عراق" کے نام سے مشہور تھا (۱۱) شاہجہانی سفراء (۱۲) جب عراق گئے تو خلیفہ سلطان سے بھی ملے۔ ان شاہجہانی سفراء کو بھی اپنی جگہ دعوی فضل و کمال تھا اور اس کو قائم رکھنا گویا ہندوستان اور سلطنت ہند کی عزت وہ سمجھتے تھے، (۱۳) وزیر نے ان سے دریافت کیا کہ امام غزالی نے (تہافت الفلاسفہ میں) مسئلہ قدم عالم اور نفی علم واجب تعالیٰ کے سبب سے (۱۴) شیخ ابو نصر فارابی اور بو علی سینا کی تکفیر کی ہے، اس کا جواب کیا ہے، جان نثار خاں نے شاہجہاں کو اطلاع کی (۱۵) بادشاہ نے اپنے وزیر سعد اللہ خاں کو حکم دیا کہ ملا عبد الحکیم صاحب کو لکھو کہ اس کے متعلق دس پندرہ دن میں ایک رسالہ لکھکر حاضر کریں کہ عراق کو بھیجا جائے۔ خدا جانے سلاطین کو اس مسئلہ سے کیا دلچسپی تھی (۱۶) چنانچہ اسی کے پس و پیش زمانہ میں امام غزالی کی تہافت الفلاسفہ اور ابن رشد نے جو اس کا جواب تہافت تہافت الفلاسفہ کے نام سے لکھا ہے، سلطان محمد خاں دوم نے اپنے دربار کے بڑے فلسفی موسی فوادی (۱۸) سے اس پر محاکمہ لکھوایا ہے جو کتاب الذخیرہ کے نام سے چھپ گئی ہے، بہرحال یہ مسئلہ بہت مہتم بالشان ہے، سینکڑوں کتابیں اس بحث پر لکھی گئی ہیں۔ یہ معلوم ہے کہ شاہان مغلیہ کے الفاظ کو احکام میں بجنسہ نقل کیا جاتا تھا، شاہجہاں کی علمی قابلیت کا یہ نمونہ ہے کہ اس نے اس مسئلہ میں جس انداز پر رسالہ لکھوانا چاہا ہے، اس کو چند جملوں میں ادا کر دیا، سعد اللہ خاں کے خط کو پڑھیے لکھتا ہے کہ کلمات حکماء و تاویلات علماء، وجہ تکفیر اہل اسلام، اقوال ملت، مباحثۂ منافرات شکوک و شبہات، ازالہ اعتراضات، سوالات و جوابات نہایت تدقیق و غایت تحقیق سے لکھے جائیں۔ در ہر باب و اساس بحث میں قائل کلام پر گفتگو ہو اور ہر جواب میں براہین ہوں صاف و مسائل متعلقہ بمطلب علم میں سے اور حضور ملک کے [illegible] متعلقہ کے بیان میں پورا احاطہ

کیا جائے اور نیز اس مسئلے کو صاف کیا جائے کہ علم صبی عالم ہے یا عین معلوم یا غیر۔ اور اس کا تعلق جزئیات سے بوجہ کلی ہے یا بوجہ جزئی وغیرہ۔

سعد اللہ خاں کی علمی استعداد تو مشہور ہی ہے، لیکن شاہجہاں کی علمی فضیلت بھی اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ کم نہ تھی، ظاہر ہے کہ جو شخص کسی علم و فن سے واقف نہ ہو وہ کیا اسکو سمجھ سکتا ہے، اگر شاہجہاں کی تاریخ کے ساتھ اسکے کمالات علمی کی بھی تلاش کیجائے تو کیا اچھا ہو۔

سعد اللہ خاں وزیر نے شاہجہاں کے حکم سے اس باب میں ملا محمد صاحب کو جو خط لکھا ہے وہ بھی اس رسالہ کے ساتھ شامل ہے اور اس کی نقل حسب ذیل ہے۔"

اس کے بعد فاضل مقالہ نگار نے اُس خط کو نقل کیا ہے۔ ہم اسے بعد میں دوسرے نسخے کے ساتھ موازنہ کر کے نقل کریں گے، یہاں صرف محلات نظریہ کی نشاندہی کیجاتی ہے:

محلات نظریہ (۱) ۱۰۵۰ھ رسالہ کا سال تصنیف ہے، مخطوطہ کا سال کتابت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے آخر میں مرقوم ہے

"ولیکن هذا آخر ما اردنا ایراده فی هذه الرسالة الخاقانیة حامداً لله تعالیٰ ومصلیاً علی نبیه وآله مشارعاً فی غرہ یوم الجمعة خامس شهر ربیع الثانی ... آخر یوم الجمعة ثانی عشر منه سنه ۱۰۵۰ھ"

(۲) مقالہ نویس نے ایک بحث کو چھوڑ دیا ہے۔ وہ ہے مسئلہ حشر اجساد۔ اصل مناظرہ میں تین مسئلے پیش نظر تھے: عالم کا حدوث وقدم، حشر اجساد کا اقرار و انکار، اور علم باری تعالیٰ بجزئیات مادیہ کی تائید یا تردید۔ ان میں سے رسالہ میں پہلے دو مسئلوں سے یونہی سا تعرض کیا گیا ہے، صرف تیسرے مسئلے سے بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

(۳) ہم اوپر کہہ چکے ہیں کہ ۱۰۵۰ھ رسالہ کا سال تصنیف ہے (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

ذکر غلط ہے کا سنہ کتابت،

(۴) لیکن اس زمانہ میں جبکہ قدیم اور جدید کے درمیان بعد المشرقین پیدا ہو چکا ہے، اس عبقری وقت کا تعارف ضروری ہے۔

(۵) ایسا نہیں ہے، بلکہ علم و حکمت کی نشر و اشاعت شاہان وقت کے "ارسال ہدایا و تحف" سے بے نیاز تھی۔

(۶) اور ترکی کے علما کی تصانیف مثلاً "خیالی" کس طرح ہندوستان میں آکر داخل درس ہوئیں؟

(۷) ۱۰۵۵ھ میں سفیر بنا کر ایران بھیجا گیا تھا (مزید تفصیل آگے آرہی ہے)

(۸) عراق سے آجکل کا عراق مراد نہیں ہے، بلکہ عراق عجم جو مغربی ایران کا نام تھا۔

(۹) خلیفہ سلطان خود نہیں آیا، بلکہ اس کے خاندان کے کچھ افراد آئے تھے۔

(۱۰) خلیفہ سلطان کا نہیں، بلکہ اس کی اولاد کا ذکر ہے۔

(۱۱) خلیفہ سلطان اعتماد الدولہ اس کا لقب تھا۔

(۱۲) "شاہجہانی سفراء" نہیں بلکہ شاہجہان کا سفیر (جان نثار خان) اور سفارتخانہ کا عملہ۔

(۱۳) اس اوباش ہمہ دانی کا تو سلطنت کی عزت سے کوئی تعلق نہیں تھا، یہ بعض سفارتخانہ کے عملہ کی بوالفضولی ہی تھی۔ البتہ جب ان بوالفضولوں کو اس مناظرے میں منہ کی کھانی پڑی تو ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا اور اسی لیے یہ رسالہ لکھوایا گیا۔

(۱۴) تیسرا مسئلہ (حشر جسمانی) بھی بیان ہونے سے رہ گیا ہے،

(۱۵) اس مکتوب کا جو دوسرا نسخہ تذکرۂ داغستان میں منقول ہے، اس میں لکھا ہے کہ مناظرہ ہوا جس میں ہندوستانی سفارتخانہ کے عملہ کو شکست ہوئی، اور پھر شاہجہان کو اطلاع دی گئی۔

(۱۶) سلاطین کو اس مسئلہ سے دلچسپی کا سوال نہیں تھا، بلکہ ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا معاملہ تھا۔

(۱۷) بیس و پیش زمانہ میں نہیں، بلکہ پورے دو سو سال پہلے، کیونکہ یہ گیارہویں صدی کے وسط میں لکھا گیا تھا، اور سلطان محمد فاتح نے "تہافت الفلاسفہ" امام غزالی اور "تہافت التہافت" ابن رشد پر محاکمہ نویں صدی ہجری کے وسط میں کرایا تھا۔

(۱۸) اس لفظ "موحی فزاروی" کو نہیں پڑھا جاسکا۔ ممکن ہے "مولیٰ خواجہ زادہ" ہو مگر کتاب "الذخیرہ" ان کی تصنیف نہیں ہے۔ یا "مولیٰ علاء الدین طوسی" ہو مگر اس تصنیف سے اقرب نہیں ہے۔

(۱۹) یہ فاضل مقالہ نگار کی قیاس آرائی ہے کہ "شاہان مغلیہ کے الفاظ کو احکام میں بعینہ نقل کیا جاتا تھا"۔ ورنہ وزیر یا دفتر کا سربراہ شاہی مراسلات کا مسودہ تیار کرتا تھا اور بادشاہ اس پر دستخط کرتا تھا یا مہر لگاتا تھا۔ لہٰذا "چند جملے" اور مسائل مجوزہ کی تفصیل سعد اللہ خاں علامی کی کاوش ذہن کا نتیجہ ہیں۔

اس خط کا ایک دوسرا نسخہ "تذکرہ باغستان" میں محفوظ ہے جو میرے خیال میں زیادہ قابل اعتماد ہے، بہرحال دونوں نسخوں کی مدد سے اس خط کی نقل ذیل میں پیش کیجا رہی ہے۔

علامی سعد اللہ خاں کا مکتوب "افادت پناہ افاضت دستگاہ جامع معقول و منقول حاوی فروع و اصول وحید العصر فرید الدہر با دولک نشاتین و احراز دارین کامیاب باشند۔ حسب الحکم اشرف می نویسد کہ چوں از افواہ و وقائع ایران بمسامع مجامع رسید کہ افادت پناہ افاضت دستگاہ خلیفہ سلطان وزیر و دانشور عراق کہ اعلم العلمائے آں دیار است از محمد فاروق مشرف و مجلس واقعہ نویس کہ بامارت مآب جان نثار خاں سفیر متعین اندرباب از دعوائے ایمان مجمل کامل و

پرسید کہ امام غزالی در مسئلہ قدم عالم ونفی علم واجب تعالیٰ شانہٗ کما یقول الظالمون
فی حق انفسہم والجاہلون باللہ جلّ وعلا بجزئیات مادیہ ونفی حشر اجساد تکفیر ابونصر فارابی
وشیخ ابوعلی سینا نمودہ۔ وجمعے تاویل کلام حکما کردہ اند۔ این مراتب را تقریر باید کرد۔ ودعاوی
دروغ چون شمع کشتہ بے فروغ اند واز مسلک معقولیت دور افتادند۔ لہذا کمترین
مریدان حکم شد کہ باں فضائل وکمالات دستگاہ سطرے چند برنگارد وبرگزارد کہ آن افادت
وافاضت مرتبہ را دریں مسائل مختصرے جامع وموجزے مفید کہ مستجمع کلمات حکما وتاویلات
علماء ووجہ تکفیر اسلامیین واقوال ملیین ومباحثات ومناظرات وشکوک وشبہات وادلّۃ
وازاحات واسولہ واجوبہ وغایت تدقیقات ونہایت تحقیقات واصل کلام در ہر باب
واساس سخن در ہر جواب وانچہ بران ظفر یافتہ باشند وبرہان بداں فائز شدہ باشند۔ واحاطہ
مسائل متعلقہ بمطلب علم از حضوری وحصولی بودن وعلم عین عالم وعین معلوم یا غیر آن و
تعلق آن بجزئیات بروجہ کلی است یا بروجہ جزئی وتحریر آنکہ کلیت وجزئیت مفہوم تابع
مدرِک یا تابع مدرَک است ونسبت واجب جزئی ہست یانہ۔ وبیان آنکہ ادراک تعقلی
است یا احساسی۔ وشمول علم بغیبات ومتشخصات از ذات وغیر آن۔ وتعلقہ علم با تغیر
معلوم وتبدل زمان۔ وحضور زمان بجمیع اجزائہ من الازل الی الابد الآباد نزد کنہ
غیر آن یا بہ غیر آن باشد نوشتہ در حضرت خلافت مرجع دہ نامہ باید فرستاد کہ
بایران فرستادہ شود۔ وآن چنان باید بود کہ قابل فرستادن ولائق اضافت آن
فضائل دستگاہ بود وبرروزگار از ان آثار گزیدہ ودر تاریخ ما جدا نوشتہ آید۔[1]

الدرة الثمینة کا مصنف، نام ونسب | الدرة الثمینة کے مصنف ملا عبدالحکیم سیالکوٹی ہیں جو حضرت

---

[1] ملاحظہ ہو مجلات نظر حیات نمبر (۴۳)

اپنے وقت کے بلکہ ہندوستان کے ایک عظیم المرتبہ فاضل تھے، پدر بزرگوار کا نام شمس الدین تھا جو غالباً اپنے دیگر ابناء وطن کی طرح کشمیر سے سیالکوٹ میں آبسے تھے۔

تعلیم و اساتذہ: ابتدائی تعلیم کی تفصیلات تاریخ نے محفوظ نہیں رکھیں لیکن اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کشمیر کے ایک جلیل القدر استاد ملا کمال الدین سے کی میر غلام علی آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:

"در عنفوان سن تمیز دامن ہمت بطلب علم برزد و بیشتر نزد ملا کمال الدین کشمیری کہ متوطن بلدۂ سیالکوٹ و بلند پرواز عالم ملکوت بود، تلمذ نمود" (مآثر الکرام، ص ۲۰۴)

اُن سے پہلے عبدالحمید نے بادشاہ نامہ میں لکھا تھا:

"اکثر علوم نزد ملا کمال کشمیری کہ در سیالکوٹ مسکن داشت و بانوار باطنی روشن، تلمذ نمودہ است"

ملا کمال الدین اپنے بھائی مولانا جمال الدین کی طرح کشمیر کے ایک صاحب دل شیخ اور عالم بابا فتح اللہ کے داماد اور شاگرد تھے، چنانچہ محمد اعظم کشمیری نے "واقعات کشمیر" میں لکھا ہے:

"مطلع الانوار لایزال اخوند ملا کمال برادر مولانا جمال است۔ حلال دقائق و کشاف حقائق بود۔ بنسبت علمی غالب داشت چنانچہ برادر عالی قدرش را جہت تقوی راجح بود ...... در سیالکوٹ و لاہور مسند افادہ علوم بیار است و علمائے از فیض خدمتش بمصاحب کمالی برخاست ...... علمائے بسیارش مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی از خدمتش مستفید گردیدہ"

اسی زمانہ میں علامہ عبدالحکیم کے تعلقات حضرت مجدد الف ثانی کے ساتھ استوار ہونا شروع ہوئے اور علامہ عبدالحکیم ہی نے حضرت مجدد صاحب کی قوت مناظرہ سے متاثر ہو کر انھیں "مجدد العلماء" کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن بعد میں دونوں دوستوں نے مختلف راہیں اختیار کیں؛ علامہ نے مسند درس و افادہ کو زینت بخشی اور مجدد صاحب نے رشد و ہدایت اور تجدید و اصلاح کے فرائض کو

انجام دیا۔

بہرحال باکمال استاد کے فیض تلمذ کا نتیجہ تھا کہ سیالکوٹ کا یہ لائق سپوت عرصۂ قلیل میں جملہ علوم و فنون کے اندر دستگاہ عالی حاصل کرکے خود تشنگان علم و حکمت کو فیض پہنچانے لگا، آزاد بلگرامی نے ان کے تلمذ کے بعد لکھا ہے :۔

"در فرصت کمی ہلال استعدادش بدر کامل گشت...... عرصۂ جہان را بلوامع فیض مملو ساخت"

درس و تدریس کا آغاز شروع میں اپنے بیشمار معاصرین کی طرح علامہ عبد الحکیم سیالکوٹی نے بھی دربار سلطنت سے دور اور شاہی جود و سخا سے بے نیاز ہو کر خود کو نشر علوم کے لیے وقف کر دیا، یہ جہانگیر کا زمانہ تھا، چنانچہ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :

"در عہد جہانگیری بہ معاش ضروری ساختہ در وطن مالوف بسر می برد"

اسی طرح عبد الحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں لکھا تھا :

"در ایام سعادت فرجام حضرت جنت مکانی بضروریات معیشت در ساختہ عزلت گزین بود"

مگر اس عزلت گزینی کے باوجود ان کے فضل و کمال اور جلالت علمی کا شہرہ دربار تک پہنچے بغیر نہ رہ سکا، چنانچہ معتمد خاں نے "اقبال نامہ جہانگیری" میں منتخب روزگار فضلائے عہد کی جو مختصر فہرست دی ہے اس میں علامہ عبد الحکیم کا نام بھی ہے، حالانکہ ان کے سوا ان کے معاصرین و متاخرین میں سے کسی کا بھی مذکور نہیں ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ شروع ہی سے علمی دنیا میں منفرد اور نمایاں تھے،

عہد شاہجہانی اور دربار تک رسائی ۱۰۳۷ھ میں جہانگیر کے انتقال کے بعد شاہجہاں تخت نشین ہوا، اس نے علم و ادب کی سرپرستی کے نئے دور کا آغاز کیا، میر غلام علی آزاد نے لکھا ہے :

"چون نوبت جہانبانی ہندوستان بہ صاحب قران شاہجہان انار اللہ برہانہ رسید...."

علما و شعرا اوراواج دیگر پیدا شد۔ (مآثر الکرام صفحہ ۲۰۴-۲۰۵)

علامہ عبدالحکیم بھی جو "دستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا" پر عامل تھے، قدر شناس بادشاہ کی تربیت سے محروم نہ رہ سکے، اسی زمانہ میں انھوں نے تفسیر بیضاوی پر حاشیہ لکھا جو اپنی نوعیت کا منفرد علمی کارنامہ تھا، اس کو بادشاہ کے سامنے پیش کیا، اس کی جوہر شناس نگاہ نے امید سے زیادہ قدر افزائی کی، اس سے علامہ کے حوصلے بڑھ گئے اور اس کی تکمیل میں لگ گئے۔ (اس کی تفصیل انھوں نے اپنے "حاشیہ تفسیر بیضاوی کے دیباچہ میں دی ہے)۔ اس کے بعد انھوں نے بہت سی تصانیف بادشاہ کے نام پر معنون کیں اور اس سلسلے میں بارہا دربار میں بلائے گئے اور شاہی انعامات سے نوازے گئے، آزاد بلگرامی نے لکھا ہے:-

"ملا دریں عہد بارہا خود را بہ درگاہ خلافت رسانید، ہر گاہ وارد حضوری گردید۔ بہ رعایت نقود نامحدود مخصوص می گشت۔ دوبار بزر سنجیدہ شد و مبالغ ہم سنگ ہم گرفت و چند قریہ برسم سیورغال انعام شد۔"

دوسرے وجوہ و اعیان مملکت کی طرح علامہ سیالکوٹی بھی جب کبھی شاہی دربار میں تشریف لاتے تو ان کی آمد درباری وقائع نویس سرکاری تاریخ میں قلمبند کرتا، عبدالحمید لاہوری نے "بادشاہ نامہ" میں اس قسم کی متعدد تقریبات کا ذکر کیا ہے۔

مناظرے: ان کے زمانہ میں جب کبھی دربار میں کوئی مدعی علم و فضل سر اٹھاتا تو اس کے مقابلے کیلئے علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی ہی کو زحمت دی جاتی، جب ملا شفیعا ایران سے آیا اور اس کے علم و فضل کا شہرہ ہوا تو علامہ ہی کو اس سے مناظرے کے لیے بلایا گیا، اس مناظرے کی تفصیل امام الدین ریاضی نے تذکرہ واقعات میں دی ہے:

"آوردہ اند کہ پادشاہ شاہجہاں ایشاں را از سیالکوٹ برائے مناظرہ ملا شفیعا کہ تازہ

از ولایت آمده بود و خطاب دانشمند خان یافته طلبید۔ ایشان آمدند و اجلاس علما و فضلا شد۔ چون نوبت سخن بمولوی عبدالحکیم رسید و با دانشمند خان مناظره واقع شد بر سر ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ گفتگو بطول کشید و بالآخر درستی قول و راستی سخن ایشان بہ بادشاه و سائر علما و امرا عالی شان انجامید۔" (باغستان ص ۴۴۴ ب ۵۰۶ الف)

مگر علامہ بحاث محض ہی نہ تھے، حق پسند اور منصف مزاج بھی تھے، ایک مرتبہ ملا محمود جونپوری سے مسئلہ وحدت الوجود کے باب میں مناظرہ ہوا تو آخر میں علامہ نے فریق مقابل کی برتری کا اعتراف کر لیا۔ امام الدین ریاضی نے دوسری جگہ لکھا ہے:۔

"ملا محمود جونپوری در فروع و اصول و معقول و منقول بکمال رسیده بود ...... مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی باوجود کمال خود بکمال جامعیت او اقرار و اعتراف بفضل و دانشمندی او می نمود ...... مولوی عبدالحکیم در مناظره علم توحید با وے مقاومت نداشت۔ می فرمود که مولانا نفس قدسی است، تار و پود سخن را خاصه بمنقولات بمنوالے بافته که کارنامه دیگران در پیش او بعینه و قد ان اوہن البیوت لبیت العنکبوت ست تر از نسج عنکبوت است۔" (باغستان صفحہ ۴۴۵ ب ۵۰۶ الف)

یہ علامہ کی حق پسندی تھی ورنہ وہ بڑے بڑے اکابر سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے، ایک مرتبہ قاضی عبدالوہاب سے جو قاضی القضاۃ تھے کسی مسئلے میں مناظرہ ہو رہا تھا، علامہ بڑے جوش و خروش سے بول رہے تھے، قاضی صاحب نے کہہ دیا "مرد آدمی سخن آہستہ گو۔" پھر کیا تھا، علامہ بگڑ گئے اور قاضی القضاۃ کے منصب کا خیال کیے بغیر انھیں ڈانٹ دیا۔

علامہ کی علم دوستی کا یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے کہ ایک مرتبہ مولانا عوض وجیہ جی سیاحیانہ وضع میں علامہ کے درس میں تشریف لے گئے اور دوران تقریر میں علامہ پر اعتراض کیے، شاد

علامہ کی سعد اللہ خاں علامی سے ملاقات ہوئی! انھوں نے اس نو وارد وسپاہی کے اعتراضات کا ذکر کیا، علامی سعد اللہ خاں سمجھ گئے، بولے ارے تو وہ تو مولانا عوض وجیہ بلخی تھے۔ مولانا نے سنا تو حسرت و اشتیاق کے ساتھ فرمانے لگے۔

"ز آمدنش اگر خبر داشتمے درہ گزرش گل و یاسمن کاشتمے۔"

معاصرین وحریف | علامہ علم وفضل کے آفتاب نہیں تھے، ماہتاب تھے، اس عہد کے آسمانِ علم وفضل پر بیشمار درخشاں ستارے روشن تھے، بدرمنیر علامہ کی ذات تھی، شاہجہاں کی علمی سرپرستی وجوہر شناسی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، اس عہد کی مشہور شخصیتوں میں بادشاہ کے وزیر علامی افضل خاں اور علامی سعد اللہ خاں کے علاوہ میرک شیخ ہروی، ملا علاء الملک تونی، سید احمد سعید، قاضی محمد اسلم، ملا عبد اللطیف، میر محمد ہاشم، شیخ عبد الحق محدث، ان کے صاحبزادے مفتی نور الحق، مفتی حسام الدین، مفتی رکن الدین، ملا عبد السلام لاہوری، مفتی عبد السلام دیوی، مولانا یوسف کیا ہی، مولانا جمال الدین تلوی، مولانا الہداد، ملا فاضل بدخشی، ملا محمد افضل اور ان کے دو شاگرد ملا محمود جونپوری (مصنف شمس بازغہ) اور شیخ عبد الرشید جونپوری (مصنف مناظرۂ رشیدیہ) قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ کشمیر میں بھی جلیل القدر علماء تھے، جیسے قاضی ابو القاسم، مولانا حیدر فیروز، مولانا داؤد مشکواتی، ملا باقر صباغ، ملا باقر نارو، ملا فاضل، ملا ابو الفضل عرف شاہم بابلہ ان میں سے اکثر ان کے حریف نقاد تھے جیسے ملا باقر نارو، جن کے بارے میں صاحب "واقعات کشمیر" نے لکھا ہے:۔

"ملا باقر نارہ ہو۔ در معقولات شاگرد ملا باقر صباغ بودہ و در تبہ و شان با ملا عبد الحکیم و علمائے پنجاب و پورب معارضہ کردہ و آنہا را ملزم می کرد۔"

ملا فاضل جن کے بارے میں محمد اعظم کشمیری نے لکھا ہے:

"ملا فاضل بعہد شاہجہاں مستحق بود و بکمال و بجامعیت شہرت یافتہ اکثر حواشی ملا عبد الحکیم سیالکوٹی را رد می نوشت۔"

شاہم بابا جی کے بارے میں یہی مصنف لکھتا ہے :-

" ملا ابوالحسن معروف بشاہم بابا در علوم مستعد و مجد بود ..... اکثر مذکورات ملا عبدالحکیم مارومی کرد وگا ..... تفات بجانب علماء حاضر نمی کرد "

ہندوستانی فضلا میں مفتی عبدالسلام دیوی کا نام قابل ذکر ہے، انکے ساتھ علامہ کی غلط فہمی کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس کی تفصیل آزاد بلگرامی نے " مآثر الکرام " میں میر اسمٰعیل بلگرامی کے تذکرے میں دی ہے بہرحال علم و فضل کے اعتبار سے یہ بڑا روشن دور تھا، اور بیشمار علماء و فضلاء سے مملکت شاہجہانی کی زیب و زینت تھی، مگر جب ہندوستان کے کھوئے ہوئے علمی وقار کی بحالی کا سوال پیدا ہوا تو شاہجہاں کی جوہر شناس نگاہوں نے ان درخشاں ستاروں میں سے اسی مہ کامل کا انتخاب کیا (اس کی تفصیل " الدرة الثمینة " کی وجہ تصنیف کے ضمن میں آگے آئیگی)

اور یہ اس فاضل عہد کی جلالت قدر اور علوئے مرتبت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

وفات | علامہ سیالکوٹی نے ۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے :-

" وفاتش دہم ربیع الاول سنہ سبع و ستین والف طوبا رجیات بہجید و دہیا لکوٹ بفوتہ گردید "

اولاد، امجاد و تلامذہ | تاریخ میں علامہ کی اولاد امجاد میں سے ان کے صاحبزادے مولانا عبد اللہ لبیب کا نام مذکور ہے، علامہ کو ان سے بے پناہ محبت تھی اور وہ ان کی تعلیم و تربیت پر خاص توجہ رکھتے تھے، چنانچہ بہت سی کتابیں انہی کے واسطے تصنیف کیں۔

مولانا عبد اللہ لبیب بھی اپنے وقت کے جید عالم تھے، " توضیح تلویح " پر ان کا حاشیہ مشہور ہے۔ ایک رسالہ وحدت الوجود کی تائید میں عالمگیر کی استدعا پر مرتب کیا تھا جیسا کہ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے :-

"آوردہ اند کہ بادشاہ بہ ایشاں گفت کہ والد شما مسئلۂ وحدۃ الوجود چہ طور تلقین شما کردہ اند۔ آنرا می خواہیم از زبان شما بشنویم کہ گویا از مولوی مرحوم شنیدہ باشیم ایشاں خود دراں وقت بجواب اجمالی کہ مقتضائے وقت بود اکتفا کردند و گفتند کہ چوں ایں سخن شرح طلب است، اگر امر شود در زودی رسالہ موجزے در حل ایں رمز شگرف تحریر نمودہ بسمع مبارک رسانم۔ فرمود بہتر۔ چنانچہ اخوند در اندک فرصتے رسالہ بسیار خوب در حل مسئلہ وحدۃ الوجود تصنیف کردہ بعرض رسانیدہ و فقیر ایشاں را ہم دراں ایام دریافتہ آں رسالہ حاصل نمودہ بمطالعہ در آوردہ۔"

(باغستان، ص ۴۰۶ ب)

لیکن علامہ کا علمی فیض انکے تلامذہ کے ذریعے زیادہ پھیلا۔ امام الدین ریاضی نے لکھا ہے:۔

"و بالجملہ از رایات جلال او شاگردان صاحب کمال اند از انجملہ است، ملا شفیعہ مخاطب بسعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں پادشاہ صاحبقراں کہ نشان مذکور از فضل او نشان می دہد...... و از انجملہ است ملا عبد العزیز عزت کہ در زمان خلافت عالمگیر خدمت عرض مکرر داشت...... و از انجملہ است ملا عصمت اللہ سہارنپوری کہ بر خلاصۃ الحساب و تشریح الافلاک شیخ بہاء الدین محمد عاملی شرح نوشتہ اند و از رایات کمال او فرزند صاحب حال است مولوی عبد اللہ۔" (باغستان صفحہ ۴۰۶ الف)

ان کے علاوہ ان کے ایک اور شاگرد مولوی عبد الرحیم مراد آبادی تھے، جن کے سلسلۂ تلمذ میں قاضی مبارک گوپاموی (شارح سلم العلوم) شمار ہوتے ہیں، ایک اور شاگرد میر اسمٰعیل بلگرامی تھے، جو پہلے مفتی عبد السلام دیوی کے شاگرد ہوئے تھے۔

تصنیفات: علامہ کثیر الدرس ہونے کے ساتھ کثیر التصنیف بھی تھے، آزاد بلگرامی نے انکی

کتابوں کی ایک مبسوط فہرست دی ہے جو حسب ذیل ہے:۔

۱۔ حاشیہ تفسیر بیضاوی
۲۔ حاشیہ مقدمات تلویح
۳۔ حاشیہ مطول
۴۔ حاشیہ شریفیہ
۵۔ حاشیہ شرح مواقف
۶۔ حاشیہ شرح عقائد تفتازانی
۷۔ حاشیہ حاشیۂ خیالی
۸۔ حاشیہ شرح شمسیہ
۹۔ حاشیہ حاشیہ عبد الغفور
۱۰۔ تکملہ حاشیہ عبد الغفور
۱۱۔ حاشیہ شرح مطالع
۱۲۔ حاشیہ شرح عقائد ملا جلال دوانی
۱۳۔ درۂ ثمینہ در اثبات واجب تعالیٰ (؟)
۱۴۔ حواشی در کنار شرح حکمۃ العین
۱۵۔ حواشی در کنار شرح ہدایۃ الحکمۃ
۱۶۔ حواشی در کنار مراح الارواح

ان میں سے ہمارے نقطۂ نظر سے "درۂ ثمینہ" سب سے زیادہ اہم ہے، اسی کا تعارف آگے آ رہا ہے، آزاد بلگرامی نے اس کا موضوع اثبات واجب تعالیٰ بتایا ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے، اس کی توضیح اگلی قسط میں پیش کی جائے گی۔ انشاء اللہ العزیز۔

(باقی)

تفسیر فتح العزیز
چند حقایق کی روشنی میں

از
جناب محمد عضد الدین خاں صاحب ادارہ علوم اسلامیہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے علمی کارناموں میں ان کی تحفۂ اثنا عشریہ اور تفسیر فتح العزیز دو اہم تصانیف خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اول الذکر اپنے موضوع پر یقیناً حرف آخر ہے۔ اور اس لحاظ سے شاہ صاحب کا اہم ترین کارنامہ ہے، اسی کے ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بھی انتہائی علمی اہمیت کی حامل ہے، بلکہ ایک لحاظ سے تحفہ سے بھی اہم ہے، شاہ صاحب کی گوناگوں علمی و ادبی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ اسی تفسیر سے ہوتا ہے، وہ اس تفسیر میں بیک وقت نحوی بھی نظر آتے ہیں اور متکلم بھی، محدث بھی اور صوفی بھی، فقیہ بھی اور ادیب بھی، اس کے علاوہ اس تفسیر میں نظم قرآنی اور دوسرے تفسیری نکات جتنے خوبصورت پیرائے میں ملتے ہیں، شاید ہی کسی ہندوستانی تفسیر میں اس وقت تک بیان کیے گئے ہوں، اسی لیے خود شاہ عبد العزیز صاحب بھی اس معرکۃ الآرا تفسیر پر فخر و مسرت محسوس فرماتے تھے، چنانچہ اپنے شاگرد مرزا حسن علی محدث کے ایک خط کے جواب میں جو اصل میں تحفۂ اثنا عشریہ کے معترضین کے جواب کے سلسلے میں تھا، تحریر فرماتے ہیں:-

"...... و مصنفہ اجاشۂ طعن معاندان و حاسدان وقتے متوجہ فقیری تواند شد کہ ایں

فقیر دعوی تصنیف ایں کتاب موجب افتخار خود دانستہ تقریر ہائے تحریر یافتہ بزبان یا بزبان قلم کردہ باشد
معلوم است کہ ایں کتاب را تصنیف حافظ غلام حلیم ابن الشیخ قطب الدین احمد ابن الشیخ ابوالفیض نوشتہ ام
اگر منظور دعوے نسبت ایں کتاب بخود می بود چرا اینقدر اختفا بنا ہائے غیر معروف عمل می آوردم
بلکہ حالا ہم ہرگز بہ نسبت ایں کتاب بطرف خود خوش نمیشوم آرے اگر تفسیر فتح العزیز و امثال
ایں تصانیف را اگر بہ فقیر نسبت کنند موجب شادمانی خاطر میگردد"[1]

لیکن اس اہم تفسیر کے سلسلے میں دو متضاد روایات ملتی ہیں، بعض روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یہ تفسیر مکمل نہیں کی تھی، بلکہ شروع کے سوا پاروں سے کچھ زیادہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر فرمائی تھی، اور بعض شواہد سے اس کا قوی گمان ہوتا ہے کہ یہ تفسیر اگر لکھی گئی تو مکمل ہی لکھی گئی۔ اس مضمون میں اصل حقیقت کی تلاش کی کوشش کی گئی ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب نے یہ تفسیر ۴۹ برس کی عمر میں ۱۲۰۸ھ مطابق ۱۷۹۴ء میں لکھی، یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ صاحب متعدد موذی امراض کا شکار ہو چکے تھے، اور ان کی بصارت بھی تقریباً جاتی رہی تھی، جیسا کہ انھوں نے خود تفسیر کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے، تفسیر لکھنے کا سبب خود شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان کے مطابق مولانا شاہ فخر صاحب کے مرید شیخ مصدق الدین عبداللہ کی خواہش اور ان کا شوق تھا، چونکہ بصارت اس وقت تقریباً زائل ہو چکی تھی اسلیے تفسیر کو خود لکھنے کے بجائے املا فرمایا تھا۔[2]

یہ تفسیر غیر مکمل پائی جاتی ہے یعنی اس میں صرف سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کی شروع کی ۱۸۴ آیتوں "وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون" تک کی تفسیر ہے جو سوا پاروں سے کچھ زائد پر مشتمل ہے، اس کے بعد آخر کے دو پاروں کی تفسیر ہے، جو متعدد بار شائع ہو چکی ہے۔

---

[1] مجموعۂ فتاویٰ عزیزی جلد اول ص ۱۳۰، [2] تفسیر فتح العزیز (مقدمہ) ص ۳

اس سلسلے میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی، یا پورے قرآن شریف کی؟ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی جتنی کہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے،

اس خیال کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ صرف اتنی ہی تفسیر قلمی یا مطبوعہ شکل میں ملتی ہے، اور یہ گمان ۔۔۔۔ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تھی جس کا بیشتر حصہ کسی وجہ سے ضائع ہو گیا ہو کیونکہ ان کی کوئی اور تصنیف ضائع نہیں ہوئی، ایسی حالت میں صرف اسی تفسیر کے حصوں کا ضائع ہو جانا قرین قیاس نہیں ہے، اس کے علاوہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے مختلف تذکرہ نگاروں نے بھی عام طور پر یہی لکھا ہے کہ یہ تفسیر نامکمل رہی، چنانچہ مولوی رحمان علی (۱۲۴۴ھ تا ۱۳۲۵ھ) نے اپنی کتاب تذکرہ علمائے ہند میں بھی یہی لکھا ہے۔

مقالات طریقت میں بھی جو شاہ صاحب کے حالات میں اہم تذکرہ ہے صراحت سے مذکور ہے کہ شاہ صاحب اپنی زندگی میں اس تفسیر کو مکمل نہ کر سکے، اس لیے ان کے شاگرد مولانا حیدر علی فیض آبادی (وفات ۱۲۹۹ھ) صاحب منتہی الکلام نے نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال کی خواہش پر اس کو ستائیس جلدوں میں مکمل کیا، صاحب مقالات طریقت کا کہنا ہے کہ انھوں نے خود اس تفسیر کو دیکھا ہے[1]،

مگر یہ عام خیال کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی جتنی آج مطبوعہ شکل میں

---

[1] مقالات طریقت از حکیم ضیاء حیدرآباد ۱۲۹۲ھ ص ۳۳۔ راقم الحروف کو حیدر علی صاحب کی تفسیر کی یہ تمام جلدیں دستیاب نہ ہو سکیں، صرف آصفیہ لائبریری حیدرآباد میں اس کے چند اجزاء ملے جن میں کسی جگہ کا خاتمہ یا کوئی ایسی عبارت نہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ یہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تفسیر کا تکملہ ہے۔

موجود ہے، مندرجۂ ذیل وجوہ سے بہت کمزور اور مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

(۱) شاہ عبدالعزیز صاحب کی مختلف عبارات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ انھوں نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، ان کے فتاویٰ میں جابجا ایسی سورتوں کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں جو اس وقت قلمی یا مطبوعہ شکل میں نہیں پائے جاتے، مثلاً یہاں چند عبارتیں نقل کیجاتی ہیں، ایک جگہ تفسیر کے سلسلے میں پوری بات لکھنے کے بعد یہ لکھتے ہیں:

...." نقلاً عن مسودة فتح العزیز	فتح العزیز کے مسودہ سے یہ عبارت نقل ہو
فی سورة آل عمران قولہ تعالیٰ	جو سورۂ آل عمران کی تفسیر میں قل آمنا باللہ
قل آمنا باللہ وما انزل علینا فقط[1]	وما انزل علینا کے تحت مذکور ہے۔

ایک دوسری جگہ یہ عبارت ملتی ہے:۔

" وایں فقیر در تحت آیت اولئک یؤتون اجرھم مرتین[2] تحقیق نفیس نوشتہ کہ ایں وقت نقل آں بسبب دور افتادن مسودات متعذر است[3]"

ایک جگہ سورہ حدید کی آیت ھو الذی خلق السموٰت والارض فی ستة ایام کی تفسیر کے سلسلے میں رقمطراز ہیں:۔

" چنانچہ تفصیل آں دفعات در سورۂ سجدہ مذکور است و در تفسیر فتح العزیز شرح آں بوجہ مستوفی مذکور شدہ چوں ایں وقت حواس درست نبود نقل از مسودات آں ممکن نشد[4]"

اسی طرح فتاویٰ کی دوسری جلد کے صفحہ ۴۴ پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

من تفسیر فتح العزیز فی سورة النساء	تفسیر فتح العزیز میں سورۂ نساء کی آیت

---

[1] فتاویٰ عزیزی، ج دوم (مجتبائی پریس دہلی ۱۳۴۱ھ) ص ۱۰۴، [2] یہاں یہ سورۂ قصص کی آیت لکھی ہوئی ہے۔

[3] فتاویٰ عزیزی ج دوم ص ۱۱، [4] ایضاً

تحت قولہ تعالیٰ کلما نضجت
جلودھم بدلناھم جلوداً
غیرھا لیذوقوا العذاب

کلما نضجت جلودھم بدلناھم
جلوداً غیرھا لیذوقوا العذاب
کی تفسیر کے تحت دکھا ہے کہ)

....

اسی کے دوسرے صفحے پر یہ عبارت ملتی ہے:

"ایضاً منقولاً من تفسیر فتح
العزیز) من سورۃ الصافات
من باب اسرار القصص تحت
قولہ ولقد سبقت کلمتنا
لعبادنا المرسلین انھم لھم
المنصورون... سینفصل
ھذہ تفصیلاً لائقاً فی تفسیر
سورۃ الزخرف انشاء اللہ تعالیٰ

اور یہ عبارت بھی تفسیر فتح العزیز کی سورۃ
الصافات میں اسرار القصص کے ذکر میں
قرآن شریف کی آیت ولقد سبقت الخ
کی تفسیر سے ماخوذ ہے.... اور انشاء اللہ
تعالیٰ اس امر کی مناسب تفصیل سورۃ
زخرف کی تفسیر میں بیان کروں گا.

اس کے علاوہ انہی فتاوی کے صفحہ ۳۰۶ پر مندرجہ ذیل عبارت ملتی ہے:

من تفسیر فتح العزیز تحت قولہ تعالیٰ
ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ ما
قلت ما السر فی ھذہ الادعیۃ
الواردۃ فی الکتاب العزیز کلھا
مصدرۃ بقولہ ربنا الا نادراً

تفسیر فتح العزیز میں آیت ربنا آتنا فی
الدنیا حسنۃ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ اگر یہ
خیال ہو کہ کیا وجہ ہے کہ قرآن شریف میں
بعض کو چھوڑ کر بعض دعائیں ہیں سب
ربنا سے شروع ہوتی ہیں......

یہ بات عجیب ہے کہ اس وقت تفسیر فتح العزیز کا جو حصہ مطبوعہ شکل میں ملتا ہے وہ مذکورہ بالا آیت یعنی ربنا اتنا الخ سے سولہ آیت پہلے ختم ہو جاتا ہے یعنی اس وقت مطبوعہ تفسیر میں سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۱۸۴ تک کی تفسیر ہے اور یہ آیت اس تفسیر کی آخری آیت سے سولہ آیتوں کے بعد ملتی ہے۔

مذکورہ بالا عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یقیناً تفسیر فتح العزیز مکمل کر لی تھی، اسی لیے انھوں نے اس کے حوالے اپنے خطوط میں لکھے ہیں جو آج فتاوی کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

فتاوی عزیزی کی مندرجہ بالا عبارات کی تصدیق ایک دوسری کتاب سے ہوتی ہے، جس کا نام ہے افادات عزیزیہ[1]، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے شاگرد شاہ رفیع الدین مرادآبادی نے مختلف قرآنی موضوعات پر شاہ عبد العزیز صاحب کے خیالات کو خود شاہ عبد العزیز صاحب کی زندگی ہی میں ایک جگہ کتابی صورت میں جمع کیا تھا، جس کا نام انھوں نے "افادات عزیزیہ" رکھا تھا، یہ خیالات زیادہ تر خود شاہ صاحب کی ہی عبارت میں تھے، جو انھوں نے شاہ رفیع الدین صاحب کو خطوط کی شکل میں لکھے تھے۔ اس کتاب کے مقدمے میں یہ عبارت ملتی ہے:

"فرید دہر و وحید عصر...... شاہ عبد العزیز سلمہ اللہ تعالی..... بتفسیری مسمےٰ بفتح العزیز

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہی صاحب نے اس کتاب کا نام "اسولہ و اجوبہ" تحریر فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو ان کا مضمون سراج الہند حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی (الفرقان مئی ۱۹۶۰ء) حالانکہ اس کا اصل نام افادات عزیزیہ ہے۔ انھوں نے اس نسخہ کو مسلم یونیورسٹی کے کتب خانہ میں بھی بتلایا ہے، شاید دونوں کے سلسلے میں مولانا کو تسامح ہوا، دار العلوم ندوہ کے کتب خانے میں جہاں مولانا نے عبارت لی ہے، اس کے دو نسخے اسی افادات عزیزیہ کے نام سے موجود ہیں۔

"تالیف نمودہ و ہنوز مسودات آں بہ بیاض نرسیدہ و تحقیقات بسیار و لطائف بیشمار دراں محرر شدہ لیکن پنج علم باستقلال باں مخصوص است اول عنوانات سور، وضبط مضمون ہر سورہ اجمالاً، دوم ربط آیات بعضہا مع بعض، سوم متشابہات القرآن، چہارم اسرار القصص والاحکام، پنجم لطائف نظم قرآن، ومصنف سلمہ اللہ تعالیٰ بفقیر محمد رفیع الدین حبۃ حبۃ نمونہ از ہر پنج علم در مکاتیب نوشتہ وبعض سوالہا کہ فقیر ازاں استفسار نمودہ جوابہا آں در مکاتیب نوشتہ اند ہمہ آنرا دریں اوراق نقل کردہ شد۔"

مندرجۂ بالا عبارت سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن کی تفسیر لکھی تھی، ورنہ شاہ رفیع الدین صاحب اس کا ضرور ذکر فرماتے، یا کم از کم تفسیر کے متعلق وہ الفاظ نہ لکھتے جو انھوں نے لکھے ہیں، اس کے علاوہ خود اس کتاب میں شاہ عبدالعزیز صاحب کی تفسیر کی ان سورتوں کی تفسیر کے حوالے ملتے ہیں جو آج کل قلمی یا مطبوعہ شکل میں موجود نہیں ہیں جن سے اس کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر یقیناً مکمل کر لی تھی، اس کتاب کی اکثر عبارتیں عربی میں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ غالباً شاہ عبدالعزیز صاحب نے شاہ رفیع الدین صاحب کو جو خطوط لکھے تھے وہ عربی میں تھے، اسی لیے انھوں نے تفسیر فتح العزیز سے ضروری مقامات کا ترجمہ یا خلاصہ عربی ہی میں دیا ہے، اس کتاب کو دیکھنے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر فتح العزیز شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات سے بہت پہلے یعنی ۱۲۰۸ھ کے قریب مکمل ہو چکی تھی، اس لیے کہ افادات عزیزیہ کے مرتب شاہ رفیع الدین صاحب کا انتقال ۱۲۱۸ھ یا ۱۲۳۳ھ[1] میں ہوا ہے، اور خود اس

[1] ان کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے، تذکرہ علمائے ہند میں ۱۲۱۸ھ اور نزہۃ الخواطر میں ۱۲۳۳ھ ہے۔

اس کتاب کے اندر ایک دو جگہ جو تاریخیں ملتی ہیں، مثلاً ۱۰ صفر ۱۲۱۴ھ یا جمعہ ۱۹ صفر ۱۲۱۵ھ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تفسیر ۱۲۱۴ھ سے پہلے مکمل شکل میں تحریر ہو چکی تھی، جبھی شاہ صاحب ان کے حوالے ۱۲۱۵ھ کے خطوط میں دیتے ہیں۔[1]

---

[1] مولانا نسیم احمد فریدی امروہی صاحب اپنے حالیہ مضمون "سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا ملفوظات" میں جو جولائی کے الفرقان میں شائع ہوا ہے، ملفوظات کے مندرجہ ذیل قطعہ سے عجیب غریب نتیجہ نکالتے ہیں، وہ قطعہ یہ ہے:-

جامع علم و عمل شیخ الوری عبدالعزیز — آنکہ او اندر جوانی کار پیراں می کند

بسکہ استمداد دارد از سحاب معنوی — بحر مواج است چوں تفسیر قرآں میکند

اس قطعہ کا ترجمہ لکھنے کے بعد مولانا لکھتے ہیں:- "اس قطعہ سے معلوم ہوا کہ آپ نے تفسیر فتح العزیز جوانی کے زمانے میں لکھی تھی" (الفرقان جولائی ۱۹۶۶ء ص ۳۰)۔ پتہ نہیں مولانا نے آخری مصرعے سے تفسیر فتح العزیز کی تصنیف کا نتیجہ کیسے نکالا، اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جب قرآن شریف کی تفسیر بیان فرماتے ہیں تو گویا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر معلوم ہوتے ہیں، اس سے بیان تفسیر مراد ہے نہ کہ تصنیف، اگر مولانا کی رائے مان لی جائے تو شاہ عبدالعزیز صاحب نے خود مقدمے میں جو سنہ تالیف یعنی ۱۲۰۸ھ دیا ہے غلط ہو جائے گا اور مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کی یہ بات بھی غلط ہو جائے گی کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی جو ابھی بیاض تک نہیں پہنچی ہے، شاہ رفیع الدین صاحب نے ۱۲۰۳ھ میں سفر حرمین سے واپسی کے بعد افادات عزیزیہ کی ترتیب ۱۲۱۲ھ کے بعد کی ہے، اگر انھوں نے جوانی ہی میں اسے تحریر فرمایا تھا تو اس وقت تک تو پوری تفسیر شائع ہو جانی چاہیے تھی جبکہ تحفہ خود شاہ صاحب کے زمانے ہی میں شائع ہو گئی۔ اس کے علاوہ جوانی میں اگر تفسیر لکھی جاتی تو اس کے مقدمے میں صحت کی خرابی، مختلف بیماریوں کی وجہ سے ضعف ذہنی وغیرہ کا اس قدر شکوہ نہ فرماتے، اس لیے اس طرح کے نتائج نکالنے میں احتیاط کرنی چاہیے۔

اس کے علاوہ ایک اور قدیم اور نایاب تذکرہ یعنی مقالات طریقت کی روایت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تھی۔ مقالات طریقت میں صفحہ ۳۲ پر یہ عبارت ملتی ہے:۔

"حاجی محمد حسین صاحب سہارنپوری سلمہ اللہ تعالیٰ مولوی نور اللہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی ایک تفسیر تمام قرآن مجید کی اکبرآباد کے قاضی کے یہاں موجود ہے مگر وہ چھپی نہیں۔"

یہ ہیں دو طرح کی متضاد روایات جن سے ایک طرف یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر نہیں بلکہ شروع کے سوا پاروں کے قریب اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر لکھی اور دوسری طرف چند روایات ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے یقیناً پورے قرآن شریف کی تفسیر لکھی تھی، یہی نہیں بلکہ ایک ہی کتاب میں دو طرح کی باتیں ملتی ہیں، مثلاً مقالات طریقت میں ایک روایت سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر مکمل نہیں کی تھی، اور مولانا حیدر علی فیض آبادی نے اس کا تکملہ کیا، دوسری طرف یہ روایت ہے کہ اکبرآباد کے قاضی کے یہاں پورے قرآن مجید کی تفسیر موجود ہے، مگر وہ چھپی نہیں؟ آخر یہ تضاد کیوں اور کیسے ہوا؟ اور ان متضاد روایات میں کس کو صحیح سمجھا جائے، اور ان میں کس طرح تطبیق دی جائے؟

اس سے پہلے کہ ہم اس تضاد کے وجوہ اور تطبیق کی صورتوں پر غور کریں، ایک اہم سوال کا جواب دینا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ اگر شاہ صاحب نے پوری تفسیر لکھی تو کیا ان کی مکمل تفسیر کا کوئی مطبوعہ یا قلمی نسخہ اس وقت کہیں پایا جاتا ہے؟ راقم الحروف کو ہندوستان کے بیشتر مشہور کتب خانوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، مگر کسی میں مکمل تفسیر نہ مل سکی۔ البتہ دو چیزیں ایسی ملیں جو شاہ صاحب کی تفسیر سے متعلق ہو سکتی ہیں، پہلی چیز ایک تفسیر کے چند صفحات ہیں جو قلمی شکل میں

کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ (ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب سابق ناظم ندوہ) کے کتب خانے نمبر ۱۰ کے تحت موجود ہیں، جو شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے نام سے منسوب ہے، یہ سورۂ مائدہ کی تیسری آیت سے ۳۷ ویں آیت تک کی تفسیر پر مشتمل ہے، اور مخطوطہ کے آخر میں یہ عبارت درج ہے:-

"تمام شد تفسیر چند آیات سورہ مائدہ تصنیف شاہ عبد العزیز محدث دہلوی ہشتم جمادی الاول روز پنجشنبہ در لکھنؤ در محل نصاری ۱۲۸۷ھ، الحمد للہ رب العلمین صلوۃ اللہ وسلامہ علی محمد خیر خلقہ واصحابہ اجمعین۔"

دوسری چیز ایک مطبوعہ تفسیر تفسیر عزیزی المعروف بہ وعظ عزیزی ہے، یہ تفسیر مجھے اپنے ایک محترم بزرگ مولانا مسیح الزمان صاحب قاسمی کے ذاتی کتب خانہ میں ملی ہے، جو سورۃ المومنون سے لیکر سورۂ یٰسین تک کی فارسی تفسیر اور ۲۵۹ صفحات پر مشتمل ہے، یہ کتاب مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، مگر سنہ طباعت درج نہیں ہے، البتہ کتاب کے مقدمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تیرہویں صدی ہجری کے نصف آخر میں شائع ہوئی ہے، اس وعظ کے مرتب شاہ صاحب کے ایک شاگرد مولانا ابو الفرید امام الدین[1] صاحب ہیں، چنانچہ شروع میں اپنے حالات اور شاہ صاحب سے اپنا تلمذ اور شاہ صاحب کے سلسلے میں ایک مثنوی لکھنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"چوں معمول قدیم آں سر حلقہ ورثۃ الانبیاء بود کہ روز سہ شنبہ وجمعہ درس قرآن

---

[1] مولانا سید عبد الحئی لکھنوی صاحب نزہۃ الخواطر میں ان کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ شاہ صاحب کی نسبت کی وجہ سے ان کا لقب بھی حجۃ اللہ پڑ گیا تھا، اس لیے کہ شاہ صاحب کو اس وقت لوگ حجۃ اللہ کہا کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو نزہۃ الخواطر جلد ۷ ص ۷۰-۷۱) ان ہی امام الدین صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی بہت سی شاہ صاحب کی کتابیں رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں۔

وحدیث میفرمود و ربط سور و آیات یک دگر بصد ہزار نکات بتوضیح تام دلنشین ہر خاص و عام شدی و اسرار احادیث علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مشتمل بر تمام مفہوم ہر وضیع و شریف گشتہ بندہ بہ تحریر تقریر دلپذیرش کمر ہمت چست بر بستم و باین سعادت عظمیٰ از سورہ مومنون تا والصافات بہرہ ور گشتم، چون کل امر مرہون باوقاتہا در سنہ یکہزار و دو صد و پنجاہ و نہ ہجری مسودہ مذکورہ را نظر ثانی نمودم و مرۃ بعد اولیٰ بر تسویدش زنگ حسرت از دل احبا زدودم۔ ابیات

شنیدم آنچہ در ہر درس تقریر — نمودم جستہ جستہ تحریر
ندارم خواہش اجرت من از کس — امید اجر دارم از خدا بس

اس کتاب کو دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ درحقیقت یہ شاہ صاحب کے درس کے نوٹ ہیں جنھیں امام الدین صاحب نے دوران درس میں قلمبند کیا ہے، اسی وجہ سے مفصل نہیں ہو مگر انداز بالکل وہی ہے جو تفسیر فتح العزیز کا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ فتح العزیز مفصل ہے اور مستقل تصنیف اور وعظ عزیزی ان کے درس کا خلاصہ ہے۔

وعظ عزیزی میں ایک بات قابل ذکر یہ ہے کہ فتاوی عزیزی میں جو عبارتیں تفسیر فتح العزیز سے متعلق ملتی ہیں، جن میں سے چند کا ذکر ہم نے شروع میں کیا ہے، وہ عبارتیں اس وعظ عزیزی سے ماخوذ نہیں ہیں، گو وعظ عزیزی میں بھی بعض اس طرح کی باتیں ملتی ہیں مگر بہت مختصر اور الفاظ بھی بالکل مختلف ہیں، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عبارتیں اسی سے لی گئی ہیں۔

اس سے ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شاہ صاحب نے غالباً اپنے درس میں پورے قرآن مجید کی تفسیر فرمادی تھی جس کا ایک حصہ امام الدین صاحب نے قلمبند کر لیا تھا جو شائع ہوگیا ہے

ممکن ہے ان کے شاگردوں میں سے کسی اور نے بھی اس طرح سے درس کے نوٹ لیے ہوں، اسکے بعد شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید یا کم از کم اس کے زیادہ حصے کی تفسیر درس میں یا وعظ میں فرمادی ہو، تو یہ بات قرین قیاس ہے کہ بعد میں لوگوں کے اصرار پر اسے املا بھی کرا دیا ہو، جبکہ واقعہ بھی ہے، کیونکہ تفسیر فتح العزیز جو اس وقت مطبوعہ شکل میں موجود ہے وہ املا ہی ہے۔[1]

اب آیئے خود تفسیر فتح العزیز کے مقدمے کو دیکھیں، اس مقدمے میں شاہ صاحب حمد وثنا اور اپنا تعارف جیسا کہ کتاب کے شروع میں لکھا جاتا ہے، کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:-

"در سنہ یکہزار و دو صد و ہشت از ہجرت مقدسہ نبویہ علی صاحبہا الف الف صلوٰۃ و الف الف تحیۃ بجاذبہ شوق و داعیہ عزم برادر دینی جوہر نتیجہ حق گزینی سالک راہ خدا[2]

---

[1] پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب تاریخ مشائخ چشت میں صفحہ ۲۰۹ پر فرماتے ہیں کہ "مسلم یونیورسٹی لائبریری کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں "تفسیر عزیزیہ" کا ایک قلمی نسخہ (کتبہ ۱۲۳۶ھ) ہے، شیخ مصدق الدین جو شاہ فخر صاحب کے مرید تھے شاہ عبدالعزیز صاحب کے درس تفسیر میں شریک ہوتے تھے اور جو کچھ سنتے تھے "لفظ بلفظ اوراد سلک تحریر کشیدہ" (ص ۲) حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے جب اس مجموعہ کو ملاحظہ فرمایا تو ایک مقدمہ لکھا" پتہ نہیں پروفیسر نظامی صاحب نے یہ کیسے نتیجہ نکالا کہ شیخ مصدق الدین صاحب جو کچھ شاہ صاحب کے درس میں سنتے تھے اس کو لکھتے گئے اور بعد میں اس مجموعے کو دیکھ کر شاہ صاحب نے اس پر مقدمہ لکھ دیا، حالانکہ خود اس مخطوطے میں اور اسی طرح اور تمام مطبوعہ نسخوں میں لفظ بلفظ اوراد سلک تحریر کشیدہ سے پہلے یہ عبارت بھی موجود ہے ... "تفسیر بلغت فارسی بحسب روزمرہ متعارف این دیار و استعمال تمثیلات رائجہ این روزگار و حذف تطویلات لاطائل اہل عربیت واسقاط توجیہات بعیدہ مبنیہ بر روایات بے وثاق املا نمودہ و آں برادر دینی لفظ بلفظ اوراد سلک تحریر کشیدہ" نظامی صاحب کو شاید اس سلسلے میں سہو ہوا۔ [2] نظامی صاحب، مشائخ چشت میں اسی صفحہ پر یہ بھی کہ قبلہ باسعود کے عہدیہ تحریر فرماتے ہیں" اس میں ایک جگہ مصدق الدین کی شاہ فخر صاحب سے نسبت ملامت کا ذکر ہے یہ ... کا ... تمام

جوہی ملازم طریقۂ صدق گوئی مقبول جناب عالی قباب خلائق مآب مولانا و بالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس سرہ الامجد شیخ مصدق الدین عبد اللہ وفقہ اللہ لما یحب و یرضاہ ..... کہ اوقات پاس بعضے معانی سورۂ فاتحۃ الکتاب و دو نیم پارہ آخریہ از حضرت قرآن مجید نفعنا اللہ بآیاتہ فی الدنیا والآخرۃ کہ اکثر مسلمین در صلوٰۃ خمسہ و جمعہ و جماعات و محاضر ارواح مقدسہ انبیاء و اولیاء و زیارت قبور صلحاء و عرفا بتلاوت ایں سور باتشرف و استعداد می نمایند و متعطش بدریافت مضامین آنہا بہم میرسانند و ثانیاً باستیناف از سورہ بقرہ کہ بحکم ؎

شربت الحب کاساً بعد کاس — فما نفد الشراب ولا رویت

مزید رغبت بجمل حقایق و دقایق کلام الٰہی قرار دادہ تفسیرے بلغت فارسی بحسب محاورہ متعارف ایں دیار و باستعمال تمثیلات رائگاں ایں ... و ذکر و حذف تطویلات لا طائل ... عربیت و استعداد توجیہات بعیدہ مبنیہ بر روایات بے وثاق املا نمود"

اگر مقدمے کی مندرجۂ بالا عبارت کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے دو اہم نتائج نکلتے ہیں

(۱) یہ مقدمہ اس وقت لکھا گیا ہوگا جب تفسیر موجودہ صورت میں لکھ کر تیار ہو گئی ہوگی۔

(۲) کم از کم سورہ بقرہ کی تفسیر مکمل لکھی گئی ہوگی۔

(بقیہ حاشیہ ص ۲۲۸) "برادر دینی جوہر...... حق گزینی، سالک راہ خداجوئی، ملازم طریقۂ صدق گوئی مقبول جناب مولانا عالی، جناب خلائق مآب و بالفضل اولانا فخر الملۃ والدین محمد قدس سرہ الامجد"

اس سلسلے میں بھی غالباً نظامی صاحب کو غلط فہمی ہوئی ہے کیونکہ برادر دینی سے صدق گوئی تک کی عبارت شیخ مصدق الدین صاحب کی تعریف میں ہے۔ اس کے بعد مولانا عالی قباب سے شاہ فخر صاحب کی نسبت ذکر ہے۔ اصل مسودہ میں عبارت "مقبول جناب مولانا عالی قباب" ہے نہ کہ "عالی جناب"۔

مگر عجیب اتفاق ہے کہ تفسیر فتح العزیز کے پہلے حصے کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی بھی صورت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ تفسیر سورہ بقرہ کے ۲۳ ویں رکوع کی دوسری آیت کی تفسیر کرتے کرتے اچانک ختم ہو جاتی ہے، حتی کہ آخری جملہ بھی مکمل نہیں ہو سکا، وہ آخری اور نامکمل جملہ یہ ہے:

"و در ترمذی و نسائی و دیگر کتب معتبرۂ حدیث از آنحضرت صلعم روایت آورده که حق تعالیٰ حضرت یحییٰ پیغمبر را پنج چیز حکم فرموده بود که خود ہم بداں عمل نماید و بنی اسرائیل را نیز بفرماید تا موافق آں عمل کنند حضرت یحییٰ علیہ السلام بنا بر تمرد بنی اسرائیل در اظہار آں احکام توقف فرمودند حضرت عیسیٰ علیہ السلام را وحی شد کہ بحضرت یحییٰ بگویند کہ حق تعالیٰ شما را"

اس سلسلہ میں اگر یہ کہا جائے کہ شاہ صاحب نے صرف اتنی ہی تفسیر لکھی تھی جتنی کہ آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے، تو شاید اس کا کوئی جواب نہیں ہے، کہ شاہ صاحب نے اس رکوع یا کم از کم اس آیت ہی کی تفسیر کیوں نہ مکمل کر دی، جسے انھوں نے شروع کیا تھا، یا آخری جملہ کیوں نہ مکمل کر دیا جس کا بڑا حصہ لکھ چکے تھے؟ اس کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کے بعد شاہ صاحب اچانک بیمار پڑ گئے اور اس کے بعد انتقال ہو گیا ہوگا، اس لیے کہ خود اس مقدمے کے مطابق شاہ صاحب نے یہ تفسیر ۱۲۰۸ھ میں لکھی اور شاہ صاحب کا انتقال اس کے ۳۱ برس کے بعد ۱۲۳۹ھ میں ہوا، اس اکتیس سال کے دوران اتنا تو بہرحال ہو سکتا تھا کہ وہ جملہ یا وہ رکوع مکمل کر سکتے تھے، حالانکہ مقدمہ کو لکھنے سے پہلے امید یہی کی جاتی ہے کہ شاہ صاحب نے سورہ بقرہ تو ختم ہی کر لی ہوگی اس لیے کہ نا تمام جملہ لکھ کر یہ طے کر لینا کہ اب اس کے آگے نہ لکھا جائیگا اور مقدمہ لکھ کر بات ختم کر دینا کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ شاہ صاحب کی تصانیف کے اصل یا کم از کم ان کے زمانے کے قلمی نسخے نہیں ملتے، جو بھی ملتے ہیں سب بعد کے ہیں، مجھے اس سلسلے میں سب سے قدیم جو قلمی نسخہ تفسیر فتح العزیز کا مل سکا ہے وہ سنہ ۱۲۴۹ھ کا مکتوبہ ہے، یہ نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ذخیرہ سر شاہ سلیمان میں محفوظ ہے، اس کے مقدمے میں سورہ بقرہ کی تفسیر سے متعلق جو جملہ عام طور پر مطبوعہ نسخوں میں ملتا ہے، مجھے نہیں ملا جس سے اور شبہہ پیدا ہوا، بلکہ یقین سا ہو چلا ہے کہ شاید یہ جملہ بعد میں بڑھایا گیا ہے،

تفسیر فتح العزیز کے سلسلے میں مذکورہ بالا حقائق کو سامنے رکھکر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

شاہ عبد العزیز صاحب نے جیسا کہ مقدمہ سے ظاہر ہے، غالباً پہلے سورہ فاتحہ اور آخر کے دو پاروں کی تفسیر شیخ مصدق الدین کو املا کرائی، مگر بعد میں لوگوں کے اصرار پر یہ خیال ہوا ہوگا کہ پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے، چنانچہ انھوں نے سورہ بقرہ سے اس کو شروع کیا اور اٹھائیسویں پارے کے آخر تک پوری تفسیر لکھوا دی، پھر مختلف عوارض نے اس کام پر نظر ثانی کرنے اور اس کو آخری شکل دینے کی مہلت نہ دی اور معاملہ آجکل پر ٹلتا رہا، مگر تفسیر کا پہلا مسودہ تیار ہو چکا تھا، اس لیے اپنے خطوط میں اپنے احباب کو اس کا حوالہ دیتے رہے، جیسا کہ فتاوی کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ شاہ رفیع الدین مراد آبادی نے بھی یہی لکھا ہے کہ شاہ صاحب نے تفسیر لکھی مگر وہ مسودہ بیاض تک نہیں پہنچا یعنی آخری شکل میں نہیں آیا، مگر مسودہ پورا ہو چکا تھا اس لیے شاہ صاحب اس کے اقتباسات اپنے احباب کو عند الضرورت لکھ دیتے تھے، لیکن مسودہ آخری شکل میں نہیں آیا تھا، اس لیے سب لوگوں تک یہ کتاب نہیں پہنچ سکی اور اس کی مختلف کاپیاں نہ ہو سکیں، غالباً شاہ صاحب کا خیال رہا ہوگا کہ اگر طبیعت سنبھل گئی تو اس پر نظر ثانی کر کے آخری شکل دیدیں گے، مگر اس کا موقع نہ مل سکا، اور یہ مسودہ آخری وقت تک اسی شکل میں پڑا رہا، اور لوگوں کو اس کا علم نہ ہو سکا، اسی لیے اکثر

تذکرہ نگاروں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، صرف چند لوگوں ہی کو اس کا علم تھا، اسی درمیان میں غالباً یہ بھی ہوا کہ شاہ صاحب کی وفات اور پھر شاہ اسحٰق صاحب اور شاہ محمد یعقوب صاحب کی ہجرت کے بعد یہ اصل مسودہ کسی طرح ضائع ہو گیا، اور اس کا صرف اتنا ہی حصہ مل سکا جو آج مطبوعہ شکل میں موجود ہے، غالباً یہی وجہ اس آخری جلد کے نامکمل رہ جانے کی ہے، ممکن ہے اس کی کوئی کاپی مقالات طریقت کے شائع ہونے کے وقت تک جیسا کہ خود اس کے مصنف کا خیال ہے اکبر آباد کے قاضی کے یہاں موجود رہی ہو، مگر ناشروں کو صرف نامکمل اور ناقص کاپی مل سکی اسی کو انھوں نے شائع کر دیا، پورا مسودہ کچھ دنوں میں ضائع ہو گیا، اور چونکہ سورہ بقرہ کی اس آیت کے بعد سے تفسیر کا کوئی حصہ نہ مل سکا اس لیے غالباً نواب سکندر جہاں بیگم نے مولانا حیدر علی فیض آبادی سے اسکا تکملہ لکھوایا، بہرحال جو صورت بھی ہوئی ہو، اغلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، اس کے بعد کیا ہوا، اس کا صحیح علم نہ ہو سکا، اس لیے اس سلسلے میں قیاس ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مولانا سید عبد الحی صاحب سابق ناظم ندوۃ العلما لکھنؤ کے سامنے بھی غالباً مذکورہ بالا شواہد اور قرائن تھے، جن کی بنا پر انھوں نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب نے قرآن مجید کی پوری تفسیر لکھی تھی جس کا بیشتر حصہ غدر کے دوران ضائع ہو گیا، وہ اپنی معرکۃ الآرا تصنیف نزہۃ الخواطر میں لکھتے ہیں:

واما مصنفاته فأشهرها تفسير القرآن المسمى بفتح العزيز صنفه في شدة المرض وتوقي الضعف املاءً وهو في مجلدات كبار... ضاع معظمها في ثورة الهند وما بقي منها الا مجلدان من اول وآخر۔

(نزہۃ الخواطر، جلد ۷، ص ۲۷۳)

انکی تصنیفات میں سب سے مشہور انکی قرآن شریف کی تفسیر ہے جس کا نام فتح العزیز ہے، اس تفسیر کو انھوں نے سخت بیماری اور ضعف کے زمانے میں املا کرایا تھا اور وہ ضخیم جلدوں پر مشتمل تھی... جس کا بیشتر حصہ ہندوستان کے انقلاب میں ضائع ہو گیا اور صرف شروع اور آخر کی جلدیں باقی رہ گئیں۔

ادبیات

غزل

از جناب حبیب احمد صاحب ممبر پبلک کمیشن

غم کیا جو اپنے جیب میں اک تار بھی نہیں
یہ غیرتِ جنوں کو سزاوار بھی نہیں

دل میں ہمارے اب خلشِ خار بھی نہیں
شاید ہمیں گلوں سے سروکار بھی نہیں

کیا جانیں ہم سے کس لیے دامن کشاں ہیں وہ
مدت سے ہم کرم کے طلبگار بھی نہیں

کچھ وجہ فخر ہو تو کرے کوئی فخر بھی
عرصے سے اب تو چشمکِ اغیار بھی نہیں

کیوں چرخِ فتنہ گر نے ہمیں منتخب کیا
ایسی تو ہم سے رونقِ بازار بھی نہیں

کمیابیٔ متاعِ محبت کا کیا ملال
دیکھا تو کوئی اس کا خریدار بھی نہیں

دنیا میں زندگی سے نہیں مطمئن کوئی
دنیا میں کوئی جینے سے بیزار بھی نہیں

اب اپنے منہ سے کیا کہیں اسکے سوا کہ ہم
زاہد نہیں تو ایسے گنہگار بھی نہیں

کچھ یہ بھی ہو کہ اس نے نہ پوچھا ہمارا حال
کچھ یہ بھی ہے کہ لائقِ اظہار بھی نہیں

اب دل میں آرزوئے گل و یاسمن کہاں
اب ذہن میں تصورِ گلزار بھی نہیں

کیوں ہے زمانہ برسرِ پیکار اے خدا
اب تو ہمارے ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

غزل

از

جناب ڈاکٹر ولی الحق صاحب انصاری

مردانِ کار ہوتے ہیں مرعوبِ زر کہیں
پیشِ بتانِ آذر بھی جھکتے ہیں سر کہیں ؟

پاتے ہیں چین آپ کے شوریدہ سر کہیں
جاتی بھی ہے یہ سوزشِ قلب و جگر کہیں ؟

کرنے لگے نہ کام زبان کا نظر کہیں
پردہ نہ دل کا فاش کرے چشمِ تر کہیں

غیرت کا نام لیتا ہے دریوزہ گر کہیں
دستِ طلب کے ساتھ بھی اٹھتا ہے سر کہیں

فکرِ علاج وہ بھی علاجِ مریضِ دل
دیوانہ ہو نہ جائے مرا چارہ گر کہیں

وہ آگ جس سے میرا نشیمن جلا ہے آج
کل پھونک دے نہ باغ کا اک اک شجر کہیں

خود خواہشِ ہلاکتِ دل کا سبب نہ ہو
خود سوئے دام لے نہ چلیں بال و پر کہیں

اخفائے رازِ عشق اک امرِ محال ہے
چھپتی بھی ہے پیار میں ڈوبی نظر کہیں

آنکھوں سے پھر ٹپکنے لگے ہیں لہو کے بوند
پھر چبھ رہا ہے دل میں کوئی نیشتر کہیں

اب گردشِ مدام سے[1] گھبرا چکا ہے دل
شامِ غمِ حیات کی ہو بھی سحر کہیں

یادش بخیر ہم بھی گلستان میں تھے کبھی
اپنا بھی آشیاں تھا کسی شاخ پر کہیں

دار و رسن کی پھر سے ہیں تیاریاں ولیؔ
پھر لب کشا ہوا ہے کوئی باخبر کہیں

---

[1] غالب سے معذرت کے ساتھ۔

مطبوعات جدیدہ

نذر عرشی - مرتبہ جناب مالک رام و مختار الدین احمد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہایت عمدہ، صفحات ۵۷۰ مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں، پتہ: مجلس نذر عرشی، نئی دہلی۔

مشہور مصنف اور فاضل محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی اکسٹھویں سال گرہ کے موقع پر ان کے احباب اور قدر دانوں نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں یہ نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، اس میں عرشی صاحب کے علمی خدمات و کمالات اور دوسرے علمی موضوعوں پر ہند و پاک کے نامور اہل قلم کے مضامین ہیں، بیشتر مضامین اردو اور چند انگریزی کے ہیں، مضمون نگاروں میں ڈاکٹر محمد حمید اللہ، ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی، ڈاکٹر سید عبد اللہ، ڈاکٹر شوکت سبزواری، مسعود حسین رضوی، مولانا سعید احمد اکبرآبادی، آل احمد سرور، شبیر احمد خاں غوری اور پروفیسر خلیق احمد نظامی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، شروع کے چار مضامین میں عرشی صاحب کی سیرت و شخصیت اور کمالات کی عکاسی کی گئی ہے، مالک رام صاحب نے ان کے خاندانی حالات و سوانح حیات کا جامع تذکرہ، اور سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب نے علمی و ادبی کمالات کا مفصل جائزہ لیا ہے، اکبر علی خاں صاحب نے عرشی صاحب کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مضامین و تصنیفات کی تاریخ وار فہرست اور ہر ایک کا مختصر تعارف کرایا ہے، یہ رسم یورپ کی ایجاد ہے مگر مفید ہے، اس سے اہل کمال کے اعتراف کے ساتھ ایک مفید علمی مجموعہ مرتب ہو جاتا ہے،

یہ مجموعہ ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

نذرِ رحمٰن ۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، ترین ٹائپ صفحات ۴۰۰، مصور، مجلد مع گرد پوش، قیمت تحریر نہیں،

پتہ: مجلس نذرِ رحمٰن، لاہور۔

یہ بھی نذرانۂ عقیدت ہے، جو پاکستان کے جسٹس شیخ عبد الرحمٰن کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے، جسٹس موصوف تنہا ماہرِ قانون ہی نہیں، علم و ادب کا بھی بلند مذاق رکھتے ہیں، وہ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہ چکے ہیں اور متعدد علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں کے سرپرست ہیں، ان خدمات و کمالات کے اعتراف میں انکے احباب عقیدتمندوں نے یہ علمی ارمغان انکی خدمت میں پیش کیا ہے، اس میں جسٹس رحمان کے ذاتی حالات و کمالات کے علاوہ مفید اور اہم علمی موضوعوں پر پنجاب کے مشاہیر اہلِ قلم کے مضامین ہیں۔ دو مضمون "مسلمان اور تاریخ سائنس" اور "سعدی معلم اخلاق کی حیثیت سے" انگریزی، ایک مضمون "تلفظ ایرانی در اشعار امیر خسرو" فارسی اور باقی سب اردو میں ہیں، ان میں "ابن عربی کا فلسفہ" بشیر احمد ڈار، "یائے نسبت اردو میں"، ڈاکٹر شوکت سبزواری "خط کی کہانی مخطوطات کی زبانی"، ڈاکٹر سید [illegible] حسین "ظفر خان اور اس کا مصور کلام"، ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی "شخصیات کلامِ اکبر کے آئینہ میں"، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں، آخر میں تین مختلف عنوانات کے تحت اشعار کا انتخاب ہے، شروع میں ڈاکٹر سید عبد اللہ نے اپنے دلچسپ و شگفتہ مضمون میں شیخ صاحب کی سیرت و شخصیت کے بعض پہلوؤں کو دکھایا ہے، یہ مجموعہ بھی علمی حیثیت سے مطالعہ کے لائق ہے۔

برنامج شیوخ الرعینی ۔ تالیف ابو الحسن علی بن محمد رعینی اشبیلی، ترتیب ابراہیم شبوح، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۰۰، قیمت ۳ لیرات، پتہ: وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، دمشق۔

ساتویں صدی ہجری کے فاضل و مصنف ابو الحسن علی بن محمد بن علی اشبیلی رعینی المعروف بابن فخار نے اس کتاب میں اپنے شیوخ کا تذکرہ لکھا ہے، اس کے دو قلمی نسخے خیر الدین زرکلی اور اسکوریال کے کتب خانوں میں تھے، ان کی مدد سے دمشق کے استاذ ابراہیم شبوح نے اس کو ایڈٹ کرکے شائع کیا ہے، اس میں رعینی نے ۱۱۲ اصحاب علم و فن سے اپنے استفادہ، ان سے روایت کی اجازت اور ان کے مختصر تذکرے اور کمالات بیان کیے ہیں، اس سلسلہ میں مغرب کے بہت سے قراء، محدثین، مفسرین، فقہا، نحاۃ، علمائے لغت و ادب اور شعراء مختلف طبقوں کے لوگوں کا ذکر آگیا ہے، اس کتاب سے اس عہد کی تہذیب، طرز تعلیم، مختلف اساتذہ کے طریقۂ درس اور دوسرے متعدد مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، شروع میں مقدمہ کے اندر کتب برامج کی قسموں اور ان کی تصنیف کے مختلف طریقوں، رعینی کے حالات، اس کتاب اور اس کے دونوں مخطوطات کے متعلق معلومات درج ہیں، ہر نسخہ کے کئی صفحوں کے عکسی فوٹو اور مختصر حواشی میں اختلاف نسخ، بعض دقیق الفاظ کے معنی اور صاحب ترجمہ کے حالات کے لیے دوسری کتابوں کے حوالے دیے گئے ہیں، آخر میں مختلف فہرستیں ہیں۔

سیرت بایزید۔ مرتبہ جناب پروفیسر فضل احمد عارف ایم اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۷۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت [illegible]۔ پتہ: سنگ میل پبلی کیشنز چوک اردو بازار، لاہور ۲۰

اس کتاب میں تیسری صدی ہجری کے مشہور بزرگ اور عارف باللہ حضرت بایزید بسطامیؒ کے پاکیزہ سیرت و سوانح اور عشق و محبت الٰہی کے موثر واقعات تحریر کیے گئے ہیں، یہ تین حصوں میں ہے، پہلے میں ان کے خاندان، تعلیم و تربیت، ریاضات و مجاہدات، ولایت، احترام و اتباع شریعت اور اخلاق و عادات کا مرقع پیش کیا گیا ہے، دوسرے میں ان کے ممتاز معاصر

صوفیا اور مسترشدین کے اعترافات سے ان کی عظمت و مقبولیت دکھائی گئی ہے، اور حضرت بایزیدؒ سے ان کے استفادہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے، تیسرے میں ان کے اعمال و اشغال اور اقوال و احوال کی تفصیل ہے، اردو میں حضرت بایزیدؒ کے حالات میں یہ پہلی مفصل و مستند کتاب ہے، فاضل مرتب کو صوفیا سے گہرا تعلق ہے اور وہ خود بھی بادۂ تصوف کے لذت شناس ہیں، اس کا اثر اس کتاب میں نمایاں ہے۔

تذکرۃ الموتیٰ والقبور ۔ تصنیف قاضی ثناء اللہ پانی پتی، ترجمہ مولانا اقبال الدین احمد
کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۰۴، قیمت عہ، پتہ: واحد بک ڈپو جونا مارکیٹ
کراچی نمبر ۲۔

ہندوستان کے مشہور عالم اور نامور فقیہ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی مرحوم کے مشہور فارسی رسالہ تذکرۃ الموتیٰ والقبور کا اردو ترجمہ ہے جو عالم آخرت کی پہلی منزل یعنی موت و قبر کے احوال و امور سے متعلق روایات و احادیث اور ان کے تشریح و افادہ پر مشتمل ہے، گو اس میں بعض غیر مستند حدیثیں بھی نقل ہو گئی ہیں اور تشریح میں صوفیا کے بعض شطحیات کا بھی ذکر ہے، تاہم زیر بحث مضمون کی اکثر متفرق حدیثوں کو جو جدا جدا ابواب میں مختلف کتابوں کے اندر منتشر تھیں، اس میں یکجا کر دیا گیا ہے، ان کی واقفیت ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے۔

مشکوٰۃ الانوار ۔ از امام غزالیؒ، ترجمہ مولانا حبیب الرحمن صدیقی، متوسط تقطیع،
کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت عمر، پتہ: واحد بک ڈپو جونا مارکیٹ
کراچی نمبر ۲۔

یہ رسالہ امام غزالیؒ کے ایک رسالہ کا جو انھوں نے انوار الٰہی کے متعلق ایک سائل کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، اردو ترجمہ ہے، یہ تین ابواب میں منقسم ہے، پہلے باب میں نور خدا اور نور کی تشریح

اس کی حقیقت و اقسام اور دوسرے نکات و فوائد بیان کیے گئے ہیں، دوسرے میں سورۂ نور کی آیت اللہ نور السموات والارض الخ کی توضیح، اس کی تمثیل کے رموز و اسرار اور مشکوٰۃ، مصباح و زجاجہ کی تشریح کی گئی ہے، تیسرے باب میں ایک حدیث ان اللہ سبعین حجابا الخ کی وضاحت ہے، امام صاحب کی دوسری تصنیفات کی طرح یہ رسالہ بھی علمی و قائق پر مشتمل اور فلسفیانہ و متصوفانہ انداز میں لکھا گیا ہے، اس لیے خواص ہی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ ترجمہ سلیس ہے۔ فاضل مترجم نے حواشی میں کہیں کہیں مصنف کے نقطۂ نظر سے اختلاف، ان کے مبہم خیالات کی توضیح اور رسالہ میں درج روایات کی قوت و ضعف کا بھی ذکر کیا ہے۔

درج الدرر فی احادیث خیر البشر - مرتبہ حافظ علی احمد صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ناظم مکتبہ الحسن بازار یکہ توت۔ پشاور شہر۔

حضرت سید شاہ محمد غوث پشاوریؒ (م ۱۱۵۲ھ) ایک صاحب سلوک و ارشاد بزرگ اور باکمال محدث و مصنف تھے، ان کی علمی یادگاروں میں ایک مختصر عربی رسالہ اصول حدیث ہے، اس کو صاحبزادہ حافظ علی احمد صاحب نے مزید اضافوں کے ساتھ اردو میں شائع کیا ہے، اس کے پہلے حصہ میں اصول و اصطلاحات حدیث کی تعریف کی گئی ہے، اور کتب حدیث کے اقسام و طبقات کا ذکر کیا گیا ہے، نیز باہم مشابہ اور ہمنام رواۃ کا التباس رفع کیا گیا ہے، اور معلم و متعلم حدیث کے آداب بیان کیے گئے ہیں، دوسرے میں چند اکابر محدثین اور ائمۂ فن کا مختصر تذکرہ ہے، آخر میں شاہ محمد غوث کے عربی رسالہ کا متن اور ان کے مختصر حالات تحریر کیے گئے ہیں، یہ رسالہ حدیث و اصول حدیث کے متعلق بڑے مفید اور ضروری معلومات پر مشتمل ہے اور فن حدیث کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے، لیکن زبان و بیان کا معیار پست ہے۔

آداب اردو۔ مرتبہ جناب حکیم کچھیں کرنالی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۲۰۸، قیمت ۶ روپیہ ۵۰ پیسہ، پتہ: اردو مشن، گلی تیراں والی، ملتان۔

حکیم کچھیں کرنالی صاحب نے صحیح اردو بولنے اور لکھنے کی تعلیم دینے کے لیے یہ مفید کتاب لکھی ہے، اس لیے اس میں اردو کے ضروری اصول و قاعدے مثلاً روزمرہ محاورہ، اردو میں غیر زبانوں کے الفاظ کے استعمال اور جمع بنانے کے طریقے، تذکیر و تانیث، صفت و اضافت اور دوسرے نحوی و صرفی مسائل، دوسری زبانوں کے اصطلاحی الفاظ کے اردو ترجمے، بعض الفاظ کی وضاحت و تحقیق، ان کے غلط استعمال کی تردید وغیرہ مختلف ضروری اور مفید باتوں کا ذکر کرکے تلفظ و صحتِ زبان کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، ایک مستقل عنوان کے تحت اردو کے بعض مشہور و مستند ادیبوں کے زبان و بیان پر نقد و احتساب کیا گیا ہے اور ان کی کتابوں کے غلط فقرے اور جملوں کی تصحیح کی گئی ہے، لیکن خود مصنف سے بھی فروگذاشتیں اور بعض الفاظ و جملوں کی وضاحت میں سہو ہوا ہے، ان کا نقد و احتساب بھی صحیح و غلط دونوں کا مجموعہ ہے، تاہم اس کتاب سے اردو کے متعلق گوناگوں اور مختلف مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں، اور مصنف کا مقصد بھی نیک ہے، یہ کتاب بخصوصیت زبان و ادب کے طلبہ کے مطالعہ کے لائق ہے۔

فروابِ فرتاب۔ از جناب برق موسوی صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۴۴، قیمت ۱۰ روپیہ، مرکز ادب حیدرآباد، آندھرا پردیش،

برق موسوی صاحب کہنہ مشق شاعر ہیں، یہ ان کی ۱۰۰ سے زائد رباعیوں کا مجموعہ ہے، جو زیادہ تر حکیمانہ خیالات، امن و صلح، محبت و اخوت اور وضعداری وغیرہ مفید مضامین پر مشتمل ہیں، رباعی میں جو ایک مشکل صنف سخن ہے، طبع آزمائی کرنا مصنف کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے، میر احمد علی قادری صاحب نے مقدمہ میں ان کی رباعی نگاری کے خصوصیات تحریر کئے ہیں۔

"ض"

جلد ۱۰۰ - ماہ جمادی الثانی و رجب المرجب ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۶۷ء - عدد ۴

مضامین

شذرات

یو، پی، بہار اور بعض دوسری ریاستوں میں جب سے جن سنگھ کا اقتدار قائم ہوا ہے اس نے حکومت کو اپنی پالیسی کے مطابق ڈھالنا اور منظم طریقہ سے مسلم کشی کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، اور اندیشہ ہے کہ یہ آگ پورے ملک میں پھیل جائیگی، جن سنگھ اور دوسری فسطائی جماعتوں کا نقطۂ نظر بالکل کھلا ہوا ہے، وہ سیکولرزم اور جمہوریت کو نہیں مانتیں، ان کا نصب العین ہندو حکومت کا قیام اور برہمنی تہذیب کا احیاء ہے، اس کا سب سے زیادہ نشانہ مسلمان ہیں، وہ ان کے وجود اور ان کی جانب منسوب ہر چیز کی دشمن ہے، اس کا سب سے آسان نسخہ پاکستان ہے جس کے نام سے وہ اکثریت کے جذبات کو بھڑکاتی رہتی ہے، درحقیقت اسکی مسلم دشمنی پاکستان کے قیام کا نہیں بلکہ اس فسطائی ذہنیت کا نتیجہ ہے جو اپنے علاوہ کسی فرقہ، کسی مذہب اور کسی تہذیب کو برداشت نہیں کر سکتی اور یہ ذہنیت بہت قدیم ہے، اسی نے ہندوستان کے اصلی باشندوں کو اچھوت بنایا جو آجتک مظلوم ہیں، اسی نے بدھ مت کا خاتمہ کیا اور ہندوستان سے اس کا نام و نشان تک مٹا دیا، پاکستان کا قیام بھی درحقیقت اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے، مگر انگریزی حکومت کے زمانہ میں یہ ذہنیت نہیں چل سکتی تھی، اس لیے دبی ہوئی، آزادی ملتے ہی ابھر آئی، یہ البتہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کے قیام نے اس میں اور شدت پیدا کر دی، اگر پاکستان نہ بھی بنتا تب بھی یہ ذہنیت موجود رہتی، لیکن ہے کہ اس کو زیادہ ابھرنے کا موقع نہ ملتا اور مسلمان اتنے بے بس نہ ہوتے، اور اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ مسلم دشمنی پاکستان ہی کے قیام کا نتیجہ ہے تو اس کا انتقام پاکستان والوں سے لینا چاہیے، ان پر تو بس نہیں چلتا، سارا نزلہ ہندوستان کے بے بس مسلمانوں پر گرتا ہے جو نہ بہادری ہے نہ شرافت، سب سے زیادہ لائق تعریف ہماری جمہوری اور سیکولر حکومت ہے جو آجتک اپنے شہریوں کے جان و مال کا تحفظ نہ کرسکی،

درحقیقت فرقہ پروری اور فسطائیت ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں اسلیے فسطائی ذہنیت محض مسلمانوں دشمنی تک محدود نہیں، کم و بیش تمام اقلیتیں اسکا شکار ہیں، حتی کہ سکھ بھی جو ہندو مذہب ہی کی ایک ترقی یافتہ شاخ ہیں، اس سے محفوظ نہیں، جہاں مذہب کا اختلاف نہیں ہے وہاں دوسری شکلوں میں یہ ذہنیت ظاہر ہوتی ہے، چھوت قومیں اس کے تحقیر آمیز سلوک اور جنوبی ہند والے لسانی اور تہذیبی جارحیت سے نالاں ہیں، مسلمان سب سے زیادہ اسلیے نشانہ ہیں کہ وہ اپنی تعداد کے اعتبار سے ایک پوری قوم اور اپنے مذہب اور تہذیب و روایات کے اعتبار سے ایک مستقل ملت اور اپنا انفرادی وجود رکھتے ہیں اسلیے فسطائی ذہنیت کی زد سب سے زیادہ انہی پر پڑتی ہے، اگر مسلمان درمیان میں نہ ہوں تو یہ مادہ آپس ہی میں پھوٹ نکلے اور اب بھی مختلف شکلوں میں پھوٹتا رہتا ہے، اسی ذہنیت نے پہلے بھی ہندوستان کو نقصان پہنچایا ہے اور آیندہ بھی اس کو متحد اور مستحکم نہ ہونے دے گا،

اس میں سب سے زیادہ قصور کانگریس اور اس کی حکومت کا ہے، جب اس فتنہ کو دبانے کا وقت تھا، اس وقت وہ عوام میں مقبولیت اور حکومت کی طمع میں اس کو اسقدر ڈھیل دیتی بلکہ پرورش کرتی رہی کہ فسطائی طاقتوں نے کانگریس اور حکومت میں گھس کر خود ان کو بدل دیا، بعض پرانے اور مخلص لیڈر خصوصاً پنڈت جواہر لال نہرو ان کے خلاف برابر آواز بلند کرتے رہے لیکن آخر میں وہ بھی انکے مقابلہ میں بے بس ہو گئے تھے، ان کے بعد خود حکومت نے اس کے سامنے سپر ڈالدی اور فسطائی جماعتوں کو مشیر بنا لیا، اسلیے انکو طاقت پکڑنے کا موقع مل گیا جس کا نتیجہ خود کانگریسی حکومت کو بھگتنا پڑا اور وہ دن دور نہیں جب جن سنگھ ریاستوں سے لیکر مرکزی حکومت تک پر قابض ہو جائے گی اور ہندوستان سے سیکولرزم اور جمہوریت کا خاتمہ اور پورا ملک انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو جائے گا، اس لیے اب یہ تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ سیکولرزم و جمہوریت اور ملک کے تحفظ و بقا کا مسئلہ ہے۔

مگر اب فسطائی طاقتیں اتنی قوت پکڑ چکی ہیں کہ انکا مقابلہ آسان نہیں ہے، اسکی صرف ایک ہی صورت ہے کہ

وہ تمام ترقی پسند پارٹیاں اور اقلیتیں جو سیکولرزم اور جمہوریت کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں، اسی سرفروشی اور ایثار وقربانی کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں جس طرح کانگریس نے انگریزی حکومت کا مقابلہ کیا تھا، وہ گاؤں گاؤں میں پھر کر اس مہم کو چلائیں اور اس راہ میں عوام میں مقبولیت اور حکومت کے اقتدار ہر چیز کی بازی لگادیں، اس وقت کامیابی کی کچھ امید ہوسکتی ہے محض زبانی تقریروں، بیانات اور قومی کمیٹی کی انجمنیں بنانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، مگر سوال یہی ہے کہ کیا اب بھی ہندوستان میں ایسی بے لوث اور ترقی پسند جماعتیں موجود ہیں، جو اس ایثار وقربانی کے لیے تیار رہوں، عوام میں مقبولیت اور حکومت کی چاٹ تو بڑی مشکل سے چھوٹتی ہے وقت آنے پر سب کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے، اس لیے ہندوستان میں سیکولرزم اور جمہوریت کا مستقبل بظاہر تاریک نظر آتا ہے۔

فرقہ پرور اور فسطائی جماعتوں کے حوصلے اس لیے اور بڑھ گئے ہیں کہ ان کو مسلمانوں کی جان ومال سے کھیلنے کی پوری آزادی ہے، ان کے لیڈر اور اخبارات مسلمانوں کے خلاف زہر پھیلاتے رہتے ہیں اور کوئی روکنے والا نہیں، فساد کے روکنے کا پہلے سے کوئی انتظام نہیں کیا جاتا، فساد کے موقع پر امن امان کے محافظ خود فریق بنجاتے ہیں، فساد میں مسلمان ہی تباہ وبرباد ہوتے ہیں اور الٹے وہی پکڑے جاتے ہیں، فسادیوں سے کوئی بازپرس نہیں ہوتی، چنانچہ آجتک کسی فساد میں مجرموں کو سزا نہیں ملی، ایسی حالت میں فساد ہونا نہیں بلکہ نہ ہونا تعجب انگیز ہے، اگر حکومت سنجیدگی سے فساد کو روکنا چاہتی ہے تو اس کو چاہیے کہ فرقہ پروروں کی زبان وقلم پر پابندی عائد کرے، فساد کے موقع پر حکام اور پولیس کی غفلت کی سختی سے بازپرس کیجائے، فسادیوں کا پتہ چلاکر ان کو پوری سزا دیجائے، فوج اور پولیس میں مسلمانوں کو بھرتی کیا جائے، اگر حکام اور پولیس دیانتداری سے اپنا فرض انجام دیں تو بڑی حد تک فساد کا خاتمہ ہوجائے یا کم ازکم وہ سنگین صورت اختیار نہ کرنے پائیں، اس کے بغیر محض اظہار افسوس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

مقالات

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

از
جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی ایم اے، فاضل دیوبند

(۲)

اہل کمال معاصرین کا خراج عقیدت
حقیقت یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ کے بعد ہندوستان کی سرزمین پر ایسا متقن، وسیع النظر محقق اور جامع عالم پیدا نہیں ہوا، اور ہندوستان اور پاکستان کے متاخرین محدثین میں ملا محمد عابد سندی المتوفی ۱۲۵۷ھ کے بعد سید انور شاہ کے سوا کوئی حافظ حدیث نہیں گزرا۔

علامہ موصوف بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے، اور اس دور میں اللہ تعالیٰ کی زبردست حجت اور برہان تھے، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں ایک موقع پر علامہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:-

سالت الشیخ العلامۃ التقی النقی	میں نے خدا ترس، پاک طینت، شیخ العلامہ
الذی لم تر العیون مثلہ ولم	انور شاہ جن کا مثل آنکھوں نے نہیں دیکھا
یر ھو مثل نفسہ ولو کان فی	اور نہ خود انھوں نے اپنا مثل دیکھا ہے

سالف الزمان لكان له شأن
فى طبقة اهل العلم عظيم وهو
سيدنا ومولانا الانور الكشميرى
ثم الديوبندى اطال الله بقائه
عن تفسير اوائل سورة النجم
وتحقيق روية النبى صلى الله عليه وسلم
ربه فقرر الشيخ تقريراً حسنا
بليغاً جامعاً لاشتات الروايات
واطراف الكلام منبهاً على اغوار
القرآن فالتمست منه ان يقيده
بالكتابة لتعم الفائدة فاستجاب
للمتمسى وعلى الله اجره مع وجود
الشواغل الكثيرة [1]

اگر وہ گذشتہ زمانے میں ہوتے تو اہل علم
کے طبقہ میں ان کا بڑا مرتبہ ہوتا، وہ ہمارے
سردار مولانا انور شاہ کشمیری ثم دیوبندی
ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں تا دیر قائم رکھے
میں نے ان سے سورۂ النجم کی ابتدائی
آیتوں کی تفسیر اور رسالتمآب صلی اللہ
علیہ وسلم کے دیدار الٰہی کی تحقیق کے متعلق
درخواست کی تھی جس کو انھوں نے شرف
قبول بخشا اور نہایت نفیس اور فصیح و
بلیغ تقریر کی جس میں متفرق روایات
اور بحث کے تمام گوشوں کو سمیٹ
لیا ہے، اور قرآن مجید کی گہرائیوں پر
تنبیہ فرمائی ہے پھر میں نے ان سے درخواست
کی کہ وہ اس کو قلمبند فرمائیں تاکہ اس سے
فائدہ عام ہو جائے، انھوں نے گوناگوں
مشغلوں کے باوجود میری یہ بات بھی مان لی
اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے۔

مفسر عثمانی آیت نمبر قل یا اهل الکتاب تعالوا الی کلمة سواء بیننا وبینکم الا

---

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم، ج ۱ ص ۳۳۵

نعبد الا اللّٰہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللّٰہ کی تفسیر میں حیات مسیح علیہ السلام کے موضوع پر علامہ کے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں ۔

" اس موضوع (حیات مسیح علیہ السلام) پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں ، مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری اطال اللہ بقاءہ نے رسالہ "عقیدۃ الاسلام" میں جو علمی لعل وجواہر ودیعت کیے ہیں ان سے متمتع ہونے کی ہمت کریں ، میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی ۔"

اور آیت شریفہ قل الروح من امر ربی وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً کی تفسیر میں روح پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" اس (بحث) میں میرے نزدیک قول فیصل وہی ہے جو بقیۃ السلف بحر العلوم سید انور شاہ صاحب اطال اللہ بقاءہ نے فرمایا ۔"

علامہ شبیر احمد عثمانی نے فیض الباری علی صحیح البخاری پر جو تقریظ لکھی ہے ، اس میں تحریر فرماتے ہیں

قال الشیخ تاج الدین السبکی فی حق القفال المروزی ، کان اماماً کبیراً وبحراً عمیقاً غواصاً علی المعانی الدقیقۃ نقی القریحۃ ثاقب الذھن ، عظیم المحل کبیر الشان ، دقیق النظر عدیم النظیر (فی زمانہ) اھ	شیخ تاج الدین سبکیؒ نے قفال مروزی کے بارے میں فرمایا تھا کہ وہ بلند پایہ امام اور علم کے گہرے سمندر ، دقیق معانی کے غوطہ زن ، پاکیزہ طبع ، روشن دماغ ، باعظمت ، بلند مرتبت ، دقیق النظر اور یگانۂ عصر عالم تھے ۔

وحكى قول ابن السمعاني فيه:
كان وحيد زمانه فقهاً
وحفظاً وورعاً
هذه كلمات كنت ارى انها
حق ذلك الامام، وصادقتها
تصدق في نابغة الهند الشهير
وعالمها بحر العلوم مولانا السيد
محمد انور شاه الكشميري
ثم الديوبندي رحمه الله
سواء بسواء من غير شطط
والحواء، وكان اماماً كبيراً
وبحراً عميقاً غواصاً على المعاني
الدقيقة الى آخر ما قال
لم اكن في عداد اصحابه وتلامذته
غير اني وفقت للاستفادة
من صحبته ومجالسه ومذاكرته
(في المشكلات والغوامض)
برهة غير قصيرة ومن مطالع
كتابي فتح الملهم على شرح صحيح

اور ان کے متعلق ابن السمعانی کا بیان
نقل کیا ہے کہ وہ فقہ، حفظ حدیث اور
ورع و تقویٰ میں یکتائے روزگار تھے۔
یہ کلمات میں نے اس امام موصوف کے
بارے میں پڑھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں
کہ یہی کلمات ہندوستان کے مشہور و
معروف عالم بحر العلوم سید محمد انور شاہ
کشمیری ثم دیوبندی رحمۃ اللہ پر بھی
پورے پورے صادق آتے ہیں اور
اس میں ذرا مبالغہ نہیں ہے کیونکہ یہ بھی
بلند پایہ امام، علم کے گہرے سمندر تھے
انھیں دقیق معانی تک رسائی حاصل
تھی...............
میں نہ ان کے تلامذہ میں سے ہوں اور نہ
میرا ان کے ہم سبقوں میں شمار ہے،
بس مجھے ان کی صحبت اور مجلسوں میں ان کے
ساتھ مشکلات فن اور دقیق مسائل
میں مذاکرہ سے ایک زمانہ دراز تک
استفادہ کا موقع ملتا رہا ہے جو کوئی

مسلہ تبین لہ ذالک میری کتاب فتح الملہم شرح صحیح مسلم کا مطالعہ کریگا اس پر یہ حقیقت روشن ہوجائیگی۔ (ملاحظہ ہو مقدمہ فیض الباری ص ۴۸)

مورخ ہند مولانا سید سلیمان ندوی نے علامہ موصوف کی جن الفاظ میں تصویر کھینچی ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں :-

"مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے، ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کی اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے، وہ وسعت نظر، قوت حافظ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے، علوم حدیث کے حافظ اور نکتہ شناس، علوم ادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر وسخن سے بہرہ مند اور زہد وتقویٰ میں کامل تھے، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں کی جنت میں ان کا مقام اعلیٰ کرے کہ مرتے دم تک علم ومعرفت کے اس شہید نے قال اللہ وقال الرسول کا نعرہ بلند رکھا........ حضرت مرحوم سے ملاقاتوں میں علمی استفادہ کے موقعے ملتے رہے، ہر سوال کے وقت ان کی خندہ پیشانی سے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ سوال سے خوش ہوئے، اہل کمال کی یہ بڑی پہچان ہے کیونکہ وہ مشکلات سے عبور کر چکتا ہے، اب جب اس سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ شبہ کے اصل منشاء کو سمجھ جاتا ہے اور جواب دیکر خوش ہوتا ہے۔

مرحوم معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے، ان کو زندہ کتب خانہ کہنا بجا ہے، شاید ہی کوئی کتاب مطبوعہ ہو یا قلمی ان کے مطالعہ سے بچی ہو۔"[1]

---

[1] ملاحظہ ہو یاد رفتگاں مکتبۃ الشرق آرام باغ کراچی ۱۹۵۵ء ص ۱۶۹ و ۱۷۰

علامہ سید انور شاہؒ کی جلالت علمی اور رفعت شان کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسا عالم ربانی کسی موقعہ پر کسی علمی مسئلہ کی وضاحت کرتا اور وضاحت کی کہیں سید انور شاہؒ سے داد تحقیق ملجاتی تو ان کو بڑی مسرت ہوتی تھی، چنانچہ الافاضات الیومیہ میں مذکور ہے :۔

"مولانا سہول احمد صاحب نے کچھ سوالات علمی فرمائے، حضرت والا نے اس سلسلہ میں فرمایا کہ اصول فقہ کا جو یہ مسئلہ ہے کہ "العبرۃ لعموم الالفاظ لا لخصوص المورد" اس میں میرے نزدیک اتنی قید اور ضروری ہے کہ وہ عموم مراد متکلم سے متجاوز نہ ہو، دلیل اس کی وہ واقعہ ہے جو حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ سفر میں ہے اور بیہوش پڑا ہے، تحقیق سے معلوم ہوا کہ روزہ رکھے ہوئے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیس من البر الصیام فی السفر تو یہاں پر اس حدیث کے الفاظ تو عام ہیں ہر مسافر کے لیے، چنانچہ بعض نے یہی سمجھا مگر بعض صورت میں اذن صوم فی السفر سے اس کا تعارض ہوگا، لیکن قرائن سے کوئی مجتہد ذوقاً یہ حکم کرسکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ عموم مقصود نہیں بلکہ اس قید کے ساتھ عموم مقصود ہے کہ جس کی ایسی حالت ہو جائے، اور جمہور کا یہی مذہب ہے، بس معلوم ہوا کہ جمہور کے نزدیک اس اصولی مسئلہ میں عموم کے اندر عدم تجاوز از مراد متکلم کی قید معتبر ہے گو مصنفین نے تصریحاً اس کا ذکر نہیں کیا،

میں نے مراد آباد میں ایک وعظ میں یہ مضمون بیان کیا تھا اس میں مولانا انور شاہ صاحب مرحوم بھی تھے، بعد وعظ کے شاہ صاحب سے کسی شخص نے ایک مسئلہ دریافت کیا تو شاہ صاحب نے فرمایا کہ کیا تم نے سنا نہیں، ابھی تو وعظ میں (میری طرف اشارہ کرکے کہا) اس نے

مسئلہ بیان کیا ہے کہ اس قاعدہ میں یہ قید بھی ملحوظ ہے۔ پھر حضرت حکیم الامت دام ظلہم العالی نے فرمایا کہ اس سے مجھکو خوشی ہوئی کہ شاہ صاحب نے اس پر انکار نہیں فرمایا بلکہ اس سے اثبات فرمایا۔"[1]

ایک اور موقعہ پر حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے موصوف کی حق پسندی اور کمال علمی و عملی کی داد تحقیق یوں دی ہے، فرماتے ہیں:-

مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریکات حاضرہ میں بہت سرگرم تھے، اور میں بالکل علٰحدہ تھا لیکن باوجود اس اختلاف مشرب کے میرے رسالہ ترجیح الراجح سے بہت متاثر تھے اور کہتے تھے کہ صدیوں کے بعد یہ بات نظر آئی ہے کہ اپنی لغزشوں سے رجوع کرکے اس کو شائع کیا جاوے۔

یہی ایک بات حق پسندی اور کمال علمی و عملی کے لیے کافی ثبوت ہے جس کی اس وقت میں کہیں نظیر نہیں۔"[2]

انسان کا چہرہ اس کے خیالات اور علوم کا آئینہ دار ہوتا ہے، علامہ سید انور شاہ کا چہرہ اس حقیقت کا پورا پورا مصداق تھا، چہرۂ انور پر علم کا ایسا نور تھا کہ مسلمان ہی نہیں، کافر بھی اگر نظر بھر کر دیکھ لیتا تو پکار اٹھتا تھا کہ یہ چہرہ تو کسی بہت ہی بڑے عالم کا ہے، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کا بیان ہے:-

"مولانا (انور شاہ) کسی جلسۂ مناظرہ (بھاگل پور) میں شریک تھے جس میں اور بڑے بڑے علماء موجود تھے، اس جلسہ کا صدر ایک ہندو کو بنایا گیا تھا، جو بہت معمر اور تجربہ کار شخص تھا، وہ جس وقت جلسہ میں آیا اس نے سب علماء کو دیکھ کر مولانا کے متعلق

---

[1] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ ج ۶، ص ۱۹۳ [2] ایضاً ج ۶، ص ۲۲۰

کہا کہ ان سب میں یہ بڑے عالم معلوم ہوتے ہیں، واقعی غضب کا قیافہ شناس شخص تھا کہ محض صورت دیکھ کر پہچان گیا کہ یہ سب سے بڑے عالم ہیں، حالانکہ اس وقت تک کسی کی تقریر بھی نہیں سنی تھی[1]"۔

علامہ سید انور شاہ ورع و تقویٰ کی صفات سے آراستہ اور محاسن اعمال اور مکارم اخلاق کے پیکر تھے، حق گوئی اور اتباع سنت کے بڑے دلدادہ تھے، اس کے آثار ان کے چہرے بشرے سب پر نمایاں تھے، ان کی ذات حقیقت میں نور علیٰ نور تھی۔

اردو کی کتابوں کے مطالعہ کا شوق علامہ سید انور شاہ نے درس و تدریس اور وعظ و تقریر میں طلبہ اور عوام کی سہولت کی وجہ سے اردو زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا، لیکن اردو زبان میں حقائق و علوم چونکہ منتقل نہیں ہوئے تھے اس لیے موصوف نے اردو میں لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کو پسند کیا، مگر جب اہل حق نے اردو زبان میں تصنیف و تالیف کر کے علوم کو عام کرنا شروع کیا تو موصوف نے بھی اردو کی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا، اس کا اندازہ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں :۔

"مولانا انور شاہ صاحبؒ نے ایک صاحب سے فرمایا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ اردو کی کتابوں میں علوم نہیں ہیں، اس لیے میں کسی کی اردو تصانیف کو دیکھنا بیکار سمجھتا تھا، لیکن جب سے تفسیر بیان القرآن[2] دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ معلوم ہوا کہ اردو کی تصانیف میں بھی

---

[1] ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ ج ، ص ۱۱۲ [2] حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی تصانیف میں جو کتابیں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں ان میں تفسیر بیان القرآن کا نام سر فہرست آتا ہے، اس کی وجہ موصوف کی اس فن سے مناسبت اور اس فن میں مہارت ہے، موصوف کا بیان ہے:۔

باقی حاشیہ ص ۲۵۳ پر)

اب علوم موجود ہیں اور اس وقت سے مجھے اردو کی کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۲) الحمدللہ میں اپنی کھلی ہوئی حالت رکھتا ہوں اس خیال سے کہ کسی کو دھوکہ نہ ہو اور جو بات میرے اندر منجملہ نعم الٰہیہ ہو اس کو بھی ظاہر کر دیتا ہوں اور جو نقص کی ہو اس کو بھی ظاہر کر دیتا ہوں، چنانچہ چار علوم جو بڑے ہیں تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف ان میں سے دو سے مجھکو بقدر ضرورت مناسبت ہے، وہ بھی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعا کی برکت سے ہے، ایک موقع پر یہ فرمایا تھا کہ تفسیر اور تصوف سے تجھکو مناسبت ہوگی، اگر اس وقت خیال ہوتا تو حدیث و فقہ کے لیے بھی دعا کرا لیتا اور یوں بقدر حاجت حدیث و فقہ سے بھی اللہ کے فضل و رحمت سے کام نکال لیتا ہوں مگر جس کو مناسبت کہتے ہیں وہ نہیں۔"

(الافاضات الیومیہ طبع تھانہ بھون ۱۹۳۹ء ج ۵ ص ۱۸۴ و ۱۸۵)

حکیم الامت کو تصنیف سے چونکہ زیادہ شغف اور وابستگی نہیں تھی اس لیے تفسیر بیان القرآن میں موصوف نے بڑی محنت کی ہے، اس امر کا اندازہ موصوف کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے:-

"ایک صاحب نے عرض کیا کہ حضرت کو تو علاوہ اور کاموں کے ڈاک ہی کا مستقل کام بہت ہے، فرمایا کہ نرے ڈاک کے کام سے مجھ پر تعب نہیں ہوتا، البتہ تصنیف کے کام سے تعب ہوتا ہے، سو تصنیف کا کام اب نہیں ہوتا، تصانیف میں تمام مضامین پر احاطہ کرنا پڑتا ہے، اس لیے تصنیف کا کام بہت بڑا ہے، پہلے دماغ میں تمام مضامین کا جمع کرنا، پھر مرتب کرنا، ان کو محفوظ رکھنا بہت ہی بڑی مشقت کا شغل ہے،

ایک سبب تصنیف کی دشواری کا میرے لیے یہ بھی ہے کہ کتابوں پر میری نظر نہیں، درسی کتابوں کے علاوہ اور کتابیں میں نے دیکھیں نہیں، ہاں درسی کتابیں پہلے بحمداللہ اچھی طرح مستحضر تھیں، مگر اب ان میں بھی ذہول شروع ہو گیا، اور تصنیف کے لیے صرف درسی"

(باقی حاشیہ ص ۲۵۴ پر)

جو بے وقعتی اردو کی کتابوں کی میرے خیال میں پہلے تھی وہ جاتی رہی۔ (ملاحظہ ہو الافاضات الیومیہ ۸ قسط)

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۳) کتابیں کافی نہیں، یہی وجہ ہے کہ میری تصانیف کا زیادہ حصہ غیر منقولات ہیں، اول تو میرے پاس کتابیں نہیں اور جو ہیں ان پر نظر نہیں، اور تصنیف بدون کتابوں پر نظر ہوئے مشکل ہے جس کا اب تحمل نہیں۔" (الافاضات الیومیہ ۵ ص ۲۲۴، ۲۲۵)

تفسیر بیان القرآن کی افادیت و اہمیت اور عظمت کا صحیح اندازہ اسی وقت کیا جا سکتا ہے جب جب اس فن کی مشہور تفسیریں نظر سے گذر چکی ہوں اور جو اشکال ان کتابوں میں حل ہونے سے رہ گیا ہے وہ موصوف نے اس میں حل کر دیا ہے اور بعض مقامات پر فخر رازی سے اونچی اور بہتر تفسیر کی ہے اور یہی اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی ہے، اس سلسلہ میں حکیم الامت کا بیان پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں:

"بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ تمھاری تفسیر میں کیا ہے، میں کہا کرتا ہوں کہ کسی مقام پر اشکال ہو تو اول اور تفسیروں میں دیکھو، پھر اس میں دیکھو تب معلوم ہوگا کہ اس میں کیا ہے۔"

(حسن العزیز مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون ۱۳۶۰ھ ج ۲ حصہ سوم ص ۸۴)

اسی وجہ سے اکابر اہل علم اس تفسیر کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور ان ہی وجوہ سے موصوف کو زمانہ تصنیف ہی سے اس کی تکمیل کی بڑی آرزو تھی چنانچہ حسن العزیز (ج ۴ ص ۴۲) میں مذکور ہے:

"ایک صاحب نے حضرت والا سے تفسیر بیان القرآن کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں .....

ان صاحب کے سوالات کے جوابات دینے کے بعد فرمایا کہ زمانہ تصنیف تفسیر میں بالکل بیمار نہیں ہوا کان بھی گرم نہ ہوا، اس زمانہ میں تھان (تھانہ بھون) میں طاعون بہت تھا، میں اللہ سے دعا مانگتا تھا کہ اے اللہ میں تفسیر لکھنے سے پہلے نہ مروں۔"

اس اہم تفسیر کی تکمیل کی مدت بھی زیادہ نہیں ہے، حکیم الامت مقالات حکمت ملقب بہ لسان الدلیل فی رمضان الاربعین (ص ۹، طبع تھانہ بھون ۱۳۴۳ھ) میں فرماتے ہیں:-

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۴) تفسیر بیان القرآن اڑھائی سال میں لکھی گئی، اس عرصہ میں کوئی سفر نہیں کیا، تفسیر اور مثنوی کی شرح لکھنے کا بہت شوق تھا، الحمد للہ کہ خدا تعالیٰ نے میرے شوق کو پورا کیا۔"

حکیم الامت نے تفسیر بیان القرآن کے لکھتے وقت کن باتوں کا التزام کیا تھا، اس کے متعلق موصوف کا بیان پڑھنے کے لائق ہے، فرماتے ہیں :۔

"تفسیر میں میرا یہ التزام تھا کہ پہلے صرف قرآن مجید لیکر اس کا خوب مطالعہ کرتا تھا جب شرح صدر ہو جاتا تو پھر تفسیروں کا مطالعہ کرتا، اگر وہ تفسیروں کے مطابق ہوتا تو درج کرتا اگر محض قرآن مجید کے مطالعہ سے شرح صدر نہ ہوتا تو پھر تفاسیر کی طرف رجوع کرتا، اگر تفاسیر کے مطالعہ سے شرح صدر ہوتا تو درج کرتا ورنہ بارگاہ خداوندی میں نہایت ابتہال اور تضرع زاری سے دعا کرتا تو کبھی عین دعا میں شرح صدر ہو جاتا اور کبھی آدھ گھنٹہ بعد، کبھی کبھی شرح صدر ہونے کے انتظار میں دیر دیر تک ٹہلتا، پھر بعد شرح صدر تفاسیر کو دیکھتا اگر اس مضمون کی تائید ان سے ہوتی تو درج کرتا ورنہ چھوڑ دیتا، اور میں نے کبھی تفسیر کو اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اکابر کی طرف منسوب کیا، ہاں بعض نکات کو اپنی جانب منسوب کیا۔

اس عرصہ میں طاعون کا بھی زور تھا، مجھے خدشہ تھا کہ تفسیر رہ نہ جائے مگر حق تعالیٰ کے فضل سے میں اس عرصہ میں بیمار تک نہیں ہوا، البتہ بعض دفعہ معمولی زکام تو ہوا، اور اسی طرح مثنوی کی شرح میں بھی اور بعد فراغت کے تعب کا ظہور ہوا اور خوب بیمار ہوا۔

اور عنوان جو تفسیر میں جلی قلم سے لکھے ہیں ان کے قائم کرنے میں نہایت دقت ہوئی اور یہ گویا علوم قرآن ہیں، اور بعض جگہ بدلنے بھی پڑے، ایک شخص نے عرض کیا کہ گویا یہ تراجم بخاری ہیں فرمایا ہاں، مگر تراجم مغلق ہیں یہ سہل ہیں،

تفسیر لکھنے کے زمانہ میں روپیہ بھی بہت آیا اور خوب کھایا اور بڑے بڑے منی آرڈر ذرا ذرا شبہ پر واپس کیے اور پھر لوٹ پوٹ کر آگئے" (مقالات حکمت ص ۲۰۵)

امتیازی شان طلبہ میں حدیث فہمی کا صحیح مذاق اور فقہ حدیث کا ملکہ راسخہ پیدا کرنا تھا، فقہ حدیث نہایت غامض علم ہے، اسی لیے محدثین اور فقہا کے مقابلہ میں فقہا، محدثین کی تعداد نہایت قلیل ہے، اس فن کے ماہرین انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے "عجالہ نافعہ" میں مشہور ترین ائمہ فن کو نام بنام گنایا ہے، دارالعلوم دیوبند کے قیام کی اصل غایت اسی علم کی نشر و اشاعت ہے، اس فن میں اکابر دیوبند کا طریقہ انیقہ نہایت معتدل ہے، درس حدیث میں علامہ سید انور شاہ کے تجدیدی کارناموں پر روشنی ڈالنے سے پہلے اکابر دیوبند کے طریقہ انیقہ کو سمجھنا ضروری ہے، اس کی وضاحت کے لیے علامہ سید انور شاہ کی وہ تاریخی تقریر جو موصوف نے ۱۳۲۹ھ میں عالم اسلام کے نہایت نامور فاضل اور وسیع النظر محدث علامہ سید رشید رضا المتوفی ۱۳۵۴ھ کی دارالعلوم دیوبند میں آمد کے موقعہ پر کی تھی، پیش کرنا کافی ہے، اس اہم تاریخی تقریر کا موضوع "فقہ حدیث اور اکابر دیوبند کا طریقہ انیقہ" ہے، علامہ موصوف کی یہ تقریر عربی میں ہے لیکن طویل ہے، اسلیے اس کا ترجمہ لکھا جاتا ہے :-

"مدرسہ دیوبند کی غایت و غرض درس حدیث اور فقہ حدیث ہے ..... ہمارے اکابر کا حدیث اور فقہ حدیث میں ایسا معتدل و بہتر طریقہ ہے، جس میں افراط و تفریط نہیں ہے، میری مراد اس سے یہ ہے کہ ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ اور احمدؒ) اکثر و بیشتر اصول اربعہ کی پابندی کرتے ہیں، اور وہ اس طرح سے کہ امام مالکؒ اہل مدینہ کے عمل کی اقتدا کرتے ہیں، بلکہ کبھی وہ حدیث مرفوع پر بھی اس کو ترجیح دیتے ہیں،

امام شافعیؒ ہر باب میں اصح حدیث سے استدلال کرتے ہیں، امام احمدؒ اصح، صحیح، حسن اور ضعیف حدیث سے بھی جس کا ضعف کمتر درجہ کا ہو استدلال کرتے ہیں، اور وہ ان دونوں طریقے (اصح و صحیح اور حسن و ضعیف) کو درست سمجھتے ہیں، موصوفؒ نے اپنی مسند

میں اسی طریقہ کو اختیار کیا ہے، اور ابو حنیفہؒ ان قسموں کی تمام حدیثوں کو قابل عمل سمجھتے ہیں، اور اختلاف کی صورت میں ان کو ایک محل پر جمع کرتے ہیں، اسی وجہ سے حنفیہ کے بیان تاویلات زیادہ ہیں اور شوافع کے بیان کے راویوں پر جرح زیادہ ہے، امام شافعیؒ پہلے امام ہیں جو بلا مؤید و عاضد اور شاہد حدیث مرسل کو قابل حجت نہیں سمجھتے ہیں۔

فن حدیث کے نکتہ شناس امام بخاریؒ نے امام مالکؒ و شافعیؒ کے اصول کو اپنایا اور اپنا خضر راہ بنایا، چنانچہ وہ صحیح بخاری میں اصح ما فی الباب کو لاتے ہیں، اور عمل سلف کی موافقت کو بھی لمحوظ رکھتے ہیں، اسی وجہ سے وہ اپنی کتاب میں کوئی ایسی حدیث ذکر نہیں کرتے جو دوسری حدیث کے معارض و مخالف ہو، انھوں نے صلوٰۃ کسوف کے بیان میں دو رکوع والی حدیث پر اکتفا کیا اور اپنے اصول و قواعد کی پابندی کی، تین، چار اور پانچ رکوع والی حدیثوں کو نظر انداز کر دیا،

امام مسلمؒ نے راویوں کی ثقاہت پر اعتماد کیا، چنانچہ انھوں نے باب الکسوف میں تین چار رکوع والی حدیثوں کو ہی نہیں بلکہ پانچ رکوع والی حدیث کو بھی جو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ پر موقوف ہے (کوئی مرفوع حدیث نہیں ہے) صحیح مسلم میں درج کیا ہے، امام بخاری نے تحقیق و تنقیح کی ہے اور امام مسلم نے اصول و قواعد کی رعایت کی ہے،

ایسی اختلافی صورتوں میں ہمارے مشائخ توسط و اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں، تشدد اور تساہل سے گریز کرتے ہیں اور متعارض حدیثوں کی ایسی توجیہ کرتے ہیں کہ جو عقل سلیم قبول کرتا ہے، اس کی مثال حدیث قلتین ہے، اس کو یزید بن زریع کامل بن طلحہ، ابراہیم الحجاج، ہدبہ بن خالد، وکیع اور یحییٰ بن حسان نے اذا بلغ الماء قلتین او ثلاثاً، جب پانی دو تین قلہ (بڑا مٹکا جس میں اڑھائی مشک پانی آتا ہے) ہو

وہ ناپاک نہیں ہوتا، لفظ تنویع (او) کے ساتھ روایت کیا ہے تو یہ تخمین واندازہ کے لیے ہے کہ جب دو تین قلہ پانی ہوگا تو ایک طرف سے دوسری طرف نجاست کا اثر نہ ہوگا اور امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کا یہی اصل مذہب ہے، چنانچہ شیخ ابن ہمامؒ اور شیخ ابن نجیم نے اس امر کی تصریح کی ہے، حدیث قلتین کے محمل کے تعین سے جو حدیثیں اس کے معارض تھیں وہ اپنے حال پر باقی رہیں اور معارضہ سے بچ گئیں، جیسے ٹھیرے ہوئے پانی میں پیشاب کرنے کی ممانعت والی حدیث، اور سو کر اٹھنے والے کو پانی میں ہاتھ ڈالنے کی ممانعت والی حدیث، اور برتن میں کتے کے منہ ڈالنے والی حدیث، اپنے اپنے محل میں قابل عمل ہیں۔

اور اس کی مثال دیگر امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے والی حدیثیں ہیں، حنفیہ نے نماز میں امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھنے پر قرآنی آیت واذا قرئ القرآن فاستمعوا وانصتوا لعلکم ترحمون (جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو)، اور حدیث رسول واذا قرئ القرآن فانصتوا (جب امام پڑھے تو تم چپ رہو)، اور حدیث من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ (جس کا امام ہو تو امام کی قرأت مقتدی کی قرأت ہے) سے استدلال کیا، اور انھوں نے حدیث لا تفعلوا الا بام القرآن (سورہ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھا کرو) والی حدیث کی تاویل کی کیونکہ جس نے سورہ فاتحہ نماز میں نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی، اور یہ اس لیے کیا کہ آیت شریفہ کے شان نزول میں کوئی صحیح روایت نہیں ہے، لہذا لفظ کے عموم کا اعتبار ہوگا (نہ خصوص سورہ کا) نیز امام بیہقی نے کتاب القرأۃ میں امام احمدؒ سے نقل کیا ہے کہ علماء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ یہ آیت نماز میں قرأت کے بارے میں اتری ہے اور حدیث واذا قرئ فانصتوا (جب امام پڑھے تو تم چپ رہو)

صحیح حدیث ہے، امام احمد بن حنبل اور ان کے شاگرد ابوبکر بن الاثرم نے اسکی تصحیح کی ہے، پھر امام مسلم نے باب التشہد میں حدیث کے ہر دو طریق، ابوموسیٰ اشعریؓ و ابوہریرہؓ کی تصحیح کی ہے اور بعد ازاں ابن خزیمہ، حافظ ابوجعفر جریر طبری، حافظ ابوعمر بن عبدالبر، حافظ ابن حزم اندلسی ظاہری، حافظ زکی الدین عبدالعظیم منذری، خاتم الحفاظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اس حدیث کی تصحیح کی ہے، یہ تو اسناد کے اعتبار سے اس حدیث کا پایہ ہے، اور باعتبار تعامل سلف و ائمہ تو اس پر صحابۂ کرام کی بڑی جماعت امام مالک، احمد، ابوحنیفہ کا اس پر عمل ہے، اور ایسی حدیث جس کے راوی ثقہ ہوں پھر سلف کا عمل بھی اس کا موید ہو تو وہ حدیث صحیح ہے، وہ نہ کسی جرح سے متاثر ہوتی ہے اور نہ کسی قدح سے اثر پذیر۔

اور حدیث من کان لہ امام فقراءۃ الامام لہ قراءۃ کو شیخ ابن الہمام نے مسند احمد ابن حنبل سے نقل کیا ہے، اور اس کی تصحیح بھی کی ہے، کیونکہ اس کی سند بخاری و مسلم شرط پر ہے، اور ہمیں ابتک اس میں کسی علت کا سراغ نہیں لگ سکا ہے، اس کی سند یہ ہے اخبرنا اسحق بن یوسف الازرق قال حدثنا سفیان وشریک عن موسیٰ بن ابی عائشۃ عن عبداللہ بن شداد عن جابر بن عبداللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الحدیث، اور پھر ترمذی کی ایک موقوف اور حدیث کی دیگر کتب میں ایک مرسل حدیث اس کی موید اور معاضد ہے، اب تو وہ بلاشبہہ صحیح ہے۔

ہمارے شیخ الشیوخ مولانا رشید احمدؒ نے حدیث عبادہؓ کی جو محمد بن اسحٰق کے طریق سے مروی ہے اس کے سیاق لعلکم تقرأون خلف امامکم قالوا نعم یا رسول اللہ نھذہ ھذا قال فلا تفعلوا، الحدیث شاید تم اپنے امام کے پیچھے پڑھتے ہو، لوگوں نے

عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ ہم جلدی جلدی پڑھ لیتے ہیں، تو آپ نے فرمایا سورہ فاتحہ کے علاوہ کچھ نہ پڑھا کرو، کی توجیہ میں فرمایا یہ اباحت اور جواز کی دلیل تو ہوسکتی ہے، وجوب کی دلیل نہیں، کیونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر پڑھتے تھے، اسی بنا پر آپ نے ان سے دریافت فرمایا تھا کہ شاید تم میرے پیچھے پڑھتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا جی ہاں تو آپ نے فرمایا بس سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرو، کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں میں سورۂ فاتحہ کا نماز کے لیے پڑھنا متعین ہو چکا ہے، کہ امام اور منفرد کی نماز اس کے پڑھے بغیر نہیں ہوتی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کے پیچھے سورہ فاتحہ کے پڑھنے کے جواز کی علت یہ بتائی ہے کہ وہ قرآن کی تمام سورتوں میں نماز کے لیے متعین ہو چکی ہے، اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی، امام اور منفرد کے حق میں اس سورہ کے پڑھے بغیر نماز کا نہ ہونا ظاہر ہے، اور مقتدی کے حق میں اس کا اثر کم سے کم اباحت ہوا، حنفیہ کا اس کے واجب ہونے پر اتفاق ہے البتہ اس کی اباحت وکراہت کا مسئلہ احناف میں مختلف فیہ ہے۔

اور ہمارے مشائخ نے مسئلہ رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسئلہ میں فرمایا ہے کہ نماز میں رفع یدین کرنا اور بآواز بلند آمین کہنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم سے ثابت ہے، اور اسی طرح رفع یدین اور اخفائے آمین بھی صحیح سند سے ثابت ہے۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ سے ترک رفع یدین اور اسی طرح اخفائے آمین صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت اور سلف صالحین سے ثابت ہے، تو ایسی صورت میں ان دونوں باتوں کو سنت ہونا چاہیے، اب بحث صرف ترجیح میں رہ جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہی آغاز وانجام میں راہ راست کی توفیق دینے والا ہے۔

پھر مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تلمذ سے ہمارے شیخ عدل، حجہ، مسند وقت مولانا محمود حسن نے علوم کی تکمیل کی، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو ان کے فیوض سے مستفیض فرمائے،

وہی اس وقت مدرسہ کے صدر مدرس ہیں، اس ملک میں ان ہی کی اسناد پر مدار ہے، جو ہنوز اپنے مشائخ کے طریق حق پر قائم ہیں، حق تعالیٰ نے ان کو روایات متعارضہ میں مطابقت پیدا کرنے اور تعارض کو رفع کرنے اور مشکلات حدیث کو حل کرنے کا ملکۂ خاص عطا فرمایا ہے، بطور مثال ایک واقعہ پیش خدمت ہے، انھوں نے مجھ سے ایک مرتبہ فرمایا کہ کسوف کی نماز میں جو تعدد رکوع احادیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ آپ کے ساتھ خاص ہے، کسی خاص وجہ سے آپ نے ایسا کیا ہے، لیکن امت کو آپ نے ایک ہی رکوع کی ہدایت کی ہے، چنانچہ فرمایا ہے صلوا کاحدث صلوٰۃ صلیتموھا من المکتوبۃ (جو فرض نماز کہ تم عنقریب پڑھ چکے ہو اس جیسی نماز پڑھو، یعنی صبح کی ایسے ہی کسوف کی نماز پڑھو، میں نے عرض کیا کہ سادات شافعیہ تو اس تشبیہ کو تعدد رکوع پر حمل کرتے ہیں، وحدت رکوع پر نہیں، فرمایا یہ تو بدیہی کو نظری بنانا ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سب کی آنکھوں کے سامنے مجمع عام میں کسوف کی نماز متعدد رکوع سے پڑھی اور امت کے لیے تعدد رکوع ہی کو مشروع کرنا تھا تو پھر آپ نے جو صحابہ نے مشاہدہ کیا تھا اس کا حوالہ کیوں چھوڑ دیا اور صبح کی نماز سے تشبیہ کی طرف میلان فرمایا، یہ محض اس لیے کیا کہ آپ نے متعدد رکوع کسی اور عارض کی وجہ سے کیے تھے اور آپ نے امت کو نماز کے مشہور و معروف طریقہ کی طرف ہدایت فرمائی۔" (ملاحظہ ہو القاسم ج ۴ شمارہ نمبر ۲ سنہ ۱۳۳۳ھ دیوبند، ص ۲۹-۳۲)

اس تقریر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ بزرگان دیوبند نے جس طرح فقہ حدیث سے خصوصی اعتنا کیا اسی طرح اس فن کے مشکلات کے حل کرنے پر بھی خاص توجہ کی ہے، سید انور شاہ نے یہ کام بہمہ وجوہ پایۂ تکمیل کو پہنچایا

(باقی)

عبدالباقی نہاوندی

اور

دیباچہ کلیاتِ عرفی

از جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب انصاری، لکھنؤ یونیورسٹی،

عہد مغلیہ، خصوصاً عہد اکبری و جہانگیری، ہندوستان میں فارسی زبان و شاعری کا عہد زریں تھا، اس زمانے میں یہاں نہ صرف زبان فارسی کے تمام چوٹی کے شاعر جمع ہوگئے تھے بلکہ اسی دور میں فارسی گو شعراء کے چند اہم ترین تذکرے بھی لکھے گئے جن میں مآثر رحیمی بھی ہے، جس کا مصنف عبدالباقی نہاوندی اکبر کے مشہور سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں کا معزز درباری تھا، عبدالباقی (پیدائش ۹۷۸ھ مطابق ۱۵۷۰ء، وفات ۱۰۴۲ھ مطابق ۱۶۳۲ء) نے خان خاناں کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اپنی اس گراں قدر تصنیف میں نہ صرف خان خاناں اور اس کے خاندان کے حالات درج کیے ہیں بلکہ اس کے دربار سے منسلک شعراء کے حالات اور ان کے کلام کا کافی حصہ بھی اس میں محفوظ کر دیا ہے، سراج الدین علی خاں آرزو لکھتے ہیں کہ[1]

"فقیر آرزو گوید تذکرہ مذکور را کہ دیدہ ام، احوال جمیع ما حال خان خاناں را نوشتہ و جمیع اشعار کہ در مدح خان خاناں گفتہ جمع کردہ ...... مناسب آنکہ نام خان خاناں عبدالرحیم است تذکرہ بہ مآثر رحیمی موسوم گردانیدہ"

---

۱ مجمع النفائس (مخطوطہ بانکی پور)

لیکن یہ قابلِ افسوس امر ہے کہ اس اہم مصنف کے حالاتِ زندگی نہ تو اس کے معاصرین ہی میں سے کسی نے لکھے اور نہ بعد کے تذکرہ نگاروں نے بیان کیے، اس کے معاصرین میں صرف تقی اوحدی نے اسے شعراء کی فہرست میں شامل کرتے ہوئے اس کے متعلق صرف چند سطریں تحریر کی ہیں، جو عبد الباقی کے حالات میں بالکل ہی ناکافی ہیں، اور ان سے صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ کاشان کے گورنر آقا خضر خاں کا چھوٹا بھائی تھا، اور آقا خضر کے قتل کے بعد اس نے ایران سے ترکِ سکونت کر لی تھی، عبد الباقی کے متعلق عرفات العاشقین میں درج ذیل چند جملے ملتے ہیں[۱]:

"وے برادر کہین آقا خضر است کہ مدتہا مستقلاً در کاشان حاکم مطلق بود و قبل شاہ عباس حسینی عم بزرگان ایشان کاشان را در تیول مفوض داشتہ بودند ....

بعد از قتل آقا خضر در ایران نتوانست بسر برد ...."

بعد کے تذکرہ نگاروں میں صرف سراج الدین علی خاں آرزو اور احمد علی ہاشمی نے عبد الباقی کے کچھ حالات تحریر کیے ہیں لیکن خان آرزو نے بھی عبد الباقی کی زندگی کے متعلق تقی اوحدی کے بیان پر کوئی اضافہ نہیں کیا ہے، یہی حال کچھ احمد علی ہاشمی کا بھی ہے جنھوں نے عبد الباقی کے ہندوستان آنے کے متعلق صرف درج ذیل چند الفاظ کا اضافہ کیا ہے[۲]:

"عبد الباقی در عہد اکبر بادشاہ در ہند آمدہ ملازمت نواب عبد الرحیم خان خانان اختیار نمود"

خوش قسمتی سے مآثر رحیمی کے دیباچہ میں خود عبد الباقی نے اپنی اس تصنیف کے اختتام یعنی ۱۰۲۵ھ تک کے اپنے کچھ حالات تحریر کیے ہیں، خود اس کے بیان کے مطابق وہ ایک کرد قبیلہ کا فرد تھا، اور ہمدان میں نہاوند کے قریب جولک نامی ایک قریہ میں پیدا ہوا تھا[۳]، اس کے

۱؎ عرفات العاشقین (مخطوطہ) [illegible] ۲؎ مخزن الغرائب (مخطوطہ) [illegible] ۳؎ مآثر رحیمی [illegible] (کلکتہ ایڈیشن)

اجداد افراسیاب کے زمانہ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے چلے آئے تھے، اور نہاوند کے قریب قصر شیرین کے علاقہ میں بسنے والے کرد قبیلوں کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے، شاہ اسمٰعیل صفوی کی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں جب ان کرد قبیلوں کے اختلافات اس حد تک بڑھ گئے کہ جنگ و جدال تک نوبت پہنچی تو عبد الباقی کے اجداد نے وطن میں قیام کرنا مناسب نہ سمجھا اور یہاں سے ترکِ سکونت کرلیا، اور شاہ اسمٰعیل کی ملازمت اختیار کرنے کے بعد قصبہ جوکک میں، جو انھیں جاگیر میں ملا تھا، قیام پذیر ہوگئے۔

عبد الباقی کے والد آقا بابا، جو اپنے عہد کی ایک مشہور شخصیت تھے، خود شاعر تھے، اور مُدرکی تخلص کرتے تھے، شاہ عباس کے عہد حکومت میں انھیں عروج حاصل تھا، اور کچھ عرصہ تک وہ وزیر[1] کے عہدے پر فائز رہے۔ عبد الباقی کا بھائی آقا خضر بھی اہل علم کا قدردان اور سرپرست تھا، چنانچہ تقی الدین کاشی، صاحب خلاصۃ الاشعار، نہ صرف اس کا دوست اور درباری تھا بلکہ اس نے آقا خضر کے حالات میں ایک مستقل تصنیف مآثر خضریہ لکھی۔

آقا خضر اپنے زمانہ میں مشہور شخصیت تھا، اور شاہ عباس کے دورِ حکومت میں گیلان کی فتح کے بعد لاہیجان کا وزیر بنا دیا گیا تھا، اس عہدے پر وہ ۱۰۰۶ھ یعنی اپنی وفات تک فائز رہا۔

اپنے والد اور بھائی کی وزارت کے دوران عبد الباقی نہاوندی انتظامیہ اور مال گزاری کے مختلف عہدوں پر فائز رہا، اس زمانے میں اس کا قیام زیادہ تر ہمدان میں رہا، سمنان، بسطام، دلمان اور لاہیجان میں بھی کچھ عرصہ کے لیے مقیم رہا، اور

---

[1] وزیر کے لغوی معنی اگرچہ بادشاہ کے مددگار کے ہیں، لیکن عہد صفوی میں ایران میں یہ لفظ ضلع مجسٹریٹ کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا۔

ایک اچھے منتظم کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کرلی تھی، اس لیے اسے کاشان میں شاہی جائداد اور اس شہر کی آمدنی کا محصل بنا دیا گیا جسے اس کے بھائی نے کاشان سے پانچ فرسخ[1] کے فاصلہ پر تعمیر کرایا تھا، کاشان کے قیام کے دوران میں عبد الباقی کو اس عہد کے ایران کی چند اہم ادبی شخصیتوں مثلاً حکیم رکن الدین مسعود، ابو تراب ترکمان، مولانا حاتم کاشی، فہمی کاشی، شوری رفیع الدین حید معمائی، تقی الدین محمد کاشی سے متعارف ہونے کا موقع ملا۔

عبد الباقی کو امرائے ہندوستان کی داد و دہش کا علم سب سے پہلے ۱۰۰۶ھ میں ہوا، اس سال خان خاناں کے دربار سے منسلک ایک امیر غیث الدین محوی استرآبادی ہندوستان سے ایران واپس گیا اور کاشان میں اس نے عبد الباقی کو خان خاناں کی علم نوازی اور داد و دہش سے مطلع کیا اور اس کی علمی و ادبی محفلوں کا حال کچھ اس طرح بیان کیا کہ عبد الباقی اور کچھ دوسرے لوگ اس کے دربار میں پہنچنے کے مشتاق ہو گئے۔ چنانچہ عبد الباقی نے اپنی اس خواہش کا اظہار ۱۰۰۷ھ میں کہی ہوئی ایک غزل کے درج ذیل شعر میں کیا ہے ؎

در عراقِ پر نفاق ایں آرزو سرمی ندیم گز سخن سنجانِ بزمِ خان خاناں نیستم

۱۰۱۶ھ (مطابق ۱۶۰۷ء) میں آقا خضر کی وفات کے بعد اس کا عہدہ عبد الباقی کے سپرد کیا گیا، لیکن حاسدوں کی سازش نے اسے چین نہ لینے دیا اور آخر کار بادشاہ اس سے ناراض ہو گیا، ایران میں اپنا قیام ناممکن سمجھ کر عبد الباقی نے ہندوستان آنے کا عزم مصمم کر لیا اور ذیقعدہ ۱۰۲۳ھ (مطابق ۱۶۱۴ء) میں وہ ایران کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہکر ہندوستان کے لیے روانہ ہو گیا، عبد الباقی کی شہرت اور اس کا متذکرہ بالا شعر خان خاناں کے کانوں تک پہنچ چکا تھا، اس لیے برہان پور میں خان خاناں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا،

---

[1] تقریباً اٹھارہ ہزار فٹ کا ایک فرسخ ہوتا ہے۔

اور مآثر رحیمی کی تالیف کی خدمت اس کے سپرد کی جسے اس نے ۱۰۲۵ھ مطابق ۱۶۱۶ء میں کامیابی کے ساتھ اختتام تک پہنچایا، ۱۰۲۵ھ کے بعد عبدالباقی کے حالات زندگی بہت ہی کم ملتے ہیں، صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ ۱۰۲۹ھ (مطابق ۱۶۱۹ء) میں وہ دکن اور برار میں امین کے عہدے پر فائز رہا، اس کے بعد جہانگیر کے دوسرے بیٹے سلطان پرویز نے اسے بہار کا دیوان بنا دیا، اس کے بعد کے اس کے حالات زندگی پردۂ اخفا میں ہیں، لیکن قیاس یہی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کا باقی حصہ بہار ہی میں گذارا۔

عبدالباقی کے سنہ وفات کے متعلق اختلاف ہے، مرزا محمد حارث بدخشی کے بیان کے مطابق اس کی وفات ۱۰۴۲ھ (مطابق ۱۶۳۲ء) میں ہوئی[۱]، لیکن سی۔اے۔اسٹوری (C. A. Storey) نے مآثر رحیمی کے ایک نسخہ پر خود مصنف کے ہاتھ کی تحریر کی بنیاد پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عبدالباقی کم از کم ۱۰۴۶ھ (مطابق ۱۶۳۷ء) تک زندہ تھا[۲]، مآثر رحیمی کا یہی نسخہ کلکتہ میں محفوظ تھا، اور اسی کی بنیاد پر مآثر رحیمی طبع ہوئی ہے، اور جس نوٹ کا اسٹوری (C. A. Storey) نے ایوانو (Ivanow) کے حوالے سے ذکر کیا ہے اس کو بھی اس مطبوعہ نسخہ میں نقل کر دیا گیا ہے، اس سے یہ بات صاف طور سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ۱۰۲۶ھ میں تحریر کیا گیا تھا نہ کہ ۱۰۴۶ھ میں جیسا کہ ایوانو (Ivanow) اور اسٹوری (Storey) نے لکھا ہے، نوٹ درج ذیل ہے[۳]:۔

۱؎ تاریخ محمدی (مخطوطہ رامپور) ۲؎ سی۔اے۔اسٹوری کے اس ضمن میں حسب ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں:

"The statement of Tarikh-i-Mohammadi that he died in 1042/1632 seems to be incorrect since a Calcutta manuscript (Ivanow 140) contains a note that it was collated by the author himself in 1046/1637"

Persian literature _ A Bio-Bibliographical Survey.

۳؎ مآثر رحیمی، ج ۱، ص ۱۴

"بتاریخ پانزدہم جمادی الثانی ہزار و بست و شش ہجری وقت دوپہر مولف این تذکرہ نامہ عبدالباقی نہاوندی بہ شرف اتمام مقابلہ این نسخہ کہ جہت یار خانی خواجہ سلطان محمد اصفہانی نوشتہ شدہ بود، توفیق یافت"

اس تحریر کی روشنی میں (جو ۱۰۲۶ھ میں لکھی گئی نہ کہ ۱۰۴۲ھ میں) مرزا محمد حارث بدخشی کا تحریر کردہ سنہ وفات غلط نہیں ثابت ہوتا۔

عبدالباقی کی اصل شہرت اس کی تصنیف مآثر رحیمی پر مبنی ہے لیکن عرفات العاشقین اور خود مآثر رحیمی کے دیباچہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ شعر بھی موزوں کیا کرتا تھا، اگرچہ پیشہ ور شاعر نہ تھا، جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے[1]

اگرچہ شعر و شاعری فن و روش فقیر نبود و مدح گفتن شعار و دثار نہ ساختہ بود و گاہے بہ تکلیف پیر و مرشد خود تتبع رباعیات دل آویز ایشان رباعی می گفت"

اس بیان کے ساتھ ساتھ اس نے خان خاناں کی مدح میں کہی ہوئی اپنی ایک غزل بھی لکھی ہے، جس سے اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تا بکے غلطم بخون دیدۂ مژگان نیستم	تا بکے سوزم بحسرت داغ حرمان نیستم
عندلیب باغ عشقم لیک در کنج قفس	سوزشے دارم کہ محتاج گلستان نیستم
گر بہ شاخ گل زنم آتش نہ بیداد ے بود	منکہ مجنون گلم از باغ و بستان نیستم
تا نشان پایم زلیلی جانب حی آردم	ورنہ دلگیر از سموم این بیابان نیستم
در عراق پر نفاق این آرزو می سرمی زدم	کز سخن سنجان بزم خان خانان نیستم

تقی اوحدی نے بھی عبدالباقی کے ذکر میں اس کے بہت سے اشعار بطور نمونہ نقل کیے اور

---

[1] مآثر رحیمی، جلد اول ص ۱۳ ؎ یہاں پیر و مرشد سے میر مغیث الدین محوی مراد ہیں۔

اس کی شاعری کے متعلق مندرجہ ذیل خیالات ظاہر کیے ہیں[1]:

"وعبدالباقی را اورا کے بلند واستقامت طبع وذکاے ضمیر بمرتبۂ عالی بودو گاہے مرتکب شعر شدہ و خوب می گفت، ودیدہ ضمیرش در سخن بخلاف چشم ظاہرش کشودہ وبینا بود"

مآثر رحیمی کے علاوہ عبدالباقی کی کم از کم دو اور نثری تصانیف کا پتہ چلتا ہے جن کا ذکر مصنف نے اپنی اس تصنیف میں کیا ہے، مآثر رحیمی کے دیباچہ میں اپنے حالات اور امیر مغیث الدین محوی سے اپنے تعلقات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اس نے محوی کے دیوان رباعیات پر ایک دیباچہ لکھا تھا۔ اس کی اصل عبارت یہ ہے[2]:۔

"چوں دریں خلاصہ در احوال میر مذکور و در دیباچۂ کہ بر دیوان رباعیات ایشاں راقم نوشتہ مفصلاً ثبت است مکرر تصدیع نمی دہد....."

اس طرح مآثر رحیمی میں عرفی شیرازی کے حالات کے ضمن میں ابوالقاسم سرجا اصفہانی کے مرتب کردہ کلیات عرفی پر ایک دیباچہ لکھنے کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے[3]:۔

"...... وشرح احوال خیر مآل ایشاں مفصلاً از دیباچۂ کہ راقم بر کلمات حقیقت آیات ایں مالک ملک سخنوری نوشتہ ظاہر می شود......"

کلیات عرفی کے اس مشہور دیباچہ کی طرف سب سے پہلے علامہ شبلی مرحوم نے توجہ دلائی، لیکن وہ انھیں دستیاب نہ ہو سکا، شعر العجم میں عرفی کے ذکر کے سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ[4]

"عبدالباقی نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا جس میں عرفی کے حالات و واقعات درج کیے، چنانچہ مآثر رحیمی میں اس کا ذکر ہے، افسوس یہ نسخہ آج بالکل ناپید ہے، ورنہ بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں"۔

---

[1] عرفات العاشقین (مخطوطہ بانکی پور) ص ۱۰۹ [2] مآثر رحیمی ج ۱ ص ۱۳ [3] ایضاً ج ۳ ص ۲۹۵
[4] شعر العجم ج ۳ ص ۹۰

علمی دنیا کو اس مشہور دیباچہ کے وجود کا علم سب سے پہلے مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے ایک مضمون سے ہوا، جو معارف، نومبر ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا تھا جس میں انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانہ میں موجود کلیات عرفی کے ایک نسخہ کا تعارف کرایا تھا[1]، اور لکھا تھا کہ اس نسخہ کے ساتھ عبد الباقی کا وہ مشہور دیباچہ بھی منسلک ہے جس کی ضرورت مولانا شبلی مرحوم نے محسوس کی تھی[2]، راقم الحروف کو اپنی تحقیق کے دوران میں کلیات عرفی کے کچھ دوسرے ایسے نسخوں کا بھی پتہ چلا جن کے ساتھ یہ دیباچہ منسلک ہے۔ چنانچہ فہرست کتابخانۂ مجلس ملی، طہران مرتبہ ابن یوسف شیرازی سے پتہ چلتا ہے کہ کلیات عرفی کا ایک ایسا نسخہ جس کے ساتھ یہ دیباچہ منسلک ہے، طہران میں بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ راقم الحروف کو کلیات عرفی کے دو اس قسم کے نسخے لکھنؤ میں دستیاب ہوئے، ان میں سے ایک جناب یوسف حسین صاحب موسوی سابق صدر شعبۂ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کی ملکیت، اور دوسرا جلسہ تہذیب لائبریری میں ہے[3]، یہ دیباچہ حیات عرفی کے متعلق ایک قیمتی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اسے علمی دنیا کے سامنے پیش کیا جائے، بدقسمتی سے علی گڑھ اور لکھنؤ کے تینوں نسخے جو راقم الحروف کے پیش نظر ہیں، غلطیوں سے پاک نہیں ہیں، اس لیے کوشش کے باوجود اس دیباچہ کی درج ذیل نقل میں کچھ جملے صاف نہیں ہیں، بہرحال اس دیباچہ کے متن کو جس حد تک درست کیا جا سکتا تھا، درست کر دیا گیا ہے، اور اب وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔

---

[1] یہ نسخہ اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے کتب خانہ میں محفوظ ہے [2] معارف، نومبر ۱۹۲۲ء میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا مضمون "عنوان" فارسی کے دو نایاب دیوان" ملاحظہ فرمائیں [3] یہ نسخہ اب ٹیگور لائبریری لکھنؤ یونیورسٹی میں محفوظ ہے۔

دیباچہ کلیات عرفی شیرازی

از

عبدالباقی نہاوندی

حمدے کہ نخستین پایہ اش معراج دانشمندان سزد و توحیدیکہ اولین حرفش سرلوحۂ مجموعہ دانایان را شایان باشد مجموعہ طراز دیوان حقیقت و دفتر پیرائے کتاب طریقت و معرفت (کذا) ستائش گری خالقے را سزاست کہ رسوم شرعی و عرفی درمیان اولاد امجاد بنی آدم گزاشت و بہ وحرف کن عالم و آدم را بہ قلم قدرت نگاشت و بصور[1] مختلفہ و زبان متغائرہ نوع انسان را دریک حقیقت موجود گردانید و یکے را ہادی و راہنماے صاحبان ایمان و ارباب ایقان و دیگرے را باعث ضلالت و عصیان طائفہ از اہل طغیان نمود و حکمتے در ضمن ہر یک ازیں دو حکمت بالغہ متضادہ نہاد۔ و وجہ فعلے کہ عبث باشد دریں کارخانہ روا نیست و شفیعے و راہ نماے بجہت عاصیان امت و گمراہان خلقت مثل سید المرسلین و خاتم النبیین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بہ خلق فرستاد و اولاد و اصحاب و خلفائے او را طریقہ[2] شریعت غرا و ملت بیضائے او کرامت کرد و قرآن مجید و فرقان عظیم را بہ میانۂ عاصیان فرستاد و از ماضی و مستقبل خبر داد۔ متابعان فرمان مجید و پیروان رسول صاحب دید بہ طریق مستقیم شریعت غرا گرانید وازیں رگذر مستوجب بہشت عنبر سرشت آیند (کذا) و گمراہان و اہل شرکت و دروغ آرایند۔ نیک بخت کسانیکہ از گلزار معرفت بوے و از دفتر دانش حرفے و از نہال توفیق برے داشتہ باشند و دریں دو روزہ حیات مستعار حمد پیرا و نعت آرا و طاعت گرا

۱؎ بطور ۲؎ الفت

باشند و از روز ازل نیک بخت بعالم فدا رو جہان ناپائیدار آمده مواجب نفسانی و مطالب
شیطانی را ملازم نباشند بنه وجوده بر ضمائر قدسی مآثر منتظمان عالم دانش و بینش و موزونان
عرصۂ آفرینش و سخن سنجان طور نکتہ دانی و صاحب عیاران دار العیار معانی پوشیده و مخفی
نیست کہ از زمان ہبوط آدم پاک بریں توده خاک بہر وقتے نوعے از علوم بین الناس
جلالت و قدرے می یافتہ است و حکمائے آن قوم و علمائے آن ایام دران عمل می کوشیده اند
منہاج نبوت بہ آں استدراج می پوشیده اند چنانکہ بعد از نوح علیہ السلام دعوت و عزیمت
بروزگار ابراہیمؑ آتش پرستی و بہ دور موسیٰؑ سحر و سیمیا و بہ زمان عیسیٰؑ حکمت و طبابت و
مہتران آں قوم بران علم دعویٰ نبوت می کرده اند و ایں علوم را معجزه می دانستہ اند۔
پس قدرت بے علت الٰہی چناں اقتضا نمود کہ انبیاء الوالعزم صلوات اللہ علیہم اجمعین
را جہت ابطال آں ادیان و گوشمال ایشان مبعوث گردانید چنانکہ معجزه نوح دعائے
او بود و معجزه ابراہیم دخول او در آتش و معجزۂ موسیٰ عصائے مبارک او بود کہ آلات
و ادوات سحر را فرو برده و معجزه عیسیٰ دم او بود کہ مرده بازنده کردے و بوقت ظہور
خاتم النبیین فصاحت و بلاغت بہ نوعے اشتہار یافتہ بود کہ فصحائے عرب بہ ایں علم دعویٰ
نبوت می کردند و امیہ بن ابی صلت کہ پیشوائے مشرکاں بود کریمہ[1] .... در حق
آں گمراه نزول گردید و رسم دعوی باطل کردن ......(کذا!) و قرآن عظیم سبحانی مبطل
مزخرفات شیطانی فصحائے عرب شد۔ الحق سخن را رتبہ عالیست۔ علمے کہ قرآن شکنند
آں باشد کم علمے نیست۔

---

[1] میرے پیش نظر نسخوں میں سے کسی میں بھی اصل آیت موجود نہیں ہے لیکن یہاں غالباً سورہ اعراف کی درج ذیل آیت مراد ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيَاتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَأَتْبَعَهُ الشَّيْطَانُ فَكَانَ مِنَ الْغَاوِينَ

گر نبودے سخن چہ گفتے کس — در معنی چگونہ سفتے کس

گر بدے گوہرے ورائے سخن — او فرود آمدے بجائے سخن

و پایۂ فصاحت و بلاغت رفیع و وسیع است و حضرت ختمی پناہ صلی اللہ علیہ وسلم شعراء و فصحاء را معزز و مکرم می داشتہ اند و در اخبار و حدیث ہست کہ مدحِ آں سرور کائنات می گفتہ اند و در مجلسِ آں سرور می خواندہ اند و صلہ می یافتہ اند و قبل از بعثت حضرت رسالت شعراء را حکماء می گفتہ اند و می نوشتہ اند و ہر کس در علم شعر ماہر بودہ او را ماء السماء لقب بودہ امیر و سرور قبیلہ بودہ اند و امرؤ القیس کہ از مشاہیر شعرائے عرب است در ایام بادشاہ بودہ او را ماء السماء لقب بودہ و حکایت خواہر جاریہ قبطیہ[1] کہ حسان بن ثابت بصلہ شعر از حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یافتہ اظہر من الشمس است بذکر آں مصدع نمی شود۔ اما امام المتقین و یعسوب الدین علی بن ابی طالب علیہ السلام و اکثرے از کبار تابعین و مشائخ طریقت بگفتنِ اشعار رغبت نمودہ اند و در ہر قرن و زمان از فحول استادان ایں فن بودہ اند چنانکہ در زمان عرب جریر و اعشی و متنبی و امرء القیس و حسانؓ و فرزدق و دیگر استادان امتیاز داشتہ اند و در زمان بادشاہانِ اسلام خصوص جمعے کہ بعد از ہجرت سید انام[2] می بودہ اند مثل عنصری و رودکی و فردوسی طوسی و انوری و خاقانی و ادیب صابر و ابو الفرج رومی و کمال الدین اسماعیل صفاہانی و مولانا روم و حکیم سنائی و شیخ نظامی و امیر خسرو دہلوی و دیگر اکابر کہ ایراد و اسامیِ ایشان طول تمام دارد، بودہ اند و کوس استادی و لمن الملکی زدہ اند۔ و بعد ازیں امیران کلام نیز جمعہ دیگر

[1] خواہر جاریہ قبطیہ سے مراد حرم رسول حضرت ماریہ قبطیہؓ کی بہن سیرینؓ ہیں جو حضرت حسان بن ثابتؓ کی ملک یا زوجہ تھیں۔ [2] حضرت نبوی

اسپِ فصاحت و بلاغت در میدانِ دانشوری رانده اند تا زمانِ پادشاه دانا دل سخن شناس سلطان حسین مرزاے بایقرا کہ آں جماعت را الحال موزونانِ متقدمین می گویند طرزِ خاص و روشِ پسندیده بوده، دراں فن ید بیضا نموده اند۔ و در زمان مرزاے موحی الیہ مولانا عبدالرحمان جامی و میر علی شیر نوائی و بابا فغانی و اہلی شیرازی وکمسی شوستری و خواجہ آصفی و میر شاہی و دیگر دانشمندان و سخنوران بوده اند و طرز و روشِ خاص کہ (کذا) از قدما تجاوز نموده اند بہ طرزیکہ الحال در میان مستعدان است نزدیک است اختیار نموده سخن آفرینیا کرده اند و آں طرز را مستعدان و سخن سنجان پسندیده بہ آں رغبت نموده اند و آئین قدما از یں سہ رہگذر رحلہ نشین سراپرده صندوق [دا] زاویہ گزین طاقہاے منازل گشت (کذا) و چوں آں سخن سنجان سر در نقاب خاک کشیدند جمعے دیگر صاحب عیاران دار المعیار نکتہ دانی شدند مثل مرزا شرف جہاں و مولانا لسانی و شریف تبریزی و یحیی لاہیجانی و مولانا محتشم کاشی و ضمیری صفاہانی و وحشی بافقی۔ ایں طبقہ آئینے غیر آں طرز را اختیار نموده اند کہ بہ روشِ متاخرین آشنا تر شده اند۔ تا آنکہ نوبتِ جہانداری و ولایتِ سخن بہ میرزا قلی میلی و خواجہ حسین ثنائی و ولی دشت بیاضی و محمد میرک صالحی و قاضی نور الدین اصفہانی و حزنی اصفہانی و فہمی و حاتم کاشی و مولانا ملک و مرالی قمی و صبری ساوجی و حضوری قمی و عرفی شیرازی و طوفی تبریزی و میر صبری روزبہان و ہلاکی ہمدانی و میرزاے حسابی و نظیری و شیخ علی نقی کمرہ، و دیگر سخن سرایان بلاد عراق و خراسان رسید۔ ایں طبقہ یکبارہ منکر طرز متقدمین شده۔ خواجہ حسین ثنائی بیشتر از ہمہ قدم در وادی تازہ گوئی نہاد با آنکہ ضمیری صفاہانی و محتشم کاشی و دیگرانے کہ آں طرز را پسندیده اند و خوب می داشتہ اند۔ و ایں جماعت یکبارہ خود د

را از آن طرز و روش بیگانہ ساختند و مستعدان ایران را طرز این جماعت کہ آغاز تازہ گوئی و زبان (کذا) و تویع درہم بود بغایت خوش آمدہ اشعار آبدار ایشان را در سفائن خاطر خود ثبت می نمودند و ہر چہ بزبان حقیقت بیان ایشان می گذشت بدستور باد صبا در سراسر ایران و توران سیار می شد تا آنکہ روزگار میدان سخنوری و عرصۂ فصاحت و دانشوری را بوجود فائض الجود حسان الزمان مولانا عرفی شیرازی بیاراست و عنان تکران سخن را بکف کافیش نہاد و بکر معانی در حبالۂ طبعش در آورد و چشم روزگار را بزادن نونہالان گل عذار[له] معانی روشن و گوش عالمیان را باستماع آن لآلی آبدار شاہوار مخزن در عدن گردانید۔ و طرز متقدمین و متاخرین کہ قبل از زمان سخن سنجی و نکتہ گزاری او در میدان فصاحت اسپ بلاغت راندہ بودند منسوخ ساختہ طرز تازہ گوئی کہ الحال در میان مستعدان ربع مسکون پسندیدہ است، بمیانہ مردم عالم آورد فاضلان این فن و استادان این علم باین طرز معتقد شدہ پایۂ سخنوری و مدار نکتہ پردازی را بدان نہادند و شیخ ابو الفیض فیضی در ہندوستان و جمعے دیگر از فحول شعرائے ایران مثل حکیم رکنائے مسیحی و حکیم شفائی اصفہانی و مولانا ثنائی تکلو و سائر مستعدان و موزونان این روزگار طرز خود را بطرز او آشنا ساختند و نفوذ و تاثیر سخن را در سکہ خانۂ معانی بنام نامی خود مسکوک ساخت و خطبۂ بادشاہی ملک سخن و دانشوری بر منبر معانی بنام نامی خود خواند و این کارنامہ را در دنیا[ئے] اہل عالم بیادگار گزاشت۔ و پیش از دیگرے باین طرز و روش مستقل (کذا)، نہ شد و حرف نہ زد۔ و در اوائل کہ طبعش باین طریق سخن گفتن میل نمود[شہ] او را پسندیدہ نمی داشتند و حمل بر بعضے مقدمات می نمودند۔ و این رتبہ و حالت از شرف تربیت و اصلاح صاحب اقبال سخن شناس قدر دانی یافت کہ مربی و تربیت کنندہ

[له] گلزار [شہ] میل نمودند

تمامی مستعدان ربع مسکون است وا ورا (کذا) به این طرز سخن سنجی و نکته گزاری بدانایان آموزد چراغ دودمان سخن افروز قدر فزاینده متاع منیر [سخن دانی] گلدسته بند گل گلشن معانی، صاحب تمیز سخنان اهل دینی (کذا) قدرشناس بیدار بخت، برآرنده تاج و تخت خان خانان که صاحب قبله گاه او بود راه نمائی کرد. الحال در مطلب[۱] رود حقیقت حال مولانا عرفی رقم کرده آید.

فرزند خلف خواجه زین الدین علی علوی شیرازیست و پدر بزرگوار ایشان گاہے به پیشوائی قوم شیراز و گاہے وزیر داروغه آن شهر بوده که مولانا عرفی بعضے مقامات[۲] علمی را طے نموده و کسب حیثیات عالیه نموده و خط نسخ را بغایت نیکو می نوشت و در موسیقی وادوا بقدر وسع و توغلے داشت و به صحبت شعرا میل پیدا می کرد و گردیده[۳] وادی شعر و شاعری نهاد و چون پدرش وزیر داروغه بود، مناسبت شرعی و عرفی را منظور داشته عرفی تخلص کرد.

و اسم اصلی ایشان خواجه سیدی محمد است و سلسلهٔ ایشان را در ولایت فارس قدرے و منزلتے بوده و چون یک چند در دارالفضل شیراز با موزونان بسر برد و اشعار آبدار از بحر طبع به ساحل ظهور رسانید و قدم در وادی تازه گوئی نهاد و استادے و مرشدے در آن وادی می طلبید. درین اثنا صیت آوازه سخن سنجی و زمزمه نکته دانی و حقیقت موزونان ایران و هندوستان مثل مولانا شکیبی اصفهانی و نظیری نیشاپوری و ملتفی بیگ انیسی و ضمیر کاشی و کامی سبزواری و بقائی خراسانی و میر مغیث محوی و غنی همدانی و دیگر مستعدان در بارش سامعه افروز او گشت و حقیقت تربیت این نکته دانان در خدمت این سپه سالار با و رسید، قصه بندگی و ملازمت نمود و مس وجود خود [را] به اکسیر اصلاح این خلاصه دودمان علی شکری زر خالص ساختن پاے همت در رکاب سعی و اجتهاد در آورد[۴] و به هندوستان

---

۱ الحال مطلب به طلب رود ۲ مقدمات ۳ به وادی شعر و شاعری پا نهاده ۴ در آورده ؛ هندوستان در آمد.

در آمد۔ چند روز قبل از آں کہ خود را بدار العیار رساند بہ خدمت علامۂ زمان و افضل فضلائے دوراں نواب غفران پناہ رضوان جایگاہ جنت آرامگاہ حکیم ابوالفتح گیلانی کہ از مقربان بادشاہ ظل اللہ جلال الدین اکبر بادشاہ ہندوستان بود، رسانید۔ و دران زمان[1] خواجہ حسین ثنائی و سید محمد نجفی و حیاتی گیلانی و بسیارے از شعرائے نامدار کہ در خدمت مشار الیہ می بودند دریافت فضل و قدرت خود را بدیشاں ظاہر ساخت و بسیار مستحسن و مقبول طبع حکیم موصی الیہ و آں سخن سرایان سخن شناس افتاد۔ و شیخ ابوالفیض فیضی کہ از یاران نکا بادشاہ و ملک الشعرائے آں زمان بود بہ شرف استادی بادشاہ زادگانِ کامگار بختیار نامدار مشرف بود، از فحول شعرائے روزگار است و بعد از امیر خسرو دہلوی بہتر از وے در ہندوستان بر نخاستہ۔ بہ صحبت او میل پیدا کرد و طرز روش تازہ کہ اختراع او بود استماع نمودہ پسندیدہ داشت و سنجیدہ دانست و بقدر رعایتے کہ از حکیم موصی الیہ یافتہ و بعد از آں خود را بدربار فیض آثار صاحب دولتے کہ در ہوائے بندگی او بسیار بودند، رسانیدہ و بہ شرف صحبت مستعدان آں بزم فیاض و شاگردی آں ذی شان مشرف شد۔ و شرح اعزاز و اکرام و احترامے کہ ازیں سپہ سالار نسبت بایں زبدۂ فصحائے واقع شدہ از مآثر رحیمی کہ (کذا) راقم ایں کلمات عبدالباقی نہاوندی بنام نامی ایں سپہ سالار رقم زدہ، کلک سوانح پیما نمودہ (کذا) در خاتمہ احوال ایں بلاغت شعار فصاحت دثار ظاہر می شود و ایں مجمل را مجالِ ایراد آں نیست و در ایام بندگی ایشاں و دیگر ایام ہمیشہ بہ گفتن ابیات عاشقانہ عارفانہ میل نمودند و قصد افزائے فضل و رتبۂ خود می بودند و قریب بہ شش ہزار بیت از ابیات آبدار ایشاں بہ سببے کہ بر راقم ظاہر نیست مہجور و ابتر شد[2] چنانکہ خود دریں بیت فرمودہ:

لہ (حاشیہ ص ۲۷۷ پر)

وصد شرح ہنر چون نہ شود محو کہ من — شش ہزار آیت احکام ہنر باختہ ام

ودر ایام مصاحبت و ملازمت ایشان بدستورے معزز و مکرم بود کہ کورنش و تسلیمے، کہ در ہندوستان مقرر و معمول است کہ پادشاہان را اکابر و اعیان می کنند، بہ ہیچ کس نمی کرد ودر مجالس بر ہمہ کس تقدیم می نمود و اہل زمان بہ جہت طبیعت عالی و ابیات متعالی تقدم اورا قبول داشتند۔ بغایت بلند ہمت و عالی فطرت بود وتا آنکہ بتاریخ نہصد و نود و نہ ہجری در دار السلطنت لاہور، در سنہ سی و شش سالگی متقاضی اجل بساط عمرش در نوشت و مرغ روحش از شاخسار عالم فانی بہ گلستان جہان جاودانی شتافت و یکے از مستعدان استاد البشر تاریخ آن قضیۂ ناگزیر یافت و او در ہمہ شہر مدفون شد۔ آخر از نتیجہ این بیت کہ در مدح سرای سرور اولیا فرمودہ ؎

بکاوش مژہ از گور تا نجف بردم — اگر بہ ہند بخاکم کنند یا بہ تتار

میر صابر اصفہانی نعش اورا بتاریخ سنہ ثمان و عشرین الف از لاہور بہ نجف اشرف نقل نمودہ در ان ارض مقدس مدفون ساخت و آرزوے بخاک بردہ مولانا را آن نیک بخت برآورد۔ و در ہنگام وداع این دار فنا مسودات اشعار افکار ابکار خود را بہ کتاب خانہ آن عالی شان فرستاد و التماس نمود و بہ یمن ہمت توجہ شاہوار این مضمار دانش و مرکز سخن دانی از پریشانی بہ جمعیت گرایند و آن نازک نہالان گلزار معانی و نوبادگان بوستان طبیعت این خسرو ثانی بدستیاری توجہ و تربیت

(حاشیہ ص ۲۶۶) عرفی کے چند خطوط راقم الحروف کو دستیاب ہو چکے ہیں، ان میں سے ایک خط عرفی کے ایک ایسے دوست کے خط کا جواب ہے جس نے عرفی سے اس کا دیوان عاریتاً مانگا تھا اور وہ اس سے ضائع ہو گیا تھا، اس خط سے یہ بات صاف ہو کر یہ چودہ ہزار اشعار کا دیوان عرفی کے ایک دوست نے اس سے لیکر ضائع کر دیا تھا۔

بہ شیراز و جمعیت در آیند و ازیں رہگذر کہ تربیت کردہ و پرور دہ ایں سپہ سالار باشد صدر نشین محافل و مجالس عالمیان گروند مرتب و مدون سازند (کذا) ایں بزرگ و انار اگوناگوں سوگواری روئے داد کہ چناں سخندان نکتہ گزار و چنیں قسطاس دانشوری و سعدی ملک سخنوری نماند (کذا) و ایں طور روانائی رخت بربست و انچہ لازمۂ بزرگی بود در مہمات نیز بہ عمل آمد و ایں مسودات کہ تمامی بہ خط ید آں دانش پژوہ بود در کتاب خانۂ عالی ایشان کہ مکتب خانۂ اہل عرفان ست.

مدتے بود و بعضے موانع وصیت و التماس او را در تعویق انداختہ بود تا آنکہ بتاریخ ہزار بست و چہار ہجری حقوق و خدمت مداحی او ایں مقدمہ را در خاطر خطیر ایں سپہ سالار آوردہ بہ وصیت آں معیار دانشوری عمل نمودہ بآں مسودات، کہ ہر مصرع از اں ماہ آسمانِ فلک معانی و خورشید جہانتاب جہان سخندانی بود، جیب و کنار حلقۂ اہلیت و استعداد محمد قاسم خلف خواجہ محمد علی اصفہانی مشہور بہ سراجا کہ از جملہ آدمی زادگان اصفہان است، گلزار[1] معانی و گلشن جادو وانی ساختند۔ و بہ جمع و تدوین ایں زلہائے طبع آں آزاد مرد، کہ ہر یکے از غایت معانی بلند و مضامین دل پسند در عالمے نگنجد، فرمان داد، اگرچہ مولانا موصی الیہ در ایام حیات خود دیوانے را از قصیدہ و غزل و رباعی ترتیب دادہ بود و ایں رباعی کہ احاد مصرع تاریخ با عدد قصیدہ و عشرات با عدد غزل و مآت بہ ابیات قطعہ و رباعی موافق است در تاریخ آں دیوان گفتہ بود ؎

ایں طرفہ نکات سحری اعجازی چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی
مجموعہ طراز قدس تاریخش یافت اول دیوان عرفی شیرازی

بعد از نمودن سفر آخرت ایں مسافر عالم قدس بعضے اشعار متفرقۂ ایشان را کہ در سفائن مجموعہا ثبت بود، بعضے از مستعدان براں افزودند چنانچہ قریب بہ ہشت ہزار بیت بہ نظر در آمد

---

[1] گلزار

چنانکہ سراپا بہ ایں سعادت موفق گشتہ، امتثال امر فرمود۔ در عرض یک سال و نیم بعد از مشقت بسیار کلیاتے مشتمل بر چہاردہ ہزار بیت از قصیدہ و غزل و رباعی و مثنوی و قطعہ و ترکیب و ترجیع ترتیب داد و الحق د رید بیضا نمود چرا کہ آں مسودات در ہنگام مقابلہ و ترتیب گاہے سامعہ افروز راقم می گشت، بنہایت مشوش و ابتر بود و ایں قطعہ در باب ترتیب و تاریخ ایں کلیات از نتائج طبع وقاد سراپا جامع ایں کلیات ست کہ نوشتہ است۔

عرفی آں واضع سخن کہ برد — رشک دارد رُوان شروانی
بہ کہ شروانی است در رشکش — ملکہ رومی و ہم صفاہانی
بعد چندے چو جائے بودن نیست — رفت ازیں دیر ششدر فانی
ماند ازو در شاہوارے چند — کش قرین نیست بحری و کانی
صورت چند جملہ با معنی — خلقتے چند جملہ روحانی
لیک آں جملگی پراگندہ — ہمہ از بے سری و سامانی
آں قدر مہلتش نہ داد اجل — کہ بہ ترتیب شاں شود بانی
گفت با دوستاں بگاہ وداع — کے عزیزان چشمی و جانی
برسانید زادہائے مرا — بجناب معلم ثانی
پیر کان بریدہ کانے را — سوئے عمان برید عمانی
صاحب علم و حلم و سیف و قلم — خان خانان سکندر ثانی
آں کہ در روز بار می رسدش — کہ سکندر کندش دربانی
چوں کمالات را بود معدن — سزاوار عقل اولش خوانی
دید چوں زادہائے عرفی را — جملہ محسود لعل پیکانی

۱؎ کر ۲؎ کز

همه نا خواننده و لیک تیمم | جمله چون زاد باشے پنهانی
چند یک چند بنده را فرمود | که دهم شان نظام دیوانی
مدت چند خون دل خوردم | تا که جمع آمد از پریشانی
هم به اقبال صاحب کامل | هم به توفیق لطف یزدانی
جاے انتظام این اوراق | شد سراچهٔ خان خانانی
از خرد خواستم چو تاریخش | گفت ترتیب را دونادانی

۱۰۲۶ھ

در زمانے که این ثمرهٔ خدمت را به تقدیم رسانید، رای حق به مولانا عرفی انداخت و در شهر برهان پور صوبه خاندیش این قطعه و کتاب را به نظر اصلاح ایشان می رسانید، و قسم از حواشی نشینان آن بزم فیاض بود. مقبول و مستحسن افتاده به انواع صلات و انعامات سرفراز گردید. الحال این کلیات در کتب خانهٔ عالی ست و الحق هیچ یک از فصحاے زمان به این خوش دیوانے نیستند و اگر روزگار امانش می داد ترقیات کلی می نمود[1] و ده برابر این بالقوه اش به فعل می آمد. و مستعدان به نوشتن این کلیات میل پیدا کردند و اکثرے نویسانیدند[2]. الحال کلیاتے که در میان مستعدان معتبر است، ازین جا نقل شده. و این سپه سالار قدردان چنانکه در ایام حیات به این طبقه لطف و عنایت داشتند، در ممات نیز به ابکار افکار ایشان دارند و تربیت کرده و مداحان خود را از خاک مذلت بر می دارند و گلدستهٔ مجالس و محافل می سازند و امثال این طائفه را به الطاف و اشفاق سرفراز می نمایند. امید وار به درگاه الهی چنان ست که سایهٔ مرحمت و الطاف این گلدستهٔ هند گلشن معانی بر سر اهل زمان، بتخصیص موزونان و مستعدان مستدام و پاینده باد۔

---

[1] می نمودند [2] نوشتانیدند۔

نقد کی تاریخی، لغوی اور اصطلاحی ماہیت

از

جناب وقار احمد صاحب رضوی ایم اے

نقد کی تاریخ کا آغاز دوسرے فنون لطیفہ کی طرح، یونان میں ہوا۔ اہل یونان شروع ہی سے نقد کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے، ان صلاحیتوں کا اظہار اُس وقت ہوا جب اہل یونان نے شعراء کے عیوب و محاسن کی نشاندہی کی، ان کے پاس نقد کے کوئی مقررہ اصول نہیں تھے، بلکہ ان کے وہاں نقد کی کسوٹی، ذوق، تھا۔

پھر وہ دور آیا جب ایلیڈ اور اوڈیسا کی نئے سرے سے تدوین کی گئی، اس کوشش سے دونوں قصوں کا پہلی بار ایک معتبر نسخہ تیار ہوا، اس سے تنقید کی راہیں استوار ہوئیں بھی مدد ملی اور آیندہ کے لیے ایک حد قائم کر دی گئی۔

پھر پانچویں صدی قبل مسیح کے نصف اول میں تمثیلی شاعری نے ایتھنس میں زور پکڑا، تو ادبی تنقید نے ترقی کی اور شعراء کے لیے یہ ممکن ہوا کہ وہ تمثیلی شعر میں جو تنقید حیات سے عبارت ہے اور زندگی کے مختلف احوال کی اصلاح کرتا ہے، وسعتِ نظر، جامعیت اور عمق پیدا کریں اس اصلاحِ حال سے نقد کا میدان بھی وسیع ہوا اور اس میں گہرائی آئی۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں یونان کی حیات اجتماعی میں مختلف لحاظ سے تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک تو یہ کہ فلسفہ کے ساتھ ساتھ عقلیت

آگے بڑھی اور یونان میں سوفسطائیت[1] کا غلبہ ہوا،

سوفسطائی چونکہ حقیقت پر اعتقاد نہیں رکھتے تھے، اس لیے خطابت کے شیدائی تھے، اور اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جمہور پر خطابت اثر انداز ہوتی ہے، اس نظریے نے خطابت کو فروغ دیا، لوگوں میں خطابت کے سیکھنے کا شوق پیدا ہوا، خطابت کے معنی، اس کے اسلوب، خطاب کرنے والے اور جمہور کے درمیان رشتوں کو مضبوط کیا۔

دوسری طرف اسی صدی کے نصف آخر میں آرٹ، نقاشی، تصویرکشی اور موسیقی کو عروج ہوا، فنی گوشوں میں تازگی اور نشاط پیدا ہوا، پھر ایسے فلسفیانہ خیالات اور نظریات پیدا ہوئے جنھوں نے بت پرستی اور ان افکار میں شک پیدا کر دیا جو اہل یونان کا ورثہ تھے، اور دانشوروں کے ایک گروہ نے قدیم یا قدیم روایات سے انکار کر دیا، ترقی پسندوں اور رجعت پرستوں کے اس ٹکراؤ سے ادب میں ایک نیا گروہ ـــ تجدد پسندوں کے نام سے رونما ہوا،

اس نئی تحریک نے نقد فلسفی یا النقد عند الفلاسفہ کو جنم دیا، یونان کے ادب اور جمالیاتی حس نے اسی عقلی نقد سے زندگی حاصل کی، اس کا اثر قدیم عربی ادب اور جدید مغربی ادب سب پر پڑا، یہ نقد فلسفی ـــ لفظ، معنی، موضوع سب پر حاوی تھا، اور اس نے ایلیڈ اور اڈیسہ پر نقد و تبصرہ کیا، اسی تحریک کے زیر اثر اسے تنقیدی ڈرامے لکھے گئے جن سے قدیم کی مذمت، اور اسلوب، مواد اور موضوع کے اعتبار سے قدیم تمثیل نگاری کے مسالک کی تردید ہوتی ہے، اس کی مثال ارسطوفان Aristopanes کا "قصۃ الضفادع"[2] مینڈکوں کا قصہ ہے

---

[1] سوفسطائی: ان لوگوں کو کہتے ہیں جو تشکیک کے شکار ہیں اور عالم کو ایک حقیقت نہیں محض دھوکا تصور کرتے ہیں، انکے فلسفہ کی بنیاد وہم پر ہے، کیونکہ وہ حقائق کو نہیں مانتے، اس اعتبار سے سوفسطا اس فلسفہ کو کہتے ہیں جس کی بنیاد وہم پر ہے یعنی جھوٹا فلسفہ بلکہ ملمع۔ [2] یہ ۴۰۵ قبل مسیح کی تصنیف ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ تصنیف معری کے "رسالۃ الغفران" سے مشابہ ہے یا معری کا "رسالۃ الغفران" اس سے مشابہت رکھتا ہے۔

سوفسطائی حقائق اشیاء سے انکار کرتے ہیں، وہ فقط تاثر لذت کی دعوت دیتے ہیں اور مخاطب کی تسکین خاطر پر اکتفا کرتے ہیں، دلیلوں سے مخاطب کو خاموش کر دیتے ہیں، اس خاموشی سے کچھ فائدہ ہے یا نہیں، اس سے ان کو کوئی غرض نہیں، وہ ذات کو صرف قانع بنانے پر اعتقاد رکھتے ہیں یعنی وقتی لذت یا محض لذتِ تاثر کے قائل ہیں۔

پانچویں صدی قبل مسیح کے آخر میں سقراط نے سوفسطائیوں کے اس نظریہ کی تردید کی، سقراط اگرچہ پہلے خود بھی سوفسطائی تھا، لیکن بعد میں نہیں رہا، اس نے حقائق اشیاء کا ادراک کیا، اور اساتذہ کے مذہب فسطائیت کی مذمت کی، سقراط نے بیان یا علم بلاغت کی یہ تعریف کی کہ فن بلاغت حقائق کے انکشاف کا نام ہے، اس میں وہ مکالمات کے مشہور طریقہ پر گامزن ہوا، اور ڈرامائی طرز خطاب اختیار کیا، صاحب نظریۂ تصویر افلاطون نے اس میں سقراط ہی کی پیروی کی۔

افلاطون ادب کو وحی اور الہام کا درجہ دیتا ہے[1]، اس کے نزدیک نقد ادبی نفوس طبیعت اور اس کے احوال کے جاننے کا نام ہے، وہ نقد ادبی میں یہ بات بھی شامل کرتا ہے کہ طبیعت اور نفس کی طاقت کیسی ہے؟ طبیعت اور کلام بلیغ میں تناسب ہے یا نہیں ہے، وہ ماحول اور کلام کے باہمی تعلق پر زور دیتا ہے، اور ادب کو معلومات کا ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔

ارسطو نے اپنی کتاب "الخطابت والشعر" میں اصول بلاغت اور نقد کے ان تمام موضوعات

---

[1] امثالِ افلاطونی یا مُثلِ فلاطونیہ: یہ ہیں کہ وجود اور ماہیت ایک چیز ہیں، ماہیت کا درجہ، وجود سے پہلے ہے، ہر چیز سے پہلے کچھ حقائق ہوتے ہیں، جیسے مکان بننے سے پہلے اس کا نقشہ، ان کو حقائق امکانیہ کہتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ثبوت کا درجہ وجود سے پہلے ہے، اسی پر افلاطون نے اپنے نظریہ تصویر کی بنیاد رکھی ہے وہ کہتا ہے علم واجب ہے، غیر واجب ہے، الگ تھلگ ہے، یعنی حقائق امکانیہ کا ثبوت، ظاہری وجود کے علاوہ ہے جو واجب ہے بالکل منفصل ہے، اسی کو مُثل فلاطونی کہتے ہیں۔

پر سیر حاصل بحث کی ہے، ارسطو نے سب سے پہلے شاعری کو نقالی سے تعبیر کیا، اور انسان کو ایک سیا
جانور بتایا، ارسطو نے ارادے کو اپنے علم اور عقیدے کے خلاف استعمال نہیں کیا، اس نے نئی
چلن رائج کیا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جو فرد یا قوم اجتماعی طور پر ارادے کا صحیح استعمال نہیں کرتی وہ
سیاسی غلامی اور روحانی بحران کا شکار ہوتی ہے، ارسطو نے حال کے شعور میں ماضی کا چہرہ
اور مستقبل کے آئینے میں حال کا احساس بیدار کیا، اس نے نفی سے مثبت کو
اخذ کیا، اور جدلیت کو نشاط تخلیق کا راستہ بنایا، اس نے منطقی قیاس اور استدلال کے
اصول کو عالم مادی پر منطبق کیا، وہ ہر تخیلی اکتساب کو مادی دنیا کا تخلیقی عکس تصور کرتا ہے
اور شاعری کو فنون لطیفہ کی شاخ مانتا ہے۔

جس طرح یونان میں نقد پہلے سلبی یا انفعالی تھا، اسی طرح عربوں میں ابتداً نقد سلبی تھا
اور اس کا مدار محض ذوق پر تھا، اس کے قوانین مدون نہیں تھے، جاہلیت میں شعر اور شاعر کے
بارے میں غور و خوض کرنے کو نقد کہتے تھے، شعراء کے باہمی مقابلہ، اسواق عرب میں انکے اجتماع
بادشاہوں اور نوابوں کے درباروں میں شعر و شاعری کے چرچے نے نقد کو پروان چڑھایا۔

شعر و سخن کے مقابلوں اور ادبی مباحث کے لیے عربوں کے یہاں ادبی مجلسیں منعقد
ہوا کرتی تھیں، جن کو "اندیہ" کہا جاتا تھا، قریش کی مجلس کا نام "نادی" اور جوار کعبہ کی مجلس کا
نام "دار الندوہ" تھا، ان مجالس سے عربی نقد و ادب میں ترقی و اضافہ ہوا، ان کے علاوہ
عرب میں مختلف مقامات پر موسمی بازار اور سالانہ میلے ہوا کرتے تھے، جہاں ہزاروں کی تعداد
میں لوگ جمع ہوتے تھے، ان میں "سوق عکاظ" زیادہ مشہور ہے، "ذو المجاز" اور "ذو المجنۃ"
بھی اہم میلے تھے، ان اسواق میں مشاعرے بھی ہوا کرتے تھے، اور آجکل کے پریس، اخبار
انجمنوں اور رسائل کا کام انجمن اسواق کے ذریعہ لیا جاتا تھا،

حسان بن ثابتؓ کا شعر ہے ؎

لنا الجفنات الغر یلمعن بالضحی — واسیافنا یقطرن من نجدة دما

ہمارے لیے بہت سے روشن لگن (خوان کرم) ہیں، جو دھوپ کے وقت خوب چمکتے ہیں یعنی ہم سخی ہیں،
اور ایسی تلواریں ہیں کہ شجاعت کی وجہ سے ان کے منہ سے خون ٹپکتا ہے، یہ ہماری بہادری کا عالم ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سوق عکاظ میں جب حسان بن ثابتؓ نے مذکورہ شعر پڑھا تو نابغہ ذبیانی نے اس شعر پر برجستہ حسب ذیل تنقید کی۔

۱۔ اگر حسان غر کے بجائے بیض کہتے تو اچھا ہوتا، کیونکہ غر اس قلیل سفیدی یا سفیدی کے اس چھوٹے دھبہ کو کہتے ہیں جو کسی دوسرے رنگ کے درمیان واقع ہو، اگر وہ بیض کہتے تو اس میں غرۃ کی بہ نسبت زیادہ مبالغہ ہوتا۔

۲۔ اسی طرح اگر حسان یلمعن بالضحی کے بجائے یلمعن بالدجی کہتے تو زیادہ اچھا تھا، کیونکہ دن میں چمکنا کوئی بڑی بات نہیں۔

۳۔ اسی طرح اگر یقطرن کے بجائے یجرین کہتے تو زیادہ غلو کے معنی پیدا ہوتے کیونکہ جری یجری کے معنی بہنے کے ہیں، اور ٹپکنے اور بہنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں ذیل کی باتیں کہی گئیں:

۱۔ غُر سے شاعر کا مقصد لگن کی چمک نہیں بلکہ خوان کرم کا خلق میں مشہور و معروف ہونا ہے، جیسے کہا جاتا ہے یوم اغر اور ید اغر، ان دونوں جگہوں پر اغر کے معنی حقیقۃً چمک نہیں بلکہ مشہور و معروف کے ہیں۔

۲۔ اسی طرح ضحی کے بجائے دجی کا لفظ بھی صحیح نہیں، کیونکہ دن میں وہی چیز چمکتی ہے جو زیادہ روشن اور درخشاں ہو، اس کے برخلاف رات میں خفیف چمک والی چیزیں

بھی نمایاں ہو جاتی ہیں، یہی حال چراغوں اور فانوسوں کا ہے۔

۳- تیسرا اعتراض عربی محاورے اور روزمرہ کے خلاف ہے، اہل عرب شجاع اور بہادر کی تعریف کے موقع پر سیفہ یقطر دما بولتے ہیں۔ سیفہ یجری دما نہیں بولتے، اگر شاعر یجرین دما کہتا تو خلاف قیاس لغوی ہوتا،

اس تنقید سے ثابت ہوتا ہے کہ نقد کے اصول اور ضوابط ناقد کے ذہن میں بالقوۃ موجود تھے، ایام جاہلیت میں عملی تنقید کے اس قسم کے بہت سے واقعات[1] ملتے ہیں، گو اس زمانہ میں فن نقد مرتب نہیں ہوا تھا، لیکن بعد کی صدیوں میں ادبی ثقافت پر ان مجالس انتقاد کا گہرا اثر پڑا، ان ہی میلوں ٹھیلوں اور ادبی محفلوں کی بدولت عربی ثقافت اور نقد نے نشو و نما پائی، اسلوب و آہنگ نے حیات ادبی کو نشاط و تازگی عطا کی، اور نقد نے ادبی دراست کے فرائض انجام دیے، شاید اسی وجہ سے الشعر دیوان العرب کہا جاتا ہے۔

دور جاہلیت میں کلام پر رائے میں جنبہ داری اور خاندانی عصبیت کو بھی دخل تھا، ہر قبیلہ اپنے شاعر کو اچھا کہنے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت لفظ و معنی یا مواد و ہیئت دونوں نقد میں شامل تھے، مگر یہ نقد سلبی تھا، اس کا اعتماد تاثر پر تھا، کوئی ضابطہ کلیہ نہ تھا، شعر کی قیمت اور شاعر کا مرتبہ اہل ذوق متعین کرتے تھے، جیسا تاثر ہوتا ویسا ہی تبصرہ کیا جاتا تھا، گویا تاثر شخصی کا دوسرا نام نقد تھا،

ایک بات یہ بھی کہ ہر شاعر کا ایک راوی[2] ہوتا تھا، اس کا کام اپنے شاعر کی طرفداری

---

[1] مثال کے طور پر یہ مشہور مقولہ بھی جاہلی تنقید کی اچھی مثال ہے: اشعر الشعراء امرؤ القیس اذا رکب والنابغۃ اذا رھب والزھیر اذا رغب والاعشی اذا طرب۔ [2] جاہلیت کے بعض مشہور رواۃ کے نام یہ ہیں:
مخرمۃ بن نوفل۔ ابوالجہم بن حذیفۃ۔ حویطب بن عبدالعزیٰ۔ عقیل بن ابی طالب

کرتا تھا اور اپنے حافظہ، ذہانت کے ذریعہ اسکے کلام کو محفوظ رکھتا تھا، چنانچہ زہیر اور نابغہ کے مسالک شعر کو الگ الگ دبستان شاعری تسلیم کیا جاتا تھا، شعر کے علاوہ نثر کے شہ پاروں اور ماہرین لغت وادب کے الفاظ وخیالات کی باقاعدہ روایت کیجاتی تھی، اسلیے عربی ادب میں ترسیل وروایت کو خاص اہمیت حاصل تھی، عہد اموی تک روایت شعری کا سلسلہ جاری رہا، پھر انہی راویوں، جیسے ابوعمرو بن العلاء، متوفی ۱۵۴ھ، حماد الراویۃ متوفی ۱۵۶ھ، خلف الاحمر متوفی ۱۸۰ھ، ابوعبیدہ متوفی ۲۰۹ھ، الاصمعی متوفی ۲۱۶ھ کے ذریعہ شعرائے جاہلیۃ کے کلام کا بڑا ذخیرہ محفوظ کیا جاسکا، جس کی ترتیب وتدوین کی جانب پہلا قدم عصر عباسی میں اٹھایا گیا،

رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے دنیائے عرب میں سیاسی اور ذہنی انقلاب آیا، اسلام نے ان کی معاشرت، تہذیب وتمدن، ادب اور علوم وفنون پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی زندگی کے پورے ڈھانچہ کو بدل دیا۔ اس سے ان کے ادبی وعلمی رجحانات میں تبدیلی واقع ہوئی، جاہلیت میں عرب اپنی عصبیت پروری اور نسبی فضیلت پر فخر کرتے تھے، اسلام نے اس کو مٹادیا۔

ان من الشعر لحکمۃ وان من البیان لسحرا۔ اس حدیث سے نبی اکرمؐ کے تنقیدی شعور کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اسی طرح امرأ القیس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے ھو اشعر الشعراء وقائدھم الی النار سے بھی آپکے تنقیدی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ صرف اس شعر کو ترجیح دیتے تھے جو لوگوں کو اخلاق فاضلہ کی تعلیم دے۔ اس لیے پاکیزہ شعر کو پسند کرتے تھے، خلفاء میں حضرت عمرؓ کی وہ تنقید جو انھوں نے زہیر کے کلام پر کی تھی، ایجابی نقد کی ایک علامت ہے۔

یہ تنقید شعر کی تفسیر بھی کرتی ہے اور اس میں نقد کے اسباب و علل کی طرف نشاندہی بھی ہے۔

انہ کان لایعاظل فی الکلام	زہیر کے کلام میں الجھاؤ نہیں، وہ نامانوس
وکان یتجنب وحشی الشعر	اور غریب الفاظ استعمال نہیں کرتا اور
ولم یمدح احدا الا بما فیہ	غیر واقعی اوصاف سے کسی کو متصف نہیں
	کرتا، یعنی مدح میں غلو سے کام نہیں لیتا،

مخضرمی شعراء میں حسان بن ثابت متوفی ۵۴ھ، کعب بن زہیر متوفی ۲۴ھ، عبد اللہ بن رواحہ متوفی ۸ھ، خنساءؔ متوفی ۲۴ھ اور الحطیئۃ العبسی کے نام قابل ذکر ہیں،

پہلی صدی ہجری میں نقد کے مفہوم میں کچھ وسعت آئی، لفظ معنی، وزن، اخلاق اور سیاست شعر کے تمام عناصر نقد میں شامل ہوگئے، قوت کلام کے لحاظ سے شعراء کے طبقات مقرر کیے گئے، عہد جاہلی کے نقد کا مدار ذوق پر تھا، ظہور اسلام کے بعد نقد میں وسعت پیدا ہوئی، شعراء کے باہم موازنے ہونے لگے، جو نقد جاہلی کے مقابلہ میں ایک طرح کی ترقی ہے، اس دور کے اہم شعراء کے نام یہ ہیں: جریر متوفی ۱۱۰ھ، فرزدق متوفی ۱۱۰ھ، اخطل متوفی ۹۵ھ، ذوالرمۃ متوفی ۱۱۷ھ، جمیل متوفی ۸۲ھ، کثیر عزہ متوفی ۱۰۵ھ اور عمر بن ابی ربیعہ متوفی ۹۳ھ،

اسی صدی میں فنی نقد کے ساتھ ساتھ لغوی اور نحوی نقد بھی پیدا ہوا، اس کی نشو ونما میں اہل لغت اور اہل نحو نے حصہ لیا، یہ علمائے لغت اور نحو، خاص طور سے بصرہ اور کوفہ سے تعلق رکھتے تھے، یہ نقد اس نسبت کی بنا پر تھا جو ادب کو لغت، نحو اور عروض سے ہے، نقد کے ذیل میں شاعر کے ماحول اور شخصیت سے بھی بحث

کیجاتی تھی، اور شعر کی ہئیت اور اسلوب سے بھی، اس طرح نقد کا دامن وسیع ہوا، جاہلیت کے طبقۂ اولی میں عدی بن زید کو شعرائے ریف میں اسی وجہ سے شمار کیا جاتا ہے کہ شہری اثرات نے ان کے کلام کو کمزور بنادیا تھا، اس میں بداوت باقی نہیں رہی تھی، بداوت کی سادہ زندگی اور دیہی حسن جو شاعری کی جان ہے، اس کے کلام سے جاتا رہا تھا، اور شہری زندگی کے ماحول اور اس کے اثرات نے اس کی شاعری میں حضارت پیدا کردی تھی۔

دوسری صدی ہجری میں شعرائے محدثین کا گروہ تیار ہوا، اس طبقہ نے جس کو مولدین کہا جاتا ہے، قدیم عربی شاعری کے عناصر کھنڈرات کا ذکر، کسی ٹیلے کے قریب جاکر گذشتہ یادوں کو تازہ کرنا، دیار محبوب کا تذکرہ، تالاب اور پانی کے چشموں کا بیان اور ان کے قدرتی مناظر کی تصویر کشی وغیرہ ترک کردیے اور انکے بجائے رندی و سرمستی، مے و مینا اور الحاد کے مضامین کو موضوع سخن بنایا، اس گروہ کا سرخیل ابو نواس متوفی ۱۹۹ھ تھا، اس کے معاصر شعراء میں بشار بن برد متوفی ۱۶۷ھ، ابو العتاہیہ متوفی ۲۱۱ھ اور مسلم بن الولید (صریع الغوانی) متوفی ۲۰۹ھ کے نام آتے ہیں۔

اس صدی میں سامی نسلیں آریوں سے ملیں، جس سے ان کی حیات اجتماعی اور فنی میں تبدیلی پیدا ہوئی، محدثین نے اپنا الگ راستہ تلاش کیا، انھوں نے قدیم بدوی محاورے چھوڑ دیے اور بداوت کے بجائے حضارت کو موضوع بنایا اس تغیر کا اثر الفاظ، معانی، وزن اور شعر کی ساخت اور اسکی پوری ہیئت میں ہوا، ان شعرائے تمثیل نگاری کے بجائے، غنائی شاعری اور تغزل کو اپنا شعار بنایا، اسی صدی

میں قدیم اور جدید شاعری میں موازنے کرنے والے ناقدین ابھرے، قدیم سے مراد جاہلیت اور صدر اسلام کی شاعری ہے، جس میں یہ ناقدین قدیم کو نمونہ بناتے ہیں، نیا دور زندگی کے تقاضوں کے ساتھ چلتا ہے، نقد نے قدیم سے جو ورثہ پایا تھا، اس دور میں اس میں ترقی ہوئی، یہ حالت تیسری صدی ہجری تک باقی رہی،

اس دور کے علما، اور محققین نے اسلامی ثقافت کو آپس میں تقسیم کرلیا، علمائے دین نے قرآن، حدیث، فقہ اور اصول فقہ کی طرف اپنی توجہ مبذول کی، اہل لغت لغت کی تدوین میں مشغول ہوئے، کچھ لوگوں نے نحو اور عروض کو مرتب کیا، مترجمین نے یونان، ایران، روم، سریانی و ہندوستانی علوم کی کتابوں کو عربی میں منتقل کیا،

دوسری صدی ہجری ہی میں المفضل الضبی متوفی ۱۶۸ھ نے اپنی کتاب "المفضلیات" تالیف کی، عربی شاعری کے منتخبات میں "السبع المعلقات" کے بعد "المفضلیات" ہی کا درجہ ہے، اس مجموعہ میں ۱۲۸ قصائد ہیں، ان قصائد کو المفضل الضبی نے خلیفہ منصور کے حکم سے اس کے بیٹے مہدی کے لیے منتخب کیا تھا، اس مجموعہ کا اصل نام مختارات یا اختیارات ہے، لیکن بعد میں مدون کے نام سے مشہور ہوگیا۔

دوسری صدی ہجری میں سکینہ بنت حسین کی مجالس انتقاد بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں، خاندان بنی حکم کے عہد میں سیدہ سکینہ ـــ دختر حسین شہید کربلا، نہایت نامور اور ممتاز خاتون گذری ہیں، جو حسب و نسب، حسن و جمال، ظرافت و شرافت، زہد و پارسائی، ہر لحاظ سے اپنے زمانہ کی خواتین میں نہایت بلند درجہ رکھتی تھیں، ان کا مکان شعراء، ادباء، علماء، و اصحاب کمال کا مرکز بنا ہوا تھا، اس میں علمی محفلیں اور تنقیدی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں،

تیسری صدی ہجری فقہ اور عربی شاعری کے لحاظ سے بہت اہمیت رکھتی ہے، اس

صدی میں جہاں بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے وہاں عربی اصولِ نقد کو بھی مدون کیا گیا۔ شعرا میں ابو تمام متوفی ۲۳۱ھ، البحتری متوفی ۲۸۴ھ نے جدید شعر کی خصوصیات اور اس کے عیوب سے واقفیت حاصل کی۔ نقدِ قدیم نے وسعت اور ہمہ گیری کے اعتبار سے اس صدی میں بڑی ترقی کی،

اسی صدی میں تقریباً ہر بڑے ادیب نے فنِ تنقید میں انفرادیت حاصل کی، ان کو قدیم عربی ادب پر عبور کے ساتھ جدید ادب میں بھی مہارتِ تامہ حاصل تھی، اور انھوں نے ادب کو فطری جمال اور اسلوب سے ہم آہنگ کیا، اس سے ان کا ذوق صحیح، پاکیزہ، لطیف اور مہذب ہو گیا، اس صدی میں اعلیٰ تنقید اور احکامِ نقد پر کتابیں لکھی گئیں، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:۔

ابو عبیدہ متوفی ۲۰۹ھ کی "مثالب العرب"، ابو حاتم سجستانی کی "کتاب المعمرین"، محمد بن سلام الجمحی متوفی ۲۳۲ھ کی "طبقات الشعراء الجاہلیین والاسلامیین"، ابو زید القرشی کی "جمہرۃ اشعار العرب"، جاحظ متوفی ۲۵۵ھ کی کتاب المحاسن والاضداد"، ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ کی "الشعر والشعراء"، ابو سعید السکری متوفی ۲۷۵ھ کی "اشعار الہذلیین" ابو العباس المبرد متوفی ۲۸۵ھ کی "کتاب الکامل"، ابو العباس ثعلب نحوی متوفی ۲۹۱ھ کی "قواعد الشعر"، ابو تمام کی حماسہ (۲۳۱ھ) کے بعد البحتری کی حماسہ (۲۸۴ھ) یہ سب کتابیں اسی صدی میں معرضِ وجود میں آئیں۔

اس دور کے نقد کو چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) اہلِ لغت (۲) ادیب (۳) وہ علما جنھوں نے دوسری زبانوں کے ادب کا مطالعہ کیا، ۴۔ وہ علما جو یونانی منقولات سے زیادہ متاثر ہوئے۔

اسی صدی میں شعراء کے طبقات کا باقاعدہ تعین کیا گیا۔

چوتھی صدی ہجری میں عربی نقد منتہائے عروج کو پہنچ گیا، اس صدی کے نقد دقتِ نظر، بلوغِ فکر اور معانی میں گہرائی پائی جاتی ہے، تیسری صدی کے ناقدین تحلیل وتجزیہ اور ضوابطِ نقد سے بحث میں اس حد تک نہیں پہنچ سکے تھے جہاں صدی ہجری کے علماء پہنچے، جس سے عربی شاعری معراجِ کمال کو پہنچ گئی، اس صدی ادب پاروں کا تحلیل وتجزیہ کیا گیا، اور ان کو اصولِ نقد کی کسوٹی پر پرکھا گیا، شعر کو فلسفہ اور اصولِ اخلاق سے وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی، اس صدی میں ناقد ابوتمام اور بحتری کے درمیان موازنہ اور ان کی شاعری پر بحث ومباحثہ کرتے۔ بعد میں یہ تقابلی جنگ متنبی متوفی ۳۵۴ھ اور اس کے رقیب ابن المعتز عبا متوفی ۲۹۶ھ کے مابین رہی، اس جنگ سے تنقیدی ادب میں اضافہ چنانچہ آمدی متوفی ۳۷۱ھ کی کتاب "الموازنہ بین الطائیین"، ابوبکر الصو متوفی ۳۳۵ھ کی کتاب "اخبار ابی تمام"، قاضی جرجانی متوفی ۳۹۲ھ کی کتا "الوساطۃ بین المتنبی وخصومہ" ان ہی واقعات سے متاثر ہو کر لکھی گئیں، یہ کتابیں ابوالفرج الاصبہانی متوفی ۳۵۶ھ کی "الاغانی"، الصاحب بن عباد متو ۳۸۵ھ کے رسالۃ فی الکشف عن مساوی المتنبی" اور ابوعلی الحاتمی متوفی ۳۸۸ھ کے اس رسالہ کے علاوہ ہیں، جس میں اس نے متنبی کا ارسطو سے افکار معانی میں موازنہ کیا ہے۔

اس طرح تنقید نے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی، اور اس کا شمار ایک علیحدہ علم اور ادبی فن میں ہونے لگا،

چوتھی صدی ہجری میں جن کتابوں نے فن نقد کو فروغ دیا اور اس کو مستقل فن کا درجہ دیا ان میں قدامہ بن جعفر متوفی ۳۳۷ھ کی "نقد الشعر" اور "نقد النثر" کے نام سرفہرست ہیں۔ قدامہ نے سب سے پہلے عربی اصول نقد کا استخراج کیا اور شاعری کے لیے منطق، فلسفہ اور اصول اخلاق کو شرائط تاسیس قرار دیا، ان کے بعد ابن عبد ربہ متوفی ۳۲۸ھ کی "العقد الفرید"، ابن الندیم متوفی ۳۸۵ھ کی "الفہرست"، ابو الہلال العسکری متوفی ۳۹۵ھ کی کتاب "الصناعتین"، ابوعبداللہ محمد بن المرزبانی متوفی ۳۸۴ھ کی کتاب الموشح کے نام آتے ہیں، اسکے علاوہ ثعالبی نیشاپوری متوفی ۴۲۹ھ کی "یتیمۃ الدہر"، ابن الرشیق القیروانی متوفی ۴۵۶ھ کی "العمدہ"، محمد بن سعید القیروانی متوفی ۴۰۶ھ کے "رسائل الانتقاد" اور رسائل الخوارزمی (متوفی ۳۸۳ھ) کے نام بھی اسی ذیل میں آتے ہیں۔

متنبی اور ابن المعتز کے علاوہ ابن الرومی متوفی ۲۸۳ھ اور ابوالعلاء المعری متوفی ۴۴۹ھ اس دور کے مفکر اور فلسفی شاعر ہیں، جن کے بلند تصورات سے عربی شاعری میں فلسفہ اور فکر کا عمق شامل ہوا۔

اس صدی میں سرقۂ شعری کا بھی نقد میں شمار ہونے لگا، اس طرح وہ چیزیں جو نقد کی شاخ تھیں، نقد میں داخل ہوگئیں، اس نے آیندہ کے لیے نقد کا دروازہ کھول دیا۔

چوتھی صدی ہجری کے نثر نگار نے جو ذہنی فضا اور تخلیقی رو پیدا کی وہ گذشتہ صدیوں کی ذہنی فضا اور تخلیقی جوش سے بڑی حد تک مختلف تھی، اس دور کی تنقید نے تہذیبی، علمی، ذہنی، افقی اور معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے عصری شعور اور احساس کے اظہار کی ذمہ داری پوری کی، تنقیدی تخلیقات کا مطالعہ، شاعری

کی حدود کا تعین اور نئے شعور و احساس کے اظہار کی صورت و سیرت کا واضح تصور قائم کرنے میں معاون ثابت ہوا، ناقدین نے ادیب و شاعر کے مافی الضمیر کو قارئین تک پہنچایا، اس دور میں احساس و تاثر نے بلوغ کی منزل میں قدم رکھا، اور ابلاغ کے تقاضوں کا احترام کیا گیا، اسی صدی میں نقد نے فلسفہ کے ذریعہ فکر میں گہرائی اور بالغ نظری پیدا کی۔

اس کے بعد آنے والی صدیوں میں ادب پر نقد کے ان ہی اصولوں کا اثر پڑا، اس میں علت و معلول کا لحاظ بھی رکھا گیا، یہ تنقید، موضوع کی تفسیر کرتی ہے، اور اس میں ضابطۂ عام بننے کی بھی صلاحیت ہے۔

المحیط اور لسان العرب میں نقد کے معنی یہ ہیں :-

التنقاد والانتقاد
تمییز الدراھم واخراج
الزیف منھا[1]

تنقاد: بفتح التاء، مصدر ثلاثی مجرد
نقد: (نصر ینصر) اور باب افتعال سے مستعمل
ہے، ان دونوں ابواب نقد کے معنی کھرے کھوٹے
میں تمیز کرنے اور کھوٹے کو نکالنے کے ہیں۔

سیبویہ کا قول ہے ؎

تنفی یداھا الحصی فی کل ھاجرۃ
نفی الدراھم تنقاد الصیاریف

---

[1] عربی میں کلام کے محاسن و معائب بیان کرنے کے لیے صرف دو مصدر نقد (نصر ینصر) اور انتقاد استعمال ہوتے ہیں، لفظ تنقید کا عربی لغت میں وجود نہیں، اور نہ عربی میں نقاد، ادبی پارکھ کے معنی میں بولا جاتا ہے، اردو میں عام طور سے Criticism کا ترجمہ تنقید کیا جاتا ہے، جو غلط العام کا مصداق ہے، زیادہ صحیح لفظ نقد یا انتقاد ہی ہے جس کا مفہوم پرکھنا یا جانچنا ہے، اس کے علاوہ تنقد (تفعّل) اور تناقد (تفاعل) دونوں مصدر نقد کا مفہوم ادا نہیں کرتے، پانچواں مصدر مناقدہ، مناقشہ کے معنی میں ہے، اسی طرح ادبی پارکھ کے معنی میں ناقد اور منتقد آتا ہے، ناقد کی جمع نَقَدَۃ اور نُقّاد ہے۔

یہ شعر اونٹنی کی تعریف میں ہے :

اونٹنی کے اگلے دو پاؤں کنکریوں کو اس طرح پھینک رہے ہیں جس طرح صراف سکوں کو پرکھ کر پھینک دیتا ہے

نقدت الدراھم وانتقدتھا : اخرجت منھا الزیف۔ میں نے کھرے کو کھوٹے سے الگ کر دیا۔

یہ نقد کے قدیم لغوی معنی ہیں، اس معنی وضعی کی رو سے نقد کے معنی ہوئے

التمییز بین الجید والردی من الدراھم والدنانیر: نقد کے معنی اول کھرے کھوٹے دراہم و دنانیر میں تمیز کرنے کے ہیں۔ کھرے کھوٹے میں فرق وہی شخص کر سکتا ہے جس کے پاس تجربہ اور مطالعہ ہو، اس میں موازنہ کی صلاحیت ہو،

المنجد میں نقد کے معنی یہ ہیں :

نقد نقدا وانتقادا (نصر ینصر) الدراھم وغیرھا : میّزھا ونظر ھا لیعرف جیدھا من ردیئھا

کھرے کھوٹے سکوں میں تمیز کرنا

ــــ الکلامَ : اظھر ما بہ من العیوب والمحاسن۔ کلام کے معائب و محاسن بیان کرنا۔

انتقد الدراھم : اخرج الزیف منھا۔ کھروں میں سے کھوٹے کو نکالنا۔

انتقد الشعر علی قائلہ : ای اظھر عیبہ۔ شعر کہنے والے کے کلام کے معائب ظاہر کرنا۔

ــــ الکلامَ : اظھر عیوبہ ومحاسنہ۔ کلام کے معائب و محاسن بیان کرنا۔

اس اعتبار سے نقد کے تین اہم معنی ہوئے، اوّل وہ لغوی معنی جو عام طور سے تمرہ کردن درہم کا مفہوم ادا کرتے ہیں، دوسرے نقد کلام اور انتقاد کلام جو ایک ہی چیز ہیں، البتہ انتقاد شعر صرف اظہار عیوب کے لیے آتا ہے، اور انتقاد کلام کے عیوب و محاسن دونوں کے ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔

نقد کے دوسرے معنی بھی ہیں اور وہ یہ ہیں :

نقدت رأسہ باصبعی: ضربتھا — میں نے انگلی سے اس کا سر ٹھوک بجا کر دیکھا

نقدت الجوزۃ انقدھا: ضربتھا — میں نے اخروٹ کو بجا کر دیکھا۔

حدیث ابی درداءؓ کی تفسیر اسی معنی میں کی جاتی ہے۔

ان نقدت الناس نقدوک وان ترکتھم ترکوک، اگر تم لوگوں کے عیب بیان کروگے تو وہ بھی تمہارے بارے میں نکتہ چینی سے کام لیں گے، اور اگر تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دوگے تو وہ بھی تم کو چھوڑ دیں گے۔

یہاں نقد کے معنی عیب جوئی، ثلم اور نکتہ چینی کے ہیں۔

نقد کا متضاد اطراء اور تقریظ ہے، اطراء: مبالغہ کے ساتھ تعریف کرنے کو کہتے ہیں۔

تقریظ: قَرْظ، ایک بوٹی ہے جس سے چمڑے کی دباغت کی جاتی ہے، اس لحاظ سے تقریظ کے معنی چمڑے کی دباغت کے ہیں، اور دباغت کیے ہوئے چمڑے کو ادیم مقروظ کہتے ہیں، چمڑے کی دباغت قرظ سے اسلیے کی جاتی ہے کہ اس کے ملنے سے چمڑا خوبصورت بنتا ہے اور ظاہری حسن و جمال سے مزین ہو جاتا ہے۔

نقد میں ذم کا پہلو بھی ہے اور تقریظ صرف مدح و ثناء کو کہتے ہیں۔

یہ تمام وہ اہم معنی ہیں جو لغت نے اس مادۂ نقد کے لیے وضع کیے ہیں، ان میں سے اکثر معنی عرف خاص میں وضع لغت سے مناسبت رکھتے ہیں، وضع لغت میں نقد کے معنی کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کے ہیں، اس اعتبار سے کلمہ نقد منقول ہے، مرتجل نہیں ہے، کیونکہ نکتہ چینی کا مفہوم سب میں پیدا ہوتا ہے۔

اصطلاح جدید اور اکثر متقدمین کے نزدیک نقد سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ نقائص ہی بیان کیے جائیں بلکہ اوصاف بیان کرنا بھی نقد میں داخل ہے، نقد کے معنی پرکھنا یا جانچنا ہیں، اگر غور سے دیکھا جائے تو نقد کے مفہوم میں حسب ذیل چار چیزیں آتی ہیں:۔ (۱) تحلیل و تجزیہ (۲) موازنہ (۳) تمیز (۴) فیصلہ۔

پس اصطلاح میں نقد ادبی، ادب پاروں کا تحلیل و تجزیہ، باہمی موازنہ، اسکا صحیح اندازہ کرنا اور ان کی قیمت اور درجہ متعین کر کے ان کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کو کہتے ہیں۔

نقد ادبی، ادب کے ساتھ مخصوص ہے، اس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ادب پارے کا مقام کیا ہے؟ اور تاریخ ادب میں اس کا کیا درجہ ہے؟ یہ اس کی اضافی قیمت ہوگی۔

اثاثۂ شبلی

رپورٹ انجمن ترقی اردو

مولانا شبلی نے انجمن ترقی اردو کی نظامت کے زمانہ میں یہ رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بمبئی منعقدہ دسمبر ۱۹۰۳ء میں پیش کی تھی اور وہ مولانا ابوالکلام کے اخبار لسان الصدق مورخہ فروری ۱۹۰۴ء میں شائع ہوئی تھی، اس رپورٹ کا ذکر حیات شبلی میں ان الفاظ میں ہے کہ "دسمبر ۱۹۰۳ء میں جب محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو اس شعبہ (اس وقت تک انجمن ترقی اردو کی حیثیت مستقل نہیں تھی بلکہ وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک شاخ تھی) کی رپورٹ علحدہ چھاپی اور شائع کی گئی، مولانا کی یہ رپورٹ بڑی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے"۔ اب یہ دلچسپ رپورٹ محمد اقبال صاحب لاہور نے لسان الصدق سے نقل کرکے بھیجی ہے۔ اس کو ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے شائع کیا جاتا ہے۔

"م"

جناب صدر انجمن!

میں انجمن اردو کی سالانہ رپورٹ جناب والا کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس سے ظاہر ہوگا کہ انجمن نے اس مدت میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔

لیکن چونکہ انجمن کی کارروائی کے سلسلے میں ملک کے اکثر اہل الرائے کے خیالات معلوم

ہو چکے ہیں، اور اس مدت تک ملک کے تمام اہل قلم سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا، تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں رپورٹ پیش کرنے سے پہلے یہ ظاہر کروں کہ انجمن اردو کی کیوں ضرورت ہے؛ اور اس میں کامیابی کی امید ہو سکتی ہے یا نہیں اور ہو سکتی ہے تو کن وسائل اور اسباب سے؛ اول وہلہ میں آپ کو خیال ہو گا کہ انجمن اردو کی ضرورت ایک مسئلۂ مسلمہ ہے اور کم از کم یہ کہ اس مسئلہ پر اگر گفتگو کی ضرورت تھی تو سال بھر پہلے تھی نہ اب، جب کہ تمام ملک میں انجمن کی عملی کارروائی کا سلسلہ پھیل گیا ہے، لیکن مجھے انجمن کی ضرورت کے متعلق عام خیال سے کچھ الگ کہنا ہے، اس لیے آپ معاف فرمائیں اگر میں اس داستان کو ایک دفعہ آپ کے سامنے دہراؤں۔

میں اس پہلو پر بحث نہیں کرتا کہ چونکہ ہر قوم کی ترقی اس پر موقوف ہے کہ علوم و فنون اس کی زبان میں آجائیں، اس لیے اردو میں علوم و فنونِ جدیدہ کے ترجمہ کی ضرورت ہے بلکہ میں ایک دوسرے پہلو سے انجمن کی ضرورت پر بحث کرتا ہوں، یہ بات علانیہ نظر آتی ہے، قوم کا ممتاز حصہ جدید تعلیم میں مصروف ہے، اور ہوتا جاتا ہے، یہ بدیہی ہے کہ جدید تعلیم خود اس قدر مشکل دیر طلب اور طویل الذیل ہے کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری تعلیم جمع نہیں ہو سکتی، اس صورت میں ہماری قومی، مذہبی اور تاریخی معلومات کے بقا کا کیا ذریعہ ہے؟ کیا یہ پسندیدہ ہے کہ ہم صرف انگریزی تعلیم حاصل کریں اور اپنی قوم کی تعلیم سے، مذہب سے، علوم سے بالکل بے پروا ہو جائیں؟ اچھا پھر ان کے بقا کی کیا تدبیر ہے؟ صرف یہ کہ ان چیزوں کو ترجمہ کے ذریعہ سے اردو زبان میں منتقل کیا جائے یا ان مضامین پر اردو میں مستقل تصنیفات لکھی جائیں۔

خوب یاد رکھنا چاہیے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ کے لیے اپنے قومی علوم و فنون اور مذہب سے واقف ہونے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ یہ علوم اصلی زبانوں سے ملکی زبان میں لائے جائیں، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دونوں کام یعنی ایشیائی اور مغربی علوم و فنون کا ترجمہ اور تالیف خود ہم نہ ہیں،

اور اس کے لیے کسی انجمن کے قائم کرنے کی ضرورت نہیں، عربی، سنسکرت اور فارسی کی سیکڑوں کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں اور ہوتی جاتی ہیں، انگریزی تصنیفات کا بھی ایک معتبر حصہ ملکی زبان میں آگیا ہے اور آتا جاتا ہے، ملک میں سیکڑوں ہزاروں مترجم پیدا ہو گئے ہیں جن کا مشغلۂ زندگی یہی ہے" یہ سوال واقعی لحاظ کے قابل ہے اور اس سوال کا جواب دینا ایک بہت بڑے عقدہ کو حل کرنا ہے۔

بے شبہہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بہت سی ایشیائی اور مغربی تصنیفات ملکی زبان میں منتقل ہو گئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کتابیں کس درجہ کی ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں اس مسئلہ کی طرف لوگوں کو علم نے نہیں، بلکہ ضرورتِ معاش نے متوجہ کیا ہے، اس لیے کام کرنے والے اسی اصلی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہیں، وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کن چیزوں کے ترجمے یا کس قسم کی تصنیفات مذاق عام کے موافق ہیں اور جلب زر کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس علمی پیداوار کا بڑا حصہ (جو کل کے قریب قریب ہے) ناول، ادنیٰ درجہ کی تاریخیں اور سوانح عمریاں ہیں، کسی اشتہاری کتب فروش کی فہرست کو پڑھو تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا کوئی آدمی سوانح عمری کے انعام سے محروم نہیں رہا، لیکن یہ سوانح عمریاں کس درجہ کی ہیں؟ اس کا آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں، علوم و فنون کی بعض کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں، وہ کتابیں فی نفسہ اچھی بھی تھیں لیکن قابل لحاظ یہ ہے کہ ترجمہ کیسا ہوا؟ کیا مترجمین واقعی کامل استعداد رکھتے تھے؟ کیا ترجمہ کی دنیا میں ان لوگوں کی کچھ شہرت تھی؟ کیا ان ترجموں کو شائع ہونے سے پہلے کسی مبصر جماعت نے تنقید کی نظر سے دیکھ لیا تھا؟ بے شبہہ ان خزف ریزوں میں ایک آدھ جواہر بھی نکل آتے ہیں لیکن وہ کالعدم ہیں۔

ان حالات کو معلوم کرنے کے بعد کون اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک ایسی مستقل انجمن کی ضرورت ہے جس کو اس کی پروا نہ ہو کہ ملک کا اور عوام کا مذاق کیا ہے، بلکہ اس کا مطمح نظر

ہو کہ ملک میں کس قسم کا مذاق پیدا کرنا چاہیے، اور ملک کی علمی زندگی کی ترقی کے لیے کس قسم کی تصنیفات اور تراجم کی ضرورت ہے، اس کے ساتھ یہ انجمن ایسے افراد سے مرکب ہو جو ایشیائی اور مغربی علوم کے ماہر ہوں اور تصنیفات و تراجم پر ناقدانہ اور آزادانہ رائے دے سکتے ہوں۔

ملک کے اور حصوں میں اس قسم کی انجمنیں قائم ہو گئی ہیں، اور علمی زبانوں سے علوم و فنون کا ذخیرہ ملکی زبانوں میں آگیا ہے، بنگالی زبان اب ایک کامل علمی زبان بن گئی ہے، جس میں ہر قسم کی علوم و فنون جدیدہ کی کتابیں مہیا ہو گئی ہیں، ہندی زبان میں ابھی حال ہی میں سائینٹفک ڈکشنری سات جلدوں میں تیار ہوئی ہے، جس کی تفصیلی کیفیت "پانیر" میں شائع ہو چکی ہے، مرہٹی زبان کی ترقیاں محتاج بیان نہیں، صرف ایک اردو زبان ہے جو باوجود عام زبان ہونے کے علمی تصنیفات اور خصوصاً علوم و فنون جدیدہ سے بالکل محروم ہے۔

اکثر یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ علوم و فنون جدیدہ کی تصنیفات اس کثرت سے ہیں کہ ان کے ترجمے کا قصد کرنا گویا آب دریا بہ گز پیمودن ہے لیکن یہ شبہ ایک وہم باطل ہے، ہر فن میں گو بہت سی تصنیفات ہوتی ہیں، لیکن امہات الکتب دو چار سے زیادہ نہیں ہوتیں، اس لیے ان کتابوں کا ترجمہ ہونا کافی ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر اس امر کا اظہار بھی ضرور ہے کہ گو ملک میں علوم و فنون کے مترجم یا مصنف بہت کم نظر آتے ہیں، اور اس سے یہ بدولی پیدا ہوتی ہے کہ انجمن اگر قائم بھی ہوئی تو قابل مصنف اور مترجم کہاں سے ہاتھ آئیں گے؛ لیکن اس مدت کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک ایسے قابل اشخاص سے خالی نہیں لیکن چونکہ ملک کا عام مذاق ان کی قابلیت کی قیمت نہیں ادا کر سکتا، اس لیے وہ گوشۂ گمنامی میں پڑے ہیں، ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کے پاس تصنیف تالیف کا سرمایہ نہیں بعض ایسے ہیں جو سرمایہ رکھتے ہیں لیکن ملک کے مذاق کے لحاظ سے ان کو یہ توقع نہیں کہ ان کی

تصنیف یا تالیف رواج حاصل کر سکے گی،

انجمن کا بڑا کام ان ہی قابل جوہروں کا پتہ لگانا اور ان کی قابلیت سے کام لینا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں انجمن کی رپورٹ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں،

یہ انجمن ۴ر جنوری ۱۹۰۳ء کو بمقام دہلی ایجوکیشنل کانفرنس کے غیر معمولی اجلاس میں قائم ہوئی اور بزرگان ذیل اس کے عہدہ دار اور کارکن قرار پائے:۔

صدر انجمن: ٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ اسکویر پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔

نائب صدر:۔ شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد خان صاحب، ایل۔ ایل۔ ڈی

مولانا الطاف حسین صاحب حالی

شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب

سکریٹری:۔ (شمس العلماء مولانا) شبلی نعمانی

اسسٹنٹ سکریٹری:۔ مولوی حامد علی صاحب صدیقی سہارنپوری

۵ر جنوری ۱۹۰۳ء کو کانفرنس ہی کے ایک پرائیویٹ اجلاس میں انجمن کے لیے ایک مختصر دستور العمل کا مسودہ تیار کیا گیا، لیکن چونکہ یہ مسودہ محض سرسری طور پر تیار ہوا تھا، اور اجلاس کانفرنس کے ختم ہونے کے ساتھ تمام ارکان دور دراز مقامات پر چلے گئے تھے، مسودہ کی درستی اور اصلاح میں خط کتابت کے ذریعہ سے ایک مدت صرف ہوگئی، یہاں تک کہ ۸ر اپریل ۱۹۰۳ء کو دستور العمل مذکور چھپ کر شائع ہوا، اور درحقیقت انجمن کے قیام کی تاریخ اسی دن سے شمار کرنی چاہیے، اس لحاظ سے یہ رپورٹ سالانہ نہیں بلکہ ہشت ماہہ رپورٹ ہے۔

(۱) انجمن کا سب سے پہلا کام ملک کو اپنے مقاصد کی طرف متوجہ کرنا اور یہ دریافت

کرنا تھا کہ جو مقاصد انجمن کو پیش نظر ہیں، ملک اس کے لیے تیار ہے یا نہیں۔ چنانچہ نہایت کثرت سے خطوط چھپوا کر شائع کیے گئے، اخبارات وغیرہ سے مدد لی گئی، ممتاز بزرگوں کی خدمت میں خاص طرح پر تحریک کی گئی، یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آئیں ملک کے ہر فرقہ نے بلا تخصیص مقاصد انجمن کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی، ابتدا میں ہندو صاحبوں کو بطور خود یہ غلط خیال پیدا ہوا کہ ان کو انجمن کی شرکت سے علیحدہ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ ایک ہندو اخبار نے اس کا اظہار بھی کیا، لیکن جب اس کے جواب میں سکریٹری کی ایک تحریر اسی اخبار میں شائع ہوئی تو ہندو صاحبوں کے دل سے یہ شبہ جاتا رہا اور سب سے پہلے جناب آنریبل رائے نہال چند صاحب رئیس مظفرنگر نے انجمن کی ممبری قبول کرنے کی اطلاع دی۔

ملک میں جس قدر ممتاز اور نامور بزرگ ہیں مثلاً آنریبل نواب عماد الملک مولوی سید حسین صاحب بلگرامی، نواب محسن الملک، بدرالدین طیب جی صاحب جج ہائی کورٹ بمبئی، مشیر الدولہ خلیفہ سید محمد حسین صاحب، سید کرامت حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا، خان بہادر سید اکبر حسین صاحب جج عدالت خفیفہ، خان بہادر مولوی عبد الغفور صاحب وزیر ریاست رام پور۔ ان تمام بزرگوں نے خوشی کے ساتھ ممبری قبول کی، انگلش جنٹلمینوں نے بھی انجمن کی طرف توجہ ظاہر کی، چنانچہ ڈبلیو بل صاحب ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب نے انجمن کا رکن اعزازی ہونا منظور کیا۔

(شمس العلماء) شبلی نعمانی

ادبیات

"ظہور قدسی"

از جناب اثیم صاحب خیرآبادی

کاف و نون کے پردۂ نوری میں پنہاں کون تھا؟
خود ہوئی صبحِ ازل جس سے نمایاں کون تھا

کُنتُ کَنزاً مَخفِیاً کی موجِ اول، سرِّ ذات
جلوۂ بے پردہ و معنیٔ عریاں کون تھا

نور الانوارِ جمال، آئینہ دارِ ذوالجلال
منظرِ صبحِ قدم کا نجمِ رخشاں کون تھا

مظہرِ ذات و صفات و مصدرِ جملہ جہات
وہ ظہورِ نور یعنی عین الاعیاں کون تھا

نور سے کس کے ہوئی تخلیق جملہ ما و من
معنیٔ کُن زبدۂ مقصودِ امکاں کون تھا

یہ زمانہ، یہ مکاں کس کیلیے سرگشتہ ہے؟
کون ہے وہ مرکزِ ادوارِ دوراں کون تھا

کس کی بیعت لی گئی تھی عالمِ ارواح میں
عاشقوں کا سب سے پہلا عہد و پیماں کون تھا

کس کے پرتو سے تجلی زار تھی بزمِ الست
مطلعِ جانانہ، شمعِ بزمِ جاناں کون تھا

کس کے پروانہ، ہمہ کرّوبیان و عرشیاں
قدسیوں کی بزم تھی جس سے فروزاں کون تھا

سب سے اول نور، لیکن سب سے آخر میں ظہور
کون ہے سب کا تتمہ، سب کا عنواں کون تھا

سجدۂ آدم سے چلئے، اس سے پہلے دیکھیے
"مرکزِ دیں" "کون ہو" "بنیادِ ایماں" کون تھا

اہلِ عالم میں ہوئے تو بھی ہوئے کتنے وجود
نظمِ عالم کی مگر تکمیل و بنیاں کون تھا

ہر نبی لاریب ہے شمعِ ہدایت، نورِ حق
جس سے عالم ہو گیا بزمِ چراغاں کون تھا

انبیاء کو جس کی پرتو سے ملی راہِ نجات
شمعِ دیں، نورِ مبیں، مفہومِ عرفاں کون تھا

کون تھا نیرنگیوں کے رنگ میں شانِ ظہور
وہ نظامِ دہر کا امید و ارماں کون تھا

کی گئیں جس کی دعائیں، دی گئی جس کی نوید
پاک سینوں میں جبینوں میں نمایاں کون تھا ؟

اہتمامِ خاص سے جس کا ہوا آخر ظہور
کچھ عجب انداز سے پیدا و پنہاں کون تھا ؟

انبیاء و مرسلیں پر وحی بھی نازل ہوئی
شان میں نازل ہوا ہو جس کی قرآں کون تھا ؟

کون ہے، جس کو ہوا ہو قربِ اوادنیٰ نصیب
حضرتِ حق کا شبِ اسریٰ میں مہماں کون تھا ؟

رحمۃ للعالمیں، مطلوبِ جملہ آن و این
جانِ عالم، جانِ جاں و جانِ جاناں کون تھا ؟

خاتم المرسلیں، محبوبِ ربّ العالمیں
سب سے اعلیٰ، سب سے افضل، بعد یزداں کون تھا ؟

مختصر یہ ہے، محمد مصطفےٰ کے ماسوا
کون ہو سکتا ہے ؟ یا معراجِ انساں کون تھا ؟

آپ کا دنیا میں آنا اب ضروری تھا نسیمؔ
یاد ہو جس کو ازل کا عہد و پیماں کون تھا ؟

غزل

جناب منشاء الرحمٰن خانصاحب منشاؔ ناگپور

بقدرِ ہمت سبھی کو جینے کا کوئی ڈھنگ اور فن ملا ہے
کسی کو عقل و خرد ملی ہے کسی کو دیوانہ پن ملا ہے

غمِ محبت کو اپنے سینے سے کیوں نہ ہم لگائے رکھیں
ہم اہلِ دل کو یہی تو لے دے کے ایک انمول دھن ملا ہے

ہزار نعمت کی ایک نعمت ہے یہ خلش سوزِ آرزو کی
یہ جس کو حاصل ہوئی اسی کو حیات کا بانکپن ملا ہے

ہجومِ سامانِ عیش و عشرت لئے اہلِ ثروت تمھیں مبارک
ہمیں یہی ہے بہت کہ ہم کو نشاطِ رنج و محن ملا ہے

فقط تمھارے جمالِ زیبا کا ذکر ہی ہر کہیں نہیں ہے
ہمارے ذوقِ نظر کا چرچا بھی انجمن انجمن ملا ہے

نصیب کا یہ نہیں کرشمہ یہ بات ہے ظرف و حوصلہ کی
تمھیں جفا کی ادا ملی ہے ہمیں وفا کا چلن ملا ہے

نہ جانے کتنے مصائبِ دل شکن سے گذرے ہیں بیٹھے بیٹھے
جنوں سرشتوں کو تب کہیں جا کے شرفِ دار و رسن ملا ہے

بنامِ زندہ دلی شعورِ حیات جس کو ہوا میسر
وہ مبتلائے غم و الم ہو کے بھی سدا خندہ زن ملا ہے

ہمارا ہی یہ جگر ہے منشاؔ کہ عزم کے ساتھ جی رہے ہیں
وگرنہ ماحول در حقیقت بہت ہی ہمت شکن ملا ہے

باب التقریظ والانتقاد

ابوعبید کی غریب الحدیث

از

جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب اعظمی

اگست ۱۹۶۷ء کے معارف میں ابو عبید قاسم بن سلام پر مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی کا ایک مضمون نکلا ہے، مضمون پُر معلومات ہے، اور محنت سے لکھا گیا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ابو عبید کی غریب الحدیث کا مطبوعہ نسخہ ابھی دار المصنفین میں نہیں پہنچا ہے، اس لیے اصلاحی صاحب نے اس کے صرف ایک قلمی نسخہ کی نشاندہی کی ہے، اور لکھا ہے کہ کتاب الاموال کے علاوہ ابو عبید کی تمام کتابیں غیر مطبوعہ ہیں، مگر بات یوں نہیں ہے، الاموال کے علاوہ غریب الحدیث بھی چھپ گئی ہے یا چھپ رہی ہے[1]، اور بہت خوشی کی بات ہے کہ اس کے چھاپنے کا فخر و شرف ہندوستان کو حاصل ہوا ہے، دائرۃ المعارف العثمانیہ (حیدرآباد) کے علم دوست منتظمین تمام اہل علم کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کو شائع کرکے اسلامی مطبوعات میں ایک گرانقدر اضافہ فرمایا ہے، ان کی توجہ سے اہل علم کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی اور اس نادر و نایاب کتاب سے ان کو استفادہ کا موقع ملا۔

اس کتاب کی تین جلدیں ہمارے پاس آچکی ہیں، چوتھی جلد بھی امید ہے طبع ہو چکی ہوگی، کتاب پڑھنے سے پہلے ہی نظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جہاں تک مرفوع احادیث کے مشکلہ الفاظ

---

[1] اس کے علاوہ ابو عبید کی کتاب الاجناس، کتاب الامثال اور فضائل القرآن کے بعض اجزاء بھی چھپ چکے ہیں۔
’’ض‘‘

کا تعلق ہے، مصنف نے ان کو ذکر کرنے میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں کیا ہے، حتیٰ کہ مسانید پر بھی ان کی ترتیب نہیں ہے، چنانچہ پہلا لفظ سنادی، دوسرا تع، تیسرا ھیع، چوتھا شعث ہے، اور اور سنادی ابو قلابہ کے مرسل یا ثوبان کے مسند میں، تع ابو ہریرہ اور سہل بن سعد اور رجل من الانصار کی مرفوع حدیثوں میں، ھیع اور شعث ابو ہریرہؓ کی حدیث میں وارد ہوا ہے، آگے پانچواں، چھٹا اور ساتواں لفظ بعض تابعین کے مراسیل میں اور آٹھواں ابو منصور انصاری کی حدیث مرفوع کا ہے،

بہرحال غریب الحدیث میں مشکل الفاظ کا ذکر نہ حروف تہجی کی ترتیب پر ہے نہ مسانید صحابہ کی ترتیب پر ۔۔۔ ہاں احادیث مرفوعہ کے بعد جب آثار صحابہ کا نمبر آیا ہے تو وہاں مصنف نے التزام کیا ہے کہ ایک صحابی کے آثار کے الفاظ ایک سلسلہ میں ذکر کیے جائیں، چنانچہ پہلے انھوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کے آثار، اس کے بعد حضرت عمرؓ کے آثار میں وارد ہونے والے مشکل الفاظ کی شرح کی ہے،

غریب الحدیث کے چھپ جانے کی اس مسرت انگیز اطلاع اور منتظمین دائرہ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مجھے کچھ اور بھی گذارش کرنا ہے۔

علمائے دائرہ نے اس کتاب کو چار مخطوطوں کی مدد سے ایڈٹ کیا ہے، ایک مخطوطہ مدرسہ محمدیہ مدراس کا ہے جس کو اصل قرار دیا گیا ہے، دوسرا رضا لائبریری رامپور کا ہے، تیسرا لیڈن اور چوتھا مکتبہ ازہریہ مصر کا ہے، موخر الذکر تینوں مخطوطے باسند ہیں، یعنی کتاب میں جن احادیث و آثار کے ٹکڑے نقل ہوئے ہیں، ساتھ ساتھ ان کی سند بھی مذکور ہے، برخلاف مخطوطۂ مدراس کے کہ اس میں تمام سندیں حذف کر دی گئی ہیں، اس کے علاوہ جگہ جگہ عبارتوں میں اختصار اور الفاظ کا تغیر و تبدل بھی پایا جاتا ہے، جس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مدراسی نسخہ جس کو اصل قرار دیا گیا ہے، وہ بعینہ غریب الحدیث نہیں ہے، بلکہ اسکی

تجرید و اختصار ہے ــــ اس صورتِ حال کا تقاضا تھا کہ مدراسی نسخہ کے بجائے رامپور یا مصر یا لیڈن کے مخطوطہ کو اصل قرار دیا جاتا، اس لیے کہ فی الحقیقة غریب الحدیث لابی عبید کے نسخے یہی ہیں، اور اگر کوئی مجبوری حائل تھی تو ظاہر کر دیا جاتا کہ ہم غریب الحدیث کی تجرید کو خاص اسباب کی بنا پر اصل قرار دے رہے ہیں، لیکن ہم التزام کریں گے کہ تجرید و اختصار کرنے والے نے جتنی سندیں اور الفاظ کم کر دیے ہیں ان کو تعلیقات میں درج کر دیں گے۔

اگرچہ علمائے دائرہ نے عملاً ایسا ہی کیا ہے کہ چھوڑی ہوئی چیزیں تعلیقات میں لے لی ہیں مگر (۱) اصل کی نسبت یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ تجرید ہے، (۲) اور تعلیقات میں جو استدراکات کیے ہیں ان کو رامپور یا مصری نسخہ کی زیادات سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ وہ زیادات نہیں ہیں بلکہ اصل کتاب کے اجزاء ہیں،

مصر اور لیڈن کے نسخے تو میں نے دیکھے نہیں، رامپور کا مخطوطہ دیکھا ہے، اس کے سوا اس کتاب کے دو نسخے مدینہ منورہ میں میری نظر سے گذرے ہیں، ایک کتب خانہ محمودیہ میں، دوسرا کتب خانہ شیخ الاسلام میں، محمودیہ کا نسخہ ۱۱۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے، اور کتب خانہ شیخ الاسلام والے مخطوطہ کا سن کتابت ۵۹۲ھ ہے، اس نسخہ کے چند اوراق کی نقل میرے پاس موجود ہے، میں یہاں ایک کالم میں اس کی بعض عبارتیں اور دوسرے کالم میں مطبوعہ غریب الحدیث کا وہی مقام بالمقابل نقل کرتا ہوں، تاکہ اہلِ علم کو تجرید و اختصار کی نوعیت کا صحیح علم ہو جائے۔

غریب الحدیث مخطوطہ کتبخانہ شیخ الاسلام	غریب الحدیث مطبوعہ حیدرآباد
فی حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم:	فی حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
زویت لی الارض فاریت	زویت لی الارض فاریت

مشارقها ومغاربها وسيبلغ
ملك أمتي مازوي لي منها.
قال حدثنا ايوب عن اسماعيل
بن ابراهيم عن ابي قلابة ان
النبي صلى الله عليه وسلم قال ذلك
في حديث فيه طول. قال
ابوعبيد: سمعت اباعبيدة
معمر بن المثنى التيمي من تيم
قريش مولى لهم يقول زويت:
جمعت، ويقال انزوى القوم
بعضهم الى بعض اذا تدانوا
وتضاموا وانزوت الجلدة
في النار اذا انقبضت واجتمعت
قال ابوعبيد ومنه الآخر ان
المسجد لينزوي من النخامة
كما تنزوي الجلدة في النار،
قال ابوعبيد ولا يكاد
يكون الانزواء الا بانحراف
مع تقبض،

مشارقها ومغاربها، وسيـ
ملك أمتي مازوي لي مـ
قال ابوعبيد: سمعت اباعـ
معمر بن المثنى التيمي من تيم
مولى لهم يقول: زويت جـ
ويقال انزوى القوم بعضـ
الى بعض اذا تدانوا وتضا
وانزوت الجلدة من النـ
اذا انقبضت واجتمعت
ابوعبيد ومنه الحديث
الآخر: ان المسجد لينز
من النخامة كما تنزوي الـ
من النار اذا انقبضت واجـ
قال ابوعبيد: ولا يكاد يكو
الا نزواء الا بانحراف
مع تقبض،

(۲) قال ابو عبید فی حدیث
النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان منبری
ھذا علی ترعۃ من ترع الجنۃ،
قال حدثنی اسماعیل جعفر
المدنی عن محمد بن عمرو بن
علقمۃ عن ابی سلمۃ بن عبدالرحمن
عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
انہ قال ذلک۔۔۔ قال ابو عبید
سمعت ابا عبیدۃ یقول:
الترعۃ، الروضۃ،

وقال [ابو عبید] فی حدیث
النبی علیہ السلام ان منبری
ھذا علی ترعۃ من ترع الجنۃ
قال ابو عبیدۃ الترعۃ الروضۃ
(ص ۵۰۲)

(۳) قال ابو عبید فی حدیث
النبی صلی اللہ علیہ وسلم [ ] انہ
سأل رجلاً أراد الجہاد
معہ فقال ھل فی اھلک من
کاھل۔۔۔ ویقال من کاھل
۔۔۔ فقال ما ھم الا اصبیۃ
صغار، فقال ففیہم فجاھد
قال: نعم،
قال حدثنا اسماعیل بن ابراہیم

قال [ابو عبید] فی حدیثہ
علیہ السلام انہ سأل رجلا
أراد الجہاد معہ [فقال لہ]
ھل فی أھلک من کاھل؟ ویقال
من کاھل، فقال نعم،
قال ابو عبیدۃ: ھو ماخوذ الخ
(ص ۱۲)

عن خالد الحذاء عن ابی قلابة

عن مسلم بن یسار عن النبی

صلی اللہ علیہ وسلم قال ابوعبید:

ھو ماخوذ الخ

اس مقام پر محقق نے رامپوری نسخہ اور اصل کے حواشی نیز فائق کی مدد سے کمی پوری کرنے کی کوشش کی ہے، پھر بھی حدیث کی پوری سند ذکر نہیں کرسکے، نیز آخری سطر میں ابوعبید کے بجائے ابوعبیدہ درج کیا گیا۔

(مدینہ)	(حیدرآباد)
ویقال فی مثل دغری لاصفی	ویقال فی مثل دَغری لاصفی،
یقول ادغروا علیہم ولاتصافوهم	ودغراً لاصفاً یقال ادغروا
ویروی دَغراً لاصفاً مثل	علیهم ولاتصافوهم وهذا
عقری حلقی وعقراً وحلقاً	ایضاً مثل قولهم عقری حلقی
	وعقراً حلقاً (۲۹ : ۳۰۲)
(۳) وقال غیر حماد مفرح بالحاء،	وروی ایضاً مفرح بالحاء و
وقال حدثنا حجاج عن ابن	روی ایضاً مفرح بالحاء وروی
جریج ان رسول اللہ صلی اللہ	ایضاً عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم] قال وعلی المسلمین	وعلی المسلمین ان لایترکوا
ان لایترکوا مفرحاً فی فداء	مفدوحاً[1] فی فداء او عقل
وعقل وفی حدیث غیرہ مفرحا	(ص ۳۰)

[1] مفدوحا غلط ہے، مفدحا چاہیے۔

ان چند مثالوں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ

(۱) مدراسی نسخہ میں حدیثوں کی سندیں تمام کی تمام حذف کر دی گئی ہیں۔

(۲) اور اس کے نتیجہ میں جگہ جگہ تعبیر بھی بدلنا پڑی ہے۔ مثلاً وقال غیر حماد مفرج کے بجائے سوی ایضاً مفرج لکھنا پڑا ہے۔ مزید مقابلہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ

(۱) بعض حدیثوں کا صرف ایک مختصر ٹکڑا لے لیا ہے اور سند کے ساتھ جو پوری حدیث مذکور ہے اس کو بالکل چھوڑ دیا ہے، جیسے ضیف کے مادہ میں سند کے ساتھ پوری حدیث مدنی نسخہ میں مذکور ہے، مگر مدراسی نسخہ میں سند کے ساتھ ساتھ پوری حدیث بھی حذف کر دی گئی ہے جس کو تعلیق میں سنادفی ر کے عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔

(۲) مدراسی نسخہ میں کہیں کہیں عبارتوں میں اضافہ بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ ص ۲۳ پر فی المعنی مثلہ واحسبہ کی نسبت تعلیق میں لکھنا پڑا ہے کہ لیس فی ر۔ اور یہ بات ر (رامپوری نسخہ) کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، مدنی نسخہ میں بھی یہ الفاظ نہیں ہیں ـــ اسی طرح ص ۲۴ سطر ۱ میں واشباہ ذلک۔ ص ۲۵ سطر ۱ میں بن مزید الاسدی، ص ۲۸ سطر ۹ میں عنہ ابن مرۃ یا فرزدق کینھا، ص ۳۳ سطر ۸ میں قولہ لا تبغی وغیرہ مدراسی نسخہ کے اضافے ہیں، جو رامپوری میں نہیں ہیں، اسی طرح مدنی نسخہ میں بھی نہیں ہیں، چنانچہ خود محقق نے بھی اس کو تعلیقات میں ظاہر کر دیا ہے، مگر کسی کسی جگہ یہ تنبیہ سقطت من ر کے عنوان سے کی گئی ہے، جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اصل کتاب میں یہ موجود ہے، اور یہ خود ابوعبید کے الفاظ ہیں، مگر رامپوری نسخہ سے ساقط ہوگئے ہیں ـــ حالانکہ واقعہ اس کے برخلاف ہے، یہ الفاظ ابوعبید کے نہیں ہیں، بلکہ مدراسی نسخہ میں اضافہ کیے گئے ہیں، اور اس کی ایک دلیل یہ ہے کہ یہ الفاظ رامپوری کے علاوہ مدنی نسخہ میں بھی نہیں ہیں۔

مثال کے طور پر ص ۵۳ سطر ۴ کے الفاظ والوشوخ منها کو لے لیجیے، ان کی نسبت حاشیہ میں مستقطت من س لکھا ہے، مگر س ہی کی خصوصیت نہیں، یہ الفاظ مدنی نسخہ میں بھی نہیں ہیں، لہذا ان کی نسبت یہ کہنا کہ رامپوری سے ساقط ہوگئے ہیں، صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ الفاظ مدراسی نسخہ میں بڑھائے گئے ہیں ۔۔ اسی طرح ص ۷۵ سطر ۸ کے الفاظ ویقال الالوتخفیف، اور ص ۷۱ سطر ۶ و ۷، و ۸ کی عبارت بھی، جن کو سقطت من س لکھا گیا ہے، حالانکہ وہ جس طرح رامپوری نسخہ میں نہیں ہیں، مدنی میں بھی نہیں ہیں، لہذا ان کو ساقط کہنا محل کلام ہے، دوسرے نسخوں کی مراجعت کرنی چاہیے، میرا خیال ہے کہ یہ سب مدراسی نسخوں کے اضافات ہیں۔

اور اکثر جگہ یہ تنبیہ لیس من س کے عنوان سے کی گئی ہے، جو مناسب ہے، مگر کسی کسی جگہ وہ بھی بے معنی سی ہے، مثلاً ص ۵۲ پر ایک مصرع مدراسی نسخہ سے یوں نقل کیا گیا ہے

ع کان حلوت الشعر حین مدحته، اس کے بعد ص ۵۳ پر ہے وبروی ع کان حلوت الشعر یوم مدحته، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے پہلے حین کا لفظ لکھا ہے مگر ایک روایت میں حین کے بجائے یوم کا لفظ آیا ہے، محقق نے یہاں حاشیہ دیا ہے کہ لیس فی س، یعنی یہ بات کہ ایک روایت میں یوم آیا ہے، رام پوری نسخہ میں نہیں ہے۔۔۔ یہاں پر یہ تنبیہ بالکل بے معنی ہے، اس لیے کہ محقق صاحب ص ۵۲ پر ایک تعلیق میں تصریح کر چکے ہیں کہ رام پوری نسخہ میں حین کے بجائے یوم ہے، پس جب رامپوری نسخہ اس مصرع کو یوم ہی کے ساتھ نقل کر رہا ہے تو آگے وہ کس طرح یہ کہہ سکتا ہے کہ ایک روایت میں یوم بھی آیا ہے، اس کا موقع تو جب تھا کہ پہلے وہ حین کے ساتھ نقل کرتا ۔۔ اس لیے لیس فی س کے بجائے یہ لکھنا مناسب تھا کہ یہ مدراسی نسخہ کا اضافہ ہے، اس لیے کہ اس سے پہلے اسی نے

لفظ حین کے ساتھ مصرع کو نقل کیا ہے،

اسی طرح ص ۳۴ سطر ۴ کی عبارت دیردی: یمص منه ماء خ کی نسبت یہ بتانا کہ یہ رامپوری میں نہیں ہے، بے موقع بات ہے، اس لیے کہ اس میں تو حسب تصریح مصحح ان ہی الفاظ کے ساتھ مصرع نقل ہی کیا گیا ہے، ہاں مگر اسی میں چونکہ ماء خ کے بجائے دانق نقل کیا گیا ہے، اس لیے یہ اضافہ برمحل ہے کہ یردی: یمص منه ماء خ

بہرحال ہمارے نزدیک ذمہ داری اور احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ جب سرورق پر غریب الحدیث لابی عبید لکھا گیا ہے تو اس کی تجرید یا اختصار کے بجائے متن میں اصل غریب الحدیث کا متن رکھا جاتا، اور اختلاف الفاظ و تعبیرات، یا اضافات یا اختصارات کی نشاندہی حواشی میں کرنا مناسب تھا،

کتاب کی تصحیح میں کچھ شبہ نہیں کہ بڑی محنت کی گئی ہے، پھر بھی بعض مقامات میں بڑی بد نما غلطیاں رہ گئی ہیں، یا ہو گئی ہیں، مثلاً

(۱) ص ۳۹ سطر ۱ میں أُذُنُكَ علی ان ترفع الحجاب چھپا ہے، حالانکہ إِذْنُكَ عَلَيَّ صحیح ہے، اس کے علاوہ اس مقام پر یہ کمی بھی محسوس ہوتی ہے کہ اس کی نشاندہی نہیں کی گئی، حالانکہ جس طرح دوسری اکثر حدیثوں کی نسبت بتا دیا گیا ہے کہ وہ کس کتاب میں کہاں پر ہیں، اسی طرح اس کی نسبت یہ بھی لکھنا چاہیے تھا کہ یہ حدیث ابن ماجہ باب مناقب ابن مسعودؓ میں ہے۔

(۲) ص ۴۲ سطر ۱ میں عَوَمَضَ الحولِ چھپا ہے، جو کسی طرح صحیح نہیں ہے، بظاہر الحول کو مرفوع ہونا چاہیے۔

(۳) ص ۴۵ سطر ۳ تقتد متهم لیزداد لهم میں تخلف معلوم ہوتا ہے، اس کے

بجائے مدنی نسخہ میں نقطہ مہملہ لیرتاد لمد ہے، اس میں بے تکلف لیَرتادَ پڑھا جاتا ہے؛

(۴) ص ۸۰ سطر ۴ میں یُجزَأ کے بجائے یَجزأُ (بصیغۂ معروف) صحیح ہے،

(۵) ص ۹۰ سطر ۳ میں او تختفوا بہا کے بجائے او تحتفئوا بہا ہونا چاہیے، اس لیے کہ جب تک ایسا نہ ہو تو قال الاصمعی لا اعرف تحتفئوا ولکنی اراہا تحتفوا بہا بے جوڑ معلوم ہوتا ہے ـــ اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مجمع الزوائد میں یہ حدیث اسی لفظ (او تحتفئوا) کے ساتھ نقل ہوئی ہے،

(۶) ص ۸۰ سطر ۵ میں الجِلّالۃ جیم کے زیر کے ساتھ صحیح نہیں، جیم پر زبر ہونا چاہیے،

(۷) ص ۴۸ سطر ۱۳ میں کان کذلک اَعْسَرَیَسَرُ کے بجائے اَعْسَرَ یَسَرَ ہونا چاہیے

(۸) ص ۹۳ تعلیق ۲ میں ہے فی ر عن الشرفی (ھو علی بن ابراہیم بن اسماعیل، انظر لسان المیزان ۴ / ۱۹۱) عن مجالد عن الشعبی ـــ اس میں معجم صاحب کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے، انھوں نے شرقی (بالقاف) کو الشرفی (بالفاء) قرار دیا ہے، حالانکہ قاف صحیح ہے، اور یہ راوی شرقی بن القطامی ہے، چنانچہ مدنی نسخہ میں بن القطامی کی تصریح موجود ہے، ـــ اور اگر یہ تصریح نہ ہوتی جب بھی لسان المیزان والے الشرفی کو مراد لینا کسی طرح ممکن نہیں تھا، اس لیے کہ اس الشرفی کی وفات ۴۵۸ھ میں ہوئی ہے، اور یہاں پر اس سے روایت کرنے والے یزید (بن ہارون) ہیں، جن کی وفات ۲۰۶ھ میں ہوئی ہے، یعنی یزید (شاگرد) الشرفی (استاذ) کی ولادت سے کچھ بھی نہیں تو دو سو سال پہلے انتقال کر چکے ہیں،

نیز الشرفی نے مجالد سے روایت کی ہے، جن کا سال وفات ۱۴۴ھ ہے، اس صورت میں اگر الشرفی کی مدت حیات کم سے کم ۳۲۹ سال مانی جائے تو کسی طرح ان کا سماع مجالد

سے ممکن ہوگا۔

شرقی بن قطامی کا ترجمہ بھی لسان المیزان میں مذکور ہے، اس کے علاوہ تاریخ بخاری میں بھی اس کا ذکر ہے۔

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

جلد ۱۰۰

بجائے دلی نسخہ میں تنقد معمل لیزنا دلعمد ے۔اس عو ... ہے

مجلہ دارالمصنفین اعظم گڑھ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مرتبہ

جنوری ۱۹۴۶ء سے جون ۱۹۴۶ء تک

سے ممکن ہوگا۔

شرقی بن قطامی کا ترجمہ بھی لسان المیزان میں مذکور ہے، اس کے علاوہ تاریخ بخاری میں بھی اس کا ذکر ہے۔

(۹) ص ۳۲ تعلیق ۲ میں عن دفرۃ اور کما تکون غلط ہے، دقرۃ بکسر الدال المہملہ وسکون القاف صحیح ہے، (دیکھو تہذیب التہذیب، اور الاکمال لابن ماکولا جلد سوم ص ۳۲۸) اور کما تکون کے بجائے کنا نطوف صحیح ہے، جیسا کہ غریب الحدیث کے مدنی نسخہ میں ہے، اور ایسا ہی الفائق للزمخشری میں بھی ہے، اور السنن الکبری للنسائی میں بھی ایسا ہی ہے۔

ان دو غلطیوں کے علاوہ اس مقام پر خود مصنف یا سند کے کسی راوی کا ایک سہو بھی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دقرۃ کو ام عبد اللہ بن اذینہ کہا گیا ہے، درانحالیکہ صحیح ام عبد الرحمن بن اذینہ ہے، جیسا کہ تہذیب التہذیب، اصابہ ۲۹۵/۴ اور اکمال بن ماکولا میں ہے،

(۱۰) غریب الحدیث جلد ثانی ص ۳۲ تعلیق ۱ میں ایک حدیث یوں نقل ہوئی ہو الاناءۃ من اللہ، الاناءۃ غلط ہے، الاَنَاۃ (بحذف الہمزہ وبوزن نَوَاۃ) صحیح ہے، (دیکھو ترمذی مع تحفۃ الاحوذی ۱۴۹/۱۴۵/۳)

(۱۱) جلد ثانی صفحات ۱۱ س ۱۰، ۱۲ س ۱، ۲۸ س ۹، ۲۹ س ۷، اور ص ۱۲ میں بار بار فناہ درج کیا گیا ہے، یہ غلط ہے، اس کے بجائے ثنایٔ نون کے ساتھ صحیح ہے، اور یہ حد ثناۃ کا مخفف ہے۔ مصحح نے خود ہی لکھا ہے کہ رام پوری نسخہ میں اس کی جگہ حد ثناہ ہے، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اصل میں قثناہ (قاف اور نون کے ساتھ) رہا ہو، اور کسی کاتب نے اس فناہ لکھ دیا ہو، اور اپنی طرف سے لفظ قال کا اضافہ بھی کر دیا ہو۔

اس صورت میں وہ قال حدثنا کا مخفف ہے۔

(۱۲) تعلیقات میں حدیثوں کے جو حوالے دیے گئے ہیں وہ اگر اس خاص سند کو سامنے رکھکر دیے گئے ہیں جسکو ابو عبید نے ذکر کیا ہے تو بہت سے حوالے صحیح ثابت نہ ہونگے، مثلاً ص۳۵ پر حدیث فھذا اوان قطعت ابھری کے لیے مسند احمد جلد ۶ ص ۱۸ کا حوالہ دیا گیا ہے، مگر مسند احمد میں سفیان بن عیینۃ عن العلاء بن ابی العباس عن ابن جعفر کے سلسلہ سے یہ حدیث مذکور نہیں ہے، بلکہ معمر عن الزھری عن عبد الرحمن بن عبد اللہ بن کعب بن مالک عن امہ کے سلسلہ سے مذکور ہے،

اور اگر اس خاص لفظ کی بنیاد پر حوالہ دیا گیا ہے جسکی تفسیر کیلئے ابو عبید نے اس حدیث کا ذکر کیا ہے تو اس مثال میں وہ لفظ تعادتنی ہے اور تعادنی کا لفظ مسند احمد (۱۸/۶) میں بالکل نہیں ہے، اس لحاظ سے بھی یہ حوالہ صحیح نہیں،

اور اگر محض اس بنیاد پر حوالہ دیا گیا ہے کہ ابو عبید کی ذکر کردہ حدیث میں جس واقعہ کا ذکر ہے، وہ واقعہ فلاں کتاب میں مذکور ہے خواہ جس سند یا لفظ کے ساتھ بھی ہو، تو پھر اس صورت میں مثال مذکور کیلئے مسند احمد کے بجائے بہتر تھا کہ صحیح بخاری کا حوالہ دیا جاتا، اسلیے کہ اس میں یہ واقعہ مذکور ہے (دیکھو، مثلاً فتح الباری ج ۸ ص ۹۲)

(۱۳) حدیثوں کی نشاندہی میں اس بات کا بھی بہت خاص طور پر لحاظ کرنا چاہیے کہ اگر کوئی حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے تو پہلے اس کا حوالہ دینا چاہیے، اس لیے کہ حدیث کی کتابوں میں یہی زیادہ متداول ہیں اور ان ہی کو سب سے زیادہ تلقی بالقبول حاصل ہے،

ہمارے محترم مصححین نے اس کا بھی اہتمام نہیں فرمایا ہے، چنانچہ ص۲ پر ضبائر کے لیے دارمی اور مسند احمد کا حوالہ دیا گیا ہے، درانحالیکہ جس حدیث میں یہ الفاظ آئے ہیں وہ مسلم (۱/۱۰۴) میں موجود ہیں، وقت میں گنجائش نہیں ہے اسلیے ان ہی چند باتوں پر اکتفا کرتا ہوں، آخر میں پھر صدق دل سے اعتراف کرتا ہوں کہ اس کتاب کی اشاعت دائرۃ المعارف کا بڑا اہم کارنامہ ہے اور ان فروگذاشتوں کے باوجود ایک قابل قدر علمی خدمت ہے جس کے لیے ارکان دائرہ ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں۔

مطبوعات جدیدہ

انوار اقبال ۔ مرتبہ جناب بشیر احمد صاحب ڈار، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۴، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲۰ روپے، ناشر اقبال اکاڈمی پاکستان، کراچی۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے خطوط، متفرق مضامین اور کمیاب تحریروں کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں لیکن ان کی بہت سی تحریریں ان میں نہیں ہیں، اس لیے اقبال اکاڈمی کے ڈائرکٹر جناب بشیر احمد صاحب ڈار نے ان مکاتیب، مضامین، تقاریظ، تبصروں اور اشعار وغیرہ کو جو اب تک شائع نہیں ہوئے تھے، یا شائع شدہ تھے لیکن کسی باقاعدہ مجموعہ میں شامل نہ ہونے کی وجہ سے کمیاب تھے، تلاش کر کے اس مجموعہ میں جمع کر دیا ہے، یہ کئی حصوں میں منقسم ہے، شروع میں درسی کتابوں کے دیباچے، مختلف تصنیفات نظم و نثر پر ڈاکٹر صاحب کے آرا و تبصرے اور آخر میں ابتدائی دور کا غیر مطبوعہ کلام ہے، ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں ڈاکٹر صاحب نے مدراس و میسور کا سفر کیا تھا، اس کی دلچسپ روداد، دو بصیرت افروز مضامین "حکمائے اسلام کے عمیق تر مطالعہ کی دعوت" اور "علم ظاہر و باطن" اور کئی اہم خطوط، بیانات اور تقریریں بھی شامل ہیں جن سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی اور افکار کے متعلق بعض مفید معلومات حاصل ہوتے ہیں، چند نادر دستاویزات کے عکس بھی اس میں دیے گئے ہیں، گو یہ مجموعہ بھی ڈاکٹر صاحب کی تمام غیر مطبوعہ اور کمیاب تحریروں کا جامع نہیں ہے، پھر بھی مرتب کو تلاش و جستجو سے جس قدر مل سکی ہیں ان کو جمع کر دیا ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اقبالیات میں ایک مفید اضافہ ہوا۔

گنج خوبی ۔ از میر امن دہلوی، ترتیب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۳۵۰ مجلد، قیمت ۱۵ روپے پتہ: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔

ملا حسین واعظ کاشفی کی مشہور و متداول فارسی کتاب اخلاق محسنی کا میر امن دہلوی نے گنج خوبی کے نام سے اردو ترجمہ کیا تھا، جو باغ و بہار کے بعد ان کی دوسری اہم کتاب سمجھی جاتی ہے، مگر اب نایاب تھی، اس لیے دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے لائق صدر، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے جو اردو کی کئی قدیم و نایاب کتابوں کو گوشۂ گمنامی سے باہر نکال چکے ہیں، اس کتاب کو میر امن ہی کے قلم کے ایک نسخہ کی مدد سے جو رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن میں تھا، اور احمدی پریس کلکتہ کے سنہ ۱۸۴۶ء کے مطبوعہ نسخہ سے مقابلہ کے بعد ایک مبسوط مقدمہ اور مختصر حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ میں فورٹ ولیم کالج کی تشکیل کا پس منظر، میر امن کی اس سے وابستگی، ان کے ادبی و تصنیفی کمالات، نثر کی خصوصیات، باغ و بہار کے مقابلہ میں گنج خوبی کی عدم شہرت کے اسباب اور ترجمہ کی سلاست و شگفتگی کے علاوہ اس کے بعض اسقام اور میر امن کی زبان کی قدامت و غرابت وغیرہ کو مثالوں کے ذریعہ تفصیل سے دکھایا گیا ہے، اور حواشی میں مخطوطہ و مطبوعہ نسخوں کے فرق و اختلاف کا ذکر ہے، آخر میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی ہے، خواجہ صاحب نے یہ کتاب تہذیب و ترتیب کے جدید طریقوں کے مطابق بڑی محنت اور خوش سلیقگی سے مرتب کی ہے، زبان و ادب کے طلبہ کے لیے اس کا مطالعہ ضروری اور نہایت مفید ہے۔

دیوان عروہ بن ورد و اللامیتان — مرتبہ الاستاذ عبدالمعین الملوحی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۵۵ و ۸۰، پتہ: مطابع وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی دمشق۔

وزارت ثقافت و ارشاد قومی دمشق نے عربی کی غیر مطبوعہ اور قدیم مطبوعہ کتابیں شائع کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے، مذکورۂ بالا دونوں کتابیں اسی سلسلہ کی مطبوعات ہیں، پہلی کتاب عہد جاہلی کے مشہور اور باکمال شاعر عروہ بن ورد کا دیوان ہے، عروہ کا دیوان یورپ اور عرب ممالک میں پہلے بھی شائع ہو چکا ہے اور اس کی شرحیں بھی لکھی گئی ہیں، ان میں مشہور لغوی و نحوی ابن السکیت کی شرح زیادہ مشہور ہے، اس مجموعہ کو تین مطبوعہ نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد شائع کیا گیا ہے، حاشیہ میں ابن السکیت کی شرح اور اس کے علاوہ مرتب کے بعض اضافے بھی ہیں، دوسری کتاب میں جاہلی شاعر ثابت بن اوس ازدی شنفری اور حسین بن علی طغرائی متوفی ۵۱۵ھ کے قصائد لامیہ عرب و لامیہ عجم ہیں، شروع میں صرف قصائد کا متن اور آخر میں اصل کے ساتھ زمخشری اور صفدی کی شرحیں بھی نقل کی گئی ہیں، دونوں کتابوں میں عروہ، شنفری اور طغرائی کے واقعات و حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں، پہلی کتاب کے مقدمہ میں عروہ کے اوصاف اور اس کی شاعری کی خصوصیات اور دوسری میں دونوں قصائد کی خوبیاں دکھائی گئی ہیں، مرتب نے تینوں شاعروں کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی شاعری میں حریت و شجاعت اور ظلم و جبر کے خلاف بغاوت کی دعوت اور کمزور و مجبور لوگوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی گئی ہے، اس حیثیت سے انھوں نے ان کو اشتراکی قرار دینے کی کوشش کی ہے، اب اشتراکیت کا تصور اسقدر چھا گیا ہے کہ اس کے پرستاروں کو ہر چیز میں اسی کا جلوہ نظر آتا ہے، ہندوستان کے ایک اشتراکی ادیب نے خواجہ حافظ کے کلام میں بھی اشتراکیت کا سراغ لگایا ہے۔

نوائے پہلوی۔ از مولانا حمید الدین فراہیؒ، تقطیع خورد، کاغذ بہتر، طباعت خوبصورت ٹائپ، صفحات ۱۴۰، قیمت للعہ، پتہ: دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ،

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کو فارسی زبان کا بھی اعلیٰ ذوق تھا، اس میں

داد سخن بھی دیتے تھے، امثالِ سلیمان کے منظوم ترجمہ خرد نامہ کے علاوہ مولانا کے چھوٹے بھائی حاجی رشید الدین صاحب مرحوم نے ان کا فارسی دیوان بھی عرصہ ہوا حیدر آباد سے شائع کیا تھا لیکن ان کی علمی و قرآنی تصنیفات کی طرح اس کا بھی بڑا حصہ ابھی غیر مطبوعہ تھا اور اس کی اشاعت کا دین ان کے تلامذہ پر باقی تھا، مولانا بدر الدین صاحب اصلاحی نے جن کو گو مولانا سے براہ راست استفادہ کا موقع نہیں ملا، مگر اب وہی ان کی علمی امانتوں کے امین ہیں، مولانا کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ فارسی کلام کو اس میں جمع کر کے یہ فرض ادا کرنے کی کوشش کی ہے، مطبوعہ دیوان کی بعض غزلیں اس میں حذف بھی کر دی گئی ہیں، یہ مجموعہ قصائد و غزلیات اور بعض دیگر اصنافِ سخن پر مشتمل ہے، زبان اتنی شستہ و رفتہ ہے کہ اہل زبان کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے، مطبوعہ دیوان میں تاریخیں درج تھیں، ان کو معلوم نہیں کیوں نکال دیا گیا، اگر لائق مرتب توضیحی نوٹ اور حواشی اور مقدمہ میں مولانا کے مفصل حالات و سوانح اور خصوصیات کلام بھی تحریر کر دیتے تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی، تاہم اس کی اشاعت سے مولانا کا فارسی کلام محفوظ ہو گیا، امید ہے کہ اصحاب ذوق اور خصوصاً مولانا کے قدر دان اس بادۂ شیراز کی لطافتوں سے لطف اندوز ہوں گے۔

مفتاح القرآن حصہ اول
تفسیر سورۂ فاتحہ
از مولانا شبیر احمد ازہر میرٹھی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۰ قیمت عہ پتہ: مکتبہ دار الہدیٰ کریم نگر (آندھرا)

یہ مصنف کی زیرِ تالیف تفسیر کا پہلا حصہ ہے جو سورۂ فاتحہ کے مطالب و معانی کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہے، اسکے بعد وہ ترتیب سے ہر چھوٹی بڑی سورہ کی تفسیریں جدا جدا ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کرینگے، اس تفسیر میں اختصار اور طوالت دونوں سے بچکر مفید اور ضروری مباحث کو سادہ اور سلجھے پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے، مصنف کا علم و مطالعہ وسیع ہے، اسلیے بعض اہم اور مفید نکات بھی اس میں موجود ہیں، البتہ کہیں کہیں زبان و بیان میں معمولی ناہمواری اور تشریح میں منطقیانہ رنگ بھی آگیا ہے مگر اس سے افادیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ "ض"

جلد ۱۰۰ ماہ شعبان المعظم ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۶۷ء عدد ۵

مضامین

شذرات

مسلم یونیورسٹی کی رٹ کے فیصلہ سے مسلمانوں میں عام طور پر بڑی مایوسی ہے لیکن مایوسی کی کوئی وجہ نہیں، سپریم کورٹ نے اس پر کوئی بحث نہیں کی ہے کہ یونیورسٹی کا مخصوص کردار باقی رکھا جائے، یا ختم کر دیا جائے، اُس نے ۱۹۲۰ء کے ایکٹ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہے، کہ یونیورسٹی مسلمانوں کی نہیں، بلکہ حکومت کی قائم کردہ ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا کردار بھی ختم کر دیا جائے، مسلم یونیورسٹی خواہ قانونی طور سے مسلمانوں کی نہ مانی جائے لیکن واقعہ کے لحاظ سے انہی کے سرمایہ سے قائم ہوئی ہے، اور اس کے مخصوص کردار کی روایت انگریزوں کے زمانہ سے مسلّم چلی آرہی ہے، اس کو ہماری حکومت بھی مانتی ہے، جس پر ارکان حکومت کے بیانات شاہد ہیں، اور اسی حیثیت سے وہ اس کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے، جس کی ضرورت ہمیشہ رہے گی، اس لئے مسلم یونیورسٹی پر مسلمانوں کے جو حقوق اجنبی حکومت کے زمانہ سے مسلّم چلے آرہے ہیں، اپنی قومی حکومت کے ہاتھوں ان کا خاتمہ اُس کے دامن پر ایک بدنما دھبہ ہوگا،

درحقیقت مسلم یونیورسٹی حکومت کی سیکولرزم کا بہت بڑا نشان ہے، مسلمانوں کے دستوری حقوق کے سلسلہ میں سیکولرزم کے ثبوت میں جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں، اُن میں سب سے اہم اور اُس کا عملی نمونہ صرف مسلم یونیورسٹی ہے، اُس کے مقابلہ میں نمائشی عہدوں کی کوئی قیمت نہیں، اس سے قطع نظر پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی صرف یہی ایک یونیورسٹی ہے جو مسلمان طلبہ کیلئے تنہا پناہ بھی ہے، ان کو جو تعلیمی سہولتیں یہاں حاصل ہیں، وہ کسی یونیورسٹی میں نہیں ہیں، جن طلبہ کو کسی

یونیورسٹی میں داخلہ نہیں ملتا یا جو ہونہار طلبہ غربت کی وجہ سے گراں تعلیمی مصارف برداشت نہیں کر سکتے، اُن کو مسلم یونیورسٹی کی رعایتوں سے حصولِ تعلیم کا موقع مل جاتا ہے، اس کی مخصوص حیثیت ختم ہونے کے بعد یہ سہولتیں بھی ختم ہو جائیں گی، اور بہت سے ہونہار طلبہ محض ناداری کی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جائیں گے، جو تنہا مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا نقصان ہے،

اس مسئلہ کو جوش و خروش کے بجائے سنجیدگی اور ٹھنڈے دماغ سے حکومت سے حل کر سمجھانے کی ضرورت ہے، اس فیصلہ نے تھوڑی سی دشواری مزید پیدا کر دی ہے، اُس کی آڑ لیکر یونیورسٹی کی دشمن طاقتیں اُس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گی، لیکن امید ہے کہ صاف ذہن کے لوگ اس معاملہ میں مسلمانوں کی حمایت کریں گے، اس کا انحصار بڑی حد تک حکومت کے رویہ پر ہے، مسلمانوں کے جذبات سے قطع نظر خود حکومت کے مصالح کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کا کردار باقی رکھا جائے، جس کا وہ بار بار اعلان کر چکی ہے، اس لئے ہم کو توقع ہے کہ آیندہ جو یونیورسٹی ایکٹ بننے والا ہے اس میں وہ اس کا لحاظ رکھے گی، یہ ایکٹ حکومت کی سیکولرزم کا امتحان ہوگا، اس کا بل پیش ہونے سے پہلے مسلمانوں کو اس مسئلہ پر حکومت سے گفتگو کر لینا ضروری ہے،

دوسرا مسئلہ وائس چانسلری کا ہے، نواب علی یاور جنگ بہادر تو اپنا کام پورا کر کے امریکہ کی سفارت پر جا رہے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ ان کی جگہ کون لیتا ہے، انھوں نے اپنے عہد حکومت میں یونیورسٹی کو جس نوبت تک پہنچا دیا، اور جن مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے، اس میں مشکل ہی سے کوئی اہل و مستحق آدمی کانٹوں کا یہ تاج اپنے سر پر رکھنے کے لئے تیار ہوگا، اور ایسے اشخاص بھی آسانی سے نہیں مل سکتے، جن کو حکومت اور مسلمان قوم دونوں کا اعتماد حاصل ہو، اس وقت چند نام نگاہ میں آتے ہیں، خواجہ غلام السیدین، کرنل بشیر حسین زیدی، ہمایوں کبیر، بشیر احمد سعید، آخر الذکر دو حکومت کی نگاہ میں معتوب ہیں، اس لئے اُن کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، خواجہ غلام السیدین بھی جہاں تک معلوم ہوا ہے، قبول نہ کریں گے، اور

وہ حکومت کے پورے گروں کے بھی نہیں ہیں، صرف کرنل بشیر حسن صاحب زیدی ہی ایسے ہیں، وہی اس ڈوبتی کشتی کو منجدھار سے نکال سکتے ہیں، اور اگر حکومت کسی ملی یا جنگ ہی کو بنانا چاہتی ہو تو اس سے بہتر یہ ہوگا کہ کسی ایسے ہندو کو بنائے جو اسلامی کلچر سے واقف اور مسلمانوں سے زیادہ قریب ہو، وہ ملی یا جنگ جیسے مسلمانوں کے مقابلہ میں یونیورسٹی کیلئے زیادہ مفید ہوگا

اسلامک اسٹڈیز کانفرنس علی گڑھ کا جلسہ ۸/ اکتوبر کو جامعہ ملیہ دہلی میں ہو گیا، اس میں شرکت کا مصمم ارادہ تھا، مگر اس سے کچھ ہی پہلے دارالمصنفین کے بزرگ مولانا مسعود علی صاحب ندوی کا انتقال ہو گیا، ہمارے رفیق کار سید صباح الدین سخت بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گئے، پھر علاج کیلئے پٹنہ چلے گئے، (اس وقت تک وہ پٹنہ ہی میں ہیں مگر الحمد للہ رو بصحت ہیں) ان حالات میں دارالمصنفین سے نکلنا مشکل تھا، اس لئے شرکت نہ ہو سکی جس کا افسوس ہے، اس کی تفصیلی روداد تو سامنے نہیں آئی ہے، مگر اجمالی خبروں سے معلوم ہوا کہ اجلاس کامیاب رہا، اسلامک اسٹڈیز کانفرنس ہندوستان میں ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کا نعم البدل ہے، انشاء اللہ اہل علم کا یہ اجتماع ایک مرتبہ دارالمصنفین میں بھی ہوگا،

عربی مدارس میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کو بہت سی چیزوں میں اولیت کا فخر حاصل ہے، اب اُس نے توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں ہندوستان کے نامور فضلا مختلف اسلامی موضوعوں پر خطبات دیں گے، اس بدعت حسنہ کا سہرا مولانا محمد اویس صاحب ندوی نگرامی شیخ التفسیر دارالعلوم کے سر ہے، اس سلسلہ کا پہلا خطبہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کا تھا، جو ۳۰ ستمبر کو مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ کی صدارت میں پڑھا گیا، اس میں رشید صاحب نے ندوہ کے طلبہ سے خطاب کیا ہے، جو خطبہ "عزیزان ندوہ کے نام" سے چھپ گیا ہے، رشید صاحب تنہا ادیب و انشا پرداز ہی نہیں بلکہ مفکر و معلم بھی ہیں، مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر بڑی نظر رکھتے ہیں، اور قرآن مجید کی اصطلاح میں رجل رشید ہیں، یہ خطبہ اُن کے ملی جذبات، علمی و تعلیمی اور دینی و اخلاقی خیالات کا آئینہ ہے، ہدیہ، مجلہ الاصلاح دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ملے گا،

مقالات

موتمر مستشرقین عالم امریکہ میں

از جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پاریس

تمہید مجھے خیال پڑتا ہے کہ معارف نے سب سے پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں "اٹھارہویں موتمر مستشرقین عالم، ترجمہ از فرنچ شکیب ارسلان" کے عنوان سے اس ادارے کی سرگرمیوں سے اپنے ناظرین کو روشناس کرایا تھا، یہ میری طالب علمی اور نوجوانی کا زمانہ تھا، اس کے بعد سے بارہا اس موتمر کے اجلاسوں کی کارروائی پیش کیجاتی رہی، گزشتہ اجلاس تو دلی میں ہونے کی وجہ سے اہل ہند اب اس سے خوب واقف ہو چکے ہیں،

اب کی دفعہ ستائیسواں اجلاس امریکہ کی دعوت پر مشیگن یونیورسٹی میں ہوا ہے جو آن آربور نامی شہر میں ممالک متحدہ اور کنیڈا کی سرحد پر واقع ہے، اس بلدالجامعہ کا مطار بس میں ایک گھنٹے کے سفر پر شہر ڈیٹرایٹ میں واقع ہے جو موٹر سازی کا مرکز اور ابھی چند روز قبل گوروں کالے ہنگامے میں اس بری طرح تباہ ہوا ہے کہ اربوں روپیے کی جائداد آتشزدگی کے جنون کے نذر ہوگئی ہے،

مجھے اس سب سے "مہذب" ملک کا انتظام پسند نہ آیا، اگر شخصی مسئلے کو نظرانداز بھی کردوں کہ جامعہ مشیگن کا مدعو ہونے کے باوجود مجھے ویزا ملنے میں چھ ہفتے کا انتظار کرنا پڑا (اور سفر سے

اڑتالیس گھنٹے پہلے تک خبر نہ تھی کہ اجازت ملے گی بھی یا نہیں) یہ امر قابل ذکر ہے کہ موتمر کا افتتاحی اجلاس ۱۳ اگست کو ہوگیا، اور ہمیں دعوت دہندہ جامعہ کی طرف سے مہیا کئے ہوئے خصوصی طیارے میں اس اجلاس کے ختم ہونے کے بعد آدھی رات کو پہنچایا گیا۔ (حالانکہ ابتدائی اطلاع یہ تھی کہ ہم اجلاس سے قبل کی رات کو پہنچیں گے پھر بلا اطلاع ہوائی کمپنی نے تاریخ بدل دی) اسی طرح پارس سے دو خصوصی طیارے مقرر کئے گئے، پھر بکثرت لوگوں کو یہ اطلاع دی گئی کہ جگہ نہ ہونے کے باعث اُن کو طیارے میں نشست نہیں مل سکتی، اور بالآخر روانہ صرف ایک طیارہ ہوا! یہ ہے مشتے نمونہ از خروارے، خیر،

ہمارے پان امریکن کمپنی کے طیارے میں ایک سو ساٹھ مسافر تھے، یہ طیارہ پارس سے شام کے ساڑھے پانچ بجے اُڑا، (پارس میں ان دنوں آٹھ بجے غروب آفتاب ہوتا ہے) چونکہ مغرب کی سمت میں جا رہے تھے، اور طیارے کی رفتار چھ سو میل فی گھنٹہ اور بلندی ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی اونچی تینتیس ہزار فٹ پر تھی، نتیجہ یہ ہے کہ آفتاب نے ڈوبنے کا گویا نام ہی نہ لیا، جب ہماری گھڑیوں میں آدھی رات کے بعد دو بجے تھے کہ طیارے میں سے سورج ڈوبتا نظر آیا، اگر کوئی شخص روزہ ہوتا تو سحری کے بعد افطار تک چوبیس گھنٹے ہو جاتے، (اگر افطار مقامی غروب کے حساب سے کیا جائے) مزید آدھ گھنٹہ بعد مطار پر اترے تو معلوم ہوا کہ مقامی وقت مغرب کے ساڑھے نو بجے ہیں، واپسی میں مشرق کی طرف پرواز کرنی ہے، اس لئے رات کے دس بجے اڑنے پر دو تین گھنٹے بعد آفتاب طلوع ہو جاتا ہے، اور کل دس گھنٹوں کی پرواز کے بعد امریکہ کے حساب سے تین بجے رات ہی کو لیکن پارس میں

دو پہر سے کچھ پہلے پہونچتے ہیں، نماز اور روزے کے اوقات کا کوئی حل ہمارے فقہاء کو کو نکالنا ہوگا،

جاتے وقت مختلف جزیروں وغیرہ کے علاوہ ایک مرتبہ ہماری توجہ اس پر منعطف کرائی گئی کہ ہمارے نیچے سمندر میں چار آئسبرگ (برف کے پہاڑ) تیر رہے ہیں کوئی چھے میل کی بلندی پر سے یہ ایک متوسط قد و قامت کے جہاز کی طرح نظر آرہے تھے اور سفید چمک رہے تھے،

سفر اگرچہ پاریس سے شروع ہوا، لیکن سارے مسافر فرانس کے باشندے نہ تھے، ان میں مختلف ملکوں کے فرنگیوں کے علاوہ متعدد ہندوستانی (جن میں ایک گیروے لباس میں بدھ مت کے لاما بھی تھے،) مصری، لبنانی، مراکشی وغیرہ بھی سوار تھے،

جامعہ مچیگن | جامعہ مچیگن جو شہر آن آربور میں واقع ہے، ممالک متحدہ امریکہ کی قدیم اور بڑی جامعات میں سے ایک ہے، اور موتمر مستشرقین عالم کے اجلاس کے لئے اس کا انتخاب بتاتا ہے کہ ملک میں اس کا کیا پایہ ہے، یہاں کچھ نہیں تو سو سال سے علوم مشرقیہ سے دلچسپی لی جا رہی ہے، وہاں کے ذیل کے شعبے اس سلسلے میں قابل ذکر ہیں؛

(۱) مشرق قریبہ کی زبانیں اور ادبیات، جو عملاً عربی اسلام کے متعلق ہے، اور مراکش سے بغداد تک کے رقبہ کی قدامت و معاصرت پر حاوی ہے، (۲) جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے مسائل کا مرکز، ایران، افغانستان، بر اعظم ہند، ملایا اور انڈونیشیا کے ذریعے سے بھی اسلام سے اختصاص رکھتا ہے، (۳) روسی اور مشرقی یورپ کے مسائل کا مرکز ضمناً ہی سہی ترکی اسلام سے متعلق ہے۔ ان کے علاوہ قانون، موسیقی، جغرافیہ و خرائط (نقشہ ہائے ممالک) حتی کہ نباتیات، اور آبی وسائل (مچھلی، پٹرول) وغیرہ کے شعبوں میں بھی مسلمانوں

کے وطن سے بڑی بحث ہوتی ہے، مثال کے طور پر ڈاکٹر اسپونٹ نے چالیس سال تک ہالینڈ ہی کے گروننگن کالج میں نباتیات کا پروفیسر رہنے کے بعد اپنی آخری زندگی مچیگن ہی میں شعبۂ نباتات میں گزاری، اور یہاں کے ذخیرۂ نباتات کو ہمالیہ اور ہمالیہ تلے کے بے شمار پودوں کے اضافے سے ترقی دی،

یہاں کا شعبۂ تعلیمات و تقابلی طریقۂ تدریس بھی قابلِ ذکر ہے، اس کی بہ کثرت سرگرمیوں میں سے ایک یہ ہے کہ بمبئی اور بڑودہ کے اساتذۂ تعلیمات مچیگن بلوائے گئے، اور ان کی جگہ مچیگن کے اساتذہ بمبئی اور بڑودہ میں کام کرنے لگے، اس طرح کا کام لبنان اور ازبکستان جیسے اسلامی علاقوں میں بھی ہوا، ازبکستان کے متعلق شائع شدہ رپورٹوں سے واضح ہے کہ مدرسیوں نے وہاں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے، اور اہلِ ملک وہاں بیسویں صدی کی صنعت اور آلات وغیرہ اور نیز زراعت میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ اسے انقلاب انگیز کہا جا سکتا ہے، اس شعبے کی سرگرمیوں کا منشا، زیادہ تر بیرونی ممالک کے متعلق معلومات جمع کرنا ہے، جسے کوئی چاہے تو جاسوسی کہہ سکتا ہے)

یہاں کے عجائب خانوں اور کتب خانوں میں بھی اسلامیات کا کافی ذخیرہ ہے، اگرچہ مخطوطات میں کوئی خاص نوادر نہیں ملتے ہیں، یہاں کی انجمن شرقیات (ایسوسی ایشن فار ایشین اسٹڈیز) بھی قابلِ ذکر ہے جو خود بھی کتب و رسائل چھاپتی ہے، اور تنگدست علما کو تالیفیں چھاپنے میں مالی مدد بھی کرتی ہے، اور آخر میں یہاں کے مسلمان طلبہ کی ایک بڑی انجمن ہے، اس کے پاس ایک بڑی عمارت ہے جس میں ایک مسجد بھی ہے،

شرکائے مؤتمر | تقریباً پچاس ملکوں سے کوئی ڈھائی ہزار عورت مرد اہلِ علم نے شرکت کی اطلاع دی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے، کتنے لوگ حقیقت میں آئے، مثلاً فہرست میں لبنان سے

صلاح الدین المنجد کا ذکر تھا، مگر وہ نظر نہ آئے، دارالمصنفین کے فاضل و عزیز محترم مولوی صباح الدین[1] کا اور میرا مقالہ دونوں ایک ہی وقت میں تھے، میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ تشریف لائے یا نہیں، جم غفیر میں وہ نظر تو نہ آئے، ممالک متحدہ امریکہ اور کینیڈا میں متوطن یا ملازم مسلمانوں میں اب کافی اہل علم نظر آتے ہیں، مثلاً کینیڈا سے آنے والوں میں عزیز احمد، محمد انوار الحق اور ایک احمقانہ نام والے "عبدل ایس سیرت" (شاید عبدالسلام کی خرابی ہے) فہرست میں نظر آئے، انوار الحق صاحب مدراس کے مشہور ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کے فرزند ہیں، جب ولایت میں تعلیم پا رہے تھے تو تو بڑی ڈاڑھی کیساتھ باپ کے ہوبہو تھے، کینیڈا میں اُن کی بیوی پروفیسر ہیں، اور یہ خود تعلیم پا رہے ہیں، انگلستان کو آنیوالوں کی فہرست میں میاں محمد سعید کا ذکر ملا، فرانس سے کچھ نہیں تو نصف درجن مسلمان آئے لیکن ان سارے فرنگستانی مسلمانوں میں نو مسلم میرے علم میں نہ آئے، صرف ایک جرمن کے متعلق بھی اطلاع ہے کہ وہ کبھی کبھی جمعہ اور عیدین میں نماز میں شرکت کے لئے آجاتے ہیں، اگرچہ اپنے اسلام کا انھوں نے کبھی زبان سے اقرار نہیں کیا ہے، البتہ ایک فرانسیسی خاتون نے اقرار کیا کہ وہ مسلمان ہو چکی ہیں،

پاکستان سے تو خیر مسلمان ہی آسکتے ہیں لیکن ہندستان سے دلی اور علی گڑھ وغیرہ سے کئی مسلمان آئے تھے، اور ملاقات بھی ہوئی، بمبئی کے ڈاکٹر حسین ہمدانی مرحوم کے فرزند عباس ہمدانی بھی اپنی بیوی کے ساتھ آئے تھے، موروثی شغف فاطمیات کے متعلق جاری ہے،

حیرت اس پر ہوئی کہ مالیزیا سے آنے والوں کی کافی اچھی فہرست میں سب کے سب چینی تھے، ایک بھی مسلمان کا نام نظر نہ آیا، اور اس پر حیرت تو نہیں دل کی سوزش مزید ہوئی کہ حالیہ ہنگاموں سے قبل کے اسرائیل میں لاکھوں ہی مسلمان تھے لیکن ان میں سے کوئی عالم کی صف میں نظر نہیں آتا کہ موتمر مستشرقین کے لئے آئے، ان بیچاروں کا روزگار تو خاک دبی

---

[1] معارف: اپنا مقالہ بھیجدیا تھا خود نہیں گئے تھے،

اور حالی رہ گیا ہے، اللہ ان پر رحم فرمائے،

روس کی سیاست میں بھی کافی انقلاب ہو گیا ہے اور وہاں کے جو سرکاری وفد میں بکثرت اسلامی نام ملے، اور ان کے القاب میں "روسی اکاڈمی علوم کا رکن" بتاتا ہے کہ جہ باشے کے لوگ ہیں، البتہ اکثر کے مقالوں میں عصر جدید کا عنصر زیادہ تھا، گویا "علم کی خاطر علم" سے کہیں زیادہ سیاست اور ملکی پالیسی کی خدمت پیش نظر معلوم ہوئی، مگر دم آخر روس نے حالیہ فلسطینی جنگ کے باعث موتمر کا مقاطعہ کیا، اور روس سے کوئی نہیں آیا،

یہ بات اتنی بڑی نہیں جتنی کانفرنس کے سربرآوردہ اور کرتا دھرتا، "برادران یوسف" کا یہ رجحان کہ مسلمانوں کو تاریخ میں ظالم ہونا، عربوں اور ترکوں کے جھگڑے کو تازہ اور تیز کرنا اور یہ سب بلادِ مقدسہ کی تازہ تنجیس کی دوامت کی کوشش میں،

مہمان نوازی کا انتظام | امریکی مہمان نوازی واقعی یورپ کے مقابل بہت بہتر رہی، جامعہ کے طلبہ کے گھروں میں جتنے لوگ سما سکتے تھے، (اور کئی سو لوگ وہاں رہ سکتے ہیں،) اُن کو رہائش اور خوراک مفت رہی، اور مشیگن سے واشنگٹن اور نیویارک نہ صرف مفت لیجایا اور وہاں پھرایا گیا، بلکہ وہاں کا ہفتہ بھر کا قیام بہت اچھے ہوٹلوں میں مفت ہی رہا، (بجز خوراک کے) حسب معمول ضیافتیں، ریاست مشیگن کے گورنر کی آمد، اور خیر مقدمی تقریر، اقوام متحدہ کی طرف سے بھی خیر مقدم عمل میں آئے،

لیکن شروع میں کہا گیا تھا کہ موتمر کے انعقاد کے وقت سارے مقالوں کے خلاصے ایک ایک صفحے پر کتابی صورت میں چھاپ کر مفت بانٹے جائیں گے تاکہ ارکان اُن کا سرسری مطالعہ کر کے جس مقالے کو چاہیں اپنی شرکت کے لئے منتخب کر سکیں، اور یہ کہ کامل مقالے بعد میں چھاپے جائیں گے، اور موتمر کے ارکان کو حسب عادت مفت مہیا کئے جائیں گے، پھر

جب اجلاس شروع ہوا تو اطلاع دی گئی کہ بیچارہ امریکا اتنا غریب ہے کہ مقالوں کے خلاصے چھاپ نہ سکا، اور سارے مقالوں کو بھی چھاپنے سے قاصر ہے، صرف ایک ایک صفحہ کے خلاصے آیندہ اجلاس تک چھاپ کر شائع کئے جائیں گے، اور اگر کوئی صاحب اپنا مقالہ یا اس کا ملخص کہیں اور چھاپ لیں، تو پھر بخوشی اس کا خلاصہ بھی اس روئداد کی جلد سے حذف کرکے وہاں صرف حوالہ دیدیا جائے گا، کہ فلاں جگہ چھپا ہے،

وجہ ؟ بتایا گیا کہ مصارف طباعت زیادہ ہیں، اور یہ امریکہ کی استطاعت سے باہر ہیں،

قبل اس کے کہ موتمر کے مقالوں کا ذکر کروں، امریکہ میں اسلام کے متعلق کچھ مشاہدات عرض کروں گا،

امریکہ میں اسلام ممالک متحدہ امریکہ میں کہتے ہیں کہ دو ہزار جامعات ہیں، سرکاری بھی، نجی لوگوں کی بھی، مجھے شروع میں یقین نہ آیا، لیکن جب یہ دیکھا ایک شہر واشنگٹن میں جس کی آبادی آٹھ لاکھ سے بھی کم ہے، پانچ یونیورسٹیاں ہیں، تو دو ہزار کی تعداد کو قرین قیاس ماننا پڑا، امریکہ میں یہ قانون ہے کہ طلبہ کے ہر گروہ کو دینی اور ثقافتی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں، چنانچہ جس جامعہ میں مسلمان طلبہ ہوں وہاں انجمن طلبہ کے مکان میں ایک کمرہ مسلمانوں کو بھی ملتا ہے جسے وہ عام طور پر نمازگاہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں، آن آربور کی جامعۂ مچیگن میں سات آٹھ مسلمان طلبہ معلوم ہوئے، یہ اپنی "مسجد" میں جمعہ کی نماز بھی پڑھتے ہیں، اور باری باری سے ہر طالب علم خطیب و امام بنتا ہے، یہاں اور کینیڈا میں بہ کثرت جامعات میں مسلمان اساتذہ بھی نظر آتے ہیں،

مسلمان طلبہ کی تعداد کم ہے، اور سارے ملک میں منتشر ہیں، اس کا درماں یہ کیا گیا ہے کہ "وفاق مسلم طلبۂ ممالک متحدہ و کینیڈا" کے نام سے ایک مرکزی انجمن بنائی گئی ہے، اور ہر سال

اس کا کسی نہ کسی جامعہ میں اجلاس ہوتا ہے، امریکہ کی آب و ہوا میں علمیت و حرکت ہے، الحمدللہ یہ انجمن بھی کافی کارگذار ہے، مالی وسائل بھی ہیں، کتابیں رسالے بھی چھپتے ہیں، ان انجمنوں کے سربراہ یا تو عرب طلبہ ہوتے ہیں، (زیادہ تر شامی) یا پھر ہمالیہ تلے کے براعظم کے دیگر ممالک کے مسلمان طلبہ، خاص کر سیاہ فام طلبہ ابھی کم نظر آتے ہیں،

امریکہ میں گوری ماؤں کو بچے کم ہوتے ہیں، کالی رعیت کی تعداد قدرتی طور پر بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، چھ سات بچے، اوسط تعداد ہیں، گوروں کالوں کی کشمکش کی تہ میں ایک راز یہ بھی ہے، اسی لئے حکومت سارے وسائل سے کوشش کر رہی ہے کہ باہر سے آنے والے صرف گورے ہوں، اور بہ کثرت ہوں، جب انسان صریح ناانصافی کرتا ہے، تو قدرت بالواسطہ کوئی اور تدبیر کر لیتی ہے،

ہر فرنگی ملک کی طرح امریکہ میں بھی اسلام اب کافی تیزی سے پھیل رہا ہے، صوبہ مچیگن ہی میں پانچ مسجدیں ہیں، خاص کر شہر ڈیٹرائٹ کی مسجد میں کچھ نہیں تو ڈھائی ہزار کی جماعت ہوسکتی ہے،

گوروں کالوں کی کشمکش دودھاری تلوار ہے، اس سے کالوں کو عیسائیت سے نفرت، اور اسلام کی طرف کشش بڑھ رہی ہے، امریکہ میں کچھ نہیں تو پندرہ فی صد آبادی سیاہ فام ہے، (بعض صوبوں میں ان کی اکثریت بھی ہے مچیگن میں وہ تہائی تک پہونچ گئے ہیں،) ان سیاہ فاموں کو ایک زمانے میں جبراً عیسائی بنا لیا گیا تھا، اب ان میں سے دو تہائی دوبارہ مسلمان ہوگئے ہیں، لیکن نسلی جھگڑوں کے باعث بارہا کالے مسلمانوں کی انجمنوں بلکہ مسجدوں میں بھی گورے مسلمانوں کا داخلہ بند ہے، گورے مسلمانوں میں بھی یہ برائی نظر آتی ہے، اور اس کا حل اس وقت تک مشکل ہے، جب تک کہ نسلی کشمکش کا

سیاسی حل نکل آئے، اس حل میں اسلام بیشک ہاتھ بٹا رہا ہے لیکن نسلی کشمکش جو اسلام کے پھیلنے میں ایک رکاوٹ بھی بن گئی ہے،

امریکہ بڑا کٹر دین پرست عیسائی ملک ہے، عیسائیت کی تبلیغ پر جتنی دولت وہ صرف کرتا ہے وہ سبق آموز ہے، اپنے قیام کے زمانہ میں واشنگٹن اور نیویارک میں میں نے دیکھا کہ ہوٹلوں کے ہر ہر کمرے میں میز کے خانے میں جہاں کچھ اسٹیشنری کا غذ لفافے اور اشتہار ہوتے ہیں، وہیں بائبل کا ایک نسخہ بھی ہوتا ہے کہ مسافر اس کا مطالعہ کرے، عموماً امریکی بائبلوں کے شروع میں ایک انڈکس (اشاریہ) بھی ہوتا ہے کہ عیسائیت کی اچھی تعلیمات کن کن صفحوں میں ہیں، موتمر مستشرقین کے ارکان کو ایک رات ایک فلم تبایا گیا یعنی حضرت موسیٰ اور مستقا و عمان کے آثار قدیمہ ان کھنڈروں کو کھودنے والوں کے ساتھ تبایا گیا کہ حبشہ مشنری ڈاکٹر بھی ہوتے ہیں، اور وہ مقامی آبادی کا مفت علاج بھی کرتے ہیں، اور ان کو باور کراتے ہیں کہ یہ طبابتی علم و حکمت عیسائی مذہب کی وجہ سے ہے، (اور غالباً انفرادی تبلیغ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ بیماری مسلمان ہونے کی وجہ سے ہے۔)

نیویارک میں مسلمانوں کے متعدد بلکہ بہ کثرت ادارے ہیں، اسلامک سنٹر جزیرہ مانہاٹن میں دریا کنارے پر فضا مقام پر ہے اور اس کا امام ازہر (مصر) کی طرف سے آتا ہے، ڈاکٹر محمد عبدالرؤف ازہر کے بھی تعلیم یافتہ ہیں، اور کیمبرج و لندن کے بھی سند یافتہ، وہ ہر دلعزیز ہیں ان سے معلوم ہوا کہ آج کل عید کی نماز کسی ہوٹل کے بڑے ہال میں پڑھی جاتی ہے، لیکن اب ایک مسجد کے لئے زمین خریدنے کا انتظام ہو گیا ہے، اسلامک مشن بروکلین کے محلہ میں ہے، جسے ایک مغربی مہاجر (بہ ظاہر طرابلس الغرب والے) اپنے مصارف پر چلا رہے ہیں، اگئی منزلہ مکان ہے، جن میں ایک بڑی مسجد بھی ہے، ایک ماہوار رسالہ بھی نکالتے ہیں، کہہ رہے تھے کہ

پچپن سال سے مقیم ہوں، جب یہاں آیا تو نسلی کشمکش اتنی شدید تھی کہ ایک دن بر سر راہ میری ہر چیز لوٹ لی گئی، "اونٹنگ دھرٹنگ" ایک میل پیدل چل کر گھر واپس آیا، اور پولیس نے دخل دہی غیر ضروری خیال کی، کوئی پچاسی سالہ یہ شیخ اب بھی تنومند اور سرگرمی سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔

فرانس میں اسلام زیادہ تر تصوف کی راہ سے پھیل رہا ہے تو امریکہ میں میرے ملاقاتیوں کے بیان کے مطابق عقل کی راہ سے، لیکن ہر جگہ ناصح بے عمل ہے۔ زیادہ مؤثر کوئی مبلغ نہیں پایا گیا،

امریکہ میں عجائب خانوں اور کتب خانوں میں اسلامی چیزوں کی کمی نہیں، اور وہاں ہر چیز بڑے پیمانہ پر ہوتی ہے، واشنگٹن میں "لائبریری آف دی کانگریس" کہنے کو تو پارلیمنٹ کا جزء اور ارکان پارلیمنٹ کے استفادہ کے لئے ہے، لیکن وہ ہر شخص کے لئے کھلی ہوئی ہے، وہاں اب کتابوں رسالوں وغیرہ کی تعداد چوہتّر ملین سے کچھ زائد (ساڑھے پانچ کروڑ) ہو گئی ہے! دو وسیع عمارتیں ناکافی ثابت ہو گئی ہیں، اب ایک تیسری بڑی عمارت بن رہی ہے، اس میں اردو کتابوں کا بھی کافی ذخیرہ معلوم ہوتا ہے، میں نے تراجم قرآن مجید کے سلسلے میں یہاں کچھ تلاش کی تو انڈونیشیا، بنگال وغیرہ کے متعدد تازہ ترین تراجم کا پتہ چلا، جن سے میں واقف نہ تھا، واشنگٹن کی مسجد جسے مسلمان ممالک کے سفیر چلاتے ہیں، بہت خوبصورت ہے، ساتھ ہی ایک مختصر دارالمطالعہ بھی ہے، پارس کی طرح یہاں بھی مسلمانوں سے زیادہ سیاح تفریح کے لئے آتے ہیں،

امریکہ میں یہودیوں سے نفرت بڑی شدید ہے، (لیکن وہ تجارت، صنعت، صحافت وغیرہ پر چھائے ہوئے ہیں) اور امریکہ ان کی تائید بظاہر اس لئے کر رہا ہے کہ وہ امریکہ چھوڑ کر فلسطین یا کہیں اور جا بسیں اور ان سے پیچھا چھوٹے،

ایک عجیب و غریب معاملہ یہ مشاہدے میں آیا کہ امریکہ والوں کو یا تو سیاحت و تفریح سے

دلچسپی ہے یا تجارت سے، کم ہی لوگ اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں، اساتذہ اور بڑے انجینیر بہ کثرت باہر کے مستعار یا تازہ وارد لوگ ہیں، بیرونی زبانوں کیلئے ہی نہیں عام علوم کے لئے بھی مختلف ممالک کے مسلمان اساتذہ جابجا جامعات میں ملتے ہیں، (ہندو بھی ہیں) یہ چیز ممالک متحدہ امریکہ میں بھی ہے، کنیڈا میں بھی، جنوبی امریکہ میں بھی آزاد پیشوں میں ڈاکٹروں کی بھی بڑی مانگ ہے، اور وہاں میں بھی بہت سے مسلمان نظر آتے ہیں،

موتمر مستشرقین کی علمی کارکردگی | ستائیسویں بین الممالک موتمر مستشرقین اگست ۱۹۶۷ء کی (۱۳) سے (۱۹) تک شہر آن اربور میں منعقد ہوئی، چونکہ کوئی ڈھائی ہزار اہل علم کا مجمع ہو گیا تھا، اس لئے تقسیم کار کی ضرورت تھی، یہ تقسیم کچھ زیادہ علمی نہ تھی، بلکہ بے تکی سی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ:-

شعبہ (۱) مشرق قریبہ (۲) مشرق قریبہ اور عالم اسلامی (۳) جنوبی ایشیا قدیم زمانے میں (۴) جنوبی ایشیا جدید زمانے میں (۵) جنوب مشرقی ایشیا (۶) چین قدیم (۷) چین جدید (۸) جاپان (۹) کوریا (۱۰) وسطی ایشیا اور آلتائی (ترکی) امور، (۱۱) اجتماعی مباحث (آبادی، فنون لطیفہ، دفتریت، مغربی تہذیب کا اثر مشرقی قوموں پر، موسیقی، قدیم امریکہ کا تعلق مشرق سے، کتب خانے، زراعت کی اصلاح مشرق میں، ادبیات میں انقلابی رجحانات، مشرقی علوم کے مطالعہ کے ادارے مختلف ممالک میں وغیرہ)

ان میں سے نمبر ۲، اور نمبر ۱۰ کو غالباً سیاسی مصلحت سے جدا کیا گیا تھا، حتیٰ کہ ان کے اجلاس بھی الگ الگ عمارتوں میں رکھے گئے، جن میں باہم میل بھر کا فاصلہ تھا، نمبر ۳ میں ہندوستان اور نمبر ۵ میں انڈونیشیا و ملایا سے بھی اسلام کو گہرا تعلق ہے، مگر انھیں الگ کیا گیا تھا، اسلام کی اہمیت گھٹانے کی اس کوشش میں اس کی اہمیت بڑھ ہی گئی کہ ایک کی جگہ کئی شعبوں میں یا دو تہ

اسلام ہی کا ذکر تھا،

یہی نہیں ہر شعبے کے ذیلی شعبے بھی تھے، اور سب بہ یک وقت جمع ہوتے تھے، مثلاً شعبۂ دوم کو بتیس ۳۲ ذیلی شعبوں میں تقسیم کیا گیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم لوگوں کے مقالے کوئی شخص سن سکتا تھا،

اسلامیات پر مقالے مسلمانوں ہی نے نہیں غیر مسلم اہل علم نے بھی پڑھے، ایک ہزار نہیں تو کئی سو مقالے اسلامی دلچسپی کے تھے، سب کی تفصیل افسوس ہے کہ ممکن نہیں، کچھ مقالے اسلام کے مختلف پہلوؤں پر تھے، تو کچھ مسلمانوں کی تاریخ و تمدن کے متعلق، اسی طرح مسلمانوں کی بستیوں اور ملکوں کی پرانی تاریخ پر حتیٰ کہ جس چیز کو مثلاً خالص یہودی تصور کیا جاتا ہے، اس سے بھی مسلمانوں کو گہرا تعلق ہے، مثلاً حضرت سلیمانؑ کے نظم و نسق کی بعض تفصیلیں؛"

نمونہ از خروارے چند مقالوں کے عنوانوں کا ذکر کرتا ہوں، خدا ہی بہتر جانتا ہے یہ کب اور کہاں چھپیں گے،

شعبۂ اوّل: (۱) معزز جگیب (ترکی): استانبول کے عجائب خانوں میں مسماری کتبوں کا ذخیرہ، (۲) مائکل روٹن (امریکا): دریاؤں کا اثر عراقی تمدن پر، (۳) ماری لویز بول (ڈانمارک) خربۃ صیلون میں ڈانمارکی آثار قدیمہ کی کھدائیاں (۴) ماری لوئز شومون (فرانس): ساسانی دور کے ماتحت بادشاہ و حکمران حیرہ وغیرہ میں (۵) صبری تبریزی: شیطان اور شر ایرانی خرافات میں۔ (۶) نیڈلر (کینیڈا): وادی علفار کے قریب جبل شیخ سلیمان کی چٹانوں پر چند قدیم کندہ تصویریں (۷) فرکوتر (فرانس) نوبیہ میں فرانسیسیوں کی آثار قدیمہ کی کھدائیاں (۸) پائونگستان ہر بوں کی تاریخ نویسی قبل

اسلام میں: (۹) رابرٹ اسمتھ (امریکہ) فحل (اردن) میں آثار قدیمہ کی کھدائیاں (۱۰) شیشان (فرانس) حضرت عزیر اور قرآنی آیت قالت الیهود عزیر ابن اللہ،،

شعبۂ دوم: (۱) سید حسین نصر (ایران) شیخ الاشراق شہاب الدین سہروردی کی کتابیں۔ (۲) برمان (امریکہ) ارسطو کی کتاب اخلاق کا اثر قدیم عربی کتب فلسفہ پر (۳) اینڈاریس (جرمنی) یونانی سے عربی میں ترجمہ اور عربی اصطلاحات فلسفہ (۴) تحسین یازیجی (ترکی) عبداللہ انصاری کی ایک گمنام تالیف (۵) محمد باقر (پاکستان) قدیم زمانے میں فارسی کی ترقی، ہمالیہ تلے کے بر اعظم میں: (۶) احمد برکات (سوئٹزرلینڈ) ہندوؤں کا حصہ فارسی نثر نگاری میں؛ (۷) ٹانفل (بلجیم) عربی محاورات لسانیاتی نقطۂ نظر سے (۸) نہاد چیتین (ترکی) زوزنی کی حماسۃ الظرفاء (۹) ہائنزکیس (جرمنی) ثعلب کی کتاب قواعد الشعر (۱۰) صلاح الدین البحیری (مصر): الناصر داؤد کے خطوط، (۱۱) لوئی گاردے (فرانس) وحی کا اثر اخلاق اور سیاست پر (۱۲) لبون (انگلستان) مسلمانوں کے شہر ساتویں سے بارہویں صدی ہجری تک (۱۳) کیڈی (امریکہ) جمال الدین افغانی کا اثر حالیہ اسلامی بیداری پر (۱۴) سعید رمضان (سوئٹزرلینڈ) اسلام اور عربوں کی (جاہلانہ) قوم پرستی (۱۵) ؟ (چیکوسلواکیا) صدر الدین عینی کی تالیفیں (۱۶) محمد خلف اللہ احمد (مصر) فصیح عربی کا اثر جدید عربوں کی زندگی اور فکر پر، (۱۷) ام بلکوت (فرانس) ترکی کی پیشہ ورانہ انجمنیں (آخی)، (۱۸) فاروق سومر (ترکی) قیمبنی قبیلے کے سردار کی یادداشت (۱۹) مرزا قدیر بیگ (کینیڈا) ابن عربی پر مجدد الف ثانی کی تنقید (۲۰) سلمان تیمی (عراق) خلافت کا اسلامی تصور (۲۱) عمر لطفی برکان (ترکی) ترکی میں سولہویں صدی عیسوی کے نصف دوم میں کچھ معاشی و سماجی بحران، (۲۲) کاہن (فرانس) قرون متوسطہ

کے اختتام پر اسلامی معاشیات کی برتری یوروپی معاشیات پر (۲۳) سامی مکارم (امریکہ) الحاکم بامر اللہ (۲۴) ایس اے علی (ہندوستان) ابو الفیض فیضی کی ایک کم معروف فارسی لغت (۲۵) عبد القادر قرہ خان (ترکی) سلطان سلیمان کے زمانہ کی ترکی شاعری (۲۶) ہائد (اسرائیل) ترکی کتب فتاوی، (۲۷) رودبوفسکی (ہنگری) لطافت نامۂ خجندی (۲۸) نہاد کیسکلک (ترکی) ابن عربی کی تازہ دریافت تالیف بلغة الحکمة، (۲۹) جارج مقدسی (امریکہ) حنبلی مذہب اور تصوف، (۳۰) احمد بن محمد ابراہیم (سنگاپور) سنگاپور میں مسلمانوں کے قانون شخصی میں تبدیلیاں (۳۱) محمود الحسن صدیقی (کمسکیو) قدیم اسماعیلی تبلیغی سرگرمی سندھ میں (۳۲) نبی بخش قاضی (پاکستان) احمد رومی کی دقائق الطریق (۳۳) ہانس کروز (جامعہ عثمانیہ) جھنڈا اسلامی فوج میں (لوا اور رایہ میں فرق) (۳۴) ناچیز محمد حمید اللہ (فرانس) نسی ہجری سنہ اور ہجری و عیسوی تاریخوں کے تطابق پر ایک نئی جنتری کی تالیف کی ضرورت۔ اسکی تائید میں کانگریس نے بالاتفاق ایک قرارداد منظور کی، اور تسلیم کیا کہ موجودہ جنتریاں ناقابل اعتماد ہیں،

شعبۂ چہارم (۱) ڈاگمار بر نشروت (جرمنی) ۱۹۶۲ء کے عام انتخابات میں حیدرآباد دکن کا ایک شہر دائرۂ انتخاب (۲) سی ام نعیم (امریکہ) ہندوستانی پاکستانی کشمکش کا اثر اردو زبان اور ادب پر (۳) رفیق الرحمن (امریکہ) بنیادی حکومت عوام کا پاکستانی نظام، اور پنچایتی راج کا ہندی نظام،

شعبۂ دہم (۱) زکی ولیدی طوغان (ترکی) برکیوں کی اصل (۲) ال خانم (ترکی) وسط ایشیا کی قدیم ترین ترکی مسجد میں فن معماری کی خصوصیتیں، (۳) مانتران (فرانس) الجزائر میں ترکی دور کے نظم ونسق کی خصوصیتیں،

اختتامی جلسہ اس ختم نہ ہونے والی فہرست کو ختم کرکے صرف یہ عرض کرونگا کہ آیندہ اجلاس کیلئے جو تین سال بعد ہوگا کوئی مقام طے نہ ہوا، ارجنٹائن کی دعوت آئی تھی مسئلہ مجلس انتظامی پر چھوڑ دیا گیا ہے،

امام العصر علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

از

جناب مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی، ایم۔ اے، فاضل دیوبند

(۲)

درس حدیث میں تجدیدی کارنامہ علامۂ موصوف درس میں کتاب ہی نہیں پڑھاتے بلکہ علوم کا درس دیتے تھے، جس سے طلبہ کے ذہن میں جلا، نظر میں وسعت اور معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا تھا اور انھیں اپنی پڑھی ہوئی چیزوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا تھا، اس حیثیت سے طلبہ کے لیے یہ درس بڑی افادیت کا حامل تھا، اور ان کے معراج کمال کے لیے یہ بھی کچھ کم نہ تھا، لیکن درس حدیث میں علامہ موصوف کا تجدیدی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کی شرح میں ہر فن کا اجرا کیا اور جس طرح علامہ شرف الدین طیبی شافعی المتوفی ۷۴۳ھ نے احادیث کی شرح میں فقہ حدیث کے فن کو برتا اور فن بلاغت کے اسرار و معارف اور لغت و کلام کے نکات کو سمجھایا اور ان فنون کو شرح حدیث میں جاری کر کے دکھایا ہے، اسی طرح علامہ سید انور شاہؒ نے درس حدیث میں تمام متداول علوم و فنون کو حدیث کی شرح میں برتا اور ان کے اجراء کا طریقہ اور سلیقہ سکھایا ہے، اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ مغز حدیث تک رسائی کے لیے جملہ علوم میں درک اور دستگاہ ضروری ہے۔

اس درس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ علامہ نے اس میں مشکلات علوم کو حل کیا ہے اور فن کی دقیق باتوں کو سمجھایا ہے، ہندوستان اور پاکستان ایسے بہت سے جید علماء

گزرے ہیں جن کے حواشی و شروح نے مشکل کتاب کو پانی کردیا ہے اور ان سے استفادہ آج آسان ہوگیا ہے، لیکن ایسے علما جنھوں نے کسی خاص فن کے مشکلات کو حل کیا ہو خال خال ہی ہیں، صرف علامہ سید انور شاہ کے متعلق یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی علوم کے مشکلات کو موصوف ہی نے سب سے زیادہ حل کیا ہے، ان وجوہ سے ان کے درس کی تقریروں (امالی) میں جو تنوع پایا جاتا ہے وہ امالی کی علمی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتا، تفسیر، حدیث، فقہ، لغت، ادب اور نحو کی متعدد امالی زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور یہ سب ائمۂ فن کی امالی ہیں، اور بعض امالی تو ایسے ائمۂ فن کی ہیں جن کو بعض علوم میں اجتہاد کا دعوی ہے، مگر ان میں سے کسی میں اس نوع کا تنوع اور ہمہ گیری نہیں ہے، فقہ کی امالی میں فقہی مسائل ہی سے بحث ہے اور لغت کی امالی کا دائرہ شعر و ادب تک محدود ہے، نحو کی امالی کا تعلق نحوی مسائل سے ہے، علامہ سید انور شاہ کی امالی میں ہر فن سے اعتناء ہے اور اس کے مشکلات کو حل کیا گیا ہے، اس لیے اس میں تنوع پایا جاتا ہے، اور اس کی حیثیت دائرۃ المعارف کی ہوگئی ہے، اس بنا پر یہ کہنا بیجا نہیں کہ علامہ موصوف کو اگرچہ نہایت محنتی اور ذکی تلامذہ ملے جنھوں نے اپنی استعداد کے مطابق ان کے درس کی تقریروں کو بڑی محنت اور جانفشانی سے قلمبند کیا، اور ان کے علوم نے علمی دنیا کو متعارف کرایا، جو ان کا ناقابل فراموش علمی احسان ہے،

ضبط امالی کے صفات اربعہ لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامۂ موصوف کے علوم کو قید تحریر میں لانے کے لئے محض ذکاوت و محنت ہی کافی نہ تھی، بلکہ علوم و فنون میں تبحر اور وسعت نظر بھی درکار تھی، جو ان صفات اربعہ سے آراستہ ہوتا وہی اُن کے درس سے پورا پورا استفادہ کرسکتا اور اُن کی درس کی تقریروں کو اچھی طرح قید تحریر میں لا سکتا تھا، اس موقع پر علامہ سید انور شاہ کے درس کے متعلق بیساختہ وہ فقرہ زبان قلم پر جاری ہوجاتا ہے۔

جو علامہ محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی سنہ ۸۶۱ھ نے علامۃ الدہر شیخ محمد بن محمد الشدائی المتوفی سنہ ۸۶۳ھ کے درس کے متعلق کہا تھا کہ

هذا الرجل لا ينتفع بكلامه	اس مرد کامل کی باتوں سے ماہر فن
لا ينبغي ان يحضر درسه	علماء ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اور
الا حذاق العلماء[1]	ان ہی کو اس کے درس میں حاضر
	ہونا سزاوار اور لائق بھی ہے،

علامہ سید انور شاہؒ کے تلامذہ کو علوم میں وہ حذاقت و مہارت حاصل نہ تھی، جس سے وہ امام عصر کی درسی تقریروں کو اچھی طرح سمجھ سکتے، اور قید تحریر میں لا سکتے، دوران مطالعہ میں امام عصر کی امالی میں کہیں کہیں جو بعض موٹی موٹی غلطیاں نظر آجاتی ہیں، وہ اسی کا نتیجہ ہیں، کہ اس اہم کام سے عہدہ برآ ہونا ان کے تلامذہ کے بس کا کام نہ تھا، مجھے اس کا اندازہ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی امالی صحیح مسلم کے دیکھنے سے ہوا، جو انھوں نے مسلم شریف کے سبق میں علامۂ موصوف سے سن کر قلم بند کی تھیں، حالانکہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے علوم کی تحصیل اس دور کے ارباب کمال سے کی تھی، اور فقہ، منطق، فلسفہ، اصول، اور کلام وغیرہ کی چوٹی کی کتابیں ان اساتذہ سے پڑھی تھیں، جن کے درس کی ہندوستان میں بڑی دھوم تھی، لیکن انھوں نے جیسی کچھ درسی تقریریں سمجھی اور لکھی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایسے محنتی اور ذکی طالب علم بھی امام عصر کی پوری باتیں سمجھ نہیں پاتے تھے، چنانچہ انھوں نے اپنے عجز کا اعتراف امالی صحیح مسلم[2] میں کیا ہے، اور جس مقام پر جو بات سمجھ میں

---

[1] ملاحظہ ہو البدر الطالع بمحاسن من بعد القرن السابع از قاضی محمد شوکانی، طبع قاہرہ ج ۲ ص ۲۴۰ [2] امالی صحیح مسلم کا یہ مجموعہ کسی طرح علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ

نہیں آئی ہے، وہاں نقطے ڈال دیئے ہیں، علامۂ موصوف کے علوم کی عظمت اُن کے دل ودماغ میں ایسی بیٹھی ہوئی تھی کہ یہ امالی اُن کو جان سے زیادہ عزیز تھی، اس کے گم ہو جانے کا ان کو ساری عمر افسوس رہا، اور وہ اس کی گم شدگی پر بڑی حیرت سے یہ شعر جس کو مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوبات میں بکثرت نقل کرتے ہیں، پڑھتے تھے،

اُنچہ از من گشدہ گراز سلیماں گم شدی　　ہم سلیماں ہم پری ہم اہرمن بگریستے

علامہ سید انور شاہؒ کے تلامذہ کا اُن کے علوم کو کما حقہٗ مدوّن نہ کرسکنے پر ہمیں امام شافعیؒ کا وہ قول یاد آتا ہے، جو انھوں نے امام مالکؒ کے معاصر امام لیثؒ بن سعد المتوفی ۱۷۵ھ کے متعلق فرمایا تھا، امام شافعیؒ کا قول یہ ہے،

اللیث افقہ من مالک الا ان اصحابہ ضیّعہ،　　امام لیث امام مالک سے زیادہ فقیہ تھے، لیکن امام لیث کے شاگردوں نے ان کو ضائع کر دیا،

حافظ ابن حجرؒ نے اس کی تشریح یہ کی ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۱) کے ہاتھ آگیا تھا، موصوف نے فتح الملہم بشرح صحیح مسلم میں اس سے استفادہ کیا، اور امالی کا حوالہ بھی دیا ہے، (ملاحظہ ہو فتح الملہم، ج ۳ ص ۳۲۳) لیکن معلوم نہیں کیوں جامع امالی مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے نام لینے سے گریز کیا،

ہمیں مولانا محمد یوسف صاحب بنوری زید مجدہم کے توسط سے یہ مجموعہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے چھوٹے بھائی فضل احمد عثمانی سے دیکھنے کے لئے ملا تھا، گو یہ مجموعہ زیادہ ضخیم نہیں، مگر علامہ سید انور شاہ کے علوم کا آئینہ دار اور بہت سے علمی فوائد کا حامل ہے،

يعني لم يقوموا بفقهه كما دونوا فقه مالك وغيره وان كان بعضهم قد جمع منها شيئاً[1]

(امام شافعیؒ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ امام لیث کے شاگردوں نے اُن کی فقہ کو مدوّن نہیں کیا جس طرح امام مالک وغیرہ کی فقہ کو شاگردوں نے مدوّن کیا ہے، گو بعض تلامذہ نے اُن کے کچھ مسائل فقہیہ کو جمع کیا ہے لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر کارنامہ نہیں ہے)

یہی صورت علامہ سید انور شاہؒ کے ساتھ پیش آئی، اُن کے شاگردوں نے اُن کے علوم کو مدوّن نہ کرکے اُن کو ضائع کر دیا، آج اُن کی جو امالی ہم کو ملتی ہیں، اُن کے علوم کا ایک شمہ ہیں، اور یہ بھی وہ باتیں ہیں جو اُن کے شاگردوں نے اپنی فہم و بصیرت کے مطابق لکھ لی تھیں، اور علامہ نے بھی طلبہ کی استعداد کے پیش نظر بغیر طلب عام واقفیت کے لئے بیان کر دی تھیں، اگر سائل محقق ہوتا، اور سوالات بھی علمی کرتا، تو امالی کا رنگ ہی کچھ اور ہوتا، کاش سید انور شاہ کو بھی کوئی ایسا شاگرد مل گیا ہوتا، جیسے حافظ ابن حجر عسقلانی کو حافظ شمس الدین محمد بن عبدالرحمن سخاوی المتوفی سنہ ۹۰۲ھ ملے تھے، کہ جب جی چاہا تقریر ضبط کرانے کے لئے خادم کو بھیج کر بلا لیا، یا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح انھیں بھی کوئی محمد عاشق پھلتی مل گیا ہوتا، جو باصرار اُن سے اُن کے علوم کو مدوّن کراتا، تو علمی دنیا اُن کی امالی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتی،

علامہ سید انور شاہ کی امالی کو قید تحریر میں لانے کے لئے موزوں ترین شخصیت علامہ شبیر احمد عثمانی

---

[1] ملاحظہ ہو الرحمۃ الغیثیہ بالترجمۃ اللیثیہ فی مناقب سیدنا الامام اللیث بن سعد از ابن حجر عسقلانی طبع میمنیہ بولاق مصر ۱۳۰۱ھ ص ۹

کی تھی، وہ بڑے ذہین، طبّاع، اور علوم معقول و منقول میں حاذق تھے، انھیں افہام و تفہیم کا بڑا اچھا سلیقہ تھا، زور بیان اور حسن ترتیب کا بھی ملکہ تھا، عربی تحریر و تقریر پر بھی پوری قدرت حاصل تھی، علامہ سید انور شاہؒ کو بھی ان کے فہم و فراست پر پورا اعتماد تھا، اور یہ بھی علامۂ موصوف کی جامعیت، ژرف نگاہی اور وسعت معلومات کے قائل اور قدر داں تھے، اسی لئے فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں جگہ جگہ ائمۂ فن اور کبار علما کے اقوال کے ساتھ علامہ سید انور شاہؒ کے اقوال کو بھی زیب قرطاس کیا ہے،

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں بڑی محنت کی، اپنی پوری جوانی اس میں لگا دی تھی، پھر بھی وہ پوری نہ ہو سکی، قرآن مجید پر اردو میں حواشی اور تفسیر ان کا بڑا کارنامہ ہے، جس کے لئے آیندہ نسلیں ان کی ممنون ہوں گی، لیکن ان کے مرتبہ کا کام یہ تھا، کہ وہ حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتابوں کے مضامین اپنی زبان میں بیان کر جاتے تو عوام و خواص دونوں ان سے استفادہ کر سکتے، یا علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کی صحاح ستہ پر امالی (درسی تقریروں) کو قید تحریر میں لے آتے، تو یہ علمی دنیا پر ان کا بہت بڑا احسان ہوتا، اور ان کی بقا کے لئے اور کسی چیز کی ضرورت نہ ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ انھوں نے یہ کام نہیں کیا، ان کے مقابلہ میں سید انور شاہؒ نے اپنی فطری صلاحیتوں سے وہی کام لیا، جو ان کے دل و دماغ کا اچھے سے اچھا مصرف ہو سکتا تھا، ان کی اس دماغی فوقیت کا راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنی قوتوں سے وہ کام لیا، جو ان کے معاصروں کی دسترس سے باہر تھا، علوم قرآن و حدیث، فقہ، اصول، کلام و فلسفہ سے متعلق اپنی تالیفات اور امالی میں جس قدر مواد یکجا کر دیا ہے، وہ علوم کا گویا نچوڑ ہے،

تاہم علامہ سید انور شاہ کے بعض تلامذہ نے ان کے علوم کو جس قدر اور جس صورت میں

بھی مُرتب و مدون کر دیا ہے، وہ بھی اہل علم کے لئے بڑا کارآمد اور قیمتی سرمایہ ہے اور آج علامہؒ موصوف کے گوناگوں علوم میں تبحر کے معلوم کرنے کا واحد ذریعہ یہی امالی ہیں، گو ایک ہوشمند عالم کو مختلف موضوع پر اُن کے مختصر رسالوں کے مطالعہ سے ان کی جامعیت، جلالت شان اور ہرفن میں مجتہدانہ بصیرت کا بخوبی علم ہو جاتا ہے، لیکن جو تنوع اُن کی امالی میں ہے، وہ تالیفات میں نہیں، کیونکہ اُن کے موضوع خاص ہیں جن کی بحث کے گوشے بھی مخصوص اور محدود ہوتے ہیں، اس کے برعکس درس کے حدود نہایت وسیع ہیں، اس میں بہت سے مسائل زیر بحث آجاتے ہیں۔

علامہ سید انور شاہؒ کی امالی اگرچہ پوری صحاح ستہ پر ہیں، لیکن العرف الشذی علی جامع الترمذی، فیض الباری علی صحیح البخاری اور معارف السنن جس میں علامہ موصوف کے مشکلات علوم کی توضیح و تشریح کی ہے، امالی علی صحیح مسلم، امالی علی سنن ابی داؤد، امالی علی سنن ابن ماجہ زیادہ اہم ہیں، اوّل الذکر تین کتابیں اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کی سرزمین پر پہلی اور آخری ہیں، ہند و پاک میں علوم سے معمور ایسی مفید اور جامع کتابیں کبھی نہیں لکھی گئیں میں جب ان امالی کو دیکھتا ہوں تو استاد اور شاگرد دونوں کو دعائیں دیتا ہوں۔

ان امالی میں علامہ سید انور شاہؒ نے اس زمانہ میں حنفی مذہب کو حدیث کی بنیاد پر جس طرح مستحکم کیا ہے، وہ حقیقت میں اُن کا بڑا کارنامہ ہے، اکثر مواقع پر علامہؒ موصوف کی دقت نظر اور علوم و فنون میں حذاقت ان کو متقدمین کی صف میں بھی ممتاز و نمایاں کر دیتی ہے، ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء پھر کمال یہ ہے کہ اُن کی تنقید کے الفاظ میں ایسی احتیاط ہے کہ ادب کا پہلو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موصوف باینہمہ علم و فضل اخلاق و تقویٰ کے کیسے بلند مقام پر فائز تھے،

اکابر دیوبند کے کمالات جانچنے کا معیار

اکابر دیوبند میں محقق عارف باللہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، امام سُنّت مولانا رشید احمد گنگوہی اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس اللہ اسرارہم کے علمی و عملی کمال کے جانچنے کا جو صحیح ترین معیار ہے، بحمد اللہ اس معیار پر علامہ سید انور شاہ کشمیری پورے اترتے ہیں، یہ حقیقت پسندانہ معیار بھی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی نے بتادیا ہے، فرماتے ہیں:

"لوگ کہتے ہیں کہ رازی اور غزالی پیدا ہونا بند ہوگئے، مگر بالکل غلط ہے، ہمارے حضرات رازی اور غزالی سے کم نہ تھے، علوم میں بھی کمال میں بھی،

بات یہ ہے کہ حیات میں قدر نہیں ہوتی، مرجانے کے بعد رحمۃ اللہ علیہ ہو، پچاس برس گذر جانے کے بعد قدس سرہ ہو جاتے ہیں، اور تماثل کے معلوم ہونے کا بڑا اچھا معیار ہے، اُن کی تحقیقات کو بھی دیکھ لیا جائے، اور ان حضرات کی بھی، اس سے معلوم ہو جائے گا" [۱]

عارف تھانوی حسن العزیز میں فرماتے ہیں،،

"ان حضرات کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں کرا دیا جائے، اور بتلایا جائے تو دیکھنے والے رازی و غزالی کے زمانہ کی بتلاویں گے" [۲]

جس کو اس امر میں تامل ہو وہ علامہ موصوف کی تصانیف کا موازنہ قدماء کی تصانیف سے کرکے دیکھ لے حقیقت آشکارا ہو جائے گی، مثلاً تکفیر کے موضوع پر جن ائمہ فن نے قلم

---

[۱] ملاحظہ ہو: الافاضات الیومیہ من الافادات القومیہ طبع کراچی ج ۲ ص ۲۹۹

[۲] ملاحظہ ہو حسن العزیز (ملفوظات حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی) شائع کردہ مکتبہ تالیفات اشرفیہ تھانہ بھون، بھارت ج ۲ ص ۴۰۲،

اٹھایا، اُن میں حجۃ الاسلام امام غزالی ابن حزم، ابن تیمیہ، ابن قیم وغیرہ کا نام سرفہرست ہے، لیکن جیسی جامعیت استیعاب مباحث اور تنقیح مناط علامہ سید انور شاہؒ کے رسالہ اکفار الملحدین فی ضروریات الدین (مجلس علمی ڈابھیل سورت) میں ہے، ان ائمہ کے یہاں نہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارا دعویٰ کس حد تک صداقت پر مبنی ہے،

علامہ موصوف نے اپنی خداداد فہم و فراست اور ذکاوت و بصیرت سے اپنے رسائل اور امالی میں مشکلاتِ علوم کو جس طرح حل کیا ہے، ان کو بلحاظ جامعیت، وسعتِ نظر، عالمانہ تدقیق اور کمالِ فن بڑے بڑے اہل کمال ائمہ کی تحقیقات کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے، اسکی توضیح سے یہ مضمون کتاب بن جائے گا، اسلئے ہم اُس کی چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں،

کتاب الایمان کی معرکۃ الآرا بحث "الایمان یزید وینقص" میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی المتوفی ۶۳۸ھ شیخ عبدالوہاب شعرانی المتوفی ۹۷۳ھ اور علامہ ابو محمد علی بن حزم المتوفی ۴۵۶ھ کا قول پیش کرنے کے بعد علامہ سید انور شاہ کا قول نقل کیا ہے،[۱]

اس مسئلہ پر کہ کفار بھی معاملات میں مخاطب ہیں، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ اور علامہ بدرالدین عینی کا کلام نقل کرنے کے بعد حافظ سید انور شاہؒ کا فیصلہ نقل کیا ہے،[۲]

نزولِ عیسیٰ کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فتح الملہم میں سید انور شاہ کی پُر مغز بحث کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے،[۳]

اسی طرح معراج کے باب میں آیتِ شریفہ ولقد راٰہ نزلۃً اخریٰ کی توضیح

---

[۱] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱-ص ۱۵۹ [۲] ایضاً ص ۱۸۱ [۳] ایضاً ص ۳۰۳،

(تشریح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار الٰہی کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے صرف علامہ سید انور شاہؒ کے کلام کو نقل کیا ہے، اور کسی اور محقق کے کلام کو پیش کرنے کی حاجت نہیں سمجھی ہے[1]،

حدیث شریف نور انی اراہ کی تشریح میں علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے فتح الملہم میں مشہور شارح بخاری شیخ ابو عبد اللہ محمد بن علی مازری مالکی المتوفی ۵۳۶ھ کا قول نقل کرنے کے بعد سید انور شاہ کا قول پیش کیا ہے، پھر یہ لکھا ہے، ولا یخفی ما فیہ من اللطافۃ[2]،

اسی طرح مسح ربع راس (چوتھائی سر کے مسح کی فرضیت) کی بحث میں علامہ عثمانیؒ نے فقیہ ابو الولید محمد بن رشد مالکی المتوفی ۵۹۵ھ اور محقق کمال الدین ابن ہمام المتوفی ۸۶۱ھ وغیرہ کی بحث کے بعد علامہ سید انور شاہ کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے[3]،

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے وضو میں سات مرتبہ پاؤں دھونے کے متعلق حافظ ابو زکریا محی الدین نووی المتوفی ۶۷۶ھ کا کلام نقل کرنے کے بعد علامہ عثمانیؒ نے حافظ ابن حجر عسقلانیؒ کی توجیہ پیش کی ہے، اور علامہ سید انور شاہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا جو مستدل پیش کیا ہے، وہ نقل کیا ہے، یہ مستدل ان دونوں حفاظ حدیث کی نظر میں نہیں ہے[4]،

علامہ موصوف کی تحقیقات کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کا فیضان آج بھی اس اُمت پر ویسا ہی جاری و ساری ہے، جیسا کہ پہلے تھا، ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۴ھ نے حدیث ان اللہ یبعث علیٰ راس کل مائۃ من یجدد لہا دینہا پر بحث کرتے ہوئے جو یہ لکھا ہے،

ان ھذہ التجدید امر اضافی یہ تجدید ایک امر اضافی ہے، کیونکہ

---

[1] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱۔ ص ۳۳۵ [2] ایضاً ص ۳۲۱ [3] ایضاً ص ۴۰۹،

[4] ملاحظہ ہو فتح الملہم بشرح صحیح مسلم ج ۱۔ ص ۳۹۲،

لان العلم كل سنة في التنزل	علم ہر سال گھٹتا جا رہا ہے
كما ان الجهل كل عام في	جہل بڑھتا جا رہا ہے، ہمارے دور
الترقي وانما يحصل ترقي علماء	کے علماء کی ترقی ہمارے علم کے تنزل
زماننا بسبب تنزل العلم	کے سبب سے ہے، ورنہ متقدمین
في أواننا والا فلا مناسبة	متاخرین علماء میں علم و عمل، حلم و
بين المتقدمين والمتأخرين	فضل اور تحقیق و تدقیق کے اعتبار سے
علما وعملا وحلما وفضلا	کوئی مناسبت ہے،
وتحقيقا وتدقيقا، [1]	

یہ کوئی حکم کلی نہیں ہے، متاخرین علماء میں جو ارباب کمال اس حکم سے مستثنیٰ ہیں ان میں علامہ سید انور شاہؒ بھی داخل ہیں، سچ ہے،

ہنوز آں ابر رحمت درفشان است   خم و خمخانہ با مہر و نشان است
نقصان نہ قابل است گرز علی الدوام   فیضِ سعادتش ہمہ کس را برابر است

موصوف کی علامہ سید انور شاہ کے الفاظ سے شہرت کی وجہ

علامہ سید انور شاہ کشمیری اکثر ایسی اونچی بات کہتے ہیں جس کو بغیر تمہید و ترتیب مقدمات طلبہ کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے، اس امر کا صحیح اندازہ ایک مدرس مزاج انسان ہی کر سکتا ہے، جس طرح علمی دنیا میں دقتِ نظر، علوم عقلیہ میں مہارت، اور جلالتِ علمی کی وجہ سے علی بن محمد جرجانی المتوفی ۸۱۶ھ کو علامہ سید شریف جرجانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح محمد انور شاہ کو اہلِ علم کے طبقہ میں علامہ سید انور شاہ کے نام سے پکارا جاتا ہے،

---

[1] ملاحظہ ہو مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح از ملا علی قاری مطبعہ میمنہ مصر ۱۳۰۹ھ ج ۱ ص ۲۴۵،

جن اہلِ علم نے اس خوانِ علم کی زلہ ربائی کی وہ آسمانِ علم کے درخشاں ستارے بنے اور اس عہد کے اکابر علماء میں ان کا شمار ہوا، ان میں جو وسعتِ نظر پیدا ہوئی وہ علامہ سید انور شاہ کے حلقۂ درس کا فیضان ہے، ایسے ہی نامور تلامذہ کو مولانا سید سلیمان ندوی نے دائرۂ علم سے تعبیر کیا ہے، یادِ رفتگاں میں لکھتے ہیں:

"بعض مشاہیر کے نام جو مجھے معلوم ہیں وہ یادگار کے طور پر سپردِ قلم کرتا ہوں، مولانا مناظر احسن گیلانی، مولانا ابو المآثر محمد حبیب الرحمان اعظمی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی، مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی، مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، ان میں سے ہر ایک بجائے خود دائرۂ علم ہے"[1]

مشکل پسندی اور مختصر نگاری

حقیقت و صداقت، عقیدت و محبت سے بلند ہے، اس لئے علامہ انور شاہ کے کمالات کے ساتھ اس کا بھی اعتراف ہے کہ اُن کی طبیعت میں مشکل پسندی اور مختصر نگاری تھی، اس لئے اُن کی تحریر و تقریر کو عوام کیا خواص کے لئے سمجھنا بھی مشکل ہے، اُن کی تقریر کے متعلق حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے، فرماتے ہیں:-

"وہاں شملہ کے بعض معزز تعلیم یافتہ صاحبوں نے مولانا انور شاہ صاحب سے کہ وہ بھی اسی سفر میں تھے، اعجاز القرآن پر بیان کرنے کی فرمائش کی چنانچہ بیان کیا گیا مضمون غامض تھا، وہ لوگ بھی نہیں سمجھے، پھر ان پر اعتراض کیا گیا کہ ایسے بیان سے کیا نفع جو سمجھ میں ہی نہیں آیا یہ بیان تو مدرسۂ دیوبند میں بیٹھ کر کرنا تھا، اس کا جواب بھی وعظ میں میں نے ہی دیا کہ شاہ صاحب نے

---

[1] ملاحظہ ہو یادِ رفتگاں، طبع کراچی ۱۹۸۶ء، ص ۴۳۔

جاہلیا بیان کیا ہے، وہ اضطراراً نہیں کہ سہل بیان پر قادر نہیں، بلکہ ایک مصلحت سے قصداً بیان کیا ہے، اور مصلحت یہ ہے کہ آج کل مدعیانِ علم بہت زیادہ پیدا ہوگئے ہیں، اور اجتہاد کا دروازہ کھل گیا ہے، حتیٰ کہ انگریزی پڑھ پڑھ کر قرآن وحدیث کا اردو ترجمہ دیکھ کر علوم میں دخل دینے لگے ہیں، تو شاہ صاحبؒ نے دکھلا دیا کہ تم اہل علم کے کلام کو بھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ قرآن وحدیث میں اجتہاد کرسکو،

تبلائیے اس بیان سے یہ نفع تھوڑا ہوا کہ تم کو اپنے جہل پر اطلاع ہوگئی، سب شرمندہ ہوگئے، مجھ کو جاہلوں کا علماء پر اعتراض کرنا بھی ناگوار ہوتا ہے، اس لئے بھی یہ جواب دیا گیا"[۱]

اسی مشکل پسندی اور مختصر نگاری کی بنا پر ان کے قلم سے جو دو چار رسالے نکل گئے ہیں، اُن کو بڑے سے بڑا محقق بار بار مطالعہ کئے بغیر پوری طرح نہیں سمجھ سکتا، چنانچہ فاتحہ خلف الامام جیسے پامال موضوع پر جب علامہ نے قلم اُٹھایا، تو ایسا رسالہ لکھا کہ اہل علم کو اشتہار میں یہ لکھنا پڑا کہ بڑے بڑے علماء اس کو مشکل سے سمجھ سکتے ہیں، اس لئے معمولی استعداد کے لوگ اس کو طلب کرنے کی زحمت نہ کریں،

یہ عجیب وغریب اشتہار، مولانا سید اصغر حسین دیو بندی نے کلیات شیخ الہندؒ کے سرورق کی پشت پر دیا تھا، کہ:

" فصل الخطاب فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں محدثانہ تحقیقات اور عالمانہ

---

[۱] ملاحظہ ہو الاضافات الیومیہ من الافادات القومیہ طبع تھانہ بھون ۱۳۶۰ھ-۶ ص ۱۹۲،

مضامین کا فی التحقیق بے مثل رسالہ جو اکابر محققین کی تصنیفات کا سچا نمونہ ہے

دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے عربی

زبان میں بکمال انصاف تحریر فرمایا ہے، بڑے بڑے علماء بھی مشکل سے سمجھتے

ہیں، کم استعداد مولوی طلب نہ فرماویں"[۱]

علامہ سید انور شاہ میں اگر تصنیف و تالیف کا اچھا سلیقہ ہوتا، اور ان میں مشکل

پسندی، ایجاز، اور مختصر نگاری نہ ہوتی، اور اُن کو اپنے معاصر محدث مولانا شیخ محمد زاہد

کوثری کا پیرایۂ بیان اور ترتیب و تہذیب ملی ہوتی، اور یہ کام اُن کے ہاتھوں انجام

پاتا، تو دنیا میں صحاح ستہ کے سمجھنے کے لئے کسی اور کتاب کی حاجت نہ رہ جاتی، اور

کسی کو اس پر قلم اٹھانے کی گنجائش باقی نہ رہتی، مگر اُن بے نفسوں کو اخفائے حال

میں اتنا اہتمام تھا کہ وہ چاہتے ہی نہ تھے کہ دنیا میں اُن کو عالم کی حیثیت سے پہچانا جائے،

بزرگوں کے جبر نے تدریس پر بھی آمادہ کیا، ورنہ اُن کو یہ بھی گوارا نہ تھا،

---

[۱] ملاحظہ ہو کلیات شیخ الہند، مطبع قاسمی دیوبند ۱۳۴۰ھ

عہدِ مغلیہ

مسلمان و ہندو مورخین کی نظر میں

(حصہ اول)

اس جلد میں شہنشاہ بابر کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی، تہذیبی کارناموں کو معاصر اور جدید دور

کے مورخین کی تحریروں کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے، قیمت ۵ روپے

مرتبہ: سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے، "منیجر"

دستور المفسرین

ایک نادر علمی تصنیف

از

جناب محمد سالم صاحب قدوائی ایم اے شعبۂ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

یہ رسالہ ناسخ و منسوخ سے متعلق ہے اور اس فن پر بہت ہی مفصل اور عمدہ تصنیف ہے[1]،

اس کے مصنف عماد الدین محمد عارف عرف عبد النبی عثمانی شطاری سندیلوی ثم اکبرآبادی ہیں، ان کے والد شیخ عبد اللہ بھی بڑے پایہ کے عالم اور صوفی بزرگ تھے، یہ دونوں چیزیں شیخ عبد النبی کو اپنے والد سے ورثہ میں ملی تھیں، افسوس ہے کہ ان کے مفصل حالات اور ولادت و وفات کی تاریخوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا، البتہ یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا زمانہ دسویں صدی کے آخر اور گیارہویں صدی ہجری کے شروع کا ہے، ان کی بعض کتابوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے، صاحب نزہۃ الخواطر اور مولوی رحمان علی صاحب نے طب لاماثل سے ان کی تصنیف فواتح الانوار کے حوالہ سے ان کا زمانہ سنہ ۱۰۲۰ھ / ۱۶۱۲ء متعین کیا ہے، فواتح الانوار کی عبارت یہ ہے:-

---

[1] ڈاکٹر زبید احمد صاحب نے اپنی کتاب The Contribution of India To Arabic Literature میں اسے لاپتہ قرار دیا ہے، لیکن اس کا ایک قلمی نسخہ علی گڑھ میں مولانا عبد الحئی صاحب مرحوم کے ذخیرۂ کتب میں مخطوطہ نمبر ۱۴/۲ کے تحت موجود ہے۔

قد وقع الفراغ یوم الجمعۃ	جمعہ کے دن ۲۸ ذوالحجہ ۱۰۲۰ھ میں
ثامن ثانی عشر من عشرین من	والد محترم کے مزار کے سامنے شہر آگرہ
حادی عشر من الھجرۃ تجاہ مرقد	(اللہ تعالیٰ اسے تمام ناپسندیدہ باتوں
الشیخ الوالد الواقع ببلدۃ آگرہ	سے محفوظ رکھے) میں اس کے لکھنے سے
صانھا اللہ من جمیع ما یکرہ و	فراغت ہوئی، اس کی تاریخ اتمام
تاریخ اتمامہ افضال حق	"افضال حق" ہے

لیکن دستور المفسرین کے خاتمہ کی عبارت سے تاریخ ۱۰۲۱ھ نکلتی ہے:

وقد حصل الفراغ من تسوید	اللہ بزرگ و برتر کی مدد سے اس
ھذا المقال بعون اللہ الملک	مقالہ کو دوشنبہ کی صبح ۲۱ صفر
الوھاب المتعال ضحوۃ یوم	۱۰۲۱ھ میں لکھنے سے فراغت ہوئی،
الاثنین حادی عشرین	
من الثانی وھو من حادی عشرین	
من احدی عشر من سنی ھجرۃ[2]	

ان کی بہت سی تصانیف ہیں جن کا ذکر طرب الاماثل تراجم الافاضل ص ۲۲۰، نزہۃ الخواطر ۵/۲۶۱ اور تذکرہ علمائے ہند ص ۱۳۵ میں ملتا ہے، مختلف تذکروں میں انکی اڑتالیس کتابوں کے نام ملتے ہیں، مثلاً فواتح الانوار شرح لوائح الاسرار، ذریعۃ النجاۃ، شرح المشکوٰۃ، شرح الفصوص، الفوائح، شوارق اللمعات شرح اللمعات، دستور السعادۃ، حاشیہ شرح جامی، لوامع الانوار فی مناقب السادات، رسالہ ناسخ التناسخ، شرح جام جہاں نما،

[1] تذکرہ علمائے ہند، ص ۳۲۰ (اردو ترجمہ)، نزہۃ الخواطر ۵/۲۶۱، طرب الاماثل تراجم الافاضل ص ۲۲۱
[2] دستور المفسرین ورق ۳،

فتوحات المغیبۃ، مقامات العارفین، حدائق الانشا، کشف الانوار، دستور المفسرین وغیرہ، ان میں سے اکثر کا پتہ نہیں چلتا۔

زیر نظر تصنیف دستور المفسرین غالباً ان کی آخری تصنیف ہے، اس لیے کہ انھوں نے اس کے آخر میں لکھا ہے کہ اگر اجل نے مہلت دی تو ایک رسالہ آیات متشابہات کی تاویل میں لکھیں گے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی، کیونکہ اس قسم کے کسی رسالہ کا ان کی تصانیف میں ذکر نہیں ملتا ہے۔

دستور المفسرین ۳۰ اوراق کا رسالہ ہے، یہ نسخہ صاف خط اور خاصے بہتر حال میں ہے، اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

"بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ و ارجو منک الافاضۃ تکریم ۃ الحمد للہ الذی نسخ سنن الضلالۃ والھوی ومسخ ومحی سنن الغوایۃ والردی ...."

اس کے بعد خاصا طویل مقدمہ ہے، جس میں یہ بحث کی ہے کہ آیات کیوں اور کس طرح سے منسوخ ہوئیں، اس سلسلہ میں مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کا ذکر اور ان کی تعریف و توصیف کی ہے، اس کے بعد اپنے نام اور علم تفسیر کے متعلق لکھتے ہیں:

وبعد فیقول العبد المفتقر	حمد و ثنا کے بعد اللہ تعالیٰ کی عنایتوں کا
الی العنایات القیومی عبد النبی	طالب بندۂ ناچیز عبد النبی بن سراج الدین
بن سراج الدین شیخ عبد اللہ	شیخ عبد اللہ صوفی جو نسبتاً عثمانی اور
الصوفی العثمانی نسبۃً والشطاری	خرقۃً شطاری اور ملتاً و مذہباً حنفی ہے

خوفه والمخوف منه هبوطه الاجوري	جس کی اقامت اور وطن بلگرام ہے،
موطنًا واقامةً ان علم التفسير	عرض کرتا ہے کہ علم تفسیر تمام علوم میں ایسا
من بين العلوم علم ارفعها	علم ہے جو اپنی قدر اور مثال کے اعتبار سے
قدراً ومثالاً واعظمها نفعاً واعتباراً	بلند ہے، اپنے نفع کے اعتبار سے عظیم ہے
اذ هو مفخر العلوم ومنبعها وكنز	اور یہ تمام علوم میں سب سے قابل فخر اور سب کا
الشرائع ومعدنها اودع الله	سرچشمہ ہے، شریعت کا خزانہ اور اس کی
سبحانه فيه اللطائف والغرائب	کان ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں لطائف
وكل ما كان وما يكون من العجائب	و غرائب ودیعت کیے ہیں اور ہر وہ عجیب
ولا رطب ولا يابس الا في	بات جو ہو سکتی تھی یا ہے اور ہر رطب و یابس
كتاب مبين (ورق ۲-ب)	اس کتاب مبین (کلام اللہ) میں موجود ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں :-

ولما كان علم الاصول من	اور جب کہ یہ علم اصول دینیہ کی بنیاد
حيث انه اساس الاصول	اور محکم دلیلوں سے مستنبط ہونے والی
الدينية ومقياس للفروع	باتوں کا پیمانہ ہے، یہ تاریخ اور
المستنبطة من الحجج اليقينية	مقدم و موخر کے علم پر، خاص طور
موقوفاً على علم التاريخ و	سے ناسخ منسوخ کے علم پر موقوف
المقدم والموخر سيما الناسخ	ہے، توضیح معانی میں اس کو خاص
والمنسوخ فان له مدخلاً	دخل ہے، اور جو شخص اس کو نہ جانتا
تاما في توضيح المعاني ومن لم	ہو اس کے لئے توضیح و تفسیر کے علیہ

فیلیس ذالک فلا یحل الاقدام	میں قدم رکھنا اچھا نہیں ہے، اور
فی میدان تلمیح المبانی ولا	اس کے لئے تفسیر و بیان اور قرآن کا
یجوز له التفسیر والبیان	ترجمہ کرنا، مسائل و معاملات کی
وذکر ترجمة القرآن و	آیات کا استدلال، مقاصد و
استدلال الآیات فی المسائل	معاملات کے سلسلہ میں دلائل و
والمعاملات والاحتجاج و	براہین پیش کرنا جائز نہیں ہے،
البرهان فی المقاصد و	اس لئے کہ اس سے مخلوق کے لئے
المدعیات لانه یفضی الی	حلال کو حرام کرنے اور حرام کو
تحریم الحلال وتحلیل الحرام	حلال کرنے، ممنوع چیزوں کے
واباحة المحظور وحظر المباح	جواز اور مباح چیزوں کی ممانعت
للانام، (ورق ۳۰)	تک نوبت پہونچتی ہے،

اس کے بعد اس سلسلہ میں احادیث و اقوال نقل کئے ہیں جن میں اس کی تاکید ہے کہ ناسخ و منسوخ کا علم ایک مفسر کے لئے بہت ضروری ہے، پھر اس کتاب کے لکھنے کی ضرورت بیان کی ہے، اور بتایا ہے کہ ان کے پیش نظر کیا ہے،

فعزمت ان اجمع رسالة	میں نے اس باب میں ایک مکمل
کاملة فی هذا الباب شاملة	رسالہ مرتب کرنے کا ارادہ کیا،
لجمیع الفصول والابواب	جس میں اس مسئلہ کی تمام تفصیلیں
محتویة لجمیع ما یقصد ویقصد	اور ابواب شامل ہوں، اور
فی هذا المقصد الاعلی جامعة	وہ تمام چیزیں اس میں آجائیں

لکل ما یجب ان یعلم و
یطلب فی هذا المطلب
الا سیّما من کون السور
مکیة او مدنیة مع ما فیها
من المختلفات والمستثنیات
وتعداد الآیات وعدد الحروف
والکلمات وتتبعت رسائل
متعددة وتفحصت صحائف
متنوعة وامعنت النظر و
اجلت الفکر واستخرجت
منها الدر الثمین ومیزت
القشر عن اللب والغث عن
الثمین فجمعت اوراقا عدیدة
فی هذا الشان مضطربة
علی ما لا بد منه فی الایضاح
والبیان مستنبطة عن
مصنفات العلماء المحققین
ومستخرجة عن مؤلفات فضلاء
المتاخرین وسمیته دستور

جن کا مقصد وارادہ اس عظیم مقصد
کے حصول کے لئے کیا جاتا ہو، جس
میں وہ تمام باتیں جمع ہوں جن کا
اس اعلیٰ مطلب کے لئے جاننا ضروری
ہو، مثلاً سورتوں کے متعلق کہ وہ
مکی ہیں، یا مدنی، مع اُن کے اختلاف
اور مستثنیات کے، آیتوں کی تعداد،
حروف وکلمات کی تعداد، میں نے
اس سلسلہ میں متعدد رسالوں کا
اتباع کیا ہے، اور مختلف قسم کی
کتابوں کو دیکھا ہے، اور اُن پر
بڑی گہری نظر ڈالی ہے، اور بہت
غور وفکر کیا ہے، میں نے اس میں
سے قیمتی موتی نکالے ہیں، اور مغز کو
پوست سے الگ کیا ہے، جھاگ سے
مکھن نکالا ہے، پس میں نے یہ چند
اوراق اس سلسلہ میں مرتب کئے
ہیں، جو توضیح وبیان کے لئے ازحد
ضروری تھے، یہ تمام محققین اور

المفسرین لیکون دستور الذاکرین وعمدۃ للواعظین، (ورق ۳-ب)	جیسے بڑے فضلائے متاخرین کی تصانیف سے ماخوذ ہیں، اور میں نے اس کا نام دستور المفسرین رکھا تاکہ ذکر کرنے والوں کے لئے ایک دستور اور واعظین کے لئے مضبوط رسّی ہو،

اس تصنیف کو مصنف نے خانخاناں کے نام معنون کیا ہے، اور خانخاناں کی بڑی تعریف کی ہے، اور اس کو "والی آالیہ الفضل والکرم" معز العلماء والفضلاء، شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ، علو الھدیٰ، بحر الھند، عضد الدولۃ القاھرۃ، وحید العصر، فرید الزمان، صاحب السیف والقلم، معدن الجود ومنبع الکرم، جامع العلوم العرفان، معین الاسلام والایمان وغیرہ بڑے بڑے القاب سے یاد کیا ہے،

اصل موضوع شروع کرنے کے بعد لفظ نسخ کی لغوی تشریح کی ہے، نسخ کے معنی ازالہ کے ہوتے ہیں کبھی نقل کرنے کے معنی میں ، استعمال ہوتا ہے، ایک جگہ سے دوسرے جگہ منتقل کرنے کو بھی کہتے ہیں، اور اس بارہ میں مختلف علماء کے اقوال نقل کئے ہیں، :-

اعلم ان النسخ فی اللغۃ الازالۃ یقال نسخت الظل ای ازالت الظل والنقل ایضا یقال نسخت الکتاب ای نقلتہ ونسخت النحل ای نقلتہ من موضع	جان لو کہ نسخ کی لغوی معنی ازالہ کے ہیں، کہا جاتا ہے کہ "نسخت الظل" یعنی سایہ ہٹ گیا، اور نقل کے معنی میں بھی مستعمل ہے، جیسے نسخت الکتاب یعنی میں نے کتاب نقل کی، منتقل ہونے

الی آخرو منه المناسخات	کے معنی میں بھی آتا ہے جیسے نسخت
لانتقاله من وارث الی	النخل" یعنی پودے کو ایک جگہ سے
آخر،	دوسری جگہ منتقل کیا، اسی سے مناسخات
(ورق - ۵)	نکلا ہے، یعنی وراثت کو ایک
	وارث سے دوسرے کی طرف
	منتقل کرنا،

یہ بحث بہت لمبی کی ہے، اور اس میں مصنف نے مختلف مثالیں دی ہیں، علما، کے اقوال نقل کئے ہیں، اور فنی و لغوی باتوں کی طرف اشارے کئے ہیں، اور اُس کے حوالے دیئے ہیں، ابن حاجب[۱]، سیدی نحاس[۲] سکین[۳]، ابو مسلم اصفہانی[۴] وغیرہ کی روایتیں بھی بیان کی ہیں، لغوی بحث کے بعد اس پر بحث کی ہے، کہ نسخ کس قسم کے احکام میں ہوا ہے، اس میں بھی قدماء کے اقوال نقل کئے ہیں، بعض لوگوں کے نزدیک محض امر و نہی کے احکام میں ہوا ہے، بعض کے نزدیک امر و نہی کے علاوہ وعدہ وعید اور ایسی

---

[۱] عثمان بن عمر متوفی ۶۴۶ھ مالکی فقیہ تھے، اکابر علما، میں اُن کا شمار ہے،

[۲] احمد بن محمد ابن اسماعیل ابو جعفر النحاس متوفی ۳۳۸ھ ہجری، مفسر اور ادیب بلند پایہ تھے،

[۳] ربیعہ بن عامر مسکین الدارمی،

[۴] محمد بن بحر الاصفہانی ابو مسلم متوفی ۳۲۲ھ بہت بڑے عالم مفسر اور ادیب تھے، جامع التاویل ان کی اہم تصنیف ہے،

خبروں میں ہوا ہے جن کا تعلق امر و نہی سے ہے، لکھتے ہیں:۔

اعلموا انّہ اختلف العلماء	نسخ کن چیزوں میں واقع ہوتا
فیما یقع علیہ النسخ فقال	ہے، علماء میں اس سلسلہ میں اختلاف
مجاهد بن جبیر وسعید	ہے، مجاہد بن جبیرؒ، سعید بن جبیرؒ
بن جبیر وعکرمہ	اور عکرمہ بن حیان کہتے ہیں کہ
بن حیان انّ النّسخ	نسخ صرف امر و نہی میں واقع
لا یقع الا علی الامر	ہوتا ہے ....
والنھی فقط وقال	....
....	....
....	....
....	....
.... قد یقع النّسخ علی الامر	....
والنھی وعلی الاخبار التی	کہتے ہیں کہ نسخ امر و نہی اور ان
یکون بمعنی الامر والنھی	خبروں میں بھی ہوتا ہے، جو امر
واما الخبر الذی لیس	و نہی کے معنی میں بھی استعمال
بمعنی الطلب فلا یدخلہ	ہوں، لیکن جو خبر طلب کے معنی
النّسخ والوعد والوعید	میں نہ ہو اس پر نسخ واقع نہیں
وقال عبد الرحمٰن بن	ہوتا، اور وعد و وعید پر بھی،
زید قد وقع النّسخ علی الامر	عبد الرحمٰن بن زید کہتے ہیں کہ نسخ

والنهی والاخبار ولم یفصل	اور اخبار میں واقع ہوتا ہے،
وقال جماعة یقع النسخ	انھوں نے اس کی تفصیل نہیں بیان
علی الامر والنهی وعلی ما	کی ہے، ایک جماعت یہ بھی کہتی ہے
قیل للاستثناء،	کہ نسخ امر و نہی پر واقع ہوتا ہے
(ورق ۶ ب)	استثنا کے لئے بھی ہوتا ہے،

یہ بحث بھی خاصی طویل ہے، اس میں مثالوں اور اقوال سے نسخ کی قسمیں سمجھائی ہیں، اس کے بعد کتاب اللہ سے نسخ کی چار قسمیں بتائی ہیں،

(۱) الرّفع الی ما هو اغلظ من الاوّل واثقل منه یعنی آسان حکم کو منسوخ کرکے مشکل حکم کا نزول، جیسے ابتداے اسلام میں اختیار تھا کہ چاہے روزہ رکھے، چاہے فدیہ دے، پھر روزہ فرض کرکے اختیار منسوخ کر دیا گیا جو فدیہ سے سخت ہے،

(۲) الرفع من غیر بدل یعنی بغیر کسی بدل کے حکم کا نسخ، جمہور اس کے جواز کے قائل ہیں، اور بعض اسکے منکر ہیں، جو جواز کے قائل ہیں وہ یہ دلیل دیتے ہیں، کہ جب مصلحت کے تقاضے سے آسان حکم منسوخ کرکے اسکے عوض مشکل حکم نازل ہو سکتا ہے، تو بغیر کسی بدل کے بدرجۂ اولیٰ ہو سکتا ہے، جو لوگ اس کے منکر ہیں وہ کلام مجید کی اس آیت کو دلیل میں پیش کرتے ہیں، ما ننسخ من آیة او ننسها نأت بخیر منها،

(۳) الرّفع ما هو اخف منه: یعنی مشکل حکم کو منسوخ کرکے اس کی جگہ آسان حکم کا نزول جیسے آغاز اسلام میں ایک مسلمان کے لئے دس کا فروں کا مقابلہ کرنا فرض تھا، یاایّها النبی حرض المومنین علی القتال ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین، الخ،

پھر مسلمانوں کی کمزوری دیکھ کر اس میں تخفیف کر دی گئی، اور ایک مسلمان کا مقابلہ صرف دو کفار سے فرض رکھا گیا الآن خفف الله عنكم وعلم ان فيكم ضعفا فان يكن منكم مائة صابرة يغلبوا مائتين،

(۴) الرفع الى ما هو مثله یعنی برابر برابر کا حکم جیسے پہلے مسلمان بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے، پھر اس کو منسوخ کرکے کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا،

اس کے بعد یہ بحث ہے کہ کن صورتوں میں نسخ جائز ہے، اسکے متعلق بھی اقوال اور مثالیں پیش کی ہیں، آگے چل کر نسخ کی چار بڑی قسمیں پھر بیان کی ہیں (۱) نسخ الکتاب بالکتاب (۲) نسخ الکتاب بالسنۃ، (۳) نسخ السنۃ بالسنۃ (۴) نسخ السنۃ بالکتاب،

۱۔ نسخ الکتاب بالکتاب یعنی پہلی قسم پر سب متفق ہیں، :-

فجائز اتفاقا للتساويهما فى	یہ چیز متفقہ طور پر جائز ہے، کیونکہ
المعنى لورد العمل بهما كنسخ	معنی کے اعتبار سے دونوں یکساں ہیں
الاعتداد بالحول الذى	جیسے عدت کی سال بھر کی مدت
ثبت بقوله تعالى والذين	جو اللہ تعالیٰ کے اس قول سے ثابت
يتوفون منكم ويذرون	ہے کہ تم میں سے جو لوگ وفات
ازواجا وصية لازواجهم	پا جائیں، اور اپنے پیچھے بیویاں
متاعا الى الحول غير اخراج[۱]	چھوڑیں اُن کو چاہئے کہ اپنی
بالاعتداد باربعة اشهر و	بیویوں کے حق میں یہ وصیت
عشرا الثابت بقوله تعالى	کر جائیں، کہ ایک سال تک

[۱] سورہ بقرہ آیت نمبر ۲۴۰

وَالَّذِیْنَ یُتَوَفَّوْنَ مِنْکُمْ	ان کو نان و نفقہ دیا جائے، اور وہ
وَیَذَرُوْنَ یَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ	گھر سے نہ نکالی جائیں" اللہ تعالیٰ
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا[1] اهفلاء	کے اس قول کا چار ماہ دس دن
الآیة لینسخ الا عند ابالسنة	کی مدت کے تعین سے منسوخ ہوا
بوجوبه اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا	جو اس آیت سے ثابت ہے، تم
(ورق - ۱۱)	میں سے جو لوگ مر جائیں، اُن کے
	پیچھے اگر ان کی بیویاں زندہ ہوں
	تو وہ اپنے آپ کو چار مہینہ دس دن
	روکے رکھیں، اس آیت سے عدت
	کی سال بھر کی مدت منسوخ ہوگئی"

اس کے علاوہ بھی کئی اور مثالیں لکھی ہیں:-

۲۔ دوسری قسم یعنی نسخ الکتاب بالسنۃ میں جمہور کا اتفاق ہے، البتہ امام شافعی کو اختلاف ہے، شوافع کے نزدیک خبر متواتر سے آیاتِ قرآن کی تنسیخ نہیں ہوتی، اس سلسلہ میں مصنف نے دونوں کے دلائل پیش کئے ہیں، اور مسائل پر پوری بحث کی ہے، جو لوگ نسخ الکتاب بالسنۃ کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی گفتگو کرتے تھے، اور جو بھی حکم دیتے تھے، وہ منجانب اللہ ہوتا تھا، اس لئے اگرچہ وہ کلام اللہ میں درج نہیں ہے، لیکن اس کا مرتبہ اس کے برابر ہے، اس لئے سنتِ متواترہ سے آیتوں کا نسخ ہو سکتا ہے، جو لوگ اس کے قائل نہیں ہیں، وہ کہتے ہیں کہ رسولُ اللہ

---

[1] سورۂ بقرۂ آیت نمبر ۲۳۴۔

صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ ہم ہی میں سے ایک انسان تھے، اور وہ جو باتیں کرتے تھے وہ بہر حال ایک انسان کی گفتگو ہوتی تھی، اس لئے اس سے آیات کی نسخ نہیں ہو سکتی، البتہ جو باتیں آپ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہی ہیں، وہ "مباح" مانی جا سکتی ہیں، مصنف خود مذہباً حنفی ہیں، اس لئے قدرتی طور پر اُن کا جھکاؤ اسی طرف ہے، اور انھوں نے حنفی مسلک کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے،

(۳) تیسری قسم یعنی "نسخ السنۃ بالسنۃ" میں جمہور کا اتفاق ہے کہ خبر متواتر خبر متواتر سے اور خبر واحد خبر واحد سے منسوخ ہو سکتی ہے، لیکن خبر متواتر کا خبر واحد سے منسوخ ہونا عقلاً تو جائز تسلیم کیا جاتا ہے، مگر شرعاً اس میں اختلاف ہے،

فاتفق الجمهور على جواز	خبر متواتر کے خبر متواتر
نسخ الخبر المتواتر بالمتواتر	سے منسوخ ہونے کے جواز پر جمہور
وعلى نسخ الآحاد بالآحاد	علماء کا اتفاق ہے، اسی طرح خبر
كما روي انه عليه السلام حرم زيارة	واحد کا خبر واحد سے نسخ ہے، جیسا کہ
القبور ثم نسخ ذالك بقوله	ایک روایت میں ہے کہ نبی صلعم نے
كنت نهيتكم عن زيارة	قبروں کی زیارت حرام فرمائی، پھر
القبور، وعلى نسخ الآحاد	قول آپ کے دوسرے قول میں نے
بالمتواتر لكونه اقوى	تم کو زیارت قبور سے روکا تھا سے منسوخ
من الآحاد واما نسخ المتواتر	ہوگیا، اسی طرح خبر واحد کا خبر متواتر
بالآحاد فاتفقوا على جوازه	سے منسوخ ہونا بھی سب کے نزدیک
عقلاً واختلفوا في وقوعه شرعاً	جائز ہے، اس لئے کہ وہ خبر واحد

ففی وقوعه للاکثرین بخلاف تخصیص العام فانه یجوز بالخبر الواحد کما تقرر فی کتب الاصول"

(ورق ۱۳۱ب)

سے قوی ہو، لیکن خبر متواتر کے خبر واحد سے منسوخ ہونے کا جواز عقلاً سب تسلیم کرتے ہیں، مگر شرعاً اس میں اختلاف ہے، اکثر لوگوں کے نزدیک نسخ نہیں ہو سکتا، البتہ خبرِ واحد سے عام حکم کی تخصیص جائز ہے جیسا کہ اصول کی کتابوں میں مذکور ہے

۴- چوتھی قسم یعنی نسخ السنۃ بالکتاب میں بھی اکثروں کو اتفاق ہے، البتہ کچھ لوگ بعض صورتوں میں اس کا جواز تسلیم کرتے ہیں، بعض صورتوں میں نہیں،

المجوزون استدلوا انه کل واحد من الکتاب والسنة وحی من الله تعالیٰ "وما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی"[1] ....

جو لوگ نسخ السنۃ بالکتاب کے جواز کے قائل ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ کتاب و سنت اللہ تعالیٰ کی جانب سے وحی ہیں، کلام مجید میں ہے کہ آپ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے تھے، بلکہ وہ وحی تھی جو آپ پر بھیجی جاتی تھی"....

والمانعون استدلوا انه لو جاز لزم تنفیر الناس عن النبی وعن طاعته لانه

وہ لوگ جو کتاب کے ناسخ ہونے کے قائل نہیں ہیں، ان کا استدلال یہ ہے کہ اگر اس کے جواز کو تسلیم کر لیا

[1] سورۂ النجم آیت نمبر ۴،

توھنوان اللہ تعالیٰ لمویوف	جائے تو اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ
بمابنیہ الرسولؐ فلا یحصل	لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ اور ان کی
مقصود البعثۃ"	اطاعت سے دور کیا جا رہا ہے، یہ
(ورق ۱۳ ب)	یہ خیال کیا جائے گا کہ نبی صلی اللہ
	علیہ وسلم نے جو کچھ توضیح فرمائی ہے،
	اس کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا،
	اس لئے بعثت کا مقصود حاصل نہ ہوگا

اس سلسلہ میں مصنف نے دو مثالیں بھی پیش کی ہیں، اسکے بعد نسخ کی قسمیں بیان کی ہیں،

اعلموان النسوخ فی کتاب	بیشک نسخ کتاب اللہ میں تین طرح
اللہ علیٰ ثلثۃ اضرب منہ	کا ہے، ایک وہ جس کا حکم اور تحریر
ما نسخ حکمہ وخطہ و	دونوں منسوخ ہو گئے، دوسرا وہ
منہ ما نسخ خطہ وبقی	جس کی تحریر منسوخ ہو گئی، لیکن
حکمہ و منہ ما نسخ حکمہ	حکم باقی ہو، تیسرا وہ جس کا حکم
وبقی خطہ"	منسوخ ہو گیا ہو لیکن تحریر باقی
(ورق ۱۴ ب)	ہو،

ان تینوں قسموں کو الگ الگ تفصیل سے بیان کیا ہے، اور اس کی مثالیں دی
پھر ناسخ و منسوخ آیات میں علماء کا اختلاف بیان کیا ہے کہ بعض لوگ ایک آیت
نسخ قرار دیتے ہیں، اور بعض اُس کو نہیں مانتے، بعض ایک آیت کو
نسخ کہتے ہیں، دوسرے اس کو نہیں تسلیم کرتے، پھر ان سورتوں کے نام لکھے ہیں، جن

میں آیات ناسخہ و منسوخہ ہیں، اُن میں علماء کے اختلافات کا ذکر تو نہیں کیا ہے، لیکن اس کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ کن کن صورتوں میں اختلاف ہے، خود مصنف کے نزدیک ستر آیتیں منسوخ ہوئیں[1]،

ان مباحث کے بعد اپنی تحقیق تحریر کی ہے اور قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے آیات منسوخہ کا تذکرہ کیا ہے، پہلے سورہ کا نام لکھا ہے، پھر اسکے مکی یا مدنی کی تفصیل تحریر کی ہے پھر اسکے حروف وکلمات اور سورہ کی کل آیات کی تعداد لکھی ہے، بعض سورتوں میں یہ التزام نہیں ہے، بلکہ صرف مختصراً ضروری باتیں لکھدی ہیں، پھر اس سورہ کی منسوخ آیات لکھی ہیں اور وجہ نسخ تفصیل سے بیان کی ہے، اگر کسی آیت کے نسخ یا اُس کی تفسیر میں کوئی اختلاف ہے، تو اس کو بھی ظاہر کیا ہے، مصنف کے بیان کے مطابق سورۂ الحمد میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی، سورۃ البقرہ میں تیس آیتیں منسوخ ہوئیں، سورۂ آل عمران میں نو، سورۃ النساء میں چوبیس[2]، اسی طرح تمام سورتوں کے نام اور اُن کی تفصیل لکھی ہے، جس سورہ میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے، اُس کے بھی حروف وکلمات آیات کی تعداد اور مکی و مدنی ہونے کی تفصیل بیان کر دی ہے،

مصنف کے انداز تحریر کو سمجھنے کے لئے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں، سورۂ بقرہ کی آیت فاینما تولوا فثم وجہ اللہ[3] کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

اختلف المفسرون فی ھذہ	مفسرین کا اس آیت میں اختلاف
الاٰیۃ منھم من قال اِنّھا	ہے، بعض کہتے ہیں، کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ

---

[1] ناسخ و منسوخ آیات کی تعداد میں علماء کا بڑا اختلاف ہے منسوخ آیات کی تعداد پانچ سے لے کر پانسو تک بیان کی جاتی ہے [2] سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۱۶، [3] سورہ بقرہ آیت نمبر ۱۴۴،

منسوخة بقوله تعالیٰ "و
حيث ما كنتم فولوا وجوهكم
شطره" ومنهم من قال
ان حكم هذه الآية ليس
منسوخ وانما نزلت في صلوٰة
النفل والسفر ـ الاصح انه
ليس في هذه الآية منسوخ
لان التولي الى اي جهة
كانت اذا السماء متغيمة
وجهة المصلي جائز سواءً
اصاب المصلي او اخطأ ثم
اختلف المفسرون في تحويل
القبلة من الصخرة الى الكعبة
في اي شهر كان وفي اي
صلوٰة كان، قال بعضهم
في صلوٰة الظهر يوم الاثنين
النصف من رجب سبعة عشر
شهراً من الهجرة. هذه

کے قول "وحيث ما كنتم فولوا
وجوهكم شطره" سے منسوخ
ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ اس آیت
کا حکم منسوخ نہیں ہے، اور یہ آیہ
نماز نفل اور نماز سفر کے سلسلہ
میں نازل ہوئی ہے، زیادہ صحیح یہ
کہ اس آیت میں کوئی چیز بھی منسوخ
نہیں ہے، اس لئے کہ کسی سمت بھی
رُخ کرنے کا حکم اس وقت کیلئے ہے
جب آسمان ابر آلود ہو، نماز پڑھنے
والے کا رُخ ٹھیک طرف ہو یا نہ ہو
دونوں حالتوں میں درست ہے،
صخرہ[1] سے کعبہ کی طرف تحویل
قبلہ میں مفسرین کا اختلاف ہے کہ
کس ماہ میں اور کس نماز میں تھا،
بعض کا قول ہے، کہ ظہر کے وقت
دوشنبہ کے دن ....
....

---

[1] مراد بیت المقدس ہے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو معجم البلدان ج ۵ ص ۱۶۶

روایة معقل بن یسار و	نصف رجب ہجرت کے سترہویں
البراء بن عازبؓ و روی	سال میں تحویل قبلہ کا حکم ہوا، یہ
سعد بن ابی عروبة عن	معقل بن یسارؓ اور براء بن عازبؓ
قتادةؒ انه قال حولت	کی روایت ہے، اور سعد بن ابی
القبلة من الصخرة الی	عروبہ قتادہ سے روایت کرتے
الکعبة یوم الثلثاء لنصف	ہیں کہ صخرہ سے کعبہ کی طرف تحویل
من شعبان لثمانیة عشر	قبلہ ہجرت کے اٹھارہویں مہینے
شهراً من الهجرة	بدھ کے دن نصف شعبان میں ہوا

(ورق ۲۴ ب)

سورۂ مومنون کے متعلق لکھتے ہیں:-

سورة المومنون مکیة	سورۃ المومنون حتی اذا اخذنا
استثنی منها حتی اذا اخذنا	مترفیہم تا اذا ہم فیہ
مترفیهم الی قوله اذا	مبلسون کے سوا مکی ہے، اس
هم فیه مبلسون آیاتها	کی آیات کی تعداد ۱۷۰ ہے، بعض
مایة وسبعون[۱] وقیل مایة	۱۱۸ اور بعض ۱۱۹ بھی کہتے ہیں،
وثمان عشرة وقیل تسع	کلمات کی تعداد ۱۸۴۰ اور حروف
عشرة وکلماتها الف و	کی تعداد ۴۸۰۲ ہے، اس میں اور

۱ غالباً کاتب سے سہو ہوگیا ہے، یہاں بھی عشرة ہونا چاہئے تھا، اس لئے کہ ۱۷۰ کی تعداد کسی طرح بھی ممکن نہیں معلوم ہوتی،

ثمان و اربعون و فيها آیتیں منسوخ ہیں،
اربعة آلاف و ثمانمائة
و اثنان و فيها من المنسوخ
آيتان ...."

(ورق ۵۰ ب)

اسی انداز پر مصنف نے تمام منسوخ آیتوں کے متعلق لکھا ہے، اس رسالہ کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے :-

"المفتقر الى رحمة الله البارى هو عماد الدين
محمد عارف عرف عبد النبى العثمانى الشطارى
نحو الله الانا ومن الصحائف الاعمال طول الامانى
والامان و بدل سيئاته بالحسنات و اخطاط ......
...کرم خوردہ ..... آمین یا رب العالمین"

یہ کتاب اپنے فن میں ایک مکمل اور مرتب تصنیف ہے، مصنف نے بڑی کاوش سے کتاب لکھی ہے، یوں تو علم ناسخ و منسوخ پر بہت سی کتابیں ہیں، اس کتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک ہندوستانی کی تصنیف ہے، اور اپنے موضوع پر جامع ہے، یہ نسخہ بہت ہی نادر ہے، اس کے کسی دوسرے نسخہ کا پتہ اب تک نہیں چل سکا ہے، غالباً کہیں نہیں پایا جاتا، زبید احمد صاحب نے اس کا نام دستور المصنفین صحیح نہیں لکھا ہے، اور اس کو لا پتہ قرار دیا ہے، کتابچے خاتمہ پر ایک طرف ایک مہر ہے جو پڑھی نہیں جا سکی، اس سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نسخہ مصنف کے مسودہ سے ۱۲۰ھ میں نقل کیا گیا ہو، دوسری طرف غالباً کاتب کی تحریر ہے،

پورنیہ (بہار) کے دو مربیان علم

نواب صولت جنگ و شوکت جنگ

از

جناب اکمل صاحب یزدانی جامعی ایم۔ اے،

بہار بنگالہ میں مسلمانوں کی حکومت کا قیام اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی (سنہ ۵۹۰ھ تا سنہ ۶۰۲ھ) کے ذریعہ عمل میں آیا، غالباً یہ پہلا شخص تھا، جس نے کوچ بہار ہوتے ہوئے تبت پر فوجکشی کی، اس نے ندیا کو تباہ کیا، اور لکھنوتی (گوڑ) کو اپنا دار السلطنت بنایا، بختیار خلجی کی ۱۲ سالہ اور اس کے بعد ملک عز الدین خلجی کی ۸ ماہ کی حکومت کے بعد علی مردان خلجی بنگالہ پر قابض ہوا، علی مردان خلجی (سنہ ۶۰۲ھ/۱۲۰۶ء تا سنہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء) کے مارے جانے پر حاکم لکھنوتی حسام الدین عوض حسین، ملقب بہ سلطان غیاث الدین عوض حسین خلجی (سنہ ۶۰۷ھ/۱۲۱۰ء تا سنہ ۶۲۴ھ/۱۲۲۶ء) نے اپنا لقب سلطان غیاث الدین رکھا، اور خطبہ و سکہ جاری کرکے اڑیسہ اور ترہٹ پر چڑھائی کی،[1] اسی کے عہد میں مسلمانوں کے حدود حکومت میں قدرے وسعت ہوئی، اور غالباً اسی زمانہ میں پورنیہ کا خطہ بھی مسلمانوں کے زیر نگیں آیا، لیکن اس کے اتری حصے مسلمانوں کے تسلط سے باہر رہے، اور ان پر مورنگ کے راجاؤں کا قبضہ رہا، خلجیہ حکومت کے قیام کے

---

[1] طبقات ناصری ص ۱۶۳،

کافی عرصہ کے بعد مسلمانوں کی باقاعدہ حکومت قائم ہوئی، اور قلعۂ جلال گڑھ آخری سرحد قرار پایا[۱]، اسی طرح اس ضلع کا پچھمی حصہ یعنی علاقۂ بیرنگر سیف خاں فوجدار پورنیہ پسر میرزا جان عمدۃ الملک عالمگیری کے عہد (۱۷۳۲ء) میں سلطنت مغلیہ میں ملا لیا گیا[۲]،

پورنیہ بنگالہ کا سرحدی خطہ تھا، اس کا انتظام فوجداروں کے ذریعہ ہوتا تھا، جو بڑی حد تک خودسر ہوتے تھے، سترھویں صدی عیسوی کے قبل کے فوجداروں کا پتہ نہیں چلتا، راجگان کھگڑہ (کشن گنج پورنیہ بہار) کے خاندانی حالات سے اتنا اور پتہ چلتا ہے کہ شیر شاہ اور ہمایوں کے درمیان بنگالے میں جو جنگ ہوئی تھی، اس میں راجگان کھگڑہ کے مورث اعلیٰ سید خاں دستور نے ہمایوں کی فوجی مدد کی تھی، اسی کے صلے میں اس نے (۹۶۲ھ/۱۵۵۵ء) میں بطور انعام سید خاں دستور کو پرگنہ سرجا پور کی زمینداری اور قانون گوئی کا خطاب عطا کیا تھا[۳]،

عہد مغلیہ میں ضلع پورنیہ ایک بڑی عسکری سرحدی سرکار (Great milit-ary Frontier Province) رہا، اس کے انتظام اور انصرام کے لئے ایک فوجدار کا تقرر ہوتا تھا جو صوبہ دار بنگالہ کا برائے نام ماتحت ہوتا تھا، اس کی آمدنی کا کوئی حساب کتاب ان کو نہ دینا پڑتا تھا، اور پورنیہ کا بیشتر حصہ ان کی جاگیر میں دیدیا جاتا تھا کہ اس کی آمدنی سے وہ اپنی نجی اور فوجی مصارف کی کفالت کرسکیں[۴]،

سترھویں صدی عیسوی کے اخیر میں، استوال خاں پورنیہ کا فوجدار مقرر ہوا، اس کی

۱؎ ریاض السلاطین ص ۲۴۴ و رپورٹ فرانسس بکانن (پورنیہ) ص ۴۳ ۵ ۲؎ ریاض السلاطین ص ۲۴۴، ۳؎ منتخب السیر (تاریخ راجگان کھگڑہ مؤلفہ خواجہ فدا علی) و بنگال گزیٹیر پورنیہ اولی صاحب ص ۳ ۴؎ بنگال ڈسٹرکٹ گزیٹیر (پورنیہ) او مالی صاحب ص ۳۵،

نواب کا خطاب بھی دیا گیا، اور سرحدی فوج کا سپہ سالار اور اس ضلع کے خزانے کا عامل بنا کر بھیجا گیا، پھر عبداللہ خان اسفندیار خان (سنہ ۱۶۹۰ء) بہمن یار خان (سنہ ۱۶۹۹ء تا سنہ ۱۷۲۲ء) سیف خان پسر امیر خان، عمدۃ الملک عالمگیری، (سنہ ۱۷۲۲ء تا سنہ ۱۷۵۰ء) صولت جنگ (برادرزادہ و داماد علی وردی خان مہابت جنگ،) شوکت جنگ وغیرہ تقریباً اٹھارہ فوجداروں نے سنہ ۱۷۷۰ء تک اس ضلع پر حکومت کی، پورنیہ کا آخری فوجدار محمد علی تھا، جس کے ہاتھوں سے مسٹر ڈ دکیرل نے پورنیہ کی حکومت کی باگ ڈور لی،[1]

ان فوجداروں نے علمی و ادبی خدمات بھی انجام دیں، اس سلسلے میں بعض فوجداروں کی خدمات بہت گراں قدر ہیں، صولت جنگ فوجدار پورنیہ اور اُن کے خلف شوکت جنگ فوجدار پورنیہ علم و ادب کے بڑے قدرداں اور سرپرست تھے، صاحب شعر الہند نے ان کا ذکر مر بیانِ سخن کے ذیل میں کیا ہے،[2]

زیر نظر مقالہ میں ان دونوں فوجداروں کے حالات اور ان کی علمی و ادبی خدمات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے،

میرزا محمد بکاول اعظم شاہ خلف اورنگ زیب عالمگیر کے دو لڑکے تھے، ایک کا نام حاجی احمد اور دوسرے کا میرزا بندی یا محمد علی تھا، جو بعد میں علی وردی خاں مشہور ہوا۔ حاجی احمد بڑا تھا، اور مرزا بندی چھوٹا، جب مرزا محمد مر گیا، تو حاجی احمد محمد اعظم شاہ پسر اورنگ زیب کے دربار میں بکاولی اور جواہر خانہ کی داروغگی کے منصب پر سرفراز ہوا، اعظم شاہ کے قتل کے بعد

---

[1] رپورٹ نرائنس بکانن (۱۰-۱۸۰۰ء) بابت پورنیہ مرتبہ جیکسن ایم اے آئی - سی ایس ص ۵۵ [2] شعر الہند حصہ دوم، ص ۱۵۰ مولفہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

جب دلی میں افراتفری مچی تو دونوں بھائی دلی سے دکن کی طرف روانہ ہوئے، اور وہاں سے اڑیسہ آگئے اور شجاع الدولہ (شجاع الدین محمد خاں) نائب ناظم اڑیسہ کی رفاقت میں رہنے لگے، جب شجاع الدولہ کو بنگالہ کی نظامت ملی تو اس نے حاجی احمد کو مشیر تدبیر اور ندیم خاص بنالیا، اور میرزا بندی کو علی وردی خان کا خطاب دے کر چکلہ اکبر نگر کی فوجداری عطا کی،[1]

حاجی احمد کے چار لڑکیاں اور تین لڑکے تھے، ایک میرزا محمد (محمد رضا) المخاطب بہ نوازش خان بہادر شہامت جنگ، دوسرا میرزا محمد سعید المخاطب بہ نواب سعید احمد خاں بہادر صولت جنگ، تیسرا محمد ہاشم الملقب بہ زین احمد خان ہیبت جنگ،[2] میرزا محمد یا محمد رضا بڑا، میرزا محمد سعید منجھلا، اور میرزا محمد ہاشم چھوٹا لڑکا تھا،

فوجداری رنگپور وغیرہ ۱۱۴۳ھ تا ۱۱۵۲ھ

شجاع الدولہ نے محمد رضا یا میرزا محمد کو بجو ترا مرشد آباد کی داروغگی عطا کی تھی، میرزا محمد سعید (صولت جنگ) کو رنگپور کی فوجداری کے منصب پر سرفراز کیا تھا، اور میرزا محمد ہاشم کو ہاشم علی خاں کے خطاب سے نوازا،

ریاض السلاطین سے ظاہر ہوتا ہے کہ علاؤ الدولہ سرفراز خان پسر شجاع الدین محمد خاں کی نیابت میں صولت جنگ کو رنگپور کے علاوہ چکلہ گھوڑا گھاٹ اور کوچ بہار کی فوجداری بھی ملی تھی، اس نے اپنے دور میں راجا کوچ بہار، اور راجہ دیناج پور پر فوج کشی کر کے اُن کے علاقے فتح کر لئے، اس فتح میں بڑی دولت ہاتھ آئی، کوچ بہار کی فتح پر حاجی احمد اور علاء الدولہ سرفراز خاں کی سفارش سے خان بہادر

---

[1] ریاض السلاطین ص ۲۹۲-۲۹۳۔ [2] مظفر نامہ قلمی مؤلفہ کرم علی خان ص ۲۔

خطاب ملا،[1]

صولت جنگ کے باپ حاجی احمد نے جو علاء الدولہ سرفراز خاں کے مشیرین خاص میں تھا، جب سرفراز خاں کے خلاف خفیہ کارروائیاں شروع کیں تو اس میں صولت جنگ کا بھی ہاتھ تھا،[2]

جب مہابت جنگ (علی وردی خاں) نے ۱۱۵۳ھ مطابق ۱۷۴۰ء میں سرفراز خاں پر فتح حاصل کی تو سعید احمد خان صولت جنگ کو جو سرفراز خاں کے ماتحت رنگ پور وغیرہ کا فوجدار تھا، اس کے عہدے پر قائم رکھا، اور صمام الدولہ صولت جنگ کا خطاب[3] دیا،

نظامت اڑیسہ علی وردی خان مہابت جنگ نے جب مرشد قلی رستم جنگ (داماد شجاع الدین محمد خان ناظم بنگالہ بہار و اڑیسہ) پر فوج کشی کی تھی، تو صولت جنگ کو بھی ساتھ لیا تھا، فتح کے بعد ایک ماہ تک اڑیسہ میں رہ کر وہاں کا نظم و نسق درست کر کے صولت جنگ کو اڑیسہ کا صوبہ دار بنایا، اور صمام الدولہ نصیر الملک سعید احمد خان، خان بہادر صولت جنگ کا خطاب[4] دیا،

اڑیسہ کی حکومت میں وہ کامیاب نہ ہو سکا، تھوڑے ہی عرصہ میں رعایا کو اپنا دشمن بنالیا، اور اس کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا، علی وردی خان نے اُسے چھڑا کر پناہ دی،

---

[1] ریاض السلاطین ص ۳۰۴-۵ [2] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۱۱۵ [3] مظفر نامہ قلمی ص ۱۵ و سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۱۲۱،

[4] ریاض السلاطین ص ۳۳۳، و سیر المتاخرین ج ۲ ص ۱۲۵،

فوجداری ہوگلی کٹک کی ناکامی کے بعد صولت جنگ بہت پریشان حال تھا، اسلئے علی وردی خاں مہابت جنگ نے اُسے ہگلی کا فوجدار بنا دیا[1]، رگھوجی اور بالاجی راؤ مرہٹہ کی پیشقدمی کے موقع پر صولت جنگ مہابت جنگ کا شریک رہا،

جنگ محب علی پور اور صولت جنگ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۵ء) میں مصطفیٰ خاں مارا گیا، اور اس کا لڑکا مرتضیٰ خاں سہسرام بھاگ گیا، اور رگھوجی بھونسلا نے اُس کی مدد کی، تو مہابت جنگ نے سراج الدولہ (نواسہ) کے علاوہ میر جعفر خاں میرزہ شمشیر خاں وسردار خاں وسعید احمد خاں صولت جنگ کو مرشدآباد سے طلب کیا، محب علی پور (عظیم آباد) کی جنگ میں بھی صولت جنگ شریک رہا[2]،

پٹھانوں کی شورش شمشیر خاں اور سردار خاں کی شورش کو ختم کرنے کے سلسلہ میں بھی صولت جنگ نے مہابت جنگ کا ساتھ دیا تھا[3]،

صوبہ داری عظیم آباد ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں جب نواب ہیبت جنگ کو پٹھانوں نے قتل کردیا، تو علی وردی خاں مہابت جنگ نے پٹھانوں کو شکست دی، امن وامان بحال ہونے کے بعد مہابت جنگ سیروشکار کی غرض سے حاجی پور گیا، اور سعید احمد خان صولت جنگ کو نائب مقرر کر گیا، سراج الدولہ (نواسہ) کو یہ بات نہایت ناگوار گذری، اس لئے علی وردی خاں اپنے چہیتے نواسے کی خواہش کو پوری کرنے پر مجبور ہوگیا، اور صولت جنگ کو جو شدت غم میں شاہ جہان آباد چلے جانے پر آمادہ ہوگیا تھا، سمجھا بجھا کر مرشدآباد دے گیا،

---

[1] احوال مہابت جنگ یوسف علی خان مخطوطہ ص ۹۵ وسیرالمتاخرین (اردو ترجمہ) جلد دوم ص

[2] سیرالمتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۱۸۱-۸۲،

[3] مظفرنامہ قلمی ص ۳۵،

اور سراج الدولہ کو عظیم آباد کا صوبہ دار نامزد کیا، اور لالہ جانکی رام کو اس کا نائب بنایا،[1]

فوجداری پورنیہ | مرشد آباد واپس لوٹنے کے بعد علی وردی خاں مہابت جنگ نے نواب سیف خاں فوجدار پورنیہ کے مرنے پر صولت جنگ کو پورنیہ کا فوجدار مقرر کیا،[2] یہ اسی سال ۱۱۶۱ھ میں ہوا،

سرپرست علم و ادب | صولت جنگ علم و ادب کا دلدادہ و سرپرست تھا، علما و فضلا و شعرا و ادبا کی مجلسوں میں بیٹھتا تھا، اکثر کہا کرتا تھا کہ ان صحبتوں کا اس قدر پابند ہو گیا ہوں کہ اگر کسی دن میسر نہیں ہوتیں، تو ایسا لگتا ہے، کہ کوئی بڑی دولت چھن گئی ہے، اور طبیعت افسردہ رہتی ہے،[3]

علما و فضلا، و ادبا و شعرا کی مجلس | اسی علم دوستی کی بنا پر جب وہ عظیم آباد سے مرشد آباد گیا، اور وہاں سے پورنیہ کی فوجداری پر مامور ہو کر پورنیہ آیا، تو اپنے ساتھ اپنے اعزہ و اقربا کے علاوہ فضلائے عظیم آباد میں سے ملا غلام یحییٰ، میر وحید، مفتی ضیاء اللہ، مولوی لعل محمد اور میر عبد الہادی روشن وغیرہ کو ساتھ لایا، ان علما کی آمد سے پورنیہ علم و ادب کا مرکز بن گیا، اس کا سلسلہ صولت جنگ کی حیات تک جاری رہا، پھر ۱۱۶۹ھ میں پورنیہ ہی میں اس نے وفات پائی،[4]

صولت جنگ بڑا پابند اوقات تھا، اپنے فرائض منصبی کے علاوہ پابندی سے علما و فضلا کی مجلس میں بیٹھتا، اور علمی و ادبی بحث و مباحثہ میں حصہ لیتا، غلام حسین طباطبائی صاحب سیر المتاخرین لکھتے ہیں، -

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۲۰۹، [2] ایضاً ص ۲۱۳، [3] ایضاً ص ۲۴۵
[4] " " " " ص ۲۵۲

"ظہر کی نماز ادا کر کے ایک جزء قرآن کی تلاوت کرتا، بعد عصر نماز کے باہر
آتا، اس مجلس میں علماء و فضلاء مانند۔ ملا غلام یحییٰ، مفتی ضیاء اللہ، میر وحید
و دولتی لال محمد، شیخ ہدایت اللہ، سید عبد الہادی روشن حاضر ہوتے،
دیگر علوم نجوم حکمت تذکرۂ علمی ہوتا، اور ایک مخصوص کتاب بطور درس
لے پڑھی جاتی، ملا غلام یحییٰ اس کے مشکلات حل کرتے، اور لوگ بھی گفتگو
س معتمدہ میں کرتے تھے، مقرر فرماتا تھا کہ اس قدر اس کا پابند ہوا ہوں
کہ اگر کسی دن میسر نہ آئے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے، شاید کوئی بڑی دولت
چھن گئی ہے، خاطر مشوش رہتی ہے[1]"

ین طباطبائی کا نیہ میں قیام	غلام حسین خاں طباطبائی صاحب سیر المتاخرین بھی صولت جنگ کے دامن دولت سے وابستہ تھے، اور شوکت جنگ

تک (تقریباً ۶ سال تک) پورنیہ میں رہے، صولت جنگ کے مقربین خاص
، اس نے ان کو پرگنہ سری پور کی زمینداری عطا کی تھی[2]، نواب صولت جنگ
ت کے بعد بھی غلام حسین شوکت جنگ خلف صولت جنگ کے دربار سے
رہے،

سراج الدولہ اور شوکت جنگ کے درمیان بلدیہ باڑی (منہاری) میں جو
ہوئی، اس میں بھی غلام حسین شریک تھے، اور شوکت جنگ کی شکست اور
کے بعد بھی کچھ عرصہ پورنیہ میں رہے، جب دار و گیر شروع ہوئی تو بذریعہ کشتی

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲، ص ۲۲۵،
[2] " " " " " ص ۲۲۳،

عظیم آباد چلے گئے۔[1]

کرم علی خاں مؤلف مظفر نامہ اور پورنیہ

کرم علی خاں مؤلف مظفر نامہ بھی جو علی وردی خاں مہابت جنگ کے وابستگان دولت میں تھا، صولت جنگ و شوکت جنگ کی قدر افزائی سے محروم نہ رہا، اُس کو بھی یہ دونوں برابر نوازتے رہے، صولت جنگ نے اس کو گھوڑا گھاٹ کا فوجدار بھی مقرر کیا تھا، اسی تعلق کی بنا پر اُس کو شوکت جنگ کے قتل کے بعد اُنیس دن تک پورنیہ میں قید رہنا پڑا، اور گھوڑا گھاٹ کی فوجداری سے دست بردار ہونا پڑا۔[2]

میر عبد الہادی روشن

میر عبد الہادی صاحب دیوان تھے، پورنیہ میں صولت جنگ کے دربار سے وابستہ تھے، اور پورنیہ ہی میں صولت جنگ کی موت کے صدمے سے اسی دن ان کی موت واقع ہوئی،

صاحب سیر المتاخرین رقم طراز ہیں:

"میر عبد الہادی روشن تخلص جو صاحب دیوان تھے، اور نظم و نثر میں مہارت تام اور علم عربی کو خوب جانتا تھا، بمجرد ملاحظہ اس کے حال کے غشی طاری ہوئی، خواجہ سراؤں نے ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا، اور مردم بالا کو بلا کر اُن کے گھر واپس کر دیا، پھر چند پہر اسی غشی میں گذرے، تین پہر یا چار پہر رات گذری ہوگی کہ وہ صاحب کمال بھی جان نثار ہوا، اللّٰھُمَّ اغفر لہٗ وارحمہٗ۔[3]

---

[1] سیر المتاخرین اردو ج ۲ ص ۲۸۶-۲۸۵، [2] قلمی تاریخ مظفر نامہ ورق ۵۵،

[3] ،، ،، ،، ص ۲۵۳،

"سید مذکور کا مولد جہانگیر نگالہ تھا، شاہ جہان آباد میں نشو و پائی، اور وہیں علوم متداولہ کی تحصیل کی، رغبت نظم و نثر کی ہوئی، مورخ والد نے دو چھوٹے بھائیوں سید علی خاں اور غالب علی خاں کو تعلیم کے لئے شاہ جہان آباد سے عظیم آباد روانہ کیا جب ہیبت جنگ نے سید علی خاں کو اپنی مصاہرت سے سرفراز کیا، سید مذکور کو اپنا ملازم بنایا، اور بعد کشتہ ہونے ہیبت جنگ کے صولت جنگ نے اپنی رفاقت میں بلایا، اور جملہ فضلائے عظیم آباد میں جن کا ذکر بالا ہو چکا اُسے بھی قبول کیا، ہمیشہ خلوت نشیں اور تمام طبیعتوں کی آمیزش سے دور رہتا ہو اکثر لوگوں سے کم آمیزش رکھتا، اور فکر شعر و سخن میں بسر کرتا، عظیم آباد اور پورنیہ میں جب تک زندہ رہا، فقیر حقیر سے ہمکلام رہا کہ ہماری تمھاری شکل اس مثل سے موافق ہے، اگر تو نہ رہے، تو میرے شعر میں معنی نہ رہیں گے"[1]

میر باقر حزیں بعض تذکروں سے پتہ چلتا ہے، کہ میر باقر حزیں شاگرد میرزا مظہر جان جاناں کو بھی نواب صولت جنگ کی رفاقت حاصل رہی ہے،

صاحب شعر الہند لکھتے ہیں ؛۔

"میر باقر حزیں نے نواب سید احمد خاں صولت جنگ کی رفاقت میں نہایت عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کی ہے"

(شعر الہند ص ۱۵۴)

مؤلف گلشن ہند رقم طراز ہیں ؛۔

---

[1] سیر المتاخرین اردو ترجمہ ج ۲ ص ۳۵۲،

"رفیق تھے نواب بافرہنگ سید احمد خاں صولت جنگ کے۔
زندگی بسر کی ہے انھوں نے ساتھ رعایت تام و ننگ کے"

(گلشن ہند ص ۸۲)

بعض تذکروں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے، کہ میر باقر حزین صولت جنگ کی رفاقت میں پورنیہ میں بھی رہے تھے،

صولت جنگ سنہ ۱۱۶۱ھ تا سنہ ۱۱۶۹ھ پورنیہ کا فوجدار رہا، نکات الشعراء میں جس کا سنہ تالیف سنہ ۱۱۶۵ھ ہے، حزین کے متعلق "بہ بنگالہ رفت" درج ہے،

(نکات الشعراء ص ۱۰۷)

"تذکرہ میر حسن میں بھی حزین کے بارہ میں "از مدتے بہ بنگالہ رفت" ہی درج ہے،

نواب شوکت جنگ ۔ نواب صولت جنگ کی موت کے بعد اس کا لڑکا شوکت جنگ جانشین ہوا[1]، اس کے نانا علی وردی خاں مہابت جنگ فرمانروائے بنگالہ بہار واڑیسہ نے سارا پورنیہ اس کو جاگیر میں دے دیا تھا، ۹ رجب سنہ ۱۱۶۹ھ[2] کو مہابت جنگ بھی مرض استسقاء میں مبتلا ہو کر چل بسا، تو سراج الدولہ اس کا جانشین ہوا، سراج الدولہ اور شوکت جنگ دونوں خالہ زاد بھائی تھے، سراج الدولہ کو شوکت جنگ سے خطرہ تھا اسلئے بالڑی (اضلاع پورنیہ) میں دونوں کی جنگ ہوئی، شوکت جنگ ۱۶ اکتوبر سنہ ۱۷۵۶ء کو مارا گیا، اور پورنیہ ہی میں دفن ہوا[3]، باپ کی طرح یہ بھی علماء و فضلاء کا قدر داں تھا، چنانچہ صاحب سیر المتاخرین غلام حسین، اس کی رفاقت میں بجا رہے، اور بلدیہ بالڑی کی جنگ میں شرکت کی[4]، جب

---

[1] سیر المتاخرین اردو (ترجمہ) ج ۲، ص ۲۰۵، [2] سیر المتاخرین اردو ج ۲ ص ۲۵۵،
[3] تاریخ مظفر نامہ قلمی ورق (۵۵) [4] سیر المتاخرین ج ۲ ص ۲۸۱ - ۲۰۴)

شوکت جنگ مارا گیا، تو اس وقت غلام حسین اس کے ساتھ تھے، شوکت جنگ کے قتل کے بعد بھی کچھ عرصہ تک پورنیہ میں رہے، [۱]

ہیبت قلی خاں حسرت ہیبت قلی خاں حسرت عظیم آبادی، شاگرد میرزا مظہر جان جاناں بھی نواب شوکت جنگ کے رفیق تھے، صاحب شعرالہند نے شوکت جنگ کا ذکر بھی زمرۂ شعرایانِ سخن کے ضمن میں کیا ہے، گلشن ہند میں ان کے متعلق ہے،

> حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے، چند روز انھوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی خلف نواب صولت جنگ "ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے،
>
> (گلشن ہند ص ۸۵، ۸۶)

۱؎ سیرالمتاخرین اردو ترجمہ ج ۲، ص ۲۸۵،

دین رحمت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح جو دین لائے تھے وہ بھی ساری کائنات کے لئے سراسر عدل و رحمت تھا، اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ دین اسلام بلا تفریق مذہب و ملت، دوست و دشمن، سارے انسانی طبقوں بلکہ حیوانات تک کے لئے رحمت ہے، اس کے سایہ کے نیچے پوری کائنات کو سکون مل سکتا ہے، مولفہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

قیمت :- ۲ ؎

"دو منیجر"

ایک تعارف

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

"سید صدیق حسن صاحب مرحوم نے تاریخ اسلام کے چند سبق آموز اور ولولہ انگیز واقعات کو نظم کیا تھا، ان کو وہ کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتے تھے، اور اُن کا تعارف مجھ سے لکھوایا تھا، مگر اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی تھی کہ اُن کا انتقال ہو گیا، اور اُن کی یہ نظمیں اور تعارف میرے پاس پڑا رہ گیا، اب سنا ہے کہ یہ نظمیں شائع ہو گئی ہیں، مگر اس میں تعارف نہیں ہے معلوم ہوتا ہے، اُن کے بعد کہیں ضائع ہو گیا، اتفاق سے پرانے کاغذات میں اس پر نظر پڑ گئی، اس لئے مرحوم کی یادگار کے طور پر اس کو شائع کیا جاتا ہے،"

قوموں اور ملتوں کے بلند اور شریفانہ جذبات مثلاً شجاعت و شہامت، ہمت و حوصلہ مندی، غیرت و حمیت اور حریت و آزادی کو ابھارنے اور اُن میں قومی عزو شرف کا احساس اور ملی سربلندی کا جوش و ولولہ پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ان کو ان کا باعظمت ماضی، اُس کی شاندار تاریخ اور اُس کے اسلاف کے قابلِ فخر کارنامے یاد دلائے جائیں، اور اس کا سب سے موثر ذریعہ نظم ہے، نظم بلکہ کبھی کبھی ایک شعر وہ کام کر جاتا ہے جو

…بڑی تقریروں اور تحریروں سے انجام نہیں پا سکتا، اس لئے دنیا کی تمام قوموں نے قومی جوش
…لہ پیدا کرنے کے لئے نظم کو وسیلہ بنایا ہے، عرب جاہلی کے شعرا اپنی آتش نوائی سے قبائل
…آگ لگا دیتے تھے، اور اپنی سحر بیانی سے اُن کی قسمتیں اور جنگ کا نقشہ پلٹ دیتے تھے،
…ں کے موقع پر جو فخریہ اشعار پڑھے جاتے تھے، اُن کی ایک مستقل صنف ہی بن گئی تھی، جو
…کہلاتی تھی، بلکہ اونٹوں کی رفتار کو تیز کرنے کے لئے بھی شعر ہی سے کام لیتے تھے، جو حُدی
…لاتی تھی، عرفی کا مشہور شعر ہے،

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کمیابی — حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

حضرت امیر معاویہ کا بیان ہے، کہ جنگ صفین کے موقع پر لیلۃ الحریر کے سخت معرکے
…امرء عمرو بن الاطنابہ کے اشعار نے مجھ کو ثابت قدم رکھا، عربوں نے ایرانیوں کے فخر و غرور
…خاک میں ملا دیا تھا، مگر شاہنامہ نے اس کو دوبارہ زندہ کر دیا، فردوسی کہتا ہے،

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم ازیں پارسی

تاریخ میں ایسے سیکڑوں واقعات ہیں، کہ شاعری نے قوموں کی گرتی ہوئی عمارت
سنبھال لی، اور فتح کو شکست اور شکست کو فتح سے بدل دیا، اور مسلمانوں کی تاریخ تو ایسے
…رناموں سے معمور ہے جن کے ذریعہ آج بھی اُن میں قومی و ملی حرارت اور اپنی کھوئی ہوئی
ملت کے دوبارہ حصول کا جوش و جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے، اردو میں سب سے پہلے مولانا حالی
…مشہور مسدس کے ذریعہ مسلمانوں میں اُن کی زبوں حالی کا احساس پیدا کرکے اُن کو بیدار
…نے کی کوشش کی، مولانا شبلی نے اُن کی عبرت و بصیرت کے لئے تاریخ اسلام کے بہت سے
…ثر اور سبق آموز واقعات نظم کئے، اور اقبال نے تو اپنی شاعری کو کارزارِ حیات کی تلوار
…میدانِ جنگ کی تکبیر بنا دیا، اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی

ملی بیداری میں سب سے زیادہ حصہ اقبال کی شاعری کا ہے،

مسلمانوں کے عہد زریں کے کارناموں میں ایک قابلِ فخر کارنامہ اندلس کی فتح بھی ہے، اس کو انھوں نے نہ صرف حیرت انگیز طریقے سے فتح کیا، بلکہ یہاں ایسی شاندار حکومت قائم کر دی، جو اپنے دور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور سب سے زیادہ متمدن حکومت تھی، اور صدیوں تک علم و تہذیب کا مرکز رہی، اسی کے ذریعہ علم و تہذیب کی روشنی یورپ میں پھیلی لیکن مسلمانوں کی تاریخ کا یہ بڑا افسوسناک واقعہ ہے کہ جس عظمت و شان کی یہ حکومت تھی ویسے ہی اس کو زوال بھی آیا، اور آج اسپین میں جس کا چپہ چپہ اسلامی تہذیب کا مدفن ہے، اسلام کا ایک نام لیوا بھی باقی نہیں ہے، اس لئے اندلس کی فتح اور اسلامی اندلس کے عروج و زوال میں مسلمانوں کے لئے بڑا سامانِ عبرت ہے، جس سے آج بھی وہ سبق حاصل کر سکتے ہیں،

سید صدیق حسن صاحب، آئی سی ایس، ممبر بورڈ آف ریونیو، محض ایک بڑے عہدہ دار ہی نہیں بلکہ "مردِ مومن" بھی ہیں، ان میں دینی احساس بھی ہے، قومی غیرت و حمیت بھی ہے، اپنی تاریخ و تہذیب و روایات سے وابستگی بھی ہے، اور وہ اردو شعر و ادب کا بھی ستھرا مذاق رکھتے ہیں، خود بھی خوشگو شاعر ہیں، مگر ان کی شاعری محض تغزل کے چنگ و رباب تک محدود نہیں، بلکہ اس سے انھوں نے شمشیر و سنان اور کاروان ملت کی حدی خوانی کا بھی کام لیا ہے، چنانچہ اسلامی اندلس کی تاریخ کے تین اہم واقعات پر نہایت موثر نظمیں لکھی ہیں، "تاریخ جد و جہد اندلس" "عبد الرحمن الداخل" اور "امیر عبد الرحمن بن عبد اللہ غافقی" ان تینوں واقعات کا پس منظر یہ ہے،

اندلس کی فتح مسلمانوں کی اولو العزمی، ہمت و حوصلہ مندی اور جرأت و بسالت کا

ایک شاندار کارنامہ ہے، ایک نوجوان فوجی افسر طارق بن زیاد شمالی افریقہ سے اٹھتا ہے، اور کل سات ہزار فوج لے کر سمندر کو عبور کر کے ایک اجنبی ملک (اندلس) کے ساحل پر اُترتا ہے، اور اس عزم کے ساتھ کشتیوں کو نذر آتش کر دیتا ہے کہ یا وہ اسپین کی سرزمین پر اسلام کا جھنڈا نصب کرے گا، یا ہمیشہ کے لئے اسی کی خاک کا پیوند ہو جائے گا اور پورے اعتماد کے ساتھ تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے کہ

ع ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

دوسری طرف اسپین والوں کا اپنا ملک ہے، ان کے لئے ہر طرح کی سہولتیں ہیں، اسپین کے سرداروں کی متحدہ فوجیں ہیں، لیکن یہ باہمت نوجوان ان سب کو زیر کر کے پورے اسپین کو فتح کر لیتا ہے، اور جنوبی فرانس کی سرحد دریائے رڈونہ تک بڑھتا چلا جاتا ہے اور حصن لوڈون کو فتح کر کے دم لیتا ہے،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ دمشق کی اموی حکومت کو ختم کرنے کے بعد عباسیوں نے اموی خاندان کے بیشتر افراد کو چن چن کر قتل کر دیا تھا، صرف وہ لوگ بچ سکے جو کسی طرح بھاگ نکلے، ان میں ایک عبدالرحمٰن الداخل بھی تھا، یہ دمشق سے بھاگ کر شمالی افریقہ پہنچا، اور یہاں کے بربر قبائل کو اپنے ساتھ ملا کر اندلس پہونچ گیا، اس وقت یہاں عرب سرداروں میں خانہ جنگی برپا تھی، ہر طرف انتشار کا دور دورہ تھا، عربوں کی قوت پارہ پارہ ہو رہی تھی، اور اس کا خطرہ تھا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر اجنبی ملک پر قابض ہو جائیں، ان نازک حالات میں عبدالرحمٰن الداخل نے بڑے تدبر و ہوشمندی اور بہادری سے حالات پر قابو حاصل کر لیا، اور دمشق سے بنی امیہ کے اکھڑے ہوئے قدم اندلس میں جم گئے، اس وقت سے اندلس کی تاریخ کا وہ تابناک دور شروع ہوا، جس سے بنی امیہ کی پوری تاریخ روشن ہے، اس لحاظ سے عبدالرحمٰن الداخل کا دو

نہ صرف خاندان بنی اُمیہ بلکہ اس دور کے دنیا کے فرمانرواؤں میں نہایت بلند ہے،

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ یزید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں امیر سمح بن مالک خولانی نے فرانس پر فوج کشی کی، اور سرحد کی نارمن ریاست کو مطیع بنا کر ڈیوک آف ایکی ٹین کا پایہ تخت طلوشہ (ٹولوس) کا محاصرہ کر لیا[1] ڈیوک نے پوری قوت سے مقابلہ کیا، امیر سمح جوش شجاعت میں دشمن کی صفوں میں گھس گئے، اور لڑتے لڑتے شہید ہو گئے، اُن کی شہادت کے بعد مسلمان شکست کھا گئے، اور اُن کی بڑی تعداد میدان جنگ میں کام آئی، باقی ماندہ تباہ حال فوج کو امیر عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی بڑی ہوشیاری اور بہادری سے بچالائے، جو اُن کا بڑا کارنامہ تھا

اس کے بعد اندلس کے مختلف امراء وقتاً فوقتاً فرانس پر حملے کرتے رہے ۱۱۳ھ میں ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں اندلس کی حکومت پر امیر عبدالرحمٰن بن عبداللہ غافقی کا تقرر ہوا، یہ جس درجہ کا سپہ سالار تھا، اسی درجہ کا مدبر اور منتظم بھی تھا، اُس نے اندلس کا اندرونی نظم و نسق درست کرنے کے بعد ۱۱۴ھ میں بڑے اہتمام سے فرانس پر فوجکشی کی، اور سب سے پہلا مقابلہ ڈیوک آف ایکی ٹین سے ہوا، امیر عبدالرحمٰن اس کو شکست دے کر بورڈیو تک بڑھتے چلے گئے، اور اس پر قبضہ کر لیا، اس کے بعد شمالی فرانس کا رُخ کیا، ڈیوک کی فوج نے پھر دریاے ڈاروون پر روکنے کی کوشش کی، مگر امیر عبدالرحمٰن نے پھر شکست دی، اور آگے بڑھ کر پائی ٹیرس پر قبضہ کر لیا، اور سینٹ ہلاری کے مشہور گرجے کی بے کراں دولت

---

[1] فرانس میں اس زمانہ میں دو حکومتیں تھیں، جنوب میں گاتھ فرمانروا ڈیوک آف ایکی ٹین کی اس کا پایہ تخت ٹولوس تھا، دوسری حکومت شمال میں میرو ونجی خاندان کی تھی، یہ فرانس کی مرکزی حکومت تھی، اس کا فرمانروا برائے نام تھا، حکومت کے تمام اختیارات چارلس مارٹل کے ہاتھوں میں تھے، ان دونوں میں ہمیشہ رشک و رقابت رہتی تھی،

اُن کے ہاتھ آئی،

اس کے بعد ڈیوک آف ایکی ٹین کے پایۂ تخت طلوشہ کا رُخ کیا، ڈیوک نے جب دیکھا کہ اس سیلاب کا روکنا اُس کے بس سے باہر ہے، اور امیر قلب فرانس تک پہنچنا چاہتاہے، تو اُس نے مجبور ہوکر اپنے حریف چارلس ماٹل سے مدد مانگی، شمالی فرانس میں مسلمانوں کی پیشقدمی خود چارلس ماٹل کے لئے خطرناک تھی، اس لئے وہ نہ صرف خود مدد دینے کے لئے آمادہ ہوگیا بلکہ مسلمانوں کے حملہ کو قومی مسئلہ بناکر پورے فرانس، پرتگال اور جرمنی کو بھی اُن کے مقابلہ کے لئے آمادہ کرلیا، اور اُن کی متحدہ فوجوں کو لے کر مقابلہ کے لئے نکلا، طلوشہ کے میدان میں دونوں کا سامنا ہوا، امیر عبدالرحمٰن نے بڑی شجاعت و پامردی سے مقابلہ کیا، مگر دونوں کی قوت میں کوئی تناسب نہ تھا، ایک طرف اندلس کے مٹھی بھر مسلمان تھے، دوسری طرف فرانس، پرتگال اور جرمنی کی متحدہ فوجیں تھیں، اس لئے کئی خونریز معرکوں کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی، امیر عبدالرحمٰن لڑتے لڑتے شہید ہوئے، اور ایک عرصہ کے لئے فرانس میں مسلمانوں کی فوج کشی رُک گئی،

یورپ کے مورخین اس واقعہ کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، اور چارلس کی کامیابی کو اس کا بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں، اسی کے بدولت اس کو ماٹل یعنی ہتھوڑے کا خطاب ملا، اور اس میں کوئی شبہ نہیں، کہ اگر مسلمان اس حملہ میں کامیاب ہوگئے ہوتے، تو نہ صرف فرانس پر اُن کا قبضہ ہوجاتا، بلکہ پورے مغربی یورپ کی تاریخ بدل جاتی،

سید صدیق حسن صاحب نے ان تینوں واقعات کو بڑے موثر انداز میں نظم کیا ہے، اور ان نظموں میں محض واقعہ نگاری نہیں ہے، بلکہ وہ قومی و ملی روح سے بھی معمور ہیں، اور اُن کے اخلاقی اور سبق آموز پہلوؤں کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے، اندلس کی فتح کے

سلسلہ میں یورپین مورخین نے مسلمانوں، طارق بن زیاد اور اس کے افسر اعلیٰ موسیٰ بن نصیر والی افریقیہ کے تعلقات کے بارہ میں جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، پہلی نظم کے مقدمہ میں مصنف نے اُن کی پوری تردید کی ہے، یوں تو یہ تینوں نظمیں بڑی سبق آموز ہیں، لیکن اُن کے خاص خاص حصے بڑے موثر ہیں، اُن کے اقتباسات طویل ہوں گے، اس لئے اُن کو نقل نہیں کیا گیا ہے، نظموں کے مطالعہ سے ناظرین کو اس کا خود اندازہ ہو جائے گا،

طویل اور واقعاتی نظموں میں شعری اور ادبی پہلوؤں کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے، لیکن مصنف ایک قادر الکلام شاعر ہیں، اس لئے شاعرانہ خوبیوں کا دامن بھی اُن کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا ہے، باقی اتنی طویل نظموں میں اگر کہیں کوئی فروگذاشت ہوگئی ہو تو اُن کی خوبیوں کے مقابلہ میں لائق التفات نہیں۔

عزیزانِ ندوہ کے نام

دار العلوم ندوۃ العلماء میں توسیعی خطبات کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے، اس کی پہلی کڑی اُردو زبان کے مشہور صاحب طرز انشا پرداز و نقاد پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ پہلا خطبہ ہے، یہ گرانقدر فکر انگیز خطبہ علوم اسلامیہ کے طلبہ کے لئے مشعل راہ اور اُن درد مندان ملت کے لئے جن کو ہر وقت ملت کی فلاح و بہبود کی فکر رہتی ہے، پیام نو ہے، اس میں ملک کی دو اہم تعلیمی تحریکوں یعنی دیوبند اور علی گڑھ کے تعارف کے ساتھ اس ملک کی سب سے زیادہ جاندار اور انقلاب آفریں تعلیمی تحریک ندوۃ العلماء کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، خطیب اُردو کے صاحب طرز ادیب و مفسر قرآن مولانا عبد الماجد دریا بادی صاحب صدق جدید کے صدارتی کلمات اور مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی کی افتتاحی تقریر سے مزین ہے، ۱۳۰ صفحے، قیمت عہ، پتہ:- ناظم جمعیۃ الاصلاح دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، (یوپی)

تحفۃ الواصلین

ایک نایاب تذکرہ

از

جناب محمد اقبال صاحب، (لاہور)

راقم الحروف عرصۂ دراز سے زیب عنوان تذکرے کی تلاش میں ہے، لیکن تلاش بسیار کے باوجود ابھی تک کسی کتاب خانے کی فہرست میں اس کا ذکر میری نظر سے نہیں گذرا، بہت سے ارباب علم و تحقیق سے بھی دریافت کیا، مگر کسی سے پتہ نہ چلا، یہاں اس تذکرے کے سنہ تصنیف کے متعلق کچھ کہنا ہے، ممکن ہے اس کو پڑھنے کے بعد کوئی صاحب اس پر روشنی ڈال سکیں،

رائے بہادر کنھیا لال اس تذکرے کی بابت لکھتے ہیں:-

"شیخ احمد زنجانی نے رسالہ تحفۃ الواصلین ۴۳۵ھ عہد سلطان مسعود غزنوی میں بمقام لاہور اس شہر (لاہور) کے علماء و فضلا کے حال میں لکھی ہے[1]"

کنھیا لال کے اس بیان پر بھروسا کرتے ہوئے، ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے اس تذکرے

---

[1] تاریخ لاہور ص [illegible] مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور [illegible]،

کو ۳۳۵ھ کی تصنیف تسلیم کیا ہے،[۵۱]

تعجب ہے کہ ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے اس بیان پر کس طرح اعتماد کر لیا، یہ بیان نہ صرف غیر تحقیقی بلکہ مضحکہ خیز ہے،

کنھیا لال حضرت ذکی کے حالات کے زمرے میں لکھتے ہیں،

"تحفۃ الواصلین میں لکھا ہے، کہ یہ بزرگ مغلوں کی لڑائی میں شہید ہوا تھا، اور اس دروازے (ذکی) کی حفاظت اُس کے ذمے تھی،[۵۲]

لاہور پہلی مرتبہ ۶۳۹ھ م ۱۲۴۱ء میں ملک معزالدین بہرام شاہ کے عہد میں منگولوں کی تاخت و تاراج کا نشانہ بنا،[۵۳] شہر پر قبضہ کرنے کے بعد انھوں نے مسلمانوں کو قتل و اسیر کیا، اس قتل و غارت میں وہ شہدا بھی شامل ہیں، جن کی قبریں "مزارات شہید گنج" محلہ سادھواں میں واقع ہیں، ان کا ذکر بھی "تحفۃ الواصلین" میں موجود ہے،[۵۴]

"تحفۃ الواصلین" میں حضرت ذکی کی شہادت کا ذکر (قریباً ۶۳۹ھ) اس کی بین دلیل ہے، کہ یہ تذکرہ ساتویں صدی ہجری کے بعد کی تصنیف ہے،

لاہور کے مشہور محقق مفتی غلام سرور لاہوری نے جن کے پاس یہ تذکرہ موجود تھا، اپنی تصانیف میں جا بجا اس کا حوالہ دیا ہے، انھوں نے سید شیخ عزیز الدین مکی ثم لاہوری کے حالات "تحفۃ الواصلین" ہی سے نقل کئے ہیں، جن کی وفات ۹۱۲ھ میں ہوئی تھی،[۵۵] اس سے ثابت ہوا، کہ

---

[۵۱] ملاحظہ ہو مقالہ "لاہور کی وجہ تسمیہ" در نقوش "لاہور نمبر" [۵۲] تاریخ لاہور، ص ۱۶۷، [۵۳] ملاحظہ ہو طبقات ناصری (انگریزی) مترجم ایچ۔ جی۔ ریورٹی، جلد اول ص ۶۵۵، سید یحییٰ سرہندی کی تاریخ مبارک شاہی ص ۳۱، مطبوعہ کلکتہ ۱۹۳۱ء [۵۴] حدیقۃ الاولیاء مفتی غلام سرور لاہوری ص ۱۵۴ مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۳ء [۵۵] خزینۃ الاصفیا، جلد دوم ص ۲۵۵

یہ تذکرہ ۱۲۶۱ھ کے بعد لکھا گیا، خزینۃ الاصفیاء ہی میں سید اسحاق گاذرونی لاہوری کے حالات کے ضمن میں مفتی صاحب لکھتے ہیں،

"این قطعہ درج رسالۂ تحفۃ الواصلین" است قطعہ

سید اسحاق ولی کریم گشت چو زیں دہر بجنت مقیم
سال وصالش عجب آمد ز دل بسم اللہ الرحمن الرحیم

۷۸۶ھ

اس قطعہ کے "تحفۃ الواصلین" ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس میں آٹھویں صدی ہجری کے بزرگوں کا ذکر بھی موجود ہے، اس لئے اس کو ۶۳۵ھ کی تصنیف نہیں کہا جا سکتا، رہا یہ سوال کہ اس تذکرے کا مصنف کون ہے؟..... اس باب میں کچھ کہنا اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اصل کتاب سامنے نہ ہو، عہدِ حاضر کے مشہور محقق جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب میرے ایک استفسار کے جواب میں لکھتے ہیں،

"میرا اپنا خیال ہے کہ شیخ احمد زنجانی کی طرف یہ تصنیف منسوب کرنا صحیح نہیں"

(مکتوب جناب صباح الدین صاحب)

(۱۱ اپریل ۱۹۶۶ء)

(بقیہ حاشیہ) مطبوعہ ثمر ہند پریس لکھنؤ ۱۸۷۳ء

ادبیات

غزل

از

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

عصرِ نو کے تغیرات نہ پوچھ — کیا سے کیا ہوگئی حیات نہ پوچھ

شرحِ ناکامیٔ حیات نہ پوچھ — حاصلِ عمرِ بے ثبات نہ پوچھ

رازِ سربستۂ حیات نہ پوچھ — اور کچھ پوچھ بس یہ بات نہ پوچھ

دل پہ گذری جو واردات نہ پوچھ — اپنی نظروں کی کوئی بات نہ پوچھ

ذکرِ آغازِ التفات نہ چھیڑ — حالِ انجامِ التفات نہ پوچھ

عشق کو جاں بلب ہی رہنے دے — رازِ ترکِ تعلقات نہ پوچھ

کیا بتاؤں سبب تباہی کا — جانتا ہوں مگر یہ بات نہ پوچھ

عشق اور حسن میں ہے کیا رشتہ — یہ ہیں نازک معاملات نہ پوچھ

عظمتِ دیر و کعبہ بھی تسلیم — لیکن اُس آستاں کی بات نہ پوچھ

میرا انجام دیکھ آنکھوں سے — انتہائے غمِ حیات نہ پوچھ

غم سود و زیاں نہیں مجھ کو — عشق میں کیا ملا یہ بات نہ پوچھ

ہر نفس انقلابِ نو درپیش — کیسے گذرے گی یہ حیات نہ پوچھ

تجھکو کیا کیا بتاؤں اے ناصح ہیں محبت کے یہ نکات نہ پوچھ

مجھ کو کتنے عزیز ہیں جوہر

یہ محبت کے حادثات نہ پوچھ

غزل

از جناب ڈاکٹر محمد ولی الحق صاحب لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی

حاصل ہوا جہاں میں غمِ جاوداں مجھے لائی میری حیات کہاں سے کہاں مجھے

منظور کب کسی سے ہو اس کا بیاں مجھے جو غم گھلا رہا ہو دلِ شمع ساں مجھے

آئی نظر حقیقتِ کون و مکاں مجھے پہنچا دیا یہ ساغرِ مے نے کہاں مجھے

پھر بھی متاعِ عشق نہیں ہے گراں مجھے دنیا پڑے گر اس کے لئے نقدِ جاں مجھے

بہلائیں کیا بہار کی رنگینیاں مجھے بھولی نہیں ہے کلفتِ دورِ خزاں مجھے

سمجھے نہ کوئی اہلِ سفر ناتواں مجھے لیتی چلے گی خود کششِ کارواں مجھے

دنیا کی فکر کیا ہے جو ہیں حوصلے بلند آواز دے رہی ہیں مہ کہکشاں مجھے

انسان کے سوا ہی نظر آ رہی ہیں آج انسان کے لباس میں پرچھائیاں مجھے

ہے مجھکو ہر تبسمِ معصوم سلسبیل اور ہر نگاہ گرم ہو برقِ تپاں مجھے

کانٹوں کی بھی چبھن تھی گوارا کبھی مگر ہے بے محل بھی طبع پہ اب تو گراں مجھے

مطلب ہی کیا ہو باغ سے اب بعدِ آشیاں فکرِ بہار اور نہ خوفِ خزاں مجھے

ہمدم تسلیوں سے تو بڑھتا ہے اور غم رہنے دو میرے حال پہ او مہرباں مجھے

تنکے تھے چند وہ بھی اب اپنے نہیں رہے دھمکا رہی ہیں کوند کے کیا بجلیاں مجھے

مایوسیاں ہیں باعثِ تسکیں قفس میں اب ہے فکرِ باغ اور نہ غمِ آشیاں مجھے

ہر دم ہو گوشۂ ابد و دوزخ کا سامنا پھر بھی ولی بہشت ہے ہندوستاں مجھے

مطبوعات جدیدہ

شرح آداب المریدین: مترجمہ جناب مولانا شاہ قسیم الدین احمد فردوسی
تقطیع کلاں کاغذ، کتابت، وطباعت اچھی، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش
قیمت: صر، پتہ: بیت الشرف، خانقاہ بہار شریف، پٹنہ،

حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد بن یحییٰ منیریؒ نے حضرت شیخ ضیاء الدین ابوالنجیب عبدالقاہر سہروردی کی مشہور عربی تصنیف آداب المریدین کی جو صوفیاے کرام کے عقائد و آداب، محاورات، اصطلاحات، اور دوسرے مسائل تصوف سے مریدین وسالکان طریقت کی واقفیت کے لئے لکھی گئی تھی، فارسی زبان میں شرح لکھی تھی، اب فارسی زبان سے بھی واقفیت رکھنے والے بہت کم لوگ رہ گئے ہیں، اس لئے شاہ قسیم الدین صاحب نے جو حضرت مخدوم الملک کی تحریروں کے اداشناس ہیں، اور اس سے پہلے بھی ان کی متعدد کتابوں کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں، افادۂ عام کے خیال سے اس کتاب کا بھی اردو میں ترجمہ کیا، جو ترجمہ اور اصل عربی متن دونوں پر مشتمل ہے، اس کے شروع میں توحید، کلام الٰہی رویت باری، ایمان اور خلافت و ملوکیت اور آخر میں فقر و تصوف کے متعلق صوفیاے کرام کے عقائد و خیالات کا ذکر ہے، آخر کے بعض مباحث میں دکھایا گیا ہے، کہ صوفیا، احکام و تکالیف شریعت کے عدم سقوط، دنیا کی عدم بشریت اور نبوت کی ولایت پر ترجیح

اور سماع کو بعض قیدوں کے ساتھ جائز بتاتے ہیں، کتاب کے مباحث میں بڑا تنوع اور وسعت ہے، اور وہ تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور تصوف وغیرہ کے بہت سے فوائد و نکات پرمشتمل ہے، فاضل شارح نے جا بجا مصنف کے مجمل و مبہم نقطۂ نظر کو قرآن، حدیث، اور صوفیاء کے اقوال کی روشنی میں واضح کیا ہے، اور متن کے غریب و مشکل الفاظ کی بھی تشریح کی ہے، شروع میں لائق مترجم نے ماتن و شارح کے مختصر حالات اور مقدمہ اور سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے دیباچہ تحریر کیا ہے، اگر حواشی میں آیات و احادیث کی تخریج اور اقوالِ صوفیا کے مآخذ بھی تحریر کر دیئے جاتے، تو روایات کی صحت و ضعف اور اقوال کے ثبوت و استناد کا بھی اندازہ ہو جاتا، شرح آداب المریدین کے یہ چند ابواب و فصول کا اردو ترجمہ ہے، امید ہے، کہ اہلِ دل اور عام مسلمان اس کی عملی قدردانی کا ثبوت دیکر اس گنجِ گرانمایہ کی بقیہ جلدوں کی اشاعت کا سامان بھی کریں گے،

ارمغانِ عرب: مرتبہ جناب عزیز احمد صدیقی تقطیع ۲۰ × ۲۶ کاغذ، کتابت طباعت اوسط درجہ، صفحات ۹۶، قیمت: عہ ر پتہ مکتبۂ ماویہ ۱۵۶ بی، ون ایریا، لیاقت آباد، کراچی نمبر ۱۹،

حضرت شاہ محمد اسماعیل شہیدؒ کی مشہور و مقبول اردو تصنیف تقویۃ الایمان کی زبان موجودہ زبان کے مقابلہ میں قدیم اور نامانوس تھی، اس لئے عزیز صدیقی صاحب نے اس کی زبان کو سلیس اور عام فہم کرکے اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، آخر میں انھوں نے اپنی ایک غیر مرتب کتاب ارمغانِ عجم کا نمونہ دیا ہے، اُن کی یہ دونوں تحریریں سنجیدگی اور توازن سے خالی اور ان کا لہجہ و اندازِ بیان نہایت درشت اور ناہموار بلکہ پست ہے، نام میں ترمیم کا جو پہلو نکلتا ہے، وہ بھی مرتب کی شدت پسندی کا نتیجہ ہے، حالانکہ کتاب کے اصلی نام

میں اس سے زیادہ وزیادہ جاذبیت اور کشش ہے، اگر کتاب کے خصوصیات اور مصنف کے حالات وکارناموں کا مختصر مرقع بھی پیش کر دیا گیا ہوتا، تو اس کی افادیت میں اور اضافہ ہو جاتا، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر تقویۃ الایمان کو آسان اور عام فہم زبان میں شائع کر کے مرتب نے ایک بڑی مفید دینی خدمت انجام دی ہے،

دینی دعوت کے قرآنی اصول وآداب از جناب مولانا محمد طیب صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۳۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ/ پتہ مجلس معارف القرآن، دارالعلوم دیوبند،

چند مہینے پہلے دارالعلوم دیوبند میں قرآنی حقائق وعلوم کو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق اردو، انگریزی، اور عربی زبانوں میں شائع کرنے کے لئے مجلس معارف القرآن کی تشکیل عمل میں آئی ہے، اس شعبہ کا افتتاح مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی اس کتاب سے کیا گیا ہے، یہ کتاب دینی دعوت کے قرآنی اصول وآداب کی مفصل تشریح اور قرآن مجید کی مشہور آیت دعوت ادع الی سبیل ربك بالحكمة الخ کی مکمل تفسیر ہے، اس میں آیت کے چاروں اہم بنیادی اجزاء یعنی دعوت، داعی، مدعو، اور مدعو الیہ کے مختلف پہلوؤں کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت کی گئی ہے، مثلاً دعوت کے اصول، پروگرام قسمیں، عملی صورتیں اس کو موثر بنانے کی تدبیریں، دعوت میں مخاطب کے مزاج وذہنیت کی رعایت، مدعو الیہ کی تعیین کر کے اسلام اور اس کی دعوت کی عالمیت وہمہ گیری اور اس کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کی غیر ہمہ گیری، داعی کے ذاتی وصفاتی اوصاف، مدعو کے عموم اور مدعوین کی قسمیں وغیرہ تشریح میں دعوت وتبلیغ کی اہمیت وضرورت اور اس کا حقیقی مفہوم اور آخر میں اس کے نظام کو مستحکم اور ہمہ گیر کرنے کی ضرورت کی بنا پر [illegible]

دفعات پرمشتمل دعوتی پروگرام کا ایک دستور العمل بھی تحریر کیا گیا ہے، مقدمہ میں مولانا نے ملی دور کو دفاعی کے بجائے اقدامی ثابت کیا ہے، یہ چیز ہندوستان کے مسلمانوں اور بالخصوص اُن کی تبلیغی جماعتوں کے لئے خاص طور پر قابلِ غور ہے، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، تاہم مولانا کے نکتہ آفرین قلم نے عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں، اور ایک ہی آیت کی دلالت اشارت، عبارت، اور اقتضاء النص سے ۲۰ سے زائد اصول و مقاصد مستنبط کئے ہیں، انداز بیان منطقیانہ ہونے کے باوجود موثر و دلنشیں ہے،

نورتن :- مرتبہ جناب شورش کاشمیری، تقطیع خورد، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۱۹۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، پتہ مطبوعات چٹان، لاہور،

جناب شورش کاشمیری مدیر چٹان کا قلم اشخاص کی مصوری میں بھی کمال رکھتا ہے، چنانچہ انھوں نے اس کتاب میں پنجاب کے نو مشہور مرحوم صحافیوں عبد المجید سالک، چراغ حسن حسرت، ماسٹر تاج الدین انصاری، ساغر نظامی، سید حبیب، مرتضیٰ احمد میکش، اختر امرتسری، حاجی لق لق، ابو صالح اصلاحی اور مجید لاہوری کے سوانحی خاکوں میں اُن کی چلتی پھرتی تصویریں کھینچ دی ہیں، اور اُن کی شعری و ادبی دلچسپیوں، صحافتی خدمات، قلمی معرکوں، باہمی آویزشوں، اور دوسرے معمولات و مشاغل کو اس ماہرانہ فنکاری کے ساتھ دکھایا ہے کہ اُن کی تصویر سامنے آجاتی ہے، اس جگ بیتی میں کہیں کہیں آپ بیتی کی جھلک بھی نظر آتی ہے، شورش صاحب ایک پختہ کار صاحب قلم ادیب اور صحافی ہیں، ان کی تحریر کی شوخی، طنز و ظرافت، تشبیہات و استعارات، برجستہ و بیساختہ جملوں نے اس کتاب کو ادبی حیثیت سے بھی دلکش بنا دیا ہے، اور وہ اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

[illegible] :- مرتبہ [illegible] صاحب [illegible]، متوسط تقطیع

کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۹۹ قیمت ۱۲، پتہ :- مدرسہ ملت، مالیگاؤں، ضلع ناسک،

مبتدیوں کے لئے عربی کی بہت سی ریڈریں لکھی جا چکی ہیں، یہ نئی ریڈر مولانا عبدالحمید نعمانی کی تالیف ہے، وہ جید عالم ہیں، اور اُن کو درس وتدریس کا بھی پورا تجربہ ہے، اور عربی زبان وادب میں اُن کو پوری دستگاہ حاصل ہے، اس لئے انھوں نے اس میں صرف ونحو کے مبادیات اور عربی کے ضروری قواعد نہایت دلنشیں اور سلیس وسادہ انداز میں مشقی سوالات اور تمرینوں کے ساتھ تحریر کئے ہیں، امید ہے مدارس کے علاوہ عام عربی سیکھنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھائیں گے،

انتخاب رُباعیات مولانا روم مُرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی تقطیع خورد، خوبصورت ٹائپ صفحات: ۷۶، پتہ: مولانا نجم الدین اصلاحی، سدھاری۔ اعظم گڑھ،

مولانا جلال الدین رومی کی سب سے مشہور ومقبول تصنیف مثنوی ہے، مثنوی کے علاوہ دوسرے اصناف سخن میں بھی اُن کی یادگاریں ہیں، انہیں میں اُن کی رُباعیات بھی ہیں جس سے کم لوگ واقف ہیں، ۱۳۱۲ھ میں مولانا کی رُباعیات کا ایک مجموعہ استنبول سے شائع ہوا تھا، جو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے پاس تھا، انہی کے ایماء سے مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی نے اس کا انتخاب مرتب کیا تھا جس کو انھوں نے نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت ٹائپ میں شائع کیا ہے اور اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہی کے نام معنون کیا ہے، شروع میں مولانا روم کے مختصر حالات بھی درج ہیں، انتخاب خوش مذاقی سے کیا گیا ہے، اور ڈیڑھ سو رُباعیات پر مشتمل ہے، مولانا روم کی مثنوی کی طرح ان کی رباعیات بھی اسرار وحکم اور عشق ومعرفت کا خزینہ اور اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہیں،

" ض "

جلد ۱۰۰ - ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۶۷ء - عدد ۶

مضامین

شذرات

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ کی وفات سے رشد و ہدایت کا ایک روشن چراغ گل ہوگیا، وہ اس دور کے بڑے شیخ طریقت اور سالکین کی اصلاح و تربیت میں اپنے مرشد حضرت مولانا تھانوی کا مثنیٰ تھے، اُن کی وفات کے بعد اُن کی ذات طالبین کا مرجع بن گئی تھی، اُن سے ایک مخلوق فیضیاب ہوئی، اُن کی اصلاح و تربیت سے ہزاروں بگڑی ہوئی زندگیاں سنور گئیں، گم کردہ راہوں کو راہ راست اور تاریک دلوں کو ایمان کی روشنی ملی، ادھر چند برسوں سے جب مولانا نے اپنے وطن فتح پور تال نرجا کا گوشۂ عافیت چھوڑ کر الٰہ آباد کا قیام اختیار فرمایا آپ کا فیض پورے ہندوستان میں پھیل گیا تھا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا رجوع خاص طور سے بہت بڑھ گیا تھا، اور اس کو خصوصیت سے زیادہ فائدہ پہنچا،

حضرت مولانا خلقۃً نحیف و ناتواں تھے، عمر کے تقاضے اور فالج کے اثر نے اور کمزور کر دیا تھا، اس کے باوجود آپ کے معمولات اور فیض رسانی میں فرق نہ آیا تھا، اسی حالت میں گذشتہ شعبان میں حج کا قصد فرمایا، مگر وقت موعود آچکا تھا، جہاز کی روانگی کے کل دو دن بعد ۲۵ر نومبر کی شب کو تہجد کی نماز سے فراغت کے بعد اور فجر کی نماز سے پہلے روح مبارک عالم قدس میں پہونچ گئی، جہاز کے قاعدہ کے مطابق ہر متوفی کی لاش تجہیز و تکفین کے بعد سمندر کی موجوں کے حوالے کر دی جاتی ہے، مگر جس کی دوبارہ طلبی ہوئی تھی، اُسی نے اس کا انتظام کر دیا کہ لاش کو جدہ لے جانے کی اجازت مل گئی، اور یقین ہے کہ اس وقت تک جسد خاکی کو جنت البقیع کی مقدس سرزمین میں سپرد خاک

کر دیا گیا ہوگا،

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا،

حضرت مولانا کی وفات سے رشد و ہدایت کی ایک بڑی مسند خالی ہوگئی، اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے، آپ کے متوسلین معرفت حق کے نام سے ایک پرچہ نکالتے ہیں، حضرت مولانا کی اصلاحی تقریریں، ملفوظات اور اصلاح و تربیت کے متعلق سوالات و جوابات شائع ہوتے ہیں، یہ ملفوظات اصلاح و تربیت کے نصاب کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ حضرت مولانا تھانوی کے مواعظ و ملفوظات کی طرح ان کو بھی کتابی شکل میں شائع کیا جائے تاکہ ان کا افادہ مستقل قائم رہے،

اس وقت دارالمصنفین دوہری مشکلات میں مبتلا ہے، اس کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ اسکی تجارت ہے، ہندوستان و پاکستان کی جنگ کے زمانہ سے دونوں ملکوں کے درمیان تجارت بالکل بند ہے جس سے دارالمصنفین کی آمدنی نصف کے قریب گھٹ گئی ہے اور صرف ہندوستان کی تجارت پر اس کا مدار رہ گیا ہے، جو اس کے مصارف کے لئے ناکافی ہے، اور موجودہ ہوشربا گرانی کی وجہ سے اس کے مصارف پہلے کے مقابلہ میں بہت بڑھ گئے ہیں، اسلئے وہ کئی سال سے مالی مشکلات میں مبتلا ہے، جوبلی کے موقع پر جو رقم ملی تھی، اس کو ملا کر کام چلتا رہا، مگر اب وہ بھی ختم کے قریب ہے، دارالمصنفین نے کبھی چندہ کے لئے دست سوال دراز نہیں کیا، وہ اپنی خودداری و وضعداری پر قائم ہے، اس کی سب سے بڑی مدد یہ ہے کہ اس کے قدردان اس کی کتابوں کی توسیع اشاعت کی کوشش کریں، اصحاب استطاعت اس کے لائف ممبر بنیں، جس کی فیس ایک ہزار

اور پانسو ایک مُشت ہے، ایک ہزار کے ممبروں کو اُس کی تمام گذشتہ اور آیندہ مطبوعات پیش کی جاتی ہیں، جن کی قیمت ایک ہزار کے قریب ہو جاتی ہے، اور انکو اپنی امداد کا معاوضہ کتابی شکل میں مل جاتا ہے، پانسو کے ممبروں کو ممبری کے وقت سے نئی مطبوعات پیش کی جاتی ہیں جس میں معارف بھی شامل ہے،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ہر پہلو سے بڑی ترقی کی ہے، اسکی شہرت اسلامی ملکوں تک پھیل گئی ہے، چنانچہ اس وقت عرب اور افریقہ تک کے طلبہ ندوہ میں زیر تعلیم ہیں، طلبہ کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جس سے مصارف میں قدرۃً اضافہ ہو گیا ہے، پچیس ہزار سالانہ صرف طلبہ کے وظائف پر صرف ہو رہا ہے، اور سالانہ بجٹ ساڑھے تین لاکھ تک پہنچ گیا ہے، طلبہ کی کثرت کی وجہ سے عمارتوں میں بھی اضافہ ناگزیر ہو گیا ہے، ندوہ کی مسجد تک نمازیوں کے لئے ناکافی ہو گئی ہے، اس لئے تعمیرات کا سلسلہ بھی جاری ہے، ان مصارف کے مقابلہ میں آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ نہیں ہے اور نہ اُس میں کوئی خاص اضافہ ہوا ہے، اسلئے دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی مالی مشکلات میں مبتلا ہے،

اس زمانہ میں جبکہ مختلف سمتوں سے مسلمانوں کے مذہب اور انکی تہذیب کو مٹانے کی کوشش جاری ہے، خود مسلمانوں کا ایک دانشور طبقہ ذہنی ارتداد کا شکار ہو چکا ہے، اس کو حکومت اور اکثریت کی خوشنودی کیلئے اپنے دین و ملت کو بھی قربان کرنے میں تامل نہیں ہے، اور اسکے اثرات مسلمانوں کی تعلیم جدید کے بعض مرکزی اداروں تک پہنچ گئے ہیں، صرف عربی مدارس ہی وہ قلعے باقی رہ گئے ہیں جنکے ذریعہ مسلمانوں کے مذہب و تہذیب و روایات کی حفاظت ہو سکتی ہے، اور ہندستان میں آیندہ اسلام و ملت اسلامیہ کی بقا انہی پر موقوف ہے، اسلئے اُن کو باقی رکھنا مسلمانوں کا سب سے بڑا دینی و ملی فریضہ ہے، ہم کو امید ہے کہ اصحاب خیر دارالعلوم ندوۃ العلماء کی پوری امداد کریں گے،

مقالات

حارث بن اسد محاسبی

از مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری دارالعلوم اشرفیہ راندیر

نام و نسب ابو عبد اللہ کنیت، حارث بن اسد نام، بصرہ جائے ولادت، بغداد مسکن و جائے وفات، نفس کا بکثرت محاسبہ فرماتے تھے، اس لئے المحاسبی کے لقب سے مشہور ہوئے[1] تاریخ ولادت معلوم نہیں، وفات بغداد میں ۲۴۳ھ میں ہوئی،

اساتذہ و تلامذہ یزید بن ہارون اور اس طبقے کے محدثین سے حدیث روایت کرتے تھے تلامذہ میں ابو العباس بن مسروق، احمد بن حسن بن عبد الجبار، جنید بغدادی، اسمٰعیل بن اسحٰق سراج، ابو علی حسین بن خیران، احمد بن قاسم بن نصر، احمد بن عبد اللہ میمون وغیرہ ہیں،

فضائل علامہ مناوی "کواکب دریہ" میں محاسبی کے متعلق رقمطراز ہیں :-

قال التیمی ھو امام المسلمین	تیمی کہتے ہیں فقہ و حدیث اور کلام
فی الفقہ و التصوف و الحدیث	و تصوف میں وہ مسلمانوں کے
و الکلام[2]	امام ہیں،

---

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۴۰۴ مطبوعہ مصر ۱۹۴۸ء بتحقیق محمد محی الدین عبد الحمید [2] الکواکب الدریہ فی تذکرۃ الصوفیہ جلد ا ص ۲۱

ابن خلکان لکھتے ہیں:۔

احد رجال الحقیقۃ و ھو ممن اجتمع لہ علم الظاھر و الباطن[1]

حقیقت و معرفت کے واقفکار علم ظاہر و باطن کے جامع ہیں،

حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں تحریر فرماتے ہیں:۔

والمحاسبی العارف صاحب التوالیف صدوق فی نفسہ وقد نقموا علیہ بعض تصوفہ و تصانیفہ[2]

عارف محاسبی صاحب تصنیفات بذاتہ صدوق ہیں البتہ انکے تصوف و تصانیف پر نکتہ چینی کی گئی ہے،

ابو القاسم قیشری نقل فرماتے ہیں:۔

"عبد اللہ بن حنیف فرماتے تھے کہ ہمارے شیوخ میں پانچ کی اقتدا کرو، اور باقیوں کے احوال خود ان کے حوالہ کرو، (۱) حارث بن اسد محاسبی (۲) جنید بن محمد بغدادی، (۳) ابو محمد رویم (۴) ابو العباس بن عطار (۵) عمرو بن عثمان، کیونکہ یہ مذکورہ حضرات علم و حقائق کے جامع ہیں[3]"

شیخ عبد الفتاح ابو غدہ (مقیم حلب) ان کے حالات میں لکھتے ہیں:۔

"امام عارف، علوم حکمت و معرفت میں رطب اللسان، تقوی و تقدس، علم و عمل معاملات و حالات میں عدیم النظیر، زہد و عبادت، پند و مواعظ میں بے مثال فقیہ و متکلم اور خطابت میں فرد تھے[4]"

مشاغل محاسبی اپنے تمام اوقات پند و موعظت، ریاضت و عبادت اور تالیف کتب میں صرف

---

[1] وفیات حوالہ سابق [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۹۹-۲۰۰ [3] رسالہ قیشریہ ص ۱۵،

[4] مقدمہ رسالۃ المسترشدین ص ۱۱

فرماتے تھے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ ہونے دیتے تھے، کوئی گھڑی ایسی نہیں گذرتی تھی کہ کوئی نیک کام نہ کرتے ہوں، اسی لئے کثیر التصانیف بھی تھے، تاج الدین ابن السبکی نے ان کی تصنیفات دو سو تک لکھی ہے[1]،

موضوع تصانیف | دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی کے آغاز میں روایت حدیث، تفسیر، مغازی اور سیرت کا عام مذاق تھا، جو تصنیف بھی عالم وجود میں آتی تھی وہ انہی میں سے کسی ایک موضوع پر ہوتی تھی، ایسے وقت میں محاسبی کا موضوع تصنیف اخلاقیات، زہد و تصوف، رد بدعات و عقائد باطلہ تھا، وہ انسانی عیوب کا پتہ لگاتے اور ان کی اصلاح کا طریقہ بتاتے، ان کی تصنیفات کا بڑا حصہ اسی موضوع پر ہے، کتاب الرعایہ، کتاب التوہم، رسالۃ المسترشدین اس فن کے انمول جواہر ہیں، ان کے علاوہ خوارج، معتزلہ، روافض و قدریہ کے عقائد کے رد، اصول دین اور فقہ و احکام میں بھی ان کی تصانیف ہیں،

کثیر التصانیف مصنفین عموماً رطب و یابس میں امتیاز نہیں کرتے، لیکن محاسبی کی تمام تصانیف معیاری ہیں، خصوصاً زہد و تصوف، تزکیہ و احسان، اور روح و نفس کے مباحث پر ان کی تصانیف بعد میں آنے والے مصنفین کے لئے سنگ بنیاد اور اصول کی حیثیت رکھتی ہیں،

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ احیاء العلوم میں لکھتے ہیں۔

المحاسبی خیر الامۃ فی علم المعاملۃ	محاسبی علم المعاملہ میں خیر الامت ہیں، نفسانی
وله السبق علی جمیع الباحثین	عیوب، نقائص اعمال اور انہماک
عن عیوب النفس وآفات الاعمال	فی العبادات کی خرابیوں پر جن لوگوں
واغوار العبادات وکلامہ	نے لکھا ہے ان سب پر محاسبی سبقت لے گئے

---

[1] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۳۷،

جنید بان یحکی علی وجہہ[1] ہیں اور ان کا کلام اس لائق ہو کہ اس کو بعینہٖ نقل کیا جائے،

خود امام غزالیؒ ان سے بہت زیادہ متاثر اور ان کی تصنیفات کے خوشہ چین ہیں، علامہ زاہد الکوثری کی رائے ہے کہ :-

لقد کان اثر الامام المحاسبی علی	محاسبی کا امام غزالیؒ پر بڑا اثر پڑا ہے،
الامام الغزالی کبیرا و لقد تبطن	انھوں نے محاسبی کی کتاب الرعایۃ
الغزالی کتاب الرعایۃ فی کتاب	کو اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں چھپا
الاحیاء[2]،	ہے،

طرز تصنیف | محاسبی کا طرز تصنیف بھی عجیب تھا، حافظ ابو نعیم اصفہانی محاسبی کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

" جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ حارث محاسبی میرے گھر آتے اور مجھ سے فرماتے آؤ ذرا تفریح کو چلیں ؟ میں عرض کرتا وحدت و عزلت سے نکال کر، تنہائی کا امن و سکون ختم کر کے آپ مجھ کو آفات و بلیات میں پھنساتا، راستوں کی سیر و تفریح میں منہمک اور شہوات و خواہشات میں مبتلا کر دینا چاہتے ہیں ؟ حضرت جنید فرماتے چلے چلو گھبراؤ نہیں، میں ان کو ساتھ لیکر روانہ ہو جاتا اور عجیب بات یہ دیکھتا کہ راستہ میں کوئی ناپسندیدہ چیز حائل ہی نہ ہوتی، جب ہم جنگل میں پہنچکر کسی مناسب جگہ بیٹھ جاتے تو فرماتے مجھ سے سوالات کرو، میں عرض کرتا میرے ذہن میں پوچھنے کے لئے کوئی سوال ہی نہیں ہے. فرماتے جو بھی دل میں آئے پوچھو، پھر خود سوالات کی بوچھار کر دیتے میں وہی سوالات ان سے پوچھتا، وہ ان کے برجستہ جوابات دیتے، اس کے بعد وہ گھر لوٹتے اور ان سے ایک کتاب تیار کر لیتے"[3]

اس طرز کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مصنف جب کسی مسئلہ کو سمجھا دیتا ہے تو اس کو یہ اندازہ ہو جاتا

۱؎ الکواکب الدریہ ج ۱ ص ۲۱۱ ۲؎ مقدمہ رسالۃ المسترشدین ص ۱۲ ۳؎ حلیۃ الاولیاء ج ۱۰ ص ۷۷،

ہے کہ کون سی بات مخاطب جلد سمجھ جاتا ہے، اور کون سی بات تفصیل طلب ہوتی ہے، یا مخاطب کے لئے جلد اس کو سمجھنا دشوار ہوتا ہے، اس کے بعد جب وہ اس مسئلہ پر قلم اٹھاتا ہے تو اسکی تصنیف بہت کامیاب ہوتی ہے،

ادب و بیان| عربی ادب و بیان کے اعتبار سے محاسبی کا شمار چوٹی کے لکھنے والوں میں ہے، ان کی تصانیف میں فصاحت و بلاغت، سلاست و روانی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے، ان کا قلم رواں، بیان موثر اور زبان شیریں ہوتی ہے، جن لوگوں نے کتاب الرعایۃ، کتاب التوہم اور رسالۃ المسترشدین کا مطالعہ کیا ہے، ان کو اس کا اندازہ ہوگا، ان میں اتنی دلکشی ہے کہ ان کے پڑھنے سے طبیعت سیر نہیں ہوتی

تصوف| محاسبی کو زیادہ تر شہرت تصوف کی وجہ سے حاصل ہے، اس فن میں انکی تصانیف کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قرآن پاک، احادیث نبویہ، اقوال صحابہ اور اعمال سلف سے استدلال کرتے ہیں، صوفیہ کی شطحیات اور فلسفیانہ بحثوں سے بالکل تعرض نہیں کرتے، انکے تصوف کا محور علم وعمل کی اصلاح، مراقبہ خداوندی نفس کی رذائل وخبائث سے تطہیر، قرب الٰہی کے حصول کے طریقوں کی پیروی ہے، ان کی زندگی بڑی صاف ستھری تھی، اچھے مکان میں رہتے تھے، عمدہ لباس پہنتے تھے ابونصر سراج طوسی نے لکھا ہے،

کان للحارث دار حسنۃ و ثیاب نظاف[1] | حارث کا مکان عمدہ تھا اور کپڑے بھی عمدہ رکھتے تھے،

لیکن زہد کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت ایک درہم بھی پاس نہ تھا، ابن خلکان نے لکھا ہے،

مات وھو محتاج الی درھم[2] | وفات کے وقت پیسے پیسے کو محتاج تھے،

کتاب اللمع میں ایک اور واقعہ لکھا ہے، کہ ایک روز حارث محاسبی کے گھر ابوحمزہ صوفی آئے

---

[1] کتاب اللمع ص ۴۹۵ [2] وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۵۰،

حارث کے مکان میں ایک بکری بندھی تھی اچانک وہ زور سے میائی تو اس پر ابو حمزہ صوفی کو وجد آگیا انھوں نے کہا لبیک یا سیدی! کسی ابو حمزہ جیسے صوفی نے کہا ہے،

کسانیکہ یزداں پرستی کنند ۔۔۔ بآواز دولاب مستی کنند

مگر حارث محاسبی سخت برہم ہوئے اور کہا کہ یہ حرکت نہایت نازیبا ہے، اس سے توبہ کرو ورنہ ذبح کردو نکالو، اس سے ظاہر ہوتا ہو کہ وہ شطحیات صوفیہ سے کتنی دور تھے،

حارث کا عہد مع اللہ | جنید بغدادی جو محاسبی کے ارشد تلامذہ میں ہیں، فرماتے ہیں کہ حارث زاہدانہ اور فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے، ایک دن میں اپنے مکان کے دروازے پر بیٹھا تھا کہ وہ وہاں سے گذرے، میں نے ان کے چہرے پر بھوک کا شدید اثر محسوس کیا اور عرض کی چچا جان اگر آپ غریب خانے میں تشریف لاکر ما حضر تناول فرمائیں تو میری خوش قسمتی ہوگی، حارث نے کہا کچھ کھلاؤ گے؟ میں نے جواب دیا، میرے لئے یہ خدمت سعادت کا باعث ہے، اس گفتگو کے بعد ہم دونوں مکان میں آئے، میں اپنے چچا کے گھر سے جو قسم قسم کے کھانوں اور طرح طرح کے میوہ جات سے ہر وقت بھرا رہتا تھا، بہترین قسم کے کھانے اور پھل چن کر لایا، حارث نے اس میں سے ایک لقمہ اٹھایا اور اس کو چباتے رہے، مگر نگل نہ سکے اس کے بعد ایکبارگی کھڑے ہو گئے، اور مجھ سے کچھ کہے بغیر ہی روانہ ہو گئے،

دوسرے روز پھر ان سے ملاقات ہوئی، میں نے عرض کیا چچا جان کل آپ نے مجھکو خوش کرکے پھر ناراض کر دیا، حارث نے فرمایا صاحبزادے بھوک تو شدید تھی اور میں نے کوشش بھی کی کہ تمھارے لائے ہوئے کھانوں میں سے کچھ کھالوں، مگر اللہ جل شانہ سے یہ میرا عہد ہے کہ اگر کھانا مشتبہ ہوتا ہے تو اس کی بو میرے شامہ میں پہونچ جاتی ہے پھر میرا جی کھانے کو ہرگز نہیں چاہتا، چنانچہ لقمہ میں نے تمھاری دہلیز ہی میں ڈال دیا تھا،

۱؎ وفیات الاعیان ج ۱ ص ۲۹۵،

قشیری نے اس واقعہ میں اتنا اور اضافہ کیا ہو کہ میں نے عرض کیا، اچھا آج سہی، حارث تیار ہو گئے میں نے گھر میں جو روٹی کے سوکھے ٹکڑے پڑے تھے وہ جمع کر کے سامنے رکھدیئے، انھوں نے اسکو تناول کیا اور فرمانے لگے، جب کسی فقیر کے سامنے کھانا پیش کرو تو ایسا ہی ہونا چاہئے!

ابن خلکان نے یہ واقعہ دوسرے انداز سے نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں ا۔

"حارث محاسبی سے مروی ہو کہ جب وہ کسی کھانے کی جانب ہاتھ بڑھاتے اور اس میں کسی قسم کا شبہہ ہوتا تو انگلیوں کی ایک رگ پھڑک کے ملتی اور وہ اس سے ہاتھ کھینچ لیتے[۱]"

طہارت کے اقسام | اسلام نے ظاہری اور باطنی دونوں طہارتوں کو اہمیت دی ہی مگر طہارتِ باطن کی اہمیت زیادہ رکھی ہے، سلف صالحین ظاہری طہارت میں تدقیقات کو اچھا نہیں سمجھتے اور پاکی و ناپاکی میں کرید کرنا ناپسند کرتے تھے، بلکہ اس سے روکتے بھی تھے،

حضرت عمرؓ فاروق ایک قافلہ کے ساتھ مکہ معظمہ جا رہے تھے، عرب کے پہاڑی علاقوں میں کہیں کہیں آبشار ہوتے ہیں، ایک مقام پر ایک آبشار کا پانی حوض میں جمع کر دیا گیا تھا، جب قافلہ وہاں پہنچا تو حضرت عمرو بن العاصؓ نے مالک حوض سے پوچھا کہ تمھاری حوض پر درندے آکر پانی پیتے ہیں ؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہرگز نہ بتانا اور فرمایا" وہ اپنے وقت میں آتے ہونگے، اب ہماری باری ہے[۲]"

لیکن طہارت باطنی میں حلت و حرمت کا معاملہ ہوتا ہے، اس لئے اسلاف اس میں بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیقؓ ایک مرتبہ مکان میں تشریف لائے تو دودھ پیش کیا گیا آپ نے نوش فرمایا، بعد میں معلوم ہوا کہ دودھ مشتبہ تھا، تو انگلی سے قے کر ڈالی، اور فرمایا "ابوبکر کی موت آجائے تو اس سے دبہتر ہے کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ جہنم میں جلے "

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ اجتناب مشتبہات میں سلف صالحین کا کیا طریقہ رہا ہی،

---

[۱] وفیات ج ۱ ص ۱۴۴ ، [۲] موطا امام محمد باب الوضوء مما یشرب منہ السباع وتلغ فیہ ص ۱۶ ،

اجتناب مشتبہات کے متعلق اس سے بھی عجیب واقعہ قشیری اور ابن خلکان نے نقل کیا ہے، کہ حارث محاسبی کو ستر ہزار اشرفیاں باپ کی میراث سے حصہ مل رہا تھا، مگر انھوں نے اس سے ایک پیسہ بھی نہ لیا، کیونکہ ان کے والد قدری خیال کے تھے، اس لئے محاسبی نے ان کا تمام مال مشتبہ سمجھ کر حصہ لینا پسند نہیں کیا۔[1]

خدائی دستگیری: کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے اہل اللہ کی رہنمائی کیجاتی ہے، اس قسم کا محاسبی کا ایک واقعہ شعرانی اور مناوی نے نقل کیا ہے، کہ حارث کا بیان ہے کہ جب میں نے کتاب المعرفۃ لکھی تو مجھے یہ عجب ہوا کہ آج تک کسی نے ایسی کتاب نہیں لکھی، ایک روز میں شاداں و فرحاں اس کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایک نوجوان بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس مکان میں داخل ہوا، اور سلام کرتے ہی معرفت الٰہی کے متعلق سوال کیا کہ اللہ کا حق مخلوق پر ہے؟ یا مخلوق کا حق اللہ پر ہے؟

میں نے جواب دیا "اللہ کا حق مخلوق پر ہے"

سائل نے کہا: پھر تو اللہ جل شانہ کو خود اس مسئلہ کی تفصیل بیان کرنی چاہئے تھی تاکہ مخلوق کو معرفت خداوندی کا صحیح علم حاصل ہوتا،

میں نے کہا، نہیں مخلوق کا حق اللہ پر ہے،

سائل نے کہا، اللہ پاک ظلم کرنے سے بری ہے، یعنی جو بات انسانی دسترس سے باہر ہے، اس کا حکم نہیں دیتا،

اس کے بعد سائل چلا گیا، میں نے فوراً "کتاب المعرفۃ" کو پانی سے دھو دیا، اور عہد کیا کہ آیندہ معرفت میں کلام نہیں کرونگا۔[2]

---

[1] رسالہ قشیری ص ۱۵ و وفیات ج ۱ ص ۱۲۶، [2] طبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۷۴، الکواکب الدریۃ فی طبقات الصوفیہ ج ۱ ص ۲۰۹،

اسی قسم کا ایک واقعہ مشہور حنفی عالم قدوری رحمۃ اللہ علیہ کی جانب منسوب ہے، ان کی مختصر درس نظامی کی اہم کتاب ہے بلکہ مرغینانی کی ہدایہ بھی ایک طرح اس کی شرح ہی کہی جاسکتی ہے، ان کا واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی مختصر لکھنے کے بعد حج کیا، اور کتاب کا مسودہ بیت اللہ کے سامنے رکھکر دعا کی کہ خدایا اس میں مجھ سے جو فروگذاشتیں ہوگئی ہوں، ان پر مجھے کسی طرح آگاہ فرمادے، اس کے بعد مسودہ کھولا تو کئی جگہ عبارت محو شدہ ملی، وہ سمجھ گئے کہ وہ عبارتیں غلط مرقوم ہوگئی تھیں،

وفات | خطیب اور ابن السبکی نے امام ابو ثور سے نقل کیا ہے کہ میں حارث کی وفات کے وقت ان کے پاس موجود تھا، انھوں نے فرمایا، دیکھنا اگر سکرات میں مجھکو اچھا منظر نظر آیا تو میں ہنسوں گا ورنہ چہرے پر بُرے آثار ظاہر ہونگے، ابو ثور کہتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ہنسے اور وفات پاگئے[1]،

ملفوظات | محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بڑے حکیمانہ ہوتے ہیں، چند ملفوظات نقل کئے جاتے ہیں، فرماتے ہیں

(۱) ہر چیز کا ایک جوہر ہوتا ہے، انسان کا جوہر اس کی عقل ہے، اور عقل کا جوہر توفیق (خداوندی) ہے (دوسری روایت) عقل کا جوہر صبر ہے،

(۲) اس امت کے بہترین لوگ وہ ہیں جن کو آخرت (کی فکر) دنیا سے غافل نہ کرے، اور دنیا (کی لالچ) آخرت سے غافل نہ کردے،

(۳) خلق حسن کا مطلب اذیت کا تحمل کرنا، غصہ کم کرنا، خندہ جبینی اور میٹھے بول ہیں،

(۴) جس نے نعمت خداوندی کا شکر ادا نہ کیا، اس نے بربادی کو خود ہی دعوت دیدی،

(۵) ہر زاہد کا زہد اس کی معرفت کے اعتبار سے ہوتا ہے، اور معرفت عقل کے اور عقل قوت ایمانی کے تناسب ہوتی ہے،

(۶) ظالم نادم ہوتا ہے خواہ لوگ اسکی مدح سرائی کریں، مظلوم خوش رہتا ہے، خواہ لوگ

---

[1] تاریخ بغداد و طبقات الشافعیۃ الکبریٰ،

اس کی مذمت کریں، قانع مالدار ہوتا ہے خواہ بھوکا رہے، اور لالچی فقیر ہوتا ہے، خواہ گنج و دولت کا مالک ہو جائے،

(۷) جو اپنے باطن کو اخلاص و مراقبہ سے سدھار لیتا ہے، اللہ اس کے ظاہر کو مجاہدہ اور اتباعِ سنت سے آراستہ فرما دیتے ہیں،

(۸) جب کوئی انسان صلاح و تقویٰ سے آراستہ ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو خلق کی صلاح کا ذریعہ بنا دیتے ہیں، اور جب کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو خلق کی گمراہی کا سبب بنا دیتا ہے،

(۹) عبودیت کا مطلب یہ ہے، کہ اپنے نفس کے اختیار کا خیال ہی باقی نہ رہے یعنی تم یہ سمجھ لگو کہ میں اپنے نفع و ضرر کا مالک نہیں ہوں،

(۱۰) اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اور اللہ پاک کے درمیان سے مخلوق کا واسطہ نکال دو اور یاد رکھو نفس انسانی بھی ایک بڑی مخلوق ہے، جب تک نفسانیت کو عمل سے خارج نہ کرو گے اخلاص پیدا نہ ہو گا،

(۱۱) جو باطن کے لئے مجاہدہ کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو حسن معاملہ کی توفیق عطا فرماتا ہے، اور جو حسن معاملہ اور باطنی مجاہدہ دونوں سے بہرہ ور ہو گیا، اللہ تعالیٰ اس کو وصول الی اللہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے، وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا الخ

(۱۲) تین باتیں کمیاب بلکہ نایاب ہیں، (۱) حسن ظاہری پاکدامنی کے ساتھ (۲) خلق حسن دیانت داری کے ساتھ، (۳) بھائی چارگی امانت داری کے ساتھ،

(۱۳) دنیا کا خیال رہتے ہوئے اس سے کنارہ کش رہنا، زاہدوں کا طریقہ ہے، اور دنیا کو بالکل نسیاً منسیاً کر دینا عارفین کا مقام ہے،

تصانیف | محاسبی کی تصانیف کی تعداد بعض روایتوں کے مطابق دو سو تک ہے، ان میں سے (۱) کتاب الرعایۃ لحقوق اللہ عزوجل، (۲) کتاب التوہم، (۳) رسالۃ مسترشدین چھپ چکی ہیں، بعض غیر مطبوعہ تصانیف کے نام یہ ہیں، (۴) آداب النفوس (۵) شرح المعرفۃ (۶) البعث والنشور (۷) المسائل فی اعمال القلوب والجوارح (۸) المسائل فی الزہد وغیرہ (۹) ماہیۃ العقل ومعناہ واختلاف الناس فیہ (۱۰) کتاب فی الدماء (۱۱) کتاب التفکر والاعتبار (۱۲) رسالۃ الوصایا (۱۳) بدء من اناب الی اللہ تعالیٰ، (۱۴) التنبیہ علی اعمال القلوب فی الدلالۃ علی وحدانیۃ اللہ (۱۵) رسالۃ المراقبہ (۱۶) القصد والرجوع الی اللہ تعالیٰ (۱۷) کتاب النصائح (۱۸) مختصر کتاب فہم الصلوٰۃ (۱۹) کتاب العظمۃ (۲۰) شرح المعرفۃ وبذل النصیحۃ (۲۱) المکاسب الورع والشبہہ، وبیان محظورہا واختلاف الناس فی طلبہا والرد علی الغالطین فیہا،

تنقیدات | محاسبی پر تنقیدیں بھی کی گئی ہیں لیکن نہ سب کی سب درست ہیں نہ تمام نظر انداز ناقابل التفات ہیں، اس لئے ان پر بھی ایک نظر ڈالی جاتی ہے،

ناقدین کی فہرست میں سب سے پہلا نام حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، گو ان کی تنقید ہلکی ہے، مگر ان کی عظمتِ شان کی وجہ سے اس کا اثر زیادہ ہوا، اس کے بعد محدث ابو زرعہ کا نام ہے، ان کا لب ولہجہ بہت سخت ہے مگر ان کی طبیعت تیز واقع ہوئی تھی، اس لئے لوگوں نے ان کی تنقید کی طرف زیادہ توجہ نہیں کی، تیسرا نام ابن العربی مالکی محدث ومفسر کا ہے، جو محاسبی کے مرتبہ شناس بھی ہیں اور ناقد بھی، اس لئے ان کی تنقید صحیح ہے،

امام احمد کی تنقید | امام احمد نے محاسبی پر دو نقد کئے ہیں، پہلا تصوف کی راہ سے، دوسرا علم کلام کے اشتغال کی وجہ سے، خطیب نے تاریخ بغداد میں ایک واقعہ لکھا ہے:۔

اسمٰعیل بن اسحٰق سراج کہتے ہیں مجھ سے امام احمد نے فرمایا، مجھے اطلاع ملی ہے کہ حارث محاسبی

تمھارے گھر بہت آتے جاتے ہیں، تم ان کو اپنے یہاں بلاؤ اور مجھے اس طرح کہیں بٹھا دو کہ ان کی باتیں سن سکوں، مجھے امام احمدؒ کی یہ خواہش پسند آئی، میں اٹھ کر سیدھا حارث محاسبی کے پاس پہنچا اور عرض کی حضرت آج رات غریب خانہ پر تشریف لائیں اور اپنے شاگردوں کو بھی ساتھ لائیں، محاسبی نے فرمایا میرے شاگرد بہت ہیں، اس لئے تمھیں دعوت کرنے میں دشواری پیش آئیگی، اس لئے تم کھجور اور چھٹنی کے علاوہ کوئی اور اہتمام نہ کرنا، میں نے انکی پوری تعمیل کی،

محاسبی کو مدعو کرنے کے بعد میں امام احمدؒ کے پاس گیا، اور ان کو اطلاع کر دی، امام احمدؒ مغرب کے بعد تشریف لائے اور بالاخانے کے ایک کمرے میں بیٹھ گئے، ان کے بعد حارث محاسبی اور ان کے تلامذہ بھی آ گئے، کھانا کھانے کے بعد عشاء کی نماز پڑھی، نماز کے بعد سب حارث کے سامنے خاموشی سے بیٹھ گئے، اسی طرح آدھی رات گذر گئی، اس کے بعد ایک شاگرد نے کوئی سوال کیا حارث نے اس پر تقریر کی تمام تلامذہ خاموشی سے سنتے رہے پھر کوئی رونے اور کوئی چیخیں مارنے لگا، مگر حارث بدستور تقریر فرماتے رہے، میں اس درمیان میں بالاخانے پر گیا، تو دیکھا کہ امام احمدؒ روتے روتے بیہوش ہو گئے ہیں، اس لئے واپس چلا آیا، یہ منظر صبح تک قائم رہا، صبح ہوتے ہی حارث اور ان کے تلامذہ منتشر ہو گئے، میں دوبارہ بالاخانہ پر گیا تو امام احمدؒ متغیر الحال تھے، میں نے عرض کی حضرت! ان لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فرمایا مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے ان کے جیسے لوگوں کو کبھی دیکھا ہو، اور نہ حقائق و معرفت میں ایسی تقریر سنی، اب میں علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ تمھارا ان کی صحبت میں رہنا اچھا نہیں ہے،[1]

اس واقعہ میں امام احمدؒ نے محاسبی کے کمال کا اعتراف بھی کیا ہے اور سراج کو ان کی صحبت سے بچنے کی ہدایت بھی کی ہے، اسکی توجیہ میں حافظ ابن حجرؒ اور علامہ تاج السبکی لکھتے ہیں،

انما نهاه احمد عن صحبتهم لقصوره عن مقامهم فانهم في مقام ضيق	اسمٰعیل سراج محاسبی کے مقام سے فروتر تھے، اس لئے امام احمدؒ نے ان کی صحبت

[1] تاریخ بغداد ج ۸، ص ۲۱۴، ۲۱۵

لایسلکہ کل احد ویخاف	سے منع فرمایا، نیز محاسبی کی راہ بہت کٹھن
علی من یسلکہ ان لا یوفیہ	تھی، ہر شخص کا یہ دل گردہ نہیں کہ اس پر
حقہ[1]	چل سکے، اس لئے خطرہ تھا کہ وہ اس راہ
	کا صحیح حق ادا نہ کر سکیں گے، اسلئے ان کو روکا

حافظ ابن کثیر نے بھی ممانعت کی پہلی وجہ تو یہی لکھی ہے، اس کے علاوہ ایک دوسری توجیہ بھی فرمائی ہے،

یحتمل ان احمد کرہ لہ صحبتہم	یہ بھی ممکن ہے کہ محاسبی اگرچہ زاہد تھے
لان الحارث بن اسد وان	لیکن علم کلام سے اشتغال رکھتے تھے جو
کان زاھدا فانہ کان عندہ	امام احمد کو پسند نہ تھا، اس لئے اسمٰعیل
شئی من الکلام وکان احمد	سراج کو ان کی صحبت اختیار کرنے سے
یکرہ ذلک	منع فرمادیا ہو،

اس کے بعد اپنی ذاتی رائے لکھتے ہیں،

"میری رائے یہ ہے کہ امام احمد نے اس لئے منع فرمایا کہ محاسبی اور ان کے اصحاب کلام میں تقشف اور سختیاں تھیں جس کا شرع متین نے حکم نہیں دیا ہے، نیز وہ لوگ دین میں باریکیاں نکالا کرتے تھے، شریعت نے اس کا حکم بھی نہیں دیا ہے، چنانچہ جب ابو زرعہ محدث کے سامنے ان کی کتاب رعایہ لائی گئی تو انھوں نے فرمایا یہ بدعت ہے، اور کتاب لانے والے کو ہدایت فرمائی کہ تم کو مالک، ثوری، اوزاعی اور لیث کا طریقہ اختیار کرنا چاہئے اس کتاب کو ترک کردو اس لئے کہ یہ بدعت ہے[2]"

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۱۳۶ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۹ [2] البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۰،

یہ بھی ممکن ہے کہ امام احمد اپنا اور محدثین کا طریقہ اچھا سمجھتے ہوں، اور اس میں سالک لئے امن و حفاظت زیادہ سمجھتے ہوں، اس لئے سراج کو محاسبی کی مجالست ترک کرنے کی ہدایت فر

یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ واقعہ گو ابن کثیر، تاج الدین ابن السبکی، حافظ ابن حجر اور خطیب بغد وغیرہ نے نقل کیا ہے مگر حافظ ذہبی نے اس پر جرح بھی فرمائی ہے، وہ "میزان الاعتدال" میں لکھ

وهذه الحکایة صحیحة السند، منکرة لا تقع علی قلبی، استبعد وقوع هذا من مثل احمد،	[illegible]	اس واقعہ کی سند صحیح ہے، مگر خود واقعہ ناقابل قبول ہے، میرا دل اس پر مطمئن نہیں اور میں امام احمد جیسے شخص سے ا[1]

امام احمد کا دوسرا نقد علم کلام سے محاسبی کے اشتغال کی وجہ سے تھا، خطیب بغدادی نے لکھا:

وکان احمد بن حنبل یکره للحارث نظره فی الکلام وتصانیفه الکتب فیه ویصد الناس عنه[2]	[illegible]	حارث کا علم کلام سے اشتغال اور اس فن میں ان کی تصنیفات امام احمد کو ناپسند تھیں اور وہ لوگوں کو اس سے ۲

ابن السبکی نے طبقات الشافعیہ میں لکھا ہے:-

"امام احمد علم کلام سے اشتغال رکھنے والوں پر کڑی تنقید فرمایا کرتے تھے اس خیال سے کہ اس کی وجہ سے لوگ غلط راہ پر نہ جا پڑیں، اور یہ واقعہ ہے کہ بلا ضرورت علم کلام میں گفتگو کرنے سے اجتناب ہی اولیٰ ہے، اور جب تک ضرورت نہ ہو اس میں گفتگو کرنا بدعت ہے، حارث محاسبی نے بھی علم کلام سے کچھ مباحث میں کلام فرمایا تھا، ابو القاسم نصرآبادی کہتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ امام احمد نے اسی وجہ سے حارث کا بائیکاٹ کر دیا تھا"[3]

۱؎ مقدمہ رسالۃ المسترشدین ص ۱۶، ۲؎ تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۴،

۳؎ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۹،

تاج الدین ابن السبکی کی رائے یقیناً قابل عمل ہے، مناوی نے بھی جامع صغیر سیوطی کی شرح فیض القدیر میں لکھا ہے ۔

"ابن عربی (صوفی فلسفی) فرماتے ہیں علم کلام کی عظمت شان کے باوجود بہت سے لوگوں کو اس کی قطعاً حاجت نہیں ہے، شہر میں ایک شخص علم کلام کا ماہر کافی ہے، اس کے برخلاف فروعات دین کے علماء کی کثرت ہونا ضروری ہے، اگر کوئی مرجائے اور اس کو علماء نظر و فکر کی اصطلاحات معلوم نہ ہوں کہ جوہر، عرض، جسم، جسمانی اور روح روحانی کیا ہوتا ہے، تو اس کی بلا بازپرس نہ ہوگی، البتہ لوگوں سے فروعات و اعمال کا ضرور سوال ہوگا" [1]

مذکورہ تنقید کا پس منظر | لیکن جب لوگوں میں عقائد کی خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں تو سالکین کی اصلاح کے لئے اس کی اصلاح اہم چیز ہو جاتی ہے، جب تک مسترشدین کا عقیدہ صحیح نہ ہوگا اصلاح کا صحیح ثمرہ رونما نہ ہوگا، چنانچہ جب مسلمانوں میں فلسفۂ یونان منتقل ہوا، اور بہت سے عجمی اسلام کا لبادہ اوڑھکر اسلام کی بنیاد پر تیشہ زنی کرنے لگے تو صوفیا خصوصاً حارث محاسبی علیہ الرحمۃ نے اصلاح خلق کا طریقہ یہی سوچا کہ لوگوں کے عقائد کی پہلے اصلاح کیجائے اور عمل کی اصلاح کو دوسرا زینہ قرار دیا جائے، اس کے لئے انھوں نے علم کلام میں تصنیفات کا سلسلہ شروع کیا، حارث رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا ذاتی تجربہ تھا، کیونکہ ان کے والد قدری تھے [2]، لیکن محدثین کی ایک جماعت اس طریقہ کو ناپسند کرتی تھی، اس کا کہنا تھا کہ اس طریقۂ اصلاح میں جس طرح سدھرنے کا احتمال ہوتا ہے بھٹکنے کا بھی ہوتا ہے، اس لئے اصلاح اعمال حسنہ کے پہلو سے ہونی چاہئے، اسی خیال کے پیش نظر وہ لوگ پہلے طریقہ والوں پر کڑی تنقید فرمایا کرتے تھے، حارث محاسبی پر امام احمدؒ نے جو تنقید فرمائی ہے وہ بھی اسی کے تحت ہے [3]، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں کا مقصد نیک اور مقصود

---

[1] فیض القدیر ج ۴ ص ۱۲۲ [2] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۵ [3] وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۱ ص ۴۹۴

ایک ہے ع عبادانتا شتی وحسنک واحد

امام احمد کی تنقید کا اثر | خطیب وغیرہ نے لکھا ہے کہ چونکہ بغداد میں امام احمد کا اثر و رسوخ تھا اس لئے ان کی تنقید کا اثر یہ ہوا کہ حارث محاسبی کو روپوش ہو جانا پڑا، اور اسی حالت میں ان کی وفات بھی ہوگئی، صرف چار آدمی نے ان کی نماز جنازہ ادا کی[1]

واقعہ کی اصلیت | لیکن حافظ ذہبی نے اس واقعہ پر بھی جرح فرمائی ہے، وہ میزان میں لکھتے ہیں کہ

هذه حکایة منقطعة[2] یہ واقعہ سند متصل سے ثابت نہیں ہے،

محدث ابو زرعہ کی تنقید | ابو زرعہ محدث کی تنقید کا نہج عجیب ہے، خطیب نے اپنی سند کے ساتھ سعید بن عمرو بردعی سے نقل کیا ہے،

"بردعی کہتے ہیں میں مجلس میں تھا کہ ابو زرعہ سے محاسبی اور ان کی تصنیفات کے متعلق سوال کیا گیا، ابو زرعہ نے سائل سے فرمایا تم کو ان کی کتابوں سے اجتناب کرنا چاہیئے، وہ بدعت و ضلالت کا مجموعہ ہیں، تم کو نقل و آثار پر قناعت کرنا چاہیئے، یہ حارث کی کتابوں کا نعم البدل ہیں"

پوچھا گیا، محاسبی کی کتابوں میں عبرت کی باتیں بھی ہوتی ہیں؟

ابو زرعہ نے فرمایا جس کو قرآن پاک میں عبرت نظر نہ آئے اس کو ان کتابوں میں کیا عبرت نظر آئیگی؟ کیا تم بتلا سکتے ہو کہ مالک بن انس، سفیان ثوری، اوزاعی، اور ائمہ متقدمین نے خطرات و وساوس اور عیوب نفسانی کی اصلاح کے متعلق کوئی تصنیف کی ہے، صوفیا اہل علم کے طریق کے خلاف جا رہے ہیں، وہ کبھی حارث محاسبی کو پیش کرتے ہیں کبھی عبد الرحیم دیبلی کو کبھی حاتم اصم کو کبھی شقیق بلخی کو، تعجب ہے کہ کس قدر جلد یہ لوگ بدعات

---

[1] تاریخ بغداد ج ۸ ص ۱۵ اور وفیات الاعیان ابن خلکان ج ۱ ص ۲۴۹ [2] میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۹۹

کی طرف بڑھے جا رہے ہیں[1]؟!

ابوذرعہ کی تنقید کی وجہ اس زمانہ میں جب محدثین کا دور دورہ تھا، وہ جب اپنے طور و طریق سے کسی کو ہٹا ہوا دیکھتے تو اس پر کڑی سے کڑی تنقید کرتے تھے، اس کی ایک مثال معجم الادباء میں ہے، یاقوت نے امام شافعیؒ کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ مصعب بن زبیر کہتے ہیں کہ میرے والد اور امام شافعیؒ کبھی کبھی شعر خوانی کیا کرتے تھے، ایک روز امام شافعی نے ہذیل کے اشعار سنائے اور فرمایا کسی اہل حدیث سے اسکا ذکر نہ کرنا کیونکہ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتے[2]،

امام احمد اور محدث ابوذرعہ کی تنقید بھی اسی قبیل کی ہے، خصوصاً ابوذرعہ کے مزاج شناس کو یہ تنقید قطعاً عجیب معلوم نہ ہوگی بلکہ وہ اس کو ہلکی ہی سمجھیں گے، امام ابوحنیفہؒ پر جو تنقیدات کی گئی ہیں اسکو بھی اسی آئینہ میں دیکھ لینا چاہئے،

تنقید کی ایک اور وجہ مذکورۂ بالا وجوہ کے علاوہ حافظ ابن رجب حنبلی نے اس کی ایک اور وجہ بیان فرمائی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

> "امام احمد وغیرہ نے وساوس و خطرات نفسانی کے متعلق گفتگو کرنے والے صوفیا پر اس لئے تنقید کی ہے کہ ان کی گفتگو اور بحث کسی دلیل شرعی پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ محض رائے اور ذوق ان کی دلیل ہوتی ہے تو جس طرح علم حلال و حرام میں محض ظن و قیاس سے بلا دلیل شرعی گفتگو کرنا مذموم ہے، اسی طرح امام احمد وغیرہ صوفیاء کے اس طریقہ کو بھی مذموم سمجھتے تھے[3]"

مگر اس کو تنقید کا سبب بتانا چند وجوہ سے غلط ہے، (۱) یہ چیز ایسی نہیں ہے کہ اس پر اتنی کڑی تنقید کی جائے، (۲) علم حلال و حرام اور فروعات دین کا مقام اور ہے اور وساوس

---

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۱۵ [2] معجم الادباء ج ۶ ص ۳۹۱ [3] جامع العلوم والحکم ص ۲۰۰، رجب حنبلی ص ۲۲۳۔

وخطرات نفسانی کا پتہ لگا کر ان کا علاج بتانا دوسری حیثیت رکھتا ہے، دونوں کو ایک پلہ میں رکھنا مناسب نہیں ہے، (۳) بڑے بڑے صوفیا جب اس موضوع پر کلام کریں گے تو ان کے لئے ہر بات کی دلیل لانا مشکل ہو جائیگا، وہ ایک بات بتلائیں گے جس کا جی چاہے مانے جس کا جی نہ چاہے نہ مانے البتہ علم حلال وحرام کے معاملہ میں بلا دلیل شرعی لب کشائی کرنا جرم عظیم ہے اور اس کا ماننا ضروری ہے،

تیسرا نقد | بعض ناقدین نے محاسبی پر ایک اور گرفت کی ہے کہ وہ اپنی تصانیف میں احادیث ضعیفہ بلکہ موضوعات تک لاتے ہیں، اسی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ان پر اعتماد کرکے ان کو اصول کا قرار دے دیتے ہیں، چنانچہ ابو بکر بن العربی مالکیؒ جو محاسبی کے بڑے مداح ہیں، ان پر تنقید کی ہے، ترمذی شریف کی حدیث "الحلال بین والحرام بین الخ"، کی شرح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس حدیث کی شرح میں جن علماء نے لب کشائی کی ہے، ان میں جلیل القدر کبیر الشان عالم حارث بن اسد محاسبی ہیں، انھوں نے عطیہ سعدی کے اس قول کو جو انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ "لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتی یترك ما لا بأس به مخافة ما به بأس" (کوئی شخص حقیقی پرہیزگار اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک مباحات کو محظورات کے خطرے کی وجہ سے ترک نہ کردے) اور اس قبیل کی دوسری روایات وآثار کو اصول بنا دیا ہے اور اس پر طویل کلام فرمایا ہے، ان کی پوری بحث وتکرار کے باوجود افادہ سے خالی نہیں ہے، انھوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے بالکل بیکار ہے، کاش وہ احادیث ضعیفہ سے تعلق نہ رکھتے، اور ان کو اپنے اصول کا مبنیٰ نہ قرار دیتے،

اگر علمائے حدیث کو اس سے واقفیت ہو جائے تو وہ ان کا مذاق اڑائیں گے حالانکہ محاسبی فن حدیث کے چوٹی کے ائمہ سے ملاقات رکھتے ہیں، جیسے ابو بکر بن شیبہ وغیرہ،

اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے جو امام احمدؒ سے مروی ہی کہ ورع و تقویٰ کے باب میں نرم ضعیف احادیث لانا جائز ہے،

لیکن اللہ تعالیٰ امام بخاریؒ پر رحمت نازل فرمائے جن کا معلوم نظریہ تھا کہ مومن کا قلب صرف صحیح احادیث کے ساتھ مربوط ہونا چاہئے، اور دین کا مدار صرف قوی احادیث پر رکھا جائے، ہمارا بھی یہی خیال ہے، اور اگر ہم امام احمدؒ کے مذہب کو بھی لیں تو ہمارے نزدیک ضعیف احادیث کا لانا صرف مواعظ و عبر میں تو صحیح ہو سکتا ہے، مگر اصول دین میں ان کو لانا کسی طرح روا نہیں ہے[1]"

محاسبی پر جن بزرگوں نے تنقید کی ہے ان میں صحیح تنقید صرف ابن العربی کی ہے، کیونکہ محاسبی کی ہر تصنیف اس قسم کی احادیث سے مملو نظر آتی ہے، رسالۃ المسترشدین میں بھی کئی احادیث اس قسم کی ہیں، جو ضعیف یا موضوع ہیں، اس کے علاوہ وہ اپنی تصانیف میں اسرائیلیات بھی لاتے ہیں

تصوف و رقاق میں سب سے پہلے مصنف محاسبی ہیں، اس لئے ان کے اس غلط طرز کا اثر بڑا دور رس ثابت ہوا، ابوطالب مکی کی "قوت القلوب" اور امام غزالیؒ کی "احیاء العلوم" وغیرہ کتب تصوف میں جو اس قسم کی احادیث ملتی ہیں اسکا سبب محاسبی کا تسامح ہو، انھوں نے اس قسم کی روایات کو اپنی تصنیفات میں جگہ دی، اسلئے بعد کے آنے والوں نے انکی اتباع میں ان احادیث کو اپنی اپنی تصنیفات میں درج فرما دیا اور اس طرح محاسبی خود اپنے ہی ملفوظ کا مصداق بن گئے کہ

"جب بھی کوئی انسان صلاح و تقویٰ سے ہمکنار ہوتا ہی تو اللہ تعالیٰ اسکو ایک خلق کی صلاح کا ذریعہ بنا دیتے ہیں اور جب کوئی انسان گمراہی میں مبتلا ہوجاتا ہو تو اللہ تعالیٰ اسکو ایک خلق کی گمراہی کا سبب بنا دیتے ہیں"

اللہ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے محاسبی اور انکے متبعین کی اس فرو گذاشت سے درگذر فرمائے، و ما ذالک علیہ بعزیز۔

---

[1] عارضۃ الاحوذی شرح جامع ترمذی مصری جلد ۹ ص ۲۰۱،

معانی الآثار امام طحاوی

از مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دارالمصنفین

یہ امام طحاوی کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، جو ان کے علمی کمالات، فقہ و اجتہاد میں بصیرت، حدیث اور رجال میں ژرف نگاہی، کثرت مطالعہ اور وسعت نظر کا بے مثال نمونہ ہے،

اہمیت: معانی الآثار کو حدیث کی کتابوں میں بڑی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس میں فقہ و حدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں اور یہ جس درجہ حدیث کی کتاب ہے، اسی درجہ فقہ کی بھی ہے، اکابر علمائے حدیث نے اس کی مدح و تحسین کی ہے، علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہمپایہ قرار دیا ہے[۱]، امیر اتقانی کا بیان ہے کہ "اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت و شان اور بلند پایگی میں کلام ہو تو سے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہئے، حنفی مذہب کا کیا ذکر جملہ مذاہب میں بھی ایسی مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی[۲]"، مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں،

"ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابو داؤد کے قریب قریب ہے، کیونکہ اس کے تمام روات معروف و مشہور ہیں گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے، اس کے بعد ترمذی اور پھر ابن ماجہ کا درجہ ہے[۳]"، مولانا عبد الرشید نعمانی نے علامہ عینی کے حوالہ سے تحریر کیا ہے کہ

"... امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پُر از منفعت ہیں، خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اسے حدیث کی اکثر مشہور و مقبول کتابوں سے بھی راجح پائیگا"

۱؎ الحاوی ایضاً ج ۱ ص ۲ ۲؎ کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۴۹-۱۰۰۰ ۳؎ فیض الباری ج ۱ ص ۵۰-۵۵

سنن ابو داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے، کیونکہ اس کے اندر وجوہ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں اور ناسخ و منسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے، اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اسکے بعض رجال ضعیف اور مرتبہ ثقاہت سے فروتر ہیں، حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے، بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے، سنن دارقطنی بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کی اہمیت اور عظمت کے مخفی رہنے کا سبب یہ ہوا کہ وہ عام لوگوں کے ہاتھ نہیں لگی، اسلئے وہ اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کر سکے اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کر سکے، یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشہ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بیخبر رہے[1]، ان اقوال سے معانی الآثار کی اہمیت ظاہر ہو جاتی ہے،

موضوع اور مقصد تالیف

امام طحاوی نے خود لکھا ہے کہ: مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احکامی روایات و آثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ و منسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت واقفیت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم کہ ان میں تضاد و اختلاف ہے، دور ہو جائے، اس لئے اس کتاب میں ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید اور واجب العمل روایات نیز علماء کی تاویل و توجیہ، ان کے دلائل و شواہد اور مرجح و مختار مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجیح کے دلائل اور وجوہ بھی نقل کئے گئے ہیں، اور اس کی تائید میں کتاب سنت، صحابہ و تابعین کے آثار اور اجماع وغیرہ کا حوالہ بھی دیا گیا ہے اور ان مباحث میں غور و خوض

---

[1] ما تمس الیہ الحاجۃ ص ۳۰

بحث و تفتیش اور تلاش و تحقیق میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا گیا،

کتاب کی نوعیت اور اس کے مباحث میں کاوش اور دیدہ ریزی کا اندازہ حسب ذیل تلخیص سے کیا جا سکتا ہے۔

وضو میں سر کے مسح کی فرضیت کا مسئلہ | وضو میں سر کا مسح فرض ہے لیکن یہ اختلاف ہے کہ سارے سر کا مسح کیا جائیگا یا صرف بعض حصہ کا، امام طحاوی نے پہلے ان روایتوں کو نقل کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے سر کا مسح فرض ہے، اس کے بعد وہ ان پر تبصرہ کرتے ہیں،

"ان احادیث کی بنیاد پر بعض لوگوں کے نزدیک سارے سر کا مسح فرض ہے، اگر کوئی حصہ چھوٹ گیا تو وضو درست نہیں ہوگا، مگر دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ہم کو بھی یہ تسلیم ہے کہ سارے سر کا مسح کرنا چاہیے، لیکن اسکی فرضیت میں کلام ہے، کیونکہ رسول اللہ صلعم کے عمل سے اسکی کوئی دلیل فراہم نہیں ہوتی، آپ سے وضو میں اعضا کو تین تین مرتبہ دھونا بھی ثابت ہے لیکن آپ یہ اس بنا پر نہیں کرتے تھے کہ تین تین بار دھونا فرض ہے، اور اس سے کم دھونا کافی نہیں ہے، بلکہ صرف افضلیت کی وجہ سے ایسا کرتے تھے، اسی طرح پورے سر کا مسح کرنا اولیٰ ہے لیکن اگر پورے سر کا مسح نہ کیا جائے تو بھی وضو ہو جائیگا، کیونکہ ایسی حدیثیں بھی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ صرف سر کے بعض حصہ کا مسح کافی اور ضروری ہے"

اس کے بعد انھوں نے اس مفہوم کی جملہ مرویات نقل کی ہیں اور ان کے اسناد و متون اور معانی و منشاء پر تبصرہ کرکے دکھایا ہے، کہ بعض حصہ کا مسح کرنا ہی فرض ہے، باقی جن روایتوں میں پورے سر کے مسح کا ذکر ہے، ان سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارے سر کا مسح اولیٰ و افضل ہے نہ کہ فرض و واجب،

یہاں تک تو مجرد آثار و احادیث کی روشنی میں مسئلہ کی توضیح و تنقیح کی گئی تھی اور یہ دکھایا گیا تھا کہ اس باب کی حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، آخر میں وہ عقلی اور نظری حیثیت سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ سر کے بعض ہی حصہ کا مسح فرض ہے، چنانچہ لکھتے ہیں،

---

[1] معانی الآثار ج ۱ ص ۱۰ ،

وضو میں بعض اعضا کا دھونا اور بعض کا مسح کرنا فرض ہے، اعضاء مغسولہ چہرہ، دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں ہیں، ان کے بارہ میں عام اتفاق ہے کہ جس حد تک دھوئے جانے کا حکم دیا گیا ہے اس حد تک دھونا فرض ہے، اگر ان میں ذرا بھی کمی کی گئی تو وضو درست نہ ہوگا، اعضا ممسوحہ میں سر اور ضعیف قول کے مطابق پاؤں بھی داخل ہیں، سر کے بارہ میں اختلاف ہے بعض لوگوں نے اعضاء مغسولہ پر قیاس کر کے سارے سر کا مسح فرض بتایا ہے حالانکہ اعضاء مغسولہ پر ممسوحہ کا قیاس غلط ہے، البتہ اسکو مسح علی الخفین پر قیاس کرنا چاہئے، گو اس کے متعلق بھی کسی قدر اختلاف ہے، تاہم فی الجملہ سب متفق ہیں کہ بعض حصہ کا مسح کر لینا درست اور کافی ہے، ایسی حالت میں قیاس و نظر کا تقاضا یہ ہے کہ مسح راس کا حکم بھی خفین کے مسح کی طرح ہو یعنی بعض حصہ کا مسح کر لینے سے فرضیت ادا ہو جائیگی تاہم اولیٰ اور افضل سارے سر کا مسح کرنا ہے، یہی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا مسلک ہے، اور صحابہ و تابعین کے عمل سے اسکی توثیق ہوتی ہے، امام زہری سالم سے اور وہ اپنے والد حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے متعلق روایت کرتے ہیں کہ "انہ کان یمسح بمقدم رأسہ اذا توضاءؓ"

اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کا عام انداز بیان اور طریقہ تصنیف یہ ہے کہ وہ اختلافی امور و مسائل میں پہلے مرجوح مسلک کی مؤید روایات نقل کرتے ہیں، اس کے بعد اس مختلف اور مرجح مسلک کی حدیثیں اور ان کے مویدات ذکر کر کے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کی تائید میں دلائل و ثبوت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہو جاتا ہے، اور ان میں کمل تطبیق بھی پیدا ہو جاتی ہے مثلاً اس بحث میں جس کی تلخیص کی گئی ہے انھوں نے دونوں قسم کی روایتوں کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن ان کے محل کی ایسی تعین کی ہے جو روایات اور قیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے اور آخر میں احناف کے ائمہ ثلاثہ کا مسلک بیان کر کے اس کی تائید میں صحابہ و تابعین کے آثار پیش کئے ہیں، (معانی الآثار ج ۱ ص ۱۷، ۱۸)

امام طحاویؒ کا یہ مختلف و متضاد روایات میں تطبیق کا ایک اصول تھا، اس اصول کے مطابق انھوں نے ان روایات کو اولیٰ اور غیر اولیٰ پر محمول کرکے ان کے ظاہری اختلاف و تضاد کو دور کیا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ بعض روایات ناسخ اور بعض منسوخ ہوتی ہیں، لیکن عدم واقفیت کی بنا پر ظاہر بیں نگاہوں کو ان میں تضاد نظر آتا ہے، ایسے موقع پر امام طحاویؒ بحث و تنقیح کے بعد دلائل کی روشنی میں ناسخ و منسوخ میں امتیاز کرکے دکھلاتے ہیں کہ اس باب میں کوئی تضاد نہیں ہے،

تیسرا اصول یہ ہے کہ مطلق و مقید یا مجمل اور مفصل اور خاص و عام روایات کا خیال نہ کرنے کی وجہ سے ان میں تناقض نظر آتا ہے، اس لئے امام طحاویؒ نے مطلق و مقید، مجمل اور مفصل اور خاص و عام روایات کی تعیین و توجیہ کرکے دکھایا ہے، کہ فی الواقع ان میں کوئی تضاد و اختلاف نہیں ہے،

چوتھا اصول یہ ہے کہ اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو تحقیق و تنقیح کے بعد صحیح اور قوی روایات کو تسلیم کیا جائیگا، اور ضعیف اور کمزور حدیثوں کو مناسب توجیہ نہ ہونے کی صورت میں رد کر دیا جائیگا،

پانچواں طریقہ یہ اختیار کیا ہے کہ اصول اور کلیات شرع کی روشنی میں احادیث کا جائزہ لیکر ان کی ایسی تاویل و توجیہ کی ہے کہ ظاہری اختلاف ختم ہو جاتا ہے،

چھٹا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر روایت کے مقابلہ میں غیر متواتر حدیث کو ساقط قرار دیا جائیگا،

امام طحاویؒ نے روایات کے اختلاف کو رفع کرنے کے لئے یہ جو چند اصول اختیار کئے ہیں ان میں سے کوئی اصول ایسا نہیں ہے جو ترک حدیث کا باعث ہو کیونکہ انھوں نے جن روایات کو ساقط بھی کیا ہے ان کو مکمل تحقیق و تنقیح کے بعد صریح اور واضح دلائل کے بعد کیا ہے،

امام طحاویؒ نے اس کتاب میں زیادہ تر اکابر احناف یعنی امام ابو حنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور

امام محمد رحمہم اللہ کے مسلک کو ذکر کرنے کا التزام کیا ہو، لیکن دوسرے فقہا مثلاً احناف میں امام زفرؒ اور دوسرے مذاہب میں امام مالکؒ، امام اوزاعیؒ، سفیان ثوریؒ، اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہ کے مسالک کی بھی کہیں کہیں تصریح کی ہے، اور بعض مسائل کے متعلق بتایا ہے، کہ وہ متفق علیہ ہیں، صحابہ میں جن بزرگوں کے مسلک نقل کرتے ہیں اُن کے نام یہ ہیں، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ، اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ، اور تابعین میں سعید بن مسیب، سعید بن جبیرؒ، نافع مولیٰ ابن عمرؓ، خارجہ بن زید، عبد اللہ بن عبد اللہ بن عمرؓ، سالم بن عبد اللہ، عمر بن عبد العزیزؒ، قاسم بن محمد، عروۃ، ابن شہاب، عبد الرحمٰن اعرج، عطا بن ابی رباح، عکرمہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، شعبی اور طاؤس وغیرہ،

امام طحاوی حنفی ہونے کے باوجود خود مجتہد اور صاحب فقہ تھے، عام طور پر اُن کو مجتہد منتسب اور مجتہد فی المذہب تسلیم کیا گیا ہے، اس لئے انھوں نے مختلف فیہا مور و مسائل میں محاکمہ کر کے مرجح و مختار مسلک کی نشاندہی کی ہے، اکثر وہ ائمہ ثلاثہ (یعنی امام اعظم اور صاحبین) کے مسلک کو جن کے اقوال عموماً انھوں نے نقل کئے ہیں، ترجیح دیتے ہیں، لیکن اگر اُن میں خود کسی مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے تو اُن میں سے کسی ایک کے مذہب کو تحقیق و استدلال کے بعد ترجیح دیتے ہیں، مثلاً بلی کے جو ٹھے کو امام اعظم مکروہ بتاتے ہیں، لیکن صاحبین کے نزدیک اس میں کوئی کراہت نہیں، امام طحاوی نے اپنے اصول اور طریقۂ بحث کے مطابق ہر فریق کے دلائل اور اُن کے مستدلات کی تفصیل بیان کر کے صاحبین کے مسلک کو مرجح اور امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے۔[۱]

۱؎ معانی الآثار جلد اول ص ۱۱ و ۱۲،

اسی طرح کبھی انھوں نے امام صاحب کے مقابلہ میں صاحبین کے مسلک کو مرجح بتایا ہے، جیسے صلوٰۃ کسوف میں امام صاحب سری قرأت کے اور صاحبین جہری قرأت کے قائل ہیں امام طحاوی کے نزدیک بوجوہ صاحبین کا مسلک قوی ہے[۱]

اسی طرح کبھی صرف امام ابو یوسف اور کبھی صرف امام محمد اور کبھی امام ابو حنیفہ و امام ابو یوسف اور کبھی امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے مسلک کو مرجح بتایا ہے،

بعض مواقع پر وہ حنفی مذہب کے ان اساطین ثلاثہ کے مقابلہ میں اسی مذہب کے دوسرے ائمہ کے حق میں فتوی دیتے ہیں، مثلاً کتاب النصاح میں ایک جگہ امام زفر کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

فھٰذا ھو النظر فی ھذا الباب	نظری حیثیت سے اس کے متعلق ائمہ
کما قال زفر لا کما قال ابو	ثلاثہ کے مقابلہ میں امام زفر کا مذہب
حنیفہ و ابو یوسف و محمد	قوی ہے،
رحمھم اللہ[۲]	

بعض اوقات حنفی مذہب کے مقابلہ میں دوسرے ائمہ فقہ کے اقوال کو ترجیح دیتے ہیں، اور سب کے برعکس اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں، مثلاً طواف کی نماز کے متعلق ائمہ احناف کا خیال ہے کہ وہ ممنوع اوقات میں نہیں پڑھی جاسکتی، لیکن بعض علما کے نزدیک عصر کے بعد اصفرار سے قبل اور فجر کے بعد طلوع سے پہلے پڑھی جاسکتی ہے، امام طحاوی دلائل عقل و نقل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں، کہ عطاء، ابراہیم، اور مجاہد کا مسلک جس کی بنیاد حضرت ابن عمرؓ کی حدیث پر ہے مرجح اور جاذب رجحان ہے، اسی جانب ہم سفیان ثوری کا بھی یہی خیال ہے گو ہمارے ائمہ ثلاثہ اس کے مخالف ہیں[۳]

---

[۱] معانی الآثار ج اول صفحہ ۱۹۷، [۲] ایضاً جلد ۲ ص ۱۳، [۳] ایضاً ج ۱ ص ۲۹۷،

احناف پر ترکِ حدیث اور تقدیم قیاس کا الزام غلط ہے

علمائے احناف پر ایک عام اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ روایات کے مقابلہ میں قیاس و درایت کی ترجیح و تقدیم کے قائل ہیں، لیکن یہ اعتراض غلط فہمی کا نتیجہ ہے، خود امام طحاوی صحیح و ثابت حدیث کے مقابلہ میں قیاس و رائے کو مطلق اہمیت نہیں دیتے، اسی اصول کی بنا پر انھوں نے بعض مسائل میں اپنے مذہب کے ائمہ کے اقوال سے اختلاف کیا ہے، ایک جگہ صاحبین کے مسلک کی وجہ ترجیح یہ بیان کرتے ہیں،

والقول الاول الذی ذہب	پہلا مسلک جس کو صاحبین نے اختیار
الیہ ابو یوسف و محمد رحمہما	کیا ہے، ہمارے نزدیک زیادہ صحیح
اللہ اصح القولین عندنا لموافقتہ	اسلئے کہ وہ روایتِ رسول کے موافق
لما قد روینا عن رسول	اور مطابق ہے،
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واللہ اعلم[1]	

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ فقہی حیثیت سے اس کتاب کا کیا پایہ ہے،

احادیث و روایات کی حیثیت سے بھی اس کی بڑی اہمیت ہے، روایات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں امام طحاوی نے بڑی دقتِ نظر سے کام لیا ہے، محدثین کے یہاں روایات کو جانچنے اور پرکھنے کی جو کسوٹی ہے، اس کی روشنی میں انھوں نے احادیث کا مفصل جائزہ لیا ہے، اور جس طرح انھوں نے احادیث سے احکام و مسائل کا استخراج و استنباط کیا ہے، اسی طرح روایات کی چھان بین اُن کے متون اور طرق کی معرفت اور رجال و رواۃ کی جانچ کی ہے، رطب و یابس حدیثوں میں امتیاز کا بھی ان کو خاص ملکہ حاصل تھا، گو رجال وغیرہ کے متعلق زیادہ معلومات اس کتاب میں نہیں ہیں، کیونکہ مصنف کا اصل مقصود تو معارض و مختلف روایات میں جمع و تطبیق

---

[1] معانی الآثار، ج دوم ص ۶۳،

اور توفیق کے لطیف و دقیق وجوہ بیان کرکے ان کے تضاد کو رفع کرنا اور وجوہ ترجیح اور طرق استدلال وغیرہ کا ذکر کرکے صحیح قول کو مستنبط کرنا ہے تاہم انھوں نے اصول حدیث اور رجال پر بھی محققانہ بحث اور روایت کے ارسال، انقطاع، وقف اور رفع و اتصال، صحیح و غلط، صالح و فاسد، غریب و معروف ضعیف و قوی روایات کی نشاندہی کی ہے، اور اسناد و متون پر ناقدانہ بحث کرکے اُن کا حسن و قبح ظاہر کیا ہے، روایت و درایت دونوں حیثیتوں سے حدیث کو پرکھا ہے اور رجال کے خصائص و محاسن اور رذائل و دسائس پر روشنی ڈالی ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو اس سے حنفیہ اور خصوصاً امام طحاوی پر ترک حدیث کے الزام کی تردید بھی ہوتی ہے،

"تشہد کے متعلق جلہ صحابہ کی مرویات جن کو ہم بیان کرچکے ہیں یہی ہیں، صرف حضرت عمرؓ کی حدیث جو گذر چکی ہے، اُن کے خلاف ہے گویا تشہد کے بارہ میں متواتر روایات موجود ہیں، اور اُن کے خلاف کوئی چیز ثابت نہیں، اس لئے ان متواتر روایتوں کی مخالفت کرکے کسی اور چیز کو اختیار کرنا درست نہیں ہے، البتہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں لفظ "مبارکات" کا اضافہ ہے اس لئے بعض لوگوں نے اس اصول کی بنا پر کہ زائد کو ناقص کے مقابلہ میں اختیار کرنا زیادہ بہتر اور اولیٰ ہے، ان کی روایت کو قابل ترجیح قرار دیا ہے لیکن دوسرے علمار کا خیال ہے کہ ابن مسعودؓ، ابن عمرؓ، اور ابو موسیٰؓ کی روایات زیادہ بہتر ہیں، کیونکہ اُن کے طرق کے بالکل ٹھیک ہونے پر سب لوگوں کا اتفاق ہے، چنانچہ ابوالزبیر جو ابن عباسؓ کی روایت کے راوی ہیں، اعمش، منصور اور مغیرہ وغیرہ جنھوں نے ابن مسعودؓ کی حدیث بیان کی ہے برابر نہیں ہیں، اور نہ اُن کا پایہ ابو موسیٰ کی حدیث کے راوی قتادہ اور ابن عمر کی حدیث کے راوی ابو بشر کے برابر ہے، رہی یہ بات کہ اضافہ کو قبول کرنا لازمی ہے چاہے راوی کتنے ہی کمتر درجہ کا ہو، تو ایمن بن نابل نے لیث کے واسطے ابوالزبیر سے جو اضافہ بسم اللہ کا بیان کیا ہے، اس کو اختیار کرنا زیادہ ضروری تھا، اسی طرح

اس اضافہ کو بھی قبول کرنا ضروری تھا، جو ابو اسلم نے ابن زبیرؓ سے روایت کیا ہے، اس میں بھی بسم اللہ کا اضافہ ہے لیکن جب یہ اضافہ نامقبول ہے تو ابوالزبیر کا وہ اضافہ کس طرح قبول کیا جا سکتا ہے، جو ابن عباسؓ کی روایت میں عطار بن ابی رباح کی روایت پر کیا گیا ہے جب کہ ابن جریج نے اس کی عطا سے اور وہ ابن عباسؓ سے اس کی موقوفاً روایت بھی کرتے ہیں، اور ابوالزبیر اس کو سعید بن جبیر اور طاؤس سے اور یہ دونوں حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً بیان کرتے ہیں، لیکن اگر یہ ساری حدیثیں ثابت بھی ہو جائیں، اور سب کی سندیں برابر بھی نکلیں جب بھی ان سب کے مقابلہ میں عبداللہ بن مسعود کی روایت سب سے بہتر اور احسن قرار پائیگی کیونکہ اس حد تک تو سب کا اتفاق ہے، کہ ثابت شدہ تشہد کے علاوہ کوئی اور تشہد نہیں پڑھا جا سکتا، کیونکہ تشہد کا ذکر سے خاص تعلق ہے، اب جن لوگوں نے تشہد کی روایت کی ہے تو انھوں نے عام طور پر حضرت ابن مسعود کی موافقت کی ہے، اگر کوئی شخص ان کی مخالفت کرتا، اور ایسی چیز بیان کرتا ہے جو ابن مسعود کی روایت میں نہیں ہے تو اسی چیز کو قبول و اختیار کیا جا سکتا ہے، جس پر اتفاق ہو اور جس کو بیشتر لوگوں نے بیان کیا ہو لیکن کسی اختلاف کو قبول نہیں کیا جا سکتا ہے،

اس کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے اس باب میں بڑے تشدد اور غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے، چنانچہ وہ اپنے شاگردوں کو واؤ تک کا لحاظ اور اہتمام کرنے کی تاکید کرتے تھے، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ سے پوری اور مکمل ہم آہنگی برقرار رہے، دوسری لوگوں کی اس درجہ احتیاط اور تشدد کا ہم کو علم نہیں، اس لئے ہم ابن مسعودؓ سے مروی تشہد کو دوسروں سے مروی تشہد کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتے ہیں[1]"

اس قسم کی متعدد فاضلانہ اور محققانہ بحثیں موجود ہیں، لیکن انکو طوالت کے خوف سے قلم انداز کیا جاتا ہے،

---

[1] معانی الآثار جلد اص ۱۵۰ و ۱۵۱

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ معانی الآثار حدیث و فقہ دونوں کی جامع ہے، اور امام طحاوی کا درجہ فقہ و حدیث دونوں میں بہت ممتاز تھا، معانی الآثار میں حدیث و فقہ کے علاوہ تفسیر و قرأت کی بعض لطیف بحثیں، مشہور مفسرین صحابہ و تابعین کے اقوال اور مختار و مرجح قرأت تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے، اور سنت و حدیث کی طرح قرآنی آیات سے بھی مسائل کا استنباط و تخریج کیا گیا ہے، سیر، انساب اور ایام و مشاہد وغیرہ کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے، معانی الآثار ابواب و مباحث کی ترتیب اور انداز بیان کے اعتبار سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے،

خصوصیات اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُن کا خلاصہ ذیل میں تحریر کیا جاتا ہے، اس سے معانی الآثار کی اہم خصوصیات ایک نظر میں سامنے آجائیں گی،

(۱) اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث و آثار کا عدم تضاد ثابت کیا گیا ہے، اور جو حدیثیں باہم بظاہر مختلف و متناقض معلوم ہوتی ہیں، اُن کی نہایت مناسب اور دلنشین توجیہ و تطبیق بیان کی گئی ہے،

(۲) گو اساطینِ احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے مذاہب اور فقہی آراء کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور بعض مواقع پر دوسرے علماء کے نقطۂ نظر خصوصاً صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوے کی بھی صراحۃً نشاندہی کی گئی ہے،

(۳) اقوالِ مختلفہ کے درمیان موازنہ اور اُن کے دلائل و شواہد بیان کر کے مرجح مسلک کا ذکر بھی ہے جس سے مصنف کا تفقہ و اجتہاد ظاہر ہوتا ہے،

(۴) مختلف طرق اور تعددِ اسناد کا ذکر، مبہم رواۃ کی نشاندہی، راوی کے شک و وہم، اضطرابِ اسناد، روایت کے رفع و اتصال، صحت، قوت اور تواتر و شہرت یا وقف و انقطاع، سقم، ضعف، شذوذ، اور تفرد وغیرہ کی تصریح، مجمل و مختصر کی تشریح، مشتبہ کی تمییز، ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید، اور

خاص و عام کی وضاحت نیز علمائے جرح و تعدیل کے اقوال وغیرہ کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

(۵) معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں،

(۶) وضع و ترتیب کی خوبی اور انداز بیان و طرز ادا کا حسن و دلآویزی وغیرہ،

معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب معانی الآثار کے ان خصوصیات کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقی کا ہے، کہ انھوں نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں، مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں، مگر احناف کے مسلک کی مؤید ہیں، تصویب کی ہے۔

لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ امام طحاوی نے بعض ایسے مسائل میں احناف کے مسلک کی مخالفت بھی کی ہے، جو روایات کے مطابق نہیں ہیں، اور اگر کہیں ایسا واقعی ہوا ہے تو اس کی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:۔

ھذا العمری تحامل ظاھر	امام بیہقی کی اس امام عظیم کی شان
من ھذا الامام فی شأن	میں جس پر اکابر علما و مشائخ نے
ھذا الاستاذ الذی اعتمدہ	اعتماد کیا ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی
اکابر المشائخ[۱]	ہے،

حافظ عبد القادر قرشی فرماتے ہیں:۔

"امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اور اُن کی عظمت کے منافی ہے، بخدا مجھ کو اس

---

[۱] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۰۰،

کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اس کے بارہ میں کہی ہے[1]

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ

"کسی عاقل اور منصف مزاج شخص کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امام طحاوی نے قرآن واحادیث نبویہ سے استنباط احکام کیا ہے"[2]

امام بیہقی کی تردید میں علاء الدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے،

رہی یہ بات کہ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے صحاح کے مقابلہ میں معانی الآثار کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، تو اس کے متعلق مولانا عبدالحئی لکھنوی لکھتے ہیں :۔

"میں ابن تیمیہ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا، جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجر کے بارہ میں کہی ہے کہ ان کا موطا اور صحیح بخاری میں تفریق اور موطا کی صحت سے انکار کرنا صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے موطا میں اس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے جس امعان نظر سے بخاری میں کام لیا ہے، ورنہ ان کو موطا کی اہمیت کا انکار نہ ہوتا، اسی طرح اگر امام ابن تیمیہ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی، تو وہ طحاوی اور ائمۂ صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روا نہ رکھتے، اور حافظ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تعنت کے لئے مشہور ہیں، اس کی عظمت کا اعتراف کرتے"[3]

---

[1] ماتمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ از مولانا عبدالرشید نعمانی ص ۳۰ و ۳۱

[2] ایضاً [3] تقریظ معانی الآثار ج ۲ ص ۵،

[3] ماتمس الیہ الحاجۃ، ص ۳۱،

معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارہ میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے امیر اتقانی لکھتے ہیں:-

"میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض و انکار کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس لئے کہ وہ معتمد و ثقہ ہیں، اور متہم نہیں ہیں، اس کے علاوہ اُن کا علمی پایہ بلند اور مرتبۂ اجتہاد مسلّم ہے، ورع و تقوی کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے، اور مذاہبِ فقہ سے واقفیت میں بھی وہ شرف و تقدم رکھتے تھے،........ اگر تم کو ابو جعفر کے فضل و کمال میں شک ہو تو اُن کی کتاب شرح معانی الآثار کا مطالعہ کرو، اس کی مثل مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی"[1]

شروح و تلخیصات معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، وہ نصاب درس میں شامل کی گئی، اُس کے شروح و حواشی لکھے گئے، اور تلخیص بھی کی گئی، ذیل میں اس کی شرحوں اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے،

۱۔ علامہ بدر الدین عینی (م ۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا، انھوں نے ایک مدت تک اس کا درس بھی دیا، اور اس کی دو شرحیں معانی الاخبار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں، دونوں کے نسخے دار الکتب المصریہ میں موجود ہیں، پہلی کتاب ۸ جلدوں میں اور دوسری ۷ جلدوں میں ہے،[2] اُن کے علاوہ انھوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار دو جلدوں میں لکھی، اس کا ناقص نسخہ بھی دار الکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے،[3] ذاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے،[4]

[1] مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۹۲، [2] الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۲ و ۳۳، و فہرست کتبخانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۲، [3] الحاوی ص ۳۳

۲- شیخ قاسم بن قطلوبغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے الایثار برجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے[1]

۳- ابوالحسین محمد بن محمد باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) کی شرح تصحیح معانی الآثار جس کے متعلق بروکلمان نے لکھا ہے کہ بنکاک میں محفوظ ہے[2]

۴- حافظ ابو محمد علی بن زکریا منبجی مؤلف لباب (م ۶۸۶ھ) بھی اس کے مشہور شارحین میں ہیں، اُن کی شرح کا ایک جزء آستانہ کے مکتبہ ایا صوفیہ میں موجود ہے[3]

۵- حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ھ) نے الحاوی فی تخریج احادیث معانی الآثار لکھی جو بڑی مفید شرح ہے، اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں کا صحاح مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے، اس کا ایک جزء دارالکتب المصریہ میں موجود ہے[4]

۶- حافظ ابو عمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس اور اکثر اپنی کتابوں میں اُن کا حوالہ دیتے ہیں تلخیص کی ہے[5]

۷- حافظ ابو محمد عبداللہ بن یوسف زیلعی صاحب نصب الرایہ (م ۷۶۲ھ) کی تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبرلی میں محفوظ ہے[6]

۸- شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ھ) نے اتحاف المہرہ میں اس کے اطراف کو جمع کیا ہے[7]

۹- شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسف دہلوی مرحوم نے عربی میں شرح امانی الاحبار فی شرح معانی الآثار

---

[1] کشف الظنون جلد ۲ صفحہ ۴۰۴ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۹۲ [2] ایضاً۔ [3] الحاوی صفحہ ۳۳، [4] ایضاً صفحہ ۳۱ و ۳۲، و فہرست کتبخانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴ ۳۴۔ [5] الحاوی صفحہ ۳۳ [6] ایضاً۔ [7] ما تمس الیہ الحاجہ صفحہ ۳،

لکھی ہے، اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں،

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ۱۳۰۲ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اس کو لیتھو کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۹۰ ہے، مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کئے ہیں، ان میں الفاظ و لغات کی تحقیق، اسماء و اعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے،

دارالمصنفین کی نئی کتاب

دینِ رحمت

جس طرح ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیغمبرانہ اوصاف و مکارم اخلاق کے اعتبار سے تمام عالم کے لئے رحمت تھے، اسی طرح آپ جو دین لائے تھے وہ بھی اپنی ہمہ گیر علمی اخلاقی تعلیمات کے لحاظ سے نہ صرف کائنات انسانی بلکہ پورے کرۂ خاکی کے لئے سراپا عدل و رحمت ہے، اس کتاب میں انسانی زندگی کے ایک ایک جزئیہ کے متعلق قرآن و حدیث کی روشنی میں نہایت تفصیل کے ساتھ مختلف ابواب کے تحت اسلام کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں، ان کو پڑھ کر اندازہ ہوگا کہ پورا دین اسلام ہی نہیں بلکہ اس کی تعلیمات کا ایک ایک جزئیہ تمام کائنات کے لئے آیۂ رحمت ہے، قیمت: ۵۰ ر

......ہ>>((مؤلفہ))<<ہ......

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی ایڈیٹر معارف

"منیجر"

عصرِ عبّاسی سے قبل عربی تنقید کا ارتقا

از

جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم اے، پی ایچ، ڈی (لکچرر وکٹیشور یونیورسٹی آندھرا)

جدید تنقیدی اصطلاح میں عصر عباسی سے قبل کی ادبی تنقید کو "غیر منہجی" کہا جاتا ہے، غیر منہجی کا مطلب یہ ہے کہ وہ تنقید اصول و نظریات پر مبنی نہ تھی، بلکہ ذاتی متاثرات اور شخصی میلانات کی ترجمانی تھی، جہاں تک تنقیدی نظریات کا تعلق ہے وہ منظم شکل میں تیسری صدی ہجری میں بھی نظر نہیں آتے، مگر تنقیدی اشارات اسی دور سے نظر آتے ہیں، جب سے ان کی شاعرانہ عظمت سامنے آتی ہے، اگر یہ نظریہ صحیح ہے کہ بغیر اعلیٰ تنقیدی شعور کے کوئی اعلیٰ ادبی شہ پارہ وجود میں نہیں آسکتا تو پھر یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ عربوں کے یہاں عصر جاہلیت سے تنقیدی شعور موجود ہے، ورنہ جاہلی شعرا غیر معمولی ادبی تخلیق پیش کرنے سے قاصر رہتے، عربوں کے تنقیدی شعور کا واضح ثبوت ان واقعات اور روایات سے فراہم ہوتا ہے، جو آئندہ اوراق میں پیش کئے جارہے ہیں،

عصر جاہلی میں مختلف تنقیدی مظاہر ملتے ہیں، عصر اسلامی یا صدر اسلام میں تنقید میں نظریاتی رنگ شامل ہو جاتا ہے، اور عصر اموی میں تنقید کو نیا افق ملتا ہے، جو نظریاتی تنقید کے بجائے الفاظ، عبارت اور قالب کی تنقید سے متعلق ہے، اس طرز تنقید کا نمونہ نقائض

جریدہ ذوق ہے، خود عبدالملک کی تنقیدیں بھی عموماً لفظی حسن یا فردی کیفیت کی غمازی کرتی ہیں، اس طرح ادبی تنقید تسلسل کے ساتھ ارتقار کے منازل طے کرتی ہے، پھر یہ تمام خصوصیات ایک منظم شکل میں عصر عباسی میں ظاہر ہوتی ہیں، چوتھی صدی میں قدامہ نقد الشعر لکھتے ہیں جس سے نظریاتی اور اصولی تنقید کا دور شروع ہوتا ہے، عصر عباسی سے قبل جو تنقیدی پیمانے ملتے ہیں اُن سے اگرچہ نہایت بلند اور اعلیٰ تنقیدی شعور کا ثبوت ملتا ہے، مگر ان میں نقص یہ ہے کہ وہ غیر مرتب و غیر منظم ہیں، کسی ایک اصول یا نظریہ کی وہ ترجمانی نہیں کرتے، اسی بنا پر ہم ان ادوار کو غیر منہجی تنقید کا دور کہتے ہیں، اگرچہ صدر اسلام میں نظریاتی بنیادیں قائم ہوگئی ہیں، مگر اموی دور میں پھر جاہلی روایات عود کر آئیں، اور اس طرح نظریاتی تنقید کے ارتقار میں تاخیر ہوگئی، اس کے باوجود ان ادوار میں تنقیدی بصیرت کا کافی سامان موجود ہے،

عہد جاہلیت میں عربی تنقید کے مظاہر

عربوں میں ادبی تنقید کا آغاز عصر جاہلی سے ہوتا ہے لیکن چونکہ جاہلی، اسلامی اور اموی دور میں کوئی کتاب تصنیف نہیں کی گئی، اس لئے ان ادوار کے تنقیدی پیمانے ان کتابوں میں ملتے ہیں، جو عصر عباسی میں لکھی گئیں خصوصاً شعرار کے تذکروں اور "اغانی" میں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عصر جاہلی شعرا در نقد شعر کے بارے میں علمی عہد تھا، جس میں شعرار پر تنقید، اچھے اشعار کا ذوق، شعر و شاعری کا چرچا، اور ادبی مراکز نظر آتے ہیں، عکاظ کے بازار میں اطراف و جوانب سے شعرار جمع ہوتے تھے، اور اپنے اپنے قصائد سناتے تھے، نابغہ ذبیانی کے لئے سوق عکاظ " میں ایک سُرخ رنگ کا خیمہ نصب کیا جاتا تھا، شعرار اس کے سامنے آکر بیٹھتے تھے، اور اس کو اپنے اشعار سناتے تھے، نابغہ ذبیانی اشعار سُن کر اُن پر تنقید کرتا تھا، ایک بار مشہور شاعر اعشیٰ نے نابغہ کے سامنے ایک قصیدہ پڑھا، اس کے بعد حسان بن ثابتؓ نے کچھ اشعار سنائے، نابغہ نے کہا اگر آپ سے پہلے اعشیٰ نے

شعر نہ سنائے ہوتے تو میں آپ کو انس و جن دونوں میں سب سے بڑا شاعر مانتا، حضرت حسانؓ نے فرمایا، خدا کی قسم میں تم سے تمھارے باپ سے اور تمھارے دادا سے بھی بڑا شاعر ہوں، نابغہ نے لپک کر اُن کا ہاتھ پکڑ لیا، اور کہا میرے عزیز تم اس پر قادر نہیں کہ ایسا شعر کہہ سکو،

فانک کالیل الذی ھو مدرکی . وان خلت ان المنتای عنک واسع[1]

(تو اس رات کی طرح ہے، جو آنے والی ہے، اگرچہ تو خیال کرے کہ تجھ سے فاصلہ

دراز ہے)

یہ اور اس قسم کے بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ عصر جاہلی میں میں ادبی تنقید موجود تھی، البتہ یہ ظاہر ہے کہ اس دور کی تنقید محض شاعروں کے ذاتی اقوال و پسندیدگی اور سطحی فکر پر مشتمل تھی، اُن کے پاس متعین تنقیدی پیمانے نہ تھے، اور نہ ان میں ناقدین شعر کا کوئی مستقل طبقہ تھا، اس دور میں تنقید کا پیمانہ صرف ذوقی تھا، عروضی عیوب بھی کسی قدر جانتے تھے،

عصر جاہلی کے قصائد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ممکن ہے کہ وہ تنقید کے اصول و نظریوں سے نابلد رہے ہوں مگر اُن کی شاعری میں فن کی پختگی موجود تھی، اور آج تک ناقدوں کا ایک گروہ اعلیٰ شاعری کی مثال جاہلی شعرا، اور اُن کے قصائد کو سمجھتا ہے، سبع معلقات کے قصائد کی پختگی، طرز کلام، تشبیب، خیالات منظر کشی، اور فنی بلندی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس عہد میں شاعری کا فن اوجِ کمال تک پہونچ چکا تھا، اسی بنا پر ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی رائے ہو کہ جاہلی قصائد اکثر بعد کے گڑھے ہوئے ہیں مگر دوسرے عرب ناقدین اس کو نہیں مانتے،

جاہلیت میں شعرا کی صفات سے اُن کے نام رکھے جاتے تھے، یہ چیز بھی اُن کے تنقیدی

---

[1] الشعر والشعراء تالیف ابن قتیبہ ج ۱ ص ۱۲۳

شعر کی جانب اشارہ کرتی ہے مہلہل بن ربیعہ کا نام مہلہل اس لئے پڑا کہ "ہلہلۃ" کے لفظی معنی ہیں کپڑے کو باریک بُننا یعنی اس کی شاعری بہت دقیق تھی، مہلہل پہلا شاعر ہے جس نے شعر میں لطافت پیدا کی، اور غریب نامانوس الفاظ سے اجتناب کیا[۵۱]، نابغہ ذبیانی کا نام "نابغہ" اس کے اشعار کی فصاحت کی بنا پر رکھا گیا،

اسی طرح کعب غنوی کو عربوں نے کعب الامثال کہا، اس لئے کہ اُس نے اپنے اشعار میں مثالوں کا کثرت سے استعمال کیا، طفیل غنوی کو طفیل الخیل اس لئے کہا گیا، کہ اس کے کلام میں گھوڑے کی توصیف کثرت سے ہے۔ امرء القیس بڑا رند بلکہ اوباش تھا، اور شاہی خاندان سے بھی تھا، اس لئے اُس کو الملک الضلیل "بہت بڑا گمراہ بادشاہ" خطاب دیا گیا[۵۲]،

عصرِ جاہلی میں یہ طریقہ تھا جو بعد میں ری رہا کہ ہر شاعر پہلے کسی شاعر کا راویہ بنتا تھا چنانچہ تمام مشہور شعرا اپنے پیشرو شعرا کے "راویہ" رہ چکے ہیں، راویہ کا کام یہ تھا کہ وہ اپنے استاد کے اشعار یاد رکھتا، اُن کی ت کرتا، اور اُن کے کی پیروی کرتا، ہر راویہ کو بے شمار اشعار حفظ ہوتے تھے، اور اُس کی شخصیت ایک ادبی مرکز ہوتی تھی جس کے پاس دور دور سے لوگ آکر شعر و شاعری کے متعلق گفتگو کرتے تھے، زہیر بن ابی سلمیٰ اوس بن حجر کا راویہ تھا، زہیر کے بیٹے کعب نے زہیر کے راویہ تھے، کعب کے راویہ حطیئہ اور حطیئہ کے راویہ جمیل ہوئے، اس تفصیل سے یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ قبل اسلام عرب کی شاعری اچھی خاصی ترقی یافتہ تھی، اور نقد کا شعور بھی تھا، مگر ابتدائی مراحل طے کر رہا تھا،

زہیر بن ابی سلمیٰ کے متعلق مشہور ہے، کہ جب وہ قصیدہ کہتے تھے، تو اُس کو فوراً نہیں

---

[۵۱] الموشح فی ماخذ العلماء علی الشعراء تالیف المرزبانی ص ۷۴،

[۵۲] الحیاۃ الادبیہ تالیف عبد المنعم الخفاجی، ص ۱۹۰، ۲۰۱،

سُناتے تھے، بلکہ ایک سال تک برابر اُس کی چک و اصلاح کرتے رہتے تھے، اور پوری طرح نوک پلک درست کرنے کے بعد اُس کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے تھے، اس عمل کو عہد جاہلیت میں پسندیدہ سمجھا جاتا تھا، اور اُس کے لئے "الحولیات" کی اصطلاح تھی، یعنی وہ قصائد جن پر سال بھر حک و اصلاح ہوتی رہی[1]

امرار القیس اور علقمہ بن عبدہ میں مقابلہ ہوا کہ ان میں کون بڑا شاعر ہے، دونوں کو بڑائی کا دعویٰ تھا، علقمہ نے کہا کہ میں تمھاری بیوی ام جندب کو "حکم" بناتا ہوں وہ جو فیصلہ کرے اس کو ہم دونوں مان لیں، اُم جندب نے کہا کہ تم دونوں ایک ہی قافیہ اور ایک ہی روی میں قصیدہ کہو اور اُس میں گھوڑے کے صفات بیان کرو، چنانچہ دونوں نے اشعار کہے، اُس کو سُن کر فیصلہ کیا کہ علقمہ امرء القیس سے بڑا شاعر ہے، امرار القیس نے پوچھا کہ اس ترجیح کی وجہ کیا ہے، امرء القیس کی بیوی نے جواب دیا کہ تم نے کہا ہے کہ کوڑے مار کر اور ڈانٹ کر یعنی گھوڑے کو قابو میں کیا اور علقمہ کا گھوڑا بغیر ڈانٹے ہوئے ہوا سے باتیں کرتا ہوا نکل گیا، یہ سُن کر امرء القیس نے کہا کہ علقمہ مجھ سے بڑا شاعر ہرگز نہیں، تم اس پر عاشق ہو گی، اور اُم جندب کو طلاق دے دی، اُس نے علقمہ سے شادی کر لی[2]

اس دور میں عربوں کا شعور اتنا ترقی کر چکا تھا کہ وہ الفاظ کے غلط استعمال کو فوراً پکڑ لیتے تھے، چنانچہ مشہور شاعر طرفہ نے مسیب بن علس کا ایک شعر سُنا جس میں اونٹ کی صفت میں "صیعریہ" کا لفظ استعمال کیا گیا تھا، جو اونٹنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، طرفہ نے سُن کر کہا کہ مسیب نے اونٹ کو اونٹنی بنا دیا[3]

---

[1] کتاب العمدة ج ۱ ص ۱۲۹، طبع دوم مطبعہ سعادت ۱۹۵۵ء مصر [2] الموشح مو زبانی ص ۲۸، ۲۹، (مطبوعہ مطبعہ لندن سلفیہ مصر) [3] ایضاً ص ۷۶،

عصر جاہلی میں عرب قافیہ کے حسن و قبح سے بھی تھوڑی بہت واقفیت رکھتے تھے، مشہور واقعہ ہے کہ جب نابغہ ذبیانی مدینہ آئے، تو لوگوں نے ایک "لڑکی" سے کہا کہ فلاں کے وہ اشعار جن میں قافیہ غلط استعمال ہے، اُن کو اس طرح پڑھ کر سناؤ کہ اُن پر اُن کی غلطی واضح ہو جائے، اس لڑکی نے اسی طرح سنایا نابغہ نے سن کر فوراً اپنی غلطی محسوس کر لی، کہ ایک شعر میں انھوں نے "الاسودُ" قافیہ استعمال کیا ہے، دوسرے میں "بالید" ہے، کیونکہ ایک ہی قصیدہ میں ایک قافیہ میں پیش اور دوسرے میں زیر مناسب نہیں ہے، اس اصلاح کو عربی تنقید میں "اقواء" کہا جاتا ہے، وہ خود کہتے ہیں، کہ میری شاعری میں خامیاں تھیں، مگر جب مدینہ جاکر وہاں سے پلٹا تو سب سے بڑا شاعر تھا[1]

عربی تنقید کے بہت سے پیمانے جو عہد جاہلیت میں ملتے ہیں، وہ بعد میں بھی باقی رہے، بہت سے ناقدوں نے ذوق کو معیار تنقید قرار دیا، ثعلبی نے اہل شام کو پورے عرب پر شاعری میں ترجیح دی جس طرح جاہلیت میں نقد و شعر کے بازار لگتے تھے، اُسی طرح کے بازار عصر اموی میں قائم کئے گئے،

اس دور میں شعراء خود بھی اپنی شاعری پر تنقید کرتے تھے، اور ہر شخص اپنے کو دوسرے سے بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا، ذوق کے اختلاف اور عصبیت کی بنا پر لوگوں کے خیالات میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، مگر مجموعی حیثیت سے عرب امرؤ القیس کو سب سے بڑا شاعر تصور کرتے تھے، ایک بار حضرت لبید کوفہ سے گذر رہے تھے، لوگوں نے ان کے پیچھے ایک شخص کو دوڑایا، کہ فلاں سے پوچھو کہ سب سے بڑا شاعر کون ہے، اُس نے جاکر پوچھا، آپ نے فرمایا امرؤ القیس اُس نے کہا اس کے بعد فرمایا طرفہ، اس نے پوچھا، اُس کے بعد فرمایا میں خود،[2]

---

[1] الموشح مؤلفہ مرزبانی ص ۳۰، ۳۹، [2] طبقات الشعراء، مؤلفہ ابن سلام مطبوعہ لائڈن ۱۹۱۳ء ص ۱۲،

اس دور میں بعض تنقیدیں مبہم بھی ملتی ہیں، مثلاً ربیعۃ ابن حذار الاسدی کی تنقیدیں مبہم محض اشارات پر مبنی ہیں، زبرقان کے اشعار پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے اشعار اس گوشت کی طرح ہیں، جو گرم ہوگیا ہو مگر نہ پورا پک گیا ہو کہ کھالیا جائے، اور نہ کچا ہو کہ اس سے کوئی اور کام لیا جا سکے، عبدہ پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمھارے اشعار ایک ایسے گھڑے کی طرح ہیں، جس کا ڈھکن مضبوطی سے بند ہو اور ایک قطرہ پانی بھی اس سے نہ نکل سکتا ہو[1]، ظاہر ہے کہ یہ تنقید بالکل مبہم اور لاطائل ہے، جس سے محسوس ہوتا ہے، کہ ناقد کے ذہن میں کوئی واضح رائے نہ تھی،

یہ مباحث و واقعات اس کا ثبوت ہیں، کہ عربوں میں تنقید کا آغاز زمانۂ جاہلیت ہی سے ہوگیا تھا، اگرچہ وہ اصول و ضوابط کی پابندی نہ تھی، پھر بھی معیاری تنقید کے بعض بہت سے اہم پیمانے اس دور میں مل جاتے ہیں،

عربی تنقید کا ارتقاء صدر اسلام میں | اسلام پوری زندگی کے لئے نئی قدریں لے کر آیا تھا، اس لئے اس نے نہ صرف عربوں کے مذہب میں تبدیلی پیدا کی، بلکہ ان کی زندگی کی تمام قدروں اور ان کے اخلاق اور ان کے فکر کے پیمانوں کو بھی بدل دیا، اس تغیر کا اثر شاعری پر پڑا، چنانچہ عصر جاہلیت اور صدر اسلام کی شاعری میں بڑا فرق محسوس ہوتا ہے، جب شاعری میں تبدیلیاں ہوئیں، تو اس کے حسن و قبح کے معیار بھی بدل گئے، اور اسلام نے شاعری کی تنقید میں نئے پیمانوں کا اضافہ کیا،

اس موقع پر یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ عربوں نے شاعری کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی، اصنافِ سخن وہی رہے، لیکن خیالات اور طرزِ فکر میں بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی، شاعری کے

[1] الموشح ص ۷۵،

جدید دور سے قبل تک عربوں نے اپنی شاعری کے موضوعات اور ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں کی، البتہ اہل اندلس نے ایک صنف "موشح" ایجاد کی جو عام عربی شاعری سے الگ تھی۔

عصر جاہلی میں جو تنقیدی معیار تھے، وہ فکر کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے، اُن کا دائرہ لغوی، عروضی تنقید اور ذاتی میلان تک محدود تھا، اسلام نے پہلے تو عربی شاعری کے ذہنی رجحانات پر ضرب لگائی، قرآن مجید نے شعراء کو اُن کی بے راہ روی پر متنبہ کیا کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں جو خود نہیں کرتے، حضورؐ نے فرمایا کہ شعر سے بہتر ہے کہ ... پیٹ بھرلے" شعراء کی پیروی کرنے والوں کو گمراہ قرار دیا گیا" لیکن ان ارشادات کا مقصد یہ تھا کہ عربوں کو فحش شاعری، عورتوں کے جسمانی محاسن، شراب کی تعریف اور جوے کی مدح سے روکا جائے، کہ اسلام کا بڑا مقصد خیالات ... اخلاق کی پاکیزگی تھی، پاکیزہ شاعری کو حضورؐ خود پسند فرماتے تھے، اور اسلام کی مدافعت میں اس سے کام لیا ہے، آپؐ نے قصائد میں جو تشبیب ہوتی تھی، اس کو بھی سُنا، اور اعتراض نہیں فرمایا، اس سلسلہ میں حضرت کعب بن زہیر کا قصہ قابل ذکر ہے۔

کعب بن زہیر مشہور شاعر زہیر بن ابی سلمٰی کے لڑکے تھے، اور خود بھی بہت اچھے شاعر تھے، انھوں نے حضورؐ کی ہجو کی، آپؐ نے اُن کا خون ہدر کر دیا، اور اُن کی جان کے لالے پڑ گئے، اُن کو یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحم دل ہیں، چنانچہ وہ ایک دن حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ عمامہ باندھ کر شکل بدل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے، اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ایک شخص آپؐ کے ہاتھ پر بیعت کرنا چاہتا ہے، اور ہاتھ بڑھا کر چہرہ سے عمامہ ہٹا دیا اور کہا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میں کعب بن زہیر ہوں، اور آپ کی پناہ چاہتا ہوں، انصار اُن کو امان دینا پسند نہیں کرتے تھے، مگر قریش اُن کے اسلام سے بہت خوش ہوئے، حضورؐ نے انھیں امان دیدی، کعبؓ نے آپ کی خدمت میں اپنا مشہور قصیدہ

"بانت سعاد" جو آپ کی مدح میں کہا تھا پیش کیا،

چند اشعار کے بعد حضورؐ نے حاضرین کی طرف پسندیدگی کی نظر سے دیکھا، بعض اشعار میں انصار پر طنز تھا، قریش نے فوراً ٹوکا اور کہا اگر تم نے انصار کی ہجو کی تو ہماری بھی ہجو کی ہے، یہ سنکر کعب نے ارتجالاً انصار کی مدح میں یہ شعر پڑھا،

الباذلین نفوسھم لنبیھم یوم الھیاج وسطوۃ الجبار

(گھمسان کی جنگوں میں نبی کریم کے لئے اپنے آپ کو قربان کرتے ہیں،)

اس شعر پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرط مسرت میں اپنی چادر اتار کر کعب کو اڑھا دی جس کو کعب بن زہیر کی اولاد سے بعد میں حضرت معاویہؓ نے ایک خطیر رقم میں خرید لیا،[1]

اشعار کے متعلق حضورؐ کا ارشاد ہے کہ وہ اچھے بھی ہوتے ہیں، اور خراب بھی، اُن میں جو حق کے مطابق ہوں وہ اچھے ہیں، اور جو حق کے مطابق نہ ہوں اُن میں کوئی خیر کا پہلو نہیں ہے، اور شعر کلام ہے، کلام اچھا بھی ہوتا ہے اور بُرا بھی،[2]

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ اشعار اچھے اور خراب دونوں طرح کے ہوتے ہیں، اچھے اشعار چن لو اور خراب کو ترک کر دو،[3]

حضرت حسانؓ، حضرت کعب بن مالکؓ اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کے اشعار کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں کے اشعار قریش پر نیزوں سے بھی زیادہ گراں گذرتے ہیں، حضرت حسان بن ثابت سے فرمایا کہ قریش کی ہجو کرو، خدا کی قسم تمھاری ہجو اندھیرے میں آدمی پر تیر پڑنے سے بھی زیادہ سخت ہے، اور روح القدس تمھارے ساتھ ہیں،[4]

---

[1] طبقات الشعراء تالیف ابن سلام مطبوعہ لائیڈن ص ۲۰، ۲۱، [2] العمدہ ج ۱ ص ۲۷، [3] ایضاً ص ۲۷، [5] ایضاً ج ۱ ص ۳۱،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے تھے کہ شاعری قوم کی میزان اور اس کو پرکھنے کا معیار ہے[۱]

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شاعری کے بارہ میں حضرت علیؓ کا واضح نظریہ تھا اس کو وہ انسانی سوسائٹی کو پرکھنے اور اس کی بلندی و پستی کا اندازہ لگانے کا معیار تصور کرتے تھے، آپ کا یہ قول دورِ جدید کے بعض بڑے مغربی ناقدوں کے نظریات سے بالکل مطابقت رکھتا ہے، مثلاً میتھو ارنلڈ کہتا ہے کہ شاعری زندگی کی تنقید ہے، (Poetry is criticism of life)

اس نظریہ سے ہزاروں سال قبل حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ شاعری قوموں کے اخلاق و سیرت کی میزان ہے آپ نے محض زندگی کی تنقید قرار نہیں دیا، بلکہ اس سے یہ بھی نتیجہ نکلتا ہے کہ صالح قوم کا ادب بھی صالح اقدار حیات کا ترجمان ہوتا ہے،

حضرت معاویہؓ فرمایا کرتے تھے کہ شاعری ادب کا سب سے اونچا درجہ ہے[۲]

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جب تم کتاب اللہ پڑھو، اور اس میں کوئی چیز سمجھ میں نہ آئے، تو اُس کو اشعار عرب میں تلاش کرو، اس لئے کہ شعر عرب کا دیوان ہے، اُن کی پوری داستان اس میں پوشیدہ ہے، جب قرآن مجید کے کسی لفظی اشکال کے بارہ میں اُن سے کوئی سوال کیا جاتا تھا، تو اُس کی وضاحت کے لئے آپ عربی شعر پڑھ دیتے تھے[۳]

حضرت عمرؓ نابغہ ذبیانی کو سب سے بڑا شاعر مانتے تھے، اور فرماتے تھے، کہ وہ بحر کے اعتبار سے بہت شیریں کلام ہے، اُس کے یہاں گہرائی سب سے زیادہ پائی جاتی ہے[۴]

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ کتنی اچھی بات ہے، کہ آدمی ضرورت کے وقت اشعار پڑھ کر

---

[۱] العمدۃ ج ۱ ص ۲۸، [۲] ایضاً ج ۱ ص ۲۹،

[۳] العمدۃ ج ۱ ص ۳۰، [۵] ایضاً ص ۱۵

لوگوں کے دل کو مائل کرتے،[۱]

حضرت عمرؓ نے غطفان کے وفد سے دریافت فرمایا کہ یہ شعر کس کا ہے،

حلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ ولیس وراء اللہ للمرء

میں نے قسم کھائی اور تمھارے نے کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں باقی رکھی؛

علاوہ انسان کا کوئی مطلوب نہیں"

لوگوں نے کہا یہ نابغہ بنی ذبیان کا شعر ہے، چند اور اشعار پوچھنے کے بعد فرمایا کہ وہ سب سے بڑا شاعر تھا،[۲]

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کس کا مصرع ہے،

الا کل شیئ ما خلا اللہ باطل

خبردار ۔ خدا کے سوا ہر چیز باطل ہے

آپ نے ایک بار صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم لوگوں کو امیہ بن ابی الصلت کے اشعار یاد ہیں، اور ان سے پورے سو شعر سنے،[۳]

جاہلیت اور اسلام کے معیار تنقید میں بنیادی فرق نظریہ کا ہے جاہلی شعراء اشعار خاص طرز فکر یا نظریہ کے تحت تنقید نہ کرتے تھے، بلکہ ان کے تنقیدی نقطہ نظر میں ذاتی کو بڑا دخل تھا، اسلام کے بعد جو تنقیدی پیمانے سامنے آئے، ان میں فکر و فن کے جلوے طور پر نظر آتے ہیں،

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ خاص طور سے شاعری، ادب

۱؎ العمدۃ جلد ۱ ص ۱۶، ۲؎ الحیاۃ الادبیہ بعد ظہور الاسلام عبد المنعم خفاجی ص ۳۱۵، ۳؎ مشکوۃ المصابیح مطبعہ سعیدیہ کراچی ص ۴۰۸، ۴۰۹

تنقید پر گہری نظر رکھتے تھے، اُن کے اقوال تنقیدی پیمانوں کی حیثیت رکھتے ہیں، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ابن عباسؓ سے فرمایا کہ سب سے بڑے شاعر کے کچھ اشعار سناؤ، انھوں نے پوچھا کہ کون سب سے بڑا شاعر ہے، فرمایا زہیر بن ابی سلمیٰ اور اس کی شاعری کے متعلق یہ رائے ظاہر فرمائی کہ وہ بات کہنے میں رکاوٹ محسوس نہیں کرتا، غریب و نامانوس الفاظ سے پرہیز کرتا ہے، اور اسی صفت کی تعریف کرتا ہے، جو انھی آدمی کے اندر موجود ہوں[۱]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رائے تھی کہ امرؤ القیس سب سے بڑا شاعر ہے، اس کے یہاں تمام شعراء سے زیادہ ندرت پائی جاتی ہے، اور وہ برمحل اشعار کہنے میں یکتا ہے،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نظریہ کی حمایت کو بھی تنقیدی پیمانہ قرار دیا، چنانچہ ایسے اشعار جو اسلام کی مدافعت میں کہے گئے، بہ نظر استحسان دیکھا، اور اُن شعراء کی ہمت افزائی فرمائی، یعنی شاعری کو اسلام کی مدافعت کا ذریعہ بنایا اور اس کی غیر صحت مند روایتوں تخیلات اور بے راہ روی پر قید و بند عائد کی، اگر حضرت حسانؓ کے جاہلی دور اور اسلامی دور کی شاعری کا موازنہ کیا جائے تو دونوں کی زبان اور خیالات میں نمایاں فرق نظر آئے گا، اس نظریہ کی بنا پر حضور سے لیکر صحابہ تک زہیر کی تعریف کرتے ہیں، کیونکہ اُن کے کلام میں صداقت ہے،

عبدالمنعم خفاجی کہتے ہیں کہ اسلام اور قرآن مجید کا اثر شعر کے اسلوب، الفاظ، اسلوب، بلاغت اور قوت پر اسی طرح پڑا، جس طرح ان کی زندگی اور اُن کے افکار و تصورات پر پڑا،[۲]

اسلام کے اثر سے عربوں کی تنقید میں دو طرز فکر پیدا ہوئے، جن کا اصل مظہر عصر عباسی ہے،

---

[۱] طبقات الشعراء تالیف ابن سلام ص ۱۰، [۲] الحیاۃ الادبیۃ بعد ظہور الاسلام مؤلفہ عبدالمنعم خفاجی، ص ۱۵،

حضرت عمرؓ نے زہیر کی شاعری کی ایک صفت صدق کو بتایا ہے یعنی وہ مبالغہ نہیں کرتا جو کچھ صفت ہے، اسی کو بیان کرتا ہے، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، کہ صداقت صدر اسلام کے ادبی اصولوں میں ایک اہم اصول ہے، حضرت حسانؓ فرماتے ہیں،

ان احسن بیت انت قائلہ بیت یقال اذا انشدتہ صدقا

(بہترین شعر وہ ہے، جس کو سُن کر لوگ کہیں کہ سچا ہے)

اموی دور میں جاہلی شاعری مع اپنی روایات کے پھر واپس آگئی، اس لئے تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ صدر اسلام کے پیمانے "متنازع فیہ" ہوگئے، چنانچہ عباسی عہد میں "صدق و کذب" دونوں مکتب فکر کے شاعر و ناقد نظر آتے ہیں، بحتری کہتا ہے،

کلفتمونا حدود منطقکم والشعر یغنی صدقہ عن کذبہ

(تم ہم کو اپنے منطقی حدود کا مکلف بناتے ہو، حالانکہ شاعری میں جھوٹ سچائی سے بے نیاز کر دیتا ہے،)

قدامہ نے کہا کہ "احسن الشعر اکذبہ" جتنا جھوٹا شعر ہو اتنا ہی عمدہ ہوتا ہے، مگر یہاں جھوٹ سے مراد مبالغہ ہے،

حضرت عمرؓ کی یہ رائے کہ زہیر وحشی و غریب الفاظ سے بچتے ہیں، درحقیقت اسلامی عہد کا بڑا تنقیدی پیمانہ ہے، بعد کے ناقدین نے بھی غریب وحشی اور مشکل الفاظ کے استعمال کو اچھا نہیں سمجھا، جو جاہلی شاعری کا بڑا عنصر تھا،

اسی طرح اسلام نے نئی اصطلاحات سے شاعری کے دامن کو مالا مال کیا، حضرت حسانؓ کا دیوان اس کا بہترین مظہر ہے، نئے الفاظ کا ایک ذخیرہ دیا، اور پاکیزہ خیالات سے اس کا دامن بھر دیا، زغلول سلام نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے، کہ اسلامی عہد میں قرآن مجید

کا اسلوب بیان اور حسن تعبیر مسلمہ نمونہ مانا جاتا تھا، اس لئے ادبی و شعری حسن و جمال کے پرکھنے اور اس کے معیار کی تشکیل میں بھی قرآن مجید کے اسلوب کا غیر معمولی اثر پڑا[۱]۔

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے عربی شاعری کی تنقید میں صدق، سلیس طرز بیان، اچھے الفاظ اور مذہبی اقدار کو شامل کیا، چنانچہ حضورؐ نے بعض احادیث میں بھی سلاست کلام پر زور دیا ہے۔

عصر اموی میں عربی تنقید کا ارتقاء

عربی تنقید کے ارتقاء کا اصلی زمانہ تو عباسی عہد ہے، مگر اس کی بنیادیں اموی عہد میں اصمعی، ابوعمرو بن العلاء، حماد الروایہ اور خلف الاحمر جیسے شاعروں اور ادیبوں نے رکھیں، اس نقطۂ نظر سے اموی عہد کا آخری دور بڑا اہم ہے، اس دور میں تنقید فن کی شکل اختیار کرنے لگی، اور شعراء و ادباء کے علاوہ بھی عرب میں ناقدین ادب و شعر کا ایک گروہ پیدا ہوگیا، اموی عہد کے بعد تصنیف و تالیف کا دور شروع ہوا، عباسی عہد کی تصانیف میں اموی عہد کے اتنے تنقید شعر کے قصے ملتے ہیں کہ اگر انھیں اکٹھا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو جائیں۔

اسی دور میں جب کہ عربی تنقید محدود شخصی پیمانوں کی تنگنائیوں سے نکل کر اصول و ضوابط کی فنی حیثیت اختیار کرتی ہے، عربی تنقید کے ارتقاء میں بہت سے عوامل اور محرکات کارفرما نظر آتے ہیں، صدر اسلام کے مقابلہ میں اس دور کی زندگی بہت مختلف ہوگئی تھی، اموی عہد نے جو تنقیدی پیمانے دیئے تھے، عربی شاعری انہی بنیادوں کی طرف لوٹ آئی تھی، جو جاہلیت میں تھیں، اور وہ اپنی تمام روایتوں اور خوبیوں کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوگئی تھیں، اسی وجہ سے عربی تنقید کے پیمانے بھی زندگی کی تبدیلیوں سے متاثر

---

[۱] اثر القرآن فی تطور النقد الادبی ص ۱۵، ۱۶۔

ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اور اسلام نے جو پیمانے عطا کئے تھے، وہ بالکل بدل گئے،

عصر اموی میں امراء، عمال اور خلفاء کے دربار شعر و نقد کا مرجع قرار پائے، بنی امیہ نے عربوں کی بجھی ہوئی قبائلی عصبیت کو دوبارہ زندہ کیا، اور اس سے اپنی خلافت و حکومت کے استحکام میں مدد لی، انھوں نے شاعروں کو گراں قدر انعامات سے نوازا، وہ خود بھی تنقیدی ذوق رکھتے تھے خصوصاً عبدالملک کا ذوق بہت بلند تھا،

جراح نے اپنی "الورقہ" میں ایک دلچسپ قصہ نقل کیا ہے، کہ عباس ابن احنف نے ہارون الرشید کے سامنے ایک قصیدہ پڑھا، اس نے قصیدہ کو بہت پسند کیا، اور پوچھا کہ اس طرز کے اشعار اور کسی نے بھی تم سے پہلے کہے ہیں، عباس نے کہا کہ نہیں، رشید نے اصمعی کو بلوایا، اصمعی اور عباس بن احنف میں رنجش و مخالفت تھی، جب اصمعی دربار میں پہونچا تو عبدالملک نے اشعار پڑھکر پوچھا کہ اس [illegible] شاعری اس سے قبل بھی ملتی ہے؟ اصمعی نے کہا بہت لوگوں نے اس طرز کے شعر کہے ہیں، اور تھوڑے سے وقفہ کے بعد ایسے اشعار سنا دیئے، احنف کا بیان ہے کہ میں بہت خفیف ہوا، جب ہم دونوں باہر نکلے، تو میں نے اصمعی کو قسم دلاکر کہا کہ سچ سچ بتاؤ یہ شعر تم نے کہے ہیں یا کسی دوسرے کے ہیں، اس نے جواب دیا، ہاں میرے ہی ہیں، مگر خلیفہ کو میں نے اس طرح سنایا کہ گویا دوسرے کے ہیں"[1]

یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف قبائل نے اپنی عزت کی خاطر، اشخاص نے ذاتی بلندی کے لئے اور ارباب حکومت نے اپنی طاقت کے قیام کے لئے عصر اموی میں خاص طور سے اس کثرت سے اشعار گڑھ کر قدیم شعراء کی جانب منسوب کر دیئے کہ اس کے لئے "انتحال" کی اصطلاح بن گئی،

---

[1] کتاب الورقہ ص ۴ و ۵،

عبدالملک کے سامنے نصیب کا یہ شعر پڑھا گیا:-

اهیم بدعد ما حییت فان امت　　　　فیا ویح دعد من یهیم بها بعدی

میں دعد کے لئے سرگرداں ہوں جب تک زندہ ہوں اگر میں مرگیا تو افسوس ہے

کہ میرے بعد اس کیلئے کون سرگرداں رہے گا؟

اقیسر نے کہا کہ واللہ شاعر نے بہت غلط انداز سے شعر کہا ہے عبدالملک نے کہا اچھا بتاؤ اگر تم کو کہنا ہوتا تو کس طرح کہتے، اُس نے کہا میں یوں کہتا

تحبکو نفسی حیاتی فان امت　　　　اوکل بدعد من یهیم بها بعدی

میں زندگی میں تم سے محبت کرتا ہوں اگر مرگیا تو دعد کو اُس کے سپرد کرجاؤنگا

جو اُس کے لئے پریشان رہے،

عبدالملک نے کہا کہ واللہ تم نے تو اس سے بھی غلط کہا ہے، اقیسر بولا اگر امیرالمومنین کہتے تو کیسے کہتے؟ عبدالملک نے کہا میں اس طرح کہتا:-

تحبکو نفسی حیاتی فان امت　　　　فلا صلحت هند لذی خلة بعدی

جب تک زندہ ہوں تم کو چاہتا ہوں اگر میں مرجاؤں تو خدا کرے ہند کسی محبت

کرنے والے کے لئے سازگار ثابت نہ ہو،

حاضرین نے ایک زبان ہوکر کہا کہ امیر المومنین نے سب سے زیادہ شاعرانہ انداز میں کہا ہے[۱]

مشہور شاعر راعی نے عبدالملک بن مروان کی تعریف میں قصیدہ پڑھا، جس کا ایک شعر یہ تھا!

---

[۱] عبدالملک بن مروان تالیف عمر ابی النصر، مکتبۃ اهلیہ بیروت ۱۹۶۲ء ص ۱۱۰،

عرب نؤدی اللہ فی اموالنا حق الزکاۃ منزلا تنزیلا

ہم عرب ہیں اور اپنے مالوں میں خدا کا حق زکوٰۃ ادا کرتے ہیں

عبدالملک نے کہا کہ یہ شعر نہیں ہے بلکہ اسلام کی تشریح اور قرآن کی آیت کی تلاوت ہے[1]

ان چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ عصر اموی میں شاعری کی تنقید کا شغف و ذوق وجود میں آ چکا تھا، اور لوگ ذوق شعریت اور زبان کے محاسن کو تنقید میں بڑی اہمیت دیتے تھے، ایک بار جریر نے عبدالملک کے سامنے ایک شعر پڑھا، جس میں لفظ بوزرہ استعمال ہوا تھا، خلیفہ نے کہا کہ یہ لفظ بڑا مکروہ ہے، اس نے شعر کی لطافت و حسن کو ختم کر دیا،[2]

لیکن یہ حقیقت ہے کہ تنقید میں عصبیت کا دخل باقی رہا، مختلف قبائل مختلف شاعروں کو ترجیح دیتے رہے، مثلاً عقیلہ بنت عقیل نے کثیر کے اس شعر پر

اُرید لانسی ذکرھا فکانما تمثل لی لیلی بکل طریق

میں چاہتا ہوں کہ لیلیٰ کے ذکر کو بھول جاؤں مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہر راہ میں اس کی تصویر کھنچی ہوئی ہے،

یہ تنقید کی کہ تم کیوں اس کے ذکر کو بھولنا چاہتے ہو[3] ظاہر ہے کہ یہ تنقید صحیح نہیں ہے، کیونکہ شاعر لیلیٰ کو فراق کی تکلیف کم کرنے کے لئے بھولنا چاہتا ہے مگر بھول نہیں پاتا، اس لئے شعر تمام حسن سے لبریز ہے،

اسی طرح اہل حجاز عمر ابن ابی ربیعہ کو سب سے بڑا شاعر سمجھتے تھے، اس لئے کہ وہ حجازی تھا

---

[1] الموشح تالیف مرزبانی ص ۱۵، [2] الشعر والشعراء تالیف ابن قتیبہ، ملاحظہ ہو مقدمہ [3] الموشح صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱،

بنی تغلب اخطل کو بڑا شاعر اس لئے سمجھتے تھے کہ وہ اُن کے قبیلہ کا تھا،

مذکورہ تنقیدی قصوں سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مذہبی رجحانات صدر اسلام میں پسندیدہ تھے، مگر دوبارہ قبائلی عصبیت اور جاہلی اختلافات پیدا ہو جانے کے بعد صدق و مذہب کا عنصر اس دور کی تنقید سے خارج ہو گیا، تعجب تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے اخطل کو جو نصرانی تھا، اموی خلفا نے اتنا بیباک کر دیا تھا، کہ اس نے نصارا اور اسلام کا مذاق اڑایا،

ذهبت قريش بالمكارم كلها ولقى اللؤم في عمائم الانصار

قریش نے سارے مکارم حاصل کرلئے اور ملامت انصاریوں کے عماموں میں باقی رہ گئی،

ان اشعار پر حضرت معاویہؓ نے بھی اس سے باز پرس نہ کی، اکثر وہ شراب میں بد مست عبدالملک کے دربار میں آتا تھا،

اموی عہد میں تنقید کے ارتقار کا ایک بہت اہم پہلو عربی شاعری کے نقائض ہیں، ان کو "نقائض جریر و فرزدق" کہا جاتا ہے، تین شاعروں جریر، فرزدق اور اخطل میں باہم سخت رقابت تھی، یہ تینوں ایک دوسرے کی مخالفت میں، تلخ اشعار کہتے تھے، کہ پوری سوسائٹی اس سے متاثر ہو گئی تھی، ہر محفل کا یہ موضوع ہو گیا تھا کہ اُن میں کون بڑا شاعر ہے، خصوصاً جریر و فرزدق میں، نتیجہ یہ ہوا، کہ لوگ دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے، اور ایسے دو حریفوں کی طرح ان میں جھگڑے ہونے لگے، "مربد" بصرہ میں ایک بازار تھا، جہاں جریر اور فرزدق کی دوکانیں تھیں، ان دوکانوں پر زیادہ تر شعر و شاعری ہی ہوتی تھی، جس طرح عہد جاہلیت میں "عکاظ" میں شعرا جمع ہوتے تھے، اور ان کا کلام لوگ سنتے تھے، اور اس پر اپنے ذوق و فہم

کے مطابق تبصرے کرتے تھے، بالکل یہی حال مربد کا بھی تھا "مربد" میں دونوں شاعروں کے معتقدین جمع ہوتے تھے، اور بہت بڑا ہنگامہ کرتے تھے، یہ ہنگامے اتنے بڑھے کہ بالآخر گورنر بصرہ نے دونوں اڈوں کو گروا دیا، پھر بھی اُن کے دل کی آگ ٹھنڈی نہیں ہوئی،

فرزدق نے جریر اور اپنے بارے میں بڑی اچھی تنقید کی ہے، کہ" میں اپنے فسق کی وجہ سے جریر کے اندر جو رقت ہے، اس کا محتاج ہوں، اور اُن کو اُن کے عفیف کردار کی وجہ سے اشعار کی درستی کی ضرورت ہے" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فرزدق کو احساس تھا کہ غزل میں رقت ضروری ہے جب کہ اس کے یہاں درشتی زیادہ تھی،

اخطل نے جریر و فرزدق کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "جریر سمندر سے پانی لیتا ہے اور فرزدق چٹان توڑتا ہے" یہ بڑی صحیح تنقید ہے، واقعہ یہ ہے کہ جریر کی شاعری میں سلاست اور فرزدق کے یہاں شوکت اور مشکل پسندی غالب ہے،

فرزدق نے نابغہ جعدی پر یہ تنقید کی کہ" ان کے پاس ایک ہزار کی چادر اور ٹکے کا ٹاٹ دونوں ہیں یعنی بلند اور پست دونوں قسم کے اشعار ملتے ہیں،

اخطل کے متعلق جریر کی رائے ہے کہ وہ بادشاہوں کی تعریف میں ید طولیٰ رکھتا ہے، اس سے پوچھا گیا کہ فرزدق و اخطل کیسے شاعر ہیں، ؟ اس نے کہا میں تو مدینۃ الشعر ہوں، فرزدق کے پاس صرف فخر ہے، اور اخطل شراب کی بہترین تعریف کرتا ہے، فرزدق کے یہاں پست اور بلند دونوں قسم کے اشعار مل جاتے ہیں،[۱]

ان نقائض و مباحات سے عربی تنقید کو غیر معمولی فائدہ پہونچا، شعراء میں اچھے اور پسندیدہ اشعار کہنے کے جذبے نے اُن کو کد و کاوش پر مجبور کر دیا، اس لئے ایسے بے شمار

---

[۱] الموشح تالیف مرزبانی ص ۱۷۱،

الفاظ استعمال ہونے لگے، جو اگر ان میں چشمک نہ ہوتی تو وہ کبھی شعر کے قالب میں نہ آتے، عام لوگوں میں اچھے شعر سے لطف لینے کا سلیقہ و ذوق پیدا ہوا، الفاظ و ترکیبوں میں وسعت پیدا ہوئی، نقائض نے ادب تنقید کا ایسا ذخیرہ پیدا کر دیا، جس میں معاشرہ کے رجحانات بھی جلوہ گر ہیں، اس دور کے ناقد کسی ایک شاعر کی فضیلت پر متفق نہ تھے، راویوں کی جماعت فرزدق کو ترجیح دیتی تھی، عام شعراء جریر کی افضلیت کے قائل تھے، عصبیت پھر واپس آگئی تھی[۱] جاہلی عصبیت اور شعراء کے جھگڑے بھی فائدے سے خالی نہ تھے، اس سے سخن گوئی میں غور و فکر کا ایک عام رجحان پیدا ہوا اور اچھے اشعار زبان زد خاص و عام ہوگئے،

قدیم و جدید کا جھگڑا اسی دور سے شروع ہوگیا تھا، احمر اور اصمعی وغیرہ ایک ہی محفل میں کسی شعر کی تحسین کرتے، مگر جب اُن کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ قدیم شاعر کا نہیں، بلکہ کسی جدید اور زندہ شاعر کا کلام ہے، تو فوراً کہہ دیتے، کہ اسی وجہ سے اس میں تکلف نمایاں ہے، کبھی کبھی اس کو غیر فصیح بتاتے، عصر عباسی میں شاعروں کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں، ان میں اس طرز کے بہت سے قصے ملتے ہیں، جن سے قدامت سے عام شغف اور جاہلی شاعری سے حسن ظن نظر آتا ہے،

ابن ابی عتیق نے عمر بن ابی ربیعہ پر بڑی عمدہ تنقید کی ہے، کہ تم عورتوں کا تغزل نہیں کرتے، بلکہ اپنے نفس کے لئے اشعار کہتے ہو،[۲]

غزل میں حسن سے وجدانی تعلق ظاہر ہونا چاہئے، نفسانی خواہشات کا بیان ابن ابی عتیق کے نزدیک تغزل نہیں ہے،

---

[۱] النقائض فی الشعر العربی تالیف احمد نشاشب، ص ۴۰۹، [۲] الاغانی مطبوعہ دار الفکر بیروت، تالیف ابو الفرج جلد ا ص ۶۲

اس دور میں صناعت اور "نقد" کے الفاظ تنقید کے لئے مستعمل نہیں تھے، بلکہ حکم "فیصلہ" قضا" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، اس کے معنی بھی فیصلہ ہی کے ہیں،

اس دور تک تنقید شخصی پیمانوں سے آزاد نہیں ہوئی تھی، بلکہ اس میں ذوق اور میلانات کو بڑا دخل تھا،

لیکن تنقید میں اصول ومبادی کے رجحانات نمایاں ہونے لگے تھے، جیسا کہ عبد الملک تنقیدوں سے ظاہر ہوتا ہے،

امیر الدین آزاد

اور

اُن کا کلام

از

از جناب ڈاکٹر لطیف حسین صاحب ادیب

غلام بسم اللہ بسمل تلمیذِ غالب کے مکان میں اُن کی زندگی ہی میں آگ لگ گئی تھی[۱]، جس سے اُن کا ذخیرۂ کتب تلف ہوگیا تھا، اتفاقی طور پر ایک صندوق میں ایک قلمی بیاض (۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء) آتشزدگی سے بچ گئی تھی جو میرے پیشِ نظر ہے، یہ بیاض خود امیر الدین آزاد کی تحریر کردہ ہے، اس میں اُس زمانے کے مقامی اور بیرونجات کے شعراء کا کلام ہے، امیر الدین آزاد نے اپنا کلام بھی نقل کیا ہے، جو اُن کے دیوان کی عدم موجودگی میں خاص اہمیت کا حامل ہے، بیاض دو کالمہ ہے، ہر کالم میں تین اشعار ہیں، ورق کا سائز ۱۲ x ۱۸ سینٹی میٹر، کاغذ ملائم چکنا، اور خط نستعلیق ہے، عنوانات ہلکی سُرخ روشنائی سے لکھے گئے ہیں، چار اوراق (۲، ۳، ۶، ۷) تلف ہو چکے ہیں، اُن کی مجموعی تعداد ستر ہے، ناقص الآخر ہے، آزاد کے کلام کی تفصیل اس

---

[۱] غلام بسم اللہ بسمل محلہ قلعہ نزد جامع مسجد بریلی میں رہا کرتے تھے، اب اس مکان میں اُن کے پوتے جناب عبدالقادر رہتے ہیں،

طرح ہے :-

کلام اردو

ایک مثنوی مسمّی بیانِ عشق۔ تعداد اوراق ۲۰، ایک دو غزلہ۔ تعداد اشعار ۲۲۔ تین غزلیات۔ تعداد اشعار، ۳۰، ایک نا تمام غزل۔ تعداد اشعار ۴، دو قطعات۔

کلامِ فارسی

چار ابیات کہ از آں از ہر چیز نام عطا حسین برآید" ایک قطعہ بسلسلہ تاریخ معزول شدن نکندراس و منصوب شدن کرامت حسین" ایک تاریخ بسلسلہ تعمیر بنگلہ نواب عطا حسین،

بیاض سے امیرالدین آزاد اور نواب عطا حسین عطا کے درمیان تعلق کا بھی علم ہوتا ہے، آزاد نے ان کا کلام بھی نقل کیا ہے، نواب عطا حسین عطا ابن نواب عظمت علی تجبر کا تعلق کمبوہانِ میرٹھ سے تھا، بسمل سے اُن کی رشتہ داری تھی، دونوں ایک ہی حویلی میں رہتے تھے، شاید اسی قربت کی وجہ سے یہ بیاض بسمل کی تحویل میں گئی، امیرالدین آزاد کو نواب عطا حسین کی رفاقت میسّر تھی، نواب صاحب بسلسلۂ علاج فرخ آباد گئے، تو آزاد ان کے ہمراہ تھے، اس سفر پر وہ رئیس سے آزاد کے علاوہ کرامت علی خان شہیدی اور محسن علی خان جوش بھی وابستہ تھے،

امیرالدین آزاد کے مفصل حالات نہیں ملتے، صرف چند باتیں معلوم ہو سکی ہیں، وہ میر غلام علی عشرت (متوفی ۱۲۱۱ھ) کے شاگرد (بروایت شیفتہ و کریم الدین وغیرہ) اور فارسی کے عالم تھے، انھوں نے بریلی کے مشہور غزل گو اور قصیدہ نگار نواب نیاز احمد خاں ہوش (متوفی ۱۲۹۵ھ) کو فارسی پڑھائی تھی، (بروایت الطاف علی بریلوی[1]) نواب عطا حسین عطا کی رفاقت میں فرخ آباد گئے، اور وہاں اپنے صاحبزادے شیخ یار علی استاد کے ساتھ نواب عظمت علی تجبر کی سرپرستی میں

---

[1] ... حافظ رحمت خاں، مطبوعہ نظامی پریس بدایوں، (ص ۳۰۶)

قیام کیا، (بروایت ولی اللہ[1]، سید علی حسن[2]) ان کا انتقال ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۷ء-۱۸۶۸ء میں ہوا، نیاز احمد خاں ہوش نے قطعۂ تاریخ کہا[3]،

جنابِ مکرم جو آزاد تھے، گئے آہ وہ سوئے دارالبقار
بہشت بریں کا ہے آزاد مرد، یہ سال رضواں نے لکھ کہا،
۱۲۸۵ھ

امیرالدین آزاد کا دیوان دستیاب نہیں ہوتا، ان کا بیشتر کلام مذکورہ بیاض میں ہی محفوظ ہے، سید ولی اللہ نے تاریخ فرخ آباد میں چھ فارسی اور تین اردو اشعار نقل کئے ہیں، مگر وہ دونوں تاریخ فرخ آباد میں شامل ہیں، شیفتہ اور کریم الدین نے صرف ایک شعر نقل کیا،

بن ترے سیر چمن کو نہ گئے ہم ورنہ، خندۂ گل نے مجھے خوب [illegible]

ایک واسوخت (۱۴ بند) "مجموعۂ واسوخت" میں شامل ہے[4]، مرتب مجموعۂ واسوخت نے بھی اُن کے کلام کی نایابی کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں،

"آزاد تخلص ہے محمد امیرالدین صاحب کا، باشندہ ہیں بانس بریلی کے۔ شاگرد رشید ہیں میر غلام علی صاحب عشرت تخلص کے۔ کلام اُن کا سوائے اس واسوخت کے جو شامل مجموعۂ ہذا ہے، نظر سے نہیں گذرا، نہ اور کوئی شعر ان کا سُنا"،

ایوب قادری صاحب فرماتے ہیں[5]:-

---

[1] مؤلف تاریخ فرخ آباد ۱۲۴۳ھ مخطوطہ رضا لائبریری رامپور ص ۲۲۶، [2] [illegible] صبح گلشن ۱۲۹۵ھ ص ۲۷، مطبع شاہجہانی بھوپال۔ [3] از کلیات ہوش، ص ۲۱۱ مطبوعہ گلشن فیض لکھنؤ ۱۳۱۲ھ [4] مرتبہ منشی فدا علی مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۲۸۵ھ (مطابق ۱۸۶۸ء) [5] مکتوب گرامی جناب قادری صاحب بنام راقم الحروف مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۶۳ء

"۱۸۳۶ء میں رحیم بخش نے چودھری بسنت رائے کو قتل کر دیا تھا، اس کے پھانسی پانے پر آزاد نے ایک مرثیہ کہا تھا[۱]"

مجھے یہ مرثیہ نہیں مل سکا، اس وقت چند غزلیں، ایک واسوخت اور ایک مثنوی پیش نظر ہے،

امیرالدین آزاد کی غزلوں میں آورد ہے، بریلی کے ابتدائی دور شاعری کی سادگی اور تخیل کی رفعت و پاکیزگی نہیں ہے، میر غلام علی عشرت نے بریلی میں خارجی شاعری کی بنیاد رکھدی تھی، آزاد نے اس کو فروغ دیا، اور غزل کی رہی سہی دلکشی بھی ختم ہوگئی، ہمارے خیال میں خارجی شاعری کے فروغ کا سبب یہ بھی تھا کہ بریلی میں انیسویں صدی کا نصف اول تلاش و جستجو کا تجرباتی دور تھا، آزاد اس دور کے نمایندہ تھے، انھوں نے اس مخصوص رنگ کو فروغ دیا، اس کا تکملہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہوا، نیاز احمد خاں ہوش، احمد حسین خاں جوش، اور عبدالعزیز خاں عزیز نے اپنی قابل رشک صلاحیتوں سے اس میں انفرادی شان پیدا کی،

امیرالدین آزاد کا نمونۂ کلام یہ ہے :-

وہ سرو سہی بالا جب باغ کو جاتا ہو ... کیا کیا گل و بلبل کو آپس میں لڑاتا ہو
نت خون کا وہ دریا سفاک بہاتا ہو ... اٹھتی جو جوانی ہے طوفان اٹھاتا ہو
گل آتش گلشن سے انگاروں پہ لوٹے ہے ... جس دم وہ گل خنداں گلگشت کو جاتا ہو
سنتا ہوں کسی کے جب مہمان انھیں جاتے ... بس پھر تو دل ناداں اک دھوم مچاتا ہو

---

[۱] اس واقعہ کی تفصیل کے لئے دیکھئے حیات حافظ رحمت خاں صفحہ ۳۶۱ (۱۹۳۶ء بدایونی اڈیشن)

مارا ہے ہمیں کس نے دُزدیدہ نگاہوں سے زخمِ دلِ غم دیدہ پانی سا چراتا ہے
دو حرف نہیں لکھتا خط آئے یہ بھی خفا کے کیا جانئے کون اُس کو ناخواندہ پڑھاتا ہے
ہوتی ہی مری حالت صحبت میں عجب اُس کی جاں خوف سے گھٹتی ہے دل ہاتھ بڑھاتا ہے
لکھا ہے مگر اُس کا وصفِ لبِ پاں خوردہ خامہ جو ہنوز اپنا لوہو میں نہاتا ہے
آتا ہے خطاب اُس کے ہم دیجے غلامی خط انجام نظر ہم کو آغاز میں آتا ہے
ناخوش نہ ہوں صاحب بندہ کی خوشامد سے بگڑا ہی ہوئی بات اپنی ہر کوئی بناتا ہے
خاموش رہے کیونکر بس ایک غزل پڑھ کے وہ اپنے غزل خواں کو ترغیب دلاتا ہے

ولہ

بے ہیچ نہیں گریہ ساتھ آہ کے آتا ہے وہ آگ لگاتی ہے یہ آگ بجھاتا ہے
وہ سروِ روان شاید گلشن میں اب آتا ہے بلبل مترنم ہے گُل فرش بچھاتا ہے
لکھتا ہے صفت خط کی اس رُو سے کتابی کے ہر حرفِ قلم اپنا تصویر بناتا ہے
وہ گُل سا بدن دیکھا شبنم کے دوپٹے سے پھولا نہیں جامے میں ہر پھول سماتا ہے
حسرت تو نہ رہ جائے تو آئے جو بالیں پہ یہ صید زبوں یوں ہی آخر ہوا جاتا ہے
جاتے ہو جو تم اے جاں دل کو بھی لئے جاؤ بھولی ہوئی باتوں کو پھر یاد دلاتا ہے
کیا خوب بنی تو وہ خاکِ دلِ سوزاں سے طفلی سے نشانہ ہی ہونا اُسے بھاتا ہے

ق

قصۂ غمِ دوری کا کاہے کو سُنے گا وُہ اس جوشش گریہ پہ رونا مجھے آتا ہے
یعنی بہ صفائے رُخ اک بیت اگر پڑھئے تو صاف مکدر ہو سو مُنہ پہ سناتا ہے
بدنام نہوں کیونکر آزاد یہ فریاد نامہ کا وہ پچھلا تل میں لگاتا ہے

کے انقلاب اور اُس کی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، اور سامراج کی حقیقت بیان کی
متعلق لینن اور دوسرے کمیونسٹوں کے خیالات اور اُن کی سامراج دشمنی کے د
تردید کی ہے، نئے امریکی سامراجیا اور کسی سامراجی طاقت کے موجودہ زمانہ میں اُبھر
کو ناممکن بتایا ہے، ایک تقریر میں انھوں نے چین اور ہندوستان کی ترقیاتی ا
کرکے اوّل کو خرگوش اور دوسرے کو کچھوے سے تشبیہ دی ہے، کتاب کے آخری
جمہوریت کی تعریف، اس کا تجزیہ اور اس پر بعض اعتراضات کا جواب دیا گیا
اور کمیونزم کے نقائص بیان کرکے جمہوری، کمیونسٹ اور سوشلسٹ نقطہ نظ
گیا ہے، مصنف خود جمہوری سوشلزم کے قائل ہیں، لیکن اُن کے تجزیے غیر جانبد
خیالات غور و فکر پر مبنی ہیں، مجموعی حیثیت سے موجودہ دنیا، اور اس عہد کے حا
کے متعلق یہ بڑی معلوماتی کتاب ہے، اور ترجمہ بھی سلیس ہے،

حمید نظامی ۔ مرتبہ جناب شورش کاشمیری صاحب تقطیع خورد، کاغذ،
وطباعت عمدہ صفحات ۱۱۲ مجلد مع گرد پوش، قیمت :- ۵ روپیے، پتہ :- مطبو
چٹان ۸۰ میکلوڈ روڈ لاہور،

آغا شورش کاشمیری مدیر چٹان نے اس کتاب میں مشہور پاکستانی صحافی ا
نوائے وقت کے اڈیٹر حمید نظامی مرحوم کے متعلق اپنے تجربات، مشاہدات اور تا
لکھے ہیں، ان کی سیرت و کردار، اُن کی خصوصیات اور زندگی کے نمایاں پہلوؤں
کمالات، تحریک پاکستان کی حمایت، جرأت و بیباکی، خودداری، مروّت و
بے تعلقی، حریفوں سے چشمک، ارباب اقتدار سے چپقلش، اُن کی شب و روز
تصویر کھینچ دی ہے، آغا صاحب کے مصدر و مرقع نگار قلم نے ایک داستان بیان کی ا

مثنوی کی کتابت عام روش سے قدرے مختلف ہے، مثلاً

اوچی = اس کے ۔ آستی = اٹھتی ۔ اوتھی = اٹھی ۔ اسے = آئی ۔ بیکنہ = بے گنہ

ہنک = چھینک ۔ بہتا = بیٹھا ۔ سے ... جی ۔ جھوٹے = چھوڑی ۔ وہنک = ڈھنگ

سپی = سے ۔ کم = گھم ۔ کہر = گھر ۔ نکہ = نرکہ ۔ دہاں = واں

اس مضمون میں مثنوی کے اشعار کا املا میں نے موجودہ رسم الخط میں کیا ہے،

قدما کے دستور کے مطابق مثنوی کا آغاز حمد باری تعالی سے ہوتا ہے،

ہے اسی کے نام سے آغاز بخشی ۔۔۔ کہ جس نے عشق کو تاثیر بخشی
اسی کے شوق میں [illegible] ہے بلبل ۔۔۔ اسی کی حمد میں ہے تر زبان گل
اسی کے داغ غم سے شمع گریاں ۔۔۔ اسی کے سوز سے پروانہ بریاں

اس کے بعد نعت سرور دو عالم پیش کی گئی ہے:-

محمدؐ ہے نبی سارے جہاں کا ۔۔۔ نہوتا وہ تو پیدا کچھ نہ ہوتا
اسے معراج کو عرش بریں پر ۔۔۔ اُسے سجدہ کو مسجد سب زمیں پر
محمدؐ مقتدائے انبیا ہے ۔۔۔ محمدؐ پیشوائے اولیا ہے،
کوئی جانے پیغمبر کو کیا ہے ۔۔۔ عجب اک مظہر نور خدا ہے،
دلیل قدرت حق اس کو کہئے ۔۔۔ سراپا رحمت حق اس کو کہئے
درود اللہ کا اس پر اور اُن پر ۔۔۔ جو اُس کی آل ہے پاکیزہ گوہر
اور اُن پر جو کہ ہیں اصحاب اسکے ۔۔۔ سپہر فضل کے ایک ایک تارے
ذرا ہوشیار ہو اے ساقی مست ۔۔۔ کیا بار تعقل نے بہت پست
مجھے دے جام راح روح افزا ۔۔۔ کہ کہا چاہتا ہوں ایک قصہ

علاوہ ہیں، انھوں نے حمید نظامی کی سرگذشت کا یہ خاکہ گذشتہ سال اپنی اسیری کے زمانہ میں ہفتہ عشرہ کے اندر ارتجالاً قلمبند کیا تھا، اس لئے اس میں بڑی بے ساختگی اور برجستگی، اور ان کی پرزور انشار کی تمام خصوصیات نمایاں ہیں،

بارش رحمت و باران رحمت: از جناب مولوی سلمان احمد صاحب ہلالی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۸۰، قیمت بالترتیب عہ، و ۵۰ پیسے،

پتہ: نظامی بک ایجنسی بدایوں۔ یو۔ پی،

یہ دونوں مجموعے مولوی سلمان احمد صاحب ہلالی وکیل بدایوں کے فکرِ سخن کا نتیجہ، اور اور قصائد نعت و منقبت پر مشتمل ہیں، اس میں مصنف نے اخلاص و عقیدت کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے، اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات کی مصوری بھی کی ہے، کلام کا معیار معمولی اور طرزِ بیان سادہ ہے،

اللہ میاں کا جادو مرتبہ مولانا ابراہیم عمادی صاحب متوسط تقطیع صفحات
اخلاقی کہانیاں بالترتیب ۶۸، ۱۱۴، ۱۰۴، کاغذ، کتابت و طباعت
بچوں کی شہرت بہتر، قیمت: ۰۰ پیسے و ۷۵ پیسے و عہ

پتہ: صدیقیہ بک ڈپو، بھنڈی بازار بمبئی ۳

لائق مصنف ایک تجربہ کار معلم ہیں، انھوں نے بچوں کی اصلاح و تربیت اور بنیادی ضروری معلومات کے لئے اُن کے مذاق اور طبیعت کے موافق نہایت دلچسپ زبان اور آسان انداز میں کئی مفید کتابیں لکھی ہیں، یہ تینوں کتابیں اسی سلسلہ کی ہیں، پہلی کتاب میں قدرت کے مختلف کرشموں، بادل، بارش، ہوا، سورج اور نباتات وغیرہ کے علاوہ گاؤں، عجائب اور قومی و مذہبی تہواروں کے متعلق بچوں کے لئے مفید معلومات تحریر کئے گئے ہیں، دوسری کتاب

کہا بیٹے سے اے کم بخت بدخو
میں کہتا تھا نہ جایا کر کہیں تو
مجھے سمجھائے بن تجھکو نہ رہنا
نہ مانا پہ نہ مانا تو نے کہنا
کرے خالق زمیں کا اس کو پیوند
نہو جو باپ کے کہنے میں فرزند

یاجب جوان وزیر زادی سے آخری ملاقات کے لئے جاتا ہے، تو وہ پورا ماجرا سننے کے بعد ہوش کھو بیٹھتی ہے،

ہوئی سنتے ہی نقشِ خاک وہ ماہ
نکالی درد سے آہ پر آہ،
بہت روئی کیا تر آستیں کو
رُلایا ساتھ اپنے ہم نشیں کو
ہوئی یاں تک بوحشت گرم شیون
کہ تھا چاکِ گریباں تا بدامن
کیا جو دشنۂ غم سے جگر خوں
بنی وہ رشکِ لیلیٰ رشکِ مجنوں
تپانچوں سے کیا نیلا رُخ اپنا
گُلِ عارض گُلِ سوسن بنایا
نہ ہاتھ اُس کا پکڑ لیتا جو وہ ناگہ
تو مر جاتی وہ اپنے آپ کو مار

جوان اس کو سمجھاتا ہے،

یہی دستور ہے سارے جہاں کا
کمالِ عشق ہے نقصان جاں کا
نہیں غم ہے ہمیں ہے بلکہ شادی
مراد اپنی یہی ہے نامرادی

ملک زادی کہتی ہے

کہ سُن اے عاشقِ صادق میری بات
جو ہو منظور جسمانی ملاقات
تو میں حاضر بدل ہوں اور تابع
نہیں ہے دوسرا یاں کوئی مانع

اس پر جوان کہتا ہے:-

یہ سُن کہنے لگا وہ پاک داماں
یہ کیا تم کو خیال آیا میری جاں

اس کے بعد قصہ کا آغاز ہوتا ہے،

سلف میں شاہ تھا ایک نام محمود سب اس محمود کا تھا نام محمود

محمود ایک عادل بادشاہ تھا، وہ رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے شب کو بھیس بدل کر گھوما کرتا تھا، ایک جوان عشق پیشہ وزیر زادی پر عاشق تھا، جدات کے وقت محل میں کمند کے ذریعہ داخل ہوکر وزیر زادی سے ملا کرتا تھا، بادشاہ نے جوان کو کمند ڈالتے ہوئے پکڑ لیا، اُس چوری کا جرم عائد کرکے ضمانت طلب کی، ایک دوست نے اُس کی ضمانت کرلی، اور وہ صبح تک کے لئے چھوڑ دیا گیا، جوان وزیر زادی سے آخری بار ملنے کے لئے محل میں داخل ہوا، اس کے تعاقب میں بادشاہ بھی پہونچا، چھپ کر جوان اور وزیر زادی کی گفتگو سُنی، اُن کی گفتگو اور پاکدامنی سے بہت متاثر ہوا اور صبح کے وقت جوان کو طلب کرکے وزیر زادی سے اس کی شادی کردی،

کہانی طبع زاد نہیں ہے، جائسی کی پدماوت میں بھی راجہ رتن سین سنگلدیپ کے قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش میں چوری سے متہم ہوکر پکڑا جاتا ہے، اور پدمنی کا باپ راجہ گندھرو سین اس کو پھانسی دینے کا حکم دیتا ہے، آخر میں پدمنی اور رتن سین کی شادی ہوجاتی ہے، بادشاہ کا بھیس بدل کر راتوں کو گھومنا، مشرقی کہانیوں میں عام ہے، عشق صادق، مصائب کے طوفان، اخلاق کی نمود، شاہوں کا عدل، اور آخر میں عاشق کی کامیابی اس قسم کی کہانیوں کی عام خصوصیت ہے، بیان عشق بھی ایک منظوم کہانی ہے، اس لئے وہ بھی ان خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں ہے،

بیان عشق میں قصہ پن زیادہ ہے، منظر کشی، بامحاورہ زبان، روزمرہ کا لطف اور رسوم کا بیان نہیں ملتا، صنعت گری بھی نہیں ہے، البتہ جذبات نگاری ضرور ملتی ہے، صاف ستھری زبان نے جذبات کی گرمی کو قائم رکھا ہے، مثلاً جب بادشاہ پدمنی کی تلاش میں جوان کو اس کے باپ کے پاس لیجاتا ہے، اس وقت جوان کا باپ جو اس سے سخت نالان تھا، کہتا ہے،

کہا بیٹے سے اے کم بخت بدخو | میں کہتا تھا نہ جا یا کر کہیں تو
مجھے سمجھائے بن تجھکو نہ رہنا | نہ مانا پہ نہ مانا تو نے کہنا
کرے خالق زمیں کا اس کو پیوند | نہ ہو جو باپ کے کہنے میں فرزند

یاجب جوان وزیر زادی سے آخری ملاقات کے لئے جاتا ہے، تو وہ پورا ماجرا سننے کے بعد ہوش کھو بیٹھتی ہے،

ہوئی سنتے ہی نقشِ خاک وہ ماہ | نکالی درد سے آہ پر آہ،
بہت روئی کیا تر آستیں کو | رُلایا ساتھ اپنے ہم نشیں کو
ہوئی یاں تک بوحشت گرم شیون | کہ تھا چاکِ گریباں تا بدامن
کیا جو دشنۂ غم سے جگر خون | بنی وہ رشکِ لیلیٰ رشکِ مجنوں
تپانچوں سے کیا نیلا رُخ اپنا | گُلِ عارض گُلِ سوسن بنایا
نہ ہاتھ اُس کا پکڑ لیتا جو وہ ماہ | تو مرجاتی وہ اپنے آپ کو مار

جوان اس کو سمجھاتا ہے،

یہی دستور ہے سارے جہاں کا | کمالِ عشق ہے نقصان جاں کا
نہیں غم ہے ہمیں ہے بلکہ شادی | مراد اپنی یہی ہے نامرادی

ملک زادی کہتی ہے

کہ سُن اے عاشقِ صادق میری بات | جو ہو منظور جسمانی ملاقات
تو میں حاضر بدل ہوں اور تابع | نہیں ہے دوسرا یاں کوئی مانع

اس پر جوان کہتا ہے:۔

یہ سُن کہنے لگا وہ پاک داماں | یہ کیا تم کو خیال آیا میری جاں

رہا میں زندگی میں فسق سے دور — درم آخر بھلا کیونکر ہو منظور

نہیں تم کو کلام ایسا مناسب — نہایت بات ہے یہ نامناسب

یہ کہتی کیا ہو یہاں کب دوسرا ہے — خدا سے تو ڈرو حاضر خدا ہے

یہ جذبات حقیقت پر مبنی ہیں، ان میں مصنف کا میلان طبع شامل ہے، پوری مثنوی مخرب اخلاق مضامین سے پاک ہے، بوس و کنار، وصل و ہم آغوشی وغیرہ کا کہیں ذکر نہیں،

مثنوی میں ایسے مواقع کم ہیں جہاں آزاد نے زور قلم کا ثبوت دیا ہے، البتہ ایک مختصر سراپا میں اُن کے قلم نے حسن کاری دکھائی ہے، چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں،

شکم میدے کی لوئی صاف شفاف — کمر تا بر نظر چشم پری ناف

سُرین وران بہ رنگِ خرمنِ گل — سب اُس کی جستجو میں شل بلبل

ہوئی بزم امید خلق پُر نور — کہ تھی ساق بلوریں شمع کافور

نگاریں پاؤں کا عالم کہوں کیا — کفِ پا گلشنِ چشم تماشا

"واسوخت آزاد" مجموعۂ واسوخت (۱۲۸۵ھ) میں شامل ہے، منشی فدا علی کے بیان کے مطابق "مجموعۂ واسوخت" کا مسودہ تین سال اُن کے پاس محفوظ رہا، اس لئے واسوخت آزاد ۱۲۸۲ھ یا اس سے پہلے کی تصنیف ہے، اس طرح اُن کے واسوخت، مذکورہ بالا غزلیات و مثنوی کے درمیان تقریباً چھبیس سال کا وقفہ ہے، اس زمانے میں زبان نے ترقی کی، آزاد کے کلام میں بھی نکھار پیدا ہوا، واسوخت آزاد سے اس عہد کی زباندانی کے نمونے کا اندازہ ہوتا ہے،

واسوخت اکتالیس بندوں پر مشتمل ہے، اس میں بیان وصل و عشق کی طرب انگیز تفصیل سراپا بھی نہیں ہے، اس کی خوبی، اس کا زور بیان ہے، چند بند ملاحظہ ہوں،

عشق وہ ہوش رُبا ہے کہ الٰہی توبہ عشق وہ سیلِ فنا ہے کہ الٰہی توبہ
عشق وہ برقِ بلا ہے کہ الٰہی توبہ عشق وہ تیغِ قضا ہے کہ الٰہی توبہ

الاماں آتشِ جاں سوز مصیبت ہے عشق
الحذر تابشِ خورشید قیامت ہے عشق

یہ وہ طرفہ گلستاں ہے کہ بہار اسکی خزاں پھل ہے تلوار کا پھل پھول گلِ داغ عیاں
بلبلِ نغمہ سرا نالۂ موزوں ہے یہاں چشمۂ چشم ہے جاری عوضِ نہرِ رواں

نفسِ سرد نسیمِ سحری کے بدلے
طائرِ روح اُڑا کبکِ دری کے بدلے

یہ وہ شمشیرِ اجل ہے کہ نہیں اسکی پناہ اس کا ماہی سے چلا آتا ہے قبضہ تا ماہ
وہ اژدر ہے کہ ہے کام نہنگ اس کا نگاہ گل و بلبل ہیں کرتا ہے ہزاروں کو تباہ

پس کے خورشیدِ فلک خاک کا ذرہ ہو جائے
چرخِ سیار اس اندوہ سے چرخا ہو جائے

وہ ہوا ہے کہ بلند آتشِ نہاں کر دے وہ صدا ہے کہ دماغوں کو پریشاں کر دے
وہ سحاب ہے کہ گلستاں کو بیاباں کر دے وہ جفا ہے کہ لبِ نہر پہ افغاں کر دے

یہ وہ لالہ ہے کہ قبا کوہ کا دامن ہو جائے
اور شگفتہ ہو جو گلشن میں سو گلخن ہو جائے

چشمۂ زیں ایک پری رو کا میں دیوانہ تھا شمعِ رخسارۂ گلرنگ کا پروانہ تھا
خانۂ کعبۂ دل اپنا صنم خانہ تھا تختِ شاہی مجھے سنگِ درِ جانانہ تھا

میرے خوش ہونے کے ساماں مہیا کرتے تھے

کام کرنے کا مرے آپ کیا کرتے تھے

اک مری چاہ سے سو چاہنے والے نکلے — ناز ایجاد ہوئے طرز نرالے نکلے
بالیاں کانوں کی ٹھنڈی ہوئیں بالے نکلے — بالے کیسے مہِ رخسار کے ہالے نکلے

نئی وضعیں ہوئیں کاتیں نئی انداز نئے
نئی حیلیں حیلاتیں نئی ہمراز نئے

پیش ازیں تھا نہ کسی بات پہ ایسا انکار — دلبری کیا ہوئی کیا ہوگئے اگلے اقرار
اب جو میں بات بھی کرتا ہوں تو سننا ہے گوارا — خو یہی آگے سے ہوتی تو نہ بڑھتی تکرار

ایک دم درد ترحم سے ہمارا نہ سنا
بیوفا تجھ سا زمانے میں نہ دیکھا نہ سنا

میں گیا تجھ سے تو پھر تو بھی زمانے سے گیا — بزم میں بیٹھنے کے لطف اٹھانے سے گیا
منزلت صحبتِ دلخواہ میں پانے سے گیا — اور وفا پیشوں میں تو آنکھ ملانے سے گیا

حسن صورت نہ رہے ناز فروشی کم ہو
خاک میں تھا خریدار سے تیرا دم ہو

جو رخِ رُخ سے ستم زلفِ دوتا سے چھوٹے — روز فرقت سے شب غم کی جفا سے چھوٹے
خوب ناکردہ گناہی کی سزا سے چھوٹے — شر گیا خیر ہوئی بند بلا سے چھوٹے

تو وہ ہے تجھ سے ملے جو کوئی ناشاد رہے
بندگی میں تری بے فائدہ آزاد رہے

میں نے بڑے بوڑھوں کی زبانی سنا تھا، کہ امیرالدین آزاد دبستان دہلی کے باوا آدم ہیں، میرے پیش نظر تو آزاد سے ڈیڑھ سو برس پہلے کا دور شاعری ہے، آزاد کے اُستاد

میر غلام علی عشرت کو بھی بریلی کی شاعری کا باوا آدم نہیں کہا جا سکتا، البتہ یہ صحیح ہے کہ وہ پچھلی صدی میں بریلی کے ایک بڑے استاد تھے، اور انھوں نے شاعری میں محاکاری کی روایت کو فروغ بخشا، اور ان کے شاگرد نواب نیاز احمد خاں ہوش نے اس روایت کو بام عروج پر پہنچایا، انہی پر یہ طرز شاعری ختم ہو گیا، ان کے بعد چند شاعروں نے رفعت تخیل اور صنعت گری کو جذبات نگاری کے مقابلے میں جگہ دی، مگر وہ کامیاب نہیں ہوئے، ان کی حالت چھوٹی موٹی پھلجھڑیوں سے زیادہ نہیں ہے، مختصر یہ کہ جس طرز کی بنا عشرت نے ڈالی تھی، اس کی اشاعت آزاد نے کی، اور اس کا تکملہ ہوش پر ہوا،

ادبیات

حقائق و معارف

از

جناب فقرؔ موہانی صاحب

آئی نہ کام اُن کے جب اپنی زندگانی کس کام کی ملی بھی گر عمرِ جاودا

دل کی وہ بیقراری اشکوں کی وہ روانی دنیا سے کیا چھپائیں رازِ غمِ نہا

تجھ کو بھی کچھ خبر ہے اے محوِ لن ترانی کیا گذری عاشقوں پر سُن کر تری جا

کس کو سنائیں اُن کے وارفتگانِ الفت عبرت بھرا فسانہ حسرت بھری کہا

پھر بھی نہ کوئی سمجھا روداد دردِ الفت ہر چند آنسوؤں نے کی دل کی ترجما

دیکھا تھا کیا نظر نے یارب فصلِ گل میں آنکھوں میں پھر رہی ہے ہر چیز دھا

بیٹھا ہی ایک ظالم تھامے ہوئے دلوں کو اُٹھ غارتِ زمانہ ظالم تری جوا

کیونکر بدل نہ جاتا سُن کر نظامِ عالم دل کی مرے کہانی وہ بھی مری زبا

دنیا میں جب نہ پایا جانباز کوئی مجھ سا روتی ہے مجھ کو میری اب مرگِ ناگہ

آتا ہے یاد فقرؔ صبوحی میں اکثر
ساقی کا دستِ رنگیں وہ جامِ ارغوانی

......•......

غزل

از

جنابؔ طالبؔ چپڑی صاحب

اب اعتبارِ وعدۂ باطل نہیں رہا — یعنی کہ سعیِ شوق کا حاصل نہیں رہا
پہلو میں جس کے درد بھرا دل نہیں رہا — دونوں جہاں میں وہ کسی قابل نہیں رہا
سیلابِ حادثات کی بیدا د ا " ا ں — ساحل بھی میرے واسطے ساحل نہیں رہا
جو بات میں نے چاہی وہ دشوار ہو گئی — جو امر اُس نے چاہا وہ مشکل نہیں رہا
اب جس کو دیکھئے وہی بنتا ہے سرفروش — کیا اس دیار میں کوئی قاتل نہیں رہا
خستہ ہو یا شکستہ ہے سرمایۂ حیات — وہ دل جو تیری یاد سے غافل نہیں رہا
جو کچھ عطا ہوا، وہ مجھے بے طلب ہوا — وہ طالبِ کرم ہوں جو سائل نہیں رہا
مایوس ہو کے دل کو سکوں تو ہوا نصیب — لیکن وہ لطفِ وعدۂ باطل نہیں رہا

طالبؔ میں اپنے جہل سے آگاہ جب ہوا
کوئی مری نگاہ میں جاہل نہیں رہا

دبستان بریلی میں اردو مثنوی کا آغاز ہو چکا تھا، نواب محبت خاں محبت کی مثنوی اسرار محبت ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء، میر غلام علی عشرت کی مثنویات، پدماوت [illegible]ھ/۱۷۹۶ء اور ریاض حسین ۱۸۰۰ء، پنڈت دیا ناتھ تمنا کی مثنوی داغ دل ۱۲۳۸ھ/۱۸۲۲ء، امیر الدین آزاد کی مثنوی بیان عشق ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء سے پہلے کی اہم مثنویات ہیں، ہمارے خیال میں عشرت کی پدماوت بطور نمونہ آزاد کے پیش نظر رہی ہو،

مثنوی بیان عشق ۳۲۰ اشعار پر مشتمل تھی، چار اوراق تلف ہو جانے کی وجہ سے ابتدا میں ۴۸ اشعار ضائع ہو گئے، جیسا کہ ترقیمے سے معلوم ہوتا ہے، مثنوی نواب عطا حسین کی فرمائش پر لکھی گئی تھی،

"حسب فرمائش گل گلشن عظمت و کرم گستری گوہر معدن ہمت و صفا پروری نگین خاتم بختیاری، خاتم نگین کامگاری، والا نژاد عالی نہاد، شہر عطا بحر احسان بسیار بخش کم ستاں،

چمن زار اقبال را زیب و زین	عطا مروت عطاے حسین
بمانا د آں خوش منش دیرگاہ	باقبال و دولت با جلال و جاہ

رقم زدہ خامۂ ژولیدہ بیان شد کاتب الفقیر خضر نوبہ دستر عیسو بہ بتاریخ بست دو دوم رمضان المبارک ۱۲۴۴ھ ہجری نبوی"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کتابت بھی آزاد کے قلم سے ہے جو ۲۲ رمضان ۱۲۴۴ھ کو تمام ہوئی، (مطابق ۲۸ مارچ ۱۸۲۹ء) تاریخ مثنوی بھی ۱۲۴۴ھ ہے، جو اس مصرعہ سے برآمد ہوئی ہے، ع :- کہی تاریخ ہے یہ مثنوی خوب"

(۱۲۴۴ھ)

مجلس احیاء المعارف کی مطبوعات میں یہ آخری کتاب ہے، دو سال کی قلیل مدت میں اس مجلس نے سولہ

کتب کی طباعت کر کے دو ہزار سے زائد صفحات ملت اسلام کے سامنے پیش کیے، یہ صرف آٹھ نو کتابیں حکومت

لکھنا ... حضرت نے کچھ مدد کی ہے، مولانا افغانی مجلس کے ... کل ... علمی و ... کے ...

... مجلس کے لیے ... کتابیں کرتا ہے ضرورت ہے کہ اہل علم مجلس کے ساتھ دینی و علمی و فقہی ... تعاون کریں،

اور اس کی مطبوعات ... منظر عام پر لائیں ... اور ... اسلام کے ...

آخر میں اپنوں کی ناقدری اور غیروں کی قدردانی کے دو عبرت انگیز واقعات سنیے۔ مولانا افغانی نے ... نے

کو ۱۹۶۰ میں مختصر الطحاوی چھپا، اس کی قیمت چھ روپے تھی، مگر دو سال کے بعد پندرہ روپے ہو گئی، ایک ... مولانا ... تعریف لائے

تو انہوں نے معمول کے خلاف اس کی قیمت بڑھ جانے کی وجہ دریافت کی، مولانا نے فرمایا بات یہ ہوئی کہ ... کے ... فسخ ... جوان

نے مختصر الطحاوی کے کچھ نسخے نمونہ کے طور پر امریکہ کی یونیورسٹیوں اور کتب فروشوں کے یہاں بھیجے، چند دنوں کے بعد وہاں سے اس کی

مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی کیونکہ اب یورپ اور امریکہ کے تعلیم یافتہ اور مستشرقین سے دلچسپی رکھنے والے اہل علم کا عام رجحان یہ ہو گیا ہے کہ

اسلام کو اس کے اصلی خدوخال میں سمجھنے کے لیے قدیم ائمہ اسلام کی کتابوں کو دیکھنا چاہیے جن کا ذہن و مزاج خالص اسلامی تھا اور جو

اسلامی علوم و فنون کو ٹھیٹ اسلامی انداز میں الفاظ و عبارات اور فرق و ملل کے خارجی اثرات کے بغیر لکھتے تھے، اسلام

کی صحیح تصویر انہی کی کتابوں میں مل سکتی ہے، اسی لیے اب اہل قدیم سے قدیم اسلامی ماخذوں کی تلاش ہو رہی ہے، چنانچہ اسلامی فقہ

اور تشریعی قوانین کی تحقیق کے سلسلے میں مختصر الطحاوی بھی ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بن رہی ہے،

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ مجلس احیاء المعارف کی ایک کتاب مولانا نے بڑی عقیدت سے قدردانی کی امید پر حیدرآباد کے ایک بہت بڑے

عالم کو پیش کی، وہ اپنے قلم سے ... کی عقیدت مندانہ عبارت لکھی، چند دنوں کے بعد ... ایک ... کتب حیدرآباد کی پرانی کتابوں

کی خریداری کے سلسلے میں گئے، وہ ایک دکان سے پرانی کتابوں کا ایک ڈھیر خرید کر لائے۔ اتفاق سے مولانا بھی ان کے یہاں

تشریف لے گئے ... وہ کتاب ... جس پر ... ابھی کاٹے نہیں گئے تھے، انہوں نے

فوراً کتاب لے کر مولانا کے سامنے پیش کر دی، اور مولانا اسے دیکھ کر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد قصہ کا آغاز ہوتا ہے،

سلف میں شاہ تھا ایک نام محمود سب اس محمود کا تھا نام محمود

محمود ایک عادل بادشاہ تھا، وہ رعایا کا حال معلوم کرنے کے لئے شب کو بھیس بدل کر گھوما کرتا تھا، ایک جوان عشق پیشہ وزیر زادی پر عاشق تھا، جدات کے وقت محل میں کمند کے ذریعہ داخل ہوکر وزیر زادی سے ملا کرتا تھا، بادشاہ نے جوان کو کمند ڈالتے ہوئے پکڑ لیا، اُس پر چوری کا جرم عائد کرکے ضمانت طلب کی، ایک دوست نے اُس کی ضمانت کرلی، اور وہ صبح تک کے لئے چھوڑ دیا گیا، جوان وزیر زادی سے آخری بار ملنے کے لئے محل میں داخل ہوا، اس کے تعاقب میں بادشاہ بھی پہونچا، چھپ کر جوان اور وزیر زادی کی گفتگو سُنی، اُن کی گفتگو اور پاکدامنی سے بہت متاثر ہوا اور صبح کے وقت جوان کو طلب کرکے وزیر زادی سے اس کی شادی کردی،

کہانی طبع زاد نہیں ہے، جائسی کی پدماوت میں بھی راجہ رتن سین، سنگلدیپ کے قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش میں چوری سے متہم ہوکر پکڑا جاتا ہے، اور پدمنی کا باپ راجہ گندھرو سین اس کو پھانسی دینے کا حکم دیتا ہے، آخر میں پدمنی اور رتن سین کی شادی ہوجاتی ہے، بادشاہ کا بھیس بدل کر راتوں کو گھومنا، مشرقی کہانیوں میں عام ہے، عشق صادق، مصائب کے طوفان، اخلاق کی نمود، شاہوں کا عدل اور آخر میں عاشق کی کامیابی اس قسم کی کہانیوں کی عام خصوصیت ہے، بیان عشق بھی ایک منظوم کہانی ہے، اس لئے وہ بھی ان خصوصیات سے مستثنیٰ نہیں ہے،

بیانِ عشق میں قصہ پن زیادہ ہے، منظر کشی، بامحاورہ زبان، روزمرہ کا لطف اور رسوم کا بیان نہیں ملتا، صنعت گری بھی نہیں ہے، البتہ جذبات نگاری ضرور ملتی ہے، صاف ستھری زبان نے جذبات کی گرمی کو قائم رکھا ہے، مثلاً جب بادشاہ پدمنی کی تلاش میں جوان کو اس کے باپ کے پاس لیجاتا ہے، اس وقت جوان کا باپ جو اس سے سخت نالاں تھا کہتا ہے،

مطبوعاتِ جدیدہ

عرب و ہند عہدِ رسالت میں: مرتبہ جناب قاضی اطہر صاحب مبارک پوری
تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۲۰۰، قیمت:- للعہ ر
پتہ:- ندوۃ المصنفین جامع مسجد دہلی ۶،

عرب و ہند کے قدیم تعلقات اور عربوں کی جا زرانی پر اردو میں سب سے پہلے حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے دادِ تحقیق دی، اور اس موضوع پر دو مبسوط کتابیں لکھیں جنھوں نے اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے ایک مستقل راستہ کھول دیا، قاضی اطہر صاحب مبارک پوری کو بھی اس موضوع سے دلچسپی ہے، اس سے پہلے انھوں نے رجال السند والہند کے نام سے عربی میں ایک کتاب تالیف کی، جس میں ساتویں صدی ہجری تک کے ان ہندوستانی علماء و فضلاء کے تراجم قلم بند کئے، جن کا تعلق عرب سے بھی تھا، اب انھوں نے یہ نئی کتاب تالیف کی ہے، اس میں شروع میں عرب و ہند کے قدیم بری و بحری راستوں اُن کے اہم مقامات اور ان ہندوستانی شہروں کے نام جن کی پیداوار اور مصنوعات عرب جاتی تھیں، اور عرب میں اُن کی منڈیوں کے نام تحریر کئے ہیں، آخری ابواب میں عرب میں ہندوستانی قوموں کی آبادی

....

بیان آمد. گوسائیں از دست ظفرخاں بیروں رفت. مقارن بدیں ظفرخاں بنا بر نزاع سنی و شیعہ کشمیر سبک شد.... ترلوچن.... گفت از رنجش من آں ہمہ آسیب بظفرخاں رسید" (دبستان المذاہب ص ۱۰۱)

رواداری اور "صلح کل" کو اس معنی میں تو صحیح کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے مذاہب اور اور ان کے ماننے والوں سے محض اختلاف مذہب کی بنا پر عناد نہ رکھا جائے اور اپنے مذہب پر استقامت کے ساتھ ان کے ساتھ اخلاق و انسانیت کا برتاؤ کیا جائے، یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنے دین و مذہب کو اس پر سے نثار کر دیا جائے، اور اس معنی میں وحدت ادیان کی تحریک سے کوئی مفید نتیجہ بھی برآمد نہیں ہوتا، ہندوستان میں اس قسم کی جتنی تحریکیں ہوئیں سب کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، زیادہ سے زیادہ ایک نیا ناقابل ذکر فرقہ پیدا ہوگیا جس کا کسی مذہب میں شمار نہیں ہوتا، اکبر کے دین الٰہی کا ذکر اب صرف کتابوں میں ملتا ہے، کبیر پنتھیوں کا شمار نہ مسلمانوں میں ہے اور نہ ہندوؤں میں، اس لیے یہ تحریک بھی لغو ہے صحیح رواداری اور صلح کل یہی ہے کہ ہر شخص اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے دوسرے اہل مذاہب کے ساتھ شریفانہ سلوک کرے۔
